

نعت رنگ

و



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نعتیاد کا علمی تحقیقی و تنقیدی کتابی سلسلہ

نعت رنگ

شمارہ 26

دسمبر 2016ء

مرتب

سیدتیج الدین رحمانی

نعت رنگ

میں شامل تمام مقالات متعلقہ
ماہرین کی رائے اور منظوری کے
بعد شامل کئے گئے ہیں
مقالہ نگاروں کی آراء سے مجلس
ادارت کا متفق ہونا ضروری نہیں

معاونین

ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ڈاکٹر اود عثمانی
ڈاکٹر محمد طاہر قریشی، غوث میاں، سمیعہ ناز اقبال
اطہر عباسی

مجلس مشاورت

ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)
ڈاکٹر ظفر اقبال (کراچی)
ڈاکٹر ریاض مجید (فیصل آباد)
پروفیسر انوار احمد زئی (کراچی)
ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی (دہلی)
ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (علی گڑھ بھارت)
ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی (فیصل آباد)
ڈاکٹر شبیر احمد قادری (فیصل آباد)
پروفیسر محمد اقبال جاوید (گوجرانوالہ)
ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (کل گاؤں بھارت)
ڈاکٹر افضال احمد انور (فیصل آباد)
ڈاکٹر اشفاق انجم (دہلی، بھارت)

سیدتیج

B-360 Block 14
Gulistan-e-johar
Karachi, Pakistan
0333-5567941
0333-2457575
17 Priorsfield Road,
Kenilworth,
Warwickshire CV8,
IDA, United Kingdom
Tel : 07800 747053
07533 376980

Email : Sabeehrehmani@gmail.com
www. Naatresearchcenter.com

پاکستان میں قیمت: 500 روپے

جو نعت گو ہے وہ شاعر قریب رب سے ہے
یہ سب کہیں تو مجھے اتفاق سب سے ہے
غزل بھی صنفِ سخن ہے مگر غزل ہی نہیں
ادب میں نعت بھی شامل بڑے ادب سے ہے

(دلاورنگار)

فروغ نعت کے سفر میں
ڈاکٹر عزیز احسن
کی پُر خلوص رفاقت کے نام

علم ہو کہ دانش ہو، عقل ہو کہ حکمت ہو
روشنی جہاں دیکھی، نورِ مصطفیٰ پایا
جب کبھی قدم رکھا راہِ منزلِ حق میں
نقشِ پائے احمد کو ہم نے رہ نما پایا

(صادق دہلوی)

دھنک

ابتدائیہ

صبحِ رحمانی

۹

﴿بابِ تمجید﴾

حمد باری تعالیٰ

فراغِ رہووی

۱۹

﴿مقالات و مضامین﴾

نعت بحیثیت صنفِ سخن

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۲۳

نعتیہ مجموعوں میں تقاریظ، دیباچوں اور مقدمات

ڈاکٹر عزیز احسن

میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

۳۰

غالب کی مثنوی بیانِ معراج کا تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر سید یحییٰ خلیفہ

۷۳

برسبیل نعت، تلفظ و املا

ڈاکٹر ریاض مجید

۹۵

حمد نعت کی شعریات

ڈاکٹر مولا بخش

۱۰۶

اردو نعت اور وقت کی ماورائی جہات

کاشف عرفان

۱۱۳

دکنی مثنویوں میں نعت

ڈاکٹر نسیم الدین فریس

۱۳۶

اردو نعت میں انوارِ قرآن

گوہر ملیانی

۱۷۵

مولانا محمد علی جوہر کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر

ڈاکٹر محمد طاہر قریشی

۲۰۲

جین اور کرپچین نعت گو شعرا

قاروق ارگلی

۲۰۷

نعتیہ گلدستہ ”سفینہ نجات“ دہلی

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد

۲۱۸

مجید امجد کی ایک نایاب نعت

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع

۲۳۵

۲۴۳	ڈاکٹر صابر سنبھلی	حدائق بخشش کے صنایع بدائع پر ایک اور نظر
۲۴۹	حافظ عبدالغفار حافظ	حدائق بخشش کے متن کا المیہ (چند مزید پہلو)
۲۵۳	ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی	کرناٹک میں اردو کی نعتیہ شاعری
۲۶۶	ڈاکٹر محمد سہیل شفیق	انجمن ترقی اردو میں ذخیرہ نعت و منقبت
۲۹۱	ظہیر قدسی	مالیگاؤں کا نعتیہ ادب اور اشفاق انجم

﴿مکالمات﴾

۳۱۱	احمد جاوید	نعت اور حب رسول کے تقاضے (ایک گفتگو)
۳۱۶	محمد جنید عزیز خان	نعت اور تنقیدی شعور (مذاکرہ)

﴿مکروفن﴾

۳۳۹	پروفیسر محمد اسلم اعوان	خولجہ محمد دیوان کی نعت گوئی
۳۵۰	ظفر احمد صدیقی	اقبال سہیل کا ایک نعتیہ قصیدہ (تقابلی مطالعے کی روشنی میں)
۳۶۱	امین راحت چغتائی	اختر ہوشیار پوری کی نعت - ایک مطالعہ
۳۶۶	ڈاکٹر عبداللہ ہاشمی	نعیم صدیقی ایک منفرد نعت گو شاعر
۳۷۲	ریاض حسین چودھری	امجد اسلام امجد کا نعتیہ آہنگ
۳۷۷	احمد جاوید	وسیم بریلوی - نئی نعت کا پیشرو شاعر
۳۸۳	فراغ رہووی	عبد المنان طرزی کا نعتیہ آہنگ
۳۸۹	ڈاکٹر غفور شاہ قاسم	حفیظ الرحمن احسن کی حمدیہ، نعتیہ شاعری (ایک جائزہ)
۳۹۸	اسلم حنیف	فراغ رہووی کی نعتیہ شاعری
۴۰۳	جاوید اختر بھٹی	انور جمال کی نعت گوئی
۴۰۹	منظر عارفی	نظیر رضوی الہ آبادی کی نعتیہ شاعری
۴۲۴	ڈاکٹر نذر عابد	نیاز سواتی کی نعت پر مسدس حالی کے اثرات
۴۳۱	ڈاکٹر طاہر مسعود	شوکت عابد کی ملی شاعری - ایک تجزیاتی مطالعہ

﴿ مطالعات نعت ﴾

۴۴۱	کاشف عرفان	نعت رنگ ۲۵ کا ایک تفصیلی مطالعہ
۴۵۷	ڈاکٹر عزیز احسن	نعت اور جدید تنقیدی رجحانات۔ ایک تجزیاتی مطالعہ
۴۷۲	ڈاکٹر محمد اشرف کمال	اردو نعت کی شعری روایت۔ ایک جائزہ
۴۸۱	ریاض ندیم نیازی	نئی صدی نئی نعت۔ خورشید ربانی کا دلاویز نعتیہ انتخاب
۴۸۴	ڈاکٹر ثار احمد	اردو نعت میں تجلیات سیرت۔ ایک مطالعہ
۴۹۲	سید معراج جامی	کراچی کا دبستان نعت۔ ایک مطالعہ

﴿ ایوان مدحت ﴾

۵۰۵

فدا خالدي دہلوی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، راز کاشمیری، عارف عبدالستین، امین راحت چغتائی، ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم، توصیف تبسم، افتخار عارف، خالد بزمی، سلیم شہزاد، ماجد الباقری، فراغ رھووی، خورشید ناظر، طلعت سلیم، حفیظ الرحمن احسن، نسیم سحر، زاہد فخری، محمد فیروز شاہ، کلیم حاذق، احسن زیدی، ابوالمجاہد زاہد، احسان اکبر، خیر سیفی، غلام محمد قاصر، محمد یعقوب پرواز، عارف منصور، خالد علیم، خواجہ محمد عارف، علی رضا، اقبال کوثر، خادم رزی، سید قمر حیدر قمر، رشید ساقی، رشید ثار، صفدر صدیق رضی، ڈاکٹر محمد اشرف کمال، حافظ عبدالغفار حافظ، خورشید ربانی، حسن عباس رضا، حسن اختر جلیل، حسن رضا اطہر، کاشف عرفان، فیضان عارف، ڈاکٹر شعیب احمد، سید امیر سالک، سرفراز قریشی، سہیل احمد صدیقی، مولانا عبدالرحمن جامی، محمد شفیق اعوان، آصف مرزا، محمد مسعود اختر،

سمعیہ ناز

﴿یاد نگاری﴾

۵۶۳	پروفیسر محمد اقبال جاوید	خالد شفیق کی یاد میں
۵۸۹	پروفیسر محمد اقبال جاوید	پروفیسر محمد اکرم رضا۔ چند یادیں
۵۹۷	ڈاکٹر عزیز احسن	ماجد خلیل ایک منفرد لہجے کا نعت گو
۵۰۶	ڈاکٹر عزیز احسن	حمد و نعت کی کہکشاں کا درخشندہ سیارہ۔ عارف منصور

﴿Column﴾

۶۱۴	Dr. Rauf Parekh Naat as a Literary Genre of Urdu: Some Questions
-----	---

﴿نعت نامے﴾

پروفیسر سحر انصاری، ریاض حسین چودھری، ڈاکٹر اشفاق انجم، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی،
ڈاکٹر صابر سنبھلی، ڈاکٹر محمد افتخار شفیع، احمد جاوید، احسان اکبر، ڈاکٹر مجید اللہ قادری، تنویر
پھول، سعدیہ سیٹھی، طلعت سلیم، سمعیہ ناز اقبال

۶۷۶	عطیات کتب برائے نعت ریسرچ سینٹر
۶۷۹	فہرست کتب نعت ریسرچ سینٹر

ابتدائیہ

ادب و تہذیب کے جملہ مظاہر انسانی فکر و شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اس امر کو بھی ہمیشہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ افراد کے فکر و شعور کی تشکیل و تعمیر میں ان کے انفرادی ذوق و جستجو کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی، سماجی اور گروہی خواہش و کاوش کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ادب و تہذیب کا کام اپنے اظہار میں بے شک فردیت رکھتا ہے، لیکن اس کی صورت گری میں سماجی رجحانات اور گروہی رویے بھی ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادیب، شاعر یا کوئی بھی تخلیق کار خلا میں جی سکتا ہے اور نہ ہی اپنے اظہار کی معنویت کا سراغ پاسکتا ہے۔ اسے اپنے معاشرے میں جینا ہوتا ہے اور یہیں اس کا فن جلا پاتا ہے اور معنویت سے ہم آغوش ہوتا ہے۔

افراد کی بلندی یا پستی کا اندازہ اُن کے مقصدِ حیات سے کیا جاسکتا ہے، اسی طرح کسی تہذیب اور کسی عہد کے لیے تخمین و ظن کا کام یا اس کی سرافرازی اور قدر و منزلت کا جائزہ بھی اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر لیا جاسکتا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو جدید دور گہرے الیے سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس کے افراد اپنے اپنے انفرادی دائرے میں اور اس کا سماج اپنی مجموعی صورت میں بڑی حد تک روحانی اور اخلاقی اقدار سے برگشتہ جب کہ مادیات اور تعیش پسندی کا دل دادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر فرد و سماج کے باطن میں ذرا سا جھانک کر دیکھا جائے تو دور تک گہری ہوتی ہوئی تاریکی کے سوا کچھ اور دکھائی ہی نہیں دیتا۔ نام نہاد ترقی، خوش حالی اور روشن خیالی کے اس دور میں ظلمت پسندی کا یہ رویہ انسانی آزادی اور ارضیت پسندی کے نام پر فروغ پا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ انسان کو اپنی زندگی خود اپنی پسند اور ناپسند کے مطابق گزارنے کا حق ہے۔ اس حق کا مطالبہ گزشتہ ادوار کے اخلاقی ضابطوں، تہذیبی فلسفوں اور نفسِ انسانی کی تربیت کرنے والے مذاہب کے خلاف اعتراضات کا غلغلہ

بلند کرتے ہوئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں زور دے کر کہا جاتا ہے کہ فلسفے اور مذہب نے انسان کو جکڑ بندیوں میں ڈالا اور اس کی آزادی سلب کی ہے۔ اسے آسمان کے خواب دکھائے ہیں اور زمین سے لاتعلق ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اب اُسے ان خوابوں سے نکل کر اپنی خواہشوں اور زمینی حقائق کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے۔ صرف اسی صورت میں وہ ایک آزاد، خود مختار، پسندیدہ اور بامعنی زندگی بسر کر سکتا ہے اور اسے خوشی نصیب ہو سکتی ہے۔

ان نظریات پر بحث کا یہ محل نہیں، اس لیے میں یہ قصہ نہیں چھیڑوں گا کہ یہ باتیں کتنی درست اور کس حد تک غلط ہیں۔ ہاں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس ارضیت پسندی نے آج کے انسان کا رشتہ آسمان سے منقطع کر دیا ہے۔ بہت سے لوگ اسی فکر کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں اور جو ابھی نہیں ہوئے، ان کو بھی اسی راہ پر لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی سمت سے کوئی آواز آسمان کے حق میں یا اُس کی طرف سے آنے والی روشنی کے اثبات کے لیے آتی ہے تو اُس پر واشگاف الفاظ میں ردِ عمل کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دورِ حاضر کی مقتدر قوتیں انسانیت کو مذہب سے لاتعلق دیکھنے کی خواہاں ہیں۔ اپنے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے وہ ہر ممکن اقدامات کر رہے ہیں۔ دنیا میں لادینیت کو آزادی کا عنوان دے کر آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے فروغ کے لیے باقاعدہ پالیسیاں بنائی جا رہی ہیں اور انھیں الیکٹرونک اور سوشل میڈیا کے ذریعے مختلف حربوں سے پھیلایا جا رہا ہے۔ ان نظریات کو قبول نہ کرنے والے لوگ مطعون گردانے جاتے ہیں اور انھیں مسترد کیا جاتا ہے۔ اگر ہم ذرا دھیان دیں تو اپنے اطراف کے حالات اور روزمرہ کے معمولات ہی میں کسی نہ کسی صورت میں ان رویوں کا تجربہ آپ کو اور مجھے بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک تجربہ پچھلے دنوں ہمیں اُس وقت ہوا جب ”نعت رنگ“ کے سلور جوبلی نمبر میں ہمارے عہد کے نامور ادیب اور نقاد مبین مرزا کا مضمون مہمان ادارے کے طور پر شائع کیا گیا۔

اس حقیقت کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی کے مترادف ہوگا کہ مبین مرزا نے اپنے اس مضمون میں جس زاویہ نظر سے بات کی ہے اور جو مقدمہ بنا کر اردو شاعری کی تہذیب پر نظر ڈالی ہے وہ ہمارے نعتیہ مطالعات ہی میں نہیں بلکہ اردو تنقید کی روایت میں بھی ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس مضمون میں اردو شعر و ادب کی تہذیب کے حوالے سے کچھ ایسے فکر افروز نکات اٹھائے گئے ہیں جو اس سے قبل ہمیں اپنی تنقید کے دامن میں نظر نہیں آتے۔ ان نکات کی رو سے

ابتدائیہ

دیکھا جائے تو اپنی شاعری اور اس کے مزاج کے بارے میں ہمارا تاثر ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم مضمون ہے اور ہمارے تنقیدی شعور کو ایک نئی سمت عطا کرتا ہے۔ اس کا کسی نہ کسی انداز میں اعتراف پاک و ہند کے ان سب اہل نظر کی طرف سے کیا گیا جو ادب اور تنقید میں تازہ کاری کو اہمیت دیتے ہیں اور ادب و مذہب کے رشتے کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات آپ اور ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ ایسے مضامین جہاں ایک طرف داد و تحسین کے مستحق گردانے جاتے ہیں وہیں دوسری طرف ردِ عمل کا ہدف بھی بنتے ہیں۔ ردِ عمل اور اختلافِ رائے کا اظہار ادب میں منفی نہیں، بلکہ مثبت رویہ گردانا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے فکر کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں اور نئے زاویے پیدا ہوتے ہیں۔ مبین مرزا کے مضمون کے سلسلے میں یہ ہوا کہ اس کی ستائش کی گئی، لیکن وہ لوگ جو مذہب سے بیگانے ہیں یا اس کی طرف ایک منفی رویہ رکھتے ہیں، انہوں نے اس مضمون پر نہ صرف اپنے منفی ردِ عمل کا اظہار کیا، بلکہ کھلے لفظوں میں کہا کہ یہ ادب کو اسلامیت کے زیرِ اثر لانے کی کوشش ہے اور ہم ایسی ہر کوشش کو رد کرتے ہیں جو ادب کی سیکولر حیثیت کو ختم کرتی ہو۔

مبین مرزا نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ادب و مذہب کا رشتہ آج کا نہیں، بلکہ ہزاروں سال پرانا ہے۔ اس سے پہلے کے ادبی تناظر میں یہودیت، عیسائیت، ہندومت، جین مت اور دوسرے مذاہب کے حوالے سے مطالعہ کر کے کتنے ہی شواہد با آسانی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ جب ایسا ہے تو اسلام اور اردو ادب کے باہمی رشتے کے حوالے سے اعتراض کی بھلا کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ دوسری بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر ایک شخص کی آزادی کے ضمن میں ہم اُسے یہ اختیار دیتے ہیں کہ وہ ادب کو سیکولر یا لامذہب سمجھے تو دوسرے شخص کو یہ آزادی دینے میں کیا امر مانع ہے کہ وہ ادب و مذہب کو ہم رشتہ گردانے۔ اگر بات حقوق ہی کی ہے تو پھر دونوں کو یکساں حقِ آزادی ملنا چاہیے۔ دونوں طرح کے لوگوں کو اپنے اپنے انداز سے ادب تخلیق کرنے، پڑھنے اور سمجھنے کا مکمل اختیار ہونا چاہیے۔ اسی اصول کے تحت مبین مرزا کے حقِ آزادی رائے سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

”نعت رنگ“ اپنے اشاعتی سفر کے آغاز ہی سے غایتِ تخلیق کائنات کی مدح و توصیف کو اپنا موضوع بنائے ہوئے ہے۔ یہ درحقیقت ایک میڈیم ہے، یعنی ایک ایسا ذریعہ ہے خدا کی اس روشن دلیل کو اپنی عقل، اپنی روح اور اپنے پورے وجود میں بسانے کا جس سے ساری روشنیاں پھوٹی ہیں، اور جس سے دُوری یا انقطاع ہی دراصل ظلمات، گمراہی یا تاریکی کا دوسرا نام ہے۔

روشنی کے اس سفر میں ”نعت رنگ“ کا یہ چھبیسواں سنگ میل ہے۔ اس سفر میں ہم نے اہل قلم کو اس ہستی سے جوڑے رکھنے کی کوشش جاری رکھی ہے جس نے خود تو قلم و قرطاس بے شک استعمال نہیں کیے، لیکن اپنی تعلیمات سے قلم و قرطاس کو معتبر گردانا اور نگاہ اعتبار سے دیکھا۔ جس مبارک ہستی پر اس لافانی کتاب کا نزول ہوا جس میں خدائے ذوالجلال نے قلم کی قسم کھائی اور اپنی محبت کی واحد شرط یہ بتلائی کہ اگر میرے محبوب کی اطاعت کرو گے تو تم بھی میرے محبوب ہو جاؤ گے، جس کے رب نے اس کے اسم کو اپنے اسم سے اور اس کے ذکر کو اپنے ذکر سے منسلک کرتے ہوئے اس کی رسالت پر ایمان کو اپنی وحدانیت پر ایمان سے مشروط کر دیا ہے۔ وہ فرط محبت سے فرشتوں کے ساتھ اپنے محبوب پر خود بھی درود بھیجتا ہے اور اہل ایمان کو بھی اس مبارک عمل کی تلقین کرتے ہوئے قبولیت دعا کو بھی درود بھیجنے سے مشروط کرتا ہے۔ اس نے اپنی تمام مقدس کتابوں کو اپنے محبوب کی بعثت کی بشارت سے روشن رکھا ہے۔ یہ تمام حقائق کیا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں کہ اللہ کا وہی محبوب غایت تخلیق کائنات ہے اور جب کائنات انسانوں کے باطن میں اپنی غایت کے انکشاف و اعتراف سے محروم ہو جائے تو کیا وجود انسانی کا ظلمت و گمراہی کی بھینٹ چڑھ جانا لازمی نہیں ہو جائے گا۔ ”نعت رنگ“ اسی تاریکی کے خلاف آوازہ بلند کیے ہوئے ہے، اس گہرے ایمان و ایقان کے ساتھ کہ اس روشنی کی تلاش اور اس سے جڑے رہنے کی صورت ہی میں ہمارا قلبی سکون اور ہماری آخری نجات پوشیدہ ہے۔

چھبیسواں شمارہ پیش کرتے ہوئے میرا دل ایک بار پھر تشکر کے جذبات سے لبریز ہے۔ پچیسویں شمارے کی پذیرائی سے یقیناً ہمارے حوصلے بلند ہوئے ہیں، بلکہ نعت کی تفہیم کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے۔ ”نعت رنگ“ کے قلمی معاونین میں مسلسل اضافہ اور موضوعات کا تنوع اور اس میں سامنے آنے والے مباحث کی گہرائی کو دیکھا جائے تو یہ سب کچھ اس بات کی علامت ہے کہ ہم اس سفر میں مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ عصر حاضر کے نمائندہ نقادوں کا نعت گوئی کے اسالیب اور شعری جمالیات پر تنقیدی شعور کے ساتھ اظہار خیال کی جانب سنجیدگی سے متوجہ ہونا خوش آئند ہے، صرف خوش آئند نہیں بلکہ یہ عمل ہماری اس کوتاہی، غیر ذمے داری اور غفلت کا مداوا بھی معلوم ہوتا ہے جو طویل عرصے تک نعتیہ ادب کے ضمن میں ہمارے ہاں فکر و ادب کی دنیا میں رائج رہی ہے اور جس کے منفی اثرات ہماری تہذیب اور سماج کے تقریباً سب ہی شعبوں میں افسوس ناک حد تک نمایاں طور پر ایک

پورے دور کے حوالے سے دیکھے اور محسوس کیے جاتے ہیں۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ تنقید نعت کا شعبہ ایسا ارزاں بھی نہیں کہ کوئی بھی اس میں در آئے۔ بڑے سے بڑا نقاد اور دانش ور بھی یہ کام توفیق من جانب اللہ اور داخلی مطالبے کے بغیر نہیں کر سکتا۔

مبین مرزا کے بقول:

ادب کی دوسری اصناف کی طرح نعت کا تنقیدی مطالعہ نقاد سے محض علمی وسعت اور تجزیاتی بصیرت ہی کا تقاضا نہیں کرتا، بلکہ ایک خاص سطح کی کشادہ نظری اور فکری متانت بھی لازمی شرائط کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے دیکھا گیا ہے کہ کوئی بھی نقاد تنقید نعت کے شعبے کی طرف اس وقت تک نہیں آتا جب تک یہ اس کا داخلی مطالبہ نہیں بن جاتا اور اس مطالبے کی تکمیل اس کے لیے ایک روحانی داعیے کی صورت اختیار نہیں کر لیتی۔

اس تناظر میں یقیناً یہ بات خوش آئند ہے کہ حالیہ عرصے میں تنقید نعت کی طرف ادب کے کچھ معتبر، سنجیدہ اور اہم ناقدین متوجہ ہوئے ہیں۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے نیا ابھرتا ہوا یہ طرز عمل دراصل ہمارے ہاں تہذیبی، فکری، ثقافتی، سماجی اور ادبی سطح پر ایک بڑی انقلابی تبدیلی کا بلیغ اور خوش کن اشارہ ہے۔ وقت کا تغیر اسی طرح قوموں کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تبدیلی جلد ہی اپنے وجود کا اثبات ہمارے تہذیبی، سماجی اور ادبی رویوں میں واضح طور پر کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ایک ایسی تبدیلی جو ہمارے تہذیبی اور ملی وجود کو نئی معنویت سے ہم کنار کرے گی۔ ہمارے گم گشتہ وقار کی بحالی کا ذریعہ ہوگی اور ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے فکری مبدا اور روحانی ورثے سے وابستہ و پیوستہ کر کے اس کو جینے کے اصل معنی سے سرشار کرے گی۔

زندہ اور فکر انگیز ادب ہمیشہ مکالماتی فضا کو قائم رکھتا ہے۔ ”نعت رنگ“ ادب کی اس کشادگی کا قائل ہے اور اس پر کاربند بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے صفحات پر ابتدا ہی سے اختلاف رائے کی گرما گرم محفلیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، جن میں فکری، ذہنی، نظریاتی، علمی اور فنی حوالوں سے خوب خوب گفتگوئیں ہوئیں۔ ہم اب بھی ادب و فکر کے مکالماتی بیانیے کو نیک شگون سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ اس طرح کے مکالمے ادب و فن کی راہوں پر نئے چراغ روشن کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس لیے اگر کچھ لوگ ”نعت رنگ“ میں شائع ہونے والی کسی بھی تحریر کے بارے میں اپنی رائے یا

اختلاف کا اظہار کرنا چاہیں تو ہم ان کو خوش آمدید کہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ بحث علمی و فکری اور ادبی نوعیت کی ہو اور اس کا لب و لہجہ بھی ادبی ہو۔

اس شمارے سے ”نعت رنگ“ کی بزم میں کچھ اور اہم نام پہلی مرتبہ شریک ہو رہے ہیں، ان میں ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر محمد اشرف کمال، ڈاکٹر طاہر مسعود، ڈاکٹر افتخار شفیع اور ڈاکٹر نذر عابد وغیرہ شامل ہیں۔ ان احباب کی شمولیت سے بھی ”نعت رنگ“ کی کہکشاں مزید باوقار ہوئی ہے۔

میری دعا ہے کہ رب لوح و قلم ہماری اس بزم کو ہمیشہ آباد رکھے۔ اس محفل میں پہلے سے آئے ہوئے اہل فکر و نظر میں سے جو لوگ اس عرصے میں ہم سے جدا ہو گئے ان پر رب کریم اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور جو حیات ہیں انھیں صحت کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے اور خدمتِ نعت پر مامور رکھے۔

وفیات

زیر نظر شمارے میں یاد نگاری کے حصے میں چار اہم نعت نگاروں اور نعت کاروں کے بارے میں مفصل مضامین شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہ ہمارے نعتیہ منظر نامے کے اہم نام تھے جو ہم سے پچھلے کچھ عرصے میں جدا ہوئے، ان میں پروفیسر محمد اکرم رضا، خالد شفیق، ماجد خلیل اور عارف منصور شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی اہم نام اس فہرست کا حصہ ہیں۔ میں ایک بار پھر عازم سفر ہوں اس لیے جو نام اس وقت ذہن میں آئے ہیں سرِ دست صرف ان کی یاد تازہ کرنے کے لیے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

سید منظور الکوینین

۱۵ جولائی ۱۹۴۴ء - ۱۹ جولائی ۲۰۱۶ء

صاحبزادہ سید منظور الکوینین کی ساری زندگی مدحتِ سرائی میں بسر ہوئی اور پایاںِ عمر تک ان کا یہ جوش و جذبہ جوان رہا۔ ان کے آہنگِ ثنا خوانی میں موسیقی کے اسرار و رموز سے آگاہی کی ادب آموز گونج بہت واضح سنائی دیتی تھی، یہی وجہ ان کے نعتیہ منظر نامے پر نمایاں رہنے کی بنی۔ ان کی پڑھت کا انداز، ادائی کا اسلوب اور طرزِیں وضع کرنے کا مؤذب اور باوقار اظہار ان کی محبوبیت کی وجہ بنا۔ انھوں نے اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کا ایک بڑا حلقہ چھوڑا جو نعتِ خوانی کے فن کو ان کے انداز میں اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے اور یہی سید منظور الکوینین کا کمال ہے۔ ان کی چند نعتیں بھی میری نظر سے گزری ہیں جو ان کے عشق و ادب کی حلاوت اور نسبت و تعلق کا

اعلامیہ بن وقت کے اوراق پر محفوظ ہو گئی ہیں۔

جو مجھ پہ چشم رسالت مآب ہو جائے
ہر ایک لمحہ مرا کامیاب ہو جائے
بروزِ حشر نہیں کوئی حامی و ناصر
کرم حضور کہ آساں حساب ہو جائے

کوثر بریلوی

۱۹۳۸ء - ۲۲ ستمبر ۲۰۱۶ء

کوثر بریلوی نے نعتیہ ادب کو دو مجموعے عطا کیے۔ ان کا پہلا مجموعہ نعت ”یہ تو کرم ہے ان کا ورنہ“ اور دوسرا ”حصارِ نعت“ کے نام سے شائع ہوا جب کہ ایک مجموعہ غزل بھی ”حدیثِ محبت“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ کراچی کے ادبی منظر نامے پر کوثر بریلوی خاصے فعال رہے مگر ان کا شعری تشخص نعت کے حلقے میں زیادہ مستحکم ہوا۔ ان کا ایک شعر:

جتنا دیا سرکار نے مجھ کو اتنی مری اوقات نہیں

یہ تو کرم ہے اُن کا ورنہ مجھ میں تو ایسی بات نہیں

عوامی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا۔

حسین سحر

یکم مارچ ۱۹۴۲ء - ۱۵ ستمبر ۲۰۱۶ء

اُردو پنجابی کے ممتاز شاعر، نقاد، مترجم اور ماہرِ تعلیم پروفیسر حسین سحر بھی پچھلے دنوں ہم سے کچھڑ گئے۔ ۴۰ سے زیادہ کتابیں اپنے آثارِ علمی کے طور پر چھوڑنے والے حسین سحر کو نعتیہ ادب سے بھی خصوصی لگاؤ تھا۔ ان کے دینی شاعری کے مجموعوں میں تقدیس (حمد و نعت)، دو جگ دا والی (پنجابی نعت)، تنویر (نعت)، سعادت (حمد و نعت)، تطہیر (سلام و منقبت) اور مودت (مناقب و سلام) شامل ہیں۔

سحر یہ نعت ہی کے شعر کو اعزاز ہے حاصل

کہ ظلمت میں ادا یہ نور کا کردار کرتا ہے

عابدہ کرامت

۱۵ جولائی ۲۰۱۶ء

کینیڈا میں مقیم معروف اُردو شاعرہ عابدہ کرامت بھی اس سال ہم سے جدا ہوئیں۔ وہ متعدد کتب کی مصنفہ تھیں۔ ۱۲ جولائی ۲۰۰۵ء کو انھوں نے ٹورنٹو کینیڈا کی ایک ادبی محفل میں مجھے اپنا حمد یہ

مجموعہ کلام ”جبینِ نیاز“ عطا کیا تھا۔ یہ عام حمدیہ شاعری کے مجموعوں سے الگ ایک ایسا جادہ عرفان محسوس ہوا جس کے مطالعے سے گزرتے راہِ سلوک کی کتنی ہی منازل طے ہو جاتی ہیں اور پھر ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں زبان خاموش ہو جاتی اور چشمِ غم سے شکر و دعا کے موتی برسنے لگتے ہیں۔ حمدیہ ادب میں اس خصوصی مجموعے کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

ترے جلووں کی کوئی حد نہیں ہے تو کیوں میری نظر محدود رکھی
رگِ جاں سے بھی بڑھ کر قرب ٹھہرا تو کیوں دُوری مرے معبود رکھی

امجد صابری

۲۳ دسمبر ۱۹۷۹ء - ۲۲ جون ۲۰۱۶ء

بعض شخصیتیں ایسی شاداب اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں کہ ان کو مرحوم لکھنا آسان نہیں ہوتا۔ امجد صابری بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھا کہ اس کی موت کا اب تک یقین نہیں آتا۔ وہ ایک بہت بڑا فنکار ہونے کے باوجود انتہائی منکسر المزاج اور خلیق دوست تھا۔ ہمیشہ ادب اور نیاز مندی کے ساتھ ملنا اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ ایک دل آواز مسکراہٹ والا، سروں کی دنیا میں گم، یہ شخص اپنے وجود میں بھی موسیقی جیسا بہاؤ رکھتا تھا۔ ہم اکثر ساتھ مختلف ٹی وی چینلز پر مقابلہ نعت میں منصف کے فرائض انجام دیتے اور مختلف محافل میں پڑھتے رہے اور میں نے اسے ہر جگہ ایک ہی رنگ اور کیفیت میں پایا یعنی ”سراپا محبت“۔ افسوس کہ ساری دنیا میں دینی اقدار کی روشنی کو مذہبی کلاموں کے ذریعے پھیلانے والے اس چراغ کو دہشت گردی کا اندھیرا نگل گیا اور ہماری ریاست اپنی روایتی بے حسی سے دیکھتی رہی۔ اس کا پڑھا ہوا کلام ”جب وقتِ نزع آئے دیدار عطا کرنا“ اس کی وہ عرضی بن گیا جو یقیناً قبولیت سے سرفراز ہوئی ہوگی، لیکن اس کے جانے کے ایک ماہ بعد تک اس کی آواز میں یہ عشق و عقیدت اور طلبِ شفاعت و رحمت میں ڈوبی ہوئی التجا پاکستان کے ہر ٹی وی چینل پر گونجتی رہی اور لوگوں کے عقیدے اور عقیدت کو تازہ کرتی رہی۔ امجد صابری تم چلے گئے مگر تمہارے نام اور کام کی روشنی دلوں کو گرماتی رہے گی۔ (ان شاء اللہ)



باب تجید

ہم اہل نعت فروعات میں اُلجھتے نہیں
ہمیں تو اُن کی محبت کو عام کرنا ہے

(ریاض مجید)

[غیر منقوط]

کہاں کوئی رہا ہے عکس در عکس
وہی ہم کو ملا ہے عکس در عکس

سر صحرا سر ساحل سر رہ
کلام اُس کا لکھا ہے عکس در عکس

رسالہ در رسالہ اسم واحد
دکھائی دے رہا ہے عکس در عکس

حوالہ در حوالہ، درس در درس
گماں اُس کا ہوا ہے عکس در عکس

سلاسل در سلاسل، دار در دار
اُسی کا سلسلہ ہے عکس در عکس

ہمالہ در ہمالہ، سطح در سطح
وہی حاوی رہا ہے عکس در عکس

وہی رحم و کرم والا، اُسی کی
عطا کا سلسلہ ہے عکس در عکس

(فراغ رہودی)

ہمیشہ سے افضل، ہمیشہ سے اعلیٰ خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا
قدیم و بزرگ و عظیم اور بالا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

زمیں، آسماں، کہکشاں، چاند، سورج، گلستان و صحراء، ندی، جمیل، ساگر
گھڑی بھر میں سب کچھ بنا دینے والا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

جو ممکن نہیں، تجھ سے ممکن ہے مولا، ترے لفظِ کن میں عجب گن ہے مولا
بنا دینے والا، مٹا دینے والا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

وہ چاہے تو سورج کو بے نور کر دے، پہاڑوں کو ہلنے پہ مجبور کر دے
ہر اک فن میں یکتا، ہنر میں نرالا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

فلک کیا، خلا کیا، زمیں کیا، سمک کیا، مکاں، لامکاں کیا، دیا حرم کیا
درونِ کلیسا، درونِ شوالہ خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

اُسی کی بدولت ہے دنیا کی رونق، اُسے خود نمائی ہے زیبا، وہ برحق
کہ خلاق گل کا، شجر کا، ثمر کا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

فراغ اُس کا فضل و کرم ہے وگرنہ نگاہوں میں چھایا ہی رہتا اندھیرا
چمک روح و دل کی، نظر کا اُجالا خدا تھا، خدا ہے، خدا ہی رہے گا

(فراغ رہووی)

مقالات و مضامین

نعت کہنے کی مرے دل میں جہاں خواہش ہوئی
در کھلے وجدان کے الہام کی بارش ہوئی

(حزین صدیقی)

نعت بحیثیت صنف سخن

ABSTRACT:

This article emphasis's importance of creativity in Poetry over theme. Theme becomes irrelevant if the poetic beauty diminished or extremely enlightened. Poetry is accepted on the basis of style of expression and not for the sake of theme only. All worldly recognized luminous literary works gained popularity irrespective of the fact carrying religious content. Vergil's Elide, Dante's Divine Comedy, Milton's Paradise Lost, Firdausi's Shah Nama and Roomi's Mathnavi were based on religious topics, yet gained popularity due to stylistic unique expression. Religious, particularly, Naatia poetry can, therefore, never be termed non-poetry if carry poetic beauty.

مسلمان چھٹی صدی عیسوی میں اپنے انقلاب آفریں عقائد کے ساتھ عرب کی سر زمین سے نکلے اور بہت جلد دنیا کے گوشے گوشے میں آباد ہو گئے۔ جہاں جہاں وہ گئے اس سے انکار نہیں کہ وہاں کی علاقائی، تہذیبوں کا اثر بھی انہوں نے قبول کیا لیکن جس چیز نے ان کی تمدنی زندگی کو ہمیشہ دوسروں کی زندگی سے ممتاز رکھا وہ توحید و رسالت پر ان کا عقیدہ تھا ایسا ہمہ گیر و وسیع عقیدہ جس کے بغیر وہ خود کو مسلمان کہنے کا دعویٰ ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اس عقیدے کے ایک جزو یعنی توحید کا تصور تو کسی نہ کسی شکل میں دوسری قوموں میں بھی موجود تھا لیکن رسالت کے مماثل ان کے یہاں کوئی چیز نہ تھی۔ مسلمانوں کے یہاں رسالت نام تھا آنحضرت کو اللہ کا رسول برحق تسلیم کرنے کا ان کی سیرت و زندگی کی پیروی کا اور پیروی سے بھی پہلے ان کی ذات و صفات سے اس والہانہ محبت و شغف کا جس کے بغیر توحید کا عقیدہ اسلام میں بے معنی ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی ست

یا شیخ سعدی کے الفاظ میں:

خلاف پیمبر کے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید
مہندار سعدی کہ راہ صفا
تو اں رفت جزاز پئے مصطفیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ شغف و محبت نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان کے فنون لطیفہ خصوصاً شعر و ادب پر گہرا اثر ڈالا۔ اس اثر کے نتیجے میں نعت گوئی جس کا اصل مقصود آنحضرت سے اظہار محبت کرنا تھا ان کے فکرو فن کا مستقل محور بن گئی۔ چنانچہ عربی، فارسی، اردو اور دوسری زبانوں کا شاید ہی کوئی مسلمان شاعر ہو جس نے نعت کی شکل میں حضور اکرم سے اپنی عقیدت کا اظہار اور انسانی زندگی پر ان کے احسانات کا اعتراف نہ کیا ہو یہ الگ بات ہے کہ نعتوں کا جتنا بڑا اور قیمتی ذخیرہ عربی، فارسی اور اردو میں موجود ہے کسی دوسری زبان میں نظر نہیں آتا۔ نعت عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کے لغوی معنی تعریف یا وصف بیان کرنے کے ہیں۔ مثلاً فارسی کے اس شعر میں:

جاوید ہمیشہ باش بہ ایں نعت بایں وصف
پاکیزہ باخلاق و پسندیدہ بافعال

نعت کا لفظ اپنے لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے لیکن ادبیات اور اصطلاحات شاعری میں ”نعت“ کا لفظ اپنے مخصوص معنی رکھتا ہے یعنی اس سے صرف آنحضرت کی مدح مراد لی جاتی ہے۔ اگر آنحضرت کے سوا کسی دوسرے بزرگ یا اصحاب و امام کی تعریف بیان کی جائے تو اسے منقبت کہیں گے۔ آنحضرت کی مدح چوں کہ نثر اور نظم کے ہر ٹکڑے کو نعت کہا جائے گا لیکن اردو، فارسی میں جب نعت کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس سے عام طور پر آنحضرت کی منظوم مدح مراد لی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا معنی کی روشنی میں نعت کا لفظ شاعری کی کسی ہیئت کی طرف نہیں بلکہ صرف موضوع کی جانب اشارہ کرتا ہے یعنی شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً: قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ یا مسدس و مخمس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں نعت کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔ نعت کا موضوع بظاہر بہت مختصر نظر آتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حدیں حضور کی زندگی اور سیرت سے آگے نہیں بڑھتیں لیکن غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ نعت کا موضوع حقیقتاً ایک انتہائی

عظیم وسیع موضوع ہے عظیم اس لیے کہ اس کا تعلق دنیا کی عظیم ترین شخصیت اور محسن انسانیت سے ہے وہ کسی خاص قوم یا گروہ کے لیے نہیں بلکہ ساری اقوام عالم کے لیے رحمت بن کر آیا تھا اور خود اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں جگہ جگہ اس کے اوصاف بیان کیے ہیں۔

جہاں تک موضوع کی وسعت کا تعلق ہے اس میں آنحضرت کی زندگی اور سیرت کے توسط سے انسانی زندگی کے سارے ثقافتی و تہذیبی پہلو اور سماجی و سیاسی مباحث درآئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو، فارسی کے بیشتر شعراء نے عموماً حضور اکرم کے حلیہ اقدس۔ واقعہ معراج اور معجزات ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے لیکن نعت کے موضوع کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے اس میں شمائل و فضائل کے ساتھ ساتھ معمولات نبوی، غزوات نبوی، عبادات نبوی، آداب مجالس نبوی، پیغامات نبوی اور اخلاق نبوی کے بے شمار پہلو شامل ہیں۔ حسن عمل، حسن سلوک، حسن بیان اور حسن معاملہ سے لے کر عدل و انصاف، جود و سخا، ایثار و احسان، سادگی و بے تکلفی، شرم و حیا، شجاعت و دیانت، عزم و استقلال، مساوات تواضع، مہمان نوازی و ایفائے عہد، زہد و قناعت، عفو و حلم، رحمت و مروت، شفقت و محبت، عیادت و تعزیت، رفیق القلمی و جاں گدازی، رحمت و کرمیت، لطف طبع و لطف سخن اور انسانی ہمدردی و عنفوانی تک تمدنی زندگی کا کونسا پہلو اور کونسا رخ ہے جس کی ترغیب و ترویج و تزیین و تطہیر کا سامان نعت کے موضوع کے اندر موجود نہیں۔ حق بات یہ ہے کہ عظمت انسانی کے جتنے گیت آج تک گائے گئے ہیں اور ایک عظیم انسان کے بارے میں جتنے تصورات آج تک قائم ہوئے ہیں وہ آنحضرت کی رحمۃ للعالمین کے ایک ادنیٰ جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے یہاں نعتیہ شاعری کو یا ایسی شاعری جس کے موضوع کا تعلق اسلام یا اسلامی اقدار و روایات سے ہو کچھ زیادہ لائق پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا اوّل تو ان اقدار کی محتمل نظموں کو مذہب اخلاقیات و تاریخ کا منظوم درس خیال کر کے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور اگر بے دلی و تنگ نظری کے ساتھ کسی نے اس پر توجہ کی تو ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر موضوعاتی شاعری کا نام دے کر انہیں بے وقعت اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے ناقدوں کے نزدیک موضوعاتی شاعری بہ حیثیت مجموعی خارجی واقعات سے اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق رکھتی ہے۔ غیر موضوعاتی شاعری ان کے نزدیک شاید یوں اہم تر ہے کہ اس کے برعکس مضمون کا ادراک ہم آسانی سے نہیں کر سکتے ہم نہیں جانتے کہ جو نظم ہم سننے والے ہیں اس میں کیا کہا جائے گا اور کس نقطہ نظر سے کہا جائے گا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ غیر موضوعاتی

شاعری عالم محسوسات و کیفیات کی چیز ہونے کے سبب اپنے قاری یا سامع کو قبل از وقت موضوع و مواد کا سراغ نہیں دیتی سننے والا جو کچھ سنتا ہے یکا یک سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اچانک محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس موضوعاتی شاعری جس کی نمائندگی بالعموم مراثی، قصائد، منظوم افسانے اور تاریخی نظمیں کرتی ہیں خارجی واقعات کا ایک مخصوص بلکہ جانا پہچانا پس منظر رکھتی ہے۔ یہ پس منظر کئی یا جزوی طور پر عنوان کے ساتھ ہی سامع یا قاری کے ذہن میں ابھر آتا ہے گویا موضوعاتی شاعری ہمیں پہلے ہی اس بات کا سراغ دے دیتی ہے کہ کسی خاص نظم میں کیا کچھ بیان کیا جانے والا ہے۔ اس پیشگی وقوف کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہم اس قسم کی شاعری اور اس کے موضوعات کو کبھی کبھی پامال محسوس کرنے لگتے ہیں اور ان میں زبان کی چاشنی کے سوا کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی جو ہمیں متاثر کر سکے۔ علاوہ ازیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چون کہ اس قسم کی شاعری کا اصل محور کوئی واقعہ ہوتا ہے جس کا حلقہ اثر عموماً کسی خاص علاقہ طبقہ یا ملت و قوم تک محدود ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا دائرہ اثر کچھ زیادہ وسیع نہیں ہوتا۔

میری ناقص رائے میں موضوعاتی شاعری کے بارے میں ہمارے ناقدین کی رائیں سوچی سمجھی نہیں ہیں۔ دنیا کے شعری کارناموں کو ذہن میں ابھاریے تو اندازہ ہوگا کہ ان کارناموں میں سے بیشتر کا تعلق غیر موضوعاتی شاعری سے نہیں خالص موضوعاتی شاعری سے ہے۔ کالیداس کے منظوم ڈرامے، ہومر کی الیڈاؤڈیسی، ویاس کی مہا بھارت تلہسی داس کی رامائن، فردوسی کا شاہنامہ، نظامی گنجوی کا خمہ، ورجل کی اینڈ، ملٹن کی فردوس گم شدہ، ڈائنٹ کی طربیہ ربانی اور گوٹے کی فاوسٹ۔ سب موضوعاتی شاعری کے ذیل میں آتی ہیں۔ لیکن کیا محض اس بنا پر کوئی شخص ان نظموں کو کم مرتبہ خیال کرے گا۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر اس نوع کی دوسری نظموں کو کم مایہ اور بے وقعت خیال کرنا مناسب بات نہ ہوگی۔ بلکہ انیس کا مرثیہ ہو یا حالی کا مسدس۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان ہو یا دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم شبلی و اقبال کی تاریخی نظمیں ہوں یا امیر و محسن کے نعتیہ قصیدے ہمارے دور میں حفیظ کا شاہنامہ ہو یا ماہر القادری کی ”ظہور قدسی“، محشر رسول کی ”فخر کوین“، ہو یا عبدالعزیز خالد کی ”فارقلیط“ ان میں سے کسی ایک کو بھی بشرطیکہ وہ شاعرانہ لوازم پر پوری اترتی ہو محض موضوعاتی شاعری کی بنا پر نظر انداز کرنا نا انصافی ہوگی۔

کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے کہ شاعری کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے، کائنات کا ذرہ ذرہ شعر میں ڈھلنے کے لیے بے تاب ہے۔ ضرورت صرف ایک ایسے صاحب نظر فنکار کی ہے جو انہیں شعر کا قالب عطا کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں موضوعات کے انتخاب کا مسئلہ اتنا اہم نہیں ہے

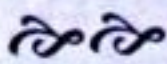
جتنا کہ موضوع کے بے جان جسم میں روح ڈالنے کا یہ روح موضوع کے خارجی پہلو میں بھی کہیں کہیں چھپی ہوتی ہے لیکن جو چیز اس کو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار لاتی ہے وہ دراصل کسی شاعر کی فنی صلاحیت اور شخصیت ہے۔ مثال کے طور پر تلسی داس کی رامائن کو لے لیجیے بقول فراق گورکھپوری رام اور سیتا کی کہانی بھی کوئی کہانی ہے اس سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز کہانیاں آئے دن کہی اور سنی جاتی ہیں لیکن جب تلسی داس جیسا جادو نگار اسے چھو لیتا ہے تو یہی کہانی قبول خلأق بن جاتی ہے اور اس میں عظمت کے ایسے آثار پیدا ہو جاتے ہیں کہ اس کا شمار دنیا کی بہترین نظموں میں ہونے لگتا ہے یہی صورت آرتھر اور ردلان، پریا دہلن منزداد فراسیاب، سکندر ودارا، شیریں و فرہاد، لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا، سکی پنوں، عمر ماروی، بے نظیر و بدر منیر اور بکا ولی و تاج الملوک کے افسانوں کی ہے۔ یہ افسانے بذات خود کسی حیثیت سے غیر معمولی نہیں ہیں۔ ان سے بہتر افسانے عظیم تر واقعات اور اہم موضوعات ہمیں اس کائنات میں نظر آتے ہیں لیکن غیر معمولی فن کاروں کی بدولت جو شہرت و قبولیت ان افسانوں کو حاصل ہو گئی وہ دوسرے واقعات یا افسانوں کو میسر نہ آئی۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شعری تخلیق میں صرف موضوع کو اہمیت حاصل نہیں ہوتی بلکہ موضوع کو برتنے کا سلیقہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلیقے کا دوسرا نام انداز بیان یا اسلوب ہے۔ یہ اسلوب فن کار کی شخصی قوتوں، اس کی تخیلی ندرتوں اور فنی مہارتوں کے سہارے ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہی کسی تخلیق کو ادنیٰ و اعلیٰ، وقتی و دائمی یا صحافتی و ادبی مرتبوں پر فائز کرتا ہے لیکن اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ موضوعات و واقعات یکسر غیر اہم ہوتے ہیں۔ یقیناً بعض موضوعات اہم بعض کم اہم اور بعض اہم تر ہوتے ہیں۔ صرف یہ کہ شاعری میں ان کی اہمیت کا انحصار عام طور پر دلکش فنی اسلوب پر ہوتا ہے کبھی اہم تر موضوعات شعر میں جگہ پا کر غیر اہم بن جاتے ہیں اور کبھی موضوعات اہم ترین محسوس ہونے لگتے ہیں۔ یہ کیوں کر ہوتا ہے اس کا جواب چنداں مشکل نہیں ہے۔ فن کار کی خوش ذوقی، فنی مہارت، بالغ نظری، جمالیاتی احساس، روایات کا پاس، مشاہدات و تجربات کا تنوع، قادر الکلامی اور ندرت فکر و خیال ایسی چیزیں ہیں جن کی بدولت ایک کم اہم موضوع شاعری میں اہم بن جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں جو چیز اہم ترین خیال کیے جانے کے لائق ہے وہ شاعری کی جذباتی صداقت ہے۔ جذباتی صداقت سے مراد فن کار کا اپنے موضوع سے وہ گہرا لگاؤ اور عقیدہ و اخلاص ہے جو اسے کسی موضوع کو شعر کا قالب دینے پر مجبور کرتا ہے۔ کوئی فن کار جب اس جہز اندروں کے ساتھ کچھ کہتا ہے تو موضوع ذہن سے گزر کر دل میں اتر جاتا ہے اور اس انداز سے کہ ”گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“۔ اب اس

اخلاص شدید یا جبر اندروں کو غالب کے لفظوں میں دل گداختہ کہہ لیجیے یا اقبال کی زبان میں خونِ جگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر نہ موضوع کی اہمیت محسوس ہوتی ہے اور نہ فن کی عظمت گویا کہنے والا جب تک خود اپنے جذبے اپنے تجربے اور اپنے موضوع سے متاثر نہ ہو وہ اپنے کلام سے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فلسفیانہ مضامین کو شعر کا موضوع بنایا جائے یا اخلاق و مذہب کو علوم معاشرتی کو زیر بحث لایا جائے یا تاریخی واقعات کو قدیم داستانوں اور تمدنی روایات کو نظم کیا جائے یا موجودہ سیاسی و سماجی مسائل کا اشتراکیت و اشتمالیت پر طبع آزمائی کی جائے یا سرمایہ داری و جمہوریت پر، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ کہا جائے اسے عقل و ذہن کی سطح سے اتار کر احساس و جذبہ کی گہرائیوں میں ڈبولیا جائے ورنہ اس کا رسمی بیان قادر الکلامی اور فنی مہارت کے باوجود بے اثر رہے گا۔ دنیا کی شاہکار نظموں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ موضوع سے گہری ذہنی وابستگی اور جذباتی لگاؤ کی بدولت بہت سے ایسے مذہبی موضوعات آفاقی اور ابدی بن گئے ہیں جنہیں ہم اپنی کج فہمی اور کوتاہ نظری سے طبقاتی یا ہنگامی خیال کرتے ہیں مثلاً ملٹن کے فردوسِ گم شدہ میں کھل کر عیسائیت کی تبلیغ کی گئی ہے۔ ورجل کی اینڈ میں روما کی برتری کا راگ الاپا گیا ہے۔ فردوسی کے شاہنامہ میں قدیم ایرانی شہنشاہیت کو اسلام کی جمہوری تحریک سے عظیم تر ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظامی کے سکندر نامے میں قبل مسیح کے ایک غیر مسلم یونانی فاتح کے کارناموں کو سراہا گیا ہے۔ تلسی داس کی رامائن میں بھگتی تحریک کو تقویت پہنچائی گئی ہے۔ ہمارے دور میں علامہ اقبال نے کھل کر اسلام اور اس کی برکات کو شاعری کا موضوع بنایا لیکن کس میں ہمت ہے کہ ان کی شاعرانہ عظمت و کمال سے انکار کر سکے۔ بات صرف یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ جذبِ اندروں سے مجبور ہو کر کہا ہے قلب و روح کی گہرائیوں میں اتار کر کہا ہے اور احساس کی پوری شدت کے ساتھ کہا ہے ان کے یہاں موضوع یا نظریہ کی نوعیت محض فلسفیانہ اور منطقی نہیں رہی بلکہ تخیلی اور جذباتی ہو گئی ہے۔ ان کا بیان و اعظانہ یا خطیبانہ ہونے کے بجائے فن کارانہ اور شاعرانہ ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا مذہب کسی ملا کا مذہب نہیں رہا بلکہ دنیا کے سارے صاحبانِ ذوق کی طمانیت و روح خیزی کا وسیلہ بن گیا ہے۔

ان حقائق کے باوصف ہمارے یہاں اکثر شعر تاریخی واقعات و سوانح و سیرت اسلامی تعلیمات و پیغامات اور اخلاقی موضوعات پر طبع آزمائی کرنا کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض ان موضوعات کو شعر و سخن کے لیے مہمل قرار دیتے ہیں۔ ان نام نہاد آزاد خیال شعرا کے نزدیک شاعری میں مذہب کا نام لینا تنگ نظری اس کا پیغام عام کرنا رجعت پسندی اور آنحضرت کی سیرت و سوانح

یا اسوہ حسنہ کو شعر کا موضوع بنانا غیر شاعرانہ بات ہے۔ ان کے خیال میں ملتی و مذہبی موضوعات کو وہی شعراء اپناتے ہیں جو عقائد و نظریات سے تعلق رکھتی ہے اس لیے غیر دلکش اور بے جان ہوتی ہے اس میں عوام کی دلچسپی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ ایسی شاعری صرف مسلمانوں کو مذہبی عقائد کے سہارے متاثر کرتی ہے۔ غالباً یہی خام خیالی ہے جس کے سبب ایک دو شاعروں کو چھوڑ کر اردو میں کسی نے اسلام اور اس کے عالمگیر پیغام کو راہ دینا پسند نہیں کیا۔ اس کے برعکس طول طویل خیالی افسانوں، صنیعاتی داستانوں اور غیر زبانوں کے بعض مذہبی، تاریخی اور نیم تاریخی نظموں کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ ملٹن کی فردوس گم شدہ کالیداس کی شکنلا اور کمار سنہو، فردوسی کے شاہ نامہ، نظامی کے سکندر نامہ، عطار کی منطق الطیر، مولانا روم کی مثنوی معنوی سب رس، باغ و بہار، افسانہ عجائب اور داستان امیر حمزہ تک کو ایک بار نہیں کئی بار اردو میں منظوم کیا گیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نقش اول سے نقش دوم کسی ایک جگہ بھی بہتر ثابت نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بہت کم لوگ ہیں جو اس قسم کے مترجم شاعروں کے نام سے بھی واقف ہوں۔ یہ بات نہیں کہ ان منظوم ترجمہ کرنے والوں میں شاعرانہ صلاحیتوں کی کمی تھی ایسا نہیں ہے۔ صرف یہ کہ تنقیدی رجحان نے ان کی نظموں میں وہ انفرادیت نہ پیدا ہونے دی جو ان کی شہرت و مقبولیت کا وسیلہ بن جاتی۔ اس کے برعکس جن شاعروں نے اپنی زمین آپ پیدا کی اور اپنے موضوع کا انتخاب آپ کیا انہیں یہی موضوعاتی شاعری ایسے بلند مقام پر لے گئی جہاں اللہ کی توفیق یاد آ جاتی ہے۔ اس لیے کسی ناقد کا یہ خیال کرنا کہ مذہبی شاعری یا نعت گوئی کو قبول عام نہیں حاصل ہو سکتا، کم نگاہی اور بے خبری کے سوا کچھ نہیں ہے جیسا کہ میں شروع میں کہہ چکا ہوں اردو میں نعت کے موضوع کو بعض شعراء نے بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ اس سلیقے کے ثبوت میں ایک دو شعر یا نظمیں نہیں بلکہ خاصا بڑا شعری ذخیرہ پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس ذخیرے کا ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف یہی نہیں کہ نعت گوئی کے رسمی لوازم کو پورا کرتا ہے بلکہ محاسن لفظی و معنوی کے لحاظ سے بھی شاعری کے مروجہ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔



نعتیہ مجموعوں میں تقاریر، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

ABSTRACT:

The article beneath contains assessment of Critical value of Forewords written by different critics on books of Naats. Appreciation of poetical beauty plus authenticity of content has been evaluated in order to judge the objectivity. The evaluation shows sympathetically written forewords and objective assessments of books by different critics. This study will help creating objectivity in the field of Criticism of genre of Naat.

مختلف ادوار میں محققین نے نعتیہ کتب کی فہرستیں تیار کی ہیں جن میں ہزاروں کتب کی طباعت کا ذکر ملتا ہے۔ پاکستان میں نعتیہ شاعری پر مشتمل کتابوں کے کوائف حفیظ تائب، راجا رشید محمود، غوث میاں، چودھری محمد یوسف ورک قادری اور محمد طاہر قریشی نے یکجا کیے ہیں۔ مؤخر الذکر دو حضرات نے دو کتب خانوں کے نعتیہ شعری خزانوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک نعت لاہری شہدہ، لاہور، اور دوسرا نعت ریسرچ سینٹر کراچی۔ ان فہرستوں میں چودھری محمد یوسف ورک قادری نے شائع شدہ نعتیہ شعری کتب کی فہرست بنائی ہے جن کی تعداد فہرست کی طباعت کے وقت تک ۱۶۰۶ تھی۔ میرے پیش نظر اس فہرست کا نقش ثانی ہے جس کی اشاعت اکتوبر ۲۰۰۶ء، میں عمل میں آئی تھی۔ اس فہرست میں کتب خانے میں موجود اور کتب خانے کو مطلوب کتب کو شامل کر لیا گیا ہے۔

محمد طاہر قریشی کی ”فہرست کتب خانہ، نعت ریسرچ سینٹر“ صرف ایک کتب خانے میں موجود کتب کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس فہرست میں ۱۳۳۸ کتب کا اندراج ملتا ہے۔ یہ فہرست پہلی مرتبہ ۲۰۰۹ء میں شائع کی گئی تھی۔

بقیہ حضرات کی فراہم کردہ تفصیل ان دونوں کاموں سے پہلے منظر عام پر آگئی تھی اس لیے اس

نعتیہ مجموعوں میں تقاریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

میں نعتیہ شعری سرمائے کی کیت ان فہرستوں کی اشاعت کے سن تک ہی محدود رہی اس لیے مؤخر الذکر دونوں فہرستوں ہی کو معیار بنا کر تعدادِ کتب کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے ان فہرستوں میں نعتیہ سرمائے کا معتد بہ حصہ چھوٹ گیا ہوگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعد میں بھی بہت سی کتب منظر عام پر آئی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نعتیہ شعری سرمائے کا بہت سا حصہ ہندوستانی کتب خانوں میں محفوظ ہوگا جس تک ہمارے تحقیق نگاروں کی رسائی ممکن نہ تھی۔ علاوہ ازیں پاکستان میں بھی ہر شہر، ہر قریے اور ہر صوبے میں نعتیہ کتب چھپ رہی ہیں لیکن سب کتب تک رسائی حاصل ہونا کسی ایسے فرد کے بس کی بات نہیں ہے جو اپنے ذوقِ کتب شاری سے سرشار ہو کر انفرادی طور پر کام کر رہا ہو۔

فی الحال ہمارا موضوع نعتیہ کتب کی فہرست سازی نہیں ہے۔ لیکن مطبوعہ کتب کی تعداد جاننے سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گیا کہ اس مقالے کے بابِ چہارم پر قلم اٹھاتے ہوئے ہمیں کتنے دیباچوں، تقاریظ اور مقدموں کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ تقریباً ہر کتاب میں کم از کم ایک دیباچہ، تقریظ یا مقدمہ تو ہے ہی۔ بہت سی کتب ایسی بھی ہیں جن میں ایک سے زیادہ اہل علم کی تحسینی آراء (appreciative opinions) موجود ہیں۔ ایسی صورت میں مقدموں، دیباچوں یا تقاریظ کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ظاہر ہے وہ ساری کتب نہ تو پڑھی جاسکتی ہیں اور نہ ہی سب کتب کے دیباچوں، تقاریظ اور مقدموں کا تجزیاتی مطالعہ کرنا ہمارے بس میں ہوگا۔ اس لیے شروع ہی میں عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس باب میں ہمارا طریق کار انتخابی (Selective) ہوگا۔

تجزیاتی مطالعہ شروع کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مقدمہ، دیباچہ اور تقریظ کی حدود کا تعین کر لیا جائے تاکہ ان اصطلاحات کے استعمال میں ہمیں کہیں الجھن پیش نہ آئے۔

مقدمہ

مقدمہ کا لفظ ہمارے ہاں کتاب کے جملہ محاسن کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ اس لفظ سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ یہ لفظ اس تحریر کے لیے مستعمل ہے جو کتاب کے اصل متن کے آغاز سے پہلے کتاب کے بارے میں اختصاراً کچھ معلومات فراہم کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ مقدمہ خود مصنف لکھتا ہے لیکن زیادہ تر مقدمہ لکھنے کے لیے کسی دوسری معروف شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ہمارے دینی، ادبی اور تاریخی ادب میں مقدمہ کا لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مقدمہ ابن خلدون تو خود ہی ایک مکمل تصنیف ہے جو تاریخ ابن خلدون سے زیادہ مشہور ہوا اور پڑھا گیا۔ ابن

خلدون کے نام سے علامہ اقبال یاد آ گئے۔ روزگارِ فقیر میں لکھا ہے کہ فقیر سید نجم الدین نے علامہ سے عرض کی کہ میں نے انہیں اپنے بیٹے (فقیر وحید الدین) کو تاریخ ابنِ خلدون پڑھنے کا مشورہ دیا ہے، تو اقبال نے فرمایا:

”پوری کتاب نہیں، صرف مقدمہ“۔ ۳

دوسری مثال اردو ادب میں ”مقدمہء شعر و شاعری“ کی ہے، جو خواجہ الطاف حسین حالی نے لکھا اور اردو تنقید کا پہلا شاہکار ثابت ہوا۔

اردو کی ادبی تاریخ میں مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اتنے مقدمے لکھے کہ ان کی یکجا طباعت ہوئی تو ایک ضخیم کتاب بن گئی جس کا نام ہی ”مقدماتِ عبدالحق“ رکھا گیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مقدمے کے لیے کچھ لوازم و عناصر کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن مقدمہ ان کے نزدیک ادب کی کوئی مستقل صنف نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مقدمہ نگاری کی حیثیت کسی مستقل صنفِ ادب کی نہیں ہے۔ کسی زبان کے ادب میں بھی اس کو ادب کی ایک باقاعدہ شاخ نہیں سمجھا گیا ہے کیوں کہ مقدمے تو کسی مصنف یا کسی کتاب کے بارے میں محض تعارف کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔“ ۴

مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شروانی نے اشارۃً ذکر کیا ہے کہ مقدمہ ”مقدمۃ الجیش“ سے ماخوذ ہے۔ ۵..... مقدمۃ الجیش لغوی اعتبار سے وہ لشکر ہوتا ہے جو آگے بھیجا جاتا ہے جسے پیشرو لشکر، ہراول فوج بھی کہتے ہیں۔ سپہ سالار کو بھی اسی لیے مقدمۃ الجیش کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت فوج میں سردار اور رہنما کی ہوتی ہے۔

اردو لغت بورڈ کی مرتب کردہ لغت میں مقدمہ کے معانی اس طرح لکھے ہیں: مقدمہ [ضم م، فت ق، شد د بفت، فت م] (i) وہ مضمون جو کتاب وغیرہ میں متن سے پہلے فہم مطالب میں آسانی کی غرض سے بطور پیش لفظ بیان کیا جائے، دیباچہ کتاب، عنوان۔ (ii) وہ امر جو اصل مقصد سے پہلے تمہیداً ہو، پس خیمہ۔ (iii) وہ بات یا مسئلہ جس کے جانے بغیر زیرِ نظر بحث سمجھ میں نہ آ سکے، وہ امر جس پر زیرِ بحث موضوع کا سمجھنا سمجھانا منحصر ہو، مبادی..... بقیہ معانی قانونی اصطلاحات کے تحت دیئے گئے ہیں جس میں نالش اور مقدمہ بازی وغیرہ کا حوالہ آتا ہے۔ مقدمہ کے ”د“ کو کسرہ کے ساتھ پڑھیں تو معانی یہ ہوں گے: ۱. آگے جانے والا [شخص یا گروہ وغیرہ] خصوصاً لشکر کا وہ حصہ جو آگے بھیج

دیا جائے، ہر اول دستہ۔ ۱۔ مقدمہ کی نوعیت کے حوالے سے شروانی صاحب لکھتے ہیں:

”آپ جب کاروبار کے کسی ممتاز مرکز پر گزریں گے تو دیکھیں گے کہ دوکانوں کے سامنے کا ایک حصہ سلیقے اور دل فریب طریقے سے آراستہ سب سے اول دیدہ نواز ہوگا۔ یہ اپنی دل فریبی سے نگاہ کو اپنی جانب متوجہ کرے گا اور متوجہ ہونے پر جب نگاہ تفصیل کی جو یا ہوگی تو وہ بتائے گا کہ آپ کو جو جنس دوکان میں ملے گی وہ کیا ہے، بعینہ یہ حال کتاب کے مقدمہ کا ہے کہ وہ آپ کو دل کش طریقے سے بتاتا ہے کہ کتاب میں کیا ہے۔“

مقدمہ نگار کے لیے شروانی صاحب نے راست نگاری کی شرط لگائی ہے جو [الف] سلیقہ اور [ب] تفصیل، کی صورت میں پیش کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں:

”لکھنے میں اس کا سلیقہ ہو کہ دل کش پیرایے میں کیا لکھا جائے اور کیا نہ لکھا جائے، کتاب کا کونسا حصہ نمایاں کیا جائے اور کونسا مخفی رہے، تفصیل ایسی ہو کہ کتاب پڑھنے کے بعد مایوسی نہ ہو بلکہ یہ اعتراف ہو کہ مقدمہ نگار راست نگار تھا۔ اگر مقدمہ نگار مطالب کتاب میں ترقی پیدا کر سکے اور پڑھنے والوں کے لیے مناسب موقع مزید معلومات بہم پہنچائے، اس طرح کہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کتاب پڑھوار ہا ہے تو اس کو کمال مقدمہ نگاری ماننا چاہیے۔“

تقریظ: [فت، ت، سک، ق، ی، مع] کے لغوی معنی ہیں (i) مصنف کے علاوہ کسی اور کا کسی کتاب یا مضمون وغیرہ پر اپنی رائے ظاہر کرنا [عام طور پر تعریفی اور تائیدی رائے] جو کتاب کے آغاز یا اختتام میں شامل ہو۔ (ii) تعریف، زندگی کی تعریف، ساتھی یا دوست کی تعریف [خواہ راست ہو خواہ دروغ]۔ (iii) داد دینا، سراہنا۔ ۹

دیباچہ: [ی، مع، فت، ج] (i) وہ تحریر جو کسی کتاب کے شروع میں ہو اور جس میں نفس مضمون وغیرہ سے متعلق یا دوسری ضروری باتیں بطور تعارف کتاب کے لکھی گئی ہوں۔ مترادف: مقدمہ، کتاب، پیش لفظ، تعارف، تمہید۔ (ii) دیوان کے شروع میں مصنف کا خود تحریر کردہ اشعار کا وہ مجموعہ جو حمد، نعت، مدح یا سبب تالیف وغیرہ پر مشتمل ہو۔ (iii) زمانہ قدیم میں کتابوں کے سرورق کی زیبائش، سرورق پر اس کی خوبصورتی کے لیے بنائے گئے بیل بوٹے۔ (iv) کسی چیز کا پہلا اور لازمی جزو، کسی چیز کے لیے پہلی شرط۔ (v) کسی چیز کا ابتدائی حصہ، ابتدائی دور، پہلا زینہ، تمہید۔ (vi) پیش

خیمہ، کسی چیز کے ظہور کی علامت۔ (vii) مجازاً، سب سے پہلا شخص، سب سے پہلی چیز۔ ۱۰۔
مقدمہ، تقریظ اور دیباچہ، کے الفاظ عموماً ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔ غالباً اسی لیے احمد ندیم قاسمی نے لکھا تھا:

”دیباچہ، مقدمہ، تمہید، پیش کلام، پیش لفظ، تعارف وغیرہ کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق، کم سے کم اردو کتابوں کی حد تک روا نہیں رکھا گیا۔ یہ لکھنے والے پر موقوف ہے کہ کتاب یا مصنف کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کا کیا عنوان رکھتا ہے۔“ ۱۱۔

سر دست ہمارا یہ موضوع نہیں، اس لیے صرف اتنا عرض کر کے ہم سلسلہء کلام کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ’مقدمہ‘ کسی تصنیف کے ذرا تفصیلی تعارف کو کہتے ہیں۔ ’دیباچہ‘ مقدمے سے مختصر ہوتا ہے اور ’تقریظ‘ محض اشتہار کے طور پر تحسینی کلمات پر مبنی عبارت پر مشتمل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر معین الرحمن کی ایک تحریر کا اقتباس دینے سے ہمارا موقف زیادہ واضح ہو سکتا ہے ”مقدمات عبدالحق پر ایک نظر“ کے زیر عنوان، وہ لکھتے ہیں:

”مقدمات عبدالحق، تقریظ نگاری کے نمونے نہیں۔ ان سے کسی ادیب یا شاعر کی غیر ضروری تشبیر مقصود نہیں۔“ ۱۲۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سید معین الرحمن ’مقدمہ‘ کو ’تقریظ‘ سے نہ صرف ممتاز کرتے ہیں بلکہ اسے مؤخر الذکر سے اعلیٰ چیز جانتے ہیں۔ با ایں ہمہ، اردو کی کتابوں میں ان الفاظ (مقدمہ، دیباچہ، تقریظ) کے استعمال میں اور ایسی تحریروں میں جو کسی کتاب کے تعارف کے طور پر لکھی گئی ہوں، کوئی معنوی اور اصولی حد بندی نظر نہیں آتی ہے۔ اسی لیے احمد ندیم قاسمی نے عنوان رکھنے کا حق ’لکھنے والے، کوسونپ کر، دیباچہ، مقدمہ، تمہید، پیش کلام، پیش لفظ اور تعارف وغیرہ کے الفاظ کو مترادفات کے طور پر قبول کر لینے کا جو عندیہ ظاہر کیا ہے اس کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ ۱۳۔

اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ ہم ”کتب نعت میں دیباچوں اور تقارین کا تنقیدی معیار“ جاننے کا آغاز کر سکیں۔

ہمارے عہد کے معتبر نعت گو حفیظ تائب کی نعت گوئی پر ”تقدیم“ کے زیر عنوان ڈاکٹر خورشید رضوی نے جو تنقیدی رائے دی ہے اس کا تجزیاتی مطالعہ اس باب کی ابتدا کے لیے مناسب رہے گا۔

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

واضح رہے کہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی تحریر مختصر ہے اس لیے میں اسے دیباچے کے ذیل میں رکھ کر دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں:

”صلو علیہ وآلہ“ کی نعتوں میں وہ سارا سلیقہ صرف ہوتا نظر آتا ہے جو جناب حفیظ تائب نے دورِ غزل گوئی میں حاصل کیا تھا۔ کتاب کا اولین قصیدہ ”آیہ نور“ خاصے کی چیز ہے، جو مولانا حالیؒ کے قصیدہ نعتیہ کی زمین میں ہے، جس کا مطلع ہے:

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور مجھ سے انھیں گے ان کے ناز ضرور

مولانا نے تشبیب کی جگہ تعلیٰ کا طویل ابتدائیہ باندھا ہے (جسے انہوں نے از روئے انکسار، ماضی کے ”ہدایات“ میں شمار کیا ہے) اور پھر گریز کر کے ”نعت سرورِ جمہور“ کی طرف آئے ہیں۔ جناب حفیظ تائب نے گریز سے گریز کرتے ہوئے ابتداء ہی اصل مدعا سے کی ہے:

جب کیا میں نے قصیدہ نعت حضور ہوئے یکجا شعور و تحت شعور

پھر ”نور“ و ”حضور“ و ”سرور“ کے قوافی سے گزرتے ہوئے ان کا توسل طبع غزل کی روش پر چل پڑتا ہے مگر موضوع سے ہٹے بغیر:

اس کی خدمت میں کچھ برنگِ غزل بہ امید قبول و قرب و حضور

اور اس موجِ خرام سے ”دور“ کی ردیف اور ”یار“ اور ”قرار“ کے قوافی کی راہ نکالتا ہے:

آبِ جو کی طرح ہو سرگرداں نکل آیا ہوں کوہسار سے دور

اک گلِ حیرت و ملال ہوں میں مسکرایا ہوں شاخسار سے دور“ ۱۴

ڈاکٹر خورشید رضوی کے اس اندازِ تحسین (appreciation) میں ان کا تنقیدی شعور بھرپور طور

سے جھلک رہا ہے۔ یہاں انہوں نے غزل کے فنی سلیقے کی بات کی ہے جس کی کامل آگاہی نے ان کے مدوح کو نعتیہ شعری دنیا میں وقار بخشا ہے۔ پھر قصیدے کے لوازم کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے انہوں نے حفیظ تائب کے قصیدے کا موازنہ خواجہ الطاف حسین حالی کے قصیدے سے کیا ہے اور اس میں بتایا ہے کہ فنی اعتبار سے تائب نے قصیدے کا گریز والا حصہ ابتداء ہی میں حذف کر دیا اور براہِ راست اصل مدعا ان کے قلم کی زبان پر آ گیا ہے۔

قصیدے کے فنی لوازم میں ”تشبیب“، ”گریز“، ”مدح“ اور ”دعا“ ۱۵ کا خاص اہتمام کیا جاتا

رہا ہے لیکن نعتیہ قصیدے میں تائب نے نہ تو تشبیب میں بہاریہ انداز اختیار کیا اور نہ ہی انہیں گریز کے مرحلے طے کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ بغیر طول طویل تشبیب کے انہوں نے نعت کہنے کے ارادے کا ذکر کیا اور اللہ تعالیٰ کے لطف اور حضرت محمد مصطفیٰ کے کرم کا تذکرہ چھیڑا:

روح ممدوح دستگیر ہوئی شامل جاں تھا لطف رب غفور ۱۶

تائب کی اس روش کا ذکر 'تقدیم' میں اختصار سے کر کے ڈاکٹر خورشید رضوی نے اپنے تنقیدی منہاج اور شعور نقد کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حالی کے قصیدے سے تائب کے قصیدے کا موازنہ کرنے کا خیال بھی خورشید رضوی کی تنقیدی روش کا حصہ بنا جس سے تائب کے قصیدے میں تعلیٰ کے مرض سے بچنے کا قابل تحسین پہلو بھی سامنے آ گیا۔ دراصل حالی کا قصیدہ تفاخر کے جذبے سے مملو تھا جسے انہوں نے نعتیہ اشعار پر ختم کر کے فخر کے لیے جواز پیدا کرنے کی سعی کی۔ حالی نے لکھا ہے:

”جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر تنبیہ ہوا لہذا قصیدے کا

خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔“ ۱۷

حالی کا قصیدہ ”پچھتر اشعار پر مشتمل تھا جبکہ حفیظ تائب نے کل اسی اشعار کہے۔ لیکن حفیظ کے تمام اشعار مدح مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہیں جبکہ حالی کے قصیدے میں تفاخر کی تمہید کے اکتالیس اشعار شامل تھے جن کی اپنی کلیات نظم میں موجودگی، خود حالی کو کھٹک رہی تھی اسی لیے انہوں نے نعتیہ قصیدے کے نیچے نوٹ نوٹ دینا ضروری جانا تھا۔

خورشید رضوی نے ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جس سے حفیظ تائب کے شعور نقد پر روشنی پڑتی ہے۔ حافظ افضل فقیر نے تائب کے ایک شعر میں لفظ ”حاصل“ سے بے اطمینانی ظاہر کی تھی۔ کچھ عرصے بعد تائب نے ”حاصل“ کو ”غایت“ سے بدل کر انہیں سنایا اور انہوں نے اتفاق فرمایا کہ واقعی لفظ ”غایت“ ہی وہ غایت تھی جس تک طائر خیال رسائی چاہتا تھا اور پھر کہا:

”مولانا! تمہاری جستجو کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔“ ۱۸

ان دونوں اشعار کی خواندگی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے شعر میں کتنی شعریت پیدا ہو گئی اور معنوی حسن کتنا بڑھ گیا:

وہ کہ ہے سوز و ساز نبضِ حیات وہ کہ ہے حاصلِ سنین و شہور

وہ کہ ہے سوز و سازِ نبضِ حیات وہ کہ ہے غایتِ سنین و شہور ۱۹

اس شعر میں ”حاصل“ کا لفظ تائب کے ممدوح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات والا

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

صفات کو سنیں و شہور کی پیداوار ظاہر کر رہا تھا [حاصل کے لغوی معانی کھیتی کی پیداوار ہیں] جبکہ ”غایت“ [لغوی معانی، غرض، مقصد، مطلب] کے لفظ نے سنیں و شہور [سال و ماہ] کے وجود کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ باجود کا صدقہ بنا کر پیش کیا جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجہ وجود کائنات ہونے کی دلیل ہے جس کا ذکر احادیثِ قدسی میں آیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے لکھا ہے:

”تائب صاحب کے نعتیہ کلام کے چند در چند خصائص میں ایک نمایاں

خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے نعت کو بار بار کے دہرائے ہوئے مضامین

سے نکال کر اس کے عمق، وسعت اور تنوع میں اضافہ کیا۔“ ۲۰

حفیظ تائب کی بعض تراکیب کو سراہتے ہوئے ڈاکٹر خورشید نے لکھا:

”نادرہ کاری ان کی بعض تراکیب میں بھی نظر آتی ہے، مثلاً اے ہادی دارین،

مقدر گر آفاق..... میں ’مقدر گر آفاق‘ کی گہرائی اور بلاغت کو دیکھیے۔ اسی

طرح یہ دل نشین شعر ملاحظہ ہو، جس میں ’روانِ خیر‘ کی ترکیب بطور خاص

لائقِ توجہ ہے:

وہ تاب جاں، سحابِ کرم، انتخابِ حق وہ شانِ فقر، آنِ تمدن، روانِ خیر ۲۱

حفیظ تائب کے کلام میں فنی نکات کی نشاندہی کرتے ہوئے ”تقدیم“ نگار نے درج ذیل شعر

پر جو رائے دی ہے اس سے ان کی آگاہی فن اور تحسین شعر کا تنقیدی سلیقہ مترشح ہے:

باتیں آقا کی سناتا ہے اُحد اس کے دامنِ صفا میں گم ہوں

ڈاکٹر خورشید رضوی نے لکھا:

”اُحد کے ساتھ لفظ صفا کی مناسبت قابلِ دید اور لائقِ داد ہے کہ ایک

طرف کوہِ صفا کا ایہام پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف صفا بمعنی مودت و

اخلاص کے حوالے سے فرمانِ نبوی ’اُحد، جبلُ بَحْبَنَا و نَحْبُہ‘ [احد ایسا

پہاڑ ہے کہ وہ ہم سے محبت رکھتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں] کی تلمیح

جھلکتی ہے۔“ ۲۲

معنوی خوبیوں کے یہ نکتے بیان کرنے سے ڈاکٹر خورشید رضوی کا مقصد، حفیظ تائب کے کلام کی

تنقیدی سطح پر پسندیدگی کا جواز پیش کرنا ہے۔ اس طرح ان کی لکھی ہوئی تقریظ یا دیباچہ، جسے انہوں نے

”تقدیم“ کا عنوان دیا ہے، ایک ایسی تحریر مانی جائے گی جس میں بلا جواز تحسین نہیں ہے بلکہ دیباچہ نگار کا

دعویٰ تنقیدی شعور کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ بھرپور دلائل سے باوزن بھی بنایا گیا ہے۔ بلاشبہ حفیظ تائب کے کلام میں ایسی معنوی اور فنی خوبیاں ہیں جن سے ان کا شعر عقیدت شعریّت سے ہم کنار اور شریعت کے بھرپور احترام سے مملو لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خورشید رضوی کی لکھی ہوئی ”تقدیم“ کتاب کا متوازن تعارف ہی معلوم نہیں ہوتی بلکہ کتاب اور تقریظ نگار کا وقار بھی بڑھاتی ہے۔

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم“، حنیف اسعدی کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں کچھ تفسیمیں بھی ہیں۔ سحر انصاری کی ایک تعارفی تحریر بعنوان ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیمیں“ اس کتاب کی زینت بنی ہے۔ سحر انصاری کی تقریظ کے تنقیدی نکات اور ان نکات کی معروضیت جاننے کے لیے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

”جہاں تک فن تفسیم کا تعلق ہے اس پر حنیف اسعدی کو غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ دراصل تفسیم کئی شرائط کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک تو اصل کلام جس نوعیت کا ہے اس کی مناسبت سے مصرعے لگائے جائیں۔ دوسرے اصل کلام کی تشریح بھی ہوتی چلی جائے اور جو رموز اس میں پنہاں ہیں ان کی تفہیم کا زاویہ بھی نکل آئے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ ساری تفسیمیں محسوس میں لکھی گئی ہیں۔ اس ہیئت میں تیسرے مصرعے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جو ماسبق دو مصرعوں اور آئیو الے دو مصرعوں کے مابین ایک محکم ربط پیدا کرتا ہے۔ اس سے تفسیم نگار کی فنی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے حنیف اسعدی کی تفسیمیں ایک تخلیقی شان رکھتی ہیں۔ ان میں شگفتگی بھی ہے، حسن بیان بھی اور فنی خوبیوں کا لطف بھی.....

شبّہم رومانی کے اس شعر پر تفسیم دیکھیے:

خیر ہیں خیر کی آخری حد بھی ہیں	باعث کن بھی ہیں کن کا مقصد بھی ہیں
خود بھی حامد ہیں ممدوح سرمد بھی ہیں	آپ احمد بھی ہیں اور محمد بھی ہیں

حمد ہے لازمی جز و نام آپ کا ۲۳

سحر انصاری کی تقریظ میں جو فنی نکات بیان کیے گئے ہیں ان کی تصدیق حنیف اسعدی کی تفسیم کے محولہ بالا نمونے سے بھی ہو رہی ہے اور حنیف اسعدی کا دیگر کلام بھی اس رائے کی اصابت پر دال ہے۔ کچھ مزید شعری نمونے دیکھنے سے اس نکتے کی وضاحت ہو جائے گی۔ مثلاً قدسی

کے ایک شعر کی تفسیر ملاحظہ ہو:

یہی کہتے ہیں زمانے کے بدلتے حالات نہ طلب ہی کو بقا ہے نہ تمنا کو ثبات
ہے فقط امتِ عاصی کے لیے ایک ہی ذات ”ماہمہ تشنہ لبانیم و توئی آبِ حیات

لطف فرما کہ زحمتی گزر دشنہ لبی ۲۴

بیدم وارثی کے شعر پر تفسیری عمل دیکھیے:

خوشا کہ مجھ کو بھی نعتِ نبی کا اذن ملا نصیب وجد میں ہے قص میں ہے فکرِ رسا
گلے لگاؤں تجھے اے شعورِ مدح و ثنا ”بلائیں لوں تری اے جذبِ شوقِ صلِ علی

کہ آج دامنِ دل کھینچ رہا ہے سوئے رسول ۲۵

تفسیر کا یہ نمونہ بھی قابل ستائش ہے۔ اس لیے ہم سحر انصاری کی تقریظ کو معتدل تقریظ کے طور پر قبول کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں، حفیظ تائب نے جو فلیپ لکھا ہے وہ بھی فن شناسی اور مقامِ نعت سے آگاہی کا ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”حنیف اسعدی ایک باکمال شاعر ہیں اور منطق و بیان کی جمالیات سے پوری طرح بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ مضامین نعت کا ادراکِ خاص رکھتے ہیں۔
ادب و آگہی کے امتزاج نے انہیں وہ لہجہ جمیل عطا کیا ہے جو ان کا امتیاز
ہے وہ روحِ عصر اور ذوقِ جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔“ ۲۶

ہمارے خیال میں ان تقریظی تحریروں کو ’متوازن تقارین‘ قرار دیں تو یہ سخن فہمی ہوگی غالب کی طرف داری قطعی شمار نہیں ہوگی۔ تابش دہلوی کی کتاب ”تقدیس“ کی نعتیہ شاعری پر ”تلاشِ جلوہ حرفِ پاس“ کے زیر عنوان دیباچہ لکھتے ہوئے ڈاکٹر سید محمد ابو الخیر کشفی نے لکھا:

”تابش کے کلام میں زبان و بیان کی جو رمز شناسی ہے، الفاظ کے بطون میں پہنچ کر معانی کے گہر تلاش کرنے کا جو رجحان ہے، برہنہ گفتاری کی جگہ رمز و ایما سے ان کی جو وابستگی ہے، الفاظ اور مفہم و جذبات کے درمیان وحدت پیدا کرنے کی جو اہلیت ہے، لفظوں کو ہشت پہلو نگینوں کی صورت جڑنے اور انہیں شمع کی طرح روشن کرنے کی جو قدرت ہے، ان سب کا مقوم و مقدر یہ تھا کہ یہ سب خوبیاں اور قدرتیں، نعتِ سرور کو نین کے سلسلے میں ان کے کام آئیں۔ تابش کے سفینہ فن کو آخر ساحلِ محمدی مل گیا..... ہر زندہ چیز

کی طرح ہمارے خن کو بھی اپنی منزل کی تلاش رہتی ہے۔“ ۲۷

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، کی درج بالا رائے کو ہم ”تاثراتی تنقید“ کہہ سکتے ہیں۔ تاثراتی تنقید میں لطافتِ احساس کی وجہ سے کچھ تخلیقی شان پیدا ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہ تنقید تحسین محض بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر کشفی نے ”تقدیس“ کی قرأت کے بعد جو تاثر قائم کیا ہے وہ نری تحسین پر مبنی نہیں ہے کیوں کہ ان کا دعویٰ، تابشِ دہلوی کے کلام میں پائی جانے والی خوبیوں کی قوی دلیل بھی رکھتا ہے۔ خود ڈاکٹر کشفی نے ”تقدیس“ میں شامل کلام سے شاعری کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ اچھے شعری نمونے ہیں، مثلاً:

محور ہستی فقط ذاتِ رسول دین و دنیا مصطفیٰ تا مصطفیٰ

نظم ہستی میں توازن کے لیے ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ ۲۸

مؤخر الذکر اشعار پر گفتگو کا سلسلہ دراز کرتے ہوئے کشفی نے ان اشعار کے متن کو ہمارے نعتیہ شعری سرمائے کی روشنی میں بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے اور قرآن کریم کی آیات کے تناظر میں بھی انھیں پرکھنے کی سعی کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

”ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ، مقامِ نبوی سے آگہی کا اظہار اس قوت سے

غالب و اقبال کے بعد مجھے تابش کے ہاں اس طرح نظر آیا ہے:

تیر قضاہر آئینہ از ترکش حق است لیکن کشود آں ز کمانِ محمد است

(غالب)

بمصطفیٰ برسوں خویش را کی دیں ہمہ لوست اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

(اقبال)

آئیے اب ذرا ”دین و دنیا مصطفیٰ تا مصطفیٰ، اور ساری دنیا اور تنہا مصطفیٰ، کا مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں کریں..... سورہ فتح میں سلسلہ کلام یہ ہے کہ وہ اللہ ہی تو ہے جس نے ہدایت اور دین حق کے ساتھ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا تا کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے..... اور اس کے فوراً بعد ارشاد ہوتا ہے: وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيداً۔ یعنی ”اللہ کی گواہی کافی ہے“ اور اللہ کی شہادت کے بعد ہی فرمایا گیا کہ: ”محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ کے رسول ہیں۔“ سورہ سبا میں ارشاد فرمایا جاتا ہے: وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا۔ ”اور اے محمد ہم نے تم کو عالمِ انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔“ یہی بشارت اور یہی تنذیر نظم ہستی میں توازن کی اساس پر ہے۔ اور وہی ذات

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

محور ہستی ہو سکتی ہے، جس کے لیے فرمایا گیا کہ اللہ رسول پر شاہد ہے اور رسول مومنوں پر شاہد ہیں..... اور یہ شہادت ابدی ہے۔“ ۲۹

درج بالا اقتباس میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی تنقیدی دانش کا بھرپور اظہار ہوا ہے اور بڑے توازن کے ساتھ۔ تحسین (Appreciation) کے اس عمل میں ڈاکٹر کشفی نے شعر کی معنوی ساختوں کو پرت پرت دیکھنے اور معنویت کی لمعات کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ بلاشبہ خیال کی معنوی رفعت نے تابش کے شعروں کو غالب و اقبال کے معنوی قوس میں بھی جگہ دی ہے اور قرآنی فکر کے نورانی ہالے میں بھی داخلے کا موقع فراہم کیا ہے۔ علاوہ ازیں شعری بخت کے سلیقے اور تقلیل الفاظ میں وسیع مضمون کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کے باعث بھی اردو نعتیہ شعری عمل میں تابش کے اشعار نمایاں ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے فدا خالدي دہلوی کے مجموعہ ”نعت“ (م۔ ص) پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھا تھا:

”حم و نعت کا میدان عقیدت کے اظہار کا ذریعہ تو ہے ہی، اس میں فن کی نزاکت اور نفاذت کا احساس بھی قائم رہے تو پھر یہ کلام صرف عام پسند نہیں رہتا، خاص پسند بلکہ خواص پسند ہو جاتا ہے۔ اس مجموعے میں بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اپنی فنی مہارت کے اعتبار سے بھی قابل ذکر ہیں۔“ ۳۰

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی یہ مختصر رائے بھی کلام کی فنی خوبیوں کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ کیونکہ، م۔ ص، میں شامل تمام کا تمام کلام شاعری کے کلاسیکل مزاج کا آئینہ دار، عشق نبوی کے شدید جذبے کا عکاس اور بیان کی سادگی و پرکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ چند اشعار کی خواندگی سے میرے احساس کو زبان مل سکے گی:

لگی دل کی انہیں آخر مدینے تک اڑالائی	بھڑک لٹھے تھے جن کے دل پہ پہلنے کہل جاتے
تمہارے نام لیوا ہیں، تمہیں سے حل کہتے ہیں	ہم اپنی داستانِ درد دہرانے کہاں جاتے
تمہاری رہنمائی کا سہارا گر نہیں ملتا	تو یہ بھٹکے ہوئے انسان خدا جانے کہل جاتے ۳۱

☆☆

اے کاش پہنچ جاؤں درِ سرور دیں تک	ایسا نہ ہو رہ جائے یہ افسانہ یہیں تک
آنکھوں میں لیے پھرتا ہوں طیبہ کے مناظر	یہ نور کی دنیا ہے مرے ذوقِ یقیں تک ۳۲

☆☆

رخ ہے طرفِ روضہ سرکارِ مدینہ جاتا ہے کوئی جانبِ دربارِ مدینہ ۳۳



جب سے فدا ہوئے ہیں سرکارِ دو جہاں پر آزاد ہو گئے ہیں دنیا کی برہمی سے ۳۴

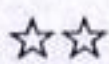


ہے کیسا سلیقے کا میخانہ محمد کا بہکانہ کبھی پی کرستانہ محمد کا ۳۵
فدا خالدي کی کتاب ”م۔ص“ میں نعتیہ غزلیں، نعتیہ رباعیات، نعتیہ پابند نظمیں، نعتیہ قصیدہ،
نعتیہ مسدس جیسی اصنافِ سخن کی موجودگی اس بات کی بین دلیل ہے کہ شاعر کا مزاج اردو کی کلاسیکی
شعری اصناف سے بھرپور مناسبت رکھتا ہے۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی کی رائے بھی دیکھیے:

”ان (فدا خالدي دہلوی) کے مجموعے کے مطالعے سے نہ صرف ان کے
زبان و بیان کی شائستگی، قدرت اور غیر معمولی حسن کا اندازہ کیا جاسکتا ہے
بلکہ ان کے خیال کی لطافت اور بلاغت کا بانگن اور جمال دلوں میں اللہ کے
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے شیفستگی کا جذبہ پیدا کر کے محبت اور سرشاری کی وہ
کیفیت بیدار کرتا ہے کہ انسان دولتِ ایمان سے بہرہ ور ہو جاتا ہے اس کا
دل عشقِ رسول کی بے تابی کا محور بن جاتا ہے۔ جناب فدا خالدي دہلوی،
حضرت بیخود دہلوی کے شاگرد ہیں اس لیے زبان و بیان پر انہیں مہارت
تامہ اور قدرت کاملہ حاصل ہے۔ جہاں وہ دیگر اصناف، نظم، غزل، رباعی وغیرہ
میں اپنی عظمتِ فن کا لوہا منوا چکے ہیں ان کا زیرِ نظر مجموعہ ”نعت ”م۔ص“
ان کی شاعرانہ عظمت اور نبی اکرم سے ان کی بے پناہ عقیدت اور محبت کا
آئینہ دار اور قابلِ قدر شاہکار ہے۔“ ۳۶

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی کی آراء کی روشنی میں فدا خالدي کے چند
اشعار کی خواندگی سے ہی ہمیں شاعر کے کمالِ فن اور جمالِ بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے:

درازی شامِ غم کی مختصر ہو پہنچ جاؤں مدینے تو سحر ہو
بھٹک سکتا نہیں راہِ وفا میں تمہاری یاد جس کی راہبر ہو
نہ آئیں آپ، وہ مجھ کو بلائیں کوئی تدبیر جینے کی مگر ہو ۳۷



نعتیہ مجموعوں میں تقاریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

آشکارا عظمتِ خیرالبشر ہوتی گئی رخ جدھران کا ہوا دنیا ادھر ہوتی گئی
رفتہ رفتہ ہر حجابِ درمیاں اٹھتا گیا شامِ غم ڈھلتی گئی، پیدا سحر ہوتی گئی ۳۸

☆☆

نام لے کر ان کا گزرا ہر کٹھن منزل سے میں سامنے دیوار جو آئی وہ در ہوتی گئی
ہر نفس راہِ مدینہ میں سکوں ملتا گیا ہر قدم ان کی محبت راہبر ہوتی گئی
تذکرہ آپ کا گفتگو آپ کی زندگی بن گئی آرزو آپ کی
جتنی سیرت نظر سے گزرتی گئی اور بڑھتی گئی جستجو آپ کی ۳۹
فدا خالدي کے شعر عقیدت کی فنی خوبی، بیان کی صفائی، خیال کی پاکیزگی اور اظہار کی نفاست
دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ نقادانِ ادب کی جو آراء ہم نے درج کی ہیں وہ بالکل معروضی آراء ہیں۔
ان آراء کو پڑھ کر یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ ناقدین نے مروتاً کچھ لکھ دیا ہو۔

وقار صدیقی اجمیری کے مجموعہ نعت ”حرف حرف خوشبو“ پر ”نعت کے نئے افق“ کے زیر
عنوان ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی نے لکھا:

”نعت گو شاعر ہر لفظ کو اسی طرح پرکھتا ہے جیسے جوہری ہیرے کو اور پھر
ہشت پہلو الفاظ کے ہیروں سے نعت کا ہار خلوص کے دھاگے سے پروتا ہے۔
نعت کے الفاظ میں خلوص، گہری معنویت، تہہ داری، عظمت، عشق، فکر، روانی
اور ایک دوسرے سے ہم آہنگی کا اجتماع ضروری ہے۔ وقار صدیقی اجمیری
کے الفاظ میں یہ آٹھوں پہلو مجھے جگمگاتے نظر آئے ہیں۔ وہ ہر لفظ کو امانت
اور ودیعتِ عشق دوست سمجھتے ہیں۔“ ۴۰

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی درج بالا رائے دیکھنے کے بعد جب ہم شاعر کا کلام ملاحظہ کرتے
ہیں تو اس کلام کی جملہ خوبیاں ہم پر آشکارا ہوتی ہیں اور نقادِ سخن سے اتفاق کرنے میں ہمیں ذرا تامل
نہیں ہوتا۔ چند اشعار بطور حوالہ پیش کیے جاتے ہیں:

نہ فلسفے سے نہ دانشوری سے ملتا ہے شعورِ زیست، شعارِ نبی سے ملتا ہے
ہم اس کی مدح میں خود کو بھی فاش کرتے ہیں وہ آئینے کی طرح ہر کسی سے ملتا ہے

وقار نعت محمد کا معتبر اسلوب ۴۱

☆☆

غرورِ فن سے نہیں، عاجزی سے ملتا ہے اک ایسا آئینہ ہے اسوۂ رسول وقار
میں جس کو دیکھ کے اکثر سنور نے لگتا ہوں ۴۲

☆☆

مخاطب ہیں ہم تذکرۂ عشقِ نبی میں بے مشورۂ دیدہ نم کچھ نہیں لکھتے
ہے پاس جنہیں آبروئے لوح و قلم کا حمد سے یا نعت سے کم کچھ نہیں لکھتے ۴۳

☆☆

اک مشیتِ خاک اور حبیبِ خدا بنے اجرِ اطاعتِ شہِ ابرار دیکھنا
اکسیر ہے یہ دیدہ و دل کے لیے وقار اوروں کو نیک خود کو گنہگار دیکھنا ۴۴

☆☆

بے تاب نظر روئے محمد پہ ٹھہر جائے ممکن نہیں اللہ تعالیٰ کا تصور
بن سکتا ہے یہ نعت کا شاعر بھی مصور یک جا ہوا گر حسن کے اجزا کا تصور ۴۵

☆☆

ان کا اقرار ہی روحِ اقرار ہے ورنہ ثابت خدا کا بھی انکار ہے
خلق کے ضابطے سب امر ہو گئے اور کیا آدمیت کو درکار ہے
ان کی نسبت اگر ہے، تو رحمت بنو بس یہی ان کی نسبت کا معیار ہے ۴۶

☆☆

میں سمجھتا تھا کہ ہونا ہے نہ ہونا میرا اپنے ہونے کی مدینے سے خبر لے آیا
جو اندھیروں کا تسلط نہیں رہنے دیتی حسنِ آفاق میں اک ایسی سحر لے آیا
اس نے تہذیب کو فطرت سے ہم آہنگ کیا اک نیا فلسفہ، فکر و نظر لے آیا ۴۷

☆☆

ہو ان کے حوالے سے جو عرفان کی تکمیل اک اور ہی دنیا پس دنیا نظر آئے
ہر حسن کو ہر وصف کو پایا ہے مجسم سرکارِ دو عالم ہمیں کیا کیا نظر آئے
ایسی بھی سحر کاش مرے خواب مجھے دیں اک اک سے کہوں میں شہِ ولا نظر آئے ۴۸

☆☆

ایمان ہے کیا آپ کی نسبت کا حسیں نام یہ دین ہے کیا آپ کے جینے کی ادا ہے

آتے ہیں وقار اب تو تغزل کو پسینے نعت شہ ابرار کا وہ رنگ جما ہے ۴۹
 وقار صدیقی اجمیری کے شعری نگار خانے میں وہ تمام رنگ نظر آتے ہیں جو عصر حاضر کی نعتیہ شاعری کو دھنک رنگ بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر کشفی کی تنقیدی رائے کی روشنی میں جب ہم درج بالا اشعار کی معنوی سطح کو بنظرِ غائر دیکھتے ہیں تو ہمیں موضوعات کی بوقلمونی اور بیان کی خوبصورتی کا اندازہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر کشفی کی تنقیدی رائے کو ایک متوازن رائے کے طور پر قبول کرنے میں کوئی جھجک باقی نہیں رہتی۔

”محراب توحید“، امین راحت چغتائی کا نعتیہ مجموعہ ہے جس پر ”پیش گفتار“ کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی نے تقریظ لکھی ہے اور ”تاثرات“ کے ذیل میں ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کی رائے ہے۔ اس نعتیہ مجموعے کا مسودہ پڑھ کر، احمد ندیم قاسمی نے لکھا:

”اس مجموعے کا مسودہ پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ اردو نعت مسلسل ترقی پذیر ہے اور مولانا ظفر علی خاں اور حفیظ تائب کی نعتوں کی روشنی میں صنفِ نعت شاہراہ ارتقا پر پورے اعتماد کے ساتھ گامزن ہے۔ ثبوت کے طور پر امین راحت چغتائی کی نعت پیش کی جاسکتی ہے۔ اس نعت میں خود سپردگی اور والہیت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی ہیں۔ میں نے جب ان کا ایک شعر پڑھا تو کئی روز تک میں اس کی بلاغت اور اس کی بے کنار رسائیوں کے حسن کا اسیر رہا۔ وہ غیر فانی شعریہ ہے:

میری بخشش کے دو وسیلے ہیں

ایک تو آپ، دوسرا بھی آپ

’ایک تو‘ کے الفاظ پڑھنے کے بعد جب دوسرا وسیلہ سامنے آتا ہے تو قاری پر ایک ناقابلِ بیان اور بے پایاں طلسمی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان بارہ سیدھے سادے الفاظ میں عقیدت کا ایک ایسا سمندر موجزن ہے جس کا دوسرا کنارہ ناپید ہے۔“ ۵۰

احمد ندیم قاسمی کا تاثر انتہائی درجہ جذبات سے مغلوب لگتا ہے لیکن شعر کی بلاغت اور معنویت کے پیش نظر ہم ان کے تاثر کو بے جا تعریف کے ذیل میں نہیں بلکہ مثبت اور جائز تحسین کے زمرے میں رکھیں گے۔ امین راحت چغتائی نے اپنے خیال کو اس ڈرامائی کیفیت میں شعری جامہ پہنایا ہے

کہ ان کے بیان پر قاری سو جان سے نثار ہو جائے۔ شاعر کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ حضور میری بخشش کا صرف اور صرف آپ ہی کی ذات ایک سہارا ہے۔ لیکن اس نے اپنے بیان میں ندرت پیدا کرنے کے لیے ایسا ظاہر کیا کہ پہلے پہل تو ”آپ“ کی طرف اشارہ کیا..... پھر سوچا کہ دو سہاروں میں دوسرا کونسا ہے؟ تو اس کی فکر دوسرا سہارا ڈھونڈنے میں ناکام ہو گئی کیوں کہ محشر میں تو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت ہی سے امت بخشی جائے گی، چنانچہ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ ”دوسرا بھی آپ“۔ زیر تبصرہ شعر میں بیان کی بے ساختگی نے جو لطف بیان پیدا کیا ہے اس کا جواب نہیں!

احمد ندیم قاسمی نے امین راحت چغتائی کے شعر عقیدت کی تحسین کے ہنگام، اپنے تاریخی شعور کو بیدار رکھا ہے اور اسی لیے وہ بڑے اعتماد سے کہتے ہیں:

”اسی طرح جب امین راحت چغتائی یہ کہتے ہیں تو اردو شاعری کی گزشتہ تین صدیوں کی روایات کو جگمگا دیتے ہیں:

تو مری زندگی کا حاصل ہے دیکھ کر تجھ کو اب کدھر دیکھوں اے

احمد ندیم قاسمی نے نعت نگاری کے ضمن میں اپنی سوچ کو بھی منعکس کیا ہے اور یقیناً بڑے پتے کی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

”نعت نگاری کے حوالے سے میرا ایک نقطہ نظر ہے جس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ مگر میرے اس نقطہ نظر میں میرا یہ یقین موجود ہے کہ جن شعراء نے تیس چالیس برس تک معیاری اردو غزل اور نظم کہی ہو، اور جنہوں نے ولی، میر، سودا، مصحفی، آتش، مومن، غالب، حالی، اقبال، فراق اور یگانہ کے حسن اظہار کو اپنے خون میں کھپا لیا ہو، وہ جب نعت کہنے پر آتے ہیں تو نعت نگاری کا حق ادا کر دیتے ہیں اور اس معیار کے شعر کہنے پر حاوی ہو جاتے ہیں:

وہ سن رہے ہیں جنبش لب کے بغیر بھی میں کہہ رہا ہوں جو بھی مری چشم تر میں ہے

احمد ندیم قاسمی نے شعر کی حساس کائنات کو مسخر کرنے کا جو تاریخی تجربہ نقل کیا ہے اس سے اختلاف کی گنجائش نکلنا مشکل ہے کیوں کہ شاعری کی دنیا میں قدم رکھنے کے ابتدائی دس بیس سال تو محض مشق سخن کی نذر ہو جاتے ہیں اور جب شاعر لفظوں کی حساسیت، بیان کی نزاکت اور شاعری کے کچھ لوازم سے آگاہ ہو کر شعر کہنے کی کوشش کرتا ہے تب اسے یہ ملکہ حاصل ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے

نعتیہ مجموعوں میں تقاریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

کہ وہ ایسی بات کہہ سکے کہ سامع یا قاری اسے ”اپنے دل کی آواز“ سمجھنے پر مجبور ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ”چشمِ تر“ کے حوالے سے کہے جانے والے ہزاروں نعتیہ اشعار میں، امینِ راحت چغتائی کا درج بالا شعر، ایک منفرد لہجے کا شعر لگتا ہے اور اس کی تعریف بجا طور پر ہر باذوق قاری کی تعریف لگتی ہے۔

کلیم احمد عاجز ایک معروف شاعر ہیں۔ ساتھ ہی شعری نزاکتوں سے آگاہی اور اس کے اظہار نے انہیں تنقید کا سلیقہ بھی عطا کر دیا ہے اس لیے ان کی تنقیدی رائے بھی ان کے شعر کی طرح ان کے احساسات کا فطری اظہار معلوم ہوتی ہے۔ ماجد خلیل کے شعری مجموعے ”روشنی ہی روشنی“ پر ”ایک معتبر شاعر“ کے زیر عنوان دیباچہ، تقریظ یا مقدمہ [جو نام بھی دیا جاسکے] لکھتے ہوئے کلیم عاجز نے بڑے پتے کی بات کی ہے، وہ کہتے ہیں:

”بقول انگریزی نقاد، ’کولرج‘ کہ ’شاعری یہ نہیں کہ کیا کہا گیا ہے، شاعری یہ ہے کہ کیسے کہا گیا ہے۔ میں نے اس قول کو بہت فراخ دلی سے جانچا پرکھا اور تجربے نے یہی کہا کہ بات سچ ہے۔ اگر صرف اونچی بات ہی شاعری کہلاتی تو اونچی باتیں تو تھوڑی ہی ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں اور سچائیاں تو شمار میں آسکتی ہیں لیکن اچھی شاعری کا شمار مشکل ہے۔ تو اچھی شاعری جو کہ کی گئی ہے وہ دراصل یہی ہے کہ کسی کہنے والے نے کسی انوکھے ڈھنگ سے کہہ دی تو کہی ہوئی بات بھی نئی ہوگئی۔ ماجد صاحب کے کہنے کا ڈھنگ یہی ہے۔ ڈھنگ اگر نقل ہو تو بات اور فرسودہ ہو جاتی ہے۔ ڈھنگ اگر تازہ ہو تو پرانی بات بھی نئی ہو جاتی ہے۔ شاعری کی اس حقیقت کو فراموش کر دیجیے تو معیاری باتیں چند ہی رہ جائیں گی۔ لیکن ہماری اردو شاعری اور فارسی شاعری میں معیاری باتیں بہت ہیں اور ان کا معیاری ہونا باتوں کی نوعیت پر نہیں بلکہ لکھنے کی انفرادی نوعیت پر ہے۔ یہ باتیں تسلیم شدہ ہیں اس لیے ان کی وضاحت اور دلائل کی ضرورت نہیں۔ ماجد صاحب کے یہاں بھی کہنے کا انفرادی ڈھنگ و آہنگ ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو پسندیدہ، دلکش اور دل پسند بنا دیا ہے۔“ ۵۳

کلیم عاجز نے ماجد خلیل کا کوئی شعر نقل نہیں کیا، لیکن ان کے بیان کی روشنی میں ماجد خلیل کے کلام کو دیکھئے تو کلیم عاجز کی نکتہ رسی کی داد دینی پڑتی ہے۔ واقعی ماجد خلیل نے بہت سے پرانے

مضامین کو بیان کی تازگی سے نیا بنا دیا ہے۔ مثلاً:

ایک وہ شب تھی کہ ہونا پڑا دہلیز بدر
ایک یہ دن ہے کہ دنیا تری دہلیز پہ ہے
لفظ ہے کا ہے سزوار یقیناً جب تک
کرۂ ارض کا ماتھا تری دہلیز پہ ہے
جب بھی تڑپا ہے حضوری کی طلب میں ماجد
دیکھنے والوں نے دیکھا تری دہلیز پہ ہے ۵۴



سبز گنبد سنہری جالی کو
اور ترسیں کے چشم و لب کب تک
عقل، دل، روح جسم و فکر و نظر
دیکھو ہوتے ہیں ان کے سب کب تک ۵۵

درج بالا اشعار میں بیان کی ندرت نے نعتیہ شاعری کے مروجہ مضامین کو نیا بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم عاجز کی تنقیدی رائے سے نہ صرف اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے بلکہ ان کی نکتہ رسی کی داد بھی دینی پڑتی ہے۔

حافظ محمد مظہر الدین کو بجا طور پر ”حسان العصر“ کے خطاب سے نوازا جاتا رہا ہے۔ ان کا کلام اردو نعتیہ شاعری کی آبرو ہے۔ میرے سامنے ان کے تین مجموعے ہیں ”تجلیات“ [۱۹۶۹ء، طبع چہارم ۲۰۰۹ء] ”جلوہ گاہ“ [۱۹۷۴ء، طبع دوم ۲۰۰۹ء] اور ”باب جبریل“ [۱۹۷۸ء، طبع دوم ۲۰۰۹ء]۔ ”جلوہ گاہ“ کے دیباچے بعنوان ”سجدہ قلم“ میں احسان دانش لکھتے ہیں:

”حافظ مظہر الدین صاحب کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو اور اپنے عجز کے بیشتر پہلوؤں پر خیالات و احساسات کی تصویریں ملتی ہیں، جن میں ادب بھی ہے اور احترام بھی، عشق بھی ہے اور سوز عشق بھی۔ میں نے پاکستان میں بہت کم لوگ حافظ مظہر الدین صاحب جیسے رفیق القلب اور عاشق رسول دیکھے ہیں اور دیکھا جائے تو نعت کا حق عاشق رسول ہی کو پہنچتا ہے اور وہی کلام دلوں میں گداز اور پلکوں پر بادلہ لگاتا ہے۔ میں نے کئی بسیار گو اور زود نویس شعراء کو دیکھا ہے کہ فنی طور پر تو ان کے کلام میں کوئی نقص نہیں ہوتا لیکن تاثر کا دور دور تک پتہ نہیں لگتا۔ قاری کا جسم بھی پیاسا رہتا ہے اور روح بھی کیوں کہ شعر تو ایک فطری ابلاغ کا ذریعہ ہے اگر وہ موزونیء طبع اور مہارت عروض کے علاوہ زود گوئی کے بل پر کہا گیا ہے تو تاثرات کے اعتبار سے دیوالیہ اور جذب کے لحاظ سے ٹھس ہوتا ہے اور کھرا

سکہ نہیں کہلا سکتا۔“ ۵۶

حافظ مظہر الدین کے نعتیہ مجموعے ”تجلیات“ کا دیباچہ [اسی عنوان سے] محمد ایوب صاحب نے لکھا تھا۔ وہ رقم طراز ہیں:

”دنیاۓ شعر و شاعری میں نعت کو بعض نادان مدِ فاضل تصور کرتے ہیں اور اس لیے ان کے نزدیک نعت کے لیے فنی قواعد و محاسن کا لحاظ ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف فن کی توہین و تحزیب کے مترادف ہے بلکہ خود نعت کی عظمت و پاکیزگی کے پیش نظر ایک طرح کی بے ادبی و گستاخی ہے۔ محبوب کے حضور ہر پیش کش حسین و متوازن انداز میں پیش کی جانی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ فن کا منصب تحسین و ترغیب ہی ہے۔ حافظ صاحب کی نعتیں الحمد للہ فنی اعتبار سے بھی بے داغ، حسین اور مزین ہوتی ہیں۔“ ۵۷

حافظ مظہر الدین کی تیسری کتاب ”بابِ جبریل“ کا ”پیش لفظ“ پیر محمد کرم شاہ رحمۃ اللہ علیہ الازہری نے لکھا تھا وہ فرماتے ہیں:

”نعت کی اپنی مخصوص زبان ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کا اپنا معیار ہے اور وہ ہے ”جذبہٴ عشق“۔ ایک سادہ سا جملہ اگر سوزِ عشق سے لبریز ہے تو وہ اپنی اثر آفرینی میں طویل قصائد سے بازی لے جاتا ہے۔ جذبہٴ عشق و محبت سے بے بہرہ دفا تر بھی دل میں گداز پیدا نہیں کر سکتے اور نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ مبداءِ فیاض نے ان [حافظ مظہر الدین] کو نغز گوئی، جدت طرازی، بیساختگی و برجستگی، شیریں بیانی، سلاست و روانی کی جو انمول صلاحیتیں بخشی ہیں، ان کا رخ ہر طرف سے موڑ کر اپنے محبوبِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کی طرف پھیر دیا ہے..... بابِ جبریل کی پہلی نعت پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جب یہ شعر پڑھا تو دل کے کسی گوشہ سے ’جائیں جاست‘ کی صدا بلند ہوئی اور کئی بار اس شعر کو پڑھتا رہا۔ آپ بھی سنیے:

جوان کے ذکر میں بیٹے وہ لمحہ، عین کرم جوان کی یاد میں گزرے وہ زندگی انعام
کتنی بڑی سچائی ہے اور ہم اس سے کتنے بے خبر ہیں۔ قبلہ حافظ صاحب کا شعور اس صداقت کی روشنی سے تابناک ہے اور اس کے ساتھ اندازِ بیان کتنا باوقار ہے۔ اس سے آگے اپنے دلبر کے شہر

کی صبح و شام کا منظر کس خوبی و خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں:

نظر فروز ہے شہرِ نبی کی صبحِ جمیل
ہزار جلوہ در آغوش ہے حجاز کی شام
حافظ صاحب کی نگاہیں شہرِ حبیب کی صبح و شام کے جلوؤں سے سرگیں ہونے کے بعد روئے
حبیب کی دلبرانہ اداؤں میں کھو جاتی ہیں۔ دل مضطر کے جذبات زبانِ قلم سے ٹپک پڑتے ہیں۔ عرض
کرتے ہیں:

اے کہ زلفوں سے تری عشق کی شامیں روشن
اے کہ چہرہ ہے ترا صبحِ درخشانِ جمال
جز ترے کون ہے مخدومِ جہانِ خواہاں
جز ترے کون ہے کونین میں سلطانِ جمال
بے خودی کے عالم میں حافظ صاحب ایک اور حقیقت سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ حافظ صاحب کے
ندرتِ بیان کی بلائیں لینے کو دل چاہتا ہے:

ہو نہ جلوہ گر چمن میں جو نبی کا نورِ تاباں
کبھی ان گلوں سے ملنے کے لیے صبا نہ آئے
دوسرے مصرعے کی جتنی داد دی جائے حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ۵۸

حافظ مظہر الدین کے کلام پر تین مختلف دیباچہ نگاروں کی آراء دیکھنے کے بعد جب حافظ
صاحب کا کلام دیکھتے ہیں تو اس میں فنی خوبیاں، بیان کی لطافتیں اور انداز و اسلوب کی ندرتیں دل موہ
لیتی ہیں۔ چونکہ دیباچہ نگاروں کے اقتباسات میں اشعار نقل کرنے سے گریز کیا گیا تھا، اس لیے چند
اشعار ہم دیکھ لیتے ہیں تاکہ تنقیدی آراء کی معروضیت یا موضوعیت سے آگاہی حاصل ہو سکے:

ذرے ذرے میں ہے دل اے سارباں آہستہ چل

یہ ہے راہِ سرور کون و مکاں آہستہ چل

اے حدی خواں! اے امیرِ کارواں آہستہ چل

ہے شریکِ کارواں اک خستہ جاں، آہستہ چل

میں و فورِ شوق میں ہوں نغمہ خواں آہستہ چل

دیدنی ہے میری مستی کا جہاں، آہستہ چل

رُک! کہ میں بھی جھاڑلوں دامن سے گردِ معصیت

کیوں کہ طیبہ ہے جہانِ نوریاں، آہستہ چل

ملنے والا ہے مرے اشکوں کو بھی رنگِ قبول

ختم ہو لینے دے میری داستاں آہستہ چل ۵۹

اس نعتیہ غزل کے ۱۹ [انیس] اشعار ہیں، میں نے پانچ اشعار اوپر نقل کیے ہیں۔ ان اشعار کی خواندگی کے بعد نقادانِ فن نے جو آراء، حافظ مظہر الدین کے کلام کے بارے میں دی ہیں انہیں ہم معروضیت کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ حافظ مظہر الدین کے کلام میں بات کہنے کا جو سلیقہ ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے علامہ شبلی نعمانی یاد آ گئے جو شعر اور شاعر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے۔ شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے۔ اور ایسے دلکشا اور ندرت آمیز اسلوب سے ادا کرتا ہے کہ سب وجد کرنے لگتے ہیں، اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے، کبھی عام طریقہ ادا کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے۔ کبھی شاعرانہ استدلال سے، کبھی شوخی و ظرافت سے کبھی استعارہ و تشبیہ کی ندرت سے اور سچ یہ ہے کہ اس کی تمام ادائیں متعین اور مشخص نہیں ہو سکتیں، سننے والے کو اتنا محسوس ہوتا ہے کہ کسی چیز نے دل میں چٹکی لے لی، کس نے لی، کیوں لی، یہ کچھ نہیں معلوم:

خوبی ہمیں کرشمہ و نازِ خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست ۱۰
حافظ مظہر الدین کے کلام کی اسلوبیاتی سطح خاصی بلند ہے، فنی چابکدستی ان کے مزاج کا حصہ لگتی ہے اور بیان کی لطافت بڑی جاذبِ توجہ ہے یہی وجہ ہے کہ مجھے شبلی نعمانی کی رائے سے استشہاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ شبلی کی بات سے حافظ مظہر الدین کی کتابوں پر دیباچے لکھنے والے حضرات کی رائے وزنی لگنے لگتی ہے۔

”حاضری و حضوری“ پر اظہارِ خیال کے زیر عنوان لکھتے ہوئے عاصی کرنالی نے صاحب کتاب سجاد سخن کی نعت گوئی کے دو خصوصی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور مثالوں سے اپنے دعوے کی دلیل بھی فراہم کی ہے۔ عاصی کرنالی کے انتخاب اشعار سے ان کے بیان میں دلیل کا زور بھی پیدا ہو گیا ہے اور ان کے مددِ وح کے نعتیہ شعری منہاج کا رخ بھی متعین ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

”میں سجاد سخن کی بے شمار بلکہ ان گنت خوبیوں میں سے صرف دو کا ذکر کرتا ہوں اور ان کے گلستانِ سخن سے صرف دو پھول چنتا ہوں۔ آگے آپ حسب ذوق اور حسبِ توفیق گل چینی کرتے

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

جائیے اور گل دے بناتے جائیے۔ ایک وصف ہے ہادی کائنات، معلم انسانیت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا ذکر۔ سجاد خن کے یہاں اس فضائل نویسی میں نہایت تنوع ہے..... چند مثالوں سے سجاد خن کی طرزِ اظہار کا اندزہ کیجیے:

مشتعل ہے ذکر آقا پر کتابِ زندگی	وقت نے کتنا بدل ڈالا نصابِ زندگی
عرشِ زیرِ پا تھا اور خلوتِ گہرِ معبود تھی	اک بشر ہوتے ہوئے آقا کی رفعت دیکھیے
روشنی ہی روشنی ہوگی متاعِ جسم و جاں	اسوہ آقا کے آئینے میں سیرت دیکھیے
عظمت کا شاہِ دیں کی تعین نہ کر سکے	ادراک، علم، فکر، تجسس، گماں، خیال

سجاد خن کی نعت کا دوسرا وصف ”حاضری و حضوری“ کا بیان ہے۔ حاضری سے قبل کیفیاتِ بے تابلی اور احوالِ مہجوری کا نئے نئے اسلوب میں ذکر، پھر حاضری سے شرفِ یاب ہو کر مدینہ منورہ میں چشم و دل سے گزرنے والے مناظر، مظاہر، مشاہدات اور محسوسات کا نہایت ندرت و لطافت کے ساتھ بیان، پھر حاضری و حضوری کے بعد مراجعت اور اپنے گھر واپسی اور اس عالم میں انہی احوال و مناظر کا تصوراتی ذکر جس میں دیدارِ مکرر کی خواہش بھی شامل ہے۔ میرے نزدیک یہ ساری نعتیں ”حضوری نامہ“ ہے۔ ذرا اس رخ سے نعتوں کا مطالعہ کیجیے۔ پڑھتے پڑھتے آپ خود سرتاپا ”حضوری“ بن جائیں گے:

ایک ہی دھن، ایک ہی رٹ ہے چلو طیبہ چلیں	چین سے رہنے نہیں دیتا مجھے سرکارِ دل
دل چاہتا ہے ہو درِ خیر البشر نصیب	لیکن ادھر ہے میری تمنا ادھر نصیب
مسافر کی طرح رہتا ہوں گھر میں	سمجھتا ہے مدینے کو وطنِ دل
اس کے سوا خدا سے کروں کیا دعا تھن	ہو تیرے در کا طوف، مدینے میں گھر نصیب
چل بلایا ہے شہنشاہِ مدینہ نے تجھے	ہو عطا گوشِ عقیدت کو یہ ہر بار نوید

سجاد خن کے ایک پُر نور شعر پر گفتگو تمام کرتا ہوں:

ہے محیطِ فکر، نورِ مکیہ خضرِ سخن
روشنی سے لکھ رہا ہوں انتسابِ زندگی الا

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرناٹی نے اپنی تاثراتی تنقیدی بصیرت کے پیش نظر مختصر سجاد خن کے فکری زاویوں کے دورِ رخ بتا کر ان کے حسنِ اظہار اور فکرِ سخن کے لیے انتخاب کیے گئے موضوعات اور بیان میں پیدا ہونے والی ندرت کا ذکر کیا۔ سچ یہ ہے کہ سجاد خن کی شعری کائنات میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور ان کی نعتیہ شعری فضا میں بہت سے رنگ بکھیرنے کی کامیاب کوششیں بھی جھلکتی ہیں۔

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

کیوں کہ سجاد حن کو تو ان کے افکار سے آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے در اقدس تک ایک عالم نور ہی نظر آتا ہے جس کی کیفیات کو وہ اپنے شعروں میں اجاگر کرتے رہتے ہیں:

مرے افکار سے آقا کے در تک ہے عالم نور کا حد نظر تک ۶۲

پروفیسر ڈاکٹر عاصی کرناٹی کی تنقیدی رائے کو ان کے دعوے اور سجاد حن کے کلام کی دلیل کی روشنی میں اعتدال پسندی کی مثالوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

بشیر حسین ناظم نے غالب کی زمینوں میں نعتیہ شعری گلاب کھلانے کا بیڑا اٹھایا اور جمال جہاں فروز کے نام سے ان کی نعتیہ کاوشیں سامنے آئیں تو راجہ محمد ظفر الحق نے اس کتاب کی تقریظ لکھتے ہوئے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا:

”بشیر حسین ناظم نے نعت کہتے وقت اپنے سامنے ادب و احترام، حفظ

مراتب، انتخاب مضامین، عمدہ اسلوب و طرز اظہار، بہترین اندازِ خطاب، توقیر

و تکریم کے التزام اور حقیقت نگاری کو ملح نظر بنایا ہے۔ علاوہ ازیں سیرت

طیبہ کا عمیق مطالعہ، ذات رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دل بستگی،

والہانہ شیفتگی، علوم دین اور مسائل دین سے کلی تعارف، ایمانی و روحانی

بصیرت، تزکیہ نفس، طہارتِ قلب و نظر، پاکیزگی، روح، عقیدہ کی پختگی،

جذبات کی صحت و صداقت اور دل و نگاہ کی مسلمانی بشیر حسین ناظم کے خواص

رہے ہیں۔“ ۶۳

تقریظ نگار راجہ محمد ظفر الحق نے مقتضیاتِ نعت نویسی اور بارگاہِ سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں پیش کرنے کے لیے کی جانے والی شاعری کے آداب کو ملحوظ رکھ کر بشیر حسین ناظم کے کلام کو پرکھنے اور اس پر اپنی رائے دینے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے ناظم کے شعری نمونے پیش کرنے سے اجتناب کیا ہے کیوں کہ قاری کے سامنے ان کی تقریظ کے فوراً بعد ہی بشیر حسین ناظم کے کلام کا دبستان کھل جاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود ناظم کے شعر عقیدت کے کچھ نمونے دیکھتے چلیں:

اے خوشا یا مرحبا، صل علیٰ یا حبذا
’حمد‘ مطلع ہے نبی کے نام کی تفسیر کا ۶۴

☆☆

وہ آئے تو ریاضِ محبت مہک اٹھے
ورنہ مالِ خلق مثالِ شمود تھا ۶۵

☆☆

ظلمت کدوں میں نور کے جھالے برس پڑے جن و بشر کے لب پہ سلام و درود تھا ۶۶

☆☆

بعد حق محمد کو دہر میں بڑا پایا
ماہتاب دنیا میں آفتابِ عقبیٰ میں
گلشنِ عقیدت میں پھول کیا کھلا پایا
دیدہ دو عالم میں نورِ مصطفیٰ پایا
چاکری پیمبر کی حریت کا غازہ ہے
روکشِ جم و دارا ان کا ہر گدا پایا ۶۷

☆☆

قابِ قوسین کی فضاؤں میں
ان کی نعتِ جمیل کہنے کا
عشق منت کش ہوا نہ ہوا
حق کسی سے کبھی ادا نہ ہوا ۶۸

راجہ محمد ظفر الحق کی تقریظ میں جن آدابِ نعت گوئی کا حوالہ آیا ہے، ناظم کے کلام میں وہ آداب خاصی حد تک ملحوظ رکھے گئے ہیں اس لیے راجہ محمد ظفر الحق کی لکھی ہوئی تقریظ بھی متوازن تقریظ کے طور پر قبول کی جاسکتی ہے۔

مقدمات کی تنقیدی اہمیت:

ہر فن کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ شاعری کے بھی کچھ اصول ہیں اور شاعری میں برتی جانے والی اصناف کے لیے بھی کچھ حدود و قیود اور ان کی ہیئت کے کچھ معیارات مقرر ہیں۔ مثلاً غزل کے لیے ہر شعر کے دو مصرعے جن میں کسی ایک خیال کی ایک تصویر یا اس کا ایک خاکہ سا بن گیا ہو۔ نظم، جس کے بہت سارے مصرعوں کے ارتباط سے کوئی مفہوم نکل سکے اور شاعر کا کوئی ایک خیال واضح ہو سکے۔ مخمس کے لیے پانچ، مسدس کے چھ مصرعوں کی قید۔ رباعی کے لیے چار مصرعوں اور مخصوص وزن کا تقاضا۔ اسی طرح نظمِ معریٰ، نظمِ آزاد اور نثری نظم کے لیے کچھ فنی تقاضے ہوتے ہیں جن کو پورا کیے بغیر ہیئتِ سطح پر بھی شعری اصناف قبول نہیں کی جاتیں۔ اسی طرح موضوعاتی اصنافِ سخن میں حمد و نعت کے مخصوص تقاضے ہیں جن کو پورا کرنا حمد نگار اور نعت نگار کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

شاعر کے شعری عمل (poetic work) میں تخلیقی پیچیدگیوں کی گرہ کشائی اور شعر کے مفہوم تک رسائی کے لیے بھی تنقیدی بصیرت، ذوقِ سخن اور سخنِ فہمی کا ملکہ ہونا ضروری ہے۔ نعتیہ شاعری کی اپنی نزاکتیں ہیں جن کا احوال ہم پچھلے ابواب میں کسی حد تک پیش کر آئے ہیں، اس لیے نعتیہ شاعری کی کتابوں میں 'مقدمہ' نویسی کی اپنی اہمیت ہے۔

نعتیہ مجموعوں میں تقریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

عام تنقید نگار کے لیے صرف ادبی معیارات کا جاننا اور پیش نظر صنفِ سخن کے تخلیقی تقاضوں سے آگاہی لازمی ہے۔ لیکن نعت کی تحسین کے لیے ادبی معیارات کے ساتھ ساتھ دینی شعور، مقامِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی آگاہی اور قرآن و احادیث میں مذکور بارگاہِ نبوی میں لب کشائی کے آداب کا ادراک ضروری ہے۔ اس لیے نعتیہ شعری کتب میں 'مقدمہ' ایک خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں مقدمہ نگار کی ذمہ داری ہے کہ اپنی ساری توجہ "کَلِیم" کی ذات کے بجائے "کلام" پر مرکوز کر دے۔ تب ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ وہ کوئی معروضی رائے دے کر قارئینِ کتاب کی راست رہنمائی کر سکے۔

ہمارے معاشرے میں راست گوئی کی قدروں کے زوال کے باعث، جہاں اور شعبوں میں رواداری نے راہ پائی ہے وہیں نعتیہ کتب کی تقریظ، دیباچہ یا مقدمہ لکھنے والوں کے ہاں بھی شاعر کی شخصیت سے مرعوبیت اور مروت کے آثار جھلکنے لگتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ مقدمہ نگاروں نے کلام کے معنوی حسن اور بیان کی جمال افروزی کو دیکھے بغیر صرف موضوع کی رفعتوں کا خیال کر کے بات کی ہے اور کوئی مقدمہ، تقریظ یا دیباچہ لکھ دیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری کی رائے بھی ہمارے گمان کو تقویت دیتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”کسی نعت یا نعتیہ مضمون کے بارے میں حسن و قبح کے حوالے سے کسی طرح کا حکم لگانا مناسب نہیں۔ ان لفظوں کا استعمال اور مروجہ استعمال نعت اور نعت کے مباحث میرے دائرہ خیال و قلم سے خارج ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے جن الفاظ کو نسبت ہو جائے وہ میرے نزدیک تنقید مروجہ سے بلند ہو جاتے ہیں۔“ ۶۹

چنانچہ جذباتِ عقیدت کی فراوانی کے باعث بہت سارے مقدمہ، دیباچہ یا تقریظ نگار حضرات کسی بھی نعتیہ مجموعے کے ملاحظے کے بعد صاحب کتاب کے لیے کمالِ فن کا تصدیق نامہ تو جاری کر سکتے ہیں اور جاری کر بھی دیتے ہیں لیکن بیشتر کتابوں کے قامت پر ان مقدمات، دیباچوں اور تقریظ کا جامہ پورا نہیں آتا۔ بعض مقدموں، تقریظات اور دیباچے پڑھنے کے بعد جب کتابیں پڑھی جاتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں پر تنقیدی رائے دینے والوں نے شاید صاحب کتاب کے لیے ”ہجوِ ملیح“ لکھ کر اپنی جان چھڑالی ہے۔

اسماعیل انیس کے نعتیہ مجموعے ”چراغِ عالمیں“ پر چوبیس اہل قلم نے نثر و نظم میں تحسینی رائے

دی۔ جبکہ اسی مجموعے میں بعض اشعار قابل گرفت تھے جن کی طرف کسی نے دھیان نہیں دیا۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار:

قرآنِ معظم کی قسم کچھ نہیں لکھتے جز اسمِ نبی لوح و قلم کچھ نہیں لکھتے •



مشورہ تخلیقِ عالم کے لیے درکار تھا کیوں نہ ہوتے عرش پہ مہماں چراغِ عالمیں اے
ان دونوں اشعار پر معروضی انداز سے غور کریں تو دونوں اشعار کا نفسِ مضمون نعتیہ شاعری کے موضوعاتی منظر نامے پر کچھ بدنما داغ کی طرح ابھرتا ہے۔ پہلے شعر میں قرآن کریم کی قسم کھا کر حصر کے ساتھ یہ کہنا کہ لوح و قلم ”نبی کے نام کے علاوہ“ کچھ نہیں لکھتے، حقیقت کے بالکل برعکس ہے۔ پھر لکھنے کا کام قلم کے ساتھ ساتھ لوح (تختی) کو بھی سونپ کر، شاعر نے اپنے علم، مشاہدے اور شعر گوئی کے منہاج کا خود ہی پول کھول دیا ہے۔

اب ذرا قرآن کریم کی سورہ ”القلم“ کی پہلی آیت دیکھئے:

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ (۱)

”قسم ہے قلم کی اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔“

اس قرآنی آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلم کی تحریر کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری

نے لکھا ہے:

”قلم، تفصیل کا مرتبہ ہے۔ واؤ قسم ہے۔ القلم سے بعض حضرات نے وہ قلم

مراد لیا ہے جس نے امرِ الہی سے تقادیر عالم کو لوحِ محفو میں تحریر کیا..... قلم،

ایک ایسا آلہ ہے جو زمان و مکان کی مسافتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ گزشتہ

صدیوں کے علوم و فنون سے حال و مستقبل کو روشن کرتا ہے اور دور دراز

علاقوں میں پیدا ہونے والے اولوالعزم حکماء و فضلا کے افکار و نظریات کو دنیا

کے گوشہ گوشہ تک پہنچاتا ہے۔“ ۲

اس تفصیل سے یہ بات تو صاف ہو گئی کہ اسمعیل انیس نے بڑے بھول پن سے ایک ایسی بات

کی قسم کھالی جو مبنی بر حقیقت نہیں تھی۔ مزید برآں، مرحوم نے ”لوح“ [تختی] کو بھی لکھنے کے آلے

کے طور پر پیش کیا جو شعر کی ردیف ”لکھتے“ کے استعمال کے باعث از خود لکھنے کے وظیفے میں شامل

ہو گئی۔ اس طرح یہ شعر عملی حقیقت کے خلاف ہوتے ہوئے قرآن کی تعلیمات کے بھی خلاف ہو گیا۔

نعتیہ مجموعوں میں تقارین، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

دوسرا شعر جس میں شاعر نے بڑی سادگی سے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ ”اللہ رب العزت کو [نعوذ باللہ] تخلیق عالم کے لیے مشورہ درک تھا اس لیے چراغِ عالمیں جنابِ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم عرش پر مہمان ہوئے“..... اپنے مافیہ کی غیر فطری اور حقیقت گریز حیثیت کا احساس دلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو اپنے بندے اور رسول سید الکونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے بلایا تھا۔ اللہ تعالیٰ تخلیق عالم کے لیے مشورے کا قطعی محتاج نہیں ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْإِسْنَاءِ.

”(ہر عیب سے) پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے قلیل حصہ میں، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، بابرکت بنا دیا ہم نے جس کے گرد و نواح کو تاکہ دکھائیں اپنے بندے کو اپنی قدرت کی نشانیاں۔“ ۳

ان تصریحات کے بعد جب ہم ان آراء کا مطالعہ کرتے ہیں جو ”چراغِ عالمیں“ کے مطالعے کے بعد نکتہ شناس تنقید نگاروں نے رقم کی ہیں تو افسوس ہوتا ہے کہ تحسینی صداقت نامے دینے والوں میں سے کسی کی نظر بھی ان اشعار پر نہیں پڑی جن کی وجہ سے اچھا خاصا مجموعہ نعت داغدار ہو گیا؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ تقریظ لکھنے والوں نے سرسری نظر ڈال کر قلم اٹھایا اور ”کلیم“ سے محبت کا اظہار فرمادیا، کلام کی قدر صرف پڑھنے والوں پر چھوڑ دی۔ نعتیہ مجموعوں کے لیے یہ روش زہر قاتل کا حکم رکھتی ہے۔

اب ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ لکھنے والوں نے کن کن زاویوں سے مذکورہ نعتیہ کلام کی تحسین فرمائی ہے:

”اسمعیل انیس نے نعت و حمد دونوں میدانوں میں نہایت خوبی، خوش اسلوبی اور دل افروزی و دلنوازی کے ساتھ جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔
”چراغِ عالمیں“ ان کی قدرتِ کلام کا خوبصورت نمونہ ہے۔“ ۴ (رئیس امر وہوی)

”میں نے کچھ نعتیں مجموعہ ”چراغِ عالمیں“ میں سے پڑھی ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بابائے شعر و سخن اسمعیل انیس کو رسول کریم سے بے پناہ عقیدت و محبت ہے۔ ان کی کہی ہوئی نعتیں مقصدیت

اور اصلاحِ حیات کا پہلو لیے ہوئے ہیں جن سے یقیناً اصولِ حیات کی راہ متعین ہوتی ہے۔“ ۷۵ (الحاج محمد محسن)

.....

”بعض بعض نعتیں تو اتنی وجد آفریں ہیں کہ ہر ایک شعر پر دل وجد کرنے لگتا ہے اور جسم و جاں میں نور کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ بابا نے بڑے ہی قلیل وقت میں اتنی عمدہ اور اتنی زیادہ نعتیں لکھ لی ہیں کہ رشک آنے لگتا ہے۔“ ۷۶ (مشاق چغتائی)

.....

”مطالعہء چراغِ عالمیں سے اسمعیل انیس کی استادانہ عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔“ ۷۷ (احمد عادل)

.....

”یہ نعتیں نئے استعارے، نئی تشبیہوں، نئے کنایوں، نئی تلمیحوں اور نئی نئی اصطلاحوں کی حامل ہیں۔ ان نعتوں میں عجیب و دلکشی اور دلپذیری ہے۔“ ۷۸ (ڈاکٹر شاہد الوری)

.....

”جہاں تک ان کی شاعرانہ صفات کا تعلق ہے وہ لفظ اور معنی دونوں پر اپنی فنکارانہ گرفت رکھتے ہیں۔ وہ تجربے کی سچائی کے بھی اتنے ہی قائل ہیں جتنا کہ انہیں لفظ کی صحت کا پاس ہے..... وہ نعت گوئی میں افراط و تفریط کے سلسلے میں بہت محتاط ہیں۔“ ۷۹ (فراست رضوی)

”چراغِ عالمیں“ میں منشور مداحی کے ساتھ ساتھ منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام آراء کے پڑھنے کے بعد قاری پر جو مرعوبیت طاری ہوتی ہے وہ ان دونوں اشعار کی خواندگی کے بعد جن پر ان سطور میں کچھ گفتگو کی گئی ہے، نہ صرف یہ کہ قائم نہیں رہتی بلکہ تقریظ نگاروں کے خوشامدی انداز کے باعث ان کی شخصیت کے حوالے سے منفی خیالات کو جنم دیتی ہے۔ یقیناً صاحب کتاب کی نعتیں اچھی ہیں لیکن تبصرہ نگاروں اور تقریظ نویسوں کا کیا یہ فرض نہیں تھا کہ وہ ایسے تمام اشعار کی نشاندہی کر کے نعتیہ مجموعے کو غیر معیاری اشعار کی اشاعت سے بچا لیتے؟

نعتیہ مجموعوں میں تقریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

اس مثال سے ظاہر ہوا کہ بعض مقدمہ، تقریظ یا دیباچہ نگار، نعتیہ شعری مواد کو پرکھے بغیر صرف موضوع کی رفعتوں کا خیال کر کے قلم اٹھالیتے ہیں اور کتابوں میں اچھے اشعار کے ساتھ ساتھ کمزور اور حقیقت سے بعید خیال کی بنت پر دھیان نہیں دیتے اور قابل اعتراض لوازمہ [matter] جوں کا توں چھوڑ دیتے ہیں۔

ناقدین کی اس روش سے نئے نعت نگاروں میں، نعتیہ مضامین کی پرکھ کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوتی اور وہ بھی خیال کی وادیوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اغلاط کی مثالیں صرف ان کتابوں میں ہی نہیں ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے لیکن ہم نے یہاں صرف چند نمونے پیش کر دیئے ہیں۔ ”مقدمہ نگاری کی اہمیت“ پر بھی ہم نے اسی لیے کچھ معروضات پیش کر دیئے ہیں تاکہ موضوع کی رفعت کے پیش نظر مستقبل کے مقدمہ، تبصرہ، دیباچہ یا تقریظ نگار حضرات ان پر غور کر سکیں اور کسی کتاب پر لکھتے ہوئے معروضیت اختیار کرنے کی کوشش کریں، صرف کلام پر توجہ مرکوز رکھیں اور کلیم کی حیثیت اور مقام و مرتبے کو نظر انداز کر دیں..... اس لیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرنے میں جو غلطی شاعر سے ہوگی، اس کو سراہنے والے اس غلطی میں شریک ہی نہیں بلکہ اس کی ترویج کے بھی ذمہ دار ہوں گے!

مقدمات میں پیش کی جانے والی تنقیدی آراء کی معروضی پرکھ:

مقدمہ لکھنے والوں نے بہت سی کتب پر مقدمے لکھے ہیں۔ بعض مقدمہ نگاروں نے حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا اور بعض نے صرف صاحب کتاب کی ثنا کی۔ کتب نعت میں مقدمات کی تنقیدی اہمیت کے ذیل میں ہم نے صرف ایک مثال پیش کر کے بتایا تھا کہ مقدمہ نگاری کی اہمیت اس وقت کم ہو جاتی ہے جب اصل کتاب میں کوئی شعر شعری یا شرعی معیارات سے فروتر پایا جاتا ہے اور دیباچہ، تقریظ یا مقدمہ نگار اس کی نشاندہی نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں نعتیہ شاعری کے باذوق قاری کے ذہن کو بڑا دھچکا لگتا ہے۔

صحیفہ نور کے نام سے لطیف اثر کا مجموعہ نعت شائع ہوا۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر ابوللیث صدیقی، ڈاکٹر الیاس عشقی، پروفیسر نذیر بھٹی اور محمد زبیر فاروقی شوکت الہ آبادی وغیرہم کی دیباچہ نما تحریریں بھی شامل ہیں۔ ان تحریروں سے چند اقتباسات درج ذیل کیے جاتے ہیں:

”اپنے مجموعہ اشعار ”صحیفہ نور“ میں اثر صاحب نے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم

کی ذاتِ مبارکہ کی صفات کو الگ الگ ایک ایک مختصر بند میں نظم کیا ہے۔ اس کا مجموعی تاثر ذاتِ رسولِ مقدس سیرت کے بعض اہم پہلوؤں کی طرف پڑھنے والوں کو خاص طور پر متوجہ کرتا ہے۔ اس میں شاعرانہ صنعت گری کو محض صنعتِ شعر کے لیے نہیں بلکہ عقیدت کے جذبات کے اظہار پر ہے۔ اس لیے جذبات کی ترجمانی حقیقت اور صداقت کے ساتھ جذباتی تاثر کا بھی اعلیٰ درجے کا نمونہ ہے اور اسے اسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر صحیفہ نور ابواللیث صدیقی ۸۰

درج بالا عبارت بے ربط ہے۔ ظاہر ہے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے ایسی عبارت نہیں لکھی ہوگی۔ اس لیے اس بے ربطی کا ذمہ دار کتاب کا مرتب ہی ہو سکتا ہے۔ الیاس عشقی صاحب نے ”تحفہ نعت، کرشمہ لطیف“ کے زیر عنوان لکھا ہے:

”ان [لطیف اثر] کے دل میں عقیدت و ایمان کا جو سمندر موجزن ہے اس کی پُر جوش لہریں فنی دشواریوں اور موضوع کی نزاکتوں کو اپنے بہاؤ سے اس طرح ہموار کر دیتی ہیں کہ کوئی دشواری، دشواری نہیں رہتی۔ ان کے کلام کی سادگی اور روانی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ ان کے جذبات و احساسات کی صداقت کو اظہار کے لیے مناسب الفاظ مل جاتے ہیں۔ ان کی زبان کہیں نہیں رکتی اور ان کا قلم کہیں نہیں جھجکتا۔ وہ فنی اور بیان کی نزاکتوں سے اس طرح گزرتے ہیں کہ ان کی قدرتِ کلام پر حیرت ہوتی ہے۔ وہ نثر کو وزن عطا کرتے ہیں اور اوزان کو نثر کی طرح سہل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ بڑی جسارت اور ہمت کا کام ہے جس کی مثال نایاب نہیں تو کیا ضرور ہے۔“ ۸۱

”لطیف اثر کا لا جواب اندازِ نعت“، یہ پروفیسر نذیر احمد بھٹی کی تقریظ کا عنوان ہے۔ اپنی اس

تحریر میں وہ ایک جگہ رقم طراز ہیں:

”وہ (لطیف اثر) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام مبارک ناموں سے اپنے

اشعار مزین کر رہے ہیں اور اس فن کے وہ امام ہیں۔“ ۸۲

محمد زبیر فاروقی شوکت آبادی نے جو تقریظ لکھی ہے اس کا عنوان ہے ”لطیف اثر اور ان کی

نعت گوئی“ وہ لکھتے ہیں:

نعتیہ مجموعوں میں تقاریظ، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

”صحیفہ نور کے مسودہ کو دیکھ کر محسوس ہوا کہ لطیف اثر کی غزل گوئی اور زبان دانی میدانِ نعت میں بھی ان کی مدد و معاون ہے۔ دیکھیے اتنی سخت اور مشکل ردیفوں میں کیسے صاف صاف شعر کہے ہیں:

آپ آئے تو زندگی آئی آپ کی ذات فخرِ موجودات
ہو گیا دور آپ جب آئے دورِ ظلمات، فخرِ موجودات
آپ کے حسنِ کرم سے سرشار ہر گل و خار محبت الفقراء
لطیف اثر کی نعتیں رسولِ مقبول سے والہانہ محبت کی آئینہ دار ہیں۔“ ۸۳

درج بالا اقتباسات سے ان تحریروں کی ایک جھلک دکھانا مقصود تھا جو تقریظ، دیباچہ یا مقدمہ کے طور پر لطیف اثر کے مجموعہ نعت پر لکھی گئی ہیں۔ ان تحریروں سے شاعر کے فن کی تحسین کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن جب ان تنقیدی آراء کی روشنی میں قاری ذوق و شوق کے ساتھ لطیف اثر کا کلام دیکھتا ہے تو اسے انتہائی درجہ مایوسی ہوتی ہے۔ بعض تقریظ نگاروں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں شاعر کی فن سے بے نیازی کا ذکر تو کیا ہے لیکن نہ تو کھل کر لکھا ہے اور نہ ہی شاعر کو کوئی ایسی نصیحت کی ہے کہ اسے آگاہی نصیب ہوتی اور وہ اپنی اصلاح کی کوشش کرتا۔

اس مرحلہ پر ہم دل کڑا کر کے اس کتاب سے چند اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ مقدمات کی معروضی جانچ پڑتال کا تھوڑا سا حق ادا ہو سکے۔ سو ملاحظہ ہوں چند اشعار:

میرے آقا سے کہا اللہ نے یہ بالیقین و ما ارسلک الا رحمت اللعالمین
اس امر میں ہیں وہی وہ اور کوئی ان سانہیں و ما ارسلک الا رحمة اللعالمین
ہوتے تھے دست و گریباں روز ہر پیر و جواں مونس و غمخوار کوئی کب کسی کا تھا یہاں
وقت تھا انسانیت کا خود بھی دشمن بدترین و ما ارسلک الا رحمت اللعالمین
کون اب جرات کریگا ضربِ کاری کیلئے اب یہاں کون آئیگا اخترِ شماری کیلئے
ہو گئی یہ جان کر مظلوم کی روشن جبین و ما ارسلک الا رحمت اللعالمین ۸۴

ان پہ قربان ہو میرا ایمان و دیں اللہم صل علی محمد
جن سے وابستہ ہے جلوۂ آفریں اللہم صل علی محمد
شافع روزِ حشر راحت العاشقین اللہم صل علی محمد
حسنِ عینِ یقین حاجتِ شائقین اللہم صل علی محمد

آپ فخر یقیں، آپ روشن مبیں، اللہم صل علی محمد
عارف العارفین سالک السالکین اللہم صل علی محمد ۵۵

.....

روشن ہے شایانِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
اللہ اللہ شانِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
کہتے رہے کہتے رہے جتک سینے نام ان کا
ہوتی ہے پہچانِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
آیا ہوں مدینے جب سے میں سوا ہے یہی سر میں میرے
حاصل ہو عرفانِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم
ذکر کرے خود جن کا خدا بیٹھ کے اپنے فرشتوں میں
خوب ہے یہ بھی شانِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ۵۶

.....

کہیئے دل سے صل علی محمد رسول اللہ
جب آئے کانوں میں صدا محمد رسول اللہ
عرش گواہی دیتا ہے اسکی صداقت کی ہم سے
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
آئے جب محبوب خدا کفر کا ٹوٹ گیا جادو
ہر جانب سے شور اٹھا محمد رسول اللہ
اسکے کرم کا رخ بدلا جب یہ کلمہ ورد ہوا
دل نے جب تسلیم کیا محمد رسول اللہ ۵۷

.....

جو ہیں خیر الامم وہ ہیں محبوب رب
جن کی امت میں ہم وہ ہیں محبوب رب
نام سے جن کے تابندہ عہد آفریں
جن کے لوح و قلم وہ ہیں محبوب رب ۵۸

آپ تسکین غم شافع یوم النثر
آپ فخر ام شافع یوم النثر ۸۹

اپنے پیکر کو اس میں پرودتجے
یہ ہے باب نظر شافع یوم الحشر ۹۰

ہوں ہمقدم کسی کے اگر افضل البشر
وہ معتبر ہو راہ گزر افضل البشر ۹۱

مثالیں بہت ہیں، پوری کتاب میں ایسی ہی شاعری ہے۔ کہیں کہیں با وزن اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن مضمون کا سراپا نا وہاں بھی مشکل ہے۔ ردیفوں کا حال تو یہ ہے کہ صرف ٹانک دی گئی ہیں۔ بحر، وزن اور مضمون کی با معنی بنت سے عاری یہ شاعری ہے جس پر ہمارے نقادوں نے شاعر کی تحسین کے لیے وہ کلمات خیر فرمائے ہیں جن کے اقتباسات پچھلے صفحات میں نقل کر دیئے گئے ہیں۔ الیاس عشقی نے البتہ طنزِ ملیح میں کچھ جملے لکھ دیئے ہیں، لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ یا تو کچھ لکھنے سے گریز فرماتے یا اس شاعری کو کھل کر وزن و بحر سے عاری لکھتے۔ الیاس عشقی کی ڈھکی چھپی بات بے چارہ شاعر کہاں سمجھ سکتا تھا؟ بہر حال الیاس عشقی کے وہ جملے بھی ملاحظہ ہوں جن میں طنزِ ملیح کا رنگ جھلکتا ہے:

”عربی جملوں کی ردیفوں کی فہرست دینے کے بعد لکھتے ہیں [ان کلمات کا بقید ردیف منظوم کرنا نہ فقط سنگ لاخ زمینوں کی ایجاد کا سبب ہے۔ بلکہ وزن و بحر کے مسائل پیدا کرتا ہے لیکن لطیف اثر فنی دشواریوں کو کب خاطر میں لاتے ہیں..... یہ منزل اگرچہ فنی طور پر بال سے باریک اور تلواریں سے تیز ہے لیکن اپنے ایمان و عقیدت کے سہارے شاعر اس مقام سے بھی بے نیاز نہ اور بے خوف گزر جاتا ہے۔“ ۹۲

لطیف اثر کی شاعری کے نمونے دیکھنے کے بعد جب ہم مقدمہ، دیباچہ یا تقریظ نگاروں کی تحریر

وں کو پڑھتے ہیں تو شعر و شاعری کے عمل اور اس کی بے جا تحسین کے انداز سے کراہیت محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسی شاعری اور شاعر کا دل رکھنے کے لیے لکھی گئی تحریریں، تنقید کے وقار کے منافی ہیں۔ ایسی شاعری ہی نعتیہ شاعری کو ادبی سطح پر ابھرنے نہیں دیتی۔ معیار سے عاری شاعری کا کتابوں میں شائع ہونا اور اس کا سراہا جانا ادب کے لیے بالعموم اور نعتیہ ادب کے لیے بالخصوص سم قاتل ہے۔ حال ہی میں نعت کے معروف نقاد رشید وارثی کی کتاب ”اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ“ منظر عام پر آئی ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ رشید وارثی نے ”علم عروض“ کو مطعون کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شعری اوزان اور لغت کے معیارات کو بالائے طاق رکھ کر بھی شاعری کی جاسکتی ہے۔ ان کا تو اس بات پر بھی اصرار ہے کہ ناقدین فن اس قسم کی شاعری کو پرکھتے ہوئے اوزان و بحر کو یکسر نظر انداز کر دیں۔ رشید وارثی کی مذکورہ تحریر سے متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے:

”ہمارے نعتیہ ادب کے بعض تنقید نگاروں میں یہ لائق توجہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ فن عروض میں کسی حد تک شد بد حاصل کر لینے کے بعد اسی کو نعتیہ تنقید نگاری کی اساس سمجھ کر اس پر انحصار کر بیٹھتے ہیں۔ علم عروض کی کوئی شرعی اہمیت تو خیر ہے ہی نہیں۔ اس پر بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ خود علمائے ادب، عروض کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ صاحب ”کشاف تنقیدی اصطلاحات“ جناب ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

’علماء نے وزن شعر کے صحت و سقم کو جانچنے کے لیے چند قواعد وضع کیے ہیں جن کے مجموعے کو عروض کہا جاتا ہے۔ علم عروض کا موجد خلیل احمد بصری (متوفی ۱۷۵۵ ہجری) ہے۔ ہندی عروض کو پنگل کہا جاتا ہے۔ عروضیوں نے جو موشگافیاں روا رکھی ہیں اور عروضی اصطلاحات کا جو انبار لگایا ہے اس کا مذاق اڑانا ایک فیشن بن چکا ہے اور جدید تنقید میں عروض کو کوئی باوقار مقام بھی حاصل نہیں رہا۔ لیکن شاعر اور نقاد عروض سے آزاد اور بے نیاز بھی نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں: ’فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے، مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہو سکتا ہے‘۔ اب رہی فن عروض کی شرعی اہمیت کی بات، تو اسلامی ادب عالیہ میں شامل دیگر فنون کی طرح اسے

بھی مباح کہا جاسکتا ہے۔ ہمارے تقریباً چار عشروں پر محیط اسلامی ادب کے مطالعے کے دوران کوئی بھی ایسی روایت ہماری نظر سے نہیں گزری کہ افصح العرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی نعتیہ کلام میں پائے جانے والے بعض معنوی اسقام کی طرح عروضی اسقام کی بھی نشاندہی فرمائی ہو یا اس بارے میں کوئی ہدایت فرمائی ہو۔ لہذا یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ فن عروض کی کوئی شرعی اہمیت نہیں۔“ ۹۳

رشید وارثی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم عروض کو اشعار کی پرکھ کے اصول کے طور پر ماننے کو قطعی تیار نہیں۔ اسی لیے ان کے الفاظ سے عروض کے حوالے سے خاصی جھنجلاہٹ جھلک رہی ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ دعویٰ بڑا بودا ہے، اسی لیے وہ غیر محسوس طور پر آل احمد سرور کی یہ رائے بھی نقل کر گئے ہیں جو ان کے موقف کے بطلان کے لیے کافی ہے:

”فاعلاتن فاعلات کی گردان اگرچہ تنقید نہیں ہے، مگر اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی اچھا نقاد عروض اور اس کے قواعد سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔“ ۹۴

علاوہ ازیں رشید وارثی نے یہ لکھ کر کہ:

”علم عروض کی کوئی شرعی اہمیت تو خیر ہے ہی نہیں“

ایک بہت بڑی حقیقت سے عدم آگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهُ ط

”اور نہیں سکھائی ہم نے اس نبی کو شاعری اور نہیں تھی اس کے شایانِ شان

یہ چیز۔“ ۹۵

جب اللہ رب العزت نے اپنے نبی جناب محمد الرسول اللہ کو تمام علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ فرمانے کے باوجود اس بات کا اعلان فرمادیا کہ ہم نے اس نبی کو شعر گوئی اس لیے نہیں سکھائی کہ یہ فن اس کے شایانِ شان نہیں ہے تو پھر شعر یا شعر سے متعلق کوئی علم ”شرعی“ کیسے ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ علم امت کو نہ تو قرآن سے حاصل ہوا ہے نہ کسی حدیث سے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت کعب بن زہیرؓ کے شعر میں جو اصلاح فرمائی تھی وہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اصلاح دی تھی اس سے شعر کا معنوی حسن تو بڑھ گیا لیکن کسی قسم کا عروضی سقم پیدا نہیں ہوا۔ آپ نے

”سیوف الہند“ کی جگہ ”سیوف اللہ“ تجویز فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ لفظ ”اللہ“ معنوی طور پر تو بلند ترین ہے ہی، عروضی اعتبار سے بھی ”الہند“ کا نعم البدل ہے۔ ۹۶

مزید برآں آپ نے غزوہ حنین کے موقع پر جو جمع فرمایا وہ بھی عروضی اوزان کے عین مطابق ہے۔

انا النبی و لا کذب..... انا ابن عبدالمطلب

”میں نبی ہوں یہ جھوٹ نہیں، میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں“ ۹۷

ان شواہد کے ہوتے ہوئے کسی نقاد کا، عروضی اوزان سے اپنی ناواقفیت کو چھپانے کے لیے علم عروض کو یہ کہہ کر مطعون کرنا کہ یہ کوئی شرعی علم نہیں ہے، بڑی عجیب بات ہے!!!
عروض کے معاملے میں رشید وارثی کے اس رویے سے علم عروض اور شعر کے وزن و بحر سے ناواقف لوگ تو خوش ہو سکتے ہیں لیکن اہل فن کو ان کی بات کیسے ہضم ہو سکتی ہے؟ کیوں کہ خود رشید وارثی نے یہ لکھ کر اپنی دلیل کمزور کر لی ہے:

”شعر کے متعلق زمانہء قدیم سے علمائے انتقاد کا یہ نظریہ رہا ہے کہ اسے محض پروازِ تخیل کا آئینہ دار ہونا چاہیے۔ لیت شعری کذا کے محاورے میں شعر گوئی اصل میں ایک فنِ لطیف کا نام ہے اور عرف میں موزوں اور مقفی کلام کو شعر سے تعبیر کرتے ہیں۔“ ۹۸

ذرا درج بالا عبارت پر غور فرمائیے، کیا فنِ لطیف اور موزوں اور مقفی کلام کو شعر ماننے اور کہنے کے بعد بھی علم عروض سے بے نیاز رہا جاسکتا ہے؟

آدم برسرِ مطلب، کسی بھی کتاب پر تبصرہ یا تقریظ لکھنے والے کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ کتاب کے مافیہ اور شعری حسن کا صحیح اندازہ لگائے اور پھر دیانتدارانہ رائے دے تاکہ اس کی تحریر کو وزن و وقار حاصل ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر مقدمہ، تقریظ یا دیباچہ نگار کتاب یا تو پڑھتے ہی نہیں ہیں یا صرف اچھے اشعار پڑھ کر رائے دیدیتے ہیں۔ حالانکہ انہیں ”خذ ما صفا ودع ما کدر“ [اختیار کرو جو کچھ کہ پاک ہو اور چھوڑ دو جو ناپاک ہو] کے مقولے پر خود عمل کرنے سے پہلے صاحب کتاب سے اس نصیحت پر عمل کروالینا چاہیے۔

لطیف اثر کی مثال تو شعری اوزان و بحر اور مضامین کی کجروی کی انتہائی درجے کی مثال ہے۔ لیکن بعض ثقہ شعراء کے یہاں بھی نعتیہ مضامین کی بنت میں کمزوریاں رہ جاتی ہیں جن کی طرف دیباچہ، تقریظ یا مقدمہ نگار غور نہیں کرتے اور بڑی اچھی اور دلکش عبارت میں اپنی رائے دے کر

صاحب کتاب کی مدح کرنے لگتے ہیں۔ ایک دو مثالیں ایسی بھی ملاحظہ فرمائیے:

”اعظم چشتی کا نام نعت خوانی اور نعت گوئی کے لیے بڑا معروف نام ہے۔ ان کے علم و فضل میں بھی کوئی کمی نہیں، لیکن شعر کہتے ہوئے ان سے ایک ایسا شعر موزوں ہو گیا جس کی موجودگی ان کے شعری مجموعے ”نیر اعظم“ (جس میں نعتیہ حصہ بھی ہے) کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ لیکن ان پر لکھنے والے اہل قلم ”صوفی غلام مصطفیٰ تبسم“ اور ”مولانا کوثر نیازی“ نے اس شعر پر توجہ ہی نہیں دی۔ حالانکہ اگر یہ حضرات اس شعر کی نشاندہی کر دیتے تو اعظم چشتی اپنے مجموعے سے وہ شعر نکال دیتے یا خیال کی اصلاح کر لیتے۔ شعر ہے:

انسانیت کو بخشی وہ تو قیر آپ نے ہر آدمی سمجھنے لگا ہے خدا ہوں میں ۹۹

اس شعر کی معنوی پر توں کو کھولنا ضروری نہیں صرف اتنا کہدینا ہی کافی ہے کہ یہ شعر تعلیمات نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے منافی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی عجز کو پسند فرمایا ہے اور ان کی تعلیم بھی عجز و انکسار اختیار کرنے کی ہے۔ یہی نبی کا اسوۂ حسنہ ہے۔ خدا بننے کی خواہش رکھنے والے اور خود کو خدا سمجھنے والے تو فرعون و نمرود تھے جن کی روش سے بچ کر چلنا ہر مومن کا فرض ہے۔

اب ذرا دیکھئے کہ دیباچہ نگاروں نے اعظم چشتی کے لیے کیا کیا لکھا؟ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم رقمطراز ہیں:

”رسول پاک کی یاد انسان کے دل میں پاکیزہ جذبات اور افکار پیدا کرتی ہے اور پاکیزہ افکار سے پاکیزہ اشعار ابھرتے ہیں اور یہاں ایک نازک اور کٹھن مرحلہ ہے۔ یہاں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر جذبات میں کھو جانا اور پھر احترام کے دامن کو تھامے رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احترام کے ساتھ جذبات کی روک تھام ہی سے اچھی نعت وجود میں آتی ہے۔ اعظم کو قدرت نے یہی جو ہر عطا کیا ہے۔“ ۱۰۰

مولانا کوثر نیازی نے لکھا:

”یوں تو جتنی بھی اصنافِ سخن ہیں سب اپنی جگہ مشکل اور اہم ہیں مگر جو نزاکت نعت گوئی میں ہے وہ کسی اور صنفِ شعر میں نہیں پائی جاتی۔ یہاں

ایک طرف محبت کے تقاضے ہیں تو دوسری طرف شریعت کی حدود۔ جذبہ ایک طرف کھینچتا ہے تو علم دوسری جانب، عام محبوبوں کا معاملہ ہو تو قلم آزاد ہے جس طرح چاہے وارداتِ قلب کا نقشہ کھینچ دے مگر یہاں جس محبوب کی بات ہونی ہے، وہ محبوبِ خدا ہے۔ ایک ایک لفظ میزان میں تل کے ٹکنا چاہیے کہ کہیں سوءِ ادب نہ ہو جائے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، جو بات ہو افراط و تفریط سے بچ کر ہو، ایک طرف یہ پابندیاں ہیں اور دوسری طرف شعریت کا مزاج اتنا حساس ہے کہ وہ ان حدود و قیود سے فوراً آورد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اب محض علم کے بل بوتے پر نعت کہو تو جذبے کی روح سے خالی ہوگی اور محض جذبے کی بنا پر شعر کہو تو اس پر نعت کا اطلاق نہ ہوگا۔ گویا نعت کیا ہے کارِ گہہ شیشہ گری ہے ذرا سی ٹھیس لگی اور آبگینہ ٹوٹ گیا۔ آب و آتش کو یک جا کرنا پھر آسان ہے مگر جذبہ اور علم کی آمیزش سے نغزل کے کامل شعور کو برقرار رکھتے ہوئے نعت کہنا کارِے دارد..... اعظم چشتی کی نعتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں عشق بھی نظر آئے گا اور علم بھی، جذبے کی گہرائی بھی ہوگی اور فن کی گیرائی بھی۔ وہ اپنی نعتوں میں بے تکلف قرآنی آیات، دینی اصطلاحات اور تصوف کے اشارات و کنایات استعمال کر جاتا ہے اور اس کے باوجود شعریت کی روح برقرار رہتی ہے۔“ ۱۰۱۔

دیباچہ، مقدمہ یا تقریظ نگاروں کے درج بالا اقتباسات سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ انہوں نے ”کلیم“ کی ذات کو پیش نظر رکھا اور کلام کی جملہ خوبیوں اور خامیوں کی طرف قطعی دھیان نہیں دیا ورنہ کم از کم مذکورہ شعر تو اس مجموعے میں شامل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا تو تقریظ نگاروں کا اشارۃً اس کا ذکر اس بات کی شہادت دینے کے لیے کافی ہوتا کہ وہ اس شعر کی حد تک شاعر سے متفق نہیں ہیں۔ اب ان عظیم ناقدین کے عطا کردہ تصدیق ناموں کو کیا نام دیا جائے؟ معروضی تبصرے کا یا جانبدارانہ تنقیدی رائے سے صاحبِ کتاب کو نوازنے کا؟

بقا نظامی کے مجموعہ ”نعت“ ”شہرِ جبریل“ پر تقریظ لکھنے والوں میں بہت سے نامور لوگ شامل ہیں مثلاً: جوش ملیح آبادی، علامہ جمیل مظہری، علامہ جعفر شاہ پھلواری، پروفیسر شاہ مقبول احمد، پیرزادہ

سید آل احمد معینی، پروفیسر معین الدین دردائی، پروفیسر محمد اسلم، رئیس امر وہوی، تابش دہلوی، شاعر لکھنوی، عطاء الرحمن جمیل، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر وفا راشدی، شمر نظامی اور منظوم تقریظ لکھنے والوں میں ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی۔ لیکن یہ تمام آراء بقا نظامی کے مجموعی کلام پر ہے جس میں غزل کی کتاب ”صہبائے بقا“ پر زیادہ کلام کیا گیا ہے۔ البتہ شاعر نے خود اپنے دیباچے میں نعتیہ شاعری کی نزاکتوں سے آگاہی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”دراصل، نعت، حمد باری تعالیٰ کی ایک شکل ہے۔ ایک اچھی اور مکمل نعت سے قاری اور سامع کے دلوں کو عظمتِ الہی اور معرفتِ الہی کا ادراک ہوتا ہے۔ نعت وہ راہ ہے جس کو عرتی جیسے شاعر نے بردم تیغ، یعنی تلوار کی دھار سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ہوشیار ہو کہ نعت گوئی تلوار کی دھار پر چلنا ہے ذرا بھی ادھر ادھر قدم بہکا اور شاعر دنیا و آخرت میں راندہ درگاہِ الہی ہوا۔ اللہم احفظنا۔“ ۱۰۲

ہم نے بقا نظامی کی شاعری پر رائے دینے والے حضرات کے نام تو لکھ دیے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ شاعر کا دائرہ تعلقات کتنا وسیع تھا۔ لیکن کسی ناقد کی رائے اس لیے نقل نہیں کی کہ تقریظ نگاروں کی رائے براہِ راست نعتیہ شاعری بالخصوص زیرِ مطالعہ کتاب ”شہپر جبریل“ پر نہیں تھی۔ اس لیے صرف صاحبِ کتاب بقا نظامی عظیم آبادی کی رائے جو زیرِ عنوان ”منصبِ نعت گوئی“ درج کی گئی ہے اس کا اقتباس دیدیا ہے۔ اب اس تصورِ نعت کے بعد خود شاعر نے جو کلام پیش کیا ہے اس کی طرف رجوع کرتے ہیں تو ہمیں کچھ ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جن کی موجودگی نعتیہ کتاب میں بہت گراں گزر رہی ہے، مثلاً:

از ازل تا بہ ابد کوئی نہیں کوئی نہیں

آدمیت کا نمونہ آپ ہیں بس آپ ہیں ۱۰۳

یہاں آدمیت کا ”واحد نمونہ“ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو بتا کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کاروں کی سیرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی جھلک تک کی نفی کر دی گئی ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہونے کے ساتھ ساتھ خیر البشر بھی ہیں اس لیے صرف آدمیت کا نمونہ کہہ دینے سے نعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

جس نے دل و جگر کو نچھاور کیا بقا

ہاں ہاں بلال و ابوذر و سلمانؓ ہو گیا ۱۰۴

اس شعر میں حضور صلی علیہ وسلم کی ذات پر سو جان سے نثار ہونے والے کو صحابیت کا درجہ ملنے کی نوید ہے جو از روئے واقعہ درست نہیں۔ کیوں کہ صحابیت کا درجہ تابعین یا اتباع تابعین نے بھی نہیں پایا۔ آج حضور صلی علیہ وسلم کا کوئی امتی صحابیت کے مقام کو کیسے پاسکتا ہے؟ لہذا اس شعر کا مافیہ بھی خلاف حقیقت ہے۔

انا بشر زمانہ تم کو سمجھے، ہم نہ سمجھیں گے

بنائے کن فکاں تم وجہ تخلیق جہاں تم ہو ۱۰۵

قرآن کریم کی آیت ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

”کہد تیجے (اے نبی) کہ درحقیقت میں بھی ایک بشر ہوں تم ہی جیسا، وحی

کی جاتی ہے میری طرف۔“ ۱۰۶

قرآن کریم کی کسی آیت کا حوالہ دے کر، فخریہ انداز میں یہ کہنا کہ ہم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کریں گے کہ آپ صلی علیہ وسلم بشر ہیں، کیسی بڑی اور سنگین جسارت ہے! اس لیے یہ شعر بھی شرعی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔

قریب حضرت محبوبِ داور ہوتے جاتے ہیں

بقا اب آپ سلمان و ابوذر ہوتے جاتے ہیں ۱۰۷

یہاں بقا نظامی اپنے کسی روحانی ترفع کا احوال بتانا چاہتے ہیں لیکن عہدِ اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابیت کا درجہ کسی امتی کو ملنا محال ہے۔ چنانچہ اس دعوے کی وجہ سے یہ شعر نعتیہ مضامین کی حدود سے نکل گیا۔

مری ہستی کو آئینہ بنا ڈالا محبت نے

بلال و ابوذر و سلمان ہوں اب اور کیا کہیے ۱۰۸

اس شعر کو بھی اسی شعر کے ساتھ ملا کر دیکھیے جس میں یہ نوید سنائی گئی تھی کہ جس نے دل و جگر کو نچھاور کر دیا وہ بلال و ابوذر و سلمانؓ ہو گیا۔ وہاں بات تعمیم زدہ تھی تو یہاں تخصیص کی صورت میں دعویٰ ہے۔ لیکن کیا اس دعوے کو قبول کیا جاسکتا ہے؟

نعتیہ مجموعوں میں تقاریر، دیباچوں اور مقدمات میں تنقیدی رویوں کا جائزہ

یہ اشعار ایک ایسے مجموعے میں ہیں جس کا دیباچہ خود شاعر نے لکھ کر اپنی ”نعت شناسی“ کا اعلان کیا ہے۔ ایسی صورت میں شاعر کا دعویٰ کس کھاتے میں ڈالا جائے؟

اس باب کے اختتام پر صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ نعتیہ کتب میں شامل مقدمے، دیباچے یا تقریریں افراط و تفریط کا شکار بھی ہو سکتی ہیں۔ اس لیے کسی شاعر کی تخلیقی کاوش کے بارے میں دی جانے والی آراء کو معروضی انداز میں پڑھنے اور محتاط طریقے سے کسی کتاب کے ”متن“ کو پرکھنے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ہر کتاب کو شعری اور شرعی سطح پر پرکھنے کا عمل بہت زیادہ معروضیت کا متقاضی ہے۔



مآخذ و منابع:

- ۱۔ فہرست کتب، نعت لائبریری شاہدہ، لاہور، طبع دوم: اکتوبر ۲۰۰۶ء
- ۲۔ فہرست کتب خانہ، نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، بار اول ۲۰۰۹ء
- ۳۔ مجموعہ مطالعات عبدالحق، ص ۶۵۰
- ۶۔ اردو لغت، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی
- ۸۔ ایضاً ص ۵۹
- ۹۔ اردو لغت
- ۱۱۔ اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، ص ۱۹
- ۱۳۔ اردو میں مقدمہ نگاری کی روایت، ص ۱۹
- ۱۵۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات، ص ۱۴۲
- ۱۷۔ کلیات نظم حالی، ج: اول، ص ۲۵۹
- ۱۹۔ ایضاً، ص ۲۶-۲۷
- ۲۳۔ آپ سلی اللہ علیہ وسلم، ص ۱۱۱
- ۲۷۔ تقدیس، ص ۱۲
- ۳۱۔ ایضاً ص ۸۸
- ۳۵۔ ایضاً ص ۱۰۰
- ۳۹۔ ایضاً ص ۹۷
- ۴۳۔ ایضاً ص ۷۵
- ۴۷۔ ایضاً ص ۹۰
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۳۰
- ۲۳۔ ایضاً ص ۱۱۴
- ۲۸۔ ایضاً
- ۳۲۔ ایضاً ص ۷۱
- ۳۶۔ ایضاً ص ۴۶
- ۴۰۔ حرف حرف خوشبو، ص ۱۸
- ۴۴۔ ایضاً ص ۸۳
- ۴۸۔ ایضاً ص ۹۶
- ۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱
- ۲۵۔ ایضاً ص ۱۱۵
- ۲۹۔ ایضاً
- ۳۳۔ ایضاً ص ۷۸
- ۳۷۔ ایضاً ص ۹۴
- ۴۱۔ ایضاً ص ۶۶
- ۴۵۔ ایضاً ص ۸۵
- ۴۹۔ ایضاً ص ۹۸
- ۲۲۔ ایضاً ص ۳۱
- ۲۶۔ ایضاً، سرورق
- ۳۰۔ م۔ ص، ص ۲۰
- ۳۴۔ ایضاً ص ۷۹
- ۳۸۔ ایضاً ص ۹۶
- ۴۲۔ ایضاً ص ۷۳
- ۴۶۔ ایضاً ص ۸۷
- ۵۰۔ محراب توحید، ص ۱۶

۵۱۔ ایضاً ص ۱۶	۵۲۔ ایضاً ص ۱۶	۵۳۔ روشنی ہی روشنی، ص ۲۳	۵۴۔ ایضاً ص ۴۴
۵۵۔ ایضاً ص ۶۶	۵۶۔ جلوہ گاہ، ص ۸	۵۷۔ تجلیات، ص ۷	۵۸۔ باب جبریل، ص ۹
۵۹۔ ایضاً ص ۸۶	۶۰۔ شعرا العجم، حصہ اول، ص ۱۶۴	۶۱۔ حاضری و حضوری، ص ۱۴	۶۲۔ ایضاً ص ۵۸
۶۳۔ جمل جہل فروز، ص ۶۴	۶۴۔ ایضاً ص ۴	۶۵۔ ایضاً ص ۷	۶۶۔ ایضاً ص ۷
۶۷۔ ایضاً ص ۹	۶۸۔ ایضاً ص ۵۴	۶۹۔ نعت رنگ، شمارہ ۲، ص ۲۹	۷۰۔ چراغ عالمیں، ص ۱۷
۷۱۔ ایضاً ص ۲۳۸	۷۲۔ ضیاء القرآن، ج: پنجم، ص ۳۳۹	۷۳۔ ایضاً، ج: ۲، ص ۶۲۳	۷۴۔ چراغ عالمیں، ص ۱۹
۷۵۔ ایضاً ص ۲۲	۷۶۔ ایضاً ص ۲۶	۷۷۔ ایضاً ص ۲۹	۷۸۔ ایضاً ص ۳۰
۷۹۔ ایضاً ص ۳۹	۸۰۔ صحیفہ نور، ص ۱	۸۱۔ ایضاً ص ۳	۸۲۔ ایضاً ص ۱۱
۸۳۔ ایضاً ص ۲۳	۸۴۔ ایضاً ص ۳۰	۸۵۔ ایضاً ص ۳۲	۸۶۔ ایضاً ص ۳۴
۸۷۔ ایضاً ص ۳۶	۸۸۔ ایضاً ص ۳۸	۸۹۔ ایضاً ص ۴۰	۹۰۔ ایضاً ص ۴۲
۹۱۔ ایضاً ص ۴۶	۹۲۔ ایضاً ص ۵	۹۳۔ اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۰	
۹۴۔ ایضاً ص ۱۹	۹۵۔ القرآن، ص ۳۶: ۶۹	۹۶۔ حقیقت محمدیہ، ص ۲۱	
۹۷۔ الرحیق المختوم، ص ۵۶۵		۹۸۔ اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۲۰	
۹۹۔ نیر اعظم، ص ۴۱		۱۰۰۔ ایضاً ص ۱۲	
۱۰۱۔ ایضاً ص ۱۷		۱۰۲۔ شہر جبریل، ص ۱۲	
۱۰۳۔ ایضاً ص ۸۳		۱۰۴۔ ایضاً ص ۹۰	
۱۰۵۔ ایضاً ص ۱۰۹		۱۰۶۔ القرآن، ص ۱۸: ۱۱۰	
۱۰۷۔ شہر جبریل، ص ۱۲۵		۱۰۸۔ ایضاً ص ۱۵۵	

غالب کی مثنوی 'بیانِ معراج' کا تنقیدی مطالعہ

ABSTRACT:

"BAYAAN-E-MI'RAJ" is a part of Mathnavi 'Abr-e-Gohar Bar' (Cloud, pouring pearls) showing miraculous journey of Prophet Muhammad (S.A.W.) from Masjid-e-Haraam (Makkah) to Masjid-e-Aqsa (Jerusalem) wherefrom skies for experiencing the unseen world. Ghalib applied astronomy instead following narrative of Quran and Sunnah. The article presented below contains salient features of Ghalib's poetic work to elaborate beauty of expression and pointing out facts and fantasy of text. Some comparative points are also mentioned in poetic works of similar nature in Iqbal and Shafiq's poetry.

تقدیمی ادب پر ہمارے ناقدین نے بہت کم توجہ دی بلکہ اکثریت نے ان تخلیقات کو سرے ہی سے ناقابلِ اعتنا سمجھ کر ان سے صرف نظر کیا، جبکہ بعض زبانوں کے ادب پاروں میں تقدیمی ادب کو کلاسک کا درجہ دیا گیا اور اس کے تقدس کو برقرار رکھنے کے جتن کئے گئے ہیں۔ ہندی میں ٹلسی کی راماین اور مراٹھی میں ”گیا نیشوری“ ہمارے سامنے کی مثالیں ہیں۔ تقدیمی ادب سے اغماض برتنے کی چند وجوہ بھی ہو سکتی ہیں۔ جیسے مذہب بیزاری، دینی علوم سے عدم واقفیت، علمائے کرام کا خوف، مادیت پسند ادبی تحریکوں کے اثرات وغیرہ۔ ان عوامل کی فعالیت کچھ اس قدر شدید رہی ہے کہ ہماری بعض نہایت اہم تخلیقات گوشہٴ گمنامی میں پڑی رہیں۔ ایسی تخلیقات میں مرزا غالب کی فارسی مثنوی ’ابرِ گہر بار‘ کے لازمی جزو ”بیانِ معراج“ کا شمار کیا جاسکتا ہے۔ صنفِ مثنوی کے عناصر ترکیبی میں نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا شمار ہوتا ہے۔ مثنوی نگار نعتِ رسول کے ساتھ اکثر اوقات واقعہٴ معراج کو نظم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ غالب نے اس مثنوی میں نعتِ رسول اور واقعہٴ معراج دونوں کو بہ اہتمام نظم کیا ہے۔ معراج کے واقعہ کو انھوں نے اس انداز سے نقل کیا ہے کہ وہ بذاتِ خود ایک مثنوی بن گئی

ہے۔ غالب کی اس تقدیری تخلیق کو بے اعتنائی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، جبکہ واقعہ معراج کے تاریخ ساز واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں ڈانٹے کی 'دیوان کا میڈی'، امیر خسرو کی 'نہہ سپہر'، ابوالعلیٰ معری کی رسالۃ الغفران، ابن شہید الاندلیسی کی 'رسالۃ التوابع والذوابع' اور ڈاکٹر علامہ اقبال کے 'جاوید نامہ' کو جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے، غالب کی مثنوی کو ان کا عشرِ عشر حصہ بھی نہیں مل سکا۔ افسوس تو اس امر کا ہے کہ 'جاوید نامہ' لکھتے وقت اقبال نے شیخ محمد غوث گوالیاری کی غیر معروف کتاب کو تلاش کرنے کے لیے اپنے احباب کو خطوط لکھے، رسالۃ الغفران اور التوابع کے مطالعہ کا ذکر کیا مگر 'جاوید نامہ' کے سو سال قبل لکھی ہوئی غالب کی مثنوی سے استفادہ کا کہیں ذکر نہیں، حالانکہ دونوں کا تقابل کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال کی فکر کا سررشتہ غالب کے بیان معراج سے ملتا ہے۔

غالب کا فارسی دیوان ان کی حیات میں پہلی بار ۱۸۴۵ء میں دارالسلام دہلی سے شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اگرچہ ۱۸۳۵ء ہی میں اسے "میںخانہ آرزو" کے نام سے مرتب کر دیا تھا لیکن یہ اردو دیوان کے چار سال بعد شائع ہوا تھا۔ ان کے فارسی دیوان کا دوسرا ایڈیشن منشی نول کشور پریس سے ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اس دیوان میں بیس برس کا بقیہ کلام اور مثنوی "ابر گہر بار" پہلی بار شائع ہوئے۔ یہی مثنوی غالب کی فارسی تصنیف 'سبد چین' اور 'سبد باغ اردو' میں بھی شامل کر دی گئی تھی، لیکن ترتیب کا یہ عمل غالب کی وفات کے بعد ہوا۔ 'مثنوی ابر گہر بار' میں نعتیہ اشعار کی کل تعداد ۴۷۸ ہے۔ ان میں ۲۸۱ اشعار [بیان معراج] کے متعلق اور مثنوی کے دیگر اجزاء (حکایت، معنی نامہ، اور ساقی نامہ) میں ۱۴۰ اشعار قلم بند ہوئے ہیں۔ مثنوی کے ترکیبی عنصر کے تحت 'ابر گہر بار' کی ابتدا میں ۵۷ اشعار کی طویل نعت بھی لکھی گئی ہے۔

مثنوی کے ترکیبی عناصر کے تحت نعتیہ مضمون میں معراج نامہ لکھنے کی روایت شروع ہی سے رہی ہے۔ اردو میں ملا نصرانی نے 'گلشن عشق' اور 'علی نامہ' میں معراج کے واقعہ کو اتنی تفصیل سے بیان کیا ہے کہ وہ ایک علاحدہ مثنوی بن گئی ہے۔ اس کے علاوہ معراج کے موضوع پر مستقل 'معراج نامے' اردو۔ فارسی میں لکھے گئے ہیں اردو میں بلاقی کے معراج نامہ کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ بلاقی نے ۱۰۶۵ھ میں اسے مکمل کیا تھا۔ بلاقی کے علاوہ شاہ کمال، مختار، محمد باقر آگاہ، ہاشمی، قربانی، ضمیر لکھنوی، امین گجراتی وغیرہ نے بھی معراج نامے قلم بند کئے ہیں۔ رشید احمد خاں نے ناسخ کے معراج نامہ کا ذکر دیوان ناسخ کے مقدمے میں کیا ہے۔ لیکن علم نجوم کو اساس بنا کر اردو میں صرف ایک معراج نامہ کبھی نرائن شفیق نے لکھا تھا۔ اسی طرح علوی سفر پر مشتمل 'جاوید نامہ'، 'نہہ سپہر' کی طرز پر اردو میں مضطر مجاز

غالب کی مثنوی 'بیانِ معراج' کا تنقیدی مطالعہ

نے ”شہرِ بقا“ لکھی۔ اقبال خود اس قبیل کا معراج نامہ لکھنا چاہتے تھے، لیکن زندگی نے وفانہ کی۔ اب غالب کے 'بیانِ معراج' کے اردو تراجم ہی ہمارے ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے لیے کافی ہیں اور اردو کے باذوق قارئین ان ہی ترجموں پر اکتفا کر رہے ہیں۔

'معراج' تاریخِ اسلام کا اہم واقعہ ہے۔ سماجی مقاطعہ، چچا کی موت اور بیوی کی وفات جیسے سانحات سر سے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پاک کو آسمانوں پر بلایا گیا۔ جنت و جہنم کی سیر کرائی گئی۔ اس آسمانی سفر کی روداد جن تخلیقات میں بیان کی جاتی ہیں، انھیں معراج نامہ کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں معراج کے سفر کا اجمالاً تذکرہ ہے لیکن احادیث میں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ برق رفتار براق پر سوار ہو کر آپ بیت المقدس سے عرشِ اعلیٰ پر جا پہنچے اور تمام آسمانوں کی سیر فرمانے کے بعد مکہ مکرمہ واپس لوٹ آئے۔ معراج نامہ میں علوی سفر کی یہی روداد بیان کی جاتی ہے، لیکن عالمی ادب میں ڈیوائن کامیڈی اور ہومر کی 'اوڈی سی' جیسے جو علوی سفر نامے قلم بند ہوئے ہیں وہ تمام تر تخیلاتی ہیں، جبکہ سفرِ معراج کا واقعہ حقیقی اور تاریخی ہے۔ غالب نے مثنوی 'بیانِ معراج' میں اس سفر کے واقعات اپنی فکر و عقیدت اور شاعرانہ خیال آرائی کے سہارے علمِ نجوم کو اساس بنا کر بیان کئے ہیں۔ غالب سے قبل ابن العربی کی 'فتوحات مکیہ'، حکیم سنائی کی 'سیر العباد الی المعاد' اور امیر خسرو کی 'نہہ پہر' جیسی سماوی سفر پر مشتمل کتابوں میں بھی علمِ نجوم کے نکات کی توضیح نہایت مؤثر انداز میں ہوئی ہے۔

'بیانِ معراج' خالصتاً مذہبی موضوع کی حامل مثنوی ہے۔ مگر غالب نے شعری جمالیات کے سہارے اور مضمون و معنی آفرینی کے ذریعہ اس کے کشف کو بڑی حد تک کم کر دیا ہے۔ عقیدت میں فن کو سامنے کا یہ ہنر بڑا مستحسن ہے۔ مذہبی امور کا یوں فنکارانہ اظہار کہ تقدس مجروح بھی نہ ہو، نہایت مشکل عمل ہے۔ واقعہ معراج بیان کرتے وقت انھوں نے علمِ نجوم کے غوامض کو ماہر فن کی طرح منکشف کیا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس علم میں درک رکھتے تھے بلکہ سیاروں کے سعد و نحس اثرات کو بھی مانتے تھے۔

مثنوی "بیانِ معراج" غالب نے رات کی تعریف سے شروع کی۔ معراج کے واقعہ کو قرآن حکیم میں اسرئیل بعبدہ لیل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسرئیل کے معنی رات میں سفر کرنے کے ہوتے ہیں۔ معراج کا واقعہ رات میں پیش آیا تھا اس لیے 'شبِ معراج' کی اہمیت دیگر راتوں کے بالمقابل کچھ زیادہ متصور کی گئی ہے۔ غالب نے اس مقدس نسبت کا خیال کرتے ہوئے اس شب کی تعریف میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں۔ پہلے شعر میں اس رات کو انھوں نے راتوں اور دنوں کا جوہر کہا

ہے۔ لیل و نہار کے متواتر منقلب ہوتے رہنے سے زمانہ وجود میں آیا ہے۔ یہ زمانہ انفجار عظیم اول سے قیامت کے انفجارِ آخری تک تشکیل پاتا رہے گا۔ گردشِ دہر کی چکی پر انگنت شب و روز گزرتے رہیں گے۔ ان سب سے افضل و اکبر معراج کی رات ہے۔ غالب اسی لیے اس کی مدحت کرتے نہیں تھکتے۔ طبعی طور پر رات روشنی کی نقیض ہے۔ مگر غالب کہہ رہے ہیں کہ یہ رات تو آنکھوں کو روشنی بخشنے والی ہے۔ یہ دن کی آنکھوں میں سرمہ کے مانند ہے۔ یہ ایسی رات ہے جس سے حاصل ہونے والی خوشیوں (عیدوں) کی فہرست لکھتے لکھتے اس کی سپیدی کثرت تحریر کی وجہ سے سیاہی میں بدل گئی ہے۔ غالب نے اس رات کو روشنی کی دولت سمیٹنے والے ضمیر کی رات کہا ہے جو ہر روز نہیں آتی صرف ایک مخصوص دن کے مقدر ہی میں یہ شب تھی۔ اس رات نے سورج کے نور سے دن بھر خود کو دھویا اور جب دن غروب ہو گیا تو عربی دستور کے مطابق لیلائے شب نے اپنے محمل کو درست کیا۔ یہ رات آنکھ کی کالی پتلی میں نور کی طرح روشن تھی۔ اس رات میں لیلائے شب کے راستے میں خورشید کی دمک بھرے ہوئے ذروں سے نور کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ اگرچہ اس رات کی روشنی و نور کے تمام اسباب میسر تھے مگر وہ خورشید کی احسان مند نہیں تھی۔ غالب کہتے ہیں، میں اس رات کو ماہِ دلبر کیوں کہوں! کہ اس کے جسم کے زیور کا ایک گہر آفتاب تھا جو اس کے زیور سے گم ہو گیا تھا، لیکن ایک گہر کے گم ہو جانے سے اس کے منور جسم کی روشنی تھوڑی ماند پڑتی ہے۔ رات میں آفتاب کی عدم موجودگی کو زیورِ شب کے گہر کی گمشدگی قرار دینا نہایت پیچیدہ استعارے کا نمونہ ہے۔ اس کی صنائی میں غالب کے تخیل کی پرواز کا کمال دیکھتے بنتا ہے۔ تقدیسی شاعری میں مضمون و معنی آفرینی کے ایسے ابعاد واکرنا اور شعریت کے رنگ و روغن سے ”رات“ کے نہایت عام موضوع کو منور و محترم بنا دینا غالب کے فن کا کمال ہے۔ شبِ معراج کی مدحت کا ایسا انداز اُردو، فارسی میں شاید ہی ملے۔ ایک شعر میں وہ معراج کی نورانیت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

بہ زیرِ زمیں کردہ خفاش روئے پئے امنِ گردِ دیدِ خورشید جوئے

(یعنی چگاڈ جیسے تاریکی پسند ہوتی ہے، وہ معراج کی رات کی روشنی کی تاب نہ لاسکی

اور اس کی روشنی سے بچنے کے لیے زمین کے نیچے جا چھپی اور اپنی جان کی امان کے

لیے سورج کی تمنا کرتی رہی۔)

غالب اگر سیدھے سپاٹ انداز میں یہ کہہ دیتے کہ اس روشن رات کے سامنے آفتاب بھی تاریک دکھائی دیتا ہے، تو نہ اس میں ندرت پیدا ہوتی نہ خیالِ آرائی کا کوئی پہلو نکلتا۔ غالب نے اس

غالب کی مثنوی 'بیان معراج' کا تنقیدی مطالعہ

شعر میں طبعی صداقت کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ زمین کے شرقی کرے میں اگر رات ہو تو غربی کرے میں سورج روشن رہتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ معراج کی رات اس قدر روشن ہے کہ تحت الارض گیا ہوا سورج اس روشنی کے سامنے ماند پڑ گیا اور چمکاؤ اس شب کی روشنی سے بیتاب ہو کر تحت الارض پہنچ گئی۔ یعنی جدھر سورج تھا ادھر چلی گئی۔ معراج کی رات کے روشن ہونے کی دوسری توجیہ وہ یوں بیان کرتے ہیں:

کہ گوئی مگر مہر زیرِ نگیں

فروزاں فوہ بودو پشتِ نگیں

اس شعر کے متعلق غالب منشی نبی بخش حقیر کے نام ۱۹ نومبر ۱۸۵۲ء کے خط میں تحریر فرماتے

ہیں کہ:

”یہ شعر شب معراج کی توصیف میں ہے کہ وہ شب ایسی روشن تھی کہ بہ سبب روشنی کے زمین ایسی چمکتی تھی جیسے ڈانک سے نگینہ چمک جاتا ہے۔ آفتاب رات کو تحت الارض ہوتا ہے اور ڈانک بھی نگینے کے تلے لگاتے ہیں اور نگینہ بقدر ڈانک کی حقیقت کے چمکتا ہے۔ پس جس نگیں کے نیچے آفتاب ڈانک ہوگا، وہ نگیں کتنا درخشاں ہوگا۔“

(مرزا غالب: مرتبہ، خلیق انجم، ”غالب کے خطوط“، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی ۱۹۸۷ء ج ۳ ص ۱۱۱۵)

اس شب کا وصف بیان کرتے ہوئے غالب آگے کہتے ہیں کہ معراج کی شب ایسی تابناک تھی کہ اس کی روشنی کے سامنے صبح کو اپنے وجود کی امید ہی نہ رہی تھی کہ اس رات کے سامنے وہ سپید ہو سکے گی۔ آگے غالب نے نادر تشبیہات کے سہارے اس شب کی اوصاف بیانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بالفرض اگر سورج بھی اس راہ میں واماندہ راہ ہو کر طلوع ہو جاتا تو اس کی آب و تاب کھو جاتی اور اس روشن رات کے مقابلے میں وہ کسی حسینہ کے چہرے پر مشک کے تل کے مانند دکھائی دیتا۔ سودا نے ”ہاتھی کی تعریف میں“ لکھے گئے قصیدے میں ہاتھی کے سفید دانتوں کو لیلیٰ کے ہاتھوں سے تشبیہ دی تھی۔ لیکن لیلیٰ (عربی میں کالی کلوثی چہرے والی کو لیلیٰ کہتے ہیں) کے سیاہ جسم کی مناسبت سے یہ تشبیہ نہایت بھونڈی اور دور از کار معنی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برعکس معراج کی رات کی تابناکی میں سورج کو حسینہ کے چہرے کا تل کہنا طبعی حقیقت کے منافی ہونے کے باوجود اس میں نہ صرف یہ کہ معنویت ہے، بلکہ اسی معنویت نے اس میں صداقت کے نور کی آمیزش کی ہے۔

غالب آگے رقمطراز ہیں کہ یہ رات اتنی روشن تھی گویا دن محسوس ہوتی تھی۔ اس کی صوفشانی کا یہ عالم تھا کہ اگر روشن رخساروں کو اس رات سے تشبیہ دی جاتی تو کچھ تعجب نہ ہوتا:

از آں روز تشبیہ عارض بہ شب
اگر رسم گشتے نبودے عجب
(یعنی اس دن سے اگر رسم پڑ جاتی کہ روشن رخساروں کو رات سے تشبیہ دی جایا
کرے تو کچھ تعجب نہیں)
آگے وہ لکھتے ہیں:

”کہ اس رات میں نور پر نور کی موجیں اس طرح اٹھ پڑتی تھیں کہ دنیا میں نور
کا دریا رواں تھا۔“

توصیفِ شب کے بعد غالب واقعہ معراج بیان کرتے ہیں کہ معراج کی خوش خبری سنانے
حضرت جبریلؑ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان پر تشریف لائے اور کہا کہ اللہ رب العزت آپ کا طالب
دیدار ہے۔ موسیٰؑ نے ”رب ارنی“ کا تقاضا کیا تھا، وہی تقاضا اب رب کریم آپ سے کر رہا ہے۔

توئی کا نچہ موسیٰ باوگفتہ است
خداوند یکتا بتو گفتہ است
(یعنی آپ کی وہ ہستی ہے کہ موسیٰؑ نے خدا سے جو تقاضا کیا تھا، وہی تقاضا خداوند یکتا آپ
سے کر رہا ہے)

غالب نے فرط عقیدت اور عشقِ نبی میں مبالغہ کی انتہا تک پہنچ کر یہ شعر کہہ تو دیا مگر انھوں نے
اس جانب توجہ نہیں دی کہ اس میں شانِ خداوندی میں استخفاف کا پہلو نکلتا ہے۔ فرط عقیدت میں اکثر
میلاد خواں نعت گو شعراء نے اس مضمون کو باندھا ہے۔ حضرت جبریلؑ کی معروضات کو غالب آگے
اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اے محمد! حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر اللہ نے جلوہ دکھایا تھا، لیکن آپ کو جلوہ
دکھانے کے لیے راہ کے ان پتھروں (کوہ طور) کو ہٹا دیا گیا۔ آپ کی شاہراہ معراج پتھر ملی اور پر
مشقت زمین کی نہیں۔ یہ تو اس کنارے سے اس کنارے تک وسیع اور کشادہ ہے۔ یہ پوری راہ راہِ
ایمن ہے۔ گو یہ سفر رات کا ہے، مگر یہ رات آپ کے لیے روشن کر دی گئی ہے۔ فرشتہ کہتا ہے کہ میں یہ
تو نہیں کہوں گا کہ خداوند عالم آپ کی محبت میں مبتلا ہے تاہم اتنا ضرور کہوں گا کہ ادھر سے جذبہ خلوص
سچا ہے۔ اس جہاں آفریں کو نہ بھوک ہے نہ سونا نہ اونگھ، لیکن آپ کی طلب میں وہ بے چین ہے۔ اس
لیے جلد اٹھیں اور نو آسمانوں کو طے کر ڈالیں۔ غالب نے اس درمیان حضرت جبریلؑ کی مدح میں بھی
اشعار کہے ہیں۔ وہ جبریلؑ کو ”امین“ اور ”عقل اول“ کہتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جبریلؑ

غالب کی مثنوی 'بیان معراج' کا تنقیدی مطالعہ

خداوند عالم کا سب سے بڑا دربان، فرشتوں کا فرشتہ، رازدانِ غیب، اور پیغمبروں کے سامنے سے پردے اٹھانے والا یعنی کاشفِ اسرار ہے۔ وہ حق کے جوہر اصلی سے اپنی پیاس بجھاتا ہے۔ اس کے پروں کی آواز میں ایسی تابانی ہوتی ہے کہ اسے دیکھنے کے لیے کان آنکھ بن جاتے ہیں۔ یہ تراکیب و لفظیات اور پیچیدہ خیالی غالب کی مشکل پسندی کے مظہر ہیں۔ جبریل کے اوصاف بیان کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جبریل کی آمد سے بحرِ انوار موجزن ہو جاتا ہے۔ آپ پر اس کے نزول کا تو اترا اتنا زیادہ ہے کہ جو کچھ آپ کے دل میں ہوتا ہے وہ جبریل کی پیشانی پر ہوتا ہے۔

جبریل کا مژدہ جاں فزا سنانے کے بعد غالب اب آپ کے لیے لائی ہوئی سواری براق کی تعریف کرتے ہیں۔ روایتی معراج ناموں میں براق کے حلیے کی تعریف بہت زیادہ کی گئی ہے لیکن لفظ ”بَراق“ (برق رفتار) کے اعتبار سے غالب نے اس کی رفتار کے بیان ہی پر زور صرف کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایسا گھوڑا ہے جس نے جنت کی خوشبودار گھاس کھائی ہے۔ اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ گنبد سے گیند کے گرنے کو جتنا وقت درکار ہوتا ہے اتنی دیر میں یہ آسمان سے زمین پر اتر آتا ہے۔ وہ اتنا تیز رفتار ہے کہ جتنی دیر میں زبان سے لفظ ”آیا“ ادا ہوتا ہے اتنی دیر میں وہ آکر نکل بھی جاتا ہے۔ اس کی چمکدار سم سورج کا اور دُم گیسوئے حور کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ گھوڑا نسیمِ سحر سے زیادہ سبک رفتار ہے کہ اس کی حرکت سے پھول سے نکلت پھوٹی ہے۔ وہ اتنا سریع السیر ہے کہ دل کی ایک دھڑکن یا آنکھ کی ایک بار پلک جھپکنے میں وہ دو سو بار فاصلے طے کر لیتا ہے۔ غالب نے براق کی تیز رفتاری کی توضیح کلمہ طیبہ کے حوالے سے بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لا الہ کے اثر کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ زبان پر یہ کلمہ آیا اور تمام عقائد باطلہ ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ویسی ہی رفتار اس براق کی ہے۔ ایک شعر میں انھوں نے براق کو ”آتشیں سواری“ کہا ہے۔ اس کی سم سے قارون کے خزانے نکل آتے ہیں اور دم کی حرکت سے پروین کی لڑی بکھر جاتی ہے۔

براق کے سفر کے احوال بیان کرتے ہوئے غالب کہتے ہیں کہ ہوا براق کے پیروں کو بوسہ بھی نہ دے پائی تھی کہ وہ ’کرۂ ہوا‘ سے گزر کر ’کرۂ نار‘ میں پہنچ گیا۔ یہ ایک جغرافیائی حقیقت ہے کہ ہماری زمین کے گردا گرد کرۂ ہوا ہے اور اس کے اوپر کرۂ نار کا غلاف ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہمارے سائنسدانوں کے دانے ہوئے مصنوعی سیاروں کے مستقر ہیں۔ ہمارے الیکٹرانک مواصلاتی نظام کے لئے یہ کرۂ نہایت سودمند ہے۔ امرِ تعجب تو یہ ہے کہ غالب کے زمانے کے بہت بعد تک کرۂ نار کا علم ماہرینِ فلکیات کو بھی نہیں تھا۔ پتہ نہیں غالب کے تخیل کی یہ کارفرمائی تھی یا واقعی وہ اس کرے سے باخبر

تھے۔ بیت المقدس تک کے سفر کے بعد سفر معراج کا اگلا پڑاؤ غالب نے چاند (فلک قمر) کو بتایا ہے۔ براق کا قدم چاند کے تخت پر یعنی فلک اول پر پڑتا ہے تو اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم ہے کہ براق کی کلغی آسمانوں کے سب سے بلند ترین سیارے کیوان (زحل) کے تاج تک جا پہنچتی ہے۔ آپ کی آمد سے اس کی مسرت ایسی دوبالا ہوئی کہ وہ تحت الشعاع میں آکر بھی آفتاب کے بالمقابل مہتاب بن گیا ہے۔ یاد رہے کہ تحت الشعاع چاند کی گردش کا وہ مقام ہے جہاں وہ مطلق دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں غالب نے یہ معنوی نکتہ پیدا کیا ہے کہ چاند کا اس رات فلک پر کوئی وجود نہیں تھا مگر شب معراج کی وجہ سے وہ اتنا روشن ہو گیا گویا ماہِ کامل ہو۔ اس رات میں فضیلتِ قمر کا یہ حال تھا کہ وہ آفتاب کی روشنی کا محتاج نہیں رہا کیونکہ حضور سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی وجہ سے اس کی توقیر میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی حیثیت کو وقار حاصل ہو چکا تھا۔

فلکِ قمر سے آپ کی سواری فلکِ دوم پر پہنچی۔ یہاں آپ کا خدنگ تیر نظر عطار د تھا۔ یعنی آپ نے سفرِ شب میں اپنی روشن آنکھوں سے عطار د کو دیکھا۔ فارسی میں عطار د کا ایک نام 'تیر' بھی ہے۔ شاعر نے تیر و عطار د کے استعمال سے شعر میں معنوی حسن پیدا کر دیا ہے۔ عطار د دیرِ فلک بھی ہے اور صاحبِ قلم بھی۔ آپ کی آمد پر وہ مدحتِ رسول بیان کرنے کے لیے غالب کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔ فلکِ عطار د پر شاعر (غالب) نے چند نعتیہ اشعار نقل کیے ہیں، جن میں آپ کے وصفِ شفاعت کو بیان کیا ہے۔ غالب کی اس نعت میں عجز و انکسار نمایاں ہے۔ اس کے بعد آپ کی سواری تیسرے آسمان پر پہنچتی ہے۔ اس فلک کا سیارہ زہرہ ہے۔ یہ قص و موسیقی کی دیوی ہے۔ اس کی محفل چنگ و رباب، بربط و جھانجھ اور صہبا و جام سے آراستہ رہتی ہے لیکن معراج کی رات آپ کی آمد کی خبر سن کر زہرہ اس قدر گھبرا جاتی ہے کہ تمام آلات موسیقی اور سامانِ عیش چھپا دیتی ہے۔ گھبراہٹ میں اس کا بربط ٹوٹ جاتا ہے اور صرف چاند کا دف اس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ علمِ نجوم میں زہرہ اور چاند کی دوستی معروف ہے۔ دف کی شکل عموماً چاند جیسی ہوتی ہے اس لیے غالب نے یہاں چاند کا دف کہا ہے۔ اسی طرح زہرہ کو رقصہٗ فلک کہنا بھی علمِ نجوم کے اعتبار سے صحیح ہے۔ یہاں غالب نے زہرہ کی تمام حرکات و سکنات کو علمِ نجوم کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

کہ در جلوہ بر سر کشد بامداد

ردائے ز نورش بہ انعام داد

(یعنی انھوں نے رقصہٗ فلک (زہرہ) کو نور کی چادرِ انعام میں دی تا کہ صبح ہوتے ہی

اپنے سر پر ڈال لے)

زہرہ آسمان میں صبح صبح نمودار ہوتا ہے، اس اعتبار سے نور کی چادر انعام میں دینا بڑا معنی خیز ہے۔ نیز علم نجوم کے نکتہ کی کارفرمائی بھی یہاں دکھائی دیتی ہے۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا براقِ فلک چہارم کی طرف پرواز کرتا ہے۔ یہ فلک شمس ہے۔ وہاں سونے کا ملمع چڑھا ہوا ایک عالی شان محل ہے جس کے دروازے پر ہوشنگ اور کیکاؤس جیسے شان و شکوہ والے لوگ زمین بوس تھے گویا وہ اس محل والے سے بھیک مانگ رہے ہوں۔ غالب نے صاحب محل کو شہنشاہ گر کہا ہے۔ یہ آفتاب ہے جس سے اوقات ناپے جاتے ہیں۔ روزہ نماز کے اوقات کا تعین بھی اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ کی آمد کا مژدہ سن کر فرط مسرت میں اس کی (شمس کی) ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ اسے اپنے سر، پیر کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ چوتھے آسمان پر آپ کا استقبال موسیٰ اور سورج کرتے ہیں۔ بہت سارے متقدمین سلاطین آپ کو سلام کرتے ہیں اور آپ پر درود بھیجتے ہیں۔ غالب نے علم نجوم کو یہاں احادیثِ معراج پر فوقیت دی ہے۔ کیوں کہ احادیث میں موسیٰ علیہ السلام سے معراج میں آپ کی ملاقات چھٹے آسمان پر ہوئی تھی غالب نے انھیں چوتھے آسمان پر سورج اور سلاطین متقدمین کے ہمراہ بتایا ہے۔ دراصل موسیٰ علیہ السلام اہل مصر سے تھے اور آپ کے زمانے میں مصر میں یہ بنیادی عقیدہ تھا کہ بادشاہ (فرعون) سورج (جسے وہ 'را' دیتا کہتے تھے) کا بیٹا ہوتا ہے۔ علم بشریات اور تاریخِ مدن میں مصر کے متعلق یہ ساری باتوں کو غالب نے علم نجوم کے حوالے سے نظم کیا ہے۔

فلک چہارم سے شاہِ معراج کی سواری پانچویں آسمان کی سمت روانہ ہوئی۔ اس فلک کا سپہ سالار مرتخ ہے۔ غالب نے مرتخ کی شجاعت و جفاکشی کے متعلق جو کچھ نظم کیا ہے وہ تمام خوبیاں علم نجوم میں اس کی اوصاف مانی گئی ہیں۔ مثلاً مرتخ کا مغرور و متکبر ہونا، خنجر کے دھنی ترکوں کی روحوں کا یہ مسکن ہونا، جنگ جو بادشاہوں کی مرتخ پر سکونت، شاہِ پشنگ (پدر افراسیاب) کی وہاں موجودگی یہ تمام کونف و واقعات مرتخ کے مزاج سے لگا کھاتے ہیں۔ مرتخ پانچویں آسمان پر آپ کی آمد کی نوید سن کر اپنی کلغی سے راستے کے موتی صاف کرتا جا رہا تھا تا کہ آپ کی سواری کو چلنے میں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ مرتخ کی تابناکی دیگر سیاروں کے بالمقابل زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی روشنی کی وجہ سے اس کے اطراف کے ستارے مدھم روشنی کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتے۔ غالب نے اس عمل کو راستے سے موتی جھاڑنے سے تعبیر کیا ہے۔

غالب، آگے چھٹے آسمان کے سفر کے کی روداد بیان کرتے ہیں کہ معراج کے مسافر کو ایک دلکشا

عبادت گاہ نظر آئی۔ رحمت کے فرشتے اس خانقاہ کے دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ اس عمارت کے در و بام سے شعاعیں پھوٹ پڑ رہی تھیں۔ وہاں ایک ایسے بزرگ فروکش تھے، جن کو خدا کی طرف سے خوبی کا فرمان ملا تھا۔ ان کے حکم سے سعادت حاصل ہوتی اور دین کو تقویت ملتی تھی۔ طبیعت کو فہم و فراست سکھانے والے، معتدل مزاج، جن کے غصے کی کڑواہٹ میں بھی شیرینی اور سختی میں نرمی موجود تھی۔ احادیث میں لکھا ہے کہ چھٹے آسمان پر آپ کی جس نبی سے ملاقات ہوئی تھی وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔ دوسرے راوی نے چھٹے آسمان پر ادریس علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ بہر حال! یہ دونوں پیغمبر اپنی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے نرم خو اور معتدل مزاج تھے۔ دین کی تشہیر میں ان کی کوششیں بے مثال تھیں۔ چھٹے آسمان کا سیارہ مشتری مانا جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ مشتری کی تابناکی خدا کے نور کا ایک جزو ہے۔ اللہ کے رسول نے یہاں نور کا شربت پیا اور ساتویں آسمان کی جانب روانہ ہوئے۔ اس آسمان کا مالک سیارہ زحل ہے۔ یہ سیاہ رو اور نہایت منحوس مانا جاتا ہے۔ ہندوستان سے اس کی نسبت ہے۔ اس نجومی نکتہ کا خیال غالب اور اقبال دونوں نے رکھا ہے۔ چنانچہ غالب نے 'بیان معراج' میں ساتویں آسمان پر زناں باندھے ہندو کا تذکرہ کیا ہے اور اقبال نے قوم کے غدار میر جعفر و صادق کی بلبلائی روحوں کے ساتھ روح ہندوستان کو مضطرب دکھایا ہے۔ اپنی رو سیاہی اور نحوست کی وجہ سے زحل آپ کی آمد پر نہایت گھبرایا ہوا ہے۔ وہ مارے شرمندگی کے آپ کے استقبال کے لیے بھی آپ کی راہ میں نہیں پہنچ سکا۔

فلک ہفتم سے آپ کا براق آٹھویں آسمان کی سمت پرواز کرنے لگا اس آسمان کو غالب 'راس' اور 'بروج' کا آسمان کہتے ہیں۔ از روئے علم نجوم دائرۃ فلک بارہ حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ کا حکمراں ایک برج ہے۔ ہر برج سے متحرک سیاروں کو گزرنا ہوتا ہے۔ ہر سیارے کی منزل کسی نہ کسی سیارے سے منسوب ہوتی ہے۔ یہ آٹھواں آسمان ستاروں کا آسمان ہے۔ جو دائرۃ فلک پر شش جہات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ چوں کہ یہ ستارے غیر متحرک ہیں اس لیے غالب انھیں آسمان میں بکھرے ہوئے موتی کہتے ہیں۔ انھیں کبھی آسمان کے چھالوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایک جگہ تو انھوں نے ان ستاروں کو فصیل آسمان میں نظر کے تیر سے بنے سوراخ کہا ہے۔ جس کی وجہ سے آسمان جذبہ بے اختیار شوق میں چھلنی بن گیا ہے۔

و یا خود نگاہش دراں شہر بند

ز تیزی بہ دیوار روزن فگند

غالب کی مثنوی 'بیان معراج' کا تنقیدی مطالعہ

کچھ اس قسم کا خیال میر نے بھی اپنی ایک غزل میں باندھا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تارے تو یہ نہیں مری آہوں سے رات کی

سوراخ پڑ گئے ہیں تمام آسمان میں

غالب کبھی ان ستاروں کو آسمانی فرش پر موتیوں کے چھڑکاؤ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بروج از روئے علم نجوم مختلف جانداروں کی صورت میں متشکل کئے گئے ہیں۔ غالب نے اس

کا فائدہ اٹھا کر اپنے اشعار میں صنعت تجسیم کا نہایت فنکارانہ انداز میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً برج حمل کے متعلق وہ کہتے ہیں:

حمل سر بہ نرمی فرا پیش داشت سپا سے ازاں لا بہ برخویش داشت

(یعنی برج حمل نے اپنا سر ادب سے جھکا لیا تھا اور اس انکسار سے اپنی ذات کا شکر گزار تھا)

حمل، مینڈھے کو کہتے ہیں۔ طبعی طور پر اس کا سر جھکا ہوا ہوتا ہے گویا کوئی چیز تلاش کر رہا ہو۔ غالب حمل کے اس عمل کو اس کے عجز و انکسار پر انطباق کرتے ہیں۔ برج حمل کے بعد غالب برج ثور (بیل، گاؤ) کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی آمد کی خبر سن کر وہ بے تحاشہ دوڑ رہا ہے یہاں تک کہ خود اس کے سینگ اسکے دل میں پینا مار رہے ہیں۔ غالب نے انھوں نے نہایت خوبصورت صنعت تجسیم کا استعمال کیا ہے۔

نبودی اگر شیر در عرض راہ چریدی بہ چالاکی از خوشہ کاہ

(یعنی اگر راستے میں شیر (برج اسد) نہ ہوتا تو یہ گاؤ فلک تیزی سے گھاس کے خوشوں (ستاروں) کو چرجاتی)

استعاروں کے سہارے پیکر سازی میں، یوں لگتا ہے کہ غالب کو کمال حاصل تھا۔ آگے وہ کہتے ہیں کہ:

”یوں کہو کہ ثریا، ستاروں کے گچھے اور برج ثور بیل نہیں، بلکہ آنحضرت کی راہ

میں کسی ہندوستانی جوگی نے گائے کو سر سے پاؤں تک کوڑیوں (ستاروں)

کے زیور سے لاد رکھا ہے اور راستہ چلتے ہوئے دوڑ دوڑ کر اور ضد کر کے

بھیک مانگ رہا ہے۔“

اس کے بعد وہ اپنے تخیل کو معراج کے بیان کی طرف موڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دونوں

محلوں (برجوں) سے چاند اور سورج کے قرآن آپ کے بازو پر تعویذ باندھ دیا تاکہ آپ جب آسمانی

سفر سے واپس ہوں تو نظر بد سے محفوظ رہیں۔ نجوم میں قران کسی ایک برج میں بیک وقت دو ستاروں کے قیام کو کہتے ہیں۔ طب نجوم میں برج حمل و ثور میں اگر شمس واقع ہو تو آدمی کے جسمانی حصص، رانیں اور زانو متاثر ہوں گے اور اگر ان بروج میں قمر واقع ہو تو زانو، شانہ اور ٹانگیں متاثر ہوں گی۔ لیکن ان کے قران سے آدمی ان امراض سے محفوظ رہے گا۔ سفر میں آدمی کے پیر اور اس کے حصے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا سفر بلا تکان اور بلا مضرت و مشقت ہوا تھا اس لیے نظر بد سے بچانے کے لیے غالب نے تعویذ کا نکتہ چھیڑ دیا اور ان ستاروں کے قران کو تعویذ سے مشابہ قرار دیا۔ علم نجوم میں شمس و قمر کے قران کی ساعت کو نظر بد سے حفاظت کی ساعت تسلیم کیا گیا ہے۔ غالب نے نجوم کی ان صداقتوں کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب بھی مومن کی طرح علم نجوم سے شغف رکھتے تھے۔ ان ساری تفصیلات کے بیان میں انھوں نے اپنے علم و ہنر کو تو خوب آزمایا، لیکن نفس مضمون اور موضوع کی انھوں نے مطلق پروانہ کی اور واقعہ معراج کے حقائق اور تفصیلات جو احادیث میں مذکور ہیں، ان سے سراسر اغماض برتا۔ یہاں تک کہ اس میں مختلف علوم کے پرتو تو نظر آتے ہیں لیکن واقعہ معراج کی روشنی کہیں نظر نہیں آتی۔ کہیں کہیں چقماق کی سی چنگاریاں نظر آتی ہیں وہ غالب کے حسن تدبیر، تفکر اور تخیل کے سائے میں آنکھ مچولی کرتی نظر آتی ہیں۔ اس مثنوی میں غالب کا کمال فن اوج پر دکھائی دیتا ہے۔ اس میں تقدس کا بھی خیال رکھا گیا ہے، لیکن واقعہ معراج سے رکھی جانے والی عقیدت اور حضور سے رکھی جانے والی انسیت کا اس مثنوی میں فقدان نظر آتا ہے۔

برج حمل و ثور کے بعد غالب نجومی ترتیب سے دیگر بروج کا ذکر کرتے ہیں۔ برج جوزا کے بیان میں انھوں نے ”کمر بستہ“ کی معنی خیز ترکیب استعمال کی ہے۔ جوزا کی نجومی علامت پشت سے پشت جڑے ہوئے توام کی ہے۔ ”کمر بستہ“ کہہ کر غالب نے ان کی طبعی جسامت کی طرف گویا اشارہ کر دیا ہے۔ اس ترکیب سے جوزا کی مستعدی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

زبس بود جوزا دراں رہروی

کمر بستہ خدمت خسروی

برج جوزا اوصاف کے لحاظ سے تیز حرکت اور سریع السیر ہے۔ اسے رفتار کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ انگریز ماہر نجوم جیرل۔ ال۔ کینن کے مطابق ”برج جوزا رفتار اور ترسیل کی علامت ہے۔ وہ ادراک و عمل میں سریع السیر ہے۔ اس کی سرعت پسندی میں تعمیر کا پہلو غالب ہوتا ہے، تخریب کا

نہیں۔ وہ منفی اثرات سے عاری اور مثبت اثرات کا حامل ہوتا ہے۔" غالب نے برج جوزا کے تمام نجومی اوصاف کو مثنوی کے ذیل کے شعر میں شاعرانہ خیال آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے:

بداں تا رود نیمہ از نیمہ بیش ز تیزی بہ برید پیوند خویش
(اس غرض سے کہ اس توام کا ایک پیکر دوسرے پیکر سے خدمت میں آگے بڑھ جائے تیز رفتار نے اپنا جوڑ کاٹ لیا)

غالب نے مثنوی بیان معراج میں ایسے بیسیوں نجومی نکات بیان کر دیے ہیں۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ برج جوزا نے جب نور کے دروازے کھول دئے تو برج سرطان دریائے نور میں نہا گیا اور سیارہ مشتری کو مقام شرف حاصل ہو گیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ از روئے علم نجوم مشتری کا مقام شرف برج سرطان ہے اور مریخ کا مقام شرف برج اسد ہے۔ مریخ اگر برج اسد میں ہو تو اس کے اثرات قلب کو کمزور کر دیتے ہیں۔ غالب نے اس نجومی نکتے کو شاعرانہ انداز میں یوں بیان کیا ہے:

نہ در پنجه زور و نہ در سينه دم فرو ماند بے حس چو شیر الم
نہ شد گر چہ چوں گاؤ قربان او ولے شیر شد گر بے خوان او
(یعنی سیارہ مریخ نے برج اسد میں جیسے ہی شرف حاصل کیا تو اسد (شیر) آپ کے خوان کی بلی بن گیا۔ نہ اسکے پنچے میں کس بل رہا اور نہ سینے میں دم۔ وہ جھنڈے کے شیر کی طرح بے حس ہو گیا تھا)

نجومی نکات کی یہ توضیح بامعنی اور حسن شاعری کا مرقع ہے۔ برج سرطان کا مقام دریا، سمندر، جھیل، نہر وغیرہ کو مانا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے غالب نے سرطان کے دریائے نور میں نہانے کی جو بات کہی ہے، اس میں صنعت مرعات النظر کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ یعنی شاعر نے دریا اور سرطان میں نسبت قائم کی ہے۔

غالب برج اسد کے بعد سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت کا ذکر کرتے ہیں اور ان بروج کی جو علامتیں علم نجوم میں متعین ہیں، ان کے معنوی پہلو کو زینت شعر بنانے کے جتن کرتے ہیں۔ مثلاً سنبلہ کے لیے 'سودانوں کا خوشہ سے سر نکالنا'، میزان سے موتی تولنا، عقرب کا راستہ میں نگہ بانی کرنا، قوس کا تیر چلانا اور جدی کی بھیڑ پر نشانہ سادھنا، دلو کا ڈول سے پانی گرانا، حوت کا شکار کرنا وغیرہ تمام مثالیں غالب کی مضمون آفرینی سے معنوی ابعاد قائم کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ معراج بیان کرتے وقت غالب نے امیر خسرو کی تتبع میں 'سبع افلاک' کی بجائے 'نہہ سپہر'

غالب کی مثنوی 'بیان معراج' کا تنقیدی مطالعہ

کے تصور کو ترجیح دی ہے۔ سات سیاروں سے منسوب آسمانوں کا سفر مکمل کرنے کے بعد آپ کی سواری آٹھویں آسمان کی طرف پرواز کرتی ہے۔ یہ آسمان غیر متحرک ستاروں اور بروج کا مسکن ہے۔ سطور بالا میں اسکی تفصیل آچکی ہے۔ آپ یہاں سے نویں آسمان پر پہنچتے ہیں۔ یہ آسمان حضور کے سفر کی آخری منزل اور مقام عرش معلیٰ ہے۔ غالب نے سفر کی آخری منزل کی روداد بیان کرتے وقت ان تمام غریب، ضعیف اور موضوع احادیث اور روایات باطلہ کو شعری رنگ اور آہنگ میں ڈھال دیا ہے جو اکثر میلاد ناموں اور معراج ناموں میں بیان کی جاتی ہیں۔ یہاں ”احمد بلا مہم“ کے نہایت گمراہ کن اور غیر اسلامی تصور کو بھی فلسفیانہ اور منطقیانہ اسلوب میں ڈھالنے کی عہد اُکوشش کی ہے۔ یہ تصور الہیت اور رسالت میں وحدت کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ خیال اور عقیدہ ”لا الہ الا اللہ“ کی گویا نفی اور تکذیب کرتے ہیں۔ لیکن غالب نے تاویلات و توجیہات کے سہارے اسے منوانے کی کوشش کی ہے:

احد جلوہ گر با شیون و صفات نبی محقق چوں صفت عین ذات

(یعنی اپنی شان و صفات کے ساتھ یہاں صرف ”احد“ ہی کا جلوہ تھا۔ نبی کا وجود

خدائے واحد میں یوں گم ہو گیا جیسے صفت عین ذات ہو)

وحدة الوجود کے نظریے کی ساری موشگافیوں کے سہارے غالب نے عرش معلیٰ پر نعوذ باللہ، اللہ اور رسول میں وحدت کا تماشا دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے معراج کے آخری مرحلے کے ضمن میں بعض ایسی باتیں بھی کیں جن کی سند نہ تو قرآن سے ملتی ہے، نہ احادیث میں ان کا کہیں ذکر ہے۔ بہر حال خدا سے ملاقات کے بعد جب آنحضرت واپس تشریف لاتے ہیں تو دروازے کی زنجیر اسی طرح ہل رہی تھی جس طرح آپ نے جاتے وقت چھوڑا تھا۔ اور آپ کا بستر اسی طرح گرم تھا جیسے آپ استراحت فرماتے وقت چھوڑ گئے تھے۔ غالب نے دوران معراج آپ کی سرعت رفتار کو بیان کرتے وقت معنی و مضمون آفرینی کے جوہر دکھائے ہیں:

زلفہ بروں پائے از نقش پائے کہ کردہ قدم بر قدم گاہ جائے

شرارے کہ از سنگ آں آستان بدر جست از نعل برق جہاں

ہنوزش قدم در رہ اوج بود کہ آمد ز بالا بہ پستی فرود

(یعنی جتنی دیر میں نشان قدم سے قدم اٹھے اتنی دیر میں وہ اپنے مسکن پر لوٹ

آئے۔ جو چنگاری آپ کے آستانے کے پتھر سے براق کی نعل کی رگڑ سے نکلی،

ابھی وہ شرارا اور ہوا جارہا تھا کہ آپ معراج کا سفر طے کر کے نیچے اتر آئے)

غالب کی مثنوی 'بیانِ معراج' کا تنقیدی مطالعہ

آخری شعر میں بالا (بلند) و پستی میں صنعت تضاد کا خوب استعمال ہوا ہے۔ معراج نامے کے آخری حصے سے پتہ چلتا ہے کہ غالب اہل تشیع کے عقائد کو حرزِ جان رکھتے تھے۔ اس طرح ”بیانِ معراج“ حضرت علیؑ کی ملاقات اور نبی و امام کی باہمی رازدارانہ گفتگو پر ختم ہو جاتا ہے۔

تقابل و توازن: غالب، شفیق اور اقبال:

فارسی میں سمواتی سیر پر مشتمل کئی منظوم تخلیقات پائی جاتی ہیں۔ انھیں واقعہ معراج کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے، حتیٰ کہ دانٹے کی 'طربیدہ خداوندی' کو واقعہ معراج سے متاثر ہو کر لکھی گئی تخلیق کہا گیا ہے۔ ہمارے ناقدین نے اقبال کے 'جاوید نامہ' کو بھی ایک قسم کا معراج نامہ کہا ہے۔ مگر طربیدہ خداوندی ہو یا جاوید نامہ، نہہر سپہر ہو یا بوستانِ خیال ان میں سے کوئی تصنیف معراج نامہ نہیں ہے۔ علم نجوم کو اساس بنا کر ہمارے یہاں صرف دو ہی تخلیقات ملتی ہیں۔ فارسی میں غالب کی بیانِ معراج اور اردو میں کچھی نرائن شفیق کی ”معراج نامہ شفیق“۔ ان کے علاوہ اردو۔ فارسی میں روایتی معراج ناموں کی بہتات ہے۔ ان روایتی منظوم معراج ناموں کے درمیان شفیق اور غالب کے معراج نامے ایک قسم کی جدت تھے کہ ان میں علم نجوم کے حوالے سے واقعاتِ معراج منظوم کرنے کے جتن کئے گئے ہیں۔ کچھی نرائن شفیق کا اردو معراج نامہ غالب کے فارسی معراج نامے سے اتنی برس قبل لکھا گیا تھا۔ شفیق سے قبل اردو میں بلائی، ہاشمی، نصرانی اور کمال وغیرہ معراج نامے لکھ چکے تھے۔ ان میں معراج کے احوال اگرچہ تفصیل سے نقل ہوئے ہیں مگر ضعیف اور موضوع روایات کو زیادہ برتا گیا ہے۔ غالب کے ”بیانِ معراج“ کے کم و بیش سو سال بعد اقبال نے ”جاوید نامہ“ لکھا تھا۔ یہ معراج نامہ تو نہیں مگر فارسی میں ایک قسم کے ”ڈیوائن کامیڈی“ کا جواب تھا۔ غالب کے بیانِ معراج سے اس کے تقابل کی وجہ محض یہ ہے کہ غالب کی طرح اس میں بھی علوی سفر کی روداد ہے۔

کچھی نرائن شفیق اور غالب دونوں نے معراج ناموں کی ابتداء روایتی انداز سے کی ہے، لیکن غالب نے معراج کی رات کی تعریف میں اپنے خلاق تخیل کو خوب آزمایا اور معنی و مضمون آفرینی کے بہت سے ابواب وا کئے۔ گذشتہ صفحات میں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ حضرت جبریلؑ نے علوی سفر کی تیاری کے متعلق آپ کو خوش خبری سنائی تھی، اس کے بیان میں غالب نے مبالغہ آرائی میں ایسی شدت اختیار کی کہ شان الوہیت میں استخفاف اور استکسار کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ معراج کے ضمن میں ایسی بے احتیاطیاں ہمارے نعت گو شعراء اکثر کرتے رہے ہیں، مگر شفیق اپنے معراج نامے میں بڑے محتاط نظر آتے ہیں۔ وہ جبریلؑ کی گذرشات کو یوں بیان کرتے ہیں:

در حجرہ پہ وہ آ جوڑ کر ہات
خدا کی ذات خواہش سے بری ہے
زباں پر قدسیوں کی ہے یہ جدت
غالب نے براق کی تیز رفتاری کا ذکر سائنس کے دو اصولوں کی بنیاد پر کیا ہے، ایک قوت ثقل کا
اصول، جس کے مطابق انھوں نے براق کی تیز رفتاری کو آنکا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گنبد سے گیند جتنی
دیر میں زمین پر گرتی ہے، اتنی دیر میں براق آسمان سے زمین پر اتر جاتا ہے۔ غالب نے سائنس کے
دوسرے اصول 'آواز کی رفتار' سے بھی براق کی تیز پروازی کو تشبیہ دی ہے۔

شتابش بر رفتار ز اں حد گزشت
کہ تا گوے آید ز آمد گزشت

(یعنی براق کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ جتنی دیر میں لفظ 'آید' کہا وہ آ کر آگے نکل جاتا ہے)

لیکن قوت ثقل اور آواز کی رفتار سے بھی تیز روشنی کی رفتار ہے، اسی صفت کی وجہ سے حضورؐ کی
معراج کی سواری کو براق یعنی تیز رفتار کہا گیا ہے۔ شفیق نے براق کی تیز رفتاری کے لیے 'برق
جولاں' اور تیز تر از خیال و گمان و فکر و وہم جیسی تراکیب استعمال کی ہیں جو روشنی کی رفتار کی ہم پایہ ہو
سکتی ہیں۔

شفیق اور غالب کی مثنویوں میں شب معراج کے چاند کے متعلق تضاد بیانی پائی جاتی ہے۔ فلک
قمر پر آنحضورؐ کی تشریف آوری پر چاند کا فرط مسرت میں پھول کر مہ کامل بننے کا ذکر غالب کرتے
ہیں، جبکہ شفیق کہتے ہیں کہ ہلال بن کر چاند نے آپؐ کو سلام کیا۔ ہلال کے پیکر کو غالب نے ایک
قصیدے میں یوں استعمال کیا ہے:

ہاں، مہ نو، سنیں ہم اس کا نام

جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

چاند کے متعلق دونوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کے نزدیک وہ شب بدر کامل کی
تھی، اور شفیق اسے ہلال کی رات سمجھ رہے تھے۔ جبکہ روایتوں میں رجب المرجب کی ستائیسویں شب
کا ذکر ہے۔ یہ رات نہ تو بدر کامل کی ہے نہ ہی ہلال کی۔ شاعرانہ رنگ آمیزی اور خیال آرائی کے لیے
دونوں نے قمری تاریخ کا خیال نہیں رکھا۔ شفیق نے البتہ قمر کی اسلامی اہمیت اور فضیلت کو اس شب
سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، وہ یہ کہ قمر کا آپؐ کی انگلی کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جانا (معجزہ شق
القمر)، چاند کو دیکھ کر روزوں کا رکھنا، رویت ہلال کی فضیلت وغیرہ تمام فضیلتیں شفیق کے مطابق اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فلک قمر پر چاند کو عطا کر دی تھیں۔ وہ کہتے ہیں:

قمر کوں چرخ اول لا کے نزدیک	کہا اسنے کہ کانے میں ملے بھیک
کہے حضرت مثال شمس انور	کئے ماہائے قمری ہم مقرر
برائے معجزہ یہ شق ہوا ہے	ہماری ضرب سینے پر لیا ہے
ولے بخشی ترے تیں ہم نے عزت	ترے پر منحصر راکھی عبادت
ترے تیں دیکھ روزہ کو دھریں گے	ترے تیں دیکھ کر عیدیں کریں گے

چاند کی فضیلتوں کے یہ احوال دیگر نعت گو شعراء نے شاذ ہی بیان کئے ہوں، مگر غالب کے بیان معراج میں ان کا مطلق ذکر نہیں۔

فلک دوم کا مالک عطارد مانا جاتا ہے۔ اسے از روئے نجوم کاتب اور محرر زمانہ بھی گردانا گیا ہے۔ ماہرین نجوم سے دی ہوئی اس نسبت کو شفیق نے نہایت ماہرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ فلک دوم پر جب آپ پہنچتے ہیں تو عطارد سے کہتے ہیں کہ 'رسالت تو مجھ پر ختم ہو گئی، وحی کا سلسلہ بھی کچھ دن اور چلے گا۔ تیرا کام کتابت و تحریر ہے، اس لیے میں تجھے ابد تک کونین کے دفتر کی ذمہ داری سونپتا ہوں۔ غالب نے عطارد کے اس وصف کا نہایت شاندار اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ کی آمد پر عطارد نے غالب کی شکل اختیار کی اور مدحت رسول کرنے لگا۔ یہیں مدحت رسول میں جو اشعار کہے گئے ہیں وہ غالب کے عشق نبی کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ثنائے نبی کا یہ انداز اگرچہ بڑا منفرد اور والہانہ ہے، مگر تعلی و تحسین ذات کا اثر و نفوذ بھی اس میں دکھائی دیتا ہے۔

چرخ سوئم پر زہرہ کی گھبراہٹ کا بیان غالب نے بڑے نفسیاتی انداز سے کیا ہے۔ علم نجوم کی رو سے زہرہ رقص و موسیقی اور کیف و نشاط کا سیارہ مانا جاتا ہے۔ سامان موسیقی میں اس کے ہاتھوں میں بربط و دف دکھائے جاتے ہیں۔ اسلام میں ان تمام چیزوں کی حرمت آئی ہے۔ اس لیے حضور کی آمد کی خبر سنتے ہی زہرہ (مونث) گھبرا جاتی ہے اور ان چیزوں کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے تو بربط اس کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ جاتا ہے اور چاند کا دف ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ غالب نے علم نجوم کی رو سے اسے چاند کی تھالی کہا ہے۔ وہ اس لیے بھی کہ زہرہ اور چاند میں نجومی نسبت تسلیم کرتا ہے۔ فلک سوئم پر زہرہ آپ کا استقبال رقص و نغمے سے کرتی ہے۔ یہ غالب کے خلاق تخیل کا کمال ہے، وگرنہ شریعت میں یہ حرمت کے دائرہ میں آتے ہیں۔ شفیق نے بھی دائرہ قمر کی دف بجاتے اور رقص کرتے ہوئے زہرہ کو فلک سوئم پر دکھایا ہے۔ ان کے یہاں فلک سوئم کے واقعات کے بیان میں کوئی ندرت ہے نہ

شعری حسن۔

چرخ چہارم از رویے نجوم شمس کے تابع ہے۔ غالب نے آسمان پر ستاروں کی گل افشانی کا سبب شمس کو قرار دیا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ ثوابت و سیارگانِ فلک اکتسابِ نور کے لیے سورج ہی کے محتاج ہوتے ہیں۔ علمِ فلکیات اور علمِ نجوم اکتسابِ نور کے اس نظریے کے مؤید ہیں۔ شفیق کے 'معراج نامے' میں سیارہ شمس اور فلک چہارم کا بیان محض سرسری ہے۔ وہ اگر چاہتے تو سورج کی فضیلت بیان کرنے کے لیے ہندو اسطور کا سہارا لیتے۔

فلک پنجم کا مالک سیارہ مریخ ہے۔ وہ جری اور صاحبِ حشمت مانا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے غالب نے اس فلک کے تذکرے میں اسے جنگ جو بادشاہوں کا مسکن قرار دیا ہے۔ مگر حضور کی آمد پر اس فلک کا مالک مریخ جھاڑو دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے علی الرغم شفیق نے مریخ کی ساری دلیرانہ اور شجاعانہ اوصاف کا تذکرہ نہایت مختصر مگر جامع انداز میں کیا ہے۔ غالب اور شفیق دونوں نے چرخ ششم، ہفتم اور ہشتم کی نجومی خصوصیات کا زیادہ احاطہ نہیں کیا، لیکن زحل کے اوصافِ قبیحہ کو بیان کرنے میں منجمانہ فکر کو بہت برتا ہے۔ دونوں نے اسے روسیہ اور بد بخت کہا ہے۔ دونوں نے اس کی نسبت ہندوستان سے بتائی ہے۔

فلک ہشتم علمِ نجوم کے مطابق غیر متحرک اور ساکت ستاروں کا مسکن ہے۔ غالب نے اس آسمان کے تمام بروج کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ مگر شفیق سرسری طور پر گذر گئے۔ چرخ نہم فلک الافلاک ہے، اور عرشِ اعظم کا مقام بھی۔ شبِ معراج میں یہ جگہ خلوتِ گاہِ خدا اور رسولِ بنی تھی۔ یہاں کے احوال کا پتہ حبیب و محبوب کے سوا کسی کو نہیں معلوم۔ اہل تشیع یہاں انگشتِ رسول کا ذکر کرتے ہیں اور حضرت علیؑ کی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کو برحق جانتے ہیں۔ شفیق اگرچہ ہندو المذہب تھے مگر شیعہ حکومت میں عہدہ جلیلہ پر فائز تھے اس لیے انھوں نے سلاطینِ حیدر آباد (گوکنڈہ) کی مذہبی حیثیت کا بہت زیادہ خیال رکھا اور معراج نامے کے آخری حصے میں اثناء عشری اعتقادات کا برملا اظہار کیا۔ غالب کے یہاں بھی فلک الافلاک کے تذکرے میں شعریت پر شیعیت غالب نظر آتی ہے۔

غالب اور اقبال:

مثنوی 'بیان معراج' کے کم از کم سو برس بعد اقبال نے 'جاوید نامہ' تحریر کیا تھا۔ اقبال نے خود اسے "ایک قسم کی ڈیوائن کامیڈی" کہا ہے۔ ان کے خطوط سے اس امر کا بھی اعتراف ہوتا ہے کہ وہ خود ایک معراج نامہ جدید لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنے احباب سے مواد بھی اکٹھا

غالب کی مثنوی 'بیان معراج' کا تنقیدی مطالعہ

کرنا شروع کر دیا تھا مگر 'جاوید نامہ' کے منصوبہ شہود پر آنے تک جمع نہیں ہو سکا تھا۔ جاوید نامہ ایک تخیلاتی / تصوراتی علوی سفر کی روداد ہے۔ واقعات معراج سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اقبال اپنے مرشد پیر رومی کے ہمراہ یہ سفر کرتے ہیں۔ غالب و شفیق کے معراج ناموں اور اقبال کے 'جاوید نامہ' میں ایک قدر مشترک ہے کہ تینوں میں علم نجوم کو برتا گیا ہے اور ماہرانہ انداز میں اس کے نکات کو شعری پیکر میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اقبال نے نجوم کی اصطلاحات کے استعمال کے بغیر علم نجوم کے مبادیات کا احاطہ اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ غالب اور شفیق کی طرح سیاروں کی صعودی ترتیب اقبال نے بھی نجومی ترتیب ہی کے مطابق رکھی ہے۔

فلک قمر کے متعلق غالب نے 'چاند کے تحت الشعاع میں پہنچنے، ماتھے پر داغ لگنے، مہ کامل بننے وغیرہ نجومی نکات اختصاراً بیان کئے ہیں، لیکن اقبال کے یہاں قمر پر جہان دوست سے ملاقات، چاند کے پہاڑ اور غار، فرنگی ساحرہ کی چاند پر موجودگی، جہان دوست (شکر) اور گوتم سے ملاقات، دریائے سیماب کا تذکرہ نیزرقاصہ امرپالی وغیرہ کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔ ان مضامین میں نجومی نکات مضمّن ہیں۔ مثلاً علم نجوم کی رو سے چاند اگر برج دلو میں مقیم ہو تو کالے جادو کے لیے مفید مانا جاتا ہے۔ رقص کا دیوتا نٹ راج (شکر۔ سومناٹھ۔ آقائے قمر) رقص کے فن میں پوجا جاتا ہے۔ یہ اور اس قسم کی کئی جزئیات اور باریکیوں کو اقبال نے بڑے ماہرانہ انداز میں منظوم کر دیا ہے۔ علوی سفر کی دوسری منزل فلک دوم ہے۔ اس کا آقا عطار د ہے۔ منجم اسے دبیر فلک کہتے ہیں۔ یہ علم و دانش اور حکمت و بصیرت کا سیارہ مانا جاتا ہے۔ غالب نے عطار د کے اسی وصف کی بنیاد پر اسے اپنے حلیے میں پیش کیا ہے اور اسی کی زبانی اپنی نعت بارگاہ رسالت میں سنائی۔ اقبال نے فلک پر عطار د کی دانش و فراست کے لحاظ سے سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی ارواح جلیلہ کو ملت روسیہ کو نصیحت کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ علم نجوم کی رو سے مذکورہ دونوں بزرگوں کے بروج بالترتیب 'جدی' اور 'دلو' ہیں۔ ان دونوں برجوں میں عطار د کے قیام کے طالع افراد ایثار پسند، ہمدرد قوم و ملت، وسیع الذہن، اور دور اندیش ہوتے ہیں۔ افغانی اور حلیم پاشا کی شخصیتیں امت مسلمہ کے اہم رہنماؤں میں گردانی جاتی ہیں۔ علم نجوم کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ عطار د کی حکمت و فراست انھیں حاصل تھی۔ اقبال نے علم نجوم کے اسی نکتہ کے تحت فلک دوم پر افغانی اور حلیم پاشا کی ارواح کو بتایا ہے۔

فلک عطار د کے بعد علم نجوم کے مطابق فلک زہرہ ہے۔ زہرہ کو "ناہید" بھی کہتے ہیں۔ جنس کے اعتبار سے یہ مونث ہے۔ اس کا پیکر عورت کا ہے اور ہاتھ میں باجا ہے۔ یہ رقص و سرور کی دیوی

ہے۔ فلک سوئم پر آپ کی آمد کی خبر سن کر اس کے گھبرا جانے کی کیفیت کو غالب نے بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ مگر اقبال کے یہاں شعریت سے زیادہ اس کے منجمانہ سروکاروں کو برتا گیا ہے۔ زہرہ علم نجوم میں افریقہ سے منسوب ہے۔ اس لیے اقبال نے فرعون اور لارڈ کچنر کو وہاں بتایا ہے کہ یہ دونوں غرق آب ہو کر مرے تھے۔ فرعون ضرب موسیٰ کی تاب نہ لا سکا، تو کچنر مہدی سوڈانی سے خوف شدہ تھا۔

غالب نے چوتھے آسمان کو فلک شمس سے تعبیر کیا ہے۔ مگر اقبال نے جاوید نامہ میں سیارہ شمس کا ذکر نہیں کیا۔ وہ پیرروی کے ساتھ عطارد سے مرتخ یعنی فلک پنجم پر پہنچ جاتے ہیں۔ مرتخ از روئے نجوم آتشی مزاج ہے اور انسانی زندگی میں عزم و حوصلہ پیدا کرتا ہے۔ منفی اعتبار سے وہ اضطراری کیفیات پیدا کرنے والا مانا جاتا ہے۔ غالب نے اسے متکبر و مغرور کہا ہے لیکن آپ کی آمد کی خبر سن کر اپنی کلفی کے راستے سے موتی ہٹانے کے لیے جھاڑو دیتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کے عزم و حوصلہ کی صفت کے مطابق غالب نے اس فلک پر جنگ جو بادشاہوں اور پشنگ و افراسیاب جیسے شجاع، تلوار کے دھنی شاہوں کو صف باندھے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کے علی الرغم اقبال نے یہاں حکیم مرتخی کو جہد مسلسل کی ترغیب دیتے ہوئے پیش کیا جو تقدیر کے بالمقابل تدبیر کو فوقیت دیتے ہیں۔ اقبال نے فلک پنجم پر ایک فرنگی عورت کو بھی دکھایا ہے جو تجدد پسند اور آزادی نسواں کی علم بردار تھی۔ فرنگی عورت کو سیارہ مرتخ پر بتانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مرتخ کو برطانیہ سے منسوب کیا گیا ہے اور اس انتساب کو ماہرین نجوم کی تائید حاصل ہے۔

غالب اور اقبال دونوں نے علوی سفر کی روداد میں مرتخ کے بعد کی منزل فلک ششم بتائی ہے۔ اس فلک کا مالک پیرسن مشتری ہے، جسے برجیس بھی کہتے ہیں۔ نجوم میں اسے پانچویں دن جمعرات، پنج شنبہ کا حاکم کہا گیا ہے، فلسفہ، آرٹ اور قانون سے اس کی نسبت اہل نجوم مانتے ہیں۔ مشتری کی پیرسنی کے اعتبار سے غالب نے ایک عالی شان مکان میں ایک بزرگ کی رہائش کے کوائف بیان کئے ہیں اور حکمت و فراست کو ان کی خوبیاں بتائی ہیں۔ یہ تمام اوصاف از روئے نجوم مشتری سے منسوب ہیں۔ لیکن فلک مشتری پر اقبال نے عالم اسلام کے مشہور ادباء و شعراء کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً: منصور حلاج، قرۃ العین طاہرہ اور مرزا غالب۔ مشتری سے منسوب تمام صفات کی مذکورہ شخصیتیں حامل تھیں اس لئے اقبال نے چھٹے آسمان پر ان کی سکونت کو واضح کیا ہے۔

ساتویں آسمان کے مالک 'زحل' کی سیاہ روئی اور بدبختی کا ذکر غالب اور اقبال دونوں نے کیا

ہے۔ زحل ہندوستان سے منسوب ہے اور رذیلوں، نامرادوں کا مسکن ہے۔ علم نجوم میں یہ منحوس مانا جاتا ہے۔ فلکیات کے مطابق اس سیارے کا رنگ سیاہ ہے اور اس کے مزے کو ماہرین نجوم کیلہ کہتے ہیں۔ غالب کے برعکس اقبال نے زحل کی خصوصیات کے مطابق بہت سارے واقعات بیان کئے ہیں جیسے خونین قلزم میں میر جعفر اور صادق کا تڑپنا، روح ہندوستان کا نمودار ہونا اور ننگ دین ننگ وطن غداروں کا مکافاتِ عمل وغیرہ۔ زحل کے وصفِ قبیحہ کے مطابق اقبال نے جو واقعات قلم بند کئے ہیں وہ نہایت عبرت ناک ہیں۔ غالب نے زحل کی اوصاف بیانی میں نہایت اجمال سے کام لیا ہے۔ فلک زحل کے بعد غالب نے آٹھویں آسمان پر بروج اور غیر متحرک ستاروں کا ذکر کیا ہے اور پھر عرشِ المعلىٰ کے احوال بیان کئے ہیں۔ اقبال نے 'جاوید نامہ' میں فلک زحل کے بعد سرحدِ دنیا کا نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے پرے از افلاک کو حدودِ کائنات کہا ہے۔ اسکے بعد بے یمن و بے یار جہاں ہے۔ یہ ایسی دنیا ہے جو لیل و نہار سے آزاد ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس میں کلام کے لئے الفاظ کی ضرورت نہیں۔ پرے از افلاک کی منظر کشی میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں اقبال اور غالب کے فکری سلسلوں کا اتصال صاف دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً غالب کہتے ہیں:

جہت را دم خود نمائی نماند

زمان و مکاں را روائی نماند

(بیان معراج)

(یعنی اس عالم [مقام] کے اندر ایک دوسرا جہاں موجود ہے، گویا اس دنیا کو حکم دیگر 'کن' سے بنایا گیا ہے۔ اس کا وقت چاند سورج کی روش کا محتاج نہیں۔ [وہ ایسا جہاں ہے] جس میں نو آسمان گم ہیں۔ یعنی نہ یہاں کمیتیں [زمین] ہیں نہ وقت [زماں] کا کوئی تصور)

غالب نے جن حقائق کو بیان کرنے کے لئے اجمال کا سہارا لیا اقبال ان کے لئے تفصیل سے کام لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ 'جاوید نامہ' بذاتِ خود ایک مستقل تصنیف ہے جس میں تفصیل کی گنجائش ہے، لیکن غالب کی 'بیان معراج' ان کی ایک مختصر مثنوی کے ایک عنصر ترکیبی پر مشتمل ہے۔

مذکورہ مقام سے گذر کر اقبال حضوری باری تعالیٰ میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو غالب عرشِ معلیٰ پر رسول اللہ کے پہنچنے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اقبال یہاں پہنچ کر شانِ عبودیت کی بجائے بندہ گستاخ کی

جرات مندی کا اظہار کرتے ہیں اور حضور حق میں چند سوالات کی وضاحت چاہتے ہیں۔ اس میں سے ایک سوال قوم کی تقدیر پر کیا جاتا ہے تو نور جمال، قہر جلال بن جاتا ہے اور اقبال کو زمین پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہاں 'جاوید نامہ' ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس غالب نے عرش معلیٰ پر اللہ اور رسول اللہ کے راز و نیاز کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ "احمد بے میم" کے غیر اسلامی تصور پر سردھنا ہے۔ حتیٰ کہ خدا اور رسول کی غیریت کے پردے میں وحدت تلاش کی ہے:

نماند اندر احمد زمیمش اثر

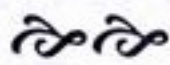
کہ آں حلقہ بود بیرون در

(یعنی احمد میں میم کا نشان بھی نہ رہا [وہ احد ہو گیا] کیوں کہ وہ [میم] خارج

از حقیقت تھا)

اس کے بعد غالب نے آپ کی واپسی کا ذکر کیا ہے کہ جتنی دیر میں نشان قدم سے قدم اٹھے آپ اپنے مسکن پر پہنچ گئے۔ غالب نے اس طرح معراج سے آپ کی واپسی کے بیان پر اپنی مثنوی 'بیان معراج' کا اختتام کیا ہے۔

غالب اور اقبال نے بیان کئے ہوئے اس علوی سفر کی روداد میں غالب نے معراج کے حقیقی مشاہدات بجائے احادیث سے مستنبط کرنے کے علم نجوم کی اساس پر اپنے فکر و خیال کے مطابق رقم کئے ہیں، جبکہ اقبال کے یہاں فلسفیانہ اور تخیلاتی فضا کے دُھند لکے میں اس سفر کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔



برسبیل نعت..... تلفظ و املا

ABSTRACT:

Proper name or adjectives are used for Prophet Muhammad (S.A.W) in Naatia poetry putting Drood in abbreviated form or in the shape of monogram. Attention is invited through this article for use of correct signs besides showing need to evolve harmony in usage of words or signs for Drood. Emphasis has also been put on pronunciation of Arabic words particularly name of Almighty Allah in poetry. Ways have also been suggested for correct usage of words according to dictionary. Writing of Drood in between couplets also makes hindrances in recitation of couplets, hence suggested to avoid the same.

اظہار کسی بھی موضوع کا ہو اور صنف کوئی بھی ہو زبان و بیان کے مروجہ اصولوں اور قرینوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے محتاط اور ذمہ دار شاعر اپنے آپ کو لغت (Dictionary) کے پابند رکھتے ہیں منقبت، نعت، حمد ایسی اصناف ہیں جن میں قرآن کریم، احادیث و سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کئی الفاظ، کئی اسمائے مبارکہ ایسے بھی آتے ہیں جنہیں لکھنے اور بولنے میں ہم لوگوں سے کبھی کبھار سہو ہو جاتا ہے یا ہماری توجہ املا اور تلفظ سے انحراف کی طرف نہیں جاتی شاعری خصوصاً نعت اور عقیدت نگاری ہی کی دوسری صورتوں (حمد و منقبت وغیرہ) میں زیادہ احتیاط درکار ہے اور اردو نعت کے معاصر منظر نامے میں تلفظ اور املا کے حوالے سے جو بے احتیاطیاں سہو ہو جاتی ہیں یا نادانستہ طور پر رہ جاتی ہیں ان کی طرف توجہ دینے اور لغت کے قواعد کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

○ ہم اللہ کے پاک اور بابرکت اسم سے برسبیل نعت: تلفظ و املا کے مسئلہ کا آغاز کرتے ہیں یہ ال۔ لاء آگاہ (مفعول) کے وزن پر ہے لا (فعلن) کے وزن پر نہیں اساتذہ اور ذمہ دار شاعر ہمیشہ اسے صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں ہم لوگ کبھی کبھار اسے صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں باندھتے آج

کل مختلف رسائل و کتب میں چھپنے والی نعتوں میں کہیں کہیں اللہ کا تلفظ الّا کے وزن پر آتا ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے:

اللہ کی رحمتیں بھی چلی آئیں ساتھ ساتھ
بچے جو آنحضور مدینہ منورہ

(سرور حسین نقشبندی)

ایسی جگہوں پر مولا، آقا، خالق یا اللہ تعالیٰ کا کوئی اور نام استعمال کر کے الّا کے تلفظ سے اس لفظ کو بدل لینا چاہیے۔ اسی طرح سبحان اللہ، ماشاء اللہ، الحمد للہ کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے بھی متوجہ اور محتاط رہنا چاہیے بعض بحروں کے آخر میں اگر یہ الفاظ آجائیں تو عروضی اعتبار سے اس کا جواز نکل آتا ہے مثلاً:

ہم سفر ہوگا نبیٰ کا کرم، ان شاء اللہ
سرخرو جائیں گے دنیا سے ہم ان شاء اللہ
حمد کس طور سر افراز ہے ماشاء اللہ
رخ ہر لفظ گل انداز ہے ماشاء اللہ
وہ مرے پاس ہے سبحان اللہ
جزو احساس ہے ماشاء اللہ
نگاہوں میں ہے پھر باب حرم الحمد للہ
کیا مالک نے پھر لطف و کرم الحمد للہ

البتہ اگر اللہ اللہ کے الفاظ آجائیں یعنی دوبار اللہ کا لفظ اکٹھا تو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں اس کا وزن صحیح عربی تلفظ کے مطابق نظر نہیں آتا مثلاً یہ مصرع دیکھیے:

اللہ اللہ شہ کونین جلالت تیری

اور

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

یہاں پہلے مصرع میں تینوں جگہوں پر اللہ کا لفظ الّا کے وزن پر ہے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مجھے اللہ اللہ جب یہ دونوں الفاظ اکٹھے آتے ہیں (عام استعمال میں یا استعجابیہ حالت میں) صحیح تلفظ

میں ملیں مگر ایسا بہت کم ہوا صرف اُن بحروں میں جہاں عروض کے اعتبار سے اس کی گنجائش تھی ایسی مثالیں دستیاب ہیں مثلاً:

اللہ ' اللہ ' اللہ ' اللہ
ہم کو دکھا دین کی سیدھی شہراہ
پیش نظر ہے اس شاہ کا دَر
الحمد للہ ، اللہ اکبر

مخصوص بحور و آہنگ کے علاوہ اللہ اللہ اور اللہ کے نام کے ساتھ کثرت استعمال میں آنے والے مرکبات الحمد للہ، بسم اللہ، سبحان اللہ، ماشاء اللہ، ان شا اللہ وغیرہ کے استعمال میں اکثر اللہ لا کے وزن پر نظر آتا ہیں مثنوی مولینا روم کا ایک مصرع دیکھیے جس میں پانچ بار یہ لفظ لا کے وزن پر ہے۔
اللہ اللہ اللہ اللہ اللہ کرد

○ سبحان اللہ۔۔۔۔۔ میں سبحان کا لفظ سُب حان ایمان، سلطان کے وزن پر ہے بعض شاعروں کے ہاں تلفظ میں اس کی ح واضح نہیں ہوتی اور شبان کے تلفظ میں اس کو برتا جاتا ہے خصوصاً بحر (مفاعیلین مفاعیلین مفاعیلین) والی نعتوں میں کچھ شاعر سبحان اللہ کو سبان اللہ کے تلفظ پر باندھتے ہیں مثلاً:

مرے ہونٹوں پہ تیرا ذکر ہے دائم سبحان اللہ۔۔۔۔۔ اس میں سبحان کی ح تلفظ میں نہیں آرہی ایسی ردیف کو مرے اللہ میں بدلا جاسکتا ہے کئی بحروں کے آخر میں اللہ کے لفظ کے آخر میں ہ کی گنجائش نکل آتی ہے (جیسے فعلن سے، فعلان کے تلفظ میں)

○ ان شاء اللہ۔۔۔۔۔ یہ قرآنی ترکیب ہے اکثر اہل قلم اسے انشاء اللہ لکھتے ہیں اس بارے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے ان شا اللہ صحیح قرآنی املا ہے۔
○ رحمت للعالمین۔۔۔۔۔ یہ قرآنی الفاظ ہیں۔

اکثر نثر اور شاعری (نعت) میں رحمت اور للعالمین کے درمیان الف لکھا جاتا ہے کئی کتابوں کے ناموں اور انتسابوں میں رحمت اللعالمین لکھا دیکھا گیا ہے جو غلط ہے اور قرآنی الفاظ میں تحریف و اضافہ کے ذیل میں آتا ہے دانستہ ایسی کوشش بہت بڑا گناہ ہے عقیدت کے اظہار میں عقیدہ مجروح نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے بعض مسجدوں اور علمی اداروں سے شائع ہونے والی تحریروں میں رحمت للعالمین میں الف کی شمولیت دیکھی ہے اخباری کالموں میں، نعتوں میں، بیڑوں اور دیواروں کی جگہ

پر یہ ترکیب الف کے ساتھ نظر آتی ہے بعض اوقات ہم مسودہ کاتبوں اور کمپوزروں کے سپرد کرتے ہیں وہ رحمت للعالمین کو رحمت اللعالمین لکھ دیتے ہیں اس بارے توجہ دینے کی ضرورت ہے رحمت اور للعالمین میں الف نہیں ہے۔

○ صلوا۔۔۔ اسی طرح صلوا کا لفظ ہے عربی قواعد کے مطابق یہ لفظ الف کے ساتھ ہی صحیح ہے لیکن کئی جگہوں پر صلوا، قولوا، سیروا کے الفاظ عربی قواعد زبان کے خلاف صلوا، قولوا، سیروا لکھے نظر آتے ہیں ایسے الفاظ کا املا الف کے ساتھ ہے اگرچہ ان کے تلفظ اور وزن میں فرق نہیں پڑتا مگر ان کا املا صحیح ہونا چاہیے یعنی الف کے ساتھ۔

رحمۃ للعالمین [رَمَّ تَن / تَلَّ لَ عَال] بحوالہ ۱۴۵۵، کالم ۳، لغت نامہ و ہند، جلد اول

البتہ اگر آپ رحمۃ العالمین لکھنا چاہتے ہیں تو اس میں الف کا شمول ضروری ہے۔

رحمۃ العالمین، بحوالہ ۱۴۵۵، کالم ۳، لغت نامہ و ہند، جلد اول، دَمَّ قَلَّ عَال

○ مَزَل اور مَدَثَر۔۔۔۔۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآنی اسمائے مبارکہ ہیں ہماری نعتوں میں ان کا تلفظ خال خال ہی صحیح دیکھنے میں ملتا ہے اکثر شاعروں نے ان الفاظ کو فَعُولُن کے وزن پر استعمال کیا ہے مثلاً:

مَدَثَر ، مَزَل ہمارے نبیؐ

وہ نبیوں میں ہیں سب سے پیارے نبیؐ

صحیح تلفظ کی مثالیں ملاحظہ ہوں

مَدَثَر و مَزَل و احمد کی ہے اَمَت

اللہ کرم کر، یہ محمد کی ہے اَمَت

○ سید کے لفظ کو بھی ہم لوگ احمد کے قافیہ پر باندھ لیتے ہیں اس لفظ کا صحیح تلفظ ساجد، مسجد اور عابد ہے زیر کے ساتھ اگرچہ بولنے میں (بقول فرہنگ تلفظ: شان الحق حقی) یہ زیر کے ساتھ غلط العام یا غلط العوام ہے (یعنی سعید اور سرحد کے وزن پر) مگر اسے شعر میں برتتے ہوئے بھی محتاط رہنا چاہیے اور اسے عربی لغت کے مطابق عابد ہی کے وزن پر باندھنا چاہیے۔

○ مواجہ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک کی جالیوں کے سامنے کی جگہ جہاں کھڑے ہو کر سلام پیش کرتے ہیں) عربی میں مواجہۃ / مواجہہ باندھا جاتا ہے مگر فارسی لغات میں اس کے دو لفظ

مواجهہ/مواجهہ دونوں تلفظات ملتے ہیں (مشابہ/مزابہت کے وزن پر) اردو میں اس کا تلفظ (بحوالہ اردو نعت: اردو ڈکشنری بورڈ کراچی) مواجهہ ہی ہے ہمارے شاعروں میں اس کا چلن اسی وزن (مدینہ) کے وزن پر ہے کچھ شاعروں نے اسے عربی تلفظ کے التزام کے ساتھ بھی باندھا ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

میں چپ تھا ہو رہی تھی مرے ترجمان کی بات
پیش مواجہہ مرے اشک رواں کی بات

(شاکر القادری)

برسبیل نعت کے سلسلہ ہائے مضامین میں زیر نظر ذیلی موضوع املا و تلفظ میں سب سے اہم اور نازک مسئلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کی کتابت اور کمپوزنگ کے حوالے سے ہے کمپوزنگ کے آغاز قریباً (گزشتہ صدی میں) اتنی کی دہائی سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر کا نشان ڈالا جاتا تھا آپ کے حوالے سے نثر میں اگر کوئی ضمیر وہ، اُن، تو، تمہارا وغیرہ آتی تو اس کے تخصّص کی بھی کے ساتھ نشاندہی کر دی جاتی اب کمپوزنگ سے حاصل ہونے والی آسانیوں میں صلی اللہ علیہ وسلم کی عبارت ایک لکچر، آئی کون، شاک فریز علامت اختصاری یا جس پر دستیاب ہے اور دوسری کمپوز کی جارہی کمپوزنگ سے مختلف ہے مثلاً اگر کمپوزنگ 18 پوائنٹ میں ہو تو یہ دردری عبارت یا شائد 8 اس سے بھی کم جس پوائنٹ میں ہو وہ بہر حال رواں عبارت سے چھوٹے فانٹ سائز میں ہوتا ہے اور دوسری عبارت کے مقابلے میں املائی تخصّیف کا حامل ہوتا ہے اگر اس نشان کو رواں کتابت کے فانٹ میں لکھا جائے تو پھر سطر کی ترتیب اور موزونیت متاثر ہوتی ہے۔

کبھی کبھار ایک ایک مصرع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک پانچ پانچ چھ چھ بار آ جاتا ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے:

نبی، رسول، بشیر، امی، شاہد اور رحیم
محمد، ابطحی، مدثر و رؤف و کریم

اب درود کی علامتوں کے ساتھ اس کی مختلف شکلیں دیکھیے۔

نبی، رسول، بشیر، امی، شاہد اور رحیم
محمد، ابطحی، مدثر و رؤف و کریم

نبی ﷺ، رسول ﷺ، بشر ﷺ، امی ﷺ، شاہد ﷺ، اور رحیم ﷺ محمد ﷺ،
ابطحی ﷺ، مدثر ﷺ و رؤف ﷺ و کریم ﷺ

ایسی صورت میں اگر آپ ہر اسم رسول اور ضمیر پر صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ شامل کریں گے تو مصرع کی کمپوزنگ کے علاوہ اس کی قرات پر بھی اثر پڑے گا یہ بات یاد رہے کہ اگر قاری صلی اللہ علیہ وسلم نہیں پڑھتا اور اچنتی ہوئی نظر ڈال کر اس سے آگے گزر جاتا ہے تو وہ گناہ گار ہو جاتا ہے لکھنے والا یا ٹاپ کرنے والا نہیں اس عبارت کو نہ پڑھنے والا گناہ کا ارتکاب کا تب ہو جاتا ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے محتاط سے محتاط انسان سے بھی اس ضمن میں خطا سر ذر ہو سکتی ہے اور مصرعے کو روانی میں پڑھتے ہوئے قاری سے ان الفاظ درود کے بارے میں صرف نظر ہو سکتا ہے اور یوں وہ گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

نثر کی بات اور ہے شاعری میں بہر حال آہنگ کا التزام کیا جاتا ہے آہنگ کا مسئلہ شعر کے ساتھ اس طرح جواہر ہے جیسے بدن کے ساتھ روح۔۔۔ واضح رہے کہ مصرع میں تراکی جگہ تیرا لکھنے اور پڑھنے سے بھی آہنگ میں خلل واقع ہو جاتا ہے چہ جائیکہ اس میں مقدس عبارت درود شریف کو شامل کیا جائے اور اس شمول سے وہ مصرع بے آہنگ ہو جائے بقول کسے:

داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارو

ہر سخن جائے و ہر نقطہ مقامے دارو

اللہ تعالیٰ معاف فرمائے یہاں درود کی تنقیص یا تخفیف مراد نہیں درود شریف کے ایک ایک حرف پر ہماری ہزاروں جانیں قربان درود ہزاروں مبارک اذکار کا خلاصہ، ثمر اور ماحصل ہے اس کے فضائل بیان کرنے کے لیے عمر خضر بھی کم ہے یہاں بات صرف شعری آہنگ کے حوالے سے کی جا رہی ہے۔ شعری آہنگ اظہار کی تاثیر کا باعث ہوتا ہے الفاظ بعینہ وہی بھی ہوں مگر ان کی ترتیب کا ذرا سا اختلاف بات کی تاثیر ختم کر دیتا ہے غالب کا یہ مصرع دیکھیے: ع تھی وہ اک شخص کے تصور سے تھی دوسرا مصرع (اب وہ رعنائی خیال کہاں) پہلے مصرع میں ایک لفظ کی ترتیب بدل کر اسے یوں لکھیں۔
وہ اک شخص کے تصور سے تھی

ہم نے شروع کے لفظ 'تھی' کو وہاں سے اٹھا کر آخر میں لکھ دیا اگرچہ نثر کے اعتبار سے مصرع کی ترتیب صحیح ہو گئی لیکن آپ دیکھیں کہ ان الفاظ کی مصرع والی ترتیب میں سے کچھ چیز غائب ہو گئی ہے کہی گئی بات کی تاثیر، یا اور کوئی جادوئی کیفیت یا طلسماتی اثرات الفاظ کے اندر سے نکل گئے

ہیں۔ اسی طرح شعر کے اندر کچھ اور لفظ شامل کرنے سے بھی نہ صرف اس کی تاثیر متاثر ہوتی ہے بلکہ وہ بے وزن ہو جاتا ہے مثلاً غالب کے اسی مصرعے کو یوں پڑھے (روح غالب سے بہت ہی معذرت کے ساتھ) تھی وہ اک شخص اللہ بخشے کے تصور سے۔۔۔۔۔ دو لفظ بیچ میں شامل کر دیں چاہے وہ دعائیہ ہی کیوں نہ ہوں اس طرح مصرعہ خارج از وزن اور بے ترتیب ہو جاتا ہیں۔

اب نعت کے حوالے سے ہم دو مثالیں پیش کرتے ہیں ان شعروں کو دیکھیے:

سلام پڑھتے ہوئے ہم نہ دیکھ پائیں مگر

جواب دیتے ہوئے وہ ہم کو دیکھتے ہیں

اب اس شعر کو یوں پڑھے:

سلام پڑھتے ہوئے ہم نہ دیکھ پائیں مگر

جواب دیتے ہوئے وہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ہم کو دیکھتے ہیں۔ ایک مثال اور دیکھیے:

اگر یہ سچ ہے کہ اذکار چہرہ رکھتے ہیں

تو پھر حضور کی صورت ہی ہوگا روئے درود

اب اس شعر کو یوں پڑھے:

اگر یہ سچ ہے کہ اذکار چہرہ رکھتے ہیں

تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ہی ہوگا روئے درود

آپ نے دیکھا کہ اگر صلی اللہ علیہ وسلم کے التزام کے ساتھ یہ شعر پڑھے جائیں تو ان مصرعوں کا (جس میں آپ کا ذکر مبارک آیا ہے) آہنگ شعر والا آہنگ نہیں رہے گا بلکہ نثر والا بھی نہیں اور اگر آپ یہ شعر نعت پڑھتے ہوئے درود کی عبارت چھوڑتے ہیں تو آپ گناہ گار ہو جاتے ہیں۔

درود شریف بہر حال نعت گوئی سے افضل ورد، شغل، عمل، ذکر اور عبادت ہے۔ اردو میں عمدہ سے عمدہ اعلیٰ نعت گو اچھی سے اچھی نعت بھی لکھے تو وہ ایک بار پڑھے گئے صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کی اہمیت اور رتبے کو نہیں پہنچ سکتی۔۔۔۔۔

نعت لکھتے اور پڑھتے ہوئے آپ بہر حال یہ پیش نظر رکھیے کہ یہ کارِ خیر اور شغلِ مبارک اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا تذکار ہے مگر یہ درود نہیں آپ شعری زبان اور تلازماتی بہاؤ میں نعت کو لاکھ، درود نما ذکر کہہ لیں مگر یہ درود کے مبادل یا مماثل نہیں۔۔۔ لہذا نعت خوانی کو بعینہ درود

خوانی نہ سمجھیے اور نہ اس کو درود بنانے پر اصرار کریں۔

نعت میں اسمائے رسولؐ مبارکہ کے ساتھ درود کے شمول کے حوالے سے اب تک جو نکات سامنے آئے وہ یہ ہیں:

۱۔ نعت میں اسمائے رسولؐ کے ساتھ کمپوز ہونے والے الفاظ درود ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کو لکھتے ہوئے املائی تخفیف روارکھی جاتی ہے جو کسی طور مناسب نہیں۔

۲۔ رواں عبارت اور الفاظ درود ایک جیسے سائز میں کرنے سے متن کی سطر متاثر ہوتی ہے۔

۳۔ درود کی عبارت نہ پڑھنے سے قاری گناہ گار ہو جاتا ہے۔

۴۔ بعض مصرعوں میں دو دو، تین تین، چار چار بار آپؐ کا اسم مبارک آنے سے مصرع کی ساخت نہ صرف بے آہنگ ہو جاتی ہے بلکہ وہ شاعری نہیں رہتی۔

۵۔ درود خوانی نعت خوانی سے ہزاروں گنا افضل وظیفہ ہے لہذا آپؐ نعت لکھتے اور پڑھتے ہوئے یہ ذہن میں رکھیں کہ نعت درود نہیں ہے یہ شعری آہنگ میں کیا جانے والا اظہار محبت و عقیدت ہے اس میں موضوع کی نزاکت کے ساتھ آہنگ کا التزام بھی ضروری ہے اور کسی بھی زائد لفظ کے شمول سے شعر خارج از آہنگ ہو جاتا ہے اور وہ شعر نہیں رہتا۔

یہ مسئلہ دراصل علامات اختصاری کا ہے جس طرح قرآن کریم کی عبارت اور آیات کے دوران اور خاتمے میں بعض علامات درج ہوتی ہیں وہ پڑھنے اور دہرانے کے لیے نہیں صرف سمجھنے اور ذہن میں رکھنے کے لیے ہوتی ہیں اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسمائے گرامی کے تخصّص کو واضح کرنے کے لیے ہمارے اکابرین چند علامات کا استعمال کرتے رہے ہیں لغت نامہ دہخدا عربی، فارسی، اردو تمام شرقی زبانوں میں سے ایک انتہائی اہم، وسیع لغت ہے (جو پہلے پچاس ضخیم جلدوں میں شائع ہوا تھا اب اسے چھوٹے فائنٹ میں ۱۶ میں شائع کیا گیا ہے اس کا ایک متوسط ایڈیشن بھی دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے) یہ لغت دانشکدہ تہران کی طرف سے فاضل اور بین الاقوامی حیثیت کے حامل فارسی ماہرین لغت کے زیر اہتمام مرتب ہوتا اور چھپتا ہے اس میں ان علامات اختصاری کو حروف ہی سے واضح کیا گیا ہے۔ مثلاً:

ص نشانہ اختصاری و مخفف صلی اللہ علیہ وآلہ (۱۸۸۱ کالم ۱، جلد دوم)

اسے اُور ص لکھا جاتا ہے۔ (یہ نشان اختصاری و مخفف صفحہ بھی ہے)

رضہ [رضہ] علامت اختصاری رضی اللہ عنہ (۱۴۷۷ کالم تین)

رضہم [رَہ] علامت اختصاری رضی اللہ عنہا

رضی اللہ عنہ۔ رضی اللہ عنہا۔ رضی اللہ عنہم۔ رضی اللہ عنہما

ان سب دعائیہ جملوں کے لیے کہ اللہ اس مرد سے، عورت سے، ان مردوں سے، ان عورتوں سے راضی ہوا پر "رضہ/رضہم/رضہما کی علامت اختصاری درج کی جاتی ہیں۔ اسی طرح صحابہ کے لیے یہ علامات اختصاری ہیں۔

فرہنگ متوسط دھنداز پر نظر دکتہ سید جعفر شہیدی..... لغت نامہ ودیخدا دانشگاه تہران

(زستان ۱۳۸۵)

مجھے گزشتہ سالوں وار برٹن کی سالانہ نعتیہ کانفرس کا ایک دعوت نامہ ملا جس میں کلمہ طیبہ میں آپ کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم یوں لکھا ہوا تھا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ سیف المملوک، معروف پنجابی شہکار کے مصنف میاں محمد بخش ہیں جب ان کا کلام مجالس میں پڑھا جاتا ہے تو مقطع میں ان کا نام آنے پر کئی سامعین صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر انگوٹھا چومتے اور آنکھوں کو لگاتے نظر آتے ہیں اور شاعر کے نام کو حضور اکرم کی ذات والا..... نام سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ ہماری سادہ لوحی اور اس حوالے سے کی جانے والی خطائیں معاف کرے۔

نعت میں شعری آہنگ کو برقرار رکھنے کے لیے ہمارے اکابرین (شاعر، محدث، فقیہ، مفسر اور معروف اہل قلم) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک پر "کا نشان ڈال دیتے ہیں جس سے قاری کو اس بات کی نشان دہی ہو جاتی ہے کہ اس ضمیر یا اسم کا اشارہ رسول اکرم کی طرف ہے قاری اپنے ذوق، مزاج، مقام اور ساعت مطالعہ کے حوالے، مناسبت اور سہولت سے صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ دوران مطالعہ زیر لب دہرا بھی لیتا ہے اور اگر کسی وقت اس نشان سے (ص سے) صرف نظر بھی ہو جاتا تھا تو وہ گناہ گار نہیں ہوتا ہے۔

نعت کے املا کے باب میں آپ کے اسم مبارک کے ساتھ درود کا شمول ایک توجہ طلب مسئلہ ہے مجھے امید ہے شعری نزاکتوں سے آگاہی رکھنے والے باذوق اہل قلم اس بارے اپنے نتائج فکر کا اظہار فرمائیں گے۔

(میں نعت اور شاعری میں آپ کے اسم مبارک اور ضمیروں پہ کمپیوٹر سے پہلے کے دور کتابت کی طرح "کا نشان ڈالتا ہوں اور نثر میں اسی سائز اور رسم الخط میں صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ لکھتا ہوں اور میری کوشش ہوتی ہے کہ میرا کمپوزر بھی کمپیوٹر کا طے شدہ مخصوص نشان استعمال نہ کرے۔

یہ مسئلہ سنجیدہ توجہ چاہتا ہے اسے کمپوزر حضرات کے حوالے نہیں کرنا چاہیے اگر آپ اسے علامت اسم و ضمیر رسولؐ کے حوالے سے استعمال کرتے ہیں تو کی علامت استعمال کریں ورنہ املا کی تخفیف کے بغیر رواں اور جاری سائز میں صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ لکھے جائیں اس سے مصرع کی جسامت، سائز اور الائمنٹ میں (اور مصرع کے شعری آہنگ میں) فرق ضرور پڑے گا لیکن قاری اسے صرف نظر کرنے کا گناہ گار نہیں ہوگا۔

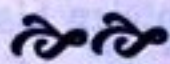
اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نعت کے اوپر عنوان کی جگہ (عنوان کے طور پر نہیں) صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ لکھ دیئے جائیں۔۔۔ قابل مطالعہ جلی سائز میں۔۔۔ (ایک روایت کے مطابق اگر کسی مجلس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک بار بار لیا جائے تو ایک بار درود شریف پڑھنا اس پوری مجلس کے دورانیہ میں آپؐ کے اسم مبارک پر درود شریف پڑھنے کی کفالت کرتا ہے) اس صورت میں نعت کے اندر آپؐ کا اسم مبارک اور ضمیر مبارک جتنی بار بھی آئے اس پر علامت اسم ضمیر رسولؐ یعنی لکھ دیا جائے اس سے شعری آہنگ متاثر نہیں ہوگا۔

قبلہ عزیز احسن یا کسی مفتی صاحب سے اس حوالے سے فتویٰ لے لیا جائے کہ نعتیہ شاعری میں جب بار بار آپؐ کا اسم مبارک آئے تو اس کی مناسب صورت کیا ہونی چاہیے اس پر دیئے جانے والے نشان یا علامت درود سے صرف نظر ہونے سے قاری گناہ گار نہ ہوگا۔۔۔ اس صورت میں موجود روایت چاہے جاری رہے۔

واضح رہے کہ میں برسبیل نعت کے سلسلہ مضامین میں یہاں املا و تلفظ کے حوالے سے بعض ان مسائل کی طرف صرف توجہ دلا رہا ہوں جنہیں میں نے محسوس کیا ہے میں اس ضمن میں کوئی کتاب عقائد یا فقہی اصول مرتب نہیں کر رہا نہ میں اس کا اہل ہوں اس پر بعض پیدائشی ناقد اور جبلی نکتہ چیں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پھر میں اس بحث میں پڑا ہی کیوں ہوں؟ گزارش ہے کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جنہیں آدمی محسوس کرتا ہے مگر اس کے پاس اس کا کوئی واضح حل نہیں ہوتا برسبیل نعت کے حوالے سے یہ محسوسات بھی خود کلامی کے ذیل میں سمجھیے کاغذ پر اس لیے آئے ہیں کہ شاید کسی کے پاس اس مسئلہ کا کوئی واضح اور قابل قبول حل ہو۔۔۔ کمپیوٹر کے آغاز سے یہ مسئلہ اس لیے بھی نمایاں ہوا کہ سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض پرانی کتابیں ان دنوں جب دوبارہ کمپیوٹر کی کتابت میں شائع ہوئی ہیں تو اس میں آپؐ کے اسما و ضمیر کے حوالے سے اسی نئے طرز کمپوزنگ کو روارکھا گیا ہے مثلاً گزشتہ سالوں میں طارق اکیڈمی فیصل آباد سے قاضی منصور پوری کی 'رحمت للعالمین' شائع ہوئی

ہے اس میں جگہ جگہ بعض مقامات پر سطر میں کئی بار یہی طرز کتابت ملحوظ رکھی گئی ہے قاضی منصور پوری کی سیرت کے پرانے کتابت شدہ ایڈیشنوں میں آپ کے اسم و ضمائر کے ساتھ درود کی عبادت کا شمول ایسے نہیں تھا کہیں کہیں اسم اشارہ / ضمیر کا التزام تھا اسی طرح مولینا احمد رضا خاں بریلوی اور مولینا اشرف علی تھانوی کی پرانی کتابت شدہ کتابوں میں ایسے مقامات پر کے نشان ہی کو روارکھا گیا تھا۔

’نعت رنگ‘ سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ نعتیہ شاعری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم و ضمائر مبارک کے حوالے سے کسی قابل قبول طرز املا کا تعین کرے اس جریدے نے نعت کے ضمن میں کئی رجحان ساز میلانات کی طرف قارئین و شعرا کی توجہ مبذول کرائی ہے اگر وہ نعت رنگ کی آئندہ اشاعتوں اور نعت ریسرچ سنٹر میں چھپنے والی کتابوں میں کسی طے شدہ املائی اسلوب کا انتخاب کرے تو بعید نہیں کہ رفتہ رفتہ اس باب میں اہل قلم کسی قابل قبول اور لائق عمل طرز املا پر متفق ہو جائیں۔



حمد و نعت کی شعریات

ABSTRACT:

Religion and poetry are both inter-related to form totality. Poetics of Hamd and Naat is actual poetics of nature which carry archetype in expression. Good poetry is good and bad poetry is bad in literary terms, this standard is also applied on religious poetry. All poetry of high standard created in the world of literature is based upon religious sensibility. Poetics of Hamd and Naat has been highlighted in this article keeping in view historic facts of development of Urdu language.

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ عربی اور فارسی ادب میں حمد اور نعت کی شاعری اور اس نوع کے فن پاروں نے ان زبانوں کو اپنے جغرافیائی خطوں سے آگے عالمی برادری کے ذہن و دماغ کا حصہ بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ہر چند کہ حسان نے قصیدے اور جامی نے غزل میں بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔ لیکن حسان اور جامی برصغیر ہند و پاک میں اپنی نعت اور حمد کی وجہ سے زیادہ جانے جاتے ہیں۔

خسرو کے دوسرے دیوان 'وسط الحیات' میں حمد و نعت ملتے ہیں۔ تیسرے دیوان 'غرة الکمال' میں 'جنات النجات' کے عنوان سے خسرو نے توحید خدا اور عقائد کا ذکر کیا ہے۔ ترجیعات میں ایک قصیدے کا مضمون نعت رسول ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنی مثنویوں میں حمد و نعت کو خاص جگہ دی ہے۔ وصف اشیائ نامی مثنوی میں تو انہوں نے باضابطہ معراج کے مضامین شاعرانہ کمال کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ غور کیجیے خدا کی ذات کے بارے میں تصوف کی اصولی بحث کی رو سے انہوں نے کیا کہا ہے:

نی بوجود یکہ بود از عدم

واجب اول بوجود قدم

نعت کا ایک شعر کہ جس میں معراج کو سمجھنے کی سعی کی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

پیش رو کو کہہ انبیا کو کبش از منزلت کبریا

از حد ناسوت برون تاختہ بر خط لاہوت وطن ساختہ

مذکورہ بالا امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنے کا مقصد یہ باور کرانا ہے کہ خسرو اردو شاعری کا آغاز ہے کہ جن کی فارسی شاعری میں حمد و نعت کی شاعری ایک اہم رجحان کی شکل میں موجود ہے۔ ان کے ہندی کلام میں تصوف کی جو رفعت نظر آتی ہے، اس کا بنیادی لحن حمد اور نعت کا ہی ہے۔

ان حقائق کے علاوہ اردو میں کچھ شعراء تو ایسے ہوئے ہیں جن کی پوری شاعری کو ناقدین ادب نے حمدیہ اور نعتیہ کلام کا درجہ دیا ہے۔ حالی کا مد و جزر اسلام اور اقبال کی جملہ شاعری اس زمرے کے خاص متون میں شمار کیے جاسکتے ہیں لیکن ہمارے ناقدین علامہ اقبال اور اس نوع کے دیگر شعراء کے متون کو مذہبی شاعری کے خانے میں رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں جب کہ شاعری کو واضح طور پر کسی خانے میں رکھنے کی روایت شاعری کے ساتھ ایک طرح کا مذاق ہے۔

غزل کی شاعری ہو یا نعتیہ کلام دونوں کے لیے عشق ایک اہم قدر ہے۔ ایک ایسا عشق جس کے لیے یہ فقرہ بولا جاتا ہے کہ ”العشق نار تحرق ماسوی المحبوب“ (عشق ایسی آگ ہے جو محبوب کے علاوہ ہر چیز کو جو غیر ہو جلا ڈالتی ہے) غزل کی شاعری میں یہ عشق حقیقی اور مجازی نیز تہذیبی و تخلیقی رنگوں میں نظر آتا ہے۔ نعتیہ شاعری میں محبوب محمد کی ذات ہے یعنی عشق رسول نعتیہ شاعری کا بنیادی محرک ہے۔ وہ عشق و مستی جس کو اقبال نے انسان کے ارتقا کے لیے لازمی گردانا ہے صرف عشق رسول ہے وہ عشق ضل ہے کہ جس میں اپنے محبوب کے عادات و شمائل، افعال و اقوال، رفتار و گفتار، عادات و اطوار، اخلاق و خصائل، پسند و ناپسند کو اپنے لیے نمونہ نہ بنایا جائے۔ وہ دل جو شاعری سے وابستہ ہے وہ ان جملہ اعمال افعال محبوبی کا قافی اظہار کرتا ہے جسے ہم نعت سے موسوم کرتے ہیں۔ حضرت فاروق اعظم رات کو گشت کے لیے نکلے تو ایک عورت روئی دھن رہی تھی اور خمسہ کا یہ بند گارہی تھی:

علی محمد صلوٰۃ الابرار صلی علیہ الطیبون الاخیر

قد کان فواما بکی بالاسحار یا لیت شعری والمنایا اطوار

ہل جمعنی و حبیبی الدار

(محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ابرار کے درود، طہمین اور اخیار کے درود۔ وہ راتوں کو جاگنے والے اور صبح کو گریہ فرمانے والے تھے۔ موت تو بہت طرح آتی ہے

مگر کاش مجھے یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوگی)

کیا مذکورہ بند میں محض بیان ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ محمد عربی کے لیے کئی استعارے استعمال کیے گئے ہیں کہ جس کے بغیر اچھی شاعری کا تصور محال ہے۔ اب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مذہبی شاعری کے عنوان سے کوئی مقالہ لکھنا بھی شاعری اور مذہب کے تعلق کو اس طرح سے سمجھنا جس طرح کہ ہم کبھی کبھی زندگی کے جھمیلوں سے فرصت پا کر کسی پارک میں بیٹھ کر ہنسی چہلیں کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب اور شاعری مزاجاً ایک دوسرے کا تکرار رہے ہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ مذہب اور اساطیر انسان کا بنیادی آرکی ٹائپ ہے اور شاعری اساطیری اور مذہبی لاشعور کی زائیدہ ایک فنی کارگزاری ہے۔ واضح رہے کہ شاعری کی ایک قسم جس میں عظیم ترین لوگوں کی شاعرانہ نقل پیش کی جاتی رہی ہے اسے رزمیہ کا نام دیا گیا ہے۔ ایلید اور اوڈیسی ملٹن کے پاراڈائز لوسٹ وغیرہ کو رزمیہ قرار دیا گیا جس کا بنیادی ایجنڈا مذہب تھا لیکن امت مسلمہ نے اپنے عظیم ترین رہنما و ہادی محمد مصطفیٰ کو جب اپنے شعروں میں جمالیات اور اخلاقیات کا پیکر بنا کر پیش کیا تو اسے خالص مذہبی شاعری کہہ کر حدودِ ادب سے الگ کوئی مذہب کی شے کیوں سمجھا گیا؟ جب کہ نعتیہ شاعری میں ایک عظیم ترین ہادی و رہنمائے انسانیت کے کردار کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اس صنف کو نظر انداز کرنے کی اہم وجہ خود کو، شاعری کو سیکولر ایجنڈے کا ہتھکنڈہ بنانا اور شاعری اور مذہب کے فطری رشتے پر پردہ ڈالنا ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ناقدین ادب نے نعت اور حمد کی شاعری کو Text Book میں شامل نہیں کیا؟

شاہنامہ اسلام کے بعد اردو میں عنبر بہرائچی کا رزمیہ مہا بھنشکر من ہمارے عہد کا ایک رزمیہ ہے علاوہ ازیں ان کی دوسری نعتیہ تخلیق 'لم یاتِ نظیرک فی نظر' کو بھی ہم رزمیہ کے زمرے میں ہی رکھ سکتے ہیں کہ جس میں عنبر بہرائچی نے ۱۳ عنوانات کے ذریعے آغاز تا فتح مکہ کے واقعات نظم کیے ہیں۔ چودھری مبارک علی کے مطابق "اس طویل نظم میں (۱۰۲۴) اشعار میں جو سب کے سب منتخب ہیں ایک بھی بھرتی کا شعر نہیں ملتا۔" اسی طرح چندر بھان خیال کی نظم "لولاک" اور ابرار کرپوری کی مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی طویل نظم 'غزوات' بھی رزمیہ کی صف میں موجود ایک اہم نعتیہ شاعری ہے۔ ان کے علاوہ قیصر الجعفری نے سیرت کو طویل نظم میں پیش کیا ہے۔ آٹھ اودل کے طرز پر رہبر جو پوری نے تاریخ اسلام نظم کی ہے۔ کیا ہم ان متون کو خالص مذہبی متون کہہ سکتے ہیں؟ یا ان متون کا بنیادی

ذہن شاعری ہے؟ جب ہم ان متون کا تجزیہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ مذہبی امور کے موضوع پر یہ متون شاعری کا ایک بلیغ نمونہ ہیں۔

ایسے میں یہ کہنا کہ مذہبی شاعری عام شاعری سے الگ ایک خاص قسم کی شاعری ہے ایک گمراہ کن بیان ہے۔ غنبر بہراپنجی نے اپنی نعتیہ رزمیہ ’لم یاتِ نظیرک فی نظر‘ میں لکھا ہے:

”اس تصنیف کو میرے ایک کرم فرمانے بغیر پڑھے ہوئے مذہبی کتاب قرار

دے دیا۔ میں بڑے ادب کے ساتھ عرض کروں گا کہ یہ کتاب صرف مذہبی

کتاب نہیں ہے اس میں جیسا کہ سطور بالا میں واضح کر چکا ہوں، قدیم

ہندوستانی رزمیہ کے تمام عناصر کو برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ویسے دنیا کی

عظیم شاعری کب بیشتر حصہ مذہبی موضوعات پر ہی مبنی ہے۔“

جیسا کہ کہا گیا ہے کہ رزمیہ میں واقعات کی صحت اور تاریخی حقائق پیش کرتے ہوئے تخیل کی

گلکاریوں سے اجتناب کیا جاتا ہے تو اس کی ایک مثال نعت رسول پاک ہے۔ اس صنف کا مقصد

اپنے ممدوح کی جملہ صفات اور جمالیاتی اور اخلاقی رنگ کو شعری جمالیات کا موضوع بنانا ہے جس کے

لیے ہیئت کی کوئی قید نہیں۔ نعت دراصل رسول پاک کی ایک ایسی سوانح ہے جو ایک شعر سے لے کر

ہزاروں اشعار میں بیان کی جاسکتی ہے کیونکہ محمد کی حیات طیبہ کا ایک لمحہ انسانیت کی بقا کا ضامن

اور انسانیت کی راہوں میں روشن چراغ کی مانند ہے۔ اس مقام پر یہ سوال قائم کیا جاتا ہے کہ نعت یا

حمد شاعری سے زیادہ عقیدے کا نام ہے۔ یہی بات مرثیے کے لیے بھی کہی جاتی رہی کہ مرثیہ ایصال

ثواب کا ذریعہ ہے گویا اس نوع کی شاعری میں شعریت کی تلاش بے کار ہے اور جب یوں ہے تو نتیجہ

اکثر یہ نکالا جاتا ہے کہ حمد و نعت کی شاعری شاعری ہی نہیں۔

اس طرح سے سوچنے والے نقاد یہ بھول جاتے ہیں کہ عقیدے کے فقدان سے شاعری فلسفیانہ

موشگافی بن سکتی ہے یا محض بیان۔ ہو سکتا ہے کہ شعر چیتاں بھی بن جائے۔ عقیدہ یا مذہبی حیثیت نے

ہی ہر دور میں ادب عالیہ کی تخلیق میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کیا مسجد قرطبہ جیسی نظم اور ’ساقی نامہ‘ جیسی

لافانی نظم عقیدے اور مذہبی شعور کے بغیر لکھی جاسکتی تھی یا ’ذوق و شوق‘ جیسی اقبال کی لافانی نظم جس کا

مرکزی خیال نعت رسول ہے، عقیدے کی وجہ سے شاہکار نہیں بنی؟

گویا مذہب ہر زمانے میں ادبی متون میں پائی جانے والے معنویاتی نظام کا سرچشمہ یا بنیادی

ساخت کا رول ادا کرتا رہا ہے۔ جس طرح ہندوؤں کے یہاں کیلاش پر بت ادب و شعر میں آرکی

ٹاہی اور اساطیری پیکر رہا ہے اس طرح آنحضرت محمد کی ذات مبارکہ کی بنا پر صفا، مروہ، کوہِ حراء، کوہِ ثور جیسے متعدد آرکی ٹاہی اور اساطیری پیکر شعر و ادب میں اساطیری استعاریت کا سیاق فراہم کرتے رہے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے جہاں اساطیر کا ذکر ہوگا وہاں مذہب کا ذکر لازماً ہوگا اور دنیا کے کسی بھی خطے کی شاعری ان کے اثرات سے خالی نہیں ہو سکتی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو نعت کے محرک اور خدایا خالق ارض و سما، جو حمد کا محرک ہے کا بیان اردو میں عرب اور عربی اور فارسی اسالیب سے گہری مماثلت کے باوجود بہت الگ ہے۔ ہندوستانی روایات اور جغرافیائی اثرات کے پس منظر میں اردو کی نعتیہ شاعری میں جو محمد سامنے آتے ہیں وہ ہندی ذہن سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں جیسے محسن کا کوروی مدح خیر المرسلین کے لیے کاشی، متھرا اور گنگا جل جیسی لفظیات کا استعمال کرتے ہیں تو لغت میں آفاقیت کے ساتھ ساتھ مقامیت کی بوباس رچ بس جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ کلام میں واقعیت اور شعری صداقت کچھ اس انداز سے ابھرتی ہے کہ یہ شاعری دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد کی شاعری میں عقیدے کی واپسی اور مذہبی رجحان کا عود کر سامنے آنا اس امر کی مثال ہے کہ نعت اور حمد کی شاعری کے لیے اردو میں ہر عہد میں ایک خاص جگہ رہی ہے۔ ہماری نعتیہ شاعری دراصل اردو شاعری کی اہم روایت ہے۔ اردو شاعری میں ابتدا تا حال دواوین بغیر حمد و نعت کے شاید ہی شائع ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بعض شعراء کی پہچان ہی حمد اور نعت کی شاعری سے قائم ہوئی ہے۔ اردو میں ابرار کرپوری تو ہندوستان میں حمد کے باضابطہ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مذہبی شاعری یعنی مذہب اور شاعری کے رشتے پر غور و فکر کرتے ہوئے سید یحییٰ شیط نے اپنی کتاب ”اسطوری فکر و فلسفہ (اردو شاعری میں)“ (۲۰۰۸ء) لکھا ہے:

”اب رہا مذہبی شاعری کو قتی نقطہ نظر سے جانچنے اور پرکھنے کا سوال... تو اس کے لیے ہمیں شاعری کے تہذیبی و ثقافتی ماحول پر نظر رکھنی ہوگی۔ اگرچہ جدید تنقیدی نقطہ نظر کو اپنا کر تہذیب و تمدن کو یکسر نظر انداز کر دیں اور پھر آج کے معیار پر قدیم مذہبی شاعری کو پرکھیں گے تو یہ فن کاروں پر بڑا ظلم ہوگا۔“

شیط صاحب بجا طور پر یہ باور کر رہے ہیں کہ نئی تنقید میں تہذیب ثقافت اور سماجی اقدار اور ادبی اقدار کو جدا گانہ رویہ قرار دیا گیا جب کہ آج ثقافتی اور ادبی اقدار کے فرق کو ختم کر دیا گیا ہے۔ نعتیہ شاعری ہر چند کہ قرآنی شعریات سے انحراف نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء اس شاعری میں

حمد و نعت کی شعریات

غزل، رباعی یا مرثیہ کی طرح آزاد نہیں ہوتے بلکہ محتاط ہو کر اپنے شعری ذہن کا استعمال کرتے ہیں لیکن اپنے ممدوح سے گہری عقیدت ہونے کی وجہ سے شعروں میں خلوص، صداقت اور عشق رسول کی وجہ سے تغزل پیدا ہو جاتا ہے۔ شعراء جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی سے اپنی دلی و دہنی وابستگی اور دیوانگی کا اظہار کرتے ہیں تو کلام میں اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ وہی اثر جو عشقیہ غزل کا مزاج ہوتا ہے۔

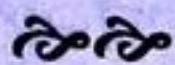
حمد و نعت کی شاعری کے بارے میں یہ رائے قائم کر لینا کہ شعر چاہے جس درجے کا ہو چونکہ اس میں خدا اور رسول کا نام ہے اس لیے نعت کا یا حمد کا شعر ہے ان معنوں میں بھی ایک لچری منطق بن جاتی ہے کہ خدا بھی اپنے بندوں کو قرآن میں احسن الخالقین کے نام سے پکارتا ہے یعنی وہ جو ہم میں بہتر تخلیق کار ہے مومن کہلاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کی تعریف اگر اچھے لفظوں اور آداب کے معیاری طریقوں کے پیش نظر کیا جائے تو وہ تعریف اپنا اثر پیدا کرتی ہے۔ لہذا نعت کا کمزور شاعر بھی ویسا ہی کمزور شاعر ہے جیسا کہ غزل کا، کیونکہ قرآنی شعریات میں 'خدا' نے اپنی تعریف کا وہ ڈھنگ سکھایا ہے کہ جس سے وہ خوش ہوتا ہے۔ الحمد شریف کی آیتوں کو پڑھتے ہوئے کیا اچھی سے اچھی شاعری اس کے آگے روکھی پھسکی معلوم نہیں ہوتی۔

اگر بغائر نظر کلاسیکی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ ہمارے کئی شعراء نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور معراج کے واقعے سے متعلق کئی اساطیری قصوں کو نظم کیا ہے جیسے طالب نامی مثنوی کے شاعر نے نبی خاص (باز و وفاختہ) کی اساطیر پیش کی ہے اسی واقعے کو کبوتر نامہ کے نام سے امیر مینائی نے نظم کیا ہے۔ فتاحی نے تخلیق نور محمدی کا قصہ نور نامہ میں بیان کیا ہے جسے پڑھتے ہوئے ہم شاعری اور شعریت کی ان جملہ اسالیب سے دوچار ہوتے ہیں جس کا تقاضا کسی ادبی فن پارے کے لیے کیا جاتا ہے۔

ان جملہ مباحث کے بعد مختصراً عرض یہ کرنا ہے کہ حمد اور نعت کی شاعری اور شاعری کی ایک زندہ اور متحرک روایت رہی ہے جس کا عام شاعری سے گہرا رشتہ ہے۔ حمد اور نعت کی شاعری کا اہم موصیف عام شاعری ہی کی طرح احساس جمال اور احترام آدمیت ہے نیز اپنی تہذیب و ثقافت کا تحفظ ہے یا اپنی ثقافتی اقدار و مداولات کی قنی پیش کش ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی کا نام نہیں بلکہ تہذیب و ثقافت، اقدار و روایات، اصول و نظریات، حق و باطل، نشست و برخاست، طرز زندگی، روحانی اسرار اور خدا اور کائنات کے درمیان ایک برزخ کا نام بھی ہے۔ اس لیے نعت کا موضوع پوری زندگی کو حاوی ہے اور اس مرکز پر شاعری وسیع لہجہ کی تقاضا کرتی ہے اور اردو زبان کے ممکنہ

رجسٹر سے رشتہ جوڑتے ہوئے اجتماعی ذہن کا اظہار بن جاتی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ نعت کے محرک ہیں ان کی حیات مبارکہ انسانیت اور سماج کے جملہ اقدار کی تجسیم ہے اس لیے نعتیہ شاعری جو کسی خاص ہیئت سے وابستہ نہیں شاعری کی جملہ جہتوں سے قریب ہونے والی شاعری یعنی منجملہ اردو شعرو شاعری ہے۔ کیونکہ بقول اقبال:

وہ دانا ئے سُبُل ختم الرسل مولا ئے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقاں وہی یسین و طابا



اردو نعت اور وقت کی ماورائی جہات

ABSTRACT:

Beyond perception dimensions of Time are focused in this article in the light of definitions of time attempted by Einstein and Hackings. Qur'anic divine verdict in this regard also referred to apprehend miraculous journey of Prophet Muhammad (S.A.W) i.e. Mairaj from Masjid-e-Haram (Makkah) to Masjid-e-Aqsa (Palestine) and wherefrom to Skies within very short span of time. Attempts also made to apprehend the theory through Qur'anic story of Men of Cave. Poetic expression as genre of Naat has also been placed to show relevance of Time theory in creative literary works.

اردو نعت میں وقت کا تصور ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساتھ ماورائیت پر بھی مشتمل رہا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل وقت کی معلوم جہات ہیں جس میں ہم اور آپ موجود ہیں اور چوتھی سمت اُن ماورائی عناصر کا بیان ہے جو وقت کی رفتار کے کم یا زیادہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اردو نعت نگاری میں وقت کا ماورائی تصور بنیادی طور پر واقعہ معراج اور حضرت محمد مصطفیٰ کے معجزات کے ساتھ منسلک ہے۔ واقعہ معراج مصطفیٰ اور معجزہ شق القمر کے ساتھ ساتھ ہجرت مدینہ کے سفر کے دوران غار ثور میں قیام میں پیش آنے والے واقعات مثلاً غار کے منہ پر مکڑی کا جالا اور فاختہ (کبوتر یا اسی طرح کا کوئی دوسرا پرندہ) کا چند ساعتوں میں گھونسلہ بنا کر انڈے دینا وقت کے اُسی ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی تصور کا اظہار ہے۔ وقت کے اس ماورائی تصور کو عہد جدید میں وقت کے نئے نظریات کے سامنے رکھ کر تجزیہ کرنا اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقانیت ثابت کرنا اس مضمون کے مقاصد میں شامل ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہوگا کہ اردو نعت میں ان واقعات کا بیان حقائق سے قریب تر ہے یا نہیں۔ شاعری میں مبالغہ آرائی پر نظر رکھتے ہوئے خلافتِ حقیقت مضامین پر گرفت کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس سے پہلے کہ ہم اردو نعت اور سیرتِ اطہر سے ان واقعات کو سائنسی اور منطقی انداز میں سمجھنے کی کوشش کریں آئیے دیکھتے ہیں کہ خود وقت کیا ہے؟ اور وقت کی مختلف جہات کو سامنے رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ، انسان اور کائنات کی مثلث میں وقت کے کون سے نئے زاویے سامنے آتے ہیں؟ کائنات کی تشکیل کے بعد انسان کو جب پہلی بار فنا اور بقا کے فلسفے کا ادراک ہوا تو اُس کو وقت کے موجود ہونے کا احساس ہوا۔ وہی لمحہ تھا جب انسان نے وقت کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی، گویا وقت ایسا پل ہے جو بقا کو فنا سے ملاتا ہے۔ مگر بنیادی سوال تو پھر اپنی جگہ موجود ہے یعنی وقت کی ماہیت کیا ہے؟

.....بقا.....فنا.....؟

وقت کو سمجھنا، آغاز ہی ہے انسان کی ضرورت بن گیا لہذا آغاز سے ہی وقت کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہوگی لیکن اس کی عقلی توجیہ آج تک پیش نہیں کی جاسکی۔ اس کی بنیادی وجہ وقت کا تجریدی ہونا ہے۔ وقت کو تجسیم نہیں کیا جاسکتا۔

وقت ماضی، حال اور مستقبل میں اپنی شکل تبدیل کرتا رہتا ہے۔ حال کو روکا نہیں جاسکتا یوں حال مستقل طور پر ماضی میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور ماضی کو ہاتھ بڑھا کر روکا یا پکڑا نہیں جاسکتا۔ خود مستقبل ہمیشہ پردہٴ اخفا میں رہتا ہے لہذا اُس کی تجسیم بھی نہیں کی جاسکتی۔ وقت کا تعلق زمانہ، عہد اور عرصہ کے ساتھ ہے اس لیے وقت کا تصور سامنے آتے ہی ماضی، حال اور مستقبل کے مفاہیم سامنے آتے ہیں یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت کا تصور اپنے ساتھ وسیع، گہرے اور ماورائی مفاہیم رکھتا ہے۔ آئن سٹائن نے کہا تھا:

۱ "Time is the fourth dimension of the universe"

آئن سٹائن نے اپنے نظریہ اضافیت (Theorey of Relativity) کے ذریعے ثابت کیا کہ خلاء میں روشنی کو انٹمی شکل میں سفر کرتی ہے یعنی توانائی کے بندل (Bundles) کی شکل میں۔ یہ نظریہ روشنی کے لہر ہونے کے پرانے نظریات کے خلاف تھا۔ اس طرح آئن سٹائن نے روشنی کے پرانے ذراتی نظریے کو پھر سے زندہ کر دیا۔ آئن سٹائن نے روشنی کو ذرہ اور لہر کی متضاد خوبیوں کا حامل قرار دیا یوں خلاء میں روشنی کی رفتار کے مستقل ہونے کا نظریہ سامنے آیا۔ یوں آئن سٹائن کی تھیوری آف ریلٹیویٹی (Theorey of Relativity) سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کائنات میں کسی بھی چیز کی حد رفتار روشنی کی رفتار ہے۔ اس نظریے نے وقت کی ماہیت کے حوالے سے بہت سے نئے سوالوں کو جنم دیا۔

☆ کیا وقت ایک حقیقت ہے یا محض فریب؟

☆ کیا وقت کائنات کی معروضی حقیقت ہے یا موضوعی؟

☆ کیا وقت کا کوئی آغاز و انجام ہے؟

☆ کیا وقت مستقل حقیقت ہے یا اضافی (Relative)؟

☆ وقت جن چیزوں کے تقابل سے وجود پاتا ہے کیا ان اشیاء سے وقت کا کوئی حقیقی تعلق ہے؟
وقت کا تصور کائنات میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے حوالے سے کیا جاسکتا ہے یعنی کوئی واقعہ کسی دوسرے واقعے سے کتنا پہلے یا بعد میں وقوع پذیر ہوا لہذا زیادہ آسانی سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وقت کا تصور مادے اور انرجی کے ساتھ ہے۔ انسانی شعور وقت کی پیمائش مادے اور توانائی کی مختلف انداز میں حرکات اور ان کا آپس میں تقابل کر کے کرتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہماری اس کائنات میں ارب ہا کہکشاں ہیں۔ ان کہکشاؤں میں سے ہر ایک کہکشاں کا نظام شمسی علیحدہ ہے۔ ہر نظام شمسی کے مختلف ہونے کے باعث کشش کا نظام بھی مختلف ہوگا لہذا وقت کی پیمائش کا نظام بھی مختلف ہوگا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دو ارب سے زائد کہکشاں ہیں ہماری اس کائنات کا حصہ ہیں۔ سائنس وقت کا تعلق روشنی کی رفتار سے جوڑتی ہے۔ وقت کو کائنات کی وسعت میں پیمائش کرنے کے لیے نوری سال (Light Year) کی اصطلاح بنائی گئی۔ وقت کے تصور کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے خود کائنات اور اس کے پھیلاؤ کے نظریے (Big Bang Theorey) کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ وقت کی تعریف مختلف لغات میں وقفہ (Duration) کی گئی ہے جو وقت کو سمجھنے کو اور مشکل بنادیتی ہے۔ سٹیون ہاکنگ اپنی معروف تصنیف ”وقت کا سفر“ میں لکھتے ہیں:

”وقت کی ماہیت کے بارے میں ہمارے خیالات چند سالوں میں کس طرح تبدیل ہو چکے ہیں اس صدی کے آغاز (بیسویں صدی) تک لوگ مطلق وقت پر یقین رکھتے تھے، یعنی ہر واقعہ وقت نامی ایک عدد سے منفرد انداز میں منسوب کیا جاسکتا تھا..... تاہم اس دریافت نے کہ ہر مشاہدہ کرنے والے کو اپنی رفتار سے قطع نظر روشنی کی رفتار یکساں محسوس ہوگی، اضافیت کے نظریے کو جنم دیا۔“ ۲

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں وقت کی تعریف کچھ یوں کی گئی ہے:

”انسانی تجربے کے مطابق وقت ایک ایسے بہاؤ کا نام ہے جس کی رفتار

نا قابلِ فہم ہے۔“ ۳

”نا قابلِ فہم رفتار“ کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ وقت کے گزرنے کی رفتار نامعلوم ہے اور نامعلوم رفتار ظاہر کرتی ہے کہ زمان کا تصور مکان کے تصور سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ سائنسی نظریات کے حوالے سے وقت کو تین مختلف نظریات کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے:

☆ بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theorey)

☆ نیوٹن، آئن سٹائن اور سٹیفن ہاکنگ کا تصور وقت

☆ بگ کرانچ تھیوری (Big Crunch Theorey)

☆ بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theorey):

بگ بینگ تھیوری دو مفروضوں پر اپنی بنیادیں استوار کرتی ہے۔ پہلا آئن سٹائن کا عمومی نظریہ اضافیت مادے کے تجاذبی تعامل (Gravitational Interaction) کو درست طور پر وضاحت جبکہ دوسرا کائناتی اصول ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کائنات میں بگ بینگ کا مرکز خلاء کا کوئی مخصوص نکتہ نہیں تھا بلکہ یہ پوری کائنات میں بیک وقت وقوع پذیر ہوا تھا۔ یہ دونوں نقاط پلانک ٹائم (Plank Time) کے بعد کی صورت حال کا جائزہ ممکن بناتی ہیں۔ بگ بینگ تھیوری کے حوالے سے مختلف نظریات مندرجہ ذیل ہیں:

..... کائناتی بیضے کا نظریہ: یہ نظریہ بتاتا ہے کہ کائنات مکان میں محدود ہے سوا سے زمان میں بھی محدود ہونا چاہئے۔

..... جھولتی کائنات کا نظریہ: یہ نظریہ کہتا ہے کہ کائنات کچھ عرصے کے لیے پھیلتی ہے پھر واپس ایک نکتہ پر مرکوز ہو جاتی ہے پھر دوبارہ پھیلنا شروع کرتی ہے۔

..... عقبی تابکاری کا نظریہ: جارج گیماؤ نے 1948ء میں بگ بینگ سے جنم لینے والے تابکاری اثرات کا نظریہ پیش کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ خلاء میں بگ بینگ کے بعد ایک بازگشت پیدا ہوئی ہوگی۔

..... افراطی کائنات کا نظریہ: یہ تھیوری سب سے جدید ہے جو امریکی سائنسدان Alan Guth نے

۷۰ء کے عشرے میں دی۔ اُس کا خیال تھا کہ کائنات میں بگ بینگ کے بعد درجہ حرارت اس قدر تیزی سے گرا کہ مختلف عوامل کے مکمل ہونے کا وقت نہیں ملا اور یہ تفریق کائنات کے کافی

بڑی ہونے کے بعد وجود میں آئی۔ آغاز کی بگ بینگ تھیوری میں کائنات کا سائز ایک انگور کے دانے کے برابر قرار دی جاتی تھی لیکن Guth نے بتایا کہ ہائیڈروجن کے نیوکلئیس سے بھی ایک ارب گنا چھوٹی ہوگی اور پھر روشنی کی رفتار سے بھی کئی گنا تیزی سے پھیلی ہوگی۔ وقت کا تصور جدید سائنس کے مطابق ایک ایسی شے کا ہے جس نے ہمیں یعنی کائنات کو چاروں جانب سے گھیرا ہوا ہے۔

آئن سٹائن کے حوالے سے ایک روایت سامنے آتی ہے کہ:

”آئن سٹائن سے اُس کی موت کے قریب کسی نے پوچھا کہ آپ اتنے بڑے سائنسدان ہیں لیکن آپ بھی موت کا شکار ہو رہے ہیں تو اُس نے تاسف سے جواب دیا ہاں! تمام ذی ارواح کی طرح میں بھی موت کا شکار ہو رہا ہوں۔ صرف ایک صورت تھی کہ میں موت کا شکار نہ ہوتا اگر میں کسی طرح وقت سے باہر نکل جاتا لیکن ایسا ممکن نہیں کیونکہ وقت کا جبر ہمارے چاروں جانب موجود ہے۔“

☆ آئن سٹائن کا تصور وقت:

وقت کے حوالے سے آئن سٹائن کا خیال بھی یہی تھا کہ کائنات میں وقت کا آغاز بگ بینک کے بڑے دھماکے کے ساتھ ہی ہوا اور اس کا اختتام بھی اسی طرح ایک عظیم دھماکے (بگ کرئج) پر ہوگا۔

☆ سٹیفن ہاکنگ کا تصور وقت:

سٹیفن ہاکنگ نے بھی بگ بینک تھیوری کو ہی وقت کی بنیاد قرار دیا۔ اُس نے اپنی کتاب

A Brief History of Time میں کہا:

”کائنات مختصر تھی تو بگ بینک کا دھماکہ ہوا اور وقت کا آغاز ہوا۔ کائنات

کے پھیلاؤ کا تصور وقت کی ابتداء کا تصور بھی دیتا ہے۔“

☆ نیوٹن اور تصور وقت:

ارسطو اور نیوٹن دونوں وقت کے حتمی تصور پر یقین رکھتے تھے یعنی وقت کو بغیر کسی شک کے درست طور پر ناپا جاسکتا ہے اور یہ اضافی نہیں بلکہ حتمی ہوگا۔ نیوٹن کے قوانین روشنی اور مادے کی حرکات پر قائم تھے لہذا اُس کے ہاں وقت کا حتمی تصور قائم ہوا۔ نیوٹن کے خیال میں وقت خطِ مستقیم

میں ہر طرف رواں ہے۔ نیوٹن کا خیال تھا کہ مادے کے بغیر بھی وقت قائم رہے گا۔ آج کی جدید سائنس وقت کو حتمی نہیں بلکہ اضافی (Relative) تصور کرتی ہے۔

وقت کے حوالے سے ڈاکٹر ناہید قمر اپنی تصنیف میں لکھتی ہیں

”انسان، کائنات اور وقت کی مثلث اسی لمحے وجود میں آگئی تھی جب انسان

کو پہلی بار اپنی فنا کا ادراک ہوا تھا اور اُس نے کائنات میں اپنے مقام کے

تعیین کے لیے وقت کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کی۔“

نیوٹن جدید طبیعیات کا بانی تھا اور اُسے بلاشبہ Father of Modern Physics کہا جاسکتا

ہے۔ نیوٹن نے وقت کے حتمی تصور کو بنیاد بنا کر کشش ثقل کا قانون پیش کیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ کائنات

میں موجود ہر مادی چیز دوسری مادی چیز کو ایک خاص قوت سے اپنی طرف کھینچتی ہے جسے کشش ثقل

کہتے ہیں۔ کھنچاؤ کی اس قوت کا انحصار دونوں اجسام میں موجود مادے کی مقداروں اور ان اجسام کے

درمیان پائی جانے والی کشش بھی اُسی کے مطابق زیادہ ہوگی اور اجسام کے درمیان جتنا فاصلہ زیادہ

ہوگا کشش کی قوت بھی اُسی کے حساب سے کم ہوگی۔ نیوٹن نے اس تھیوری کے بیان میں یہ بھی کہا کہ

چاند کشش ثقل کے زیر اثر مسلسل زمین کی طرف آرہا ہے لیکن وہ زمین سے کبھی بھی نہیں ٹکراتا اس کی

وجہ اُس نے کھنچاؤ کی قوت (Gravitational Pull) کو قرار دیا۔ نیوٹن نے اس کھنچاؤ کی قوت کو

بنیادی طور پر کائنات میں موجود توازن کا بنیادی نکتہ قرار دیا۔ اُس نے اس قوت کو بغیر کسی واسطے

(Mediam) کے اثر انداز ہونے والی ایسی قوت قرار دیا جیسے رسی سے بندھا ہوا جسم ہم دائرے میں

گھماتے ہیں نیوٹن کا خیال تھا کہ یہ طویل فاصلوں پر بھی ایسے ہی اثر انداز ہوتی ہے جیسے قریب رکھے

ہوئے دو اجسام پر۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وقت کو حتمی تصور کرنے والی یہ مساوات آج بھی رائج ہے

اور ٹھیک کام کر رہی ہے۔ راکٹوں، مصنوعی سیاروں اور خلائی مشنز کے مداروں کا حساب لگانے اور

قوت کی شرح نکالنے کے لیے یہ کامیابی سے استعمال کی جاتی رہی ہے۔

آئن سٹائن وہ دوسرا اہم سائنسدان تھا جس نے وقت کو اضافی قرار دے کر نیوٹن کے بنیادی

نظریہ میں دراڑ ڈالی۔ اس نے کشش ثقل کے نظریے کو ایک نیا زاویہ اور نئی وضاحت دی۔ وہ روشنی کی

رفتار اور ماہیت پر غور کرتے ہوئے جب اس یقین پر پہنچا کہ کائنات میں کوئی بھی چیز روشنی سے تیز سفر

نہیں کر سکتی تب اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر سورج (ہمارے نظام شمسی کی مرکزی قوت) مکمل

طور پر ختم ہو جائے تو کیا ہوگا؟ اپنے اس ذہنی سفر میں اُس نے اس کا جواب جاننے کی کوشش کی۔

نیوٹن کے مطابق اگر سورج ختم ہو جائے تو سورج کی کشش جو نظام شمسی میں سیاروں کو مدار میں گھومنے کی وجہ ہے، بھی ختم ہو جائے گی اور سورج کے گرد گردش کرنے والے سیارے فوراً اپنے مداروں سے نکل کر خطِ مستقیم پر سفر کرنے لگیں گے۔ یہاں نیوٹن کے نظریے کے ساتھ ایک مسئلہ پیدا ہوا۔ مسئلہ یہ تھا کہ روشنی کو سورج سے زمین تک پہنچنے میں آٹھ منٹ لگتے ہیں تو سورج کے ختم ہوتے ہی زمین اپنا مدار چھوڑنے کے آٹھ منٹ بعد تک روشن ہی رہے گی۔ آئن سٹائن نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ تجرباتی سطح پر وہ یہ نتیجہ نکال چکا تھا کہ کائنات میں موجود کوئی بھی شے روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز رفتار نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ کششِ ثقل بھی اس سے تیز رفتار نہیں تو پھر زمین سورج کے ختم ہو جانے کے بعد بھی آٹھ منٹ تک اپنے مدار میں قائم رہے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سورج کے ختم ہو جانے سے کشش کا نظام بھی ختم ہو گیا تو پھر وہ کون سی قوت ہے جو زمین کو آٹھ منٹ تک مدار میں قائم رکھے گی یہاں آئن سٹائن وقت کے اضافی (Relative) ہونے کے نظریہ ہونے پر پہنچ گیا۔ اس ذہنی سفر سے وہ اس نتیجے پر بھی پہنچا کہ کششِ ثقل نامی کوئی شے موجود نہیں۔ اصل میں اس معاملے کا تعلق سپیس ٹائم (Space Time) کے ساتھ ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم آئن سٹائن کے وقت کے متعلق اس نظریے کو سمجھیں پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ آئن سٹائن نے سپیس ٹائم کی اصطلاح کیوں اور کس کے لیے استعمال کی۔ اسپیس ٹائم (Space Time) کے اس نسبتاً پیچیدہ تصور کو سمجھنے کے لیے ایک مثال پر غور کرتے ہیں۔

فرض کریں ہمارے ارد گرد موجود تمام چیزیں غائب ہو جائیں یعنی عمارتوں، پہاڑوں، درختوں سے لے کر چھوٹی سے چھوٹی اشیاء تک اگر کسی عمل سے غائب کر دی جائیں تو پھر پیچھے کیا بچے گا؟ ایسی صورت میں پیچھے بچ جانے والا مواد خلاء یا Space کہلائے گا۔ اگر ہم سپیس یا خلاء کو سادہ زبان میں بیان کریں تو سپیس یا خلاء وہ گنجائش ہے جس میں تمام مادی اجسام موجود ہیں اور انہیں آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے حرکت کرنے کے لیے جگہ میسر ہوتی ہے۔ نیوٹن خلاء (Space) کو غیر متغیر اور غیر عامل مانتا تھا جبکہ آئن سٹائن کے خیال میں خلاء غیر متغیر اور غیر عامل نہیں ہے۔ بلکہ یہ کائنات میں رونما ہونے والے عوامل میں حصہ لیتی ہے۔ خلاء پھیل اور سکڑ سکتی ہے بل کھا سکتی ہے اور لچک بھی اس کی خصوصیات میں شامل ہو سکتی ہے۔ آئن سٹائن نے وقت کے متعلق بھی ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ خلاء کی طرح وقت بھی مستقل اور غیر متغیر نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی پھیل اور سکڑ سکتا ہے۔ کائنات کے مختلف منطقوں میں وقت کی رفتار بھی مختلف ہو سکتی ہے۔

اُس نے وقت کو اضافی (Relative) قرار دیا۔ اُس نے خلاء اور وقت کے غیر متغیر اور غیر مستقل (اضافی) ہونے کو ایک نئی اصطلاح سپیس ٹائم (Space Time) کا نام دیا۔ آئن سٹائن کے مطابق تمام مادی اجسام سپیس ٹائم پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس میں خم پیدا کر دیتے ہیں۔ مادی جسم جس قدر بڑا ہوگا اُسی قدر زیادہ خم ڈالے گا اور جتنا ہلکا ہوگا اُس کا خم بھی اُسی لحاظ سے کم ہوگا۔ یوں سمجھیں کہ مادی اجسام اپنے مادے کی مقدار کے لحاظ سے سپیس ٹائم میں ایک گڑھا بنا دیتے ہیں اور ارد گرد کے چھوٹے اجسام اس گڑھے میں گرنے لگتے ہیں اور ایسا سمجھا جاتا ہے کہ بڑے اجسام کی کشش چھوٹے اجسام کو اپنی جانب کھینچ رہی ہے یعنی سیب درخت سے ٹوٹ کر اس لیے زمین کی طرف نہیں گرتا کہ اُسے زمین کی کشش اپنی جانب کھینچتی ہے بلکہ زمین کے گرد موجود سپیس ٹائم کا خم اُسے زمین کی جانب دھکیلتا ہے آئن سٹائن نے اپنے نظریے سے یہ بھی بتا دیا کہ کتنا بڑا خم سپیس ٹائم میں کتنا بڑا گڑھا ڈالے گا۔ سپیس ٹائم یعنی وقت اور خلاء کے اس نظریے کو بعد میں دو مختلف تجربات کے ذریعے سائنسی طور پر ثابت بھی کیا گیا۔ 1976ء میں دو ایٹمی گھڑیوں کے ذریعے پہلا تجربہ کیا گیا۔ اس تجربے کو گریوٹی پروب اے (Gravity Prob A) کا نام دیا گیا۔ اس تجربے میں ایک ایٹمی گھڑی کو زمین پر رکھا گیا اور دوسری کو خلاء میں بھیجا گیا۔ کچھ وقت کے بعد زمین والی گھڑی اور خلاء کی گھڑی کا موازنہ کیا گیا تو پتہ چلا کہ زمین کے نزدیک موجود گھڑی کا وقت خلاء میں موجود گھڑی کی نسبت سُست تھا یعنی دونوں مقامات پر وقت کی رفتار میں فرق تھا۔

دوسرا تجربہ ۲۰۰۴ء میں گریوٹی پروب بی (Gravity Prob B) کے نام سے کیا گیا اس میں ایک مصنوعی سیارہ خلاء میں بھیجا گیا اور اس میں موجود آلات کی مدد سے ایسی پیمائشیں کی گئیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ زمین اپنے گرد موجود سپیس ٹائم میں خم ڈال رہی ہے۔ ان تجربات سے حاصل شدہ نتائج آئن سٹائن کی مساواتوں سے حاصل کردہ نتائج سے بالکل ہم آہنگ تھے لیکن بنیادی سوال کا جواب آئن سٹائن کے پاس بھی نہیں تھا کہ مادی اشیاء میں ایسا کیا ہے جو سپیس ٹائم کو موڑ دیتا ہے؟ آئن سٹائن کے اس نظریے نے بلیک ہول (Black Hole) کے تصور کو بھی زندگی دی۔ بلیک ہول یا سیاہ گڑھا ایک مردہ ستارہ ہوتا ہے جو اپنی ہی کشش کی وجہ سے ایک نکتے پر سکڑ جاتا ہے اور اس کا حجم کم ہونے سے اس کی کشش ہزار ہا گنا طاقت ور ہو جاتی ہے کہ یہ سپیس ٹائم اور روشنی کو بھی اپنے اندر گھسیٹ سکتا ہے۔ بلیک ہول کے نزدیک جانے والی تمام اشیاء اس میں دفن ہو جاتی ہیں۔ بلیک ہول کی بے پناہ کشش اور انتہائی کم حجم نے آئن سٹائن کے نظریے پر سوالیہ نشان لگا دیا ہے

آئن سٹائن کے خیال میں بڑے اجسام سپیس ٹائم میں بڑا گڑھا بناتے ہیں جبکہ کم حجم والے بلیک ہول کی کشش زیادہ طاقت ور ہونے کی وجہ سے اس کے مرکز میں وقت صفر ہو جاتا ہے سچ یہ کہ وقت کے اضافی ہونے کے بہت سے تجرباتی ثبوت ہونے کے باوجود ایسی وضاحت ملنی باقی ہے جس کا اطلاق بڑے بڑے اجسام کے ساتھ چھوٹے اجسام مثلاً ایٹم یا اُس سے بھی چھوٹے ذرات پر بھی یکساں طور پر کیا جاسکے۔ موجودہ دور میں گاڈ پارٹیکلز اور گریوٹان (God Particles / Gravitons) کے نظریات نے کشش ثقل اور وقت کے اضافی ہونے کے نظریے کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ صرف طبعیات کی مدد سے وقت کی ان ماورائی جہات کو سمجھنا ناممکن ہے کہ مابعد الطبیعیاتی عوامل یکساں طور پر ہماری کائنات پر عمل پذیر ہو رہے ہیں۔ ان مابعد الطبیعیاتی عوامل کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآن کی جانب رجوع کرنا پڑے گا اور اس کے لیے دل میں عشق رسول اور عشق خدا کی شمعیں روشن کرنا پڑیں گی۔ اس حوالے سے شاہ محمد سبطین شاہ جہانی کے چند جملے درج کرنے ضروری ہوں گے:

”یہ بات روزِ روشن کی طرح منور ہے کہ تفہیم قرآن مجید اور اس کے رموز سمجھنے کی یہ سعادت کما حقہ اُسے ہی حاصل ہوتی ہے جس کے دل میں عشق رسالت مآب کی نورانی قندیل روشن و تاباں ہو اور تزکیہ نفس، تصفیہ قلب اور تجلیہ روح کی سعادتوں سے وہ شخص بذریعہ مرشدِ کامل مستفید و مستفیض ہو چکا ہو۔“

وقت کی ان ماورائی جہات کو سمجھنے کے لیے صرف سائنس اور منطق پر بھروسہ کرنا دانشمندی نہیں ہے کہ مذاہب میں روحانی عوامل کا حصہ مادی عوامل سے کم نہیں ہوتا۔ وقت کو کائنات کی چوتھی جہت (Fourth Dimension) سائنس اور منطق نے کہا لیکن قرآن وقت کے حوالے سے بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں۔

الْشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝

”سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔“

دوسری جگہ وقت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

”اُس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے مضمون کا

کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے۔“

وقت کے حوالے سے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر وقت (زمانہ) کے حوالے سے انسان کو مختلف پیغامات دیے ہیں۔ زمانے کو پروفیسر احمد رفیق اختر نے ایک نئے زاویے سے بیان کیا۔ فرماتے ہیں:

”میرے نزدیک زمانہ ایک حد بندی ہے جس میں مختلف حادثات و واقعات اس طرح پابند کیے گئے ہیں کہ آپس میں رگڑ نہ کھائیں۔ اس وقت زمان و مکاں پر جتنے بھی تھیسز زمین پر موجود ہیں ان میں زمانے کو لامحدود قرار دیا گیا ہے یا لازمان قرار دیا گیا ہے جبکہ مذہبی طور پر زمانہ بھی چیزوں اور وقت کے تعین کے لیے خدا کا ایک آلہ ہے۔ اس کو قطعی لا انتہا نہیں کہا جاسکتا۔“ ۹

مذہبی نقطہ نظر سے وقت محدود ہے۔ اگر زمین اور کائنات کے تناظر میں وقت کو دیکھا جائے تو یہ محدود ہو جاتا ہے۔ وقت دراصل مختلف اشیاء کی پہچان ہے۔ یہ چیزوں کو چیزوں سے جدا کرنے کا ایک آلہ ہے اسی لیے عربی میں کہا جاتا ہے:

الوقت سيف قاطع

(وقت کاٹتی ہوئی تلوار ہے)

وقت کے ریلیٹو یا اضافی ہونے کا نقطہ نظر شعراء کے ہاں بھی موجود رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک نظم ملاحظہ کریں۔ وقت کے لمحہ موجود میں ہوتے ہوئے ماوراء ہونے کا تصور کس خوبصورت انداز میں سامنے آتا ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

وقت ٹھہرا ہوا ہے

زماں کی روانی فقط واہمہ ہے مری انگلیوں سے گزرتے چلے جا رہے ہیں

زماں گول منکوں کا اک ڈھیر جس کو زماں کی روانی فقط واہمہ ہے

مری انگلیاں رات دن گن رہی ہیں ہر اک شے خود اپنی جگہ پر

جو بے حس پڑا ہے حنوطی ہوئی لاش ہے

فقط ایک پل ہے کہ جس کی وقت کی منجمد قاش ہے

ازل بھی نہیں اور ابد بھی نہیں ہے وقت ٹھہرا ہوا ہے ۱۰

مگردیکھنے والے کہتے ہیں

مکے رواں ہیں

نظم وقت کے مسلسل ہونے کا بیان ہے۔ شاعر نے برگساں کے آن واحد (Elan Vital) کے نظریے کو بیان کرتے ہوئے وقت کی رفتار کو لمحہ موجود سے ماوراء کی جانب ایک مسلسل سفر میں بیان کیا ہے۔ مرزا غالب کے ہاں بھی وقت کا یہی فلسفیانہ تصور موجود تھا۔ کہتے ہیں:

ہستی کے مت فریب میں آجائو اسد عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

(غالب)

لیکن شعراء حضرات نے وقت کے مذہبی تصور کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اگرچہ اس کے لیے بہت سا مطالعہ اور فکری گہرائی کی ضرورت ہوتی ہے لہذا ہمیں اس حوالے سے دینی اور ادبی سطح پر کوئی بڑی کوشش نظر نہیں آتی۔ اسی حوالے سے میری ایک نظم "چوتھی دشا" پیش کرتا ہوں جس میں وقت کے مذہبی تصور کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی دشا

وہ کہ تعداد میں تین تھے پانچ تھے سات تھے

کون جانے مگر

ساتھ تھا

ان کے اک پالتو جانور

(دوستوں کی طرح)

کھوج میں تھے وہ سب منبع نور کی

وقت اپنی حقیقت کسی کو بھی دیتا نہیں

وقت مٹھی سے گرتی ہوئی ریت جیسا عمل بھی نہیں

(ہے ازل سے ابد کو ملانے کا اک راستہ)

وقت کتنی دشاؤں میں پھیلا ہوا

کون جانے مگر

وقت کی ایک چوتھی دشا بھی تو ہے

منبع نور کی کھوج میں غار کے پتھروں پہ تھے وہ سجدہ زن

تین سو سال تک

جانے کتنے زمانوں میں بہتے رہے

وقت رکتا نہیں

ہاں! مگر دوستوں کے لیے رک ہی جاتا ہے وہ

اپنی آغوش میں لے لیا

وقت نے آگے بڑھ کے انہیں

وہ جو تعداد میں تین تھے پانچ تھے سات تھے

کون جانے مگر

وقت کی ایسی چوٹی دشا کو چلے

جس کے آگے فقط

منبع نور تھا ۱۱

وقت کی حقیقت کا تعلق بنیادی طور پر اُس بڑی حقیقت سے ہے جس کی تلاش ہمیشہ سے انسان کا مقصد رہی ہے۔ فلسفہ اور دوسرے علوم کی مدد سے انسان اُس حسنِ ازلی کو پانے کا خواہ رہا ہے جو موجود ہوتے ہوئے بھی ماوراء سے جا ملتا ہے۔ قرآن و حدیث میں وقت کے مختلف تصورات کے حوالے سے اشارے ملتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَالْعَصْرُ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ

”قسم ہے زمانے کی بے شک انسان نقصان میں ہے۔“ ۱۲

زمانے سے مراد یہاں وقت ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہاں عصر (شام کا وقت) مراد ہے۔ دونوں صورتوں میں وقت کی مدت یا وقت کے ایک دورانیہ کو ہی مراد لیا گیا ہے۔ تاہم زیادہ قرین از قیاس یہ ہے کہ زمانہ مراد لیا گیا ہوگا۔ وقت ازل وابد سے بے نیاز ہمیشہ سے موجود اور ہمیشہ رہنے والی شے نہیں ہے کیونکہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۱۳

”کوئی شے (کائنات میں) اس سے مشابہہ نہیں۔“

ایک حدیث قدسی ہے:

”زمانے کو برا مت کہو بے شک زمانہ میں خود ہوں۔“ ۱۴

ایک حدیث اسی حوالے سے ملاحظہ فرمائیں:

”آدم کا بیٹا زمانے کو برا کہتا ہے اور زمانے کا مالک تو میں ہوں۔ رات اور

دن میرے ہاتھ میں ہیں۔“ ۱۵

اسلام اور قرآن وحدیث کی تعلیمات میں وقت کی باگ ڈور اُس رب ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے جو اس ساری کائنات کو بنانے والا ہے۔ وہ خود کو زمانہ (وقت) بھی کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت اُس کی تخلیق ہے۔ وقت کے پیمانے اُس نے مختلف مقامات کے لیے مختلف رکھے قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ

اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ ۚ ۱۶

”بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے سب آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش قائم ہوا۔“

اصحاب کہف کے حوالے سے بھی سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا ۚ ۱۷

”اور اصحاب کہف اپنے غار میں نو اوپر تین سو سال رہے۔“

اصحاب کہف کا واقعہ جو قرآن پاک کی سورۃ الکہف کی آیات ۱ تا ۲۵ میں بیان کیا گیا ہے جس میں وقت کی رفتار اور کائنات کے کسی نئے منطقے میں اللہ کے حکم سے اصحاب کہف کے داخل ہونے کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اصحاب کہف کا اللہ کے حکم سے تین سو سالوں تک سوئے رہنا اور اٹھنے پر اُن کے احساسات کا صرف چند گھنٹے نیند کرنے والوں جیسا ہونا وقت کی اسی نئی جہت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ قرآن پاک کے مطابق وقت کی ماورائی جہات کا دوسرا اہم ترین تصور ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے حاصل ہوتا ہے۔ سورۃ بنی اسرائیل کا آغاز انہی آیات سے ہوتا ہے جس میں آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے چھوٹے سے حصے میں مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی سیر کے لیے لے جایا گیا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے:

سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ

الْأَقْصَى الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا ط ۱۸

”پاک ہے وہ ذات جو رات کے ایک چھوٹے سے حصے میں اپنے بندے کو

مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گئی جس کے آس پاس ہم نے برکت رکھی ہے

تاکہ ہم اسے اپنی قدرت کے کچھ نمونے دکھائیں۔“

مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک پرانے زمانے کے مطابق مسافت ۴۰ دن کی تھی۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں معراج سے واپس آ کر اس کی خبر لوگوں کو دی تو کفار نے استہزاء کیا لیکن ایمان والے مسلمانوں نے اس پر یقین بھی کیا اور کفار کو اُن کے استہزاء کا جواب بھی دیا۔ اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اس انوکھے اور شاندار واقعے کی تفصیلات کا درست صورت میں ملنا ذرا مشکل ہو گیا کہ واقعات میں رطب و یابس اور افراط و تفریط بھی شامل ہو گئی حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

”واقعہ معراج ہمارے پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی آیاتِ کبریٰ کا مشاہدہ بھی عظیم تر ہے لیکن عجیب بات ہے کہ ابھی تک اس معجزہ عظیم کی مستند تفصیلات کسی ایک جگہ نہیں ملتیں..... علاوہ ازیں اس معجزے کی بابت لوگ افراط و تفریط کا شکار بھی ہیں۔“ ۱۹

واقعہ معراج کے حوالے سے مستند احادیث میں نبی اکرم کی طرف سے بتائے گئے واقعات کی ترتیب کچھ یوں ہو گئی۔

..... معراج نبی اکرم کو خواب یا روحانی مشاہدہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ کو جسمانی طور پر آسمانوں کی سیر کروائی گئی اور مشاہدات حق سے سرفراز کیا گیا۔

..... معراج کے دو حصے ہیں اسریٰ اور معراج لیکن عام طور پر دونوں حصوں کو اجتماعی طور پر معراج ہی کہا جاتا ہے۔ پہلے حصے میں آپ کا مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک کا سفر اور دوسرے حصے میں بیت المقدس سے آسمانوں کا سفر۔

..... معراج سے واپسی پر جب آپ نے معراج پر جانے کے بارے میں مکہ والوں کو خبر کی تو آپ کا استہزاء کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آپ کی سچائی کو تسلیم کیا اور بارگاہِ نبوی سے صدیق کا لقب حاصل کیا۔

..... معراج نبی کا واقعہ صبح بخاری میں مندرجہ ذیل چار مقامات پر تفصیلی طور پر بیان ہوا ہے

(الف) کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء (حدیث: ۳۴۹)

(ب) کتاب بدء الخلق، بات ذکر الملائکہ (حدیث: ۳۲۰۷)

(ج) کتاب مناقب الانصار، بات المعراج (حدیث: ۳۸۸۷)

(د) کتاب التوحید، باب ماجاء فی قولہ عزوجل (حدیث: ۷۵۱۵)

کچھ دیگر مقامات پر اس کی جزئیات بھی بیان ہوئی ہیں:

(الف) کتاب مناقب الانصار، باب حدیث الاسراء (حدیث: ۳۸۸۶)

(ب) کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ (حدیث: ۳۳۹۶ تا ۳۳۹۴)

(ج) کتاب التفسیر، باب اسرئیل بعدہ لیل من المسجد الحرام (حدیث: ۴۷۱۰ تا ۴۷۰۹)

(د) تفسیر سورة النجم (حدیث: ۳۸۵۸ تا ۳۸۵۵)

(ر) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ۲۰

.....صحیح بخاری میں معراج شریف کی تفصیلات اُس روایت سے لی گئی ہیں جو حضرت انس بن مالکؓ، مالک بن صعصعہؓ سے بیان کرتے ہیں۔

.....آپؐ حطیم میں استراحت فرما رہے تھے کہ ایک آنے والا (فرشتہ) آپؐ کے پاس آیا اور آپؐ کا سینہ مبارک چاک کیا۔ دل باہر نکالا اور سونے کی طشت میں لائے ہوئے ایمان اور حکمت سے دل کو دھویا گیا اور پھر سفید جانور (براق) لایا گیا۔ وہ تیز رفتار جانور تھا۔ آپؐ کو اس پر سوار کروایا گیا اور جبرائیلؑ ساتھ چلے یہاں تک کہ پہلے آسمان پر پہنچے۔ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے خوش آمدید کہا۔

.....پھر دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات ہوئی انہوں نے بھی خوش آمدید کہا۔

.....تیسرے آسمان پر حضرت یوسفؑ سے ملاقات ہوئی۔

.....چوتھے آسمان پر حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی۔

.....پانچویں آسمان پر حضرت ہارونؑ تشریف فرما تھے۔ انہوں نے بھی پیغمبرِ آخر الزماں کو خوش آمدید کہا۔

.....چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰؑ سے ملاقات ہوئی۔

.....ساتویں آسمان پر حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی۔

.....آپؐ کو پھر سدرۃ المنتہیٰ کی طرف اٹھایا گیا۔ یہ ایک درخت ہے جس کا پھل (بیر) عنجر شہر کے منکوں جیسا تھا اور پتے ہاتھی کے کانوں کی طرح تھے۔

.....وہاں آپؐ نے چار نہروں کا مشاہدہ کیا۔ دو نہریں جنت کے اندر اور دو جنت سے باہر تھیں۔ آپؐ

سے جبرائیلؑ نے فرمایا۔ ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں جبکہ باطنی نہریں جنت کی نہریں ہیں۔

.....پھر آپؐ کے لیے المعمور بلند کیا گیا۔ پھر تین برتن لائے گئے۔ ایک میں شراب دوسرے میں

دودھ اور تیسرے میں شہد تھا۔ آپ نے دودھ منتخب کیا۔ حضرت جبریلؑ نے فرمایا: ”یہ وہ فطرت ہے جس پر آپ اور آپ کی امت ہے۔“

..... پھر آپ کو پانچ نمازوں کا تحفہ بارگاہ رب کائنات کی جانب سے ملا۔

وقت کے مذہبی تصور کو شعراء نے واقعہ معراج کے تصور میں دیکھا لیکن زیادہ تر شعراء کے ہاں یہ روایت سے جڑا ہوا اندازِ نظر ہی سامنے آیا البتہ اقبالؒ اس میں ایک استثناء کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم خوند میری اپنے مضمون ”زمانہ..... اقبال کے شاعرانہ عرفان کے آئینے میں“ میں لکھتے ہیں:

”اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے ایک حرکت پذیر کائنات میں انسانی

موقف کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ کائنات اگر تغیر پذیر ہے تو پھر انسانی

تقدیر کو بھی تغیر پذیر ہونا چاہیے۔ انسانی تاریخ کی کوئی بھی منزل آخری اور

قطععی نہیں ہو سکتی دوسرے الفاظ میں انسان تبدیلی کے قابل ہے..... تاریخ

کی سطح پر ارادہ اور زمانہ یا وقت قریبی تعلق رکھتے ہیں۔“ ۲۱

اقبال کے ہاں واقعہ معراج سے انسانی عظمت اور تحریک کا فلسفہ سامنے آتا ہے۔ وہ واقعہ معراج

کے تناظر میں وقت کی ماہیت پر بحث کرتے ہیں اور وقت کو کائنات میں انسان کے آگے بڑھنے اور

کائنات کے شکست و ریخت کے تناظر میں ایک آلے کے طور پر دیکھتے ہیں:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے

کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبال کے ہاں نعت نگاری سے ہٹ کر بھی مختلف مقامات پر وقت کے فلسفیانہ تصور کو سمجھنے کی

کوشش کی گئی ہے۔ ساقی نامہ کے یہ اشعار دیکھیے:

ترپتا ہے ہر ذرہ کائنات

کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود

فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

دلوں کے الٹ پھیر کا نام ہے ۲۲

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات

ٹھہرتا نہیں کارونِ وجود

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے

اقبال کے ہاں بھی زمان و مکان کا تصور اضافی اور غیر مستقل اور اعتباری ہونے کا ہے۔ اقبال

نے اس تصور کو قرآن سے ہی حاصل کیا ہے قرآن نے زمان (Time) کو اعتباری یعنی اضافی قرار دیا

ہے۔ اس کی دو مثالیں سامنے کی ہیں:

..... محشر میں ہزاروں، لاکھوں برس پہلے مرے ہوئے لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے جب پوچھا جائے گا کہ تم کو دنیا سے گئے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تو وہ اُس کو مدت ایک آدھ دن ہی بتائیں گے۔

..... زمان کے اعتباری (اضافی) ہونے کا ایک اور ثبوت یہ بھی قرآن سے ملتا ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا کہ خدا کا ایک دن تمہارے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔

اقبال کے تصورِ وقت کے اہم نکات یہ ہیں:

(الف) زمان (Time) ایک تخلیقی قوت ہے۔

(ب) زمان (Time) ایک ارتقائی قوت ہے۔

(ج) زمان (Time) پر قابو پا کر ہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔

(د) زمان کی دو شکلیں ہیں پہلی شکل زمانِ حقیقی ہے جو لمحوں کا مرکب ہے اور اس میں تسلسل بھی نہیں ہے جبکہ دوسری شکل زمانِ مسلسل ہے جو مختلف اکائیوں (لمحات) کا مرکب ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں زمانِ حقیقی کا بیان جگہ جگہ ہوا ہے:

خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زناری

نہ ہے زمان نہ مکان لا الہ الا اللہ

اقبال نے زمانِ حقیقی کو تقدیر کے متبادل سمجھا ہے۔ قرآن حکیم نے بھی اس وقت کو وحدت اور

کلیت قرار دے کر تقدیر ہی کہا ہے۔ وقت کی اس زمانی حقیقت کو معراج کے تناظر میں مختلف نعت گو شعراء نے لفظوں کی شکل دی ہے۔ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی رقمطراز ہیں:

”اقبال جیسا ہمہ جہتی اور کثیرالابعادی شاعر ہماری زبان میں کوئی اور نہیں۔

اس سے اقبال کے ناقدوں کی مشکلات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اقبال پر

تنقید کا حق وہی ادا کر سکتے ہیں جو ایک طرف شعر کے ہنر اور فن کے نکات

آشنا ہوں دوسری طرف وہ قرآن و حدیث اور اسلامی علوم پر نظر رکھتے ہوں

اور اس کے ساتھ فکر مغرب اور عصری مسائل کے منظر اور پس منظر کی تاب لا

سکتے ہوں۔“ ۲۳

اقبال کے ہاں زندگی کا حرکی تصور ملتا ہے جو اسلام کے انقلابی اور حرکی مزاج سے ہی اخذ کیا

گیا ہے۔ اُن کے ہاں وقت کا تصور زمانی و مکانی بھی ہے اور ماورائے زمان و مکان بھی وہ وقت کو

کائناتی تفہیم کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اصغر گوٹوی فرماتے ہیں:

عالم ناسوت میں اور عالم لاہوت میں
کوندتی ہے ہر طرف برقی جمالِ مصطفیٰ

عالم لاہوت سے مراد وقت کی وہی زمانی حقیقت ہے جہاں وقت ٹھہر جاتا ہے یا وقت (Time) کی قیمت صفر ہو جاتی ہے۔ شبِ معراج نبی اکرمؐ کا آسمانوں پر جانا اور جنت و جہنم کا مشاہدہ وقت کے مختصر وقفے میں ہونا وقت کی اسی مطلق قیمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

میں نے اس عرضداشت میں یہی کوشش کی ہے کہ ان اشعار کا انتخاب کروں جس میں واقعہ معراج میں وقت کی زمانِ حقیقی (Absolute Time) کی طرف شعراء نے اشارہ کیا ہو اور ایسے اشعار کو جن میں روایتی اندازِ فکر شامل ہو انہیں منتخب نہ کیا جائے کہ میرے موضوع کا تقاضا وقت کی ماورائی جہات کے عمل کو سمجھنا اور سمجھانا ہے۔

مولانا ظفر علی خان تحریک پاکستان کے مجاہد اور بے باک صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے عاشقِ رسول بھی تھے۔ اُن کی محبت سے لکھی گئی نعتوں نے برصغیر پاک و ہند میں بہت شہرت حاصل کی۔ فرماتے ہیں:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآن کے سپاروں میں

ایمان کی روشنی میں قرآن سے رہنمائی حاصل کر کے نعت کہنے والے اس مجاہد نے واقعہ معراج کو کس انداز میں دیکھا:

چلتے ہیں جبریل کے پر جس مقام پر
اُس کی حقیقتوں کے شناسا تہی تو ہو

وہ مقام جہاں سے آگے جانا مقرب فرشتہ جبرائیلؑ کے لیے بھی ممکن نہ تھا نبی اکرمؐ اُس سے آگے کی کیفیات کے بھی شاہد ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات بھی فرمائی۔

امام احمد رضا خان شبِ معراج کے حوالے سے رسول اللہ کی شان بیان کرتے ہوئے لاشعوری سطح پر وقت کی مختلف عددی قیمت کے لحاظ سے عرش اور فرش کے درمیان تقابل بھی فرما گئے۔ بنیادی طور پر اس تقابل کا مقصد معراج کے واقعہ سے رسول اللہ کی شان کا بیان ہے تاہم بادی النظر میں وقت کی زمانی حقیقت کی جانب بھی اشارہ کر گئے۔ فرماتے ہیں:

فرش والے تری شوکت کا علو کیا جانیں

خسروا! عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

قرآن پاک میں سورۃ النجم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى. فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى. فَأَوْحَى إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى. مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى. أَفَتُمَرُونَهُ عَلَى مَا يَرَى. وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَى. عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى. عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَى. إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَى. مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى. لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى ۲۴

”پھر وہ قریب ہوا اور اتر آیا، پس وہ دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا۔ پس اُس نے اپنے بندے یا اُس کی طرف وحی کی جو وحی کی، دل نے اسے جھوٹ نہیں کہا جو پیغمبر نے دیکھا، کیا تم جھگڑا کرتے ہو اُس پر جو وہ دیکھتا ہے اور اُس نے ایک مرتبہ اور اترتے ہوئے دیکھا تھا، سدرۃ المنتہی کے پاس، اُس کے پاس جنت المادیٰ ہے جبکہ سدرہ کو چھپائے لیتی تھی وہ چیز جو چھارہی تھی، نہ تو نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی، یقیناً اُس نے اپنے رب کی بعض بڑی نشانیاں دیکھیں۔“

قرآن کریم کی آیات میں سرور کائنات کے معراج کے دوران اللہ تعالیٰ سے قربت کا بیان ہوا ہے۔ قَابِ قَوْسَيْنِ سے معروف ان آیات کی تشریح و تفسیر دو مختلف انداز میں کی جاتی رہی ہے۔ علماء کی ایک جماعت قَابِ قَوْسَيْنِ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دیتی ہے جبکہ ایک اور گروہ کا خیال اس سے مختلف ہے۔ ان کی رائے ہے کہ قَابِ قَوْسَيْنِ (دو کمانوں کا فاصلہ) سے مراد حضرت محمد اور جبرائیلؑ کی ذات ہے۔ اُس کی دلیل میں وہ کہتے ہیں کہ وحی کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات حضرت محمد سے دو کمانوں کے فاصلے پر نہیں آئی۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن وحی کی جگہ کلام کا لفظ استعمال کرتا۔ انہی آیات کے حوالے سے ہمارے شعراء کرام نے بھی نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ مرزا دبیر کی ایک رباعی اسی موضوع سے متعلق ہے:

معراج نبی میں جائے تشکیک نہیں
قوسین کے قرب سے یہ صادق ہے دبیر

ہے نور کا تڑکا شب تاریک نہیں
اتنا کوئی اللہ کے نزدیک نہیں

(مرزا دبیر)

مرثیہ کے مشہور شاعر میر انیس کے ہاں بھی قاب قوسین کی آیات کے حوالے سے اظہار خیال ملتا ہے۔ نعتیہ بند دیکھیے:

معراج سے اُس کو جو ملا رتبہ اعلیٰ یہ رتبہ کسی اور پیمبر نے نہ پایا
اللہ سے جو قرب محمد تھا کہوں کیا قوسین کا ہے فرق جہاں رتبہ اولاً
جبریل امیں کو بھی نہ واں دخل کی جا ہے یا احمد مختار ہے یا ذات خدا ہے
(میر انیس)

دونوں نعتیہ اظہار میں دبیر اور انیس کے ہاں قاب قوسین کے حوالے سے اللہ سے ملاقات اور معراج کے حوالے سے شان رسول کا بیان ہے۔ دونوں مذکورہ اشعار میں وقت کی ماہیت کو سمجھنے یا کم از کم فکری سطح پر واقعہ معراج کو سمجھنے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ روایت سے جڑے ہوئے ان نعتیہ اشعار میں واقعہ معراج کو معنوی سطح پر سمجھنے کا عمل نظر نہیں آتا۔ شان رسول کے بیان اور لفظوں کی عمدہ دروبست کے باعث انہیں عمدہ نعتیہ اشعار قرار دیا جاسکتا ہے تاہم یہ آفاقی یا عظیم شاعری نہیں کہ فکر نے روایت سے علیحدہ اپنا کوئی معنوی نظام ترتیب نہیں دیا۔ اس کے مقابلے میں تجل حسین اختر کا اسی موضوع پر یہ خوبصورت شعر دیکھیں:

گھلا طلسم زمان و مکاں شبِ معراج ہزار صدیوں کی گردش سے ایک رات بنی
(تجل حسین اختر)

اسی موضوع پر سید نصرت زیدی کا زندہ رہنے والا شعر ملاحظہ کریں:

آئینہ حیراں کی طرح وقت کی رفتار اے صاحبِ معراج خردمہر بہ لب ہے
(سید نصرت زیدی)

مذکورہ بالا دونوں اشعار میں وقت کی رفتار کے حوالے سے فکری سطح پر ایک حیرانی کا اظہار کیا گیا ہے۔ شان رسول کے بیان میں اللہ کی قدرت سے وقت کی رفتار کا کم ہونا شاعر کا اس محیر العقول واقعے پر حیرانی کا اظہار بھی دراصل اس واقعے کی روحانی سطح سے نیچے آکر منطقی استدلال کے ساتھ سمجھنا ان دونوں اشعار کی بنیاد ہے۔

غور کیا جائے تو اوپر دیے گئے اشعار سے شعراء کی فکری اُچ کے ساتھ ساتھ فنی گرفت بھی نمایاں نظر آتی ہے۔ دونوں اشعار میں لفظوں کا خاص دروبست معنوی سطح پر ایک نئے منظر نامے کا راستہ کھول رہا ہے۔

وقت کا تصور انسانی اذہان میں پائیداری اور استقلال کے حوالے سے رہا ہے لیکن بعض شعرائے کرام نے اس کی اضافیت (Relativity) کو فکری سطح پر ادبی حوالوں سے جانچنے کی بھی کوشش کی ہے۔ نعت کا یہ خوبصورت شعر وقت کی اسی جہت کی تصویر کاری کر رہا ہے۔

میں روشنی کے ساتھ حرم کے سفر پہ تھا
ان کی کشش میں وقت سے آگے نکل گیا ۲۵

سرشار صدیقی نے ادبی اظہار کو اپنے فن کا حصہ بنانے کے ساتھ ساتھ وقت کی اس ماورائی کیفیت کو نظم کرنے کی بھی کوشش کی جو لمحوں میں صدیوں کے رنگ سمیٹ دیا کرتی ہے۔ اس ماورائی کیفیت کا تعلق سائنس اور منطق کے بجائے روحانیت اور انسانی نفسیات کے ساتھ ہے۔ وقت کا روحانی تصور منطق سے جدا ایک نئے فکری منطقے کی تشکیل کرتا ہے جہاں عقیدت راستوں کی رہنما بن جاتی ہے لیکن یہ کیفیات ہر ایک کے نصیب میں کہاں ہوتی ہیں۔ دوسرے مقام پر وقت کی رفتار کو جذبہ شوق سے یوں مہمیز دیتے ہیں۔

یوں سفر ہو تو پھر اسباب سفر کیا معنی؟

ابھی سوچا ہی تھا میں نے کہ مدینہ آیا ۲۶

وقت کی رفتار کا یہ حوالہ تو انفرادی تھا لہذا اس کیفیت میں انفرادی رنگ نمایاں ہے لیکن جب حوالہ حضرت محمد کی معراج سے متعلق ہو تو اُن کا قلم بھی بلندی پر نظر آتا ہے
بس ایک لمحہ شب میں یہ راز ہو گیا فاش
کہ وقت کیا ہے، مکاں کیا ہے، لامکاں کیا ہے ۲۷

وقت کی تفہیم کا یہ مرحلہ جس میں مکاں سے لامکاں تک کا فاصلہ لمحہ موجود سے ناموجود کے درمیان فاصلے کی طرح چشم زدن میں طے ہو جائے۔ سرشار صاحب کا خاصہ ہے۔ بیان میں ندرت اور اظہار میں سلیقے نے اُن کے اشعار کو ادبی سطح پر اعلیٰ تخلیقات کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ وقت اور کائنات کے حوالے سے یہ نعتیہ شعر دیکھیں:

دھڑک رہا ہے دل کائنات کی صورت

وہ راز کن جو ابھی وقت کے ضمیر میں ہے ۲۸

صہبا اختر کی ایک نعتیہ نظم ”نور کی پرچھائیاں“ نعت میں وقت کی رفتار اور ان ماورائی کیفیات کو سمجھنے کی کوشش ہے جن پر واقعہ معراج کی بنیاد ہے۔

نور کی پرچھائیاں

ایک دشت بیکراں سے آسماں
 اور دشت بیکراں میں صورتِ ماہ و نجوم و کہکشاں
 جار ہے ہیں رات کے یہ بادِ پا گھوڑے کہاں
 ان کے سر پر کیوں تنے ہیں بجلیوں کے سائباں
 کیسے گھوڑے ہیں کہ جن کو پر لگے ہیں بے گماں
 اور یہ گھوڑے پرندے ہیں اگر تو اے سمائے بیکراں
 کن خلائی شاخساروں میں ہیں ان کے آشیاں
 اک ستارے نے کہا یہ ناگہاں
 جو براق سید الافلاک تھا
 سب اسی کا عکسِ ضو ہیں
 سب اسی کے نور کی پرچھائیاں ۲۹

نظم کی غنائیت اور لفظوں کا دروبست شاعر کی قادر الکلامی کی گواہ ہے لیکن نظم کی اصل خوبصورتی فطرت کا مضبوط حوالہ ہے۔ وقت کے حوالے سے حضرت محمد مصطفیٰ کی معراج کی رات آسمانی سواری براق کی رفتار کے حوالے سے کائناتی مظاہر کو شانِ مصطفیٰ کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش صہبا کی اس نظم کی بنیاد ہے۔

اک ستارے نے کہا یہ ناگہاں
 جو براق سید الافلاک تھا
 سب اسی کا عکسِ ضو ہیں

نعتیہ نظم میں براق کی رفتار کو نور کا عکس قرار دے کر فطرت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش ہے۔ شعراء کے ہاں فکری سطح پر موضوع پر گرفت تو موجود ہوتی ہے تاہم جب وہ اپنی فکر کو شعر کی صورت میں ڈھالتے ہیں تو لفظوں کا چناؤ درست نہ ہونے کے باعث شعر اپنا پورا تاثر نہیں دے پاتا بلکہ بعض صورتوں میں تو وہ باقاعدہ خراب تاثر پیش کرتا ہے۔ نعت میں یہ صورت حال اور زیادہ تکلیف دہ بن جاتی ہے کہ ہمارے لفظوں نے آقائے نامدار حضرت محمد کی تعریف و توصیف بیان کرنی ہوتی ہے اور کوئی ایک غلط لفظ یا غلط ترکیب شعر میں منفی تغیرات پیدا کر دیتے ہیں۔

شاید حسن کا ایک نعتیہ شعر اسی موضوع سے متعلق ہے تاہم صرف ایک لفظ نے شعر کے ساختیاتی تاثر کو جتنا نقصان پہنچایا شاید اس کا اندازہ خود شاعرہ کو بھی نہ تھا۔ شعر دیکھیے :

لکھ سکا کون سر عرش ملاقات کا حال

شب معراج خدا اپنے ہی دلبر سے ملا

لفظ ”دلبر“ اپنی تاثیر اور بناوٹ دونوں کے لحاظ سے عوامی بلکہ عامیانہ صورت اختیار کر چکا ہے۔ کسی حد تک اس لفظ میں تیسرے درجے کی فلمی یا عوامی شاعری کے سارے منفی رنگ جھانکتے نظر آتے ہیں۔ شاید دوسرے لوگ اس خیال سے اتفاق نہ کریں تاہم بعض اوقات صرف ایک لفظ یا بعض صورتوں میں صرف ایک اضافت بھی شعر کے ظاہری حسن کو برباد کر دیتی ہے اور نعت کے معاملے میں تو شاعر یا شاعرہ کو اور بھی زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح محمود الحسن صاحب کا ایک شعر ہے :

ان کی تو جبریل کو بھی کچھ خبر نہیں

پہنچے جہاں جہاں ہیں نشانے حضور کے

نشانے کا لفظ پورے شعر کے توازن میں ایک بڑے بگاڑ کا پیش خیمہ بن گیا اور سچ پوچھیں تو لفظ ”نشانے“ معنوی سطح پر بھی شعر میں ایک بڑے سقم کی جانب اشارہ کر رہا ہے اس لفظ سے جنگ و جدل کا تاثر ابھرتا ہے جو اسلام کے بنیادی نظریے کے خلاف ہے۔ دوسرے پہلو سے غور کریں تو حضرت محمد اللہ کے حکم سے معراج پر تشریف لے گئے اور آپ نے اللہ کے حکم سے آسمانوں کی سیر کی تو ایسی صورت میں آقا کے نشانوں کا ذکر تعریف نبی کے ذیل میں نہیں آتا ہے۔

آپ حضرات نے شعروں کے ظاہری حسن کے حوالے سے لفظوں کا منفی استعمال تو دیکھا اب مختلف شعراء کے ہاں نعتیہ اشعار میں لفظوں کا مثبت بلکہ استعاراتی و علامتی انداز بھی دیکھیں۔ سید عارف کے، معراج نبی کے موضوع پر شعر میں لفظ کے ہشت پہلو ہو کر علامتی انداز اختیار کرنے کی کیفیت سے لطف اندوز ہوں۔

میں اس کی وسعتوں کو لفظ پہناؤں تو کیا، جس کا

زمین پر اک قدم ہے دوسرا افلاک سے آگے

(سید عارف)

”وسعتوں“ نے پورے شعر کو ایک خاص طرح کی فکری وسعت دے دی۔ نبی اکرم کا معراج پر جانا اور وقت کے ایک قلیل حصے میں آسمانوں کی سیر سے واپس آنا اسی ”وسعت“ کی جانب اشارہ

کرتا ہے جس میں وقت اور اس سے متعلق مظاہر بھی شامل ہیں۔ زمین پر وقت کے پیمانے آسمانی پیمانوں سے مختلف ہیں۔ وقت کے گزرنے کی رفتار دونوں جگہوں پر مختلف ہے جس کا ثبوت قرآن حکیم ہے اور حضرت محمد اللہ کے حکم سے وقت کے دو مختلف منطقوں سے گزرے۔ یقیناً یہ اللہ کے نبی کی شان ہے کہ آپ کے لیے رب تعالیٰ نے وقت کو زمین پر ساکت کر دیا۔ شاید طاہر شیرازی نے اسی لمحے کو لفظوں میں مقید کرنے کی کوشش کی ہے:

اذن معراج مل گیا ہے اُسے وقت رک رک کے دیکھتا ہے اُسے

(طاہر شیرازی)

”وقت رک رک کے دیکھتا ہے اُسے“ سے محاورہ بندی (زبان و بیان) کی خوبصورتی تو سامنے آتی ہی ہے ساتھ ہی وقت کے ساکت ہونے کی سائنسی حقیقت کی جانب اشارہ بھی ہو جاتا ہے۔ نعت گو شعراء کے ہاں یہ خیال عام طور پر راسخ ہوتا جا رہا ہے کہ صرف اپنے زبان و بیان اور لفظوں کے زور پر وہ اچھی نعت کہہ سکتے ہیں حالانکہ اس کے لیے صرف محبت رسول ہی کافی نہیں بلکہ رسول اللہ کی سیرت، حسب و نسب اور صفات کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ رشید وارثی لکھتے ہیں:

”نعت گوئی کے لیے صرف انشاء و عروض سے واقفیت یا قادر الکلامی پر انحصار

نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے لیے حضور اکرمؐ کے فضائل شیون و صفات، اسوہ

حسنہ اور ذات اقدس سے متعلقہ دیگر علوم سے واقفیت حاصل کرنا ضروری

ہے۔“ (۳۰)

معراج نبی کے حوالے سے بھی نعت میں قادر الکلامی تو جگہ جگہ اپنے رنگ دکھاتی رہی لیکن موضوع کی فکری جہات کو سمجھنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء اس موضوع پر روایتی انداز فکر کے حامل رہے جو بہت سی جگہوں پر موضوعاتی اسقام میں بھی تبدیل ہوا۔ روایتی انداز شعر کی ایک مثال دیکھیں۔ طویل بحر میں یزدانی جالندھری کا شعر:

واپس آئے تو بستر ابھی گرم تھا اور زنجیر در میں تھی جنبش ابھی

فرش سے فرش تک، فرش سے فرش تک ہو گیا طے سفر دیکھتے دیکھتے

طویل بحر کے اس شعر میں واقعہ کا بیان ایک خبر کے انداز میں ہے۔ شاعری کا بنیادی تعلق

ذہن کی جگہ دل سے ہوتا ہے اور اچھا شعر اپنے تشبیہاتی اور استعاراتی رنگ کے باعث دل کو چھوتا

ہے۔ شاعری نثر سے مختلف چیز اسی لیے ہے کہ اس میں لفظوں کے دروبست سے ایک واقعہ دوسرے

واقعے کے قریب محسوس ہونے لگتا ہے۔ لفظوں کو علامت کے طور پر برتنے سے شعر میں آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔

وقت کی ماورائی جہت کو ایک نئے زاویے سے محسن احسان نے بھی دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وقت کے ٹھہر جانے کا احساس اُن لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے جو اپنے لبوں پر دعائیں سجائے بارگاہ رب العزت میں حاضر ہوتے ہیں اور گنبدِ خضریٰ کا واسطہ دے کر اپنی دعائیں اللہ کریم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ وقت کے اس پہلو کے بارے میں نعتیہ نظم ”زارین کے لیے ایک نظم“ کا یہ ٹکڑا ملاحظہ کریں:

آسمانوں کی طرف اُن کے یہ اٹھتے ہوئے ہاتھ
ایسے لگتا ہے زمانے کی مسلسل گردش
ایک نکتے پر تھمی ہو جیسے
وقت پر برف جمی ہو جیسے

.....

سبز گنبد کے مکیں

اُن کی تسبیح کے دانوں میں جو خوابیدیں تمنائیں ہیں

پوری کر دے ۳۱

محسن احسان کے ہاں واقعہٴ معراج نبی کو بھی بڑی محبت اور اُس واقعے کی عظمت کے حوالے سے عقیدت کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

زمین سے عرشِ معلٰی تک ایک زینہٴ نور
رواں تھے سوئے فلکِ تزک و احتشام کے ساتھ ۳۲
دوسری جگہ اسی مضمون کو دوسرے انداز میں شعری فکر کا حصہ بناتے ہیں:
چلے زمین سے تو افلاک کی حدیں چھولیں

رکے تو قرونوں کو لمحات میں شمار کیا ۳۳

محسن نے سیرت کے اس محیر العقول اور معجزاتی حصے کو علمی سطح پر دیکھنے اور سمجھنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ وہ اس کا بیان کرتے ہوئے ایک حیرتی کی طرح علمی اور منطقی سطح پر اسے پہچاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عمومی طور پر شعراء کے ہاں فکری سطح پر شعر برائے گفتن کی طرز پر اس واقعے پر

اظہار خیال ہوتا ہے۔ جو شعر کی بنت کے لحاظ سے تو درست ہے لیکن کسی بڑے خیال کو منطقی سطح پر پہچانے کی کوشش کرنا اور پھر اُس نتیجے کو شعر میں ڈھالنا بڑی نعتیہ شاعری کی بنیاد ہونی چاہیے اور محسن احسان اس میں کامیاب ٹھہرے:

کہکشاں اس کے غبارِ کفِ پا کا پرتو اُس کا جلوہ ہے جو آفاق میں تنہا پھیلا
کرۂ ارض کو ہے ناز کہ وہ ابرِ کرم اس پہ برسا جو سرِ عرشِ معلیٰ پھیلا ۳۴
ہیں آپ کی آواز کی زد میں کئی صدیاں دیکھا ہے زمانے نے جلالِ آپ کا مولا ۳۵
چمک ذروں سے لے کر کہکشاؤں تک گئی محسن
کہ ہے آفاق میں خورشیدِ نعتِ مصطفیٰ روشن ۳۶

درونِ ذات سفر کی عجیب لذتیں ہیں دلوں میں ہے وہ تجلی جو مہرِ ماہ میں ہے ۳۷

ترے سفر نے جمالِ سفر دیا ہے اسے زمیں سے تابہ فلک کہکشاں مسافت ہے ۳۸

ہے عرصۂ آفاق میں پھیلی ہوئی ہر سو اک کاہکشاں آپ کے نقشِ کفِ پا کی ۳۹

کہا یہ اُس نے کہ تسخیر کائنات کرو خدا گواہ کہ اعلان ارتقاء ہیں نبی ۴۰
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر وقت کے چھوٹے سے حصے میں تشریف بھی لے گئے اور واپس بھی آئے۔ وقت اتنا قلیل تھا کہ بستر کی گرمی باقی تھی اور دروازے کی کنڈی بھی ابھی تک متحرک تھی۔ واقعہ تو مکمل بیان ہوا لیکن شاعری کہاں گئی؟ اسی سے ملتے جلتے موضوع کو سید سلمان رضوی نے اپنے شعر میں استعمال کیا لیکن پوری شعریت موجود رہی۔

معراج جس کو کہتے ہیں وہ ہے مرے خدا اک منفرد روش ترے شائستہ گام کی
آپ نے غور کیا کہ وقت کی رفتار کو خاص حضرت محمدؐ کے لیے روکنے اور تیز رفتاری سے آسمانوں کی سیر اور رب سے ملاقات کو ”شائستہ گام کی منفرد روش“ کہہ کر کس طرح شاعری کے فن میں خوبصورتی سے ڈھالا گیا۔ اردو نعت سے منسلک شعرائے کرام کے ہاں معراجِ مصطفیٰ کو منطقی سطح پر سمجھنے کا عمل خال خال نظر آتا ہے۔ سید ابوالخیر کشفی کی ایک نظم ”قصیدہ بردہ شریف کا ایک نقش“ کا

ایک حصہ ”فی ذکر معراج النبی“ ملاحظہ کریں:

وہی ذاتِ مبارک آیتِ معراجِ انساں ہے

حرم سے بیتِ اقدس تک

محمد مصطفیٰ معراجِ آدم کے امیں بن کر

بلندی کے نشاں بن کر

افق پر جگمگاتے ہیں

یہ تارے، کہکشاں، نجمِ سحر، خورشیدِ خاور، آج تک ہدم

اسی معراج کی افسانہ خوانی کرتے جاتے ہیں

فضائے بے کراں میں ذرہٴ خاکی

اسی معراج کے نقش کہن کو ڈھونڈنے نکلا

گروہِ مسلمیں! آگے بڑھو، تاروں کو اب چھولو

زمیں کی پستیوں کو آسماں کر دو

سید ابوالخیر کشفی کی نعتیہ نظم کے اس ٹکڑے میں معراجِ نبی کو ذرہٴ خاکی کے منطقی سطح پر سمجھنے کے عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے علم اور تجسس کے جو راستے کھولے ہیں، معراجِ نبی کو سمجھنے کا یہ عمل بھی اسی کا حصہ ہے۔ مصرعے:

فضائے بے کراں میں ذرہٴ خاکی

اسی معراج کے نقش کہن کو ڈھونڈنے نکلا

انسان کی کائناتی توازن کو سمجھنے کی جدوجہد کا بیان کرتی ہیں۔ خلاء اور کائنات میں پھیلی ہوئی ارب ہا کہکشاؤں کے درمیان موجود سیارہٴ زمین کا انسان اللہ کی بنائی ہوئی اس عظیم کائنات کا حصہ بھی ہے اور اس کے راز ہائے سر بستہ کو تلاش کرنے کی خواہش کا اسیر بھی۔ فلسفہ، سائنس یا عمرانی علوم سبھی راستے اسی منبعِ علوم کی جانب لے کر جاتے ہیں اور معراجِ نبی اُس کائنات میں موجود اللہ کے اسرار کو سمجھنے کا ایک راستہ ہے۔ سید کشفی نے بھی:

گروہِ مسلمیں! آگے بڑھو، تاروں کو اب چھولو

زمیں کی پستیوں کو آسماں کر دو

کہہ کر مسلمانوں کو منطقی علوم حاصل کر کے اللہ کی کائنات کو مسخر کرنے کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ معراجِ نبی کی عظمت کو عظمتِ انسان اور عظمتِ مسلمان کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں۔ نعت کہنے میں شاعر کا اپنا ہنر اتنا کام نہیں کرتا جتنا توفیقِ خداوندی کام آتی ہے۔ پروفیسر محمد اکرم رضا اپنے

ایک مضمون "رنگِ نعت کی بہارِ جاوداں" میں نعت کی تعریف بیان کرتے ہیں:

"نعت کیا ہے۔ یہ پہلے قلب و جاں پر نازل ہوتی ہے پھر نوکِ قلم سے جواہر بے بہا کی صورت ٹپک کر صفحہ قرطاس کی زینت بنتی ہے۔ یہ مجبانِ رسول اللہ کے لیے حسنِ کائنات ہے، بے قرار جذبوں کی تسکین کے لیے رحمت الہی کی سوغات ہے۔" ۴۲

شاعری نثر سے مختلف ہی اسی لیے ہوتی ہے کہ اس کے اثرات ہمارے جذبات و احساسات پر پڑتے ہیں۔ یہ عقل کو اپیل کرنے سے پہلے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ واقعہ معراج کے حوالے سے بھی نعتیہ اشعار عمدہ، مناسب یا آفاقی ہوتے ہیں۔ اچھا شعر صرف ہنر اور زبان و بیان کے زور پر نہیں کہا جاسکتا۔ فکر حضرت محمد کی محبت سے معطر ہو اور سیرت کا مطالعہ روزِ مرہ کا حصہ ہو تو اچھی نعت کے لیے موضوعات بھی حاصل ہوتے ہیں اور لفظوں کا درو بست اچھی نعت میں ڈھلتا ہے۔ رشید ساقی کا ایک شعر معراجِ نبی کے موضوع سے متعلق ہے:

حاصل ہے سوا آپ کے کس کو یہ سعادت مہمانِ سرِ عرشِ علیٰ مرے آقا

آقائے نامدار کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نے آپ کو عرش پر بلوایا اور میزبانی فرمائی۔ حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو بھی مالکِ دو جہاں نے اپنا جلوہ نہیں دکھایا لیکن نبی آخر الزماں آقائے نامدار حضرت محمد کو یہ فخر حاصل ہوا۔ یقیناً یہ امت محمدیہ کے لیے بھی فخر کا مقام ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے غور و فکر کا مقام بھی ہے کہ ہمیں نبی اکرم کی امت کی حیثیت سے جہاں بانی کے فرائض انجام دینے ہیں، اُس کے لیے علم سے محبت اور تحقیق و تجسس سے دلچسپی ہماری زندگی کا حصہ ہونا چاہیے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ دسویں صدی عیسوی سے اٹھارویں تک ہم اقبال کے اس شعر کی تفسیر تھے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(اقبال)

اردو نعت میں واقعہ معراج کو شانِ رسول کے حوالے سے شعراءِ کرام نے بیان کیا لیکن اس طرف توجہ کم رہی کہ اسے اجتماعی شعور کے حوالے سے عظمتِ انسان کے تناظر میں دیکھا اور سمجھا جائے میری رائے میں واقعہ معراج میں وقت کی رفتار کا رک جانا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں کے سفر پر مقرب فرشتہ حضرت جبرائیلؑ کے ہمراہ جانا اور جنتِ جہنم کا مشاہدہ کرنا اور اپنے رب سے

ملاقات کرنا (اس بات پر بھی امت میں اتفاق نہیں ہے) کو مندرجہ ذیل موضوعات کے حوالے سے دیکھا جانا ضروری تھا:

☆ رب العالمین کی قدرت کا بیان

☆ شانِ رسول کا واقعہ معراج کے تناظر میں بیان

☆ عظمتِ انسان کا واقعہ معراج کے تناظر میں بیان

☆ اجتماعی شعور کی معنوی تفہیم (واقعہ معراج کے تناظر میں)

☆ قرآنی آیات (قاب قوسین) کے حوالے سے نبی اکرم کی اللہ سے محبت کا بیان

☆ وقت کی تغیر پذیر کیفیات کا واقعہ معراج کے حوالے سے بیان

ان میں سے زیادہ تر موضوعات پر شعراء کرام نے طبع آزمائی کی تاہم عظمتِ انسان اور وقت کی تغیر پذیر کیفیات کو واقعہ معراج کے تناظر میں بیان کرنے کی سنجیدہ کوششیں کم کم ہوئی ہیں اور اس کی بڑی وجہ نعت گو شعراء کا روایتی اندازِ فکر کا حامل ہونا ہے۔ ابوالخیر کشفی نے اپنے سفرنامہ حج میں وقت کے حوالے سے ایک اہم بات کہی۔ حیران کن طور پر وہ وقت کی اُسی مطلق قیمت کو ذاتی حوالے سے سمجھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

”طواف کے سات دائرے مکمل ہوئے..... طواف کے سات چکر۔ جیسے

تخلیق کے سات مراحل ہیں۔ دن تو سات ہی ہیں۔ یہ طواف وقت کو اپنی

گرفت میں لے لیتا ہے۔“ ۳۳

اردو میں نعت عام طور پر غزل کی ہیئت میں لکھی جاتی ہے اور نعت خوانی کی محافل کے باعث یہ طریقہ مقبول بھی ہے۔ اس کی بڑی وجہ قافیہ اور ردیف کی خوبصورت بُنت ہے جو نعت کے سامع کے لیے خوشگوار تاثر پیدا کرتی ہے اور اس کی طرز سازی بھی نسبتاً آسان ہوتی ہے۔ اردو غزل کی طرح اردو نعت میں بھی قافیہ اور ردیف کے تغیر پذیر انداز سے اچانک پن کی کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے جو سامع کے ذہن کو ایک مختلف تاثر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نعت میں نظم کی نسبت غزل کا فارمیٹ زیادہ مقبول ہے جبکہ اگر کسی موضوع پر فلسفیانہ انداز سے کسی رائے کا اظہار کرنا ہو تو نظم کی ہیئت میں غزل کی نسبت زیادہ گنجائش موجود ہوتی ہے لیکن اردو میں نعت نگار حضرات نظم کی طرف کم کم آتے ہیں اور جو آئے بھی ہیں وہ ذاتی حوالوں سے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ نعتیہ ادب کی تخلیقی و تنقیدی اہمیت کے حوالے سے ڈاکٹر عزیز احسن لکھتے ہیں:

”نعتیہ ادب میں تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی کام کے لیے جس آگاہی کی ضرورت ہے وہ صرف چند نکات پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں بے کنار ہیں..... شاعری کرتے ہوئے اسے پرکھتے ہوئے اور اُس پر تحقیق کرتے ہوئے انتہائی معروضیت (Objectivity) کا مظاہرہ کرنا لازمی ہے۔“ ۲۳

آغاز سے نعت، روایتی شعراء کے ہاں انفرادی حوالوں سے محبت رسول کا بیان رہی اور مذہبی فلسفے کے حوالے سے بڑے سوالات کی جانب ہمارا شعر گو آنے سے ہچکچاہٹ محسوس کرتا رہا۔ فلسفہ مذاہب کے تناظر میں وقت کی ماورائی جہات کے حوالے سے پیدا ہونے والے سوالات کی طرف ہمارا نعت گو کیوں نہیں آسکا؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں مسلم اجتماعی شعور میں جھانکنا پڑے گا۔ عمومی طور پر ہمارے غزل گو اور خصوصی طور پر نعت گو شعراء کے ہاں نظم کی طرف نہ آنے کی وجوہات کچھ یوں ہو سکتی ہیں:

(الف) روایتی فکر سے جڑت کے باعث ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں کسی نئے منطقے کی دریافت کرنے کے قابل نہیں رہیں۔

(ب) غزل کی ہیئت میں نعت کو محافل میں حاصل ہونے والی پسندیدگی کے باعث شعراء انفرادی حوالوں سے محبت رسول کا بیان کرنے میں آسانی محسوس کرتے رہے۔

(ج) اردو نعت کو ادبی صنف بننے اور غزل کے فلسفیانہ انداز فکر رکھنے والے شعراء کا نعت کی طرف آنے میں مشکلات حائل رہیں۔

(د) روایت سے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی طرف اردو غزل تو منتقل ہوئی لیکن اردو نعت کا یہ سفر ابھی آغاز میں ہی ہے

(ر) اردو غزل اور اردو نعت کے روایتی شعراء کے ہاں حضرت محمدؐ کی تعریف کے ساتھ ساتھ شہرت کے عناصر بھی ساتھ ساتھ موجود رہے۔

(ہ) اردو نعت میں جدید ادبی انداز تحریر اور نئے نظریات کے استعمال کا فقدان رہا۔

ان تمام نکات کو سامنے رکھیں تو اردو نعت میں روایتی فکر کی ڈومینیشن (Domination) سامنے آتی ہے اور اس کی بڑی وجہ تو وہی ہے کہ ہمارا شاعر اور سامع دونوں مطالعے کے عادی نہیں ہیں۔ علم اب حجر نہیں رہا یہ مرکب صورت میں اذہان پر اثر انداز ہوتا ہے اور پیچیدگی و ابہام پیدا کرتا ہے لہذا

اس علم کے حصول کے لیے اپنے ذہن کو مرکب صورت میں چیزوں کو دیکھنے کا عادی بنانا ہوگا۔ وقت کی مذہبی تفہیم کے سلسلے میں مجھے ن۔م۔راشد کی ایک نظم یاد آتی ہے:

زمانہ خدا ہے

زمانہ خدا ہے

اسے تم برا مت کہو

مگر تم نہیں دیکھتے، زمانہ فقط ریسمان خیال

سبک مایہ، نازک، طویل

جدائی کی ارزاں سبیل

وہ صبحیں جو لاکھوں برس پیشتر تھیں

وہ شامیں جو لاکھوں برس بعد ہوں گی

انہیں تم نہیں دیکھتے، دیکھ سکتے نہیں

کہ موجود ہیں، اب بھی موجود ہیں وہ کہیں

مگر یہ نگاہوں کے آگے جو رسی تنی ہے

یہ رسی نہ ہو تو کہاں ہم میں تم میں

ہو پیدا یہ راہ وصال ۴۵

وقت کی تفہیم پر مشتمل اس نظم میں وقت ایک خاص حد فاصل رکھتا ہے یعنی ایک زمانہ دوسرے

زمانے میں پوست مختلف عوامل کو ایک دوسرے سے جدا رکھتا ہے۔ نعت میں وقت کی ایسی تفہیم کی کوئی

کوشش میری نظر سے نہیں گزری۔ یقیناً ایسی نعتیہ نظمیں لکھی جا رہی ہوں گی جن میں وقت کی بنت کو

کسی خاص زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہو۔ ستیہ صاحب کی ایک نظم کی چند لائنیں دیکھیں اس

میں جاوداں زندگی کی جانب قدم بڑھانے کا عمل بنیادی طور پر وقت سے ماوراء ایک نئے جہان کی

جانب پیش رفت کا اشارہ ہے۔

دھیان میں گم رہوں تو شاید میں

دیکھ پاؤں حضور کا جلوہ

چہرہ پاک کی ضیاء پاشی

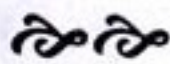
کالی کملی سے نور چھننا ہوا

درمیاں میں رہوں تو سن پاؤں
آپ سے میں پیام حق کے راز
جاوداں زندگی کی تعبیریں
لفظ وحدت کے معنی و تفسیر

نعت میں فکری سطح پر ذات اور کائنات کے حوالے سے بڑے فلسفے کے مضامین پر مشتمل شاعری کا دور اس وقت شروع ہوگا جب قرآن اور سیرت کا تفصیلی اور گہرا مطالعہ نعت گو شعراء کریں گے اور سامع کی ذہنی تربیت اس حوالے سے کی جائے گی۔ جیسے جیسے ہمارا سامع، قاری اور ناظر ادبی تربیت یافتہ ہوگا ہماری شاعری میں بھی گہرائی اور وسعت آئے گی۔ روایتی شاعری اردو نعت میں بہت عمدہ ہو رہی ہے اور محافل کی زینت بن رہی ہے تاہم آفاقی اور عظیم شاعری (نعت) کے سامنے آنے کا وقت اب آرہا ہے کہ چودہ سو سالوں میں ہم مسلمان ایک پختہ اور مکمل تہذیب کے حامل ہو چکے ہیں اور وہ جو ایلیٹ نے کہا تھا:

”کلاسیک (آفاقی اور عظیم فن پارہ) اُس وقت وجود میں آتا ہے جب کوئی تہذیب کامل یا پختہ ہو چکی ہوتی ہے۔“ ۲۶

اسی تہذیبی تکمیل کے عمل میں ہمارے ہاں اب نعت فلسفے اور سائنس کے بڑے مباحث کو شامل کرنے کی حالت میں آچکی ہے۔ اقبال، عبدالعزیز خالد، عارف عبدالمبین کے بعد اب اس حوالے سے کچھ نئے شعراء کو سامنے آنا چاہیے کہ محبت کا تقاضا صرف محبوب خدا کی روایتی تعریف ہی نہیں بلکہ نعت کے تناظر میں علم کو آگے لے کر چلنا بھی وقت کی ضرورت ہے اور یہی سرکارِ دو عالم کی حقیقی تعریف بھی ہوگی۔ آقا کی دعا ”رب زدنی علما“ ترجمہ: ”اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما“، کا اصل مفہوم بھی یہی ہے۔



حوالہ جات

- ۱۔ شیخین ہانگ، وقت کا سفر، مشعل لاہور ۱۹۹۸ء
- ۲۔ شیخین ہانگ، وقت کا سفر، مشعل لاہور ۱۹۹۸ء، ص ۱۸۵
- ۳۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا
- ۴۔ لیکچر ”روشنی کا سفر“، طارق جمیل، مولانا، پی ٹی وی ۲۳/ جون ۲۰۱۵

- ۵۔ سٹیفن ہانگ، وقت کا سفر، مشعل لاہور ۱۹۹۸ء
- ۶۔ اردو فکشن میں وقت کا تصور، ص ۵
- ۷۔ تجلیات قرآن، بسطین شاہجہانی، ص ۳
- ۸۔ سورۃ الرحمن: ۵
- ۹۔ پروفیسر احمد رفیق اختر
- ۱۰۔ ڈاکٹر وزیر آغا بحوالہ اردو فکشن میں وقت کا تصور
- ۱۱۔ کاشف عرفان، چوٹی دشا، (غیر مطبوعہ نظم)
- ۱۲۔ سورۃ العصر: ۱-۲
- ۱۳۔ القرآن
- ۱۴۔ حدیث قدسی
- ۱۵۔ حدیث قدسی
- ۱۶۔ سورۃ الیونس: ۳
- ۱۷۔ سورۃ الکہف: ۲۵
- ۱۸۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۱
- ۱۹۔ واقعہ معراج اور اس کے مشاہدات (ایک تحقیقی جائزہ)، دارالسلام، اسلام آباد
- ۲۰۔ بحوالہ واقعہ معراج اور اس کے مشاہدات
- ۲۱۔ آدمی اور کتاب، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، زین پبلی کیشنز کراچی، ص ۷۷
- ۲۲۔ سورۃ النجم، آیت ۸-۱۸
- ۲۳۔ میثاق، سرشار صدیقی، حرافاؤنڈیشن کراچی، مئی ۲۰۰۲ء، ص ۳۰
- ۲۴۔ ایضاً، ص ۱۱۲
- ۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۹
- ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۰۵
- ۲۷۔ اقراء، صہبا اختر، مکتبہ ندیم کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۵۸
- ۲۸۔ اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۴۶
- ۲۹۔ اجمل واکمل، محسن احسان، القلم اسلام آباد، اپریل ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۸، ۱۰۹
- ۳۰۔ ایضاً، ص ۵۱
- ۳۱۔ ایضاً، ص ۴۲
- ۳۲۔ ایضاً، ص ۳۳
- ۳۳۔ ایضاً، ص ۵۵
- ۳۴۔ ایضاً، ص ۶۵
- ۳۵۔ ایضاً، ص ۶۶
- ۳۶۔ ایضاً، ص ۹۴
- ۳۷۔ ایضاً، ص ۹۳
- ۳۸۔ ایضاً، ص ۱۰۰
- ۳۹۔ نسبت، ابوالخیر کشفی، سید، القلم نعت کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۷۶، ۷۵
- ۴۰۔ رنگ نعت (مؤلفہ) پروفیسر محمد فیروز شاہ، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص ۲۳
- ۴۱۔ وطن سے وطن تک، ابوالخیر کشفی، مجلس مطبوعات و تحقیقات کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸
- ۴۲۔ نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے، عزیز احسن، ڈاکٹر، نعت ریسرچ سنٹر، کراچی، ستمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲
- ۴۳۔ ن-م-راشد (نظم)
- ۴۴۔ اشارات تنقید، سید عبداللہ، ڈاکٹر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ص ۱۱۹

ڈاکٹر نسیم الدین فریس۔ بھارت

دکنی مثنویوں میں نعت

ABSTRACT:

Naatia poetry was usually written by rulers of Golkunda and Dakkin and poets exposed to religiosity were highly appreciated by them. This is why most of the poets wrote Mathnavis (a poem of set of numerous couplets carrying similar sounded words in the end of every two lines of a couplet). Poets started writing Mathnavis with the couplets of Naat in the beginning according to vogue. This article introduces Naatia poetry written in the form of Mathnavi from said to be the first Mathnavi Kadam Rao Padam Rao written in between 1421 to 1435 A.D., to Mathnavi Rizwan Shah wa Rooh Afza written by Faaiz in 1094 Hijrah. This shows the spirit of love to the Prophet Muhammad (S.A.W) in expressions of poets from beginning of Urdu language.

نعت اردو شاعری کی سب سے قدیم صنف سخن ہے۔ دنیا کی اکثر بڑی زبانوں کی طرح اردو میں بھی تخلیق ادب کا آغاز شاعری سے ہوا۔ شاعری میں بھی مذہبی اور صوفیانہ شاعری پہلے وجود میں آئی۔ ادبی اور عشقیہ شاعری کی ابتداء بعد میں ہوئی۔ دکنی میں صوفیانہ شاعری کے نمونے گیتوں کی شکل میں ملتے ہیں، مثلاً حضرت گیسودراز سے منسوب چکی نامہ، پہلیے اور حقیقت گیت وغیرہ۔ ان گیتوں میں حمدیہ اور نعتیہ مضامین بھی آئے ہیں۔ چوں کہ یہ گیت اردو شاعری کے قدیم ترین نمونے ہیں، اس لیے حمد و نعت اردو کی قدیم ترین اصناف ہیں۔ دکنی شعرا نے فارسی سے متعدد اصناف مستعار لیں، جیسے مثنوی، غزل، قصیدہ اور رباعی وغیرہ۔ ان میں مثنوی کی صنف کو دکنی میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اردو شاعری کا دکنی دور ایک طرح سے مثنوی کا دور تھا۔ اس دور میں فقہی، صوفیانہ، عشقیہ، رزمیہ، اخلاقی، تاریخی اور سوانحی غرض ہر طرح کی بکثرت مثنویاں لکھی گئیں۔ فارسی شعراء کی روش کے مطابق دکنی شعرا نے بھی مثنوی کے آغاز میں حمد و مناجات اور نعت و منقبت لکھنے کا اہتمام کیا۔ اس طرح حمد و

نعت کی شمولیت مثنوی کا لازمہ بن گئی۔ اس کے نتیجے میں دکنی مثنویوں میں نعتیہ شاعری کی ایک طویل درخشاں روایت وجود میں آئی۔

دکنی زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز بہمنی دور میں ہوا۔ اس دور میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز دکنی کے اولین سخنور کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ آپ سے منسوب چکی نامہ اور حقیقت گیت قدیم مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ نظامی اشرف اور قریشی بہمنی عہد کے اہم مثنوی نگار شاعر ہیں۔ ذیل میں ان کی مثنویات میں نعتیہ شاعری کے عناصر کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ بہمنی دور کے شاعر فخر الدین نظامی کی مثنوی ”کدم راو پدم راو“ اردو کی پہلی مثنوی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق نظامی نے یہ مثنوی بہمنی خاندان کے مشہور فرمان روا احمد شاہ ولی بہمنی کے عہد حکومت ۸۲۵/۱۴۲۱ء تا ۸۳۹/۱۴۳۵ء میں لکھی۔ گویا یہ مثنوی آج سے کوئی چھ صدی قبل کی تصنیف ہے۔ اسی اعتبار سے اس کی زبان بھی چھ سو سال پرانی ہے۔ نظامی نے مثنوی کا آغاز حمد سے کیا ہے۔ حمد کے بعد نعت رسول اللہ ہے جو بائیس ابیات پر مشتمل ہے۔ نظامی کی زبان نہایت کشن اور مغلط ہے۔ اس میں سنسکرت تت سم اور تدبھو الفاظ کی کثرت ہے۔ اس کی لغات لہجے اور اسلوب پر ہندوی اثر غالب ہے۔ نظامی نے عربی اور فارسی کے الفاظ خال خال ہی استعمال کیے ہیں۔ نعتیہ اشعار میں بھی وہ رسول مقبول کی توصیف و ستائش میں عربی یا فارسی کے القاب استعمال نہیں کرتا بلکہ سنسکرت القاب استعمال کرتا ہے جیسے وہ سرور عالم کے لیے۔

راو کساتیں (بمعنی آقا) یا راوت (بمعنی شہنشاہ) کہتا ہے۔

تہیں ایک سا چا گستا میں امر (تو ہی ایک سچا اور لافانی آقا ہے)

محمد بڑا راوت جگ تھا (محمد دنیا کے بڑے شہنشاہ تھے)

نظامی کہتا ہے کہ آقائے نامدار علیہ السلام دنیا کے سر کا انمول تاج ہیں اور آپ خالق کی بے

سہارا مخلوق کے کام بناتے ہیں:

امولک مکٹ سیس سنسار کا کرے کام نزدھار کرتا رکا

محمد عالم کی بنیاد اور نور ہیں دونوں عالم میں آپ کے نور کا فیض ہے

محمد جرم آد بنیاد نور دوئی جگ سرے دسے پر ساد نور

معجزہ شق القمر کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ نبی علیہ السلام کی مخالفت میں دشمنوں نے کج

بجشی کی تو آپ علیہ السلام نے ہاتھ کی انگلی سے چاند کو پھاڑ کر دو کر دیا:

نبی میر میں دندکیتا بنار انگل ہت کرچند کیتا دو پھاڑ
آگے وہ کہتا ہے کہ خدا نے سنوارا تو ذات مصطفیٰ سنور گئی۔ خدا نے صفا کے ساتھ مصطفیٰ کو
سنوار ہے:

خدا سنور یا مصطفیٰ سنور یا خدا با صفا مصطفیٰ سنور یا ۱

زبان کی قدامت و غرابت کے سبب نظامی کے اشعار کا سمجھنا کارے دارد ہے۔ لیکن تاریخ
ادب میں اس کے نعتیہ اشعار کی اہمیت یہ ہے کہ یہ اردو کی پہلی ادبی تصنیف اور پہلی مثنوی کے نعتیہ
اشعار ہیں۔

اسی دور کے ایک اور قدیم شاعر شاہ میراں جی شمس العشاق (م۔ ۹۰۲) ہیں جو دو واسطوں سے
حضرت گیسو درازؒ کے خلیفہ تھے۔ میراں جی نے چھوٹی بڑی متعدد مثنویاں لکھیں، مثلاً معرفت کے
مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ ان کی مثنویوں میں شہادت التحقیق سب سے اہم ہے، جس میں ۱۱۸
اشعار ہیں۔ ۲۔ میراں جی کی زبان نظامی کی بہ نسبت صاف ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمد سے ہوتی ہے۔
اس کے بعد نعت ہے۔ نعت میں وہ بارگاہ رب العزت میں عرض پرداز ہیں ”محمد تیرے نبی ہیں۔ اُن
پر میرا ایمان ہے۔ اُن کے بغیر تیری تجلی نہیں۔ وہ سارے عالم کے تاج ہیں۔ جو ان کی طرف آئیں
انہیں تیرا دیدار نصیب ہوگا۔ جو انہیں بھول کر بھٹکتا پھرے تو اسے دوزخ میں رکھے گا۔“

محمد	نبی	تیرا	اس	پر	ایمان	میرا
نادرس	دیں	اس	باج	سب	عالم	کیرا
جو	اس	کے	رخ	آوے	سو	تیرا
اس	بھول	جو	کوئی	تھا	نے	دوزخ
					مانہہ	راکھے

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ نئی خود مختار سلطنتیں قائم ہوئیں یعنی نظام شاہی،
عادل شاہی، عماد شاہی اور قطب شاہی۔ نظام شاہی سلطنت کا بانی ملک احمد بحری، لقب نظام الملک
(۹۸۵ء تا ۱۰۱۴ء) تھا۔ سید شاہ محمد اشرف بیابانی اسی کے دور کے شاعر تھے۔ جنہوں نے ۹۰۹ میں
واقعات کر بلا پر ”نوسر ہار“ کے نام سے دکنی زبان میں ایک مثنوی لکھی۔

شاہ اشرف بیابانی (۸۶۴ تا ۹۳۵) کے والد شاہ ضیاء الدین رفاعی بیابانی قندھار شریف کے
مشہور صوفی سید علی ساکنڑے سلطان مشکل آسان کے بہنوئی اور خلیفہ تھے۔ اشرف کو اپنے والد سے
بیعت و خلافت حاصل تھی۔ ۴۔ اشرف نے سلطان محمد شاہ بہمنی کا زمانہ (۸۶۷ تا ۸۸۷) دیکھا، جب

کہ سلطنت بہمنیہ عروج پر تھی۔ اشرف کے تین شاہ تصانیف لازم المبتدی، واحد باری اور نوسر ہار یادگار ہیں جو سب کی سب منظوم ہیں۔ ان میں ”نوسر ہار“ اہم ہے۔ اس میں واقعات کربلا اور شہادت حضرت امام حسینؑ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔ حمد کے بعد سرور کونین کی مدح و توصیف کا باب ہے جو اکیس اشعار پر محتوی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دین محمد نیک پناہ

دو ہنوجک کیرا سرور شاہ

(شاہ یعنی آقائے نامدادونوں عالم کے سردار ہیں اور آپ کا دین سب سے اچھی پناہ ہے)

روز محشر کا شفیع

سارے عالم کا نبی

(دکنی شاعری کے رواج کے مطابق اشرف نے نبی کا صوتی قافیہ شفیع باندھا ہے۔ وہ کہتا ہے

آپ سارے عالم کے لیے نبی بن کر آئے ہیں اور قیامت کے دین شفاعت فرمائیں گے)

عالم سراجیاآت رہس

جس کے چاؤ اٹھارہ سہس

(خدا نے آپ کی محبت میں اٹھارہ ہزار عالم کی تخلیق بڑے ذوق سے کی)

امت کیرا وہ دستگیر

سگلے نبیوں کیرا میر

(آپ سارے نبیوں کے سردار اور امت کی دستگیری فرمانے والے ہیں)

چوں کہ یہ مثنوی واقعات کربلا سے متعلق ہے۔ اس لیے اشرف نے اگلے اشعار میں خلفائے

راشدین کے ذکر کے بعد حضرت حسینؑ کی منقبت بیان کی ہے۔ چیدہ چیدہ اشعار دیکھ لکھیے

حسنؑ حسینؑ جس کا ناؤں

دوئی نواسے ان بل جاؤں

بی بی فاطمہؑ کے دلبد

علیؑ کے اے دوئی فرزند

مانگ دوئی جیورالے ۵

بیری ان کوں یوں دکھ دے

دکن کی برید شاہی سلطنت کا بانی قاسم برید تھا۔ اس نے اپنا پایہ تخت بیدر قرار دیا جو بہمنی

سلطنت کا بھی پایہ تخت تھا۔ بہمنی خاندان کے ساتویں حکمران امیر برید ثانی کے عہد حکومت (۱۰۱۰ھ تا

۱۰۱۸ھ) میں بیدر کے ایک شاعر پیار محمد بن عیسیٰ خاں قریشی نے جنسیات کے موضوع پر ایک مثنوی

لکھی جس کا نام بھوگ بل ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس کا سنہ تصنیف درج ذیل شعر کی بنیاد پر

۱۰۲۳ھ میں بتایا ہے۔ ۱۔

کیا میں مرتب سو خوش حال سب

ہزار (اوپر) نیویس تھے سال جب

قریشی کو فیروز بیدری (مصنف مثنوی پر ت نامہ) سے بیعت حاصل تھی۔ ”بھوگ بل“ میں

اس نے کوک شاستر کا دکنی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔ اس مثنوی کا موضوع بھوگ بلاس اور ناکہ
بھید ہے، لیکن مثنوی کی شروعات حسب دستور حمد و نعت سے کی گئی ہے۔ نعتیہ اشعار میں وہ کہتا ہے۔
حق تعالیٰ نے نبیؐ پر سلام اور درود کے اعلیٰ ترین تحفے نثار کیے۔ دن رات نبیؐ پر ہزاروں سلام
بھیجے۔ بے شک خدا ہی نبیؐ کے مقام ہیں۔ نبیؐ حق کے پیارے ہیں۔ خدا نے آپؐ پر تمام
عنایتیں کیں۔

سلام ہوا دروداں کے تحفے اپار محمد نبیؐ پر کیا حق نثار
سدا گال نس دن ہزاراں سلام خدا تھے ہیں بے شک نبیؐ کے مقام
ہمارے نبیؐ کو خدا نے جس طرح نوازا ہے، دیگر انبیاءؑ پر ایسی نظر عنایت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے
آنحضرتؐ کے لیے فرمایا: ”اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں کوئی چیز خلق نہ کرتا۔“
ہمارے نبیؐ کوں خدا جوں دیا نہ بعضے نبیؐ کوں نظر یوں کیا
کھیارب محمد کیرے حق میں یوں نہ ہوتا جے توں کچھ نپاتا نہ ہوں
آگے معراج کا ذکر کرتے ہوئے قریشی کہتا ہے کہ اس رات آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ
کی تجلیات کا مشاہدہ فرمایا۔ ایک پل میں سات آسمانوں کا سفر کیا، جہاں ملائک نے آپؐ کی خدمت
کی۔ آپؐ کو ایسا قرب حق حاصل ہوا کہ حق تعالیٰ نے آپؐ سے بات کی۔ ایک رات میں سارے
انعامات عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰؑ نے کوہ طور پر چڑھ کر خدا سے کلام کیا تھا۔ ہمارے نبیؐ سات
آسمان کی بلندی پر گئے۔

اے جس پر آئی سو معراج رین نبیؐ دیکھا ہے ربیؐ کوں سو عین
چڑیا سات آکاس یک تل منے ملائک کیے خدمات سب جنے
تقرب سوں کیتا خدا سات بات دیا سب عنایت خدا ایک رات
کیا بات موسیٰؑ نے چڑ کوہ طور محمد چڑیا سات آکاس دور

شیخ حسن شوقی دکنی زبان کا ایک استاد سخنور تھا۔ اس کا ابتدائی زمانہ احمد نگر میں گزرا جہاں وہ
حسین نظام شاہ (۹۶۱ھ تا ۹۷۲ھ) کے دربار سے وابستہ رہا۔ احمد نگر پر مغلوں کے قبضے کے بعد وہ
سلطان شاہ (۱۰۳۸ تا ۱۰۶۷) کے عہد میں احمد نگر سے بیجاپور آیا۔ بعض قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ
گوکنڈہ بھی آیا تھا۔ حسن شوقی بیجاپور کے مشہور صوفی سید شاہ حبیب اللہ کا مرید تھا۔ حسن شوقی نے دو
مثنویاں لکھیں۔ (i) فتح نامہ نظام شاہ۔ (ii) میزوانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ۔

فتح نامہ نظام شاہ ۹۷۶ھ کی تصنیف ہے۔ یہ مثنوی جنگ تالی کوٹ (۹۷۲ھ) کی منظوم تاریخ ہے۔ اس جنگ میں ابراہیم قطب شاہ علی عادل شاہ اول، حسین نظام شاہ اور برید شاہ نے ایک کر کے وجیانگر کے راجہ رام کو شکست دی تھی۔ مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے جو مختصر ہے۔ اس کے بعد نعت کے صرف دو شعر ہیں۔ خدا کے عطایہ و غایات اور بذل و نوال کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

محمد نبی کوں دیا سروری ختم ہوئی جن پر سو پیغمبری

سوقرباں دو جگ اس نول لال پر درود اس کے اصحاب ہوا آل پر

حسن شوقی کی دوسری مثنوی میزبانی نامہ سلطان محمد عادل شاہ کے عقد کی دھوم دھام اور شان و شوکت کے بیان میں ہے۔ اس میں نعتیہ اشعار نہیں ہیں۔ پہلے شعر کے مصرع اول میں حمد ہے۔ دوسرے مصرع سے بادشاہ کی تعریف کا آغاز ہوتا ہے۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد ۸۹۷ھ/۱۴۹۰ء میں بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۵ء تک یعنی تقریباً دو سو سال تک عادل شاہی خاندان کے نو حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے مملکت بیجاپور فرمانروائی کی۔ عادل شاہی سلاطین علوم و فنون اور شعر و ادب کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان کی سرپرستی اور سایہ عطوفت میں دکنی شاعری کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ سر زمین بیجاپور سے متعدد شاعر اٹھے جنہوں نے دکنی زبان میں بلند پایہ مثنویاں لکھیں اور اپنی مثنویوں میں حمد و نعت و منقبت کی روایت کا تسلسل برقرار رکھا۔ ذیل کی سطور میں دبستان بیجاپور کے اہم شعراء کی مثنویوں میں نعت گوئی کے مختلف رنگوں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

دبستان بیجاپور کی مخصوص ادبی روایت کے اولین اہم شاعر شاہ برہان الدین جانم (م: ۹۹۰) ہیں۔ یہ بیجاپور کے مشہور صوفی بزرگ حضرت میراں جی شمس العشاق کے فرزند تھے۔ جانم نے مریدوں اور طالبوں کی ہدایت کے لیے دکنی زبان میں کئی مثنویاں لکھیں جیسے وصیت الہادی، بشارت الذکر، منفعت الایمان، سکھ سہیلا، ارشاد نامہ، حجت البقاء اور فرمان ازدیوان وغیرہ۔ ”ارشاد نامہ“ جانم کی سب سے اہم مثنوی ہے۔ اس میں مرید اور مرشد کے سوال و جواب کے پیرایے میں تصوف و طریقت کے مسائل سمجھائے گئے ہیں۔ مثنوی کی شروعات رب کی حمد و ثنا سے کی گئی ہیں۔ بعد ازاں نعت رسول خدا ہے۔ جو [۳۲] اشعار پر مشتمل ہے۔ چند شعر دیکھئے:

اب میں سنوروں کروں بکھان نازل ہوا جس فرقان

(اب میں اس کی تعریف کرتا ہوں جس پر قرآن نازل ہوا)

روز قیامت اس کا چھاؤں

احمد محمد جس کا ناؤں

(جس کا نام مبارک احمد اور محمد ہے اور قیامت کے دن جس کا سایہ رہے گا)

آگے جانم کہتے ہیں کہ نور حق پردہ تجرید تھا۔ اس نے سب سے پہلے نور محمدی کی تخلیق کی۔

جب تھا دیکھو وہ تجرید

سب نے اول تجہ آفرید

آنحضرت کے معجزات کا ذکر کرتے ہوئے جانم کہتے ہیں بادل آپ پر سایہ فلن رہتا تاکہ آپ

کا سایہ زمین پر نہ پڑے۔ آپ نے دست اقدس کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دکھایا

نا اس چھاؤں بھیں پڑے

ابر سایہ سدا کرے

چاند دیکھا یا کردو پھاڑ

دست مبارک اپنا کاڑ

رسول اللہ کے فضائل و شمائل کا تذکرہ کرتے ہوئے آخر میں جانم کہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کی

ذات بڑی محبوب ہے۔ سب آپ کے امتی ہیں۔ امت آپ کا دامن تھا مے ہوئے ہے۔ آپ میری

دستگیری فرمائیے۔ میرا حال بہت برا ہے۔ میں اپنا چہرہ آپ کے سامنے نہیں لاسکتا۔

امت جس کا سارا ہے

ایسا جگ میں پیارا ہے

توں منجہ ہویں رے دستگیر

امت تیرا دامن گیر

تجہ سمور کیوں ہوئے کپال

نا تو اس سخت میرا حال

دبستان بیجاپور کے اولین شعراء میں عبدل کا بھی نام آتا ہے۔ وہ بیجاپور کے چھٹے عادل شاہی

حکمران ابراہیم عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا۔ اس نے ۱۰۲۰ھ/۱۶۱۱ء میں ابراہیم نامہ

کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی جو دبستان بیجاپور ادبی نقش ہے۔ اس میں اس نے اپنے مربی سلطان

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی سیرت و شخصیت اس کے خیل و حشم، شہر بیجاپور قلعے، شہہ پناہ اور شاہی محل کے

حسن و شکوہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ مثنوی کے آغاز میں عبدل نے حمد، نعت، مدح یا ران رسول اللہ کے

بعد حضرت گیسو دراز کی منقبت بھی لکھی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ کی مدح ہے۔ ہر موضوع کے لیے اس

نے علاحدہ باب مختص کیا ہے۔ نعت کے باب میں اس نے چودہ شعر لکھے ہیں۔ نعت کے آغاز میں وہ

کہتا ہے ”ابتدا میں صرف ذات حق ایک ہی تھی اور کچھ موجود نہیں تھا۔ حق تعالیٰ نے نور محمدی سے

لاکھوں عالم پیدا کیے۔“

نپایا محمد سوں لک جگ وجود

گسائیں ایکٹ تھا نہ ہو رکچھ موجود

آگے وہ کہتا ہے کہ جو گنج مخفی یا پوشیدہ خزانہ تھا اسے ظاہر کیا۔ اس کے لیے عشق کے آئینے میں

میم کی متصل سے گھسا گیا۔ جس کی وجہ سے احد اور ہو گیا اور میم نے احد کو احمد کیا۔ احمد کے چار حروف نے چار بھید یا اسرار دیئے جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ہیں۔ چاروں کے رموز نبی پر عیاں کر دیئے۔

جو تھا گنج مخفی سو پر گٹ دکھائے
عشق آرسی میم مصقل پھرائے
احد دور کر میم احمد کیا
حرف چار مل بھید چارودیا
شریعت، طریقت، حقیقت بیاں
کیا معرفت عین اس پر عیاں

آخر میں عبدل یہ اعتراف کرتا ہے کہ سرکار دو عالم کے محامد کی توصیف کا حق ادا ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر کوئی سات درباروں کی روشنائی جا کر لکھنے والی انگلیوں کو دے تب بھی آپ کی صفات کے دفتر کا ایک ورق بھی نہیں بھر سکتا۔ اگر جسم کا ہر بال ہزار زبان بن جائے تب بھی عبدل آپ کی ایک صفت بھی بیان نہیں کر سکتا۔

نہ تجھ دفتر ورق کو بھرائے
کوئی سا تو دریے جو انگلیاں کولائے
اگر جیسے ہر بال ہویں ہزار
نہ عبدل صفت کر سکے یک بچار

مقبلی عادل شاہی عہد کا ایک سنخور ہے۔ اس نے ۱۰۳۵ تا ۱۰۵۰ھ کے درمیان ”چندر بدن و مہیار“ کے نام سے ایک مثنوی لکھی، جو دبستان بیجاپور کی پہلی عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں مقبلی نے ایک ہندو دو شیزہ چندر بدن اور ایک مسلمان سوداگر بچے مہیار کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔ مثنوی کے افتتاحی ابواب حمد، مناجات، نعت اور منقبت چہار یار کبار کے لیے مختص ہیں۔ جناب رسول اللہ کی مدح میں مقبلی کہتا ہے کہ اللہ کے رسول دونوں عالم میں خدا کے خلیفہ ہیں۔ آپ کی محبت سے دین قبولیت پاتا ہے۔ بتول (بی بی فاطمہ زہرا) کے امین دو عالم کے سلطان ہیں۔ آپ کو ازل سے بقا حاصل ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک جتنی چیزیں پیدا ہیں وہ سب محمد کی نعت کی شیدا ہیں۔

دو جگ کا خلیفہ خدا کا رسول
ہوا دین جس کی بقا پر قبول
دو جگ کا ہے سلطان امین بتول
ہوا ہے بقا جس ازل نے وصول
سماتا ارض میں جو پیدا اچھے
زنعت محمد میں شیدا اچھے

آگے وہ کہتا ہے کہ آپ کی بدولت دین ازل سے لے کر ابد تک مضبوطی سے قائم ہے اور آپ کے لائے ہوئے دین نے دیگر ادیان کو کالعدم و منسوخ کر دیا۔

قوی دین قائم ابدتا ازل
ہوئے دین منسوخ اسی دین تل

آخر میں وہ اپنی عاجزی و بے چارگی کا اظہار کرتا ہے:

ترا نعت کہنے سکت کس اے سچ کر جو تیرا ثنا کوئی کہے ۱۱

سلطان محمد عادل شاہ کے دور کا ایک اہم شاعر شیخ محمد شریف عاجز ہے۔ محمد شریف عاجز احمد گجراتی (مصنف یوسف زلیخا۔ لیلیٰ مجنون) کا بیٹا تھا۔ احمد گجراتی گجرات سے آکر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا، جبکہ اس کی اولاد بیجاپور منتقل ہو گئی۔ محمد شریف عاجز نے اپنے باپ کی طرح انہیں موضوعات پر دو مثنویاں یوسف زلیخا (۱۰۴۴ھ/۱۲۶۴ء) اور لیلیٰ مجنون (۱۲۰۶ھ/۱۶۳۶ء) تصنیف کیں۔ مثنوی لیلیٰ مجنون میں حمد کے بعد ”در نعت احمد محمد مصطفیٰ“ کے زیر عنوان بارہ اور ”در صفت معراج محمد مصطفیٰ“ کے تحت [۱۹] اشعار ہیں۔ نعت میں اس نے نبی اکرم کی شان لولاک اور قول اتامن نوری کے حوالے سے خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ اس کے بعد چار یار اور حضرت حسینؑ کا ذکر کیا ہے۔ ”در صفت معراج میں عاجز“ شب معراج کے حسن، جبریلؑ کی آمد، سدرۃ المنتہیٰ تک حضرت جبریلؑ کی ہم رکابی، وہاں سے سرور کونین کا تنہا آگے جانا۔ رب سے ہم کلامی اور آسمان دنیا سے زمین کو واپسی کا ذکر کیا ہے۔ سدرہ پر حضرت جبریلؑ رک جاتے ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوچھتے ہیں کہ اے انخی کیوں رک گئے؟ جبریلؑ کہتے ہیں میری حد بس یہیں تک ہے۔

پوچھے شہ، انخی کی کھڑے ہوا ہے
آگے کے اشعار دیکھئے:

ہوا حق تین فرمان اگیں رکھ قدم
یو حضرت کے برکت ہوا ہے کرم
(یعنی خدا کا فرمان ہوا کہ اے نبی آگے آئیے)

نبی لامکان سوں مشرف ہوئے
سلام ہوا درود حق نے آپیں لے
(نبی لامکان کی سیر سے مشرف ہوئے اور حق تعالیٰ نے خود آپ پر درود و سلام بھیجا)
آگے وہ ایک لطیف نکتہ بیان کرتا ہے:

کرن سور کی بھی چلی سور میں
ندی جوں دریا سوں ملی پور میں ۱۲
(یعنی سورج کی کرن سورج میں چلی گئی یا ندی بھر پور دریا سے مل گئی)

سید حسن شاہ محی الدین صنعتی دبستان بیجاپور کا ایک ممتاز سخنور گزرا ہے۔ اس نے سلطان محمد عادل شاہ اور علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۸ تا ۱۰۸۳ھ) کا زمانہ دیکھا۔ ۱۰۰۰ء میں اس نے قصبہ بے نظیر کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں حضرت تمیم انصاریؑ کے محیر العقول واقعات قلمبند کئے۔ اس

مثنوی میں اس نے حمد کے بعد نعت کا التزام رکھا ہے۔ مثنوی قصہ بے نظیر کے نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔ صنعتی نے سنسکرت کے الفاظ سے گریز کیا ہے۔ اس لیے ان اشعار کا سمجھنا آسان ہے:

نبی کریم ”شفیع“ امین
رسول خدا رحمت العالمین
کہ جس سرپو لولاک کا تاج ہے
سو اس کو عرش آپی محتاج ہے
شا جس کی بولیا ہے سلطان نے
سو طہ و یسین قرآن میں
احد میں تجے ناؤں احمد دیا
بجز میم بھی فرق کچھ نہیں کیا
تراناؤں اپس ناؤں نے ہم قریں
کیا، ہو رہی ہزار آفریں

حکایت ہے کہ بادشاہ سکندر قاصد کے بھیس میں ملکہ نوشابہ کے دربار میں گیا، لیکن نوشابہ نہایت ذہین تھی، سکندر کے اطوار سے اس نے پہچان لیا کہ وہ سکندر کا قاصد نہیں، بلکہ خود سکندر ہے۔ اس تلمیح کو خاطر نشین رکھتے ہوئے صنعتی کے ان نعتیہ اشعار کا مطالعہ کیجیے:

ازل نے جو کوئی تھے کو نہ نگاہ
نہ سمجھے تجے دیک اے بادشاہ
جو کوئی تھے جو نوشابہ تیز ہوش
پہچانت کے جم جام سوں بادہ نوش
کہے دل سوں تجہ دیک اے شہریار
سکندر رسالت کا آیا بہار

قصہ بے نظیر کی تصنیف کے بائیس سال بعد ۱۰۷۷ھ میں صنعتی نے اپنی دوسری مثنوی ”گلدستہ“ تصنیف کی۔ مثنوی کی ترکیب و ترتیب کے مطابق اس نے اس مثنوی میں حمد نعت اور منقبت کے ابواب رکھے ہیں۔ حمد کے آخری اشعار میں صنعتی نے وسیلے کا ذکر کرتے ہوئے نعت کا جواز پیدا کیا ہے۔ اس طرح وہ نہایت ہنرمندی کے ساتھ حمد سے گریز کر کے نعت کی طرف آتا ہے۔

کہ عاجز ہوں مخلوق تجہ دار کا
دھریا ہوں سو امید دیدار کا
وسیلہ ترے دوست کا کرسدا
کیا ناؤں پر اس کے تن من فدا
شفاعت کی تسکین لوک دھر کے اس
اتا نعت چل بولتا بے ہراس

ان اشعار کے بعد نعت کے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ صنعتی کے نعتیہ اشعار میں قصیدے کا ساز و بیان، شکوہ اور کرد و فر نظر آتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زہے خاص احمد نبی الوراء
کہ ہے برگزیدہ توں لولاک کا
کہ او شافع خلق ہر دوسرا
انس لامکاں کے دھنی پاک کا
جو تر جگ ترا امر طالع ہوا
تظلم کفر دین لامع ہوا

اپنی پہلی مثنوی ”قصہ بے نظیر“ میں صنعتی نے آنحضرتؐ کی نعت کے تسلسل ہی میں واقعہ معراج کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ معراج کے بیان میں علاحدہ باب نہیں رکھا، لیکن مثنوی ”گلدستہ“ میں اس نے ”صفت معراج“ کے بیان میں علاحدہ باب قائم کیا ہے۔ معراج کے بیان کے لیے وہ نعت کے آخری اشعار میں صفت معراج کی تمہید اس طرح قائم کرتا ہے جیسے بات میں بات نکل آئی ہو۔

توں ڈر حشر کا دور کر دل ستی
بچن بول معراج کا صنعتی

اس گریز کے بعد وہ معراج کے باب کا آغاز کرتا ہے۔

سلطان محمد عادل شاہ کے دور کا ایک اہم شاعر ملک خوشنود تھا، جس نے ۱۰۵۶ء میں امیر خسرو کی فارسی مثنوی بہشت بہشت کا جنت سنگار کے نام سے دکنی میں منظوم ترجمہ کیا۔ مثنوی جنت سنگار میں ملک خوشنود نے مثنوی کی عام ہیئت کے مطابق حمد باری کے بعد ”در نعت حضرت رسالت پناہ“ اور ”در صفت معراج می گوید“ کے عنوانات قائم کیے ہیں۔ بعد ازیں خلفائے راشدین اور سیدنا علیؑ کی منقبت کا باب بھی ہے۔ نعت کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

کہا ہوں حمد اول میں خدا کا
محمد مصطفیٰ محبوب رب کا
نبی کے نور کا نقطہ ہے سنسار
بیان معراج کے کچھ شعر دیکھئے:

دنیا ہوا دین کا دیوا نچھل توں
کیا سب عرش روشن ہوا چندرتوں
(تو دنیا اور دین کا چمکتا ہوا چراغ ہے۔ تو نے عرش اور چاند سب کو روشن کیا)

ایں عاشق ہوئی تھی دیک دیدار
پرت ابرن کری سب چھوڑ سنسار
(تیرا دیدار کر کے رات عاشق ہو گئی اور ساری دنیا کو چھوڑ کر محبت کا سنگھار کرنے لگی)

زلف عنبر کہوں یا مشک کالا
ستارے گوندتے ہیں پھول مالا
(آپ کی زلفوں کو عنبر کہوں یا مشک سیاہ۔ ستارے آپ کے لیے پھول کے ہار گوندھتے ہیں)

عجب سورج چندر دوسیں کے پھول
قطب ٹیلا دیے جوں حور مقبول
(یہ سورج اور چاند تیرے سر کے دو عجب پھول ہیں اور قطب شاہ تارہ جو تیری مانگ کا ٹیلا ہے کسی حور کی طرح حسین ہے)

مکٹ سوں کہکشاں چل آسنوارے
ثریا کے سہاتے گوشوارے

(کہکشاں خود آ کے آپ کو تاج پہنا کر سنواری تھی ہے۔ ثریا کے گوشوارے

بڑے خوشنما لگتے ہیں) ۱۵

عادل شاہی دربار سے وابستہ ایک اور سنخور کمال خان رستمی نے سلطان محمد عادل شاہ (۱۶۲۷ء تا ۱۶۵۷ء) کی ملکہ خدیجہ سلطان شہربانو کی فرمائش پر ابن حسان کی مثنوی ”خاورنامہ“ کا فارسی سے دکنی میں ترجمہ کیا۔ خاورنامہ ایک طویل رزمیہ مثنوی ہے، جو بائیس ہزار اکٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔ ۱۶ اس میں حضرت علیؑ کی معرکہ آرائیوں کے محیر العقول واقعات بیان کیے گئے ہیں، جو سراسر فرضی ہیں۔ مثنوی کے افتتاحی ابواب روایتاً حمد و مناجات اور نعت کے لئے مختص ہیں۔ نعت کے سلسلے میں رستمی نے ”ذکر معراج“ اور ”صفت مدینہ“ کے ابواب بھی لکھے ہیں۔ ظاہر ہے یہ اشعار فارسی اشعار کا ترجمہ ہیں۔ نعت، ذکر معراج اور صفت مدینہ کے ابواب نہایت طویل ہیں۔ ذیل میں صفت مدینہ کے باب سے چیدہ چیدہ اشعار پیش کیے گئے۔ رستمی کی زبان نسبتاً صاف ہے۔ اس میں قدیم الفاظ کم اور عربی و فارسی کا عنصر زیادہ ہے۔ اس لیے ان کے ترجمے کی ضرورت نہیں ہے۔

دھرے شرع سرتاج شاہاں تمہیں	سزاوار یسین و طہ تمہیں
فلک ہے سو منڈپ تری قدر کا	زمین تخت ہوا فرش ہے صدر کا
ترے گھر کا پروردہ روح الایں	کیا اس اسی کام جاں آفریں
توں لولاک کے تاج کا تاجدار	تری باس تھے خوش نسیم بہار
اول آفرینش میں توں مقتدا	پس انبیاء ہے ولے پیشوا
توں موجود تھا جو کہ آدم نہ تھا	توں پیدا ہوا جو کہ عالم نہ تھا
توں پیدا تھا جو کہ کونین نہیں	سراپردہ قاب قوسین نہیں
یوسب آفرینش ہے تیرا طفیل	تو سرخیل یوسب ہیں تیرا جیل

ملا نصرتی عادل شاہی خاندان کے آٹھویں حکمران سلطان علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۸-۱۰۸۳ھ / ۱۶۵۷-۱۶۷۲ء) کے دربار کا ملک الشعراء اور ایک قادر الکلام سنخور تھا۔ اس کا شمار دکنی کے صف اول کے شعراء میں ہوتا ہے۔ نصرتی نے تین مثنویاں گلشن عشق (۱۰۶۸ھ / ۱۶۵۷ء) علی نامہ (۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء) اور تاریخ اسکندری تصنیف کیں۔ گلشن عشق اور علی نامہ میں اس نے نعتیہ شاعری کے بلند پایہ نمونے پیش کیے ہیں۔

گلشن عشق میں نصرتی کنور منوہر اور مدالیتی کی داستان عشق نظم کی ہے۔ اس مثنوی میں حمد باری

تعالیٰ کے بعد نعت سرور عالم اور صفت معراج کے ابواب بھی ہیں۔ حمد کے چند اشعار دیکھیے:

زہے نامور سید المرسلین کہ آخر وہ ہے شافع المذنبین

ادا ہوں نہ حمد احد کے بچن نہ راکیں جلگ مدح احمدیں من

(اللہ کی حمد کے کلمات اس وقت تک ادا نہیں ہوتے جب تک احمد مجتبیٰ کی

مدح میں دل نہ لگائیں)

آگے وہ کہتا ہے کہ اے نبی آپ ہی دائم حق سے گفتگو فرماتے ہیں۔ قاب قوسین آپ کا مقام

ہے:

نہیں حق سوں نت ہم زباں ہم کلام تجے قاب قوسین ادنیٰ مقام

پھر وہ کہتا ہے اے نبی آپ لامکاں کے مالک کے رازدار ہیں۔ آپ اس ذات کے حبیب

ہیں جو بے مثل و بے شبہ ہے۔

نہیں لامکاں کے دھنی کا انیس تو بے مثل و بے شبہ کا ہم جلیس

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یا رسول اللہ آپؐ نے..... معراج کی شب لامکاں میں بن آواز اور

بن حرف کے کلام حق سنا۔

بن آواز و بن حرف کے خوش بچن سنیا لامکاں میں تمہیں پا وطن ۱۸

نصرتی نے اپنی دوسری مثنوی علی نامہ میں بھی حمد و مناجات کے بعد نعت اور ذکر معراج کے

عناوین رکھے ہیں۔ چوں کہ علی نامہ ایک رزمیہ مثنوی ہے اسی مناسبت سے نصرتی نے اس کے نعتیہ

اشعار میں آنحضرتؐ کی شجاعت و دلیری، غزا اور دبدبے کی توصیف کی ہے۔

تمہیں اے شہنشاہ دنیا و دیں شجاعت کے صف کا ہے کرسی نشین

شرف کوں دلیری کے ہے سینہ صدر دیا ہت کم تیغ کوں تونج قدر

ترے کاج جس حق نے پیدا کیا غزا کا شرف توں ہوید اکیا

ترا دبدبہ سن کے خوش دھات کا زمین پر نہ تھا ریا قدم لات کا ۱۹

سید میراں میاں خاں ہاشمی بیجاپور کے آٹھویں حکمران علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ایک نابینا

لیکن پرگو اور قادر الکلام شاعر تھا۔ یہ نصرتی کا معاصر تھا۔ اس کی تصانیت میں دیوان ریختی کے علاوہ

قصائد و مراثی اور مثنویات شامل ہیں۔ ہاشمی مہدوی عقیدے کا پیرو تھا۔ اس نے اپنے مرشد سید شاہ

ہاشم کی فرمائش پر ۱۰۹۹ھ میں مثنوی ”یوسف وزلیخا“ تصنیف کی جو پانچ ہزار ایک سو اشعار پر مشتمل

دکنی مثنویوں میں نعت

ہے۔ ہاشمی ایک کہنہ مشق استاد سخن تھا۔ ”یوسف وزلیخا“ میں اس نے صنف مثنوی کے بنیادی لوازمات یعنی ربط و تسلسل کا بڑا خیال رکھا ہے۔ ابتدائی ابواب میں اس نے نہایت ہنرمندی اور فنی رچاؤ کے ساتھ حمد کے آخری شعر سے مناجات کی طرف گریز کیا ہے اور مناجات کے آخری شعر کو نعت کی گریز کا شعر بنایا ہے۔ اسی طرح نعت کا آخری شعر آنے والے باب ”صفت معراج“ کی گریز ہے۔ مناجات سے نعت کی طرف گریز کا انداز دیکھیے۔

مناجات تو ہوئی تیری قبول
وسیلہ تو دھر ہاشمی اب رسول
نصرتی کی طرح ہاشمی نے بھی مثنوی کے ابواب کے عناوین اشعار میں لکھے ہیں۔ باب نعت کے عنوان کا شعر یہ ہے:

ہاں نے صفت اس کی سنو ظاہر خدائی جس نے ہوئی

سو او محمد ہے نبی سلطان اولوالابصار کا

آنحضرت کے فضائل کا ذکر کرتے ہوئے ہاشمی کہتا ہے کہ نبیوں میں جو سب سے افضل ہیں وہی رسول انبیاء محمد ہیں۔ خدا نے پہلے آپ کو بنایا پھر ساری خدائی کی تخلیق کی۔ پہلے نور ذاتی کو ظاہر کیا پھر سارے عالم کو پیدا کیا۔

سوئی ہے محمد رسول خدا

بزاں سب خدائی کیا آشکار

بزاں سب یو عالم کوں پیدا کیا

بنیاں میں جسے تے فاضل کیا

اول کر محمد کوں پروردگار

اول نور ذاتی ہویدا کیا

آگے وہ آپ کے اسم معظم کی برکات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جو آپ کے نام کا ورد کرتا ہے اسے دو عالم میں فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ زمین، جن و پری، سارے دریا اور پہاڑ، تمام آسمان، سب جو رو ملک، عرش و کرسی اور لوح و قلم آپ کے نام کا ورد کرتے ہیں:

کھیا سو بڑائی وہ دو جگ منجھد

محمد کہیں سب یو جن و پری

محمد کہیں سب جبل

محمد کہیں سب یو حور و ملک

محمد کہیں دم بہ دم

محمد محمد جو کوئی بار بار

محمد کہے دھر تری

محمد دریا کہیں سگل

محمد کہیں سب فلک

عرش ہوا کرسی یو لوح و قلم

نعتیہ اشعار کے آخر میں معراج کے بیان کی طرف گریز کرتے ہوئے ہاشمی کہتا ہے کہ اگر جسم

کے ہر روئیں کو سوز بانیں مل جائیں تب بھی آپؐ کی توصیف کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اے ہاشمی معراج کا بیان طویل ہے تو اسے مختصر بیان کر۔

ہر یک روں کوں سوسوزباں گردھرے تبی وصف نا کوئی پورا کرے
مطوں تو ہے ہاشمی سر بسر ابنا کر تو معراج کوں مختصر

مثنوی یوسف زلیخا میں ہاشمی نے نہایت اچھوتے انداز میں صفت معراج بیان کی ہے۔ اس رات کی رونقوں اور اہتمام کا ذکر کرتے ہوئے وہ رات کو ایک ”چتر“ اور ”خوش دماغ“ مالن کے روپ میں پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ رات ایک عقلمند اور خوش دماغ مالن کی طرح آسمان کے باغ کو کھلا ہوا دیکھ کر دوڑ پڑی۔ اس نے ثریا سے خوش نما الاقہ (علاقہ۔ طرہ دستار) گوندھا۔ پھر سنبلہ سے طرہ اور کہکشاں سے پار گوندھے۔ سارے ستاروں کے پھولوں کو کھلا ہوا دیکھ کر وہ انہیں آسمان کے دوڑنے میں بھرا لائی اور اس میں معراج کی ساری خوبیاں سمو کر نبی کے حضور یہ ہدیہ لے آئی۔

این ہو کے مالن چتر خوش دماغ وہ دوڑی گنگن کا پھولیا دیکھ باغ
الاقہ سریا گندی خوش نماں ترا سنبلہ ہارسوں کہکشاں
کھلے پھول سارے ستاریاں کے کر لیائی فلک کے سو دوڑنے میں بھر
خوبی بھر کے معراج کی تس میں پور وہ ہدیہ لیاتی نبیؐ کے حضور ۲۰

نصرتی اور ہاشمی کے ایک ہم عصر محمد امین ایانغی نے علی عادل شاہ ثانی کے عہد حکومت (۱۶۵۶ تا ۱۶۷۲ء) میں ”نجات نامہ“ کے عنوان سے ایک مذہبی مثنوی تصنیف کی۔ اس مثنوی میں لوگوں کو عذاب الہی سے ڈرایا گیا ہے اور گناہ گاروں کو قیامت میں جو سزائیں دی جائیں گی ان کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ایانغی نے احوال قیامت کے بیان سے قبل حمد و نعت بھی لکھی ہے۔ نعتیہ اشعار میں پہلے وہ نبی اکرمؐ کے بعض فضائل و محاسن کا ذکر کرتا ہے، پھر آپؐ کی شریعت پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ آپؐ کی شان و فضیلت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتا ہے:

محمد نبی تاج پیغمبراں سپہ دار دیں ، سرور سروراں
شہنشاہ تاج لولاک کا کہ پل میں کیا سیر افلاک کا
اسے تاج و اقبال و رفعت دیا اپس کن بلا بھیج عزت دیا

ذکر فضائل کے بعد ایانغی مسائل کی طرف آتا ہے اور امت کو نصیحت کرتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ کی بات قبول کرنا ضروری ہے، جو آپؐ کی بات نہیں سنے گا قیامت کے دن حسرت سے ہاتھ چبائے گا

انھیں آرزوؤں کا اظہار انجم صاحب نے بھی بالکل اچھوتے انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح لفظوں میں اپنی دلی کیفیات کو بیان کیا ہے کہ وہ کیفیات سب کے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی ہیں۔

حضور سامنے ہوں اور جان نذر کروں
یہ التجا یہ تمنا یہ خواب ہے اللہ
ملا کے خاکِ مدینہ میں سرخرو کر دے
یہاں غلام کی مٹی خراب ہے اللہ
ممکن نہیں پر ایک تمنا ہے کیا کروں
دو گز زمین چاہئے سرکار پاؤں میں
نعت گوئی کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اشعار میں اپنی اور مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کر کے آپ
سے دعا کی گزارش، شفاعت کی تمنا اور پستی و بربادی کا منظر آپ کے حضور پیش کیا جائے جس کی
اولین مثال ہے مولانا حالی کی ”اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے“ اس کی اتباع میں شعرائے
کرام نے بھی آپ کے حضور استغاثہ پیش کیا ہے مگر اس میں اکثر نے آپ کو (نعوذ باللہ) اللہ کے
اوتار کا درجہ دے دیا ہے۔ مگر اس طرح کی فریاد میں بھی انجم صاحب نے بے حد احتیاط سے کام لیا
ہے۔ ”فریاد“ کے عنوان سے انجم صاحب کی نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

حضور ملت بکھر رہی ہے، ہماری صورت بگڑ رہی ہے
سیاہی آنکھوں میں پھر رہی ہے دلوں کی دنیا اجڑ رہی ہے
حضور ظلمت کی کیا شکایت ہے روشنی روشنی کی دشمن
لہو خود اپنے لہو کا پیاسا ہے زندگی زندگی کی دشمن
چمکتے گنبد ہیں مسجدوں کے منارے بے حد بلند آقا
نمازیوں سے صفیں ہیں خالی تماشے ہیں دل پسند آقا
بھلا کے سب روح کے تقاضے بدن کو علماء سجا رہے ہیں
نمازیں اجرت پہ ہو رہی ہیں امام روزی کما رہے ہیں
امیرِ ملت میں کھیلتے ہیں غریب و مسکین ترس رہے ہیں
کہیں لبوں پر گلابِ شبنم، کہیں پہ آنسو برس رہے ہیں
نئے زمانے کی روشنی میں ہماری نسلیں بھٹک رہی ہیں
ہٹائیں است کی بیٹیوں کے سروں سے آقا سرک رہی ہیں

غموں سے انجم ہے دل شکستہ خوشی کا کچھ اہتمام آقا

دہائی آقا، دہائی آقا، درود آقا، سلام آقا

اسی کے ساتھ ان اشعار پر بھی غور کیجئے:

کٹیں گے کیسے تمنا کے راستے آقا
چراغ جیسے مرے خواب بجھ گئے آقا
ہر ایک سمت سے یلغار ہے مصیبت کی
میں چھوڑ بیٹھوں نہ امید، حوصلے آقا
مجھے سنبھالنے میں اس زمین پر ہوں جہاں
رتھوں کے ساتھ ہی چلتے ہیں زلزلے آقا
یہاں سکون میسر نہیں کسی صورت
دیوار امن و اماں میں بلائے آقا

تمام قوم پریشاں ہے صرف میں ہی نہیں خدا کے واسطے لطف و کرم مرے آقا
ان اشعار میں انجم صاحب نے اپنی اور مسلمانوں کی حالت زار بیان کی ہے اور آپ سے
لطف و کرم، مہربانی، شفاعت اور دعا کی ہی گزارش کی ہے۔ اس کے ساتھ انجم صاحب نے حمد اور دعا
و مناجات میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذبات کو سادے مگر جدید لفظیات اور اسلوب کے ساتھ
اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ حمد کے دو تین اشعار ملاحظہ ہوں:

قلم میں رنگ انوکھے کہاں سے آتے ہیں خیال ذہن کے رستے کہاں سے آتے ہیں
دراز ہے نہ جھروکے ہیں آسمانوں میں ہوائے خلد کے جھونکے کہاں سے آتے ہیں
دلوں میں پیار کے جذبات کون بھرتا ہے یہ ماہ تاب سے چہرے کہاں سے آتے ہیں
”صدف“ میں کون پروتا ہے خوش نما موتی ”گلاب جیسے فرشتے“ کہاں سے آتے ہیں

اسی طرح مناجات کے یہ اشعار بھی اپنے آپ میں ایک زمانے کے درد کو سمیٹے ہوئے ہیں۔

خوابوں کی تعبیر دکھا دے اللہ سائیں یا ان کو زنجیر پنہا دے اللہ سائیں
میرے گھر میں کچھ کرنیں تو آجائیں گی ہمسایوں کے دیپ جلا دے اللہ سائیں
میرے اندر ویرانی سی ویرانی ہے تو چاہے تو سورگ بنا دے اللہ سائیں
انجم کا دل رکھ لے ورنہ ڈر لگتا ہے دیواروں سے سر ٹکرا دے اللہ سائیں

نئے اسلوب، جدید لفظیات، دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے الفاظ، اظہار کا انوکھا انداز، یہ
اور ایسی بہت سی باتیں اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری کے خصوصیات کہی جاسکتی ہیں۔ صلو علیہ وآلہ، د
راصل اطاعت الہی، عشق رسول اور راہ سلوک کے راہی کے دل کی آواز ہے جو صفحہ قرطاس پر آنے
کے بعد ہر دل کی آواز بن جاتی ہے کیوں کہ اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری حمد و نعت کے مروجہ راستے سے
جدا اور مشاعروں کی نعتیہ شاعری سے پرے سچے اظہار کی شاعری ہے۔ اس سلسلے میں میں مزید کچھ نہ
کہتے ہوئے صلو علیہ وآلہ میں شامل بشرنواز (اورنگ آباد دکن) کے مضمون ”پل صراط“ کے اقتباس پر
اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ بشرنواز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”اشفاق انجم بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے کے درمیان اپنی
شناخت بنانے والے شعراء میں شامل ہیں۔ ان شعراء میں لسانی اور ہیبتی
تجربوں کی جسارت بھی تھی۔۔۔۔۔ اشفاق انجم کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں

نے اس دور میں بھی اپنے آپ کو ”تنقیدی ترغیبات“ سے بچائے رکھا اور غیر ضروری تجربوں یا زبان و بیان سے چھیڑ چھاڑ کی بجائے اپنے سچے اظہار پر توجہ مرکوز رکھی۔ چنانچہ ان کے یہاں روایت کے احترام اور تجربے کی ضرورت کا ایک ایسا امتزاج ملتا ہے جو اچھی شاعری کی اولین شرط ہے۔ اپنی ذہنی تربیت، احترام روایت ہی کی وجہ سے ان کے یہاں شروع سے ہی دعائیہ اور حمدیہ لہجے کی جھلکیاں ملتی ہیں جو ۸۵-۸۰ء کے بعد نئی غزل میں زیادہ روشن ہوا۔

زیر نظر نعتیہ کلام کو میں اسی رجحان کی توسیع سمجھتا ہوں۔ اشفاق انجم مذہبی اور علمی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مذہب سے لگاؤ، عشق رسول اور اطاعت الہی اس خانوادے کے مزاج میں شامل ہے۔ اشفاق انجم نے یہ تمام اثرات شعوری اور غیر شعوری ہر دو طرح سے قبول کئے۔۔۔۔۔ اردو کی نعتیہ شاعری میں عام طور پر غزل کا رنگ غالب آ جاتا ہے اور شاعر غزل کے محبوب کی طرح حضورؐ کے حسن و جمال پر اکتفا کرنے لگتا ہے۔۔۔۔۔ اشفاق انجم نے نعت گوئی کی اس عمومی اور بڑی حد تک سطحی روش سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے۔ انھوں نے حضور اکرمؐ کے حسن و جمال سے زیادہ ان کے اسوۂ حسنہ پر توجہ دی ہے۔۔۔۔۔ میں خصوصی طور پر اس طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ اشفاق انجم کی نعتیں سراپا نگاری سے زیادہ کردار نگاری کی حامل ہیں۔“ ۲



حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر ہارون فراز، صلو علیہ وآلہ، ٹائٹل فلیپ

۲۔ بشر نواز، دیباچہ صلو علیہ وآلہ، مطبوعہ ۲۰۰۱ء

قرطاس مصلیٰ ہے تو سجدے میں قلم ہے
یہ منزلت مدح شہنشاہِ اُمم ہے

(ابرار عابد)

مکالمات

عہدِ نو کی ضد کہ روح ارتقا نافذ کرو
قلب کہتا ہے کہ عشقِ باصفا نافذ کرو
عقل کہتی ہے فقط سود و ربا نافذ کرو
عشق کہتا ہے نظامِ مصطفیٰ نافذ کرو

(رئیس امر وہوی)

نعت اور حب رسول کے تقاضے! (ایک گفتگو)

معروف دانشور اور مذہبی اسکالر جناب احمد جاوید لاہور سے کراچی تشریف لائے تو انھوں نے 28 اگست 2016 کی شام کراچی پریس کلب میں ایک طرحی مشاعرے میں شرکت فرمائی۔ نعت پیش کرنے سے قبل منتظمین کے اصرار پر انھوں نے نعت اور اظہار حب رسول کے تقاضوں پر بھی مختصراً گفتگو فرمائی۔ نعتیہ ادب میں احتیاط کے پہلوؤں پر مبنی چند نکات توجہ طلب ہیں چنانچہ احمد جاوید صاحب کے خطاب کا متن نعت رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

حسن اظہار کے بغیر سچائی کا بیان ہو بھی جائے تو وہ ادھورار رہتا ہے اور بعض مرتبہ مضر نکلتا ہے۔ نعت گوئی کے کچھ فنی آداب اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے روحانی اور معاشرتی مظاہر کیا ہیں؟ ایک مختصر سی گفتگو کر کے میں رخصت چاہوں گا۔ مسلمانوں کے احساسات و جذبات کا سارا نظام دو ستونوں پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ہے۔ یعنی مسلمان اپنی افتاد طبع میں اور اپنے بنیادی مزاج میں دو احوال کا حامل ہوتا ہے، اور ان دو احوال کو اپنے اندر رکھنا اور اپنے مسلمان ہونے کے احوالی اسباب ہونے کی حیثیت سے انھیں تسلسل سے رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایمان لانا! کیوں کہ یہ ایمان کے شاہد ہیں۔ تو وہ جو دو احوال جن سے مسلمانوں کا سارا نظام جذبات و احساسات چل رہا ہے وہ ہیں خشیت الہی اور حب رسول! تو یہ دو چیزیں اگر ہمارے مزاج میں بنیادی محرکات کے طور پر موجود ہیں تو ہم نے گویا رسول اللہ کا عاجز مگر سچا امتی ہونا کو الیفائی کر لیا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن جن جہتوں سے مڑ کی بنا کر بھیجے گئے تھے... تزکیہ کہتے ہیں ہدایت پر نفس کا راضی ہو جانا، ہدایت پر نفس کا مطمئن ہو جانا، یہ تزکیہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تزکیے کے واحد ضامن تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ایک خاص جہت سے اپنے خدام کا تزکیہ فرمایا کرتے وہ ایک

جہت یہ ہے کہ نفس کے غالب ترین احوال کی حیثیت سے وہ اللہ کی خشیت اور اللہ کے رسول کی محبت کو اپنے تمام احساسات و جذبات کی اصل بنانے کے لائق ہو جایا کرتے تھے۔

میرے خیال اور میری ناچیز رائے میں ہمارے تنزل، انحطاط اور ہماری ہر درجے پر شرمندہ کر دینے والی بے بسی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تعلق باللہ اور تعلق مع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ بنیادی فطری تقاضے نظر انداز کر رکھے ہیں حتیٰ کہ ہماری دینی تعلیم کے نظام میں بھی ان بنیادی احساسات کی تخم کاری اور ترویج کا وہ اہتمام نہیں ہے جو رسول اللہ کی مجلسوں میں پایا جاتا تھا۔ کیوں کہ انسان جس چیز کو اہمیت و وقعت دیتا ہے، یعنی انسان کی بناوٹ ایسی ہے یہ جس چیز کو بہت ضروری بہت اہم سمجھ کر قبول یا اختیار کرتا ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کے احساسات کا نظام اس چیز پر نہ چلے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اللہ کو مانوں اس کی شان کے ساتھ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤں آپ کی شان کے ساتھ اور وہ ان دونوں ہستوں سے تعلق کے احوال، احساسات اور جذبات سے محروم رہ جاؤں۔ مطلب یہ انسان کی بناوٹ کے خلاف ہے۔ یہ غیر فطری ہے۔ گویا اللہ سے نہ ڈرنا اور رسول اللہ پر ہر سانس کے ساتھ ثناء ہوتے نہ رہنا یہ غیر فطری ہے۔ یعنی اس کا غیر دینی اور غیر عقلی ہونا بعد میں دیکھا جائے گا، یہ غیر فطری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کرے کہ رسول اللہ پر ایمان اور آپ کی کامل اتباع کے سچے عزم کے ساتھ اس کی بدولت، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دو بنیادی احوال مرحمت فرمادیں کیوں کہ جیسا انیق احمد کہہ رہے تھے اس پر مسلم انفرادیت، مسلم اجتماعت اور مسلم ریاست سب کا دار و مدار ہے۔ اور جو انہوں نے بہت اچھی بات فرمائی کہ انسانوں کا معاشرتی آئیڈیل مساوات رہا ہے۔ یعنی انسانوں نے بہتر معاشرے کے لیے جو سب سے زیادہ بڑا خواب دیکھا ہے اس خواب کا عنوان مساوات ہے وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ یعنی مساوات انسانی معاشرے کی بہترین صورت کا وہ آئیڈیل ہے جو ہمیشہ ذہن میں رہا کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ لیکن رسول اللہ نے انسانوں کو ایمان کی بنیاد پر ایک دوسرے کا جذباتی، ذہنی اور عملی بھائی بنا کر دکھا دیا یعنی رسول اللہ نے مساوات کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے آئیڈیل مواخات کو عمل میں لا کر دکھا دیا۔ مواخات کو عمل میں لانے کا جو بے نظیر کارنامہ ہے وہ رسول اللہ نے ان دو احساسات کو اپنے ماننے والوں کا مدار وجود بنا کر برپا کیا۔ لوگ ایک دوسرے کے بھائی بھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے ہو گئے تھے یہ آپ کی محبت ہے جو آپ کے امتیوں کو ایک دوسرے کا ایسا بھائی بنا سکتی ہے کہ نسبی بھائی بعد میں آئے گا یہ نسبی بھائی پہلے آئے گا۔

تو یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ کی محبت آپ سے محبوبیت کا شرف حاصل کرنے کے لیے نسب کوئی Final (حتمی) یا decisive (فیصلہ کن) چیز نہیں تھا، نسبت بنیادی چیز تھی۔ یہ نسبت ہے جو بلال حبشیؓ کو سیدنا عمر فاروق اعظمؓ کی زبان اقدس سے ”سیدنا“ کہلواتی ہے۔ ہم اگر بس اس نسبت کو اپنے وجود کے بہترین احوال کے ساتھ قبول کر لیں تو امید ہے کہ کم از کم اگر ہم ریاست اسلامی نہ بنا سکے، معاشرہ اسلامی بنانے میں یقیناً کام یاب ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی معاشرتی وحدت و مواخات حب رسول کی زندہ، جیتی جاگتی بنیاد پر، یہ ہمارا آئیڈیل ہے اور اس آئیڈیل کو آسانی سے عمل میں لانے کا یہ راستہ ہے کہ اللہ سے ڈرنا سیکھو اور رسول اللہ پر مرنا سیکھو۔

دوسری بات نعت گوئی کے ایک دو لوازم کے بارے میں..... کیوں کہ یہاں سب بہت کہنے مشق، قادر الکلام اور صاحبان کیفیات شعرا بیٹھے ہوئے ہیں تو ان کو اس کی ضرورت نہیں، ویسے ہی کہہ رہا ہوں..... نعت کے چند ضروری عناصر ہوتے ہیں، جن کو بالکل یہ نظر انداز کر کے نعت وجود میں نہیں آسکتی۔

ایک یہ کہ نعت رسول اللہ کی جناب میں اظہار محبت ہے اللہ کے شکر کے ساتھ! یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اس دنیا ہی میں نہیں، اللہ نے جنت میں پہنچایا تو وہاں بھی۔ دنیا و آخرت میں اللہ کی سب سے بڑی رحمت اور نعمت رسول اللہ خود ہیں۔ دنیا میں رہیں گے تو دنیا کا مرکز ہیں، جنت میں رہیں گے تو جنت کا مرکز ہیں۔ اور جنت کی کوئی بھی چیز رسول اللہ کے ہم پلہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے دعا کرو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے گناہ بخشے اور ہمیں رسول اللہ کی مشفقانہ شفاعت کا مستحق بنائے اور کیا عجب ہے کہ ہمیں رسول اللہ سے مرافت کی توفیق بھی جنت میں مل جائے کہ جنت کی سب سے بڑی دو نعمتیں ہیں؛ رویت باری تعالیٰ اور معیت رسول اللہ۔ تو یہ دونوں نعمتیں حاصل کرنے کی تیاری کرو! دل کے لیے اللہ سے ڈرنا لذیذ بنا دو، دل کو اللہ کی خشیت کی طرف راغب اور مائل کرو کسی احساسِ جبر کے بغیر۔ اور اسی طرح رسول اللہ کے عاشق بننے کی بجائے رسول اللہ کے عاشق ہونے کا ثبوت دو! اللہ مجھے اور آپ کو، سب کو توفیق عطا فرمائے۔

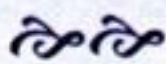
نعت کے جو ضروری عناصر ہیں ان میں سے ایک اظہار محبت ہے اپنی اوقات میں رہتے ہوئے۔ کیوں کہ رسول اللہ انسانوں کے درمیان جاری نظامِ عشق و محبت میں نہیں آتے۔ آپ نعوذ باللہ، نعوذ باللہ کوئی عام محبوب نہیں ہیں۔ رسول اللہ سے بیٹوں کی طرح محبت نہیں ہو سکتی، رسول اللہ سے والدین کی طرح محبت نہیں ہو سکتی، رسول اللہ سے کسی بھی محبوب کی طرح کی محبت نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ رسول اللہ کی محبت میں بھی ایک زور وحدت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یعنی اس میں کسی کو شریک نہیں رکھا جاسکتا۔ تو رسول اللہ کی محبت ہے ایک ناچیز امتی کے دل کی سب سے بڑی متاع جو وہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود سرکارِ دو عالم کی خدمت میں پیش کرنے کا شوق رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میرا یہ جو ناچیز ساتھ ہے وہ اس بارگاہِ سخاوت میں، اس بارگاہِ فیاضی میں، بارگاہِ رحمت میں اللہ کی تائید کے ساتھ قبول ہوگا۔ مطلب یہ کہ اظہارِ محبت بھی محبت کے عمومی اسالیب میں نہیں، اپنی اوقات میں رہتے ہوئے اور آپ کے محبوب خدا ہونے کے مرتبے کو نظر میں رکھتے ہوئے۔ رسول اللہ کے لیے یہ تو کوئی لقب ہی نہیں کہ آپ محبوبِ امت ہیں، کبھی یہ استعمال نہیں ہوا کیوں کہ یہ تو آپ کی کسرِ شان ہے۔ آپ کے لیے لقب ہے محبوبِ الہ، محبوبِ خدا، محبوبِ جبرئیل۔ تو مطلب یہ کہ جو خدا کا محبوب ہو اس کے عاشق کو اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔ اللہ بڑا غیرت والا ہے، بڑا حمیت والا ہے وہ اپنے محبوب کے حضور میں کسی بھی ضروری حد سے تجاوز قبول نہیں فرمائے گا۔

دوسرا یہ ہے کہ نعت میں ایک بحرِ حمد یہ رو بھی دوڑنی چاہیے کہ یا اللہ تیرا احسان، یا اللہ تیرا شکر کہ تو نے مجھے اپنے حبیبِ مکرم کا امتی بنایا، کہ تو نے مجھے آخرت کے لیے پُر امید رہنے کا سبب عطا فرمایا۔ اگر رسول اللہ سے تعلق نہ ہو تو اپنی آخرت کے لیے پُر امید رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا، ٹھیک ہے نا؟ تو یہ جو ایک تشکر کی رو ہے یہ نعت کو گویا اس کی معنوی اٹھان عطا کرتی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ایسی نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے ہوئے میں نعت لکھ رہا ہوں اور اس نعمت کو دینے والے کے تشکر کے اظہار کا راستہ اس نعت میں نہیں مل رہا تو یہ بڑی کمی کی بات ہے۔ اور تیسرا یہ کہ اگر کوئی کہے کہ اللہ کے لیے کوئی ایسا لقب بتا دو کہ جس میں اس کی تمام صفاتِ جمیلہ و جلیلہ شامل ہو جائیں، اللہ کی شان میں ایسا ایک Phrase (نقحرہ) بنا دو تو میں کم از کم کہوں گا وہ Phrase ہے اللہ محمد۔ اللہ کے وصف کو اپنی انتہائی بلندی پر اگر بیان کرنا چاہو تو اسے کہہ دو ”اللہ محمد“ اب اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان گویا اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم نے بیان کر دی۔ تو اسی طرح رسول اللہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تعلق کا ایک لاشریک مزاج ہے، اس میں وہ کسی کو مداخلت نہیں کرنے دیتا، نہ اللہ نہ اللہ کے رسول۔ تو اللہ اس سے خوش ہوگا کہ اسے اللہ محمد کہا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خوش ہوں گے کہ انھیں عبد اللہ کہا گیا ہے رسول اللہ کی ہر شانِ بندگی کے دائرے میں بیان ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہر شانِ الوہیت کے درجے میں بیان ہوگی، تو اس میں اختلاط نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی رسول اللہ کو اللہ کی بندگی سے الگ کر کے ڈیفائن کرنے کی جو بھی کوشش ہوگی وہ اللہ کو بعد میں رسول

اللہ کو پہلے ناراض کرے گی۔ تو میری محبت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مجھے اپنے منہ زور جذبات کی تسکین سے زیادہ اپنے محبوب کی خوشنودی عزیز ہونی چاہیے۔ نعت گوئی کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے جذبات محبت کی تسکین میرا موضوع نہیں ہے، یہ تو شرک کے برابر ہے کہ میں اپنی تسکین چاہتا ہوں اللہ کے رسول کی تعریف کر کے۔ یہ تو گویا اپنے لیے کہا گیا ناں؟ اس میں مطلب سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہو جائیں۔ آپ کا معبود راضی ہو جائے، آپ خوش ہو جائیں۔ تو اللہ نے بھی اپنی محبت کی انتہا پر ”عبدہ“ کہا، اسی طرح رسول اللہ بھی اپنے تعارف کا انتہائی کلمہ عبد اللہ ہونا بتاتے ہیں۔ یہ شان بندگی ہمارے لیے تو شرف ہے ہی رسول اللہ کے لیے بندگی نعوذ باللہ کوئی نقص تھوڑی ہے، یہ تو اللہ کی طرف سے دیا گیا سب سے قیمتی تحفہ ہے جو اللہ نے خاص رکھا اپنی کتاب میں۔ تو اس تحفے کو رسول اللہ کے دستِ عظمت سے چھیننے کی کوشش نہ کرو، یہ چھیننے کی کوشش ہے۔

یہ دو آداب فنی اہتمام کے ساتھ، لفظ پر مناسب قدرت کے ساتھ، جمالیاتی شعور کی مناسب تربیت کے ساتھ اگر ہم دو یہ آداب نعت گوئی کے عمل میں رسول اللہ کے دکھائے اور بتائے ہوئے معیار تک لے جائیں تو ہم نے گویا نعت گوئی کی روایت کو رسول اللہ کے ساتھ تعلق کی روایت کا سب سے کارگر اور مؤثر مظہر بنا دیا۔ نعت گوئی کی روایت اگر اخلاص اور درست محبت کے ساتھ پروان چڑھ جائے، رواج پکڑ جائے تو رسول اللہ سے تعلق رکھنے والے احساسات و جذبات کسی بھی تحریر کسی بھی لٹریچر کے مقابلے میں جلدی منتقل ہو جائیں گے۔ تو نعت گو حضرات اور نعت خواں حضرات دونوں پر یہ فریضہ دعوت عاید ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے ساتھ تعلق کے لیے درکار احساس کو پھیلائیں اپنے سامعین و مخاطبین میں مگر ان شرائط کے اندر رہتے ہوئے۔



نعت اور تنقیدی شعور (مذاکرہ)

ABSTRACT:

Dr. Professor Abu Sufyaan Islahi, Professor Arabic, visited Pakistan for a short while from Ali Garh (Bharat). Director Naat Research Centre, Dr. Aziz Ahsan, arranged a symposium on the topic of Critical Consciousness of poets of Arabic, Persian and Urdu languages for creating devotional poetry i.e. genre of Naat. Professor Sahar Ansari and Professor Anwar Ahmad Zai also participated in discussion. Dr. Aziz Ahsan, remained present as host moderator during discussion. The symposium has now been transcribed for publishing in 26th issue of NAAT RANG.

ڈاکٹر عزیز احسن: آج میرے لیے یہ بہت ہی مسرت کا لمحہ ہے کہ ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب، علی گڑھ سے تشریف لائے ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری صاحب ہمارے بزرگوں میں ہیں اور یہیں کراچی میں تشریف رکھتے ہیں انھوں نے بھی ہماری دعوت پر اس محفل میں شرکت فرمائی ہے اور..... میں کیا کہوں کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے..... جناب پروفیسر انوار احمد زئی، چیئر مین بورڈ آف سائنڈری ایجوکیشن بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

میں یہ چاہ رہا تھا کہ چوں کہ نعت ریسرچ سینٹر کے چیئر مین پروفیسر انوار احمد زئی بھی یہاں

ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ، بھارت سے کراچی تشریف لائے تو نعت ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز احسن نے، منگل: یکم ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۲ جنوری ۲۰۱۶ء (رات ساڑھے سات بجے)، ”نعت اور تنقیدی شعور“ کے موضوع پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا۔ اس مذاکرے میں مہمان خصوصی جناب پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری اور پروفیسر انوار احمد زئی نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر عزیز احسن، میزبان کی حیثیت سے مذاکرے میں شامل رہے۔

موجود ہیں اور میں 'خاکسار' (عزیز احسن) نعت ریسرچ سینٹر کا ڈائریکٹر ہوں۔ صبح رحمانی، نعت ریسرچ سینٹر کے سیکریٹری جنرل ہیں جو آج کل کینیڈا میں ہیں۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب کے مضامین، نعت رنگ میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر سحر انصار صاحب کے بھی مضامین شائع ہوئے ہیں اور انھوں نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا کہ ہماری درخواست پر میرزا مظہر جان جاناں کی ایک فارسی نعت کا چند منٹوں میں منظوم ترجمہ کر دیا جو نعت رنگ میں شائع ہو چکا ہے۔ ان مقتدر حضرات کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نعت پر اور نعتیہ ادب میں تنقیدی شعور کے حوالے سے کچھ باتیں ریکارڈ کر لوں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ نعت رنگ کے ذریعے ہم نے تنقیدی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور نعت کے حوالے سے تنقید کے ضمن میں، عمومی طور پر لوگوں کا شرح صدر نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات فرمائیں کہ عربی، خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب آپ تو عربی کے حوالے سے ہمیں بتائیے کہ عربی نعت میں تنقیدی شعور کس طرح کارفرما رہا ہے وہ کیسا رہا ہے اور نعت کے عربی کے مآخذ کیا کیا ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری صاحب اردو کے چوں کہ تنقید نگار بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں یہ بھی بتائیں گے اور کچھ میں بھی عرض کروں گا۔ تو بتائیے کہ کہاں سے بات شروع کی جائے۔

پروفیسر سحر انصاری: عربی سے نعت شروع ہوئی ہے اور عربی کو تقدم حاصل، اس لیے ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

عزیز احسن: عربی سے چوں کہ نعت کا آغاز ہوا ہے اس لیے اصلاحی صاحب سے درخواست ہے کہ وہ عربی نعتیہ ادب کے حوالے سے ہمیں کچھ بتائیں۔

اصلاحی: جہاں تک کہ عربی میں نعت گوئی کا تعلق ہے تو ایک طریقے سے قبل نبوت ہی سے اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ بہت سے ایسے قصیدے اور بہت سی ایسی چیزیں مل جائیں گی جو نعت گوئی کے حوالے سے پیش کی جاسکتی ہیں اور اس کے بعد جب نبوت کا آغاز ہوا تو شعراء الرسول کے حوالے سے ایک پوری ٹیم تھی اور یہ اصحاب رسول ﷺ تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ ان کے سامنے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے اوصاف و کمالات اور ان کے اخلاق عالیہ یہ سب چیزیں ان کے سامنے تھیں اور اسی کو پیش نظر رکھ کر وہ اللہ کے رسول ﷺ کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ تو یوں بالخصوص قبل نبوت اور نبوت کے بعد کی شاعری کو ایک طریقے سے اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سیرت نگاری کا ایک بہت بڑا مآخذ ہے۔ یہ اس لیے کہ اس شاعری کا بہت بڑا حصہ اللہ کے رسول ﷺ کی نظروں

سے گزرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسا شعر ہے جس سے آپ کا نظریاتی تصادم یا نظریاتی ٹکراؤ ہے تو وہاں آپ بڑیک لگاتے اور اس پر تنقید کرتے، اسے روکتے بلکہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ کچھ اشعار ایسے پڑھے جارہے تھے جن کا مفہوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو غیب کا بھی علم ہے تو فوراً آپ نے منع کیا۔ گویا اس سے متبادر ہے کہ شعراء الرسول ﷺ کی شاعری یا شعراء الرسول سے پہلے کی شاعری جو ہے اس کو بہت ہی اہمیت و عظمت حاصل ہے اور سیرت نگاری کے سلسلے میں اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ (عزیز احسن سے مخاطب ہوتے ہوئے) شبلی کی سیرت النبی ﷺ میں یہ چیز موجود نہیں ہے۔ کس قدر جہاں دیدہ آدمی تھا سرسید جس نے یہ تحریر کیا کہ سیرت نگاری کا تصور ہم بغیر عربی شاعری کے کر ہی نہیں سکتے۔ جیسے قرآن کریم اور حدیث، سیرت نگاری کے بنیادی source ہیں۔ اسی طرح جو سیرت نگاری کے چار پانچ بنیادی sources ہیں جن کے بغیر سیرت نگاری کے عوامل و محرکات سامنے آ ہی نہیں سکتے ہیں ان میں عربی شاعری کی یہی قابل ذکر حیثیت ہے۔ سرسید نے جب خطبات احمدیہ کا آغاز کیا ہے تو آپ دیکھیے کہ انھوں نے بیس پچیس تیس شعر کوٹ کیے ہیں۔ ابھی میں نے اپنے ایک مضمون میں یہ وضاحت کی کہ سیرت النبی ﷺ کی ترتیب میں کلام عرب سے استشہاد کو اور آگے بڑھایا جانا چاہیے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی ﷺ میں کچھ اشعار نقل تو کیے ہیں، لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو جس کا سرسید نے آغاز کیا تھا اس کو سیرت کے مآخذ میں بڑھایا جانا چاہیے تھا لیکن سیرت النبی ﷺ میں یہ اسلوب تحقیق موجود نہیں ہے۔ ابھی شبلی کی سیرت النبی میں جو عربی اشعار ہیں اس پر میرا ایک مضمون، مجلہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں شائع ہوا ہے۔ ان کے نقل کرنے میں کہاں کہاں سہو ہوا ہے۔ وہ سب میں نے point out کیا ہے۔

عزیز احسن: آپ کی گفتگو سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ پہلے یہ طے ہو جائے..... اور

یہ آپ ہی سے ہمیں معلوم ہوگا کہ عربی شعراء نے زیادہ تر حسنِ صوری کی بات کی ہے یا جمالِ سیرت واسوہ رسول کریم ﷺ کا ذکر زیادہ کیا ہے؟

اصلاحی: اچھا سوال آپ نے کیا..... میرا یہ مضمون ”المدح النبوی! ایک مطالعہ“ جو نعت رنگ

میں ابھی آیا ہے یہاں بھی دیکھیے خاص طور سے وہ شاعری جو صحابہ کرام یا دیگر شعراء نیز تبع تابعین کی شاعری رہی ہے۔ اس ضمن زیادہ تر شامل النبی موضوع بحث رہے۔ تو ان لوگوں نے نعلین مبارک اور دیگر چیزوں پر توجہ نہ دے کر اوصاف نگاری پر توجہ مرکوز کی ہے۔ گویا شامل النبی ﷺ ان کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتنا ہے۔ شامل النبی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اخلاق اور آپ کا کردار کیسا

تھا۔ آپ معاشرے کے ساتھ پیش کیے آتے تھے..... یا دین کی تبلیغ کا طریقہ کار کیا تھا۔ یا جو مخالفین تھے ان کے ساتھ آپ کا کس طریقے سے discussion ہوتا تھا۔ ان تمام چیزوں کو اس [شاعری] میں highlight کیا گیا ہے۔ لیکن دو سو سال کے بعد یہ شاعری شروع ہوئی ہے۔ تو ابونواس کی شاعری کے بارے میں آپ دیکھیے۔ اندلس کے جو شعراء ہیں اس کے بعد عہد عباسی کے شعراء ہیں یا نیچے آئے تو یہاں میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے ان موضوعات یعنی نعلین اور آپ ﷺ کے حلیے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی چیز ہے..... آپ دیکھیے کہ جو نعت کے مباحث ہونے چاہئیں۔ جس میں دانشورانہ، عالمانہ انداز ہو وہ دو سو سال سے پہلے والی شاعری میں ہے۔ دو سو سال کے بعد اس میں عالمانہ انداز آپ نہیں دیکھیں گے۔ اس میں رونے اور اپنے گناہوں کی معافی کا انداز ملتا ہے۔ شفاعت کا بار بار ذکر آتا ہے۔ no doubt کہ آپ ﷺ شفیع المذنبین ہیں..... اس طرز پر یہ ساری چیزیں یہاں ملتی ہیں۔ لیکن دو سو ڈھائی سو سال پہلے آپ جائے تو آپ کا کردار کیا تھا نیز آپ کا دین کی تبلیغ اور اشاعت قرآن کے سلسلے میں کیا طریقہ کار تھا، ان پر خصوصی گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن ڈھائی سو سال کے بعد زیادہ تر ہم نے صرف توصیفی یا تعریفی گفتگو کی ہے۔ لیکن اس توصیف میں آپ کا اخلاقی معیار کیا تھا، معاشرتی و سیاسی کیا کردار کیا رہا..... ان پہلوؤں پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے گفتگو کی ہے..... آپ دیکھیے، یہ بات تو اردو کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ جب حضرت حسان بن ثابتؓ سے کئی بار آپ ﷺ نے کہا کہ یہ جو میرے مخالفین ہیں ان کا تم جواب دو۔ تو اس جواب میں یہ چیزیں تھوڑی شامل ہیں کہ آپ کا بال کیسا تھا، آپ کی آنکھ کیسی تھی۔ آپ کی آواز کیسی تھی۔ آپ کا لباس کیسا تھا۔ ان نکات پر اپنی توجہ مبذول نہ کی..... میں حضرت حسان بن ثابت اور عربی نعتیہ شاعری کے حوالے سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کے اوصاف عالیہ کو موضوع شاعری بنایا گیا ہے۔ اور یہ بات میں نے کہیں تھوڑی سی لکھی بھی ہے..... یہ تو معلوم ہی ہے کہ پورے پاکستان میں نعت گوئی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ اسی طرح نعت خوانی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جبکہ سب سے پہلے جسے اولیت ہم دیں گے وہ توحید اور قرآن کریم کو دیں گے۔ تو اس حوالے سے پوری عربی شاعری کا جب میں تجزیہ کرتا ہوں تو اس میں حمد ہے ہی نہیں..... یہ ایک زبردست قسم کا فقدان ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد اسماعیل صبری انیسویں صدی کا جدید شاعر ہے اس نے کئی حمد یہ نظمیں کہی ہیں۔ کچھ شعراء کے یہاں حمد ملتی ہیں۔ لیکن یہ کہ باقاعدہ موضوع بنایا گیا ہو۔ پورے پورے حمد یہ مجموعے ہوں اس کا فقدان ہے۔ اردو میں بھی حمد یہ شاعری

سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اسماعیل میرٹھی اور حالی کا تتبع کیا جاتا تو یہ سلسلہ توحید چل پڑتا۔
عزیز احسن: لیکن اب ہمارے ہاں حمدیہ مجموعے آرہے ہیں۔

اصلاحی: اللہ کرے کہ ایسا ہو! اللہ کرے کہ ایسا ہو!..... اچھا تھوڑی سی گفتگو میں کرنے
جار ہا ہوں لیکن اسے مسلکیت سے نہ جوڑیں..... میرے لیے سحر انصاری صاحب نے بہت پہلے ایک
لفظ استعمال کیا تھا..... ان کو یاد نہیں ہوگا۔ میں آج یاد دلا دیتا ہوں۔ پندرہ بیس سال پہلے آیا تھا
..... اس وقت شعبہ اردو میں تھے آپ [سحر انصاری]۔ میری تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی آپ کے
کمرے میں۔ وہاں سے ہم جب نکلے تو پروفیسر ظفر اقبال صاحب نے بتایا تھا کہ آپ نے میرے
بارے میں کہا تھا کہ بہت ہی rationalist ہیں..... پر حقیقت تو ہے کہ میں کسی مسلک کو نہیں مانتا
ہوں۔ میرا مسلک اسلام ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اردو شعرا دو سو ڈھائی سو سالہ
عربی شاعری کو بنیاد بنائیں۔ کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا معتبر اور مستند قسم کا چہرہ متاثر ہو رہا ہے
..... بہت سی اردو نعتیہ شاعری پڑھتا ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ بخدا تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ
شاعری اگر ہمارے پیش نظر ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کی طرف نہیں پہنچیں گے بلکہ اللہ کے رسول
ﷺ کی اساسی حیثیت کو جس طرح قرآن نے پیش کیا ہے وہ پیش نظر ہوگی اور جہاں تک کہ آپ
نے تنقید کے حوالے سے کہا ہے۔ عربوں میں تنقید اردو سے پہلے آئی ہے..... رسالت سے قبل
عرب کے ادبی میلوں (اسواق العرب) میں تنقید کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ سوق عکاظ کی ادبی اور تنقیدی
روایات کی داستان ”مصادر الشعر الجاہلی“ میں بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ خود اسواق پر کافی لکھا جا چکا
ہے۔ عہد جدید میں بھی عربوں کو ہم پر اولیت حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ فرنج سے واقف ہیں۔ جیسے
ہندوستان میں ہم ہندی جانتے ہیں اسی طریقے سے ہر عرب جو پڑھا لکھا اور ناقد ہے وہ فرنج ضرور
جانتا ہے۔ انگریزی بھی وہ سب جانتے ہیں۔ تو مغرب سے وہ بہت پہلے متاثر ہوئے اور ہم سے پہلے
واقف ہوئے۔ لیکن جہاں تک نعت کا حوالہ ہے۔ نعت کے حوالے سے مجھے اب تک کوئی ایسی چیز
نہیں ملتی کہ اردو میں جس طریقے سے نعتیہ تنقید آئی ہے کہ نعت کو کیسا ہونا چاہیے، اس کے مضامین
کیسے ہوں اس کی ہیئت کیا ہو، اس کی زبان کیا ہو..... میں سمجھتا ہوں کہ عربی نعت گوئی کے حوالے
سے جو عربی تنقید ہے وہ اردو کے مقابلے میں بہت طفلانہ ہے۔ لیکن جہاں تک صرف عمومی تنقید کا ذکر
ہے۔ تو وہ ہم سے بہت آگے ہیں لیکن نعتیہ تنقید کے تناظر میں ان کے یہاں کوئی کام نہیں ہوا ہے۔
عزیز احسن: سحر انصاری صاحب! آپ بتائیے یہ جو فرما رہے ہیں کہ عرب فرنج سے زیادہ

خدا کا حبیب وہ خدا کا رسول
جو کوئی نہیں سنا ہے محمد کی بات
خدا کا حبیب وہ کہا ہے سو کرنا قبول
قیامت میں چاہے گاحسرت کے ہات
ایاغی کی مثنوی نجات نامہ دکنی مثنویوں میں اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کے نعتیہ اشعار میں
پند و وعظ کا رنگ غالب ہے۔ اس مثنوی کا موضوع احوال قیامت کا بیان فرائض کی پابندی اور امر کی
ادائیگی اور نواہی سے اجتناب کی تلقین ہے۔ ایاغی پر واعظانہ رنگ اس قدر چھایا ہوا ہے کہ اس نے
نعتیہ اشعار میں بھی امر بالمعروف اور انہی عن المنکر کا درس دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دنیا کی بڑائی نہ کام آئے گی
دنیا کے بدل دین توں کھونکو
دغل باز دنیا نکل جائے گی
مرے گا تو بچ، دوزخی ہونکو
اگر دین ہوتا تو دنیا کون چھوڑ
دغل باز عیار تھے موں مروع ۲۱

شاہ معظم علی عادل شاہ ثانی کے دور کے صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ھ - ۱۰۹۷ھ) کا دور بھی دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے عادل شاہی سلطنت نے آخری ہچکی لی۔ شاہ معظم بیجاپور کے مشہور صوفی سید شاہ امین الدین اعلیٰ کے خلیفہ شاہ قادر نگا کوتال کے مرید و مجاز تھے۔ دیوان غزلیات کے علاوہ معظم سے متعدد نظمیں اور مثنویاں یادگار ہیں، جیسے گفتار عقل و عشق، معراج نامہ ساقی نامہ، مفتاح الاسرار، گلزار چشت اور شجرة الاتقیا وغیرہ۔ معظم کی تقریباً تمام مثنویوں میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں۔ ذیل میں معراج نامہ کے کچھ نعتیہ اشعار درج کیے گئے ہیں جو ۱۰۷۰ھ کی تصنیف ہے۔

مبارک نول ناؤں تیرا نبی
عرش پر تو ہے تیرا ناؤں احد
سماں کے اپر تجھ کوں احمد کتے
سو محمود کہتے ہیں تحت الشری
سیادت کیرانج دیا ہے خطاب
دیارب چھترج کوں لولاک کا
بلاتا ہے پیلوں سوں تجھ کوں ربی
لیکن کوانا توں آپس عبد
زمین پر تجھے سب محمد کتے
ترا وصف دستا وراء الورا
اولوالعزم ہو رشاہ عالی جناب
عطا تج کیا تحت افلاک کا ۲۲

یہ امر نہایت دلچسپ ہے کہ معظم نے مثنوی شجرة الاتقیا اور مثنوی مفتاح الاسرار کے نعتیہ اشعار میں بھی انہی مضامین کی تکرار کی ہے۔

محمد مختار بیجاپور کے آخری دور کا شاعر تھا۔ وہ حضرت گیسو دراز کے خانوادے کے ایک بزرگ

سید محمد حسینی عرف شاہ حضرت کا مرید تھا۔ مختار نے تین مذہبی مثنویاں لکھیں جن کے نام یہ ہیں:

(i) معراج نامہ۔ (ii) نور نامہ۔ (iii) مولود نامہ

مثنوی معراج نامہ ۱۰۹۴ھ میں لکھی گئی۔ یہ تقریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ مختار کی مثنویوں میں حمد و مناجات اور نعت و مناقب کے سوا دوسروں کی مدح نہیں ملتی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی بادشاہ سے متعلق نہیں تھا۔ مختار کی زبان صاف اور عام فہم ہے۔ اس کی مثنوی معراج نامہ کے چند اشعار دیکھیے جن میں اس نے اسم محمد کے چاروں حرفوں کی وضاحت نہایت دلچسپ انداز میں کی ہے۔

عجب دیکھ محبوب ہے بے بدل	محمد شہ انبیا از ازل
اسے چار حرفاں کا ہے ناؤں آج	رکھے اس کوں لولاک کا سر پوتا ج
سو ہر حرف کا میں کہوں یوں بیاں	کہ ہے میم محبوبیت کا نشان
سوح کی دلالت حمایت پر	حمایت کی ساری شفاعت پر
سو میم دیگر سب مدد کی خبر	قیامت میں دیتا ہے امت پر
کہوں دال ہے وہ نشان دوا	جو ہے دردِ عصیان کا وہ شفا

عادل شاہی سلطنت کے زوال کے بعد گوگی علاقہ سگر (کرناٹک) کے ایک صوفی شاعر قاضی محمد بحری نے ۱۱۱۲ھ میں ”من لکن“ کے نام سے ایک عارفانہ مثنوی لکھی جسے تصوف کے حلقوں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں حمد و توحید کے بعد نعتیہ باب ”در نعت خواجہ کائنات محمد“ ہے۔ اس باب کا آغاز بحری نے بڑے دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ وہ قلم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں اے قلم اٹھ اس گھڑی گھر نہ جائیں بلکہ تھوڑی دیر ”نعت نگر“ کی سیر کر آئیں۔

اٹھ اے قلم اس گھڑی گھر نہ جائیں نکت نعت کا سیر کر آئیں

لیکن اچانک انہیں اپنی بے بضاعتی کا خیال آتا ہے کہ نعت کہاں اور میں ناداں کہاں؟ اگر میں نادان نہ ہوتا تو ایسے مشکل کام میں ہاتھ ڈال کر خوش نہ ہوتا۔

پن نعت کہاں کہاں یو ناداں ناداں جو نہیں تو کیو ہے شاداں

آگے کہتے ہیں کہ مجھ سا بے علم راز کی باتیں کہنا چاہتا ہے، گویا کہ قلم میں آفتاب کو قید کرنا چاہتا ہے۔ ایک معمولی سی چیونٹی ساتویں آسمان تک کیوں کر چڑھ سکتی ہے یا پتے پر بیٹھ کر سمندر کیسے پار کر سکتی ہے؟

یعنی مگے بولنے کوں یو بھید کرنے کوں قلم میں قید خورشید

کیو چیونٹی سات چرخ چڑ جائے یا مار سمہ میں پات پر جائے
اپنی بے علمی کے اظہار کے بعد وہ پھر قلم سے کہتے ہیں کہ معذرت کے راستے میں اٹک کر مت
رہ بلکہ عذرو حیلے چھوڑ کر صاف نعت کی پناہ میں آجا۔

اب رہ نگو معذرت کی راہ میں آنعت کے ناتھ کی پنہ میں
آنحضرت کی اولیت کے اظہار میں وہ حروف تہجی سے کنایہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ”آپ عین
ہیں۔“ اس ”عین“ (حقیقت محمدی) سے سارے حروف ابجد (یعنی کائنات) کی تخلیق ہوئی۔ اس عین
نے عالم شہادت میں اپنا جلوہ دکھانے کے لیے اسلام کے علم کو ظاہر کیا اور اپنے ہاتھ میں شرع کی
شمشیر لے کر ساری دنیا کو دین کی دعوت دی۔

او عین جو ابجد اس کوں فرزند سیوٹ کوں اپس دکھاو نے چھند
تختی پوشہادتی ہو اظہار اسلام کے علم کوں کیا بار
شمشیر لے شرع کا پس ہت یکبار کیا جگت کوں دعوت
من لگن میں بحر کی نے ”در صفت معراج مبارک“ کا علاحدہ باب رکھا ہے۔ اس میں انہوں
نے واقعہ معراج کے اسرار و غوامض بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور کی معراج جسمانی تھی۔
انہوں نے معراج جسمانی کے لیے ایک نادر تشبیہ تلاش کی ہے کہ آپ جسم اطہر کے ساتھ سات
آسمانوں میں سے یوں گزر گئے جیسے سوئی گودڑی کی سات تہوں میں سے نکل جاتی ہے۔

معراج کیا اسی بدن سات اما او بدن بدل ہے من سات
یوں پھوڑ گیا گنگن سواو دھن جوں گودڑی سات تہہ کی سوزن
ساتویں آسمان سے آگے آنے کے بعد آپ نے اپنی سواری کو لامکاں کے میدان میں آگے

بڑھایا۔

اٹ واں لے ترنگ کوں بھکیلیا میداں میں لا مکاں کے ٹھیلیا
آگے بڑھنے سے قبل آپ نے تن، قلب، روح اور نور کو جو کثرت کے مظہر ہیں، اسی مقام پر
چھوڑ دیا۔ اس کے بعد مقام نور اور منزہ و لطیف آن میں پہنچے۔

یو دیہہ یو دل، یو جیو، یو جیوت کثرت کے شریک، شرک کے کوت
اس چار کوں چھوڑ اگے دیا چل تو تھان ہے نوری آن نزل
اس مقام کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس مقام پر نہ ”ان“ تھانہ ”گن“ تھا۔ نہ

معرفت ہے نہ انا ہے نہ صفت ہے۔

جس آن منے نہ ان تھانہ ان تھا نہ گیان نہ گرب تھا نہ گن تھا ۲۳

واقعہ یہ ہے کہ بحری نے من لگن کے نعتیہ اشعار کو تصوف و معرفت کے حقائق و بصائر کا آئینہ

بنادیا ہے۔

بہمنی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کے مختلف صوبیداروں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اپنی سلطنتیں قائم کر لیں۔ چناں چہ تلنگانہ کے صوبیدار محمد قلی قطب الملک نے بھی ۹۲۴ھ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کیا اور گولکنڈہ میں قطب شاہی سلطنت کی نیورکھی۔ قطب شاہی خاندان میں آٹھ حکمران ہوئے جنہوں نے ۹۲۴ھ/۱۵۱۸ء سے ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء تک کوئی پونے دو سو سال گولکنڈے کی سلطنت پر حکمرانی کی۔ ان میں سے اکثر حکمران نہایت بلند حوصلہ علم پرور اور فنون لطیفہ کے والہ و شیدا تھے۔ انہوں نے نہایت فیاضی اور سیر چشمی سے ارباب کمال شعراء اور ادیبوں کی قدر دانی کی۔ قطب شاہی دور میں گولکنڈہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ فیروز، محمود اور ملا خیاتی وغیرہ گولکنڈہ کے اولین شعراء ہیں۔ ذیل میں دبستان گولکنڈہ کی اہم مثنویوں میں نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا جائے گا۔

شیخ احمد گجراتی کی مثنوی یوسف زلیخا دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ہے۔ احمد سلطنت محمد قلی قطب شاہ نے ایک خاص نوازش نامہ لکھ کر گجرات سے گولکنڈہ آنے کی دعوت دی تھی۔ یہاں آنے کے بعد اس نے یوسف زلیخا لکھی۔ محققین کا خیال ہے کہ اس نے یہ مثنوی ۹۹۹ھ/۱۰۸۰ء اور ۹۹۷ھ/۱۰۷۸ء کے درمیان تصنیف کی۔ یوسف زلیخا کے علاوہ اس کی ایک اور مثنوی لیلیٰ مجنوں کا بھی پتہ چلا ہے۔ یوسف زلیخا میں احمد گجراتی نے مثنوی کی روایتی ہیئت کے مطابق حمد و مناجات، نعت ذکر معراج منقبت اور مدح کے ابواب ہیں۔ ”نعت سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرخی کے تحت احمد نے ۴۲ نعتیہ اشعار لکھے ہیں جن میں اس نے حضور کے فضائل و مراتب کی رفعت اور آپ کے اوصاف جمیلہ کا ذکر کیا ہے۔“

رسولان ، انبیاں کا شاہ ہے وہ

محمد جو رسول اللہ ہے وہ

چلے فرمان سارے جگ پر اس کا

وہ ہے راجادہوں جگ لشکر اس کا

آگے وہ آپ کے استغنا کی توصیف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آپ کی نظر میں دنیا کی حیثیت ایک تل سے بھی کم تھی۔ آپ اپنے دل سے کوئی بات نہ کہتے جو فرماتے وحی سے فرماتے۔ آپ کا فرمایا

گویا خدا کا فرمایا ہے۔ خدا سے الگ آپ کوئی بات نہیں فرماتے تھے۔ احمد نے وما ينطق عن الهوىٰ کی ترجمانی کی ہے۔

جگت اس دشت قلم ایک قلم تھے نہ بولے وحی بن یک بات دل تھے
 کھیا سو ہے جے کچ کھیار خدا سو نہ بولے کچ خدا تھے وہ جدا ہو
 احمد گجراتی نے ”صفت شب معراج رسول“ کی سرخی کے تحت [۷۰] اشعار لکھے ہیں جن میں
 معراج کے مختلف مراحل، لوح و قلم کی سیر اور اس سے آگے کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ
 جناب رسالت مآب نے مغرب و مشرق کے تعینات سے گزر کر لوح و قلم کا مشاہدہ فرمایا۔ وہاں سے
 عرش سے پرے پہنچے تو وہاں آگے پیچھے کوئی دوسرا تھا ہی نہیں۔ اس جگہ دنیا کا کوئی نشان نہیں تھا۔ وہ
 مقام اشارے اور مقام سے بری تھا۔ وہاں نہ مکاں ہے نہ آٹھ جہتیں ہیں۔ وہاں جو کچھ تھا فکر اور
 اندیشے سے وراء تھا۔

جو گئے از عرب مشرق ہو گزر کر سٹے لوح و قلم پر بھی نظر کر
 وہاں تھے عرش جب پیلاڑ لانگے نہ دوجا کوئی واں پیچھے نہ آگے
 نہ کچ اس ٹھاؤں عالم کی نشانی اشارت ہوا نشان اس تھے برانی
 نہ ٹھاؤں ہے وہاں نااشت دک ہے جکچ ہے فکر اندیشے تھے ادک ہے
 اسراء و معراج کے تمام مشاہدات کے بعد جب آپ کا شانہ ثبوت واپس لوٹے تو ہنوز بستر
 مبارک گرم تھا۔

پچھانا گرم اچھے لگ پھر کر آیا قدم امرت سوں دھرتی کون جیوایا ۲۴
 دبستان گولکنڈہ کی دوسری مثنوی سلطان محمد قلی قطب شاہ کے ملک الشعراء ملا وجہی کی تصنیف
 ”قطب مشتری“ ہے۔ یہ گولکنڈہ کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۱۸ھ/۱۶۰۹ء ہے۔
 وجہی نے شہزادہ قطب اور بنگال کی شہزادی مشتری کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ حمد اور مناجات
 کے بعد نعت کا عنوان ہے جس کے تحت [۲۶] اشعار ہیں۔ وجہی کی زبان نسبتاً صاف ہے اس کے
 اشعار آسانی سے سمجھ میں آتے ہیں۔

محمد نبی تانوں تیرا اہے عرش کے اپر چھانو تیرا اہے
 کہ چودہ ملک کا تو سلطان ہے علی ساتیرے گھر میں پردھان ہے
 اسی ہو ریک لک پیغمبر آئے ولے مرتبہ کوئی تیرا نہ پائے

مچھپا نور سب کا ترے نورانگے کہ جیوں تارے چھپتے اہے سورانگے
ان اشعار کے بعد وجہی کہتا ہے کہ اے نبیؐ جب سے آپؐ کا دین ظاہر ہوا دنیا میں کفر زیر و زبر
ہو گیا۔ محبت، مروت، وفا، حلم، علم اور عمل جیسے اوصاف دنیا میں نہیں تھے۔ آپؐ کے تشریف لانے کے
بعد یہ اوصاف ہویدا ہوئے۔ وہ استفہامی انداز میں کہتا ہے کہ اتنی اچھی تصنیف کسی ذات میں نہیں،
پھر خود ہی جواب دیتا ہے اس ذات میں جس میں غضب اور غصہ نام کو نہیں یعنی ذات رسالتؐ:

ترا دین جس دن سے پرگٹ ہوا	سو اس دین نے سب کو تلپٹ ہوا
محبت، مروت، وفا ہو ر حلم	حلیسی، سلیسی، عمل ہو ر علم
توں پیدا ہوا یوں ہویدا ہوئے	اول یو نہ تھے تج نے پیدا ہوئے
یتیاں خصلتاں خوب ہے کس منے	غضب ہو ر غصہ نہیں جس منے ۲۵

”ذکر معراج“ کے باب میں وجہی نے معراج کی رات کی نورانیت اور زیب و زینت کا جمال
آفریں مرقع پیش کیا ہے۔ نبیؐ کے استقبال کی تیاری دیکھیے۔

صفت کر تو معراج کی رات کا	کہ جا گیا اہے بخت تج بات کا
اتھا اس دین کوں عجب کچہ نور	کہ لاکھل تے چاندل۔ کروڑاں تے سور
ملک زرگراں زر لے کر سور کا	لمع انبر کوں کیے نور کا
نبیؐ آتے ہیں کرنے جب یو بات	سنوارن لگے نو انبر دھات دھات ۲۶

دبستان گوکلنڈہ میں ملا وجہی کا خورد معاصر ملا غواصی تھا۔ وہ قطب شاہی خاندان کے ساتویں
فرمانروا سلطان عبداللہ قطب شاہ کا ملک الشعراء تھا۔ اس سے تین تصانیف یادگار ہیں۔ مثنوی سیف
الملوک و بدیع الجمال۔ طوطی نامہ اور مینا ستونتی۔ تینوں مثنویوں میں غواصی نے مثنوی کے اجزائے
ترکیبی کا لحاظ رکھا ہے۔ یعنی ہر مثنوی میں حمد، نعت اور منقبت موجود ہیں۔ پہلے ہم سیف الملوک و بدیع
الجمال (۱۰۳۵ھ) کے نعتیہ اشعار کا مطالعہ کرتے ہیں۔ غواصی کی زبان صاف ہے۔ اس میں
ہندوستانی بولیوں کے الفاظ کم سے کم ہیں۔ اس لیے اس کے اشعار عسیر الفہم نہیں ہیں۔

سچا توں محمد سچا مصطفیٰ	سچا ہے توں احمد سچا مرتضیٰ
توں طہ توں یسین تو بطحی	توں امی توں مکی توں مرسل صحیح
نہیں ہاشمی ہو ر قریشی رسول	جکج توں کہے سو کرے اب قبول
توں قائم توں حجت توں حافظ سچا	توں شافع توں سابق توں واعظ سچا

تقی ہوا سخی توں ولی ہوا خلیل
دیا تج نبی ناؤں رب جلیل ۲۷
مثنوی طوطی نامہ (۱۰۴۹ھ) میں غواصی نے حمد کے بعد کے عنوان سے [۲۴] ابیات لکھی ہیں۔
چند اشعار دیکھیے۔

رتن خاص دریائے لولاک کا جھلک لا مکاں نور افلاک کا
(آپ دریائے لولاک کے خاص رتن..... اور افلاک و لامکاں کے نور کی جھلک ہیں)
محمد نبی سید المرسلین سدا روشن اس تے ہے دنیا و دین
(محمد نبیوں کے سردار ہیں۔ آپ سے دین اور دنیا ہمیشہ روشن ہے)
عدم میں تے عالم کوں پروردگار اسی کے کیا نور سوں آشکار
(خدا نے آپ کے نور سے عالم کو نیستی سے ہستی میں لایا)

ہوئے ختم اس پر نبوت کے گن بجے طبل اس کا قیامت لگن ۲۸
(آپ پر نبوت کے اوصاف ختم ہو گئے۔ آپ کا طبل قیامت تک بجتا رہے گا)

غواصی کی تیسری مثنوی ”مینا ستونئی“ ہے۔ اس مثنوی کے مرتب ڈاکٹر غلام عمر خان کا خیال ہے کہ یہ مثنوی ”طوطی نامہ“ اور ”سیف الملوک“ سے قبل کی تصنیف ہے۔ ۲۹ اس مثنوی میں غواصی نے مثنوی کی عام ہیئت کی ساخت کے مطابق حمد، نعت، منقبت چار یار اور منقبت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور منقبت حضرت گیسو دراز رقم کی ہے۔ ”در حقیقت حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے:

الہی رکھیا توں بندیاں کی شرم نبی کوں دیا بھیج کینا کرم
منور کیا جس نے اسلام کوں شفاعت دیا خاص ہو عام کوں
شفیع او حشرات کے وقت کا او سلطان معراج کے تخت کا
آگے وہ آنحضرت کے اوصاف قناعت، صبر اور توکل کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:
روہی سرور عالم و شہر یار قناعت کیا جن اپر عین بار
صبر جس کے گھر کا کو آتا ہے داس پڑیا ہے توکل سو جس دار پاس
آخر میں وہ سرکار دو عالم سے اپنی فدائیت اور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:
تصدق ہمن سار کے کئی ہزار محمد کے نعلین پر بار بار
نا اچھتے ہمن کوں جو او مہر باں تو اچھتے ہمیں سب جہنم کے ٹھاں

ہزاراں ہمن پشت کے نیک نام محمد پو صدقہ ہیں سارے تمام
 احمد جنیدی قطب شاہی خاندان کے ساتویں حکمران سلطان عبداللہ قطب شاہ کے دور کا شاعر
 تھا۔ ۱۰۶۲ھ میں اس نے ”ماہ پیکر“ کے نام سے ایک عشقیہ مثنوی لکھی جس میں محمود غزنوی کے وزیر
 حسن میمنہ کی دختر ماہ اور ایک سوداگر زادے پیکر کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔ جنیدی بیجاپور کے
 شاعر ہاشمی کی طرح مہدوی فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ مثنوی ”ماہ پیکر“ میں اس نے عام رواج کے مطابق
 پہلے حمد لکھی ہے اس کے بعد نعت اور منقبت چار بار ہے۔ حمد کے آخری دو اشعار میں وہ دعا کرے
 ہے کہ ”مجھے محمد کی شفاعت نصیب ہو اور میری زبان پر سدا محمد کا نام رہے۔“

کہ منگنا دعا میں رین دین سب شفاعت محمد کی دے منج کوں رب
 کہ احمد جنیدی پہ کریوں کرم رہوے نانوں زباں پر محمد جرم
 حمد کے ان دعائیہ اشعار سے وہ نعت کے لیے گریز کا کام لیتا ہے۔ نعتیہ اشعار میں رسول اکرم
 کی توصیف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

الہی نپایا توں آخر زماں کہ ہے مصطفیٰ دو جہاں رہنماں
 محمد نبی تاج پیغمبر اس سپہ دین کے سرور سروراں
 دوسرا شعر بیجاپور کے شاعر ایانگی کی مثنوی ”نجات نامہ“ کی نعت میں بھی ہے۔ وہاں ”سپہ
 دین“ کے بجائے ”سپہ دار دیں“ کے الفاظ ہیں۔ ایانگی کی مثنوی بعد کی ہے۔ معلوم نہیں ایانگی کو توارف
 ہوا ہے یا اس نے جنیدی سے استفادہ کیا ہے۔

محمد نبی ہوا رسول خدا درود ہو اسلام اس پر برحق ہوا
 کہ کئی لاک معجزے کئی دھات کے اتھے اس کنے سب سو ہر بات کے
 اس کے بعد جنیدی نے آپ کا ایک معجزہ نقل کیا ہے کہ مشرکین کے کہنے پر آپ نے پتھر میں
 سے ایک درخت پیدا کیا جس کی ہر شاخ پر الگ الگ اقسام کے میوے لگے تھے۔ ہر شاخ پر الگ
 الگ پھول تھے اور ان شاخوں پر مختلف پرندے بیٹھے آپ کے رسول برحق ہونے کی گواہی دے رہے
 تھے۔ ظاہر ہے یہ ضعیف روایت ہے۔ سیرت کی معتبر کتابوں میں اس کا ذکر نہیں ملتا لیکن دکن کے
 شاعروں میں یہ روایت بہت مقبول تھی۔ گجرات کے ایک شاعر جنونی گجراتی نے بھی ۱۱۰۲ھ میں اس
 روایت کو ”قصیدہ معجزہ“ کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ جنونی کا قصیدہ چھیا سٹھ اشعار پر مشتمل ہے جبکہ
 جنیدی نے صرف اٹھارہ ابیات میں یہ واقعہ نظر کیا ہے۔

ابن نشاطی سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کا ایک اہم مثنوی نگار شاعر تھا۔ اس نے (۱۰۷۶ھ/۱۶۶۵ء) میں احمد حسن دبیر عیدروسی کی تصنیف بسا تین الانس کا دکنی میں منظوم ترجمہ کیا۔ اس نے اس مثنوی کا نام پھول بن رکھا۔ پھول بن ایک داستانی مثنوی ہے۔ اس میں ابن نشاطی نے حمد اور مناجات کے بعد نعت کا باب رکھا ہے۔ اس کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تری تعریف کا اونچا ہے پایا	خدا قرآن میں تجکو سرایا
نبی توں پاک تیرا پاک دیں ہے	سچا تو رحمت للعالمین ہے
اگر ہوتا نہ توں آدم نہ ہوتا	نہ آدم بلکہ یو عالم نہ ہوتا.....
شریعت کا سٹیا آواز جگ میں	طریقت کوں کیا توں تازہ جگ میں
حقیقت تجہ سوں ہے حق کا ہویدا	خدا کا معرفت تجہ سوں ہے پیدا ۳۲

قطب شاہی خاندان کا آخری حکمران ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء تا ۱۰۹۸ھ/۱۶۸۷ء) تھا۔ اس کے دور کا اہم مثنوی نگار شاعر طبعی تھا۔ طبعی شاہ راجو کا مرید اور تانا شاہ کا پیر بھائی تھا۔ اس نے ۱۰۸۱ھ/۱۶۷۰ء میں بہرام وگل اندام کے نام سے ایک مثنوی لکھی، جو نظامی کی فارسی مثنوی ہفت پیکر کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں ایران کے بادشاہ بہرام گور کی حکایات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثنوی بہرام وگل اندام میں طبعی نے حمد و مناجات کے بعد نعت لکھی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

محمد نبی توں خدا کا رسول	یو پیغمبراں باغ ہے توں سو پھول
خدا نے کیا تج کوں اپنا حبیب	یو منصب نہیں ہر کسی کو نصیب
سہاتا ہے مہر نبوت تجہ	یو دولت ہوا ہے عنایت تجہ
بنیاں جگ میں یک لاک اسی ہزار	یو سارے پیارے ہیں تو ہے سوار

آخر میں وہ اپنے گناہوں کا اقرار اور شفاعت کی درخواست کرتے ہوئے کہتا ہے:

ہوا ہے میرے ہات تے نئی گناہ

نہیں کوئی تج باج پشت و پناہ

کہ تیری شفاعت کا دھرتا امید	قیامت میں طبعی کوں کر روسفید ۳۳
-----------------------------	---------------------------------

قطب شاہی خاندان کے آخری فرمان روا سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۳-۱۰۹۸ھ/۱۶۷۲-۱۶۸۷ء) کے عہد کا ایک قابل ذکر شاعر محبت یا محبی ہے جس نے ۱۰۸۸ھ میں ”معجزہ فاطمہ“ کے عنوان سے ۳۸۲ اشعار پر مشتمل ایک مختصر مثنوی لکھی، جس میں خاتون جنت کی ایک کرامت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ مشرکین مکہ کی عورتوں نے بی بی صاحبہؑ کو بہ طور آزمائش فرضی شادی میں مدعو کیا تو اللہ تعالیٰ نے

حضرت جبریلؑ کے ذریعہ آپ کیلئے بہشتی ملبوس اور زیور روانہ کیے۔ ظاہر ہے یہ ایک بے اصل روایت ہے لیکن اس دکن کے ایک اور شاعر فاروقی نے بھی نظم کیا ہے۔ محبی غالباً شاہ راجو کا مرید تھا۔ اس نے مثنوی کی عام ہیئت کے مطابق پہلے حمد و مناجات لکھی ہے، پھر ”در مدح حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم“ اور ”در صفت معراج حضرت نبی علیہ السلام“ کے ابواب ہیں۔ نعت کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

محمد نبی سید المرسلین	ہوا شرع اسلام تج نے میں
ترے نور تے خلق کو ایک بار	کیا جگ میں اظہار پروردگار
ترا نعت یسین و طہ کیا	کسی کو شرف حق بتائیں دیا.....
ہوا ختم تج تے نبوت تمام	نبیاں مقتدیاں سب تو ان کا امام ۳۴

آخر میں کہتا ہے کہ آپ کے اوصاف فضائل جو حق تعالیٰ جانتا ہے انہیں کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ آپ کی نعت کا حق ادا کرنا محال ہے۔

ترا وصف اور مدح حق پر عیاں
اے تیوں نہ کوئی کر سکے گا بیاں
ترا نعت ہے تیوں کنا ہے محال
کیا نعت تیری مری قدر حال

قطب شاہی دور کی آخری اہم مثنوی فائز کی ”رضوان شاہ و روح افزا“ ہے۔ فائز نے یہ مثنوی سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے عہد میں ۱۰۹۴ھ میں تصنیف کی۔ اس کے چار سال بعد اورنگ زیب کے ہاتھوں قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس مثنوی میں فائز نے چین کے بادشاہ رضوان شاہ اور روح افزا پری کے عشق کی داستان نظم کی ہے۔ مثنوی کا آغاز اس نے حسب قاعدہ حمد و نعت سے کیا ہے۔ نعت کے بعد سیدنا علیؑ کی منقبت ہے۔ غالباً فائز ملک اثنائے عشری کا پیرو تھا۔ فائز نے حمد کے آخری اشعار میں اس نے ”شفاعت“ کے حوالے سے نعت کی طرف گریز کیا ہے۔

بھروسہ عمل پر ہے گر ہے عمل	شفاعت کرے نہیں سو کیا ہے عمل
ہمارے نبی کا ہے پایہ رفیع	مقدم شفیعاں پوہے یو شفیع
شکر اس خدا کا جو خلقت کیا	ہمن کو محمد کی امت کیا

حمد کے بعد ”در نعت حضرت سید المرسلین محمد مصطفیٰ“ کی سرخی کے تحت اس نے نعت لکھی ہے۔ نعت میں اس نے حمد کے آخری نعتیہ اشعار کے تسلسل کو جاری کیا ہے۔

نبیاں جو سنے اس امت کا صفت	بر جا اپس کا قرب منزلت
کہے کاش ہوتے یو امت ہمیں	یوسن کر پکڑتے تھے ہمت ہمیں

آگے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مراتب رفیعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

ترا قدر سب انبیاء میں جلیل کئے بار چل کرتے ترے یاں جبرئیل

خدا کو ہے معلوم تیرا شرف تیری شان رتبے میں نہیں ہے حرف

آنحضرت کے شاہ اولین و آخرین ہونے کا ذکر کرتے ہوئے فائز لکھتا ہے

ترا نور بھیجا ہے سب سوں اول ہوا کیا جو آخر کوں آیا نکل

اگر تج کوں پیدا نہ کرتا قدیر تو آدم کی مائی نہ ہوتی خمیر ۳۵

عادل شاہی اور قطب شاہی دور کے آخر میں مغلوں کے حملے اور فتح دکن سے قبل ہی ان

سلطنتوں میں زوال کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ کسی بڑی اور بلند پایہ ادبی تخلیق کے لیے جس

طرح کے سماجی اور تہذیبی ماحول کی ضرورت ہوتی ہے وہ ختم ہو رہا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس دور میں

کوئی اہم ادبی مثنوی نہیں لکھی گئی۔ حکمرانوں کی کمزوری، انتشار اور مغلوں کے حملے کے خوف نے

ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ اس عہد میں بیجاپور اور گولکنڈہ میں مذہبی نظمیں اور مثنویاں کثرت

سے لکھی گئیں جن کا سلسلہ سقوط بیجاپور اور انقراض گولکنڈہ کے بعد بھی جاری رہا۔ اس دور کی مذہبی

مثنویوں میں معراج نامہ (سید بلاقی) مولود نامہ، وفات نامہ (عبداللطیف)، مولود نامہ (فتاحی)،

ہدایات ہندی، مفید الیقین (ضعیفی)، قصص الانبیاء (قدرتی)، قصہ ابو شحمہ (اولیاء)، قصہ ابو شحمہ

(امین)، قصہ حسینی (خواص)، جنگ نامہ محمد حنیف (سیوک)، محی الدین نامہ (شاہ افضل) اور ظفر نامہ

محمد حنیف (غلام علی خاں) وغیرہ۔ یہ ساری مثنویاں فقہی موضوعات یا مذہبی شخصیتوں سے متعلق تاریخی

یا نیم تاریخی واقعات پر مبنی ہیں۔ ادبی اعتبار سے ان کا شمار بڑے کارناموں میں نہیں ہوتا۔ چوں کہ یہ

مثنویاں مذہبی موضوعات پر ہیں اس لیے ان میں صنف نعت کا بہرہ اچھا خاصہ ہے، بلکہ ان میں بعض

مثنویاں بہ تمام و کمال نعت کے دائرے میں آتی ہیں جیسے معراج نامہ، مولود نامہ، شمائل نامہ اور وفات

نامہ وغیرہ۔

دکنی مثنویوں پر محض ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ دکن کے تقریباً

تمام مثنوی نگار شعرا نے اپنی مثنوی کا آغاز حمد و نعت سے کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

انہوں نے یہ صنف فارسی سے درآمد کی تھی اور اسے اس کے تمام فنی تقاضوں، ہیئت و معنوی روایات اور

اصول و لوازم کے ساتھ قبول کیا تھا۔ چوں کہ فارسی میں حمد و نعت اور منقبت وغیرہ سے مثنویوں کی ابتدا

کی جاتی تھی لہذا دکنی شعراء نے بھی حمد و نعت اور منقبت کو مثنوی کے اجزائے ترکیبی بنایا۔ اس طرح

دکنی مثنویوں میں حمد و نعت کی ایک طویل، مسلسل اور درخشاں روایت تشکیل پا گئی۔

دکنی مثنویوں میں نعتیہ شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ان کے موضوعات میں تنوع اور بوقلمونی کا احساس ہوتا ہے۔ ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس، آپ کے شامل، فضائل، محاسن، مراتب، کمالات، اوصاف حمیدہ، اخلاق جمیلہ اور امتیازات عالیہ ایک بحر بے کراں ہیں۔ ہر مثنوی نگار نے بقدر ہمت اس بحر کی شناوری کر کے حضور اکرم کے نعوت و محامد کے کچھ درہائے آبدار نکالے اور انہیں اپنی نعت کے دامن میں سجایا۔ دکنی مثنویوں میں آنحضرت کے شرف و تقدم کے بیان کے علاوہ کہیں آپ کے اخلاق و معجزات کا ذکر ملتا ہے تو کہیں سیرت طیبہ کے بعض خاص واقعات کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ کہیں عالمانہ انداز ہے تو کہیں صوفیانہ رنگ، کسی مثنوی میں روایات ملتی ہیں تو کسی میں شاعر اپنی عقیدت اور فدائیت کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ دکن کی ابتدائی دور کی مثنویوں جیسے کدم راؤ، پدم راؤ اور نوسر ہار وغیرہ میں شہنشاہ کونین کے لیے سنسکرت القاب مثلاً سائیں اور گوسائیں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کا چلن بڑھتا جاتا ہے۔ دکنی مثنویوں کی نعت میں شعراء نے قرآن مجید کی آیات مقدسہ سے بھی استفادہ کیا ہے اور اپنے اشعار میں ان آیات کے ٹکڑوں کو استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے عربی کے نعتیہ قصائد کے خوان سے بھی ذلہ ربائی کی اور..... فارسی کے گلستان نعت سے بھی اپنے وجدان فن کو عطر بیز کیا۔

دکن کے بعض مثنوی نگاروں نے حمد و نعت کے بعد ”صفتِ معراج“ کے لیے بھی ایک علیحدہ باب مختص کیا ہے، جیسے خاور نامہ (رتھی)، قطب مشتری (وجہی)، یوسف زلیخا (احمد گجراتی)، علی نامہ (نصرتی) وغیرہ۔ بعض مثنویوں میں نعت نہایت مختصر ہے، جیسے نصرتی کی مثنوی ”تاریخ اسکندری“ میں پہلے شعر کا پہلا مصرع حمد یہ اور دوسرا مصرع نعتیہ کہہ کر اصل مثنوی کا آغاز کیا گیا ہے۔ حسن شوقی کی مثنوی فتح نامہ نظام شاہ میں نعت کے صرف دو شعر ہیں۔ اس کی دوسری مثنوی میزبانی نامہ میں نعتیہ اشعار نہیں ہیں۔ تاہم بہ استثنائے چند دکنی کی بیشتر مثنویوں میں خواہ وہ فقہی ہوں یا متصوفانہ یا بزمیہ، نعت لکھنے کا التزام نظر آتا ہے۔

دکنی مثنوی نگاروں نے نعت گوئی میں اپنی ہنرمندی اور فنی شعور کا ایک نمونہ یہ بھی پیش کیا ہے کہ مثنوی کے موضوع اور مزاج سے میل کھاتی ہوئی حمد بھی لکھی ہے اور اسی سے ہم آہنگ نعت بھی کہی ہے۔ مثلاً نصرتی کی مثنوی علی نامہ کا موضوع رزمیہ ہے اسی لیے اس نے مثنوی کے حمدیہ اشعار میں بھی رزم کا پہلو رکھا ہے اور نعت میں بھی رزمیہ عناصر شامل کیے ہیں۔ اسی طرح غواصی کی مثنوی طوطی نامہ

میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں جو انسانی کردار کی خامیوں اور کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے پیش نظر غواصی نے مثنوی کی حمد و نعت میں اللہ اور اس کے حبیب کے وصف ستاری، عیب پوشی، غفاری اور کریمی کا ذکر کیا ہے۔

ایات کی مثنوی نجات نامہ میں دین اسلام کے فرائض و احکام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کے نعتیہ اشعار میں اعمال صالحہ اور سنت رسول کی اتباع پر زور دیا گیا ہے۔ قریشی کی مثنوی بھوگ بل جنیات جیسے نازک موضوع پر ہے لیکن اس کے حمدیہ و نعتیہ اشعار میں بھی اس نے بڑے ہی عالمانہ انداز میں اور نہایت نفاست کے ساتھ موضوع سے ہم آہنگی پیدا کی ہے۔

دکنی مثنویوں کے نعتیہ اشعار سے ان شعراء کے عشق رسول اور آنحضرت کی ذات گرامی سے ان کی والہانہ عقیدت و شیفنگی کا اظہار ہوتا ہے۔ دکنی شعراء نے اپنی نعتیہ شاعری کے ذریعہ اردو میں نعت گوئی کے رواج کو عام کرنے میں اہم حصہ لیا۔ مثنویوں کے نعتیہ اشعار سے دیگر شعراء کو نعت کہنے کی تحریک ملی، جس کے نتیجہ میں دیگر اصنافِ سخن مثلاً غزل اور رباعی وغیرہ میں بھی نعتیہ مضامین کی شمولیت ہونے لگی۔ دکنی مثنویوں میں شعراء نے نعتیہ شاعری میں اتنے جہت اور امکانات روشن کیے کہ ان کے اقران و اعتاب کے لیے ان کی روشنی میں نعتیہ شاعری میں نئے رنگ چمکانے پہلو اور نئے اسالیب ایجاد کرنا آسان ہو گیا۔ حاصل کلام یہ کہ دکنی مثنویوں کی نعتیہ شاعری نے اردو میں نعت گوئی کی روایت کے نشو و نما، ارتقا اور اس کے فروغ و استحکام میں اساسی کردار انجام دیا۔



مصادر و منابع

- ۱۔ فخر دین نظامی، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، مرتبہ: ڈاکٹر جمیل جالبی، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۱۶
- ۲۔ مولوی عبدالحق، قدیم اردو کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸
- ۳۔ ایضاً
- ۴۔ افسر صدیقی امر و ہوی، مخطوطات، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۶۵
- ۵۔ اشرف بیابانی، مثنوی نو سر ہار (قلمی) مخطوطہ [۱] فخر و نہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد، ص ۵-۴
- ۶۔ مولوی عبدالحق، اردو زبان و ادب، مرتبہ: ابن فرید علی گڑھ، سنہ ندارد، ص ۶۴
- ۷۔ قریشی، مثنوی بھوگ بل (قلمی) مخطوطہ Illustrations مخزنہ سالار جنگ میوزیم حیدر آباد، ص ۳-۲
- ۸۔ شاہ برہان الدین جانم، مثنوی ارشاد نامہ، مرتبہ: اکبر الدین صدیقی، شمولہ قدیم اردو حیدر آباد، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۲-۱۳۱
- ۹۔ ایضاً

- ۱۰۔ عبدل بیجاپور، مثنوی ابراہیم نامہ، مرتبہ: پروفیسر مسعود حسین خان، بنگلور ۱۹۹۹ء، مقدمہ، ص ۱۸ اور ۵۳
- ۱۱۔ مقیمی، مثنوی چندر بدن و مہیار، مرتبہ: محمد اکبر الدین صدیقی، حیدرآباد، ۱۹۵۶ء، ص ۷۹
- ۱۲۔ عاجز، مثنوی لیلیٰ مجنوں، مرتبہ: پروفیسر غلام عمر خان، حیدرآباد، ۱۹۶۷ء، ص ۵۴
- ۱۳۔ صنعتی، مثنوی قصہ بے نظیر، مرتبہ: پروفیسر عبدالقادر سروری، حیدرآباد، ۱۳۵۷ء، ص ۷-۹
- ۱۴۔ صنعتی، مثنوی گلستہ، مرتبہ: پروفیسر سید جعفر حیدرآباد، ۲۰۰۳ء، ص ۷۲
- ۱۵۔ ملک خوشنود، مثنوی ”جنت سنگھار“، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۲ اور ۲۶۴
- ۱۶۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اول، ص ۲۶۶
- ۱۷۔ رستمی، مثنوی، خاور نامہ، مرتبہ: شیخ چاند ابن حسین، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۳-۱۲
- ۱۸۔ نصرتی، مثنوی گلشن عشق، مرتبہ: سید محمد، حیدرآباد، ص ۱۱۳ اور ۱۶
- ۱۹۔ نصرتی، مثنوی علی نامہ، مرتبہ: پروفیسر عبدالجید صدیقی، حیدرآباد ۱۹۵۹ء، ص ۱۱-۱۰
- ۲۰۔ ہاشمی، مثنوی، یوسف زلیخا (قلمی)، مخطوطہ نمبر ب۔ مذہبی قصے (۲۰) مخزنہ سالار جنگ میوزیم، ص ۱۹-۱۶
- ۲۱۔ ایاضی، مثنوی نجات نامہ، مرتبہ: پروفیسر محمد علی اثر، مشمولہ دکنی کی تین مثنویاں، حیدرآباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۹-۳۸
- ۲۲۔ ڈاکٹر حسینی شاہد، شاہ معظم، حیدرآباد، ۱۹۷۸ء، ص ۶۸-۶۷
- ۲۳۔ بحرّی، مثنوی، من لگن، مرتبہ: سخاوت مرزا، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۱۱
- ۲۴۔ احمد گجراتی، مثنوی یوسف زلیخا مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر، حیدرآباد، ۱۹۸۳ء، ص ۲۱۰-۲۰۹
- ۲۵۔ وجہی، مثنوی قطب مشتری، مرتبہ: ڈاکٹر حمیرہ جلیلی، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۱۱-۱۱۰
- ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۲
- ۲۷۔ غواصی، مثنوی سیف الملوک و بدیع الجبال، مرتبہ: میر سعادت علی رضوی، حیدرآباد، ۱۳۵۷ء، ص ۴
- ۲۸۔ غواصی، مثنوی طوطی نامہ مرتبہ: میر سعادت علی رضوی، حیدرآباد، ۱۳۵۷ء، ص ۴
- ۲۹۔ غواصی، مثنوی میناستونقی، مرتبہ: ڈاکٹر غلام عمر خاں، مشمولہ قدیم اردو حیدرآباد، ۱۹۶۵ء، مقدمہ ص ۱۲
- ۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱-۲۰
- ۳۱۔ جنیدی، مثنوی ماہ پیکر مرتبہ: پروفیسر سیدہ جعفر مشمولہ قدیم اردو حیدرآباد ۱۹۸۶ء، ص ۸۰
- ۳۲۔ ابن نشاطی، مثنوی پھول بن، مرتبہ: پروفیسر عبدالقادر سروری، حیدرآباد ۱۳۵۷ء، ص ۸-۷
- ۳۳۔ طبعی، مثنوی بہرام و گل اندام، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۰
- ۳۴۔ محبی، مثنوی معجزہ فاطمہ، مرتبہ: ڈاکٹر ابوالنصر خالدی، مشمولہ دکنی کلام اور اسلامی تہذیب، حیدرآباد ۲۰۰۴ء، ص ۹۰
- ۳۵۔ فائز، مثنوی رضوان شاہ و روح افزا، مرتبہ: سید محمد حیدرآباد ۱۹۵۶ء، ص ۶-۵

اردو نعت میں انوارِ قرآن

ABSTRACT:

Poetics of Islamic literature is based on the divine word of Almighty Allah, saved in Qur'an. All Naatia literature, therefore, carries (or should carry) thought content, theme and text of poetry derived from Qur'an. The article hereunder comprises of some details of text and theme reflected in couplets of Urdu Naat containing fragrance and enlighten from the Verses of Quran-e-Kareem. Poets tried their best to learn beauty of expression, capturing reality and facts from Qur'an to paint personality and life of Prophet Muhammad (S.A.W) in the canvas of their poetic work.

اظہارِ محبت کے بے شمار زاویے ہیں بلکہ سلیقے اور قرینے کی ایسی بوقلمونی ہے کہ ہر قلبی کشش، ہر فکر و خیال کی خواہش اور ہر جذبہٴ واحساس کی تابش قوسِ قزح کا جمال رکھتی ہے۔ عشق و محبت کی کیفیات جب گلستانِ دل کی نکبت بن کر پھیلتی ہیں تو ہر شام جہان کو رعنائیِ حسن سے نہال کرتی جاتی ہیں۔ ہر دل میں محبت بساتی جاتی ہیں۔ اس کی تہذیبی معنویت محبوب کی اداؤں پر فریفتہ کرتی جاتی ہے۔ گویا محبت کی ہر جہت میں ایک چاہت درخشاں ہوتی ہے۔ جس میں ایک ایسا نور ہوتا ہے جو قلب و نظر کو ضو بار کرتا ہے اور آرزو و جستجو کو زنگار کرتا ہے۔

ہم محبت کا یہ نور اصنافِ ادب میں چمکتا و مکتا پاتے ہیں۔ اس کے طرح طرح کے رنگ ڈھنگ چمنستانِ شعرو سخن کو بہار رکھتے ہیں۔ یہ کشش، یہ تڑپ اور حسن، نثر میں بھی ہے اور نظم میں بھی ہے مگر دل کی دنیا میں نظم، نثر سے زیادہ تجلیاتِ حسن سے معمور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی فطرت اس حسن کی تلاش میں رہتی ہے۔ یہی صداقت اور یہی حسن، ادیب، شاعر اور فنکار کی متاعِ عزیز ہے۔ ایک جواں مرگ رومانٹک (Romantic) شاعر جان کیش نے اس کی اہمیت واضح کی ہے:

Beauty is truth, truth's Beauty that's all,

All ye Know on the earth
And all ye need to Know.

”حسن ہی صداقت ہے، صداقت ہی حسن ہے
یہی حقیقت ہے کہ کائنات میں تم سب اسے جانتے ہو اور تم سب کو یہ معلوم
ہونا چاہیے۔“

یہ پیغام حسن و صداقت ایک ایسا جمالیاتی رنگ رکھتا ہے، جس سے اصنافِ سخن خاص طور پر
لبریز ہیں۔ البتہ اس رنگ میں بعض اوقات صداقت غائب ہو جاتی ہے اور دنیا داری، ہوس پرستی یا
خواہشاتِ نفسانی ابھر آتی ہیں۔ محبوب کے وصل کی جذباتیت، ہجرو بے اعتنائی کی خاصیت اور غیر
فطری بہیمیت پھیل جاتی ہے۔ ایسی بہت سی خواہشیں نظم، مثنوی اور غزل میں پائی جاتی ہیں۔ تاریخ
ادب کا مطالعہ کریں تو متقدمین سے لے کر متاخرین تک یہ خرمستیاں موجود ہیں۔ مشتبہ از خروارے
اشارے کرتا ہوں۔ اختر شیرانی کی منظومات دیکھیے:

”سنا ہے میری سلمیٰ رات کو آئے گی وادی میں“

اسی طرح میر حسن کی مثنوی ”سحر البیان“ میں بدر منیر کی جذباتی ملاقاتیں۔

یا غزل کی ایک زمانے کی لکھنوی روش پر غور کیجیے۔ ان تخلیقات میں شعراء کی گمراہی سے
لبریز کیفیات کی سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سامنے آ جاتی ہے۔

”اور رہے شعرا تو چلا کرتے ہیں ان کے پیچھے بہکے ہوئے لوگ، کیا نہیں

دیکھتے ہو تم، کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور بلاشبہ وہ کہتے ہیں ایسی

باتیں جو کرتے نہیں۔“ (الشعراء: ۲۲۵-۲۲۶)

دراصل عشق و محبت کے یہ اظہار یہ، اسلامی تعلیمات کی روح سے خالی ہیں بلکہ اسلامی ادب
نے ایسے خیالات و جذبات کو انسانی سرشت کی اخلاقی اقدار کے منافی قرار دیا ہے۔ انہیں عریانی اور
نادانی کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس اس عشق کی ستائش کی جاتی ہے جو حقیقت
الحقائق کا پسندیدہ ہو، پاکیزہ اور روح پییدہ ہو جو سفلے خواہشات اور خود غرضی کی حدود کا مظہر نہ ہو۔

اس سلسلہ میں گلستانِ اصنافِ سخن میں ہمیں وہ درخشندہ و تابندہ صنف ملتی ہے، جس میں قرآنی
تجلیات، روحانی روایات اور جاودانی برکات ہیں۔ جسے ”صنفِ نعت“ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں
حقیقی محبت، قلبی عقیدت اور لاثانی مودت کے لؤلؤ لالا چمکتے دکتے ہیں۔ اس میں دل کی دھڑکن، فکر

کا درپن اور خیال کا جو بن ہے۔ جو کلید جنت ہے، عروسِ رحمت ہے، باعثِ شفاعت ہے اور گلشنِ تصور کی نکلت ہے۔ جس میں جذبہ شوق فراواں ہے، جس میں فکر و فن کی تابانی نمایاں ہے اور جس میں نورِ قرآنی صوفشاں ہے۔

جب حقیقی عشق و محبت صنفِ نعت میں در آتے ہیں تو اس میں معصومیت کی روشنی، طہارت کی چاندنی اور صداقت کی چاشنی کے پرکشش نظارے نظر آتے ہیں۔ یہ نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جو نورِ قرآن ہے اور سنتِ رحمان ہے، اصنافِ ادب میں اعلیٰ و ارفع فن بن جاتی ہے۔ یہ اپنے محاسن و محامد کی خوبیوں اور اسلوب کی رعنائیوں کی وجہ سے محبت کی ضیا اور ربِّ کائنات کی دلکش ادا بن جاتی ہے۔ یہ صفتِ تابندہ ایسی دولتِ حسن ہے، جس کو زوال نہیں، یہ ایسا رشتہ نازک ہے جس کی مثال نہیں۔ یہ ایسا کلام ہے جس کا حکم خدا دیتا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ شرک سے مبرا ہو، حقیقی انوار و صفاتِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اجالا ہو، اس لیے تو کہتے ہیں کہ نعت کہنا نازک ترین مرحلہ ہے۔ پل صراط سے گزرنے کا معاملہ ہے محبوبیت اور رسالت کے مراتب کا مسئلہ ہے۔ ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی تو شرک کی گہرائی میں گرنے کا خطرہ ہے، عرفی شیرازی متوفی بمقام لاہور ۹۹۹ء نے کیا خوب کہا ہے:

عرفی مشابہاں رہ نعت است نہ صحرا آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن نعتِ شہِ کونین و مدحِ گے و جم را

حقیقت یہ ہے کہ صنفِ نعت، عقیدت و محبت کے ساتھ ساتھ خیالات کی رفعت، جذبات کی صلابت اور اسلوب کی قدرت بھی مانگتی ہے۔ قرآن میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ حقائق و اوصاف کا ادراک بھی چاہتی ہے پھر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کی احادیث میں ضیا بار صفات کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔ گویا عظمت و رفعتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر پہلو سے شناسائی بھی درکار ہے۔ سیرتِ مطہرہ، اسوۂ حسنہ اور اخلاقِ عظمیٰ کے اظہار کے لیے دانائی چاہیے، ذہن و شعور اور علم و فکر کی توانائی چاہیے اور قلب و نظر کی رعنائی بھی چاہیے۔ نعت گو اس بات سے باخبر ہو کہ نعتِ سید ابرار، احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ خیر کے لیے اس کے جذباتِ خیالات اور احساساتِ مصفیٰ اور مجتبیٰ ہیں۔ وہ حسنِ سیرت، نورِ عقیدت، تعلیماتِ رسالت اور خصائل و شمائلِ مخزنِ شفقت صلی اللہ علیہ وسلم سے رخشندہ ہے۔ وسیع و فصیح اسلوب کے نوادرات سے آگاہ ہے۔

نعت کہنا سنتِ ربِّ کریم ہے بلکہ فرمانِ رحیم و علیم ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجو۔ ربِّ کائنات نے وہ سلیقہ اور قرینہ بھی بتا دیا ہے، جس کے لیے قرآن حکیم میں سید کون و مکاں

سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفاتِ عالیہ کا اظہار کر دیا ہے، جسے انوارِ قرآن کہا جاسکتا ہے اور انہیں ہی نعتِ خالق ارض و سماوات کہہ لیجیے۔ اللہ کی نعت کا اسلوب الہامی ہے جو انسانی بساط سے بالا ہے۔ مگر اللہ نے ہر نعت گو کو فکر و دانش اور وجدان کی قوت کا عطیہ بھی دیا ہے۔ وہ اکتسابِ نور حتی المقدور کر سکتا ہے۔ اس کے خیالات میں محبت کی ضو ہو، ریاضت کی تگ و دو ہو اور وہ قرآنِ کریم کے ان انوار سے اپنے افکار کا لوازم حاصل کر سکتا ہو۔

آئیے ان انوار کی تلاش میں قرآن حکیم جیسے بحرِ بیکراں میں غوطہ زن ہوں اور گہر ہائے گرانمایہ سے قلب و نظر کو مستنیر کریں۔ مشاہداتی قوت کے سامنے پہلا نورِ قرآن ہی درودِ سلام کا حکم ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا. (الاحزاب: ۵۶)

”بلاشبہ اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان پر درود بھیجو اور خرب سلام کو بھیجا کرو۔“

اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ پر بے حد مہربان ہے۔ آپ کی تعریف فرماتا ہے۔ آپ کے کام میں برکت فرماتا ہے۔ آپ کا نام بلند کرتا ہے اور آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ سے غایت درجہ محبت رکھتے ہیں اور آپ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپ کے دین کو سر بلند کرے آپ کی شریعت کو فروغ بخشے اور آپ کو مقامِ محمود پر پہنچائے۔

”اہل ایمان کو نبی کے حق میں صلوا علیہ وسلموا تسلیما کا حکم دینے کا مطلب ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح و ثنا کرو اور ان کے دعا کرو..... تم ان کے لیے کامل سلامتی کی دعا کرو اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے ان کا ساتھ دو، ان کی مخالفت سے پرہیز کرو اور ان کے سچے فرمانبردار بن کر رہو۔“ (تفہیم القرآن: ۱۲۳-۱۲۴)

نعت کائنات کا ہر شاعر اس لحاظ سے حکمِ ربانی کا اتباع کرتا ہے اور نعت اس کا جوشِ ایمان بن جاتی ہے کلیدِ جنت بن جاتی ہے اور اطاعتِ رب کائنات کریم کا مژدہ بن جاتی ہے۔

حمد صانع ہے ثنا مصنوع کی
نعت توصیف رسول ہاشمی
مستحق اس کا نہیں غیر از رسول
شمس حق ہے نعت کی تنویر سے

نعت احمد ہے خدا کی حمد بھی
درحقیقت فعل حق کی پیروی
نعت ہے مخصوص صنف شاعری
ہے منور نعت گو کی زندگی
سید شمس الحق بخاری

میں امام عشق و حسن ہوں، پڑھ رہا ہوں سلام
اے مرے اللہ رکھ لینا تہی دستی کی شرم

میں ادیب درس الفت ہوں سکھاتا ہوں درود
اور تو کچھ بھی نہیں، سوغات لاتا ہوں درود
ہارون الرشید ارشد

زمزمہ درود کا
نور و ظہور مصطفیٰ
صل علی نبینا

نام خدا سے سلسلہ
منزل ذات کا پتا
روح رواں کی ہے صدا

صل علی محمد

حفیظ تائب

سلام آقا کی خدمت میں جو ہیں محبوب ربانی
راجا رشید محمود

سلام آقا کی خدمت میں نہیں جن کا کوئی ثانی

سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی
حفیظ جالندھری

سلام اے آمنہ کے لال، اے محبوب سبحانی

میں وہ چاکر خاتم الانبیا ہوں
سردار عبدالرب نشتر

شب و روز مشغول صل علی ہوں

آئے نہیں اس واسطے دسواں مرے پاس
سرور بدایونی

رہتی ہے درودوں کی حبسیں آس مرے پاس

کہ جس کو رحمت کل عالمین کہہ تو سکوں
سید محمد جعفری

سلام بھیجوں درودیں نبی کی نذر کروں

بادۂ عرفاں، ساقی عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
ساغر نظامی

صاحب قرآن فخر رسولاں خسروین ورحمت یزوں

آیات بینات میں ہے اس کا ذکر خیر
محبوب ذوالجلال کی عظمت درودِ پاک
جن و بشر کو چاہیے طاعت رسول کی
دیتا ہے ان کو شان و فضیلت درودِ پاک
گوہر ملیانی

وہی ہیں طاہر، وہی مظہر، وہی ہیں شافع، وہی پیغمبر
وہ سب سے افضل، وہ سب سے بالا وہ سب کے رہبر وہ سب سے برتر
تحیت ان پر، درود ان پر صلوٰۃ ان پر سلام ان پر

آسی لکھنوی

اللہ تعالیٰ سید الانبیاء، صاحب جود و سخا اور رسولِ رشد و ہدیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر محبت کرتے
ہیں کتنا پیار کرتے ہیں! انسانی ادراک اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ فہم و شعور اس کی کنہہ پانے سے
عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے قرآن حکیم میں کہیں بھی اسم مبارک محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا احمد لے کر نہیں پکارا۔ اللہ
کے حسنِ مخاطب پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے کہ سیرت و کردار کے محاسن بیان کرنے سے پہلے
یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہہ کر نہیں پکارا بلکہ صفاتی حسن کو سامنے رکھا۔

يَا أَيُّهَا الْمَرْمَلُ (مزل: ۱)

”اے کپڑوں میں میں لپٹنے والے!“

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ (مذثر: ۱)

”اے چادر اوڑھنے والے۔“

سبحان اللہ! خالق ارض و سماوات نے محرم اسرار خواجہ دوسرا صلی اللہ علیہ وسلم کو جس حالت میں دیکھا
اُسی انداز سے کتنی محبت سے پکارا۔ یہ محبت ہی نہیں ہے بلکہ عظمتِ خیر الوری اور شانِ پیکرِ تسلیم و رضا
بھی ہے۔

اسی طرح یسین اور طہ اور دیگر حروفِ مقطعات ہیں جن میں اوصاف و احسانات کی ایک دنیا
مضمّن ہے۔ ان کے مفہیم و مطالب سے اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات اور اس کے محبوب پیغمبر، صاحب
قرآن ہی آگاہ ہیں۔ مفسرین قرآن حکیم سے انہیں القابات قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

يَس وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ (یسین: ۱-۲)

”یسین قسم ہے قرآن حکیم کی۔“

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عکرمہؓ وغیرہم کا قول ہے کہ ہم اس کے معنی ہیں: ”اے

انسان یا اے شخص! اور بعض مفسرین نے اسے ”یاسید“ کا مخفف بھی قرار دیا ہے۔ اسی تاویل کی رو سے ان الفاظ کے مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (تفہیم القرآن، ج ۴) یہ آیت دیکھیے:

ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ (ص: ۱)

”ص“ قسم ہے نصیحت بھرے قرآن کی۔“

یہ بھی حروفِ مقطعات میں سے ہے۔ ”ص“ کے مفہوم کا تعین بھی مشکل ہے لیکن حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک کا یہ قول بھی کچھ دل کو لگتا ہے کہ اس سے مراد ”صادق“ فی قوله یا صَدِّق یا محمدؐ، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم صادق ہیں جو کہہ رہے ہیں صحیح کہہ رہے ہیں۔ صاد کے حرف کو ہم اردو زبان میں بھی اسی سے ملتے جلتے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں میں اس پر صاد کرتا ہوں۔ (تفہیم القرآن)

یہ ایک اور آیت دیکھ لیجیے:

طہ مَا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَى (طہ: ۱-۲۰)

”طہ، ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔“

اس میں بھی آپ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ وہی دلکش، محبت بھرا اسلوب ہے۔ رسولِ مکرم کی عظمت و رفعت اور شوکت و فضیلت ہے۔ نعتیہ ادب کا مطالعہ کریں تو یہ مخاطب کم کم نظر آتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یا محمدؐ سے نہ مخاطب کیا جائے۔ ویسے بہت سے نعت گو نے شانِ مصطفیٰ کے خطاب میں حسنِ بیان کا مظاہرہ کیا ہے چند اشعار حاضر ہیں جن میں انوارِ قرآن درخشاں ہیں:

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر وہی قرآن، وہی فرقاں، وہی سیں، وہی طاہا

علامہ اقبال

اسی طرح نعت نگاروں نے والشمس، والضحیٰ، والنجم کے حسنِ خطاب کو بھی اپنی مدحتوں کی زینت بنایا ہے اور ان انوارِ قرآن کی ضیاءوں سے اپنے اشعار کو منور کیا ہے:

وہ جس کا ذکر سورۃ والشمس والضحیٰ ذرے چمک اٹھے، ہے اسی کی نظر کا فیض

منظور الحسن عباسی

والنجم کے پرتو سے چراغاں ہے فلک پر والشمس کے جلوؤں سے منور ہیں فضا میں

رحمت للعالمیں، سیں و طہ، ص، ق جبریل آداب سے پیغامِ حق لاتے رہے

سید افتخار حیدر

مَدَّثِرٌ و مَزْمَلٌ و طُ لَقَبُ انساں

قرآن کی آیات کا عنوان میں ہے

مسعود رضا خاکی

ہے سورۃ الشمس اگر روئے محمد

والیل کی تفسیر ہوئی موئے محمد

کرامت علی شہیدی

مَزْمَل و مَدَّثِر، یسین بھی طُ بھی

فی الجملہ وہ سر تا پا تفسیر ہے قرآن کی

یزدانی جالندھری

مَزْمَل، مَدَّثِر ہیں القاب تیرے

تو یسین و طُ میں طلعت نما ہے

عبدالعزیز خالد

کہیں مَزْمَل و یسین، کہیں مَدَّثِر و طُ

ہزار انداز سے وہ رشکِ ماہِ مر سلاں چمکے

منظر عارفی

ضو بد اماں صوت میں جب گونجتی ہے برملا

المزمل ، المدثر ، المبشر کی صدا

صہبا اختر

والنجم کس کی شوکت و عظمت پہ ہے گواہ

زینت فزائے برج دنا اور کون ہے

حفیظ تائب

محسن انسانیت کے تذکار اوصاف حمیدہ کی ایک کہکشاں قرآن حکیم میں بھی ہے۔ انوارِ کتاب ہدیٰ کی ضیائیں جب عالم مدحت کو صوفشاں کرتی ہیں تو ان میں مہتاب کی ایک کرن رحمت للعالمین کی صفت لیے عالم انسانیت کو فروزاں کرتی ہے۔ رب انس و جاں نے یہ پیغام جاوداں دیا ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

”اور ہم نے نہیں بھیجا مگر تم کو رحمت للعالمین بنا کر۔“

گویا آپ سب جہانوں کے لیے رحمت کی گھا بن کر آئے ہیں۔ صرف بنی نوع انسان ہی کے لیے نہیں بلکہ جملہ مخلوقات کے لیے بادِ صبا بن کر آئے ہیں۔ مفسرین نے اپنے اپنے انداز سے رحمت کی وسعت کو بیان کیا ہے۔ صاحب تفہیم القرآن کی ترجمانی کچھ یوں ہے:

”اے محمد! ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں ہماری

رحمت ہے۔“

پھر اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی کریم کی بعثت دراصل نوع انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور مہربانی ہے کیوں کہ آپ نے آکر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چونکایا ہے اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے اس کو بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کون سی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی کفار مکہ حضور کی بعثت کو زحمت اور مصیبت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جدا کر دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے زحمت سمجھتے ہو، یہ درحقیقت تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔“ (تفہیم القرآن، ص ۱۹۲)

رحمت للعالمین نے جہالت میں ڈوبے مصائب میں پھنسے انسانوں کو راحت فراہم کی۔ آپ کی رحمت حدود و قیود و ثغور سے ماروا ہے، وقت کی قید سے آزاد آج بھی آپ رحمت للعالمین ہیں اور قیامت تک کے زمانے کے لیے آپ کی تعلیمات بنی نوع انسانی کے لیے رحمت ہیں۔ رب العالمین ”الرحمن الرحیم“ ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”اسمائے حسنیٰ میں ”الرحمن“ وہ اسم ہے جو نظام و جدانی کا مبداء ہے اور جس کے بعد اور کوئی اسم نہیں وہ ”الرحمن“ ہے..... اس کے فیضان کی عمومیت..... کلی ہے، اور اس فیضان کا مبداء ذات اقدس کی رحمانیت مطلقہ ہے۔ (نقوش سیرت، ص ۲۳-۲۴)

گویا یہ صفت ”الرحمن“ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مختص ہے تو صفت ”رحمت للعالمین“ سرور کائنات کے لیے مختص ہے۔ اس رحمت و شفقت بے پایاں کے انوار جادوئی ہیں۔ قرآن کے یہ انوار صفت نعت میں بھی ضیا بار ہیں۔

تری رحمت کی وسعت اے تعالیٰ اللہ تعالیٰ اللہ چلے آئے سمٹ کر ہر دو عالم تیرے داماں میں

عابد بریلوی

عرب کے واسطے رحمت، عجم کے واسطے رحمت وہ آیا اور آیا رحمت للعالمین ہو کر

ظفر علی خاں

اب بھی مجھے سرکار کی رحمت پہ یقین ہے کل بھی مجھے سرکار کی رحمت پہ یقین تھا
حافظ مظہر الدین

ملا ہے مرسل رحمت کا داماں غمِ دوراں سے اب کیا واسطہ ہے

حفیظ تائب

تری سرکار بڑی ہے مولا تو تو رحمت کی جھڑی ہے مولا
شیر افضل جعفری

جس کے فیض سے بنجر سینوں نے شلابلی پائی ہے موج میں وہ رحمت کا دریا کل بھی تھا اور آج بھی ہے
صبحِ رحمانی

تذکرہ تابندہ و رخشندہ ہے قرآن کا رحمت للعالمیں فرمان ہے رحمان کا
گوہر ملیانی

آپ کا آغوشِ رحمت وا ہوا سب کے لیے ساری دنیا پر ہے داماںِ جہاں پر ور کھلا
عاصی کرنا لی

گلِ معنی کھلا جب رحمت للعالمیں آئے مشیت تھی کہ آخر میں بہارِ اولیں آئے
رعنا اکبر آبادی

شفیع المذنبیں اور رحمت للعالمیں وہ ہیں کرم سارے زمانے پر ہمیشہ جانِ رحمت کا
عبدالرحمن عبد

اسی سلسلے کی یہ آیت بھی سرورِ عالم کی شان و شوکت اور رحمت و شفقت کے انوار پھیلاتی ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ
عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبہ: ۱۲۸)

”دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے،
تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان
لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔“

”رؤف“ رافت سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کمزوری و مصیبت پر جوش
میں آئے۔ پس رافت اور رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے۔ دونوں کے جمع کر دینے
سے رحمت کا مفہوم زیادہ قوت و تاثر کے ساتھ واضح ہو گیا ہے۔ خدا نے یہ دونوں وصف جا بجا اپنے لیے

فرمائے ہیں اور یہاں اپنے رسول کے لیے بھی فرمائے ہیں۔ (ترجمان القرآن، جلد ۲، ص ۱۵۷)
 رؤف الرحیم کے یہ انوار گلشنِ مدحت کو ہر بہار بناتے ہیں جو قلب و نظر کو ضو بار کرتے ہیں۔ رسولِ
 رحمت کے یہ اوصاف تابندہ اردو ادب کو ایک روحانی فضا اور نورانی ردا عطا کرتے ہیں۔

رسولِ اکرم کا ذکر انور ہی ضوفشاں ہے کتابِ حق میں حسین انداز میں کہا ہے رؤف بھی ہیں رحیم بھی ہیں
 گوہرِ ملیانی

میرے نبی کے کرم کی بھی وسعتیں بے انت میرے نبی کا کرم رحمتِ خدا سے ہے
 ریاضِ حسین چودھری
 ان کی رحمت کا کیل ہے ٹھکانہ دیکھ لے سوئے طائفِ نملہ موسمِ سنگ باری میں لب پر کیا دعا کا اجلا نہیں ہے
 صبحِ رحمانی

اس رحمتِ عالم کی عطا سب کے لیے ہے سرکار کی شفقت کی ردا سب کے لیے ہے
 ابو الخیر کشفی

تمام رحمت و بخشش، تمام لطف و کرم متاعِ قلب گدایانِ بے نوا ہیں رسول
 اقبال صنفی پوری
 وہ مجسمِ عنایت و رحمت وہ سراپاِ متانت و تمکین

رحمت تیری قریہ قریہ فیض ہے تیرا عالم عالم دریا دریا تیری سخا ہے، دامن دامن ابر کرم
 حافظ لدھیانوی

میرے سرکار تو رحمت ہیں وہ رحمان نہیں اتنا سمجھا ہوں زیادہ مجھے عرفان نہیں
 آفتابِ کریبی

خلق میں سر بر رؤف و رحیم آدمیت کا پاساں یعنی
 تابشِ دہلوی

اس کی شفقت ہے بے حد و بے انتہا اس کی رحمت تخیل سے ہے ماورا
 جو بھی عالم جہاں میں بنایا گیا اس کی رحمت سے اس کو بسایا گیا

کرم حیدری

قرآن کریم میں محسنِ انسانیت کی جلالت و فضیلت سیرت کا ایک پُر عظمت انداز بیان ملتا ہے۔

جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم کی دلربا قوس و قزح سجائی ہے۔ جس میں مدح و ثنا کا ایسا نور جلوہ نما ہے، جس میں خلق کی ضیائیں قاری کے ذہن و خیال کو منور کرتی ہیں۔ باری تعالیٰ کی مدحت کا حسیں اسلوب دیکھیے:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقِي عَظِيمٌ (القلم: ۴)

”اور بے شک تم اخلاق کے بڑے مرتبے پر ہو۔“

کتنا اچھوتا اور رس بھرا جملہ ہے۔ فصاحت و بلاغت کی انتہا ہے جو ضرب المثل بن گیا ہے۔ یہ عظمت و حشمت سلسلہ انبیاء بلکہ جملہ نوع انسانیت میں اور کسے عطا ہوئی۔ بعثت رسول اکرم کے زمانے کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں مکہ کا ہر معقول آدمی حضور اکرم کے اخلاق حسنہ سے متاثر تھا۔ آپ کو صادق و امین کے حسین القاب سے پکارا جاتا تھا۔ اگرچہ متعصب مشرک سردار جانتے بوجھتے حضور کو مجنون اور جادوگر کہتے تھے مگر کوئی ذی شعور انسان تسلیم نہ کر سکتا تھا۔ اتنے بلند اخلاق رسول کو آج کے متعصب فنکار و قلمکار بھی اہانت سرور عالم میں مصروف ہیں۔ یہ جہالت کی انتہا ہے حالاں کہ کتاب مبین میں یہ انوار اخلاق عظیم اللہ تعالیٰ کی شہادت سے جگمگ کر رہے ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ”کان خلقه القرآن“ کہہ کر اللہ تعالیٰ کے فرمان کی تصدیق کر دی ہے۔

یاد ہے بات مجھے حضرت صدیقہ کی آپ کا خلق ہی قرآن ہے سبحان اللہ

حفیظ تائب

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس آیت کی تشریح حسین و جمیل انداز میں کی ہے۔
 ”محسن انسانیت نے دنیا کے سامنے قرآن کی تعلیم ہی نہیں پیش کی تھی بلکہ خود اس کو مجسم نمونہ بن کر دکھلایا تھا۔ جس چیز کا قرآن میں حکم دیا گیا آپ نے خود سب سے بڑھ کر عمل کیا، جس چیز سے اس میں روکا گیا آپ نے خود سب سے زیادہ اس سے اجتناب فرمایا۔ جن اخلاقی صفات کو اس میں فضیلت قرار دیا گیا سب سے بڑھ کر آپ کی ذات ان سے متصف تھی اور جن صفات کو اس میں ناپسندیدہ ٹھہرایا گیا سب سے زیادہ آپ ان سے پاک تھے۔“ (تفہیم القرآن، جلد ۴)

گلشن نعت میں سید ابرار، احمد مختار کے اخلاق حسنہ کے گلہائے سدا بہار مہکتے ملتے ہیں۔ دیکھیے

چند گلاب حاضر ہیں:

جو حسنِ خلق میں ہیں موجِ کوثر و تسنیم تو گفتگو میں مزاجِ گل و صبا ہیں رسول

اقبال صفی پوری

محبوبوں کے چمن کھلائے ہیں آپ نے خلقِ بیکروں سے وفا کی تعلیم سے چراغاں کیے ہیں کتنے مرے نبی نے
جعفر بلوچ

خلق کی خوشبو تمام ادوار میں رچ بس گئی ہے باغِ ہستی میں کھلایوں ان کی شفقت کا گلاب
صبحِ رحمانی

لقب دیا ہے انھوں نے امین و صادق کا ہیں ان کے خلق و مروت کے معترف اغیار
حافظ لدھیانوی

کردار بے مثال ہے اسوہ ہے لا جواب خلقِ عظیم آپ کا عکس کتاب ہے
گوہر ملیانی

مہکتا ہے گلِ اخلاق کی خوشبو سے ہر آنگن ضیائے سیرت سرکار سے ہر گھر چمکتا ہے
حفیظ تائب

ایسے انوارِ قرآن اردو ادب میں صنفِ نعت کو جگمگاتے ہیں۔ رسولِ ہاشمی کے حسنِ اخلاق کی کرنیں
مدحت نگاروں کے خیالات و افکار بھی ان سے جلا پاتے ہیں۔ ان گہر ہائے تابدار کی ضو فشانیاں نعتیہ
کلام میں دیکھیے۔

مدح و ستائش کے حسین و جمیل گل ہائے گلاب کی نکبت کتابِ مبین میں مختلف آیات میں بکھری
ہوئی ہیں جو ذوقِ مدحت رکھنے والے ہر شاعر کے مشامِ خیال کو معطر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے پُر بہار
اسلوب میں ایک اور جلوۂ محبت سید البشر کی ادائے بشریت ہے۔ ربِّ کائنات نے آپ کے مرتبہ
بشریت کو شانِ نبوت کے حوالے سے اجاگر کیا ہے۔ آپ کے مقامِ بشریت کی خصوصیت کو واضح
کرنے کے لیے آپ کا حقیقی مرتبہ کو انوارِ وحی سے ضیا بار کا ہے:

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَهُكُمُ إِلَهُ وَاحِدٌ فَمَنْ
كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ
أَحَدًا (الکہف: ۱۱۰)

”اے محمد! کہہ دیجیے کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا، میری طرف وحی

کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔“

کتنا تابندہ و درخشندہ مطالب و مفاہیم کا مرقع یہ فرمان باری تعالیٰ ہے۔ معیار و مرتبہ کے لحاظ سے مدحت کا کتنا بلغ اسلوب ہے۔ زبان خیر البشر سے کہلوادیا کہ اے اہل ایمان میں بھی تم جیسا ایک بشر ہوں مگر ان کمزوریوں سے پاک ہوں جو دیگر انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ میری رہنمائی تو قدم قدم پر ربِّ قدیر کرتا ہے۔ میرے قول و فعل اور میرے حسن کردار کی حفاظت رب قہار کرتا ہے۔ میرے پاس حضرت جبریلؑ وحی لے کر آتے ہیں۔ احکامِ خداوندی پہنچاتے ہیں جو فرض مجھے ادا کرنا ہے اس کی ہدایت فرمانِ الہی کے مطابق پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے معصوم عن الخطا رکھا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ اپنے عہد رسالت میں مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے ہیں۔ باری تعالیٰ نے قرآن حکیم میں خود اس کا تذکرہ فرمایا ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ (الطور: ۳۸)

”پس اے نبی صبر کرو اپنے رب کا فیصلہ آنے تک اس لیے کہ بلاشبہ تم ہماری نگہداشت میں ہو اور تسبیح کرو اپنے رب کی حمد کے ساتھ جب تم اٹھو۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ (الزمر: ۳۶)

”کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے۔“

اسی صورت میں حضور کو مخاطب فرماتے ہوئے تسلی دی۔

قُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ (الزمر: ۳۸)

”اے محمد! کہہ دیجیے اللہ تعالیٰ میرے لیے کافی ہے۔“

بلکہ سورہ المائدہ میں تو اللہ نے واضح طور پر فرمادیا۔

وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (المائدہ: ۶۷)

”اللہ تعالیٰ تمہاری (ہر قسم کے) لوگوں سے حفاظت کرے گا۔“

یہ حفظ و امان کے فرمودات رسول اکرم کے لیے ہیں اور کسی انسان کے لیے نہیں ہیں۔ یہ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ ہم اپنے محبوب پیغمبر پر وحی بھیجتے ہیں اور اس کی ہر طرح رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ وہ مرتبہ بشریت ہے جس پر آسمان کے فرشتے اور زمین پر اللہ کے بزرگ انسان بھی ناز کرتے ہیں۔

قرآن حکیم میں سید المرسلین کی عظمت و فضیلت کے انوار و نعت کے حسن و جمال کو ضو بار کرتے ہیں دیکھیے:

خلوت کدہ قربت تو سین کا مقصود
ممدوح ملائک بہ کمال بشریت
سرتاج رسل، شمع سرا پردہ وحدت
امی لقب و وداقب اسرار حقیقت
بشیر احمد بشیر

محمد عربی ہے جمال حق کی نمود
ہے نور قلب و نظر سید البشر کا وجود
سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی
حافظ لدھیانوی
سلام اے فخر موجودات، فخر نوع انسانی
حفیظ جالندھری

میری نظروں میں بسا ہے اسوۂ خیر البشر
کس طرح آئے مرے نزدیک دنیا کا خیال
ذکی قریشی

اس خاک کا کیا ہے ستاروں سے بھی بلند
انسانیت کی شوکت و عظمت ہے آپ سے
شہزاد احمد

خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر خیر البشر
خوش نژاد و خوش نہا و خوش نظر خیر البشر
حفیظ تائب

رب کائنات نے اپنے لازوال حسن اسلوب، بے مثال نور بیان سے نعت کی عظمت کو ایسے نور
قرآن، جمال برہان سے اجاگر کیا ہے کہ نبی آخر الزماں، ہادی و جاں کی مدحت، اصناف اردو ادب
میں بے بدل ہو گئی ہے۔ فرمایا:

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الم نشرح: ۴)

”(اے محمد!) اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آواز بلند کر دیا۔“

ذرا غور کیجیے مخزن حکمت، مظہر رحمت اور عنوان مدحت کے بارے میں جو یہ بات اس زمانے
میں فرمائی گئی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس فرد فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں
اور سب ہی شہر مکہ تک محدود ہیں اس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا، کیسی ناموری اس کو حاصل
ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں اپنے رسول کو خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقے سے اس کو پورا
کیا۔ سب سے پہلے آپ کے رفیع ذکر کا کام خود آپ کے دشمنوں سے لیا۔

کفار مکہ نے آپ کو زک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر جب تمام عرب سے لوگ کھج کھج کر ان کے شہر میں آتے تھے، اس زمانے میں کفار کے وفود حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ، بیٹے سے، بھائی بھائی سے اور شوہر بیوی سے جدا ہو جاتا ہے اس سے بچ کر رہنا۔ یہی باتیں وہ ان لوگوں سے بھی کہتے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا تجارت کے لیے آتے تھے۔ رسول اکرم ہر وفد کے پاس تبلیغ دین اسلام کے لیے جاتے تھے۔ اس سے ایک تجسس پیدا ہوتا، لوگ سوچنے پر مجبور ہو جاتے۔ یوں عرب کے گوشے گوشے میں حضور کا نام پہنچ گیا۔ کفار کا جتنا پروپیگنڈا بڑھتا گیا اتنا ہی زیادہ آپ کا ذکر بلند ہوتا گیا۔

آپ کے رفع ذکر کا دوسرا حصہ ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام سے اس میں تو آپ کا غلغلہ سارے عرب ہی میں نہیں پھیلا بلکہ روم تک پھیل گیا۔ آپ کی اخلاقی اقدار، بلکہ اور عملی اقدام سے کفار و مشرکین بھی متاثر ہوئے اور فتوحات نے آپ کی عظمت اخلاق کو ہر طرف صوفشاں کر دیا۔

تیسرا مرحلہ رفع ذکر کا خلافت راشدہ کے دور سے شروع ہوا۔ یہ سلسلہ آج تک بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ رفعنا لك ذكرك کی آب و تاب مشرق و مغرب میں پھیل گئی۔ زمین کا کون سا گوشہ ہے جہاں سرور عالم کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہے۔ کون سا براعظم جہاں مسلمان آباد نہیں ہیں اور وہاں پانچ وقت اذان نہ گونج رہی ہو اور اشہد لا الہ کے ساتھ اشہد محمد رسول اللہ کا کلمہ فضا میں نہ گونج رہا ہو۔ یہ قرآن کی صداقت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے جو اس آیت کریمہ میں ضیابار ہے۔ (تفہیم القرآن، ص ۳۸)

اللہ تعالیٰ کی مدحت کا نور گلستان صنف نعت کو آج بھی حسن و جمال سے منور کر رہا ہے۔

ذکر آپ کا بلند کیا کردگار نے چرچا ہے کائنات میں افزوں حضور کا

حفیظ تائب

ہے مکاں آپ کا، لامکاں کی طرح

وہاں تک آپ کا ہے نام پہنچا

گوہر ملیانی

کہہ اٹھتا ہے وجدان رفعنا لك ذكرك

سوچ سے ماورا آپ کی رفعتیں

جہاں سورج ہے صبح و شام پہنچا

پڑھتا ہوں کبھی صل علی سیدنا جب

راجا رشید محمود

ہر صدی، ہر عہد کے گلشن کو ان کی آرزو!
ہر زمانے میں کھلا ہے ان کی چاہت کا گلاب
صبحِ رحمانی

رفعت بشریت کا تاج رب کائنات نے مظہر انوار حق، مصدر اسرار حق کے سر پر سجایا ہے۔ انسان کی فہم و فراست کے اس حقیقت امر حق کی وسعت کو پانے سے قاصر ہے۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ سید البشر کا سفر معراج، اس کی رفعت کے اسرار و رموز کیا تھے۔ اس سدرۃ المنتہی کے سفر کے مقاصد کیا تھے؟ قرآن حکیم کی اس آیت کی تشریحات اور اس کے متعلقہ احادیث کی تفہیمات سے جو کچھ فکر و خیال کی متاع عزیز بنتا ہے اسی پر غور و خوص کرتے ہیں جو عظمتیں اور فضیلتیں اس آیت کریمہ سے حاصل ہوتی ہیں انہیں صنفِ نعت کی زینت بناتے ہیں کیوں کہ یہ نور قرآن تو اللہ تعالیٰ کی پُر جمال نعت ہے۔ قرآن حکیم کا یہ فرمانِ دلربا دیکھیے:

سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى
الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْإِنشَاءِ إِنَّهُ هُوَ
السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (بنی اسرائیل: ۱)

”پاک ہے وہ اللہ جو لے گیا، ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد
اقصیٰ تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی تاکہ اس کو اپنی کچھ نشانیوں
کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا۔“

یہ وہی واقعہ ہے جو اصلاً معراج اور اسراء کے نام سے مشہور ہے۔ یہ واقعہ ہجرت سے ایک
سال پہلے پیش آیا۔ بہت سے صحابہ کرامؓ اس کے راوی ہیں۔ قرآن مجید صرف مسجد حرام سے مسجد بیت
المقدس تک جانے کی تشریح کرتا ہے اور اس سفر کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی
کچھ نشانیاں دکھانا چاہتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ کوئی تفصیل نہیں ہے۔ احادیث میں اس کی
تفصیلات ہیں۔ حضرت جبریلؑ کے آپ کو اٹھا کر براق پر لے جانے کے واقعات ہیں۔ (تفہیم
القرآن، جلد ۲، ص ۵۸۸)

تفصیلات کسی بھی تفسیر میں دیکھ لیجیے۔

معراج درحقیقت ایک انوکھا اور انسانی فہم و فراست سے بہت بلند واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے
بندے خیر البشر، سید البشر، امام الانبیاء اور ختم المرسلین کو اپنے پاس سدرۃ المنتہی پر لے گیا اور اپنی بہت

ی نشانیاں دکھائیں۔ یہ انسانیت کا عروج، محسن انسانیت کی عظمت و رفعت کا بے مثال واقعہ ہے۔ حضرت موسیٰ کو تو ”لن ترانی“ کا جواب ملا تھا مگر اس معراج میں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس بلا لیا۔ یہ شانِ خداوندی اور شانِ بشر کا ایسا تعلق ہے کہ سوچیں گم ہو جاتی ہیں۔ فکر و شعور جواب دے دیتے ہیں صنفِ نعت کے شعرائے کرام اس عروجِ انسانیت کے انوار سے اپنے اپنے خیالی گلستان سجاتے ہیں۔ اردو ادب کے شعری ذخیرہ میں یہ موضوع ایسا پُر ضیا ہے کہ اس نے صنفِ نعت کو بخن کے چمن کا گلِ سرسبد بنا دیا ہے۔ ہر شاعر نعت کا کلام ”ہر گلِ رارنگ و بوئے دیگر است“ کے مصداق نئے نئے خیالات و جذبات کا مرقع ہے۔

یہ وہ بشر کہ ملا جس کو رتبہٴ معراج یہ وہ نبی کہ نبوت ہے جس کی لامحدود

اختر الحامدی

وہ منظر دیدنی ہوگا کہ جب عرشِ معلیٰ پر خدا سے لامکمل میں آپ نے خلوت میں کی باتیں

راشد میر

زمین و آسمان سے کون گزرا فضائے بیکراں سے کون گزرا
فلک بولا یہ کیسی روشنی ہے یہ میرے درمیان سے کون گزرا
ستاروں سے ستارے سے پوچھتے ہیں ہماری کہکشاں سے کون گزرا
کے معراج کی منزل ملی ہے مکان و لامکاں سے کون گزرا

امداد ہمدانی

وہ شامِ اسرا کی رات کیا تھی وہ نور کیا تھا وہ رات کیا تھی تمام پردے اٹھے ہوئے تھے وصال بھی اور وصال کیسا

برگ یوسفی

وہ جس کے علم کی تفسیر الم نشرح لک صدرک وہ جس کے اوج کی تعبیر سبحان الذی اسرا

صوفی تبسم

خبر ملی ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

علامہ اقبال

اسرا کی شبِ خدا نے ہزار اہتمام سے اسرار کائنات بتائے حضور کو

حفیظ تائب

عرش بریں پہ جلوئے کچھ ایسے بکھر گئے اب تک ہے دن کا دل شبِ اسری کی روشنی

صبحِ رحمانی

جب تصور میں شبِ اسرئی کی آئی ہے ضیا
ذہن میں بھی عرش کی گوہر فضا میں آنے لگی
گوہرِ ملسیانی

اطاعت مرسل داور، بدرِ منور بھی نعت کا دل کش موضوع ہے۔ عقیدت و محبت کی روحانی اور قلبی روشنی کے بغیر اطاعت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لیے رب ارض و سماوات نے شاہِ امم، مہرِ کرم کی اطاعت کو اپنی اطاعت کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ گویا اپنی حمد کے ساتھ اپنے محبوب رسول کی نعت کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ اس طرح واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سرورِ عالم کی اطاعت سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ فرمان ربِ قدوس ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (النساء: ۵۹)

”اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔“

ایک اور مقام پر مزید تاکید فرمائی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا
أَعْمَالَكُمْ (محمد: ۳۳)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور

اپنے اعمال کو برباد نہ کرو۔“

گویا اعمال کی قبولیت بھی اطاعت رسول کے بغیر ممکن نہیں اس سے بڑھ کر عزیز“ علیم نے یوں بھی فرمایا:

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰)

”جس نے رسول کی اطاعت کی بے شک اس نے اللہ کی اطاعت کی۔“

ان آیات مقدسہ میں باری تعالیٰ نے نعت کے اس موضوع منور کو جگمگا دیا ہے۔ اس میں محبت کی شیرینی اطاعت کے شہدِ مصفا میں پنہاں دکھائی ہے۔ نعت کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور نعت گو کو انوار قرآن میں سے محبت و اطاعت کی ایک صوفشاں کرن مل جاتی ہے۔ جو نعت کی ادبی عظمت کو جلا بخشی ہے بلکہ صنفِ نعت اصنافِ ادب کو دلکش استعارات و تشبیہات سے مالا مال کر دیتی ہے۔ دیکھیے:

اہل ایمان کو ہے قرآن کی تعلیم یہی
رب اکبر کی اطاعت ہے اطاعت ان کی

قمریز دانی

جو آدمی حضور کا طاعت گزار ہے

اس آدمی کو گردشِ دوراں کا غم نہیں

رب سے ملنا ہے تو محبوبِ خدا سے ملیے

انجم وزیر آبادی

حق تو ملتا ہی نہیں ان کی اطاعت کے سوا

بشیر زواری

خدا محبت کرے گا اس سے کہ جو محبت کرے نبی سے

کرو محبت نبی سے لوگو! خدا کی چاہت ملے گی تم کو

آفتاب کریبی

رسول خدا کی اطاعت کروں

بناؤں یہی مقصدِ زندگی

لالہ صحرائی

احمد کی اطاعت کو شعار اپنا بنا لو

احمد کی اطاعت کا صلہ خلدِ بریں ہے

اعجاز رحمانی

تری ذات سے محبت، ترے حکم کی اطاعت

یہی زندگی کا مقصد، یہی اصل دین و ایماں

ماہر القادی

ہم تو انسان ہیں کیوں ان کی اطاعت نہ کریں

سنگ و اشجار نے جب ان کی اطاعت کی ہے

منظر عارفی

نعیم اللہ توفیقِ اطاعت بھی تمہیں بخشے

کہ بس حسنِ بیاں کافی نہیں مدحِ پیمر کو

ضیاء الدین نعیم

روشنی ہی روشنی ہے زندگی کے واسطے

ابتدا تا انتہا پیارے نبی کا راستہ

طاہر سلطانی

بشر کو تلخیوں میں حوصلہ ملتا ہے سیرت سے

رسول ہاشمی کے اسوۂ نورِ اطاعت سے

گوہر ملیانی

گلشنِ نعت میں جہاں عقیدت و اطاعت کے غنچے چٹکتے ہیں وہاں سید ابرار کے زہد و ریاضت، جو دو سخاوت و اسوۂ حسنہ کے رنگارنگ پھول بھی مہکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کتابِ مبین میں رسولِ امین، صاحبِ یسین صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ اسوۂ حسنہ بھی شعرائے نعت کو عطا کیے ہیں۔ کتنے دلربا انداز میں خود بھی حسنِ مدحت کی ضیائیں پھیلائی ہیں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ

وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهُ كَثِيرًا (الاحزاب: ۲۱)

”در حقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے جو

اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔“

اگرچہ یہ فرمان غزوہ احزاب کے مجاہدین کے لیے تھا مگر یہ الفاظ عام ہیں اور انہیں معنی تک محدود نہیں۔ اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ صرف اس لحاظ سے اس کے رسول کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ ہے بلکہ مطلقاً اسے نمونہ قرار دیا ہے لہذا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان ہر معاملے میں آپ کی زندگی کو اپنے لیے نمونے کی زندگی سمجھیں۔ اس کے مطابق اپنی سیرت اور کردار کو ڈھالیں۔ (تفہیم القرآن: ص ۸۱)

یہ آیت کریمہ اپنے اندر حضور اکرم کے اسوۂ کے بے مثال انوار رکھتی تھی۔ اسے ہم محسن انسانیت کی عظیم نعت کہہ سکتے ہیں۔ کتنے حسین انداز میں اللہ تعالیٰ نے باور کرایا ہے کہ اہل ایمان اسوۂ سید البشر کے انوار سے اپنی زندگی کو جگمگائیں اور اخروی زندگی کی فلاح پائیں۔ بعض نعت نگاروں نے اس نور قرآن سے اپنے نعتیہ اشعار کو صوفشاں کیا ہے، جس سے صنف نعت کو ایک جدید ضیاء بار اسلوب ملا ہے:

منارِ رشد ہدایت، سحابِ رحمت جود مرے رسول کا اسوۂ، مرے نبی کا وجود

حفیظ تائب

انسانیت کا اسوۂ کامل حضور ہیں اس کا روانِ زیست کی منزل حضور ہیں

محشر رسول نگری

گالیاں کھا کے بھی لوگوں کو دعائیں دی ہیں ان کے اسوہ کا مرے دل میں دیا ہے روشن

راز کا شمیری

وہ اسوۂ اخلاق وہ آئینہ الطاف دنیا میں کہاں آپ کا مجموعۂ اوصاف

خالد بزمی

دوستو! آؤ ایک کام کریں اسوۂ مصطفیٰ کو عام کریں

اعجاز رحمانی

اسوۂ ختم الرسل سامنے رکھیں اگر کشمکشِ زیست میں مات کا امکان نہیں

عزیز احسن

آج بھی آپ کا اسوہ ہے ہمارا رہبر کل بھی خورشید اسے راہنما رکھتے تھے

خورشید بیگ ملیسوی

اسوہ رحمت عالم تو بلاتا ہے ہمیں

مشکلیں جو بھی زمانے کی ہیں آساں کر لیں

شوکت ہاشمی

بدر کامل ، اسوہ کامل ہوا

کر لو اے تیرہ شبو کسب ضیا

لالہ صحرائی

معیار ہے دنیا کے لیے اسوہ حسنہ

سربستہ توحید کے ہیں نقشِ حسین آپ

عبدالکریم ثمر

شان رسالت کی لاتعداد کرنیں قرآن وحدیث میں چمکتی ہیں جو اوصاف و صفات امام انبیاء و مرسلین کی پُر تاثیر ضیائیں گلستانِ علم و ادب اور صاحبانِ نظر کے دلوں کو ضیا بار کرتی ہیں۔ ان انوار قرآن کو بارگاہِ رب کائنات سے پیش کی جانے والی مدح و ستائش کی روحانی و نورانی مدحتیں بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان میں پیغمبر اسلام کے فرائض کی عظمتیں اور سیرت و کردار کی فضیلتیں بھی ہیں۔ فرمانِ قادرِ مطلق ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا - وَدَاعِيًا إِلَى اللَّهِ

بِأَذْنِهِ وَسِرَاجًا مُنِيرًا (الاحزاب: ۴۵، ۴۶)

”اے نبی ہم نے تمہیں گواہ بنا کر بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور ڈرانے

والا بنا کر اور اللہ کی اجازت سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور روشن

چراغ بنا کر۔“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چند کلمات رسول اللہ کو مخاطب کر کے فرمائے گئے ہیں جن میں آپ کے لیے تسکین کا خزانہ بھی اور فرائض کی انجام دہی کا فرمان بھی ہے۔ درحقیقت مقصود کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سرورِ عالم کو یہ مراتبِ عالیہ عطا کیے ہیں۔ آپ کی شخصیت بہت بلند و بالا ہے یہ مخالفین بہتان و افترا کا طوفان اٹھا کر آپ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ آپ ان باتوں پر رنجیدہ نہ ہوں۔ اس حکم سے یہ ستائش رب کریم بھی مترشح ہوتی ہے ان کا سابقہ کسی معمولی انسان سے نہیں ہے، انہیں تو اللہ تعالیٰ نے بلند ترین مقام پر سرفراز فرمایا ہے۔ (فہیم القرآن، جلد ۴، ص ۱۰۵)

اللہ تعالیٰ نے نبی محترم و مکرم کی صفات، شاہد مبشر اور نذیر بھی بیان کر دی ہیں۔ اس شہادت کا مفہوم قوی بھی ہے کہ آپ کی ہر بات خالق کی ہدایت کے مطابق ہے اور یہ شہادت عملی بھی ہے کہ آپ نے ہر حکم پر خود عمل کیا ہے اور یہ شہادت اخروی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے آخرت میں ہر ایک کے متعلق شہادت دیں گے۔ اسی طرح آپ کو اللہ نے آپ کو بشارت دینے والا اور ڈرانے والا

بھی بنا کر بھیجا ہے۔ واضح رہے کہ محسنِ انسانیت روشن چراغ بھی ہیں۔ جس طرح چراغ سے روشنی پھیلتی ہے اور تاریکی بھاگ جاتی ہے اسی طرح مہرِ ہدایت کے طلوع ہوتے ہی جہالت اور کفر و باطل کی تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ تاریخِ عالم اس کو سب کے سامنے عیاں کرتی ہے۔ یہ انوارِ قرآن صنفِ نعت کو جلا دیتے ہیں۔ اردو ادب میں نعت کی یہ تجلیات فکر و خیال اور اسلوب و انداز کو درخشاں کرتی ہیں۔

جو ہیں بشیر و مبشر، بشارت و بشر
جو ہیں مشاہد و اشہد جو شاہد و مشہود
اخترا الحامدی
و محمد ہیں احمد بھی محمد بھی، حسن مطلق کا شہد بھی مشہود بھی علم و حکمت میں وہ غیر محدود بھی بظاہر اُمیوں میں اٹھایا گیا
کرم حیدری
کیوں کر ڈریں نہ تجھ سے عدو مثل دوست ہوں
پایا خطاب تو نے بشیر و نذیر کا
احقر بہاری
سراجِ منیر و نذیر و مبشر
مہاجر ہے خود کو مسافر کہا ہے
عبدالعزیز خالد
شاہد کہا ہے آپ کو بلکہ نذیر بھی
کیسی صفاتِ منصبِ امی خطاب میں
گوہرِ ملیانی
دنیا کی عظمتوں میں سراجِ منیر تم
قدیلِ عرش و مشعلِ عقبے تمہیں تو ہو
صبا متھراوی
روشنی جس کی مدہم نہ ہوگی کبھی
وہ ہدایت کا مہرِ منیر آپ ہیں
حفیظ تائب
تو اے سراجِ نور وہ انوار کر عطا
کچھ ظلمتِ نگاہ کو رستہ دکھائی دے
ع، ہ، مسلم
ہیکرِ نور، اے سراجِ منیر
ہے یہ خورشید میں تری تنویر
اثرِ صہبائی
رَب نے بھیجا ہے بنا کر سرورِ کونین کو
اک مبشر، اک نذیر اک شاہد علم و یقین

راجا رشید محمود

قرآن کریم میں عظمت مخزن اسرار ربانی، مرکز انوار رحمانی کی ایک اور ضیافتِ نعت کو صوفشاں کرتی ہے اور قادر مطلق کے مدوح مدثر و منزل کے حسن کی ایک اور اندازِ تابانی پھیلاتی ہے۔ اس مدحتِ ربانی کی ایک جھلک دیکھیے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيِّينَ ط وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (الاحزاب: ۴۰)

”لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔“

اگرچہ اس آیت کے پہلے حصے میں مشرکین کے اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے جو حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کی طلاق اور حضور اکرم کے اس نکاح پر کیا جارہا تھا مگر اللہ نے اس رسم جاہلیت کا خاتمہ کیا ہے جو منہ بولے بیٹے کو بیٹا کہا جاتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ محمد آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، جن کے عہد میں ایسی رسم کو مٹا دیا جائے۔ (مفہوم تفہیم القرآن، جلد ۴، ص ۱۰۳)

مگر ہمیں تو دیکھنا ہے کہ باری تعالیٰ نے کتنے حسین اسلوب میں بے نظیر و بے مثال، انتہائے کمال کی رسالت کو آخری قرار دیا ہے۔ یہ فضیلت و عظمت اور حشمت و رفعت کی ایک پُرکشش ادائے مدحت ہے۔ کون خالق کائنات کے اسلوبِ نعت کو اختیار کر سکتا ہے۔ مدحت نگاروں کو ایک راستہ دکھایا ہے کہ نعت کیسے کہی جاتی ہے اور نعت کے مضمون کے لیے گہر ہائے گرانمایہ کیسے منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ تو کتاب نور کے انوارِ حقیقت ہیں۔ ان کی روشنی میں شعرائے نعت نے اپنا کلام پُر انوار بنانا ہے اور حقیقی قرآن و روحانی مضامین کے پھولوں کو سجانا ہے۔

نہ تھا کوئی تجھ سا نہ ہے اور نہ ہوگا ہے شاہد تری خاتم المرسلین

اثر لدھیانوی

کوئی نہ صدر بن سکا صدر العلای کے بعد

سید فیضی

وہ صدر آخری تھے رسالت کی بزم کے

اک تتمہ اور اک شرح کتابِ راز ہے

آغا حشر کاشمیری

تو پیامِ آخری، قرآنِ کلامِ آخری

نہ چھیڑاے محتسب میں ہوں مئے وحدت کا متوالا میں وہ مے خوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلین ساقی

خولجہ عزیز الحسن مجذوب

میں وہ چاکر خاتم الانبیا ہوں

شب و روز مشغول صلی علی ہوں

سردار عبدالرب نشتر

میں بھی پڑھتا ہوں درود ان پر پڑھیں سب امتی

ہیں حکم اور اختتام ان پر نبوت کا ہوا

راجا رشید محمود

نازل ہوا ب کتاب کی پر غلط غلط

ختم رسل کے بعد یممر غلط غلط

امین گیلانی

جس زوایے سے دیکھیے ہے نور کردار

جس پر ہوئی ہے ختم نبوت وہ تاجدار

مسعود رضا خاکی

قرآن حکیم ام الکتاب ہے اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے جو ازل سے ابد تک کے افکار و علوم اور پوشیدہ علوم، انوار علم و آگہی کا گلستان ہے جس میں ہر موضوع کے پھول مہکتے ہیں ادب کے غنچے بھی چمکتے ہیں اسلوب و انداز بیان، فصاحت و بلاغت اور تشبیہات و استعارات کے خیابان بھی چمکتے ہیں۔ یہی نہیں تخلیق کائنات کی غرض و غایت، تخلیق بنی نوع انسان کی مقصدیت انبیاء علیہم السلام کی بعثت کی اہمیت اور خصوصاً خام النبیین کے اسوۂ سیرت کی اجتماعیت کی آفاقیت کے تذکار کی حکمت قرآن حکیم کی تعلیمات میں درخشاں ہے۔

عالمی علوم نے گذشتہ چودہ صدیوں سے مسلسل اپنے ذخیرۂ ادب کو اس کتاب نور کے بحر بیکراں سے لؤلؤ لا لاجن کر زرخیز بنایا ہے بلکہ اس کے انوار روحانی و اخلاقی سے مستفید ہوئے ہیں۔ کیا مفکر، کیا سائنسدان، کیا عوام و حکمران، کیا ادیب و شاعر اور علوم لدنی کے خطیب و ترجمان سب کتاب حکمت کے انوار و محاکات اور کمالات و نادرات سے اپنے فنی، ادبی، فکری اور اجتہادی زاویوں کو ضیا بار کرتے رہے ہیں۔

عربی، فارسی، اردو، انگریزی، پنجابی، سرائیکی بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی ادبیات پر تعلیمات قرآن حکیم کے اثرات مرتسمد کھائی دیتے ہیں۔ اپنے موضوع مقالہ کے حوالے سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن حکیم نعت محبوب رب العزت، ختم دور رسالت اور غنچہ راز مدحت کا بنیادی نکتہ اور اساسی ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرستید بہادی دواں، فخر صادقوں کی خود نعت کہی ہے۔ آپ

کے انوار عظمت و برکات اور اوصاف درجات کی تجلیات سے گلشن کو مہکایا ہے اور اپنے حسن ادا سے جگمگایا ہے۔ صنف نعت کی ضیاؤں سے منور ہر شاعر، ہر قلم کار اور فن کار قرآن حکیم کی حکمتوں کا خوشہ چین ہے۔ انوار بیانات رب قدیر سے، اپنے جذبات و احساسات اور خیالات روشن کرتا ہے۔ کتاب نعت کا منبع و مصدر قرآن حکیم ہے۔ حافظ فقیر یہی اعلان کرتے ہیں۔

اس فصاحت کا نہیں عالم امکان میں وجود
جس کو حاصل نہ ہو تائید کتاب محکم
حافظ فضل فقیر

نعتیہ کلام سے بہت سی شہادتیں ملتی ہیں کہ نعت کہنے والے شاعر بحر قرآن حکیم میں غوطہ زن ہو کر اپنے افکار و خیالات کے لیے مدحت سے گہر ہائے گرانمایہ حاصل کرتے ہیں۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
علامہ اقبال

کس کی طاقت ہے کہ مدحت میں زباں کھول سکے
جب خدا خود ہی ہو قرآن میں شاخاں ان کا
امیر مینائی

گفتگو یاد کریں کھول کے قرآن حکیم
پھر انہیں لفظ و معانی کا سمندر لکھیں
صبح رحمانی

سنانے کے لیے آیات قرآن اہل عالم کو
رسول ہاشمی سے خوشنوا کی آمد آمد ہے
حفیظ تائب

شایان نعت ہے تو ہے اسلوب کبریا
معیار بس حقیقت قرآن ہے نعت کا
راجا رشید محمود

صنف نعت کے حسن اسلوب میں زیب و زینت کا حقیقی رنگ انوار قرآن سے ابھرتا ہے۔ ہر قاری محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ آسمانی نعت پر انوار قرآن کی پھیلی ہوئی کہکشاں کس قدر زرخیز، صوبار اور بہار ہے۔ اردو نعتیہ کلام میں آیات قرآن رطب اللسان ہیں۔ حسن انداز بیاں، جمال گفتگوئے ذی شاں اور جلال علم و عرفاں کی ادائیں صوفشاں ہیں۔ لوازمات نعت کے لیے انوار قرآن کا شمار کرنا عقلِ انساں کے لیے محال ہے۔

اس مقالہ کی تحقیقی، فکری اور تحریری کاوش پر غور کرتا ہوں تو اپنے آپ کو قوتِ اظہار میں نادار پاتا ہوں۔ تحقیقی لحاظ سے بھی تفکر و تدبر قرآن حکیم کی طاقت کو کمزور و ناتواں سمجھتا ہوں۔ پھر بھی خیالات کو

صفحہ قرطاس پر لانے کی سعی کو عطیہ ربانی تصور کرتا ہوں۔ اس مقالہ میں جو اظہار محکمات ہیں وہ انعاماتِ خداوندی ہیں اور جو تحقیقی کمزوریاں ہیں وہ راقم کی کم علمی کی دشواریاں ہیں۔ جہاں تک موضوع کے لحاظ سے انتخاب اشعار کا معاملہ ہے تو نعتیہ کلام کی کثرت، کتب ہائے مدحت کی بہتات میں چمکتے دکتے انوار قرآن سے حصول فیض کی رکاوٹیں بھی شامل رہیں۔ بہر کیف مقالہ حاضر کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

مگر قبول ہے اقتد زعز و شرف

محمد محمد

مولانا محمد علی جوہر کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر

ABSTRACT:

Maulana Muhammad Ali Jauhar was great freedom loving leader who rendered sacrifices for freedom of India, particularly Indian Muslims. He remained in prison for years during his struggle but did not give up hope and wrote Editorials for his Newspaper against British Government in occupied India. He also wrote poetry and expressed his Love of Prophet Muhammad (S.A.W). He penned down some couplets in praise of Him (S.A.W.). The couplets, he wrote, though not much in terms of quantity, yet are of great value in poetic sensibility and impression due to the reason that they carry valuable sentiments of devotion. This article present some account of devotional poetry of Maulana Muhammad Ali Jauhar.

مسلمانانِ ہند کی سیاسی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ کم ہی شخصیات ہیں جو اتنی کثیر الصفات ہوتی ہیں۔ وہ بیک وقت شعلہ بیان مقرر، قلم کو تلوار بنا دینے والے جری صحافی، الفاظ سے گولہ باری کرنے والے ادیب، اسلام اور پیغمبر اسلام کے سچے شیدائی، تحریک خلافت کے ایسے رہنما کہ محمد علی جوہر اور تحریک خلافت لازم و ملزوم، علی گڑھ اور آکسفورڈ کے بہترین طالب علم، انگریزی کے اعلیٰ درجے کے انشاء پرداز اور ایک بہترین مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔^۱ جمال الدین افغانی کے بعد جوہر نے ”اتحاد بین الاسلامی“ کی آواز کو نہ صرف بلند کیا بلکہ عملاً اس کے لیے وقف بھی ہو گئے۔^۲ ہندوستان ہی نہیں دنیائے اسلام میں کہیں بھی کسی کلمہ گو کے پھانس چبھی تو بقول عبد الماجد دریا بادی، اس کی چھن محمد علی جوہر کے سینے میں لگتی۔^۳ اسلام یا شعائر اسلام پر کہیں کوئی حملہ ہو تو اس کی تڑپ محمد علی کے سینے میں پیدا ہوتی۔^۴ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو آزادی کا صحیح مفہوم بھی سمجھایا اور اس کے لیے ہر قسم

مولانا محمد علی جوہر کی ملی شاعری میں نعتیہ عناصر

کی قربانی دینے کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ ۶۔ محمد علی جوہر کی ساری زندگی بر عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی سیاسی اور فکری رہنمائی کرتے ہوئے گزری۔ ۷۔ ان کی تحریر و تقریر اور شاعری کا مرکز و محور ملت اسلامیہ بالخصوص ہندوستان کی ملت اسلامیہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ہندوستان کو آزاد ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکے لیکن جس طرح مسلسل انھوں نے اپنی قوم کے لیے جدوجہد کی ہے ان کا نام ہمیشہ ”برصغیر کی تاریخ میں زندہ رہے گا۔“ ۸۔

جہاں تک محمد علی جوہر کی شاعری کا تعلق ہے تو ان کا کلام ”جبر و استبداد کی قوتوں کے مقابلے کے لیے اعلان کلمہ الحق کی حیثیت رکھتا ہے۔“ ۹۔ ملی شاعری میں ان کا بھی ایک مقام ہے اگرچہ شاعرانہ مقام کے لحاظ سے ”وہ اقبال کے افکار بلند کی گرد کو بھی نہ پہنچتے تھے لیکن اسلامی انقلابی افکار اور ملی احساسات کے لحاظ سے محمد علی اقبال سے کم نہ تھے۔“ ۱۰۔ جوہر کے کلام کا ایک ”معتد بہ حصہ“ ”محبوسیات“ کے تحت آتا ہے۔ ۱۱۔ لیکن ایسی شاعری میں بھی مایوسی اور پشیمردگی کا کوئی گزر نہیں ہے بلکہ امید، حوصلے اور باطل کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ نمایاں ہے اور اس میں آورد کے بجائے آمد ہی آمد ہے۔ ۱۲۔ ان کی غزلیں صرف شاعر کے جذبہ دروں کی ہی غماز نہیں ہیں ۱۳۔ بلکہ اس دور کے سیاسی ماحول اور مسلمانان ہند کے اجتماعی احساسات کی ترجمان بھی ہیں۔

محمد علی جوہر ۱۹۲۲ء میں جب بیجا پور ڈسٹرکٹ جیل میں قید تنہائی میں تھے تو کال کوٹھڑی میں انھیں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں سنائی دیں جس سے انھوں نے اندازہ لگایا کہ ترکوں کو یونانیوں کے خلاف سرنا میں کامیابی حاصل ہوئی ہے جس پر انھوں نے مندرجہ ذیل غزل کہی۔ ۱۴۔ کئی اشعار اس میں ایسے ہیں جو ملی شاعری کے زمرے میں آتے ہیں اور نعتیہ عناصر کے حامل ہیں:

یوں جڑ جما رہا ہے محمد کے دین کی	ہے نام مصطفیٰ کی یہ برکت کہ پھر خدا
یہ ہے وصیت اس کے رسول امین کی	بہر خدا یہود و نصاریٰ کو دو نکال
ختم الرسل اور اس کے ہر اک جانشین کی	وہ انبیاء کا مولد و مدفن سپرد ہے
اپنا لہو رگوں میں ہے اس کی زمین کی ۱۵	چودہ برس جو قبلہ رہا ہے رسول کا

آخری شعر کے مصرع ثانی کو جوہر نے یوں بھی لکھا ہے:

قیمت ہے اپنا خون اسی کی زمین کی ۱۶

مولانا محمد علی جوہر کا شعری سرمایہ مقدار میں زیادہ نہیں ہے۔ اس میں بیشتر غزلیات ہیں جسے کلیتاً ملی شاعری میں شمار کرنا تو صحیح نہیں ہے لیکن ان کی غزلوں میں کئی اشعار ایسے نظر آتے ہیں جن

میں جوہر کا ملی کرب نہ صرف بر عظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ کے لیے بلکہ عالم اسلام کے لیے بہت واضح طور پر جھلکتا ہے۔ مذکورہ بالا غزل کو صرف ہیئت کے لحاظ سے ہی غزل کہا جاسکتا ہے ورنہ اس میں غزل یا روایتی غزل جیسی کوئی بات نہیں ہے اور کوئی مناسب عنوان دے کر اسے بآسانی نظم قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسی قبیل کی جوہر کی دیگر غزلیات ہیں۔ کئی غزلیات مولانا محمد علی جوہر کے ایام اسیری کی یادگار ہیں لیکن اسیری کے دوران بھی جوہر دل شکستہ نہیں ہوتے۔ ان کا جذبہ اسلامی اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت انھیں مایوسی سے بچائے رکھتی ہے۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ چند منتخب اشعار درج ذیل ہیں:

مرا یہ شور و شیون سب در باغ جناں تک ہے فغان بلبل نالاں بہارِ بے خزاں تک ہے
بھلا مایوس کیوں کر اس سے ہو امت محمد کی کہ جس نصرت کا وعدہ ہر ضعیف و ناتواں تک ہے
ایک دوسری غزل جس کا مطلع ثانی ہے:

قید ہے جوہر کہ بیجا پور کی تسخیر ہے گو کلنڈے بھی جو جا پہنچے تو عالم گیر ہے
اور آگے چل کے واضح کرتے ہیں کہ قرآن پاک بھی انھیں اس لیے عزیز ہے کیوں کہ اس میں
سرورِ کائنات کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتی ہے:

ہو محمد کیوں نہ قرآن اور بھی ہم عزیز اس میں خود تیری جو جیتی جاگتی تصویر ہے ۱۸
جوہر یہ بات اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اگر روزِ محشر، شافعِ محشر کی شفاعت نصیب نہ ہو تو مسلمان
بے یار و مددگار ہو جائیں گے۔ جوہر کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

سینہ ہمارا فگار دیکھیے کب تک رہے چشم یہ خونناہ بار دیکھیے کب تک رہے
اس غزل میں کئی ملی اشعار ہیں۔ ایک شعر میں امت مسلمہ کی امیدوں کا تذکرہ کرتے ہوئے
کہتے ہیں:

امتِ احمد کو ہے فضل کی تیرے امید فضل کی امید وار دیکھیے کب تک رہے ۲۰
مولانا محمد علی جوہر کے دیوان میں، جسے دیوان کہنا درست نہیں ہے کیوں کہ اس میں غزلیات
ردیف وار نہیں ہیں، ایک نظم ”شانِ کلکتہ“ کے عنوان سے ہے جو کلکتہ میں ہنگامے اور حکومت کے
مسلمانوں پر تشدد سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے جس میں شاعر نے مسجدِ کان پور کا بھی فخر یہ تذکرہ کیا ہے:
اللہ نے بڑھائی ہے کیا شانِ کلکتہ روحِ رسول آج ہے مہمانِ کلکتہ

یثرب کی خاکِ پاک کے ہر ذرہ کے لیے سوجان سے فدا ہیں غلامانِ کلکتہ
 مسرور خلد میں ہیں شہیدانِ کان پور ہوں گے شریکِ بزمِ شہیدانِ کلکتہ ۲۱
 سرسید احمد خان کی قومی خدمات کے محمد علی جوہر زبردست مداح تھے۔ ۱۹۰۷ء میں سرسید ڈے
 کے موقع پر جوہر نے ایک نظم پڑھی تھی جس کا عنوان ”عرضداشتِ بخدمتِ سرسید احمد خان مرحوم و
 مغفور“ تھا۔ ۲۲ پوری نظم میں سرسید کے کارناموں کو، جو انھوں نے ملک و قوم کے لیے کیے، زبردست
 خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ ایک شعر میں سرور کونین کے حوالے سے کہتے ہیں:
 ملا ہے تم کو ورثہ قوم کی مشکل کشائی کا عزیزِ مصطفیٰ تم ہو عزیزِ مرتضیٰ ۲۳
 جوہر کی غزلیات سے چند اور شعر پیش کیے جاتے ہیں جو ذکرِ مصطفیٰ کے حامل ہیں:
 کافر ہنسی اڑائیں خدا کے وعید کی ساعت نہ یوں ٹلے گی عذابِ شدید کی
 ہے خواب میں بھی حسنِ پیمر تجھے حجاب جوہر کی آرزو ہی رہی تیری دید کی ۲۴
 نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پر اتنا ہے کہ ہاں نام محمد مرتے دم وردِ زباں پایا ۲۵
 ہے محمد کی شفاعت تو خدا کی رحمت حشر کیا عید ہے امت کے گنہگاروں کی ۲۶
 بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بُلا بھیجیں بھیجی ہیں مصلیٰ کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں ۲۷
 مولانا محمد علی جوہر کا مختصر شعری سرمایہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اگر وہ سیاست اور
 صحافت کے گرفتارِ بلا نہ ہوتے تو ان میں بڑا شاعر بننے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ لیکن اس مختصر سے
 سرمائے میں بھی ملتِ اسلامیہ کا درد، اتحادِ اسلامی کی آرزو، اپنے دین و مذہب سے سچا لگاؤ اور خاص
 طور پر خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے عناصر پوری طرح جلوہ گر ہیں۔



حواشی

- ۱۔ قدوائی، توکل حسین، مقدمہ بر ”مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات“، ص ۸
- ۲۔ دریابادی، عبد الماجد، مولانا، ”مولانا محمد علی کی جامعیت“، ص ۲۴
- ۳۔ یوسفی، اللہ بخش، ”علی برادران، نام و نسب“، ص ۱۱۳
- ۴۔ ایضاً، ص ۲۴ ۵۔ ایضاً
- ۶۔ قدوائی، توکل حسین، بحولہ بالا، ص ۱۸
- ۷۔ نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، ”اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار“، ص ۹۰

۸۔ قادری، محمد ایوب، پروفیسر، تعارف بر ”مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات“، ص ۲۰

۹۔ برنی، انعام عظیم، ”مولانا محمد علی جوہر کی شاعری ایک آپ بیتی“، ص ۱۱۶

۱۰۔ شاہجہاں پوری، ابوسلمان، ڈاکٹر، ”مولانا محمد علی جوہر اور اقبال“، ص ۲۴۱

۱۱۔ برنی، انعام عظیم، محولہ بالا، ص ۱۱۶

۱۲۔ حسین، اعجاز، ڈاکٹر، ”مختصر تاریخ ادب اردو“، ص ۳۵۱

۱۳۔ محمود الرحمان، ڈاکٹر، ”جنگ آزادی کے اردو شعراء“، ص ۲۴۵

۱۴۔ ”دیوان جوہر“، ص ۵۱

۱۵۔ ایضاً ۱۶۔ ایضاً ۱۷۔ ایضاً، ص ۶۳ ۱۸۔ ایضاً، ص ۸۵

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱ ۲۰۔ ایضاً، ص ۱۳۲ ۲۱۔ ایضاً، ص ۱۵۴ ۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۶۴ ۲۴۔ ایضاً، ص ۱۰۱ ۲۵۔ ایضاً، ص ۱۰۵ ۲۶۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۳۱

فہرست اسناد محولہ

برنی، انعام عظیم، ۱۹۷۸ء، ”مولانا محمد علی جوہر کی شاعری ایک آپ بیتی“، مشمولہ: ”سہ ماہی“ ”العلم“ (کراچی)، مولانا محمد علی جوہر نمبر

حسین، اعجاز، ڈاکٹر، ۱۹۵۶ء، ”مختصر تاریخ ادب اردو“، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، پہلا پاکستانی ایڈیشن
دریابادی، عبدالماجد، مولانا، ۱۹۷۸ء، ”مولانا محمد علی کی جامعیت“، مشمولہ: ”العلم“ (سہ ماہی)، مولانا محمد علی جوہر نمبر،
کراچی

ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر، ۱۹۷۹-۷۸ء، ”مولانا محمد علی جوہر اور اقبال“، مشمولہ: ”علم و آگہی“ (کراچی)،
مجلہ گورنمنٹ نیشنل کالج

قادری، محمد ایوب، ۱۹۹۰ء، تعارف بر ”مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات“، مؤلف، ثناء الحق صدیقی، آل
پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، بار دوم

قدوائی، توکل حسین، ۱۹۹۰ء، مقدمہ ”مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات“، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس،
کراچی، بار دوم

محمود الرحمن، ڈاکٹر، ۱۹۸۶ء، ”جنگ آزادی کے اردو شعراء“، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، بار
اول

نیر، طاہرہ، ڈاکٹر، ۱۹۹۹ء، ”اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار“، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، بار اول
یوسفی، اللہ بخش، ۱۹۷۸ء، ”علی برادران نام و نسب“، مشمولہ: ”سہ ماہی“ ”العلم“ (کراچی)، مولانا محمد علی جوہر نمبر جوہر، محمد
علی، مولانا، ۱۹۶۲ء، ”دیوان جوہر“، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، بار اول

جین اور کر سچین نعت گو شعرا

ABSTRACT:

Beauty reflected by atmosphere or person, is always instinctively loved by human being. Al-Mighty Allah has bestowed upon His Prophet Muhammad (S.A.W) highest degree of good qualities of character besides unique handsome personality. Hence, every sane writer praises Him (S.A.W) in the shape of prose or poem. Muhammad (S.A.W) has been paid tributes in each and every language spoken in the world without discrimination of religion. Examples have been cited from Naatia Poetry done by Jane and Christian Urdu poets in praise of Holy Prophet Muhammad (S.A.W), in the article placed herein. Some couplets reflect so deep love for Prophet Muhammad (S.A.W.) that one can hardly believe to have been written by non Muslim poets.

عالم انسانیت کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام رحمت عالم سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو دنیا کی تمام غیر مسلم اقوام میں بھی اپنی نورانی صفات، پاکیزہ سیرت اور آفاقی تعلیمات کے سبب تاریخ انسانی کی سب سے اعلیٰ، سب سے برتر اور سب سے افضل شخصیت تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقائد اور شعائر سے اختلاف اور مسلم قوم سے سیاسی و تہذیبی معاندت یا سخت ترین دشمنی کے باوجود غیر مسلم اقوام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی صدیوں سے قائل ہیں۔ دنیا کی تمام بڑی چھوٹی رائج و معدوم زبانوں کے علماء اور حکماء گزشتہ چودہ صدیوں سے اپنی تحریروں میں پیغمبر اسلام کی تعریف و توصیف کرتے آئے ہیں سید البشر کی تعریف و توصیف کے شاعرانہ اظہار کا ہی نام نعت ہے۔ توحید و رسالت پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں کے لیے تو اپنے پیغمبر، اپنے ہادی برحق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا اور اپنی شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے نثر و نظم میں رطب اللسان ہونا ایمانی تقاضا ہے، لیکن ان اقوام کے لیے جو اسلامی اصولوں کے برعکس

مذہبی عقائد رکھتی ہوں ان کے شعراء اور اہل دانش کا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کرنا محسن انسانیت پیغمبر اسلام کی عظمتوں کو تسلیم کرنا اور اپنے علم و فن سے مسلمان بھائیوں کی دلداری کرنا ہی کہا جاسکتا ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان صدیوں سے مختلف مذاہب، گونا گوں عقائد، رنگارنگ تہذیبوں اور زبانوں کا خوبصورت گلدستہ رہا ہے۔ اس وسیع و عریض دنیا کے کسی ملک کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے جہاں اتنی مختلف الخیال قومیں بقائے باہم اور مشترک اقدار حیات کے ساتھ صدیوں سے شیر و شکر کی طرح ایک ساتھ رہتی آئی ہوں۔ کثرت میں وحدت، احترام کل مذاہب اور انسانی رواداری کا انقلابی فروغ اس سرزمین پر اسلام کی آمد کے بعد ظہور میں آنے والی مشترکہ تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ خاص طور پر ہوا۔ اسی مشترکہ تہذیب نے ایک نئی عوامی زبان پیدا کی جو تمام بیرونی اور ملکی تہذیبوں کے امتزاج سے بنی تھی۔ یہ ہندی یا اردو زبان ہے جس نے اس ملک کی تمام بڑی قوموں میں سماجی اور انسانی ہم آہنگی پیدا کر دی اس طاقتور زبان نے رواداری، فراخ دلی، روشن خیالی اور انسانی قدروں پر مبنی انقلاب برصغیر کی سرزمین پر برپا کیا یہ اسی زبان کا کرشمہ ہے کہ توحید و رسالت پر ایمان رکھنے والے مسلمانوں نے یہاں کے غیر مسلموں کے مذہب و عقیدے کے احترام میں ان کے مذہبی پیشواؤں کا احترام کیا۔ مسلمان صوفیوں اور شاعروں نے شیو جی، شری رام اور کرشن جی کی مدح و توصیف کے نغمے سنائے جو اسلامی تعلیمات اور اصولوں کے قطعی برعکس تھا لیکن محبت کا جواب محبت ہوتی ہے یہاں کے غیر مسلموں نے بھی پیغمبر اسلام کی شاخوانی میں کوئی کمی نہیں کی۔ ہندو، مسلم، سکھ، جین، عیسائی سبھی ترقی یافتہ قوموں کی مشترکہ زبان اردو کا عظیم شعری سرمایہ شاہد ہے کہ ہندوستان مذہبی رواداری اور احترام کل مذاہب کی دنیا میں یہ سب سے انوکھی مثال ہے۔

ہندوؤں کا ایک نہایت اہم فرقہ جین مت ہے۔ اس کے عقائد اور مذہبی نظریات قدیم اکثریتی ہندو دھرم سے یکسر مختلف ہیں۔ مذہب کے معاملے میں یہ طبقہ خاص سخت گیر تصور کیا جاتا ہے، لیکن اردو زبان کی ہمہ گیری نے جین سماج پر گہرا اثر ڈالا۔ جین برادری میں بھی دوسرے ہندوؤں کی طرح بڑے بڑے دانشور اور شاعر پیدا ہوئے جن کے کارنامے اردو زبان اور تہذیب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس جگہ راقم الحروف کو یاد آ رہے ہیں دہلوی تہذیب کے نمائندے جین سماج کے سرکردہ رہنما اور اردو کے قادر الکلام شاعر جناب دگمبر پرشاد گوہر دہلوی۔ نہایت دھارمک اور باوقار شخصیت کے مالک دگمبر پرشاد گوہر دہلوی شہر کے نامور جوہری تھے، دریہ کلاں میں ان کی سونے چاندی اور جواہرات کی بہت بڑی دکان تھی۔ شاعری کا شوق بچپن سے ہی تھا، اردو فارسی کی اعلیٰ تعلیم

حاصل کی اور اردو کے بہت بڑے شاعر آغا شاعر قزلباش کے شاگرد ہوئے اور غزل گوئی میں خاصا کمال پیدا کیا۔

گوہر صاحب جب تک زندہ رہے جین سماج کی خدمت اور تجارتی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے لیے بھی کوشاں رہے، ان کی دکان شاعروں اور ادیبوں کا مرکز بنی رہتی تھی۔ متمول اور کشادہ دست بھی تھے، بہت سے اردو والے ان سے فیض پاتے تھے۔ مشاعرے اور ادبی شعری محافل کے انعقاد کا انہیں بیحد شوق تھا۔ مشاعروں اور نشستوں میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے تھے۔ اپنے استاد سے انہیں اس درجہ محبت اور عقیدت تھی کہ اپنا کلام سنانے سے پہلے کچھ اشعار اپنے استاد حضرت آغا قزلباش کے ضرور سناتے تھے۔ یہ روایت انہوں نے زندگی بھر نبھائی۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے انہوں نے ادبی جریدہ 'شعلہ و شبنم' جاری کیا تھا جس میں ملک بھر کی علمی ادبی سرگرمیاں اور ہمعصر شاعروں، ادیبوں کی تخلیقات اہتمام کے ساتھ شائع کرتے تھے۔ نئے شاعروں کی خاص طور پر حوصلہ افزائی ان کا پسندیدہ کام تھا۔ دگمپر پرشاد گوہر صاحب نے اسلامی تاریخ اور مذہبی امور کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے انہیں یقیناً گہری عقیدت تھی جو ان کی نعتیہ شاعری میں جھلکتی ہے۔ ان کی ایک نعت میں شب معراج کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کس والہانہ انداز میں بیان کی گئی ہے لگتا ہی نہیں کہ یہ ایک غیر مسلم کا کلام ہے جو اپنے سماج کی اہم مذہبی شخصیت بھی ہے:

کھل گئے چرخ پہ اسرارِ خدا آج کی رات	پڑ گئی عرش پہ بنیاد..... آج کی رات
کوئی دیکھے تو یہ اندازِ عطا آج کی رات	جو بھی دینا تھا وہ خالق نے دیا آج کی رات
ہے فرشتوں میں یہی شورِ بپا آج کی رات	عرش پر آتے ہیں محبوبِ خدا آج کی رات
کس کے پر تو سے منور ہے بساطِ عالم	عرش پر کون ہوا جلوہ نما آج کی رات
ہمقائے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی	خود یہ کہتا ہے محمد سے خدا آج کی رات
نورِ عرفاں سے مرادِ دل بھی ہے روشن گوہر	ظلمتِ کفر میں پھیلی ہے ضیا آج کی رات

دگمپر پرشاد گوہر دہلوی کو تقسیم وطن کے بعد پیدا ہونے والے نامساعد حالات نے بہت صدمہ پہنچایا آپ کی نظروں کے سامنے دلی کی روایات اور اس کی اقدار کو زوال آنے لگا تو دل برداشتہ ہو کر رسالہ بند کر دیا اور مشاعروں، محفلوں سے دور تارک الدنیا کی طرح زندگی بسر کی۔ اسی گوشہ گمنامی میں ۱۹۸۸ء میں دنیا سے رخصت ہوئے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پانی پت کے ایک مشہور شاعر گزرے ہیں جناب شگن چند جین روٹن۔ ان کا شمار اپنے وقت کے مقبول شعرا میں ہوتا تھا۔ انھوں نے غزل، نظم، قصیدہ، رباعی سبھی اصناف میں طبع آزمائی کی، لیکن اردو کی بد قسمتی سے ان کے بعد ان کے ورثا کی عدم توجہی سے ان کا کلام ضائع ہو گیا۔ روٹن صاحب کے ایک طویل نعتیہ مسدس کا یہ بند دیکھئے، زبان و بیان کا کیسا پر شکوہ نمونہ ہے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا کیسا خوبصورت بیان ہے:

جس کے قدموں کے اشارے پہ رہا تاج و کلاہ جو فقیری میں رہا جن و بشر کا بادشاہ
فیض قدرت سے ہوئی جس کو عطا ایسی نگاہ جس کے آگے ماند ہے یہ روشنی مہر و ماہ
اس نے اخلاص و وفا کا بول بالا کر دیا جس نے عالم کے اندھیروں میں اُجالا کر دیا
یہ اردو زبان اور تہذیب کا کرشمہ ہی ہے کہ تقسیم وطن کے بعد جب سماجی اخلاص و محبت اور مذہبی رواداری کے قدیم جذبوں پر مبنی ہندو مسلم اتحاد زوال پذیر ہونے لگا، پنجاب اور سندھ سے ترک وطن کر کے ہندوستان آنے والوں کی اکثریت نے مسلم مخالف سیاست کا ساتھ دیا۔ 'پر تاب' جیسے پردیسی فرقہ پرست اخباروں نے پورے اردو سماج کی فضا میں تکدر بھر دیا، لیکن اس ماحول میں بھی اردو کے ہندو سکھ شاعروں اور ادیبوں نے مشترکہ تہذیبی روایات کے چراغ جلائے رکھے۔ مجاہدِ اردو کی تنظیم حلقہ تشنگانِ ادب نے اردو کی اُجڑی ہوئی راجدھانی کو آباد کیا اور شعر و ادب کی روشنی سے دلوں کو منور کیا اس علمی اور ادبی تنظیم کی سرگرمیاں گزشتہ نصف صدی میں کبھی ماند نہیں پڑیں، پابندی کے ساتھ ہونے والی ادبی شعری نشستوں میں اس عہد کے نامور ہندو، مسلم، سکھ شعرا نے اردو تہذیب کے پرچم کو نفرت انگیز سیاستوں کے شہر دہلی میں آن بان اور شان کے ساتھ بلند رکھا۔ اس تاریخ ساز تنظیم کے برہنہ برس تک سربراہ رہے نامور اردو شاعر جناب جگدیش چند جین۔ یہ ان شخصیتوں میں ہیں جنہیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و روایات کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ اس وقت جین صاحب اردو دنیا کے سب سے معمر اور برگزیدہ شاعر ہیں۔ ۹۲ سالہ جگدیش چند جین کو دہلوی تہذیب کی زندہ علامت بھی سمجھا جاتا ہے آپ کا جنم ۱۹۲۲ء میں دہلی میں ہوا۔ خاندان اور بزرگوں میں اردو شعر و ادب کا ماحول تھا، شہری فضا میں بھی اردو شعر و شاعری کی گونج تھی اس کا اثر ان کے ذہن پر بھی پڑا، اسکول اور کالج کے زمانہ سے ہی علمی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہنے لگے تھے۔

کالج کی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ برطانوی فوج میں میجر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں آپ نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ فوج سے سبکدوش ہو کر آپ آزاد

ہندوستان کے محکمہ ڈاک و تار سے وابستہ ہو گئے اور اپنی غیر معمولی لیاقت اور صلاحیت سے افسر اعلیٰ کے عہدے تک پہنچے۔ پہلے فوج اور پھر محکمہ مواصلات کی مصروفیات کے زمانہ میں ان کے دل میں بے اُردو شعر و سخن کا شوق جوان رہا۔ ۱۹۷۱ء میں دوسری ملازمت سے بھی سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے خود کو پوری طرح اپنے ذوق و شوق کے سپرد کیا۔ اس عمر میں بھی نامور شعرا کی رہنمائی اور ایک طرح کی شاگردی سے گریز نہ کیا۔ شمیم کرہانی، ساغر نظامی، رتھی پٹیلوی، ساحر ہوشیار پوری جیسی شخصیات نے ان کے دیر سے شروع ہونے والے شعری سفر میں بھرپور رہنمائی کی۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے، انھوں نے اس میدان میں اپنی پختہ ذہانت کے خوب جوہر دکھائے۔ ان کی شاعری پر یادگار داغ ابوالفصاحت پنڈت لکھو رام جوش ملیحانی کا رنگ غالب ہے۔ جوش صاحب سے انھوں نے باقاعدہ تلمذ تو حاصل نہیں کیا لیکن وہ انھیں اپنا معنوی استاد مانتے ہیں۔ جگدیش جین کا کلام تصوف اور روحانیت سے لبریز ہے:

پردے میں ہر آواز کے شامل تو وہی ہے میں لاکھ بدل جاؤں مگر دل تو وہی ہے
 ذروں میں دھڑکتے ہوئے دل دیکھے ہوں جس نے نسان کی توقیر کے قابل تو وہی ہے
 جین صاحب نے خوبصورت نعتیں کہیں جن سے شاعرانہ تصنع نہیں دل کی گہرائیوں سے محسوس
 انسانیت، رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ نعت کے یہ شعر ثبوت کے طور پر:
 بادۂ عشقِ نبی سے جس کا دل سرشار ہے درحقیقت ایسا میکشِ خلد کا حقدار ہے
 یوں تو دنیا میں ہزاروں ہی نبی آئے مگر شاہکارِ بزمِ فطرت آپ کا کردار ہے مگر
 موجِ طوفان و حوادث اس کو چھو سکتی نہیں جس سفینے کا کھویا احمد مختار ہے
 کہنا کیا جگدیش کی تقدیر کا اے دوستو! اس کے دل میں بھی حبیبِ کبریا کا پیار ہے

اُردو شاعری کی تاریخ میں جین شعرائے کرام کی خاصی تعداد موجود ہے۔ فی زمانہ زندہ شعرا میں ایک نام مشہور و معروف فلمی موسیقار اور گلوکار رویندر جین کا ہے۔ رویندر جین بینائی سے محروم ہیں لیکن ان کی چشم بصیرت بے نظیر ہے۔ انھوں نے فلموں میں لازوال نغموں کی تخلیق کی ہے۔ اپنی شاعری سے گنگا جمنی اُردو تہذیب کے ایوان کو روشن کیا ہے، بڑے معیاری شعر کہتے ہیں، خدا نے انھیں آواز بھی بہت خوبصورت عطا کی ہے، بھجن گائیکی میں بھی ماہر ہیں۔ مشہور و مقبول ٹی وی سیریل 'رامائن' اور 'مہا بھارت' میں جین صاحب کی آواز نے بھکتی کا رس برسایا ہے۔ انھوں نے اُردو شاعری کی شاندار روایات کے مطابق اپنے روحانی بھکتی رس میں ڈوب کر نعتیں بھی کہیں۔ رویندر جین کی ایک

خوبصورت نعت شریف ملاحظہ کریں:

آپ کی شان عجب شان رسول اکرم	آپ ہیں افضل الانسان رسول اکرم
روزِ اول کے ہیں عنوان رسول اکرم	آپ اللہ کے مہمان رسول اکرم
آپ تکمیل مساوات، امین و صادق	اور محشر کے ہیں سلطان رسول اکرم
آپ کے ماننے والوں میں ضروری تو نہیں	آپ ہیں افضل الانسان رسول اکرم
آپ ہی کی تو بدولت ہے میسر ہم کو	صرف شامل ہوں مسلمان رسول اکرم
آپ اکرام ہی اکرام عطاءے اول	وہ جسے کہتے ہیں قرآن رسول اکرم
آپ کا ذکر ہے وہ ذکر کہ جس کو سن کر	آپ احسان ہی احسان رسول اکرم

پختہ ہو جاتا ہے ایمان رسول اکرم

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کے لیے انتہائی قابلِ احترام ہیں جو پیغمبر اسلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل عالم انسانیت کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے۔ عیسائی مذہب اور اسلام میں بنیادی فرق صرف یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ کی امت کہے جانے والوں نے آپ کو پیغمبر کے بجائے خدا کے بیٹے کا درجہ دیا اور توحید خداوندی کے بجائے تثلیث کے عقیدے کو اپنایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد سابقہ تمام مذاہب اور عقائد منسوخ ہو گئے۔ قرآن کریم نے ایک اللہ کی پرستش اور ایک پیغمبر آخر الزماں رحمت عالم کی اطاعت کا حکم دیا۔ عیسائیت اور اسلام کے مابین اس واضح فرق نے یہود و نصاریٰ کو مسلمانوں کا دشمن بنادیا۔ بڑی بڑی صلیبی جنگوں سے لے کر آج تک کسی نہ کسی صورت میں یہ جنگ جاری رہی ہے، لیکن محسن انسانیت، سید الانبیاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت سے قوم مسیحی کے اہل دانش و بینش بھی منکر نہیں ہیں۔ مغرب کے عظیم مسیحی دانشور سر ولیم میورے نے تو یہاں تک کہہ دیا:

”ہمیں بلا تامل اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ (تعلیم نبوی) نے

ان تمام توہمات کو ہمیشہ کے لیے جزیرہ نمائے عرب سے باہر نکال دیا جو صدیوں سے اس ملک پر چھائے ہوئے تھے۔ بت پرستی خارج البلاد ہو گئی، توحید اور خدا کی لامحدودیت کا تصور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کے دلوں میں جا گزیں ہو گیا۔“

یوں تو مغربی دنیا کے بڑے بڑے عیسائی دانشوروں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا اعتراف

کیا ہے جن کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہے، لیکن اس جگہ روسی ادیب اور فلسفی لیو ٹالسٹائی کا یہ بیان کافی ہے جو پوری مسیحی دنیا کی نمائندگی کر رہا ہے:

”بلاشبہ وہ (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سچے پیغمبر اور کروڑوں انسانوں کے ہادی اور رہبر ہیں۔ انھوں نے گمراہ ولوگوں میں نورِ ایمان پیدا کیا، ان کے دلوں میں حق پسندی کا جذبہ بیدار کیا، انھوں نے اعلان کیا کہ اللہ ایک ہے اور اس کے نزدیک سب انسان برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہایت متواضع، خلیق، روشن ضمیر اور صاحب بصیرت تھے، لوگوں سے اچھا برتاؤ کرتے تھے، اہل عرب آپ کی پاکبازی اور دیانت داری کے قائل تھے اور آپ کو الامین کہتے تھے۔“

یہ اُردو زبان کی دلپذیری اور سحر خیزی ہے کہ ہندوستان میں آکر بس گئے انگریز، فرانسیسی اور عیسائیت قبول کر لینے والے بھی گیسوئے لیلائے اُردو کے اسیر ہو گئے۔ شاعری کے کمالات دکھائے، خوبصورت غزلیں اور نظمیں ہی نہیں دلوں کو چھونے والی نعتیں بھی کہیں۔

۱۸۵۷ء سے نصف صدی قبل ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک بڑے افسر سربراہام کے فرزند جان رابرٹ اُردو کے نامور شاعر گزرے ہیں۔ ان کی پیدائش ہندوستان میں ہی ہوئی تھی، اس لیے اُردو ان کی مادری زبان بن گئی۔ اپنے وقت کے بڑے شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ جان رابرٹ کا کلام مرصع، سلیس اور پراثر ہے، انھوں نے غزل کے علاوہ نعت، سلام، منقبت سب کچھ کہا اور خوب کہا۔ انھوں نے اسلامیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ حمد و نعت میں دل کا جذبہ بھی شامل ہو گیا اور انھوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔ جان رابرٹ کی یہ مرصع نعت ملاحظہ ہو:

رہکِ پد بیضا ہے کفِ پائے محمد	ہے عرش پہ قوسین کی جا، جائے محمد
یوسف سے ہے بڑھ کر رُخ زیبائے محمد	عیسیٰ سے ہے بڑھ کر لبِ گویائے محمد
اک نور کا سورہ تھا سراپائے محمد	والشمس تھے رخسار تو واللیل تھیں زلفیں
روشن ہوا عالم جو یہاں آئے محمد	اندھیر ہوا کفر کا سب دور جہاں سے
بے شک ہے بہشتی جو ہے شیدائے محمد	عصیاں سے بری ہو کے قیامت میں اُٹھے گا

یہ نعت شریف ایک نسلِ انگریز شاعر اٹھارہویں صدی میں کہہ رہا ہے جو شاہ حاتم کے بڑھاپے

اور ذوق کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس لحاظ سے زبان کی سلاست اور کلام کی روانی حیرت انگیز ہے جان رابرٹ کا انتقال ۲۱ مئی ۱۸۲۸ء میں ہوا۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۲۲ برس پہلے۔ اسلامی ادبیات کے محقق نعت گو اور رثائی شاعری کے معروف سنخوڑ عظیم شاعر جناب گوپی ناتھ امسن لکھنوی کے صاحبزادے ڈاکٹر دھرمیندر ناتھ نے اپنی تحقیقی کتاب 'ہمارے رسول' میں جوہر دیو بندی، مالک رام صاحب اور ماہنامہ 'خاتون' کراچی کے 'رسول نمبر' کے حوالے سے ایک انگریز شاعر جارج فان توم کا ذکر کیا ہے جو اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے وہ صاحب اور جرجیس تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۷۹ء میں ان کا انتقال مراد آباد میں ہوا تھا، انھیں بریلی کالج کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ جارج فان کی ایک فارسی نعت شریف کے یہ شعر کس قدر والہانہ عقیدت کے ساتھ کہے گئے ہیں:

اگرچہ چشم ارادت نظر کنی صاحب	برائے صدقِ عقیدت ہمیں بس است دلیل
فروغ داد جہاں را بہ نیرِ اعظم	زنور پاک کہ شہ بخش آں برآلِ خلیل
یکے مسیح مطہر دگر محمد پاک	ضیائے دیدہ اسحاق و نورِ اسماعیل
بوعده ہائے مبارک کہ شد بہ ابراہیم	زبارگاہِ علی حضرتِ خدائے خلیل
شود شفیع یکے بہر حالِ اسماعیل	رسد نجات زدگیر بہ آلِ اسرائیل

دیسی عیسائی شعرائے کرام میں مسٹر ڈی اے ہیرسین کا شمار بیسویں صدی کے نامور بزرگ شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۹۱۹ء میں مراد آباد میں ہوئی تھی، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ابھی حیات ہیں یا نہیں، اگر موجود ہیں تو ان کی عمر ۹۳ سال کی ہوگی۔ ہیرسین صاحب قربان نے اردو ادبیات اور انگریزی میں ڈبل ایم اے اور بی ٹی کی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور محکمہ تعلیم میں ذمہ دار عہدے پر فائز رہے۔ ان کی کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں جن میں 'شیکسپیر کی کہانیاں، مثنوی داستان عجیب، مسیح جہاں (ڈرامہ)، علمی ادبی مضامین کا مجموعہ 'فکر حسین، حرفِ آرزو، 'صلیب کا دور' (شعری مجموعہ) ڈرامہ 'تصویر غالب، افسانوی مجموعہ 'سلگتے خواب'۔ شاعری میں محبوب علی اختر فیروز آبادی، علامہ بشیشور پرشاد منور لکھنوی، پادری ایس ایس ریحانی لکھنوی، رتن پنڈوری اور بخشی اختر امرتسری جیسے مقتدر شعرا سے فن شعر میں رہنمائی حاصل کی آپ نے اردو کے مسیحی شعرا کا ایک مبسوط تذکرہ بھی مرتب کیا جس میں ہندوستان کے تمام ہی عیسائی شاعروں کا ذکر اور نمونہ کلام تحریر کیا ہے۔ قربان کی ایک مرصع نعت شریف دیکھیں، اگر نام چھپا لیا جائے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک غیر مسلم کا کلام ہے:

سنی جس کسی نے صدائے محمد ہوا قلب و جاں سے فدائے محمد

مجھے لے چلو اب مدینے میں یارو
مٹی تیرگی جہالت جہاں سے
اٹھوں گا نہ اب آستانِ نبی سے
بچائیں گے امت کو محشر میں وہ ہی
سرِ عرش ان کو خدا نے بلایا
پسند آیا ان کو بھی قربان جب سے
وہاں مل رہی ہے ہوائے محمد
جو پھیلی عرب سے ضیائے محمد
رہوں گا سدا میں گدائے محمد
وہاں دیکھ لینا وفائے محمد
کچھ ایسی تھی دلکش ادائے محمد
جو میں کر رہا ہوں ثنائے محمد

جولینس نحیف دہلوی بیسویں صدی کے شعرا میں جانا پہچانا نام ہے۔ گزشتہ ساتویں اور آٹھویں
دہائی میں ان کے کلام کی خاصی شہرت تھی۔ مشاعروں اور نشستوں میں کلام ترنم سے سناتے تھے اور
پسند کیے جاتے تھے ۱۹۸۴ء میں ان کا مجموعہ کلام 'آوازِ دل' مکتبہ شانِ ہند سے شائع ہوا تھا۔ اس کا
پیش لفظ علامہ بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے تحریر کیا تھا۔ نحیف دہلوی ۱۷ ستمبر ۱۹۲۷ء کو تحصیل باغبٹ کے
موضع جگھولی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد پادری تھے، نحیف نے یونائیٹڈ کرپچین کالج دہلی میں تعلیم
پائی۔ اس کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے، ان کا گھریلو نام جمشید اللہ بخش تھا، یہی نام ان کے اسکولی
ٹیفلیٹ میں درج تھا۔ ۱۹۴۷ء میں اسی وجہ سے فوج کی نوکری چھوڑنی پڑی، اور اس کے بعد اپنا نام
جولینس رکھ لیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و ادب کا شوق تھا۔ جب استاد شاعر موجِ زیبائی سے تلمذ
اختیار کیا تو نحیف متخلص اختیار کیا۔ ان کا بے حد معیاری کلام ملک کے اخبارات و جرائد میں مسلسل شائع
ہوتا رہا۔ منور لکھنوی نے 'آوازِ دل' کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ جولینس کے اشعار میں داغ کا رنگ
جھلکتا ہے۔ عرشِ صہبائی کا خیال ہے کہ نحیف کے کلام میں اس دور کے جدید شاعروں کی طرح الجھاؤ
اور ابہام نہیں ہے، بلکہ بڑے صاف اور واضح انداز میں شعر کہتے ہیں۔ نحیف کی شاعری سلاستِ بیان
اور صلابتِ زبان، سادگی اور بے تکلفی کا بہترین نمونہ ہے۔ نحیف دہلوی نے بہترین نعتیں بھی کہیں،
ملاحظہ کریں:

مہ و انجم میں دیکھو روشنی صلی علی کی ہے
ملا ہر امتی کو خوب نذرانہ محمد کا
بڑے ہی ناز سے کہتا ہے مستانہ محمد کا
ہوئی انسانیت کی شمع روشن شان و شوکت سے
فلک پر چاند بھی شرما گیا حسنِ لطافت سے
مے توحید سے لبریز پیانہ محمد کا
مبارک ہے جو کہلاتا ہے دیوانہ محمد کا
محبت سارے عالم کو شہِ روزِ جزا کی ہے
ہر اک دل جگمگا اٹھا چراغِ شانِ وحدت سے
منور کیوں نہ ہو جائے زمانہ شمعِ الفت سے

یہ ساری دلکشی دنیا میں شاہِ انبیاء کی ہے
فلک پر دیکھیے کیسی ہوئی ہے کہکشاں روشن
زمین روشن، زماں روشن، ہوا سارا جہاں روشن
تجلی سے نظر آنے لگے کون و مکاں روشن
محیفِ زار کیسے ہیں زمین و آسماں روشن
مہ و انجم میں دیکھو روشنی صلیٰ علیٰ کی ہے

مخلص بدایونی گزشتہ صدی کے نصف اول کے نامور شعرا میں شمار ہوتے تھے ان کے والد بدایوں میں پان کی دکان کرتے تھے، لیکن چچا مراری لال گوہر اردو کے شاعر تھے۔ مخلص بدایونی کا اصل نام الن جون تھا، ان کی پیدائش ۱۸۷۹ء میں بدایوں میں ہوئی شعر و سخن کا شوق زمانہ طالب علمی سے ہی تھا، ۱۹۰۱ء میں شیخ محمود حسین جلیل بدایونی کے شاگرد ہوئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مناقب میں غزلوں کا مجموعہ 'فریادِ حزین' کے عنوان سے غزلوں کا مجموعہ اور نعتیہ منقبتی شاعری کا مجموعہ 'گلدستہ نعت' مخلص بدایونی کی یادگار ہیں۔ ۱۹۵۵ء میں انتقال ہوا۔ مخلص صاحب کے پانچ بیٹوں میں تین کو ان کی شاعرانہ وراثت ملی۔ یہ ہیں سلسلن جون عبرت بدایونی، رابنسن جون حیرت بدایونی اور پریم جون عاجز بدایونی۔ مخلص بدایونی کا ایک نعتیہ شعر بہت مقبول ہوا:

اگر تم دیکھنا چاہو خدا کو

کرو راضی محمد مصطفیٰ کو

موجودہ مسیحی شعراء میں نذیر قیصر کا نام خاصی علمی و ادبی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو اور پنجابی میں یکساں دسترس حاصل ہے اور دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں، کئی وقیع شعری مجموعوں کے خالق ہیں، صحافت سے بھی تعلق ہے، کافی وقت تک اردو ہفت روزہ 'صدائے حق' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ ان کے شعری مجموعے 'تیری آنکھیں، چہرہ، ہاتھ' گنبدِ خوف سے بشارتِ اردو کی نئی شاعری میں قابلِ قدر اضافہ تسلیم کیے گئے۔ قیصر نے نعتیہ شاعری میں بہت شہرت و ناموری حاصل کی۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ 'اے ہوا مؤذن ہو' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا تھا۔ پیش ہے عام روش سے ہٹ کر اور بالکل نئے لب و لہجے میں کہی گئی نذیر قیصر کی۔ ایک مرصع اور خیال آفرین نعت شریف۔

تیرے قدموں کی صدا دل میرا

اور سرِ بابِ دعا دل میرا

شاخ کے ساتھ جھکا دل میرا

حرف در حرف لکھا دل میرا

اک کتاب، ایک دیا دل میرا

خامشی، غارِ حرا، دل میرا

گنبدِ سبز پہ تاروں کا ہجوم

صبح کے ساتھ جھکی شاخِ گلاب

لوح در لوح ترے نقشِ قدم

ڈوبتی رات کے ستارے میں

اور ستارے نے کہا، بول میرا
اُن زمانوں کی ہوا، بول میرا

انساں کا ہے مقام کہاں تک بتا گئے
جینا سکھا گئے، ہمیں مرنا سکھا گئے
مجھڑے خاک پر رقم اُس کے
تارے اترے ہیں غم بہ غم اُس کے

روشنی طاقِ ابد سے اُتری
جن زمانوں میں تری خوشبو تھی
قیصر کے دو نعتیہ قطعات بھی دیکھیں:
پل میں درائے عرش گئے اور آ گئے
قیصرِ باں سے بڑھ کے ہو کیا ملکِ زندگی
آساں آساں قدم اُس کے
لہر بکھری ہے یم بہ یم اس کی
اور آخر میں مسیحی لہ آباد کا یہ بلیغ شعر:

سجِ نامری آئے تمہاری دینے خوش خبری
جو روحِ صدق ہے انجیل میں وہ رہنا تم ہو

ۛۛۛ

ڈاکٹر رفاقت علی شاہد۔ لاہور

نعتیہ گل دستہ ”سفینہ نجات“، دہلی

ABSTRACT:

Safina-e-Najat was a flowers' vase of Naatia poetry that was published in 1898 by Muhammad Hakim Khan Haziq. This article depicts some research comments on the date of publication and publishers name. This flowers' vase carry poetry of only 21 poets on the suggested pattern of expression i.e. 'Misra-e-Tarh'. Harmony could not prevail in judging quality of poetry for the purpose of publishing. Poetry of some poets' occupied much space than others.

اردو گل دستوں کی روایت کے ساتھ ساتھ نعتیہ گلدستوں کی روایت بھی اردو ادب کی انفرای اور بے مثال پہچان ہے۔ اردو میں متعدد نعتیہ گلدستے جاری ہوئے۔ ان میں سے بعض تو دیگر گل دستوں کی طرح مختصر زندگی کے بعد اپنی یاد چھوڑ گئے لیکن کچھ گل دستے ایسے بھی تھے جو تا دیر اپنی مہک سے گلستانِ ادب کو معطر کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہے۔ ایسے گل دستوں میں سے ایک نعتیہ گل دستہ دہلی کا ”سفینہ نجات“ ہے۔

”سفینہ نجات“ کا ذکر تو تاریخِ ادب و صحافت میں موجود نہیں۔ صرف اسی گل دستے کا کیا مذکور، ۱۸۸۸ء کے بعد شائع ہونے والے کئی گل دستوں کے ذکر سے اردو ادب اور اردو صحافت کی تاریخیں خالی ہیں۔ کیوں کہ اردو گل دستوں اور اردو اخبارات و رسائل کی تاریخ پر بنیادی کتاب ”اختر شہنشاہی“ ہے جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی اور اس میں اسی سنہ تک کے اخبارات، رسائل اور گل دستوں کا ذکر ہے۔ امداد صابری مرحوم کی کتابیں ”تاریخ صحافت اردو“ پہلی تین جلدوں میں اور گل دستہ صحافت بیشتر اسی ماخذ پر مشتمل ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں کتابوں میں بھی ”سفینہ نجات“ کا ذکر نہیں ہے۔

”سفینہ نجات“ کے ایک شمارے کا عکس میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ ساتویں جلد کا آٹھواں شمارہ

ہے۔ یہ شمارہ جامعہ پشاور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا سرورق موجود نہیں۔ البتہ پشت پر ورق موجود ہے جس کے دونوں صفحات پر کتابوں کے اشتہار ہیں۔ پشت ورق پر سرخ رنگ کے کاغذ پر طبع ہوا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرورق بھی اسی رنگ کے کاغذ پر طبع ہوا ہوگا۔ اس شمارے کی کل ضخامت سولہ صفحات ہے جس میں پشت ورق کے دو صفحات شامل نہیں۔ گل دستوں کی روایت کے مطابق شروع میں مصرع درج ہے اس کے بعد شاعروں کے تخلص کی الف بائی ترتیب سے طرچی کلام درج ہے۔ اسی طرح روایت کے مطابق طرچی کلام کے آخر میں آئندہ کے لیے طرچی مصرعے درج ہیں۔

پیش نظر شمارے کے پہلے صفحے پر سب سے اوپر جلد و شمارے اور اس کے مطابق عیسوی و ہجری مہینے و سال کا اندراج ہے۔ اندراج کے مطابق یہ جلد ۷ کا شمارہ ۸ بابت ”ماہ اگست ۱۹۰۴ء اور مطابق جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۳ھ“ ہے اس سے معلوم ہوا کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ نے اپنی اشاعت کے چھ سال مکمل کر لیے ہیں اور اب ساتویں سال میں اس کی اشاعت جاری ہے یوں معلوم ہوا کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کا آغاز (۱۹۰۴ء-۶) ۱۸۹۸ء میں ہوا۔ جلد شمارہ نمبر کے اس اندراج سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ”سفینہ نجات“ کے شماروں کی نمبر شماری عیسوی سال اور مہینوں کے مطابق کی جاتی تھی اور اس کی نئی جلد کا آغاز جنوری سے ہوتا تھا۔ اسی حساب سے یہ آٹھواں شمارہ بابت اگست ہے۔ عیسوی سال اور مہینوں سے جلدوں اور شمارہ نمبروں کا حساب انیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں عام تھا۔ اردو اخبارات میں تو اس کا التزام شروع سے تھا البتہ بعض رسائل خصوصاً مذہبی، اسلامی رسائل میں ہجری سال اور مہینوں کے مطابق جلد اور شمارہ نمبر کا حساب درج ہوتا تھا۔

یہ تو اندازہ ہو گیا کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ ۱۸۹۸ء میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا لیکن یہ طے ہونا مشکل ہے کہ یہ ۱۸۹۸ء میں کس مہینے سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اردو کے قدیم رسائل اور گل دستوں میں یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کوئی جریدہ جنوری کے بعد اور دسمبر سے قبل کسی مہینے میں شروع ہوا تو سال کے بارہ شمارے مکمل کرنے کے بجائے دسمبر تک کے شماروں پر مشتمل پہلی جلد مکمل کر دی جاتی تھی اور نئے سال یعنی اگلے سال جنوری کے مہینے سے دوسری جلد کا آغاز کر دیا جاتا تھا۔ ممکن ہے کہ ”سفینہ نجات“ کے سلسلے میں بھی یہی طرز عمل روارکھا گیا ہو۔ ایسی صورت میں یہ واضح ہونا مشکل ہے کہ اس گل دستوں کا آغاز جنوری ۱۸۹۸ء سے ہوا یا اس کے بعد کے کسی مہینے سے۔

میرے گذشتہ مضمون ”اردو کے چند نعتیہ گل دستے“ (مشمولہ مجلہ نعت رنگ کراچی، شمارہ ۲۳، صفحات ۲۲۹ تا ۲۴۰) میں ”سفینہ نجات“ کے اجرا کا سال ۱۸۹۷ء درج ہو گیا ہے۔ یہ درست نہیں کتابت کی غلطی ہے۔ گل دستے کے پیش نظر شمارے میں کل ۲۱ شعرا کا نعتیہ طرحی کلام شائع ہوا ہے۔ ان میں سے بعض شعرا کی نعتیہ غزلوں کے زیادہ شعر شامل کیے گئے ہیں جب کہ اس کے مقابلے میں بعض شعرا کے نسبتاً کم شعر درج ہیں اس کی تفصیل درج ذیل گوشوارے یا فہرست شعرا سے معلوم ہوتی ہے۔

(۱) ایرج، نواب محمد شوکت علی خاں بہادر، شاگرد حسان الہند (ص ۱-۱۱ شعر مع مطلع و مقطع)

(۲) اختر، منشی محمد عبدالقادر، سوداگر کیا مٹی و سیکرٹری محفل نقشِ سخن، برادرزادہ و شاگرد سعید کیا مٹی (ص ۲، ۳-۲۸ شعر مع مطلع اول و دوم اور مقطع)

(۳) اسد، منشی عطاء جان تلمیذ حسان الہند رضوان علی خاں رضوان (ص ۳، ۴-۱۳ شعر مع مطلع اول و دوم اور مقطع)

(۴) اشرف، نواب میاں جان خاں، شاگرد ایرج (ص ۴-۸ شعر مع مطلع اول و ثانی مقطع)

(۵) الیاس، محمد الیاس، ساکن چلیپانہ، شاگرد مولا بخش مدرس مدرسہ پپلسانہ، ضلع مراد آباد (ص ۴، ۵-۹ شعر مع مطلع و مقطع)

(۶) آزل، حکیم سید محمد برہان الحق، رئیس امر وہہ، شاگرد حسان الہند (ص ۵-۵ شعر مع مطلع و مقطع)

(۷) ارشد، نواب محمد رشید الدین احمد خاں، رئیس مراد آباد، شاگرد حسان الہند (ص ۵، ۶-۱۳ شعر مع مطلع و مقطع)

(۸) تمکین، نواب محمد اکبر علی خاں، رئیس مراد آباد (ص ۶، ۷-۲۲ شعر مع مطلع و مقطع)

(۹) حاذق، منشی شیخ بھیکن، ممبر بزم سرور سخن، از دھرن گاؤں، تلمیذ مولوی ناصر خاں نذر آبادی (ص ۷-۷ شعر مع مطلع و مقطع)

(۱۰) خاقان، شیخ محمد ابن شیخ بڑے صاحب، جمعدار تحصیل ساکن، ضلع باس، حال مقیم تعلقہ پوسد، شاگرد حاذق الہند مہتمم ”سفینہ نجات“، دہلی (ص ۷، ۸-۱۶ شعر مع مطلع اول و دوم و سوم اور مقطع)

(۱۱) رضوان، حسان الہند نواب حاجی رضوان علی خاں بہادر (ص ۸، ۹-۲۹ شعر مع مطلع اول تا پنجم اور مقطع)

(۱۲) ریاض، محمد ریاض الدین تاجر عطر عطر خلت اصغر مولوی عظیم اللہ مرحوم، تلمیذ حاذق مہتمم گل دستہ

ہذا (ص ۱۰۔ ۷ شعر مع مطلع و مقطع)

(۱۳) سعدی، سعد اللہ خاں، ساکن پیلیمانہ، ضلع مراد آباد، شاگرد مولا بخش مدرس مدرسہ پیلیمانہ (ص ۱۰۔ ۵ شعر مع مطلع و مقطع)

(۱۴) صادق، منشی شیخ امیر، خلف الرشید بھیکن میمر بزم سرور سخن، از دھرن گاؤں (ص ۱۰۔ ۳ شعر)

(۱۵) عاصی، حافظ فتح یاب خاں، سوداگر ناگ پور، تلمیذ شریق مرحوم (ص ۱۱۔ ۱۲ شعر مع مطلع و مقطع)

(۱۶) عریقی، منشی عبدالقادر، مدرس مدرسہ جنڈ، ضلع جالندھر (ص ۱۱۔ ۱۲۔ ۶ شعر)

(۱۷) فروغ، منشی محمد حسین مراد آبادی، تلمیذ تمکین (ص ۱۲۔ ۷ شعر مع مطلع و مقطع)

(۱۸) مشاہیر، منشی عبدالودود، فرزند محمد عبدالرحمن، از سلمیر، ضلع جنوبی ارکاٹ (ص ۱۳۔ ۱۲ شعر مع مطلع اول

تثالث اور مقطع

(۱۹) مولا، منشی مولا بخش، مدرس مدرسہ پیلیمانہ، ضلع مراد آباد (ص ۱۳، ۱۲۔ ۱۶ شعر مع مطلع اول ثالث

اور مقطع)

(۲۰) منیر، منشی محمد منیر خاں، مولود خواں، سکۂ جبل پور (ص ۱۴، ۱۵۔ ۱۳ شعر مع مطلع اول ثالث

اور مقطع)

(۲۱) نیر برہما، سید محمد بدیع الرحمان برہماوی، ساکن ارکان ناہیرنگی، تلمیذ حسان الہند (ص ۱۵۔ ۹ شعر مع

مقطع)

پیش نظر شمارے میں شامل مذکورہ بالا شعرا کی فہرست سے کئی باتوں کا اندازہ ہوتا ہے سب سے

پہلے تو اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ گل دستے میں صرف دہلی کے شعرا کا کلام شائع نہیں ہوتا تھا بل کہ

ہندوستان کے دور دراز کے علاقوں کے شعرا بھی اپنا کلام اس میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ موجودہ

شمارے میں زیادہ تر مراد آباد کے شعرا کا کلام بھی شامل ہے۔ دہلی کے محض دو تین شعرا ہی اس میں

شامل ہیں۔ ان میں بھی گل دستے کے مہتمم اور ان کے شاگرد کا ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ

جالندھر، کیا مٹی (کامٹی) ناگپور، جنوبی ارکاٹ اور ارکان ناہیرنگی جیسے دور دراز مختلف علاقوں کا کلام

گل دستے میں شامل ہے۔ اس امر کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شاعر کا حتیٰ کہ مہتمم گل دستہ کا تعلق بھی

خاص دہلی سے نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مہتمم کا تعلق مضافات دہلی سے تھا۔ غالباً اسی وجہ سے

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے شروع کے زمانے میں دہلی اور اطراف دہلی کے معروف

شعرا گل دستے کے زیر نظر شمارے سے غیر حاضر ہیں۔

اردو گل دستوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں موصولہ کلام کا انتخاب شائع کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر گل دستے کے ضوابط میں یہ تحریر ہوتا تھا کہ منتخب یا اچھا کلام ہی گل دستے میں شائع کیا جائے گا۔ البتہ طرحی و غیر طرحی کلام اجرت پر بھی درج کیا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں کلام کا انتخاب نہیں کیا جاتا تھا۔ بل کہ فی شعر مقررہ اجرت کے حساب سے اجرت ادا کر کے غیر منتخب اشعار درج کرائے جاسکتے تھے۔ یہ خصوصی طور پر گل دستوں کا ذریعہ آمدن تھا۔

گل دستہ ”سفینہ نجات“ کے زیر نظر شمارے میں شامل کلام سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کچھ شعرا کا کلام اجرت لے کر شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ اوپر کی درج فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض شعرا کی غزلوں کے تو ۳، ۵، ۷، ۸، ۹ شعر شائع ہوئے ہیں لیکن بعض شعرا کی غزلوں میں ۱۶ سے لے کر ۲۹ شعر تک درج ہیں۔ تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوا کہ اس میں کمی بیشی کا تعلق کلام کے معیار سے ہرگز نہیں۔ جن شعرا کی غزلوں میں ۹ سے زیادہ اشعار موجود ہیں ان کے تمام اشعار معیاری نہیں بل کہ عام اور کمزور شعر بھی ان غزلوں کا حصہ ہیں۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان شعرا کی ایسی غزلیں اجرت لے کر شائع کی گئی ہیں۔ ان شعرا کی فہرست میں سے حسان الہند رضوان مراد آبادی کو نکالا جاسکتا ہے۔ اول تو انیسویں صدی کے قرب و جوار میں وہ ایک معروف نعت گو گردانے جاتے تھے دوسرے اُن کا حلقہ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ ”سفینہ نجات“ کے اس شمارے میں اُن کے سات شاگردوں کا کلام شامل ہے۔ گویا موجود شمارے کے ایک تہائی شریک شعرا اُنھی کے شاگرد ہیں چنانچہ دونوں حیثیتوں سے اُن کا کلام تبرک کے طور پر اور گل دستے کے لیے اعزاز سمجھ کر شامل ہوتا ہوگا۔

مذکورہ بالا فہرست سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پیش نظر شمارے میں مہتمم گل دستہ کا کلام شامل نہیں لیکن اُن کے دو شاگردوں (خاقان، ریاض) کا طرحی کلام شامل ہے۔

طرحی کلام کے اختتام پر مطبع حقانی، دہلی کی آٹھ کتابوں اور ایک ”نقشہ درگاہ خولجہ بزرگ اجمیری“ کا اشتہار ہے (ص ۱۵-۱۶) اس کے بعد آئندہ دو شماروں کے لیے طرحی مصرعے درج ہیں۔ آخر میں پرچے گل دستے کی بروقت اشاعت کے لیے معذرت خواہانہ بیان ہے جو مہتمم گل دستہ کی جانب سے ہے۔

گل دستہ ”سفینہ نجات“ کا دہلی کے مالک اور مدیر کے بارے میں کوئی معلومات نہیں

ملتیں۔ پیش نظر شمارے کے مندرجات سے بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ مذکورہ شمارے کا سرورق موجود نہیں۔ اس کا سرورق موجود ہوتا تو گل دستے کے مدیر، مالک، مطبع، مقام اشاعت اور شرائط و ضوابط وغیرہ کے بارے میں معلوم ہو جاتا۔ موجودہ صورت میں موجودہ شمارے کے اندراجات کے ذریعے اندازے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اندازوں کے حق میں مضبوط شواہد موجود ہیں جن کی وجہ سے یہ اندازے یقین کی حد تک قائم کیے جاسکتے ہیں۔

عبدالحکیم خاں حاذق کو متعدد جگہ گل دستے کا مہتمم لکھا گیا ہے۔ موجودہ شمارے کے پشت ورق پر ایک اندراج یوں ہے: [محمد عبدالحکیم خاں حاذق مہتمم گل دستہ ”سفینہ نجات“، دہلی] ۲

اس کے علاوہ اس شمارے میں شیخ محمد خاقان اور محمد ریاض الدین ریاض کو ”حاذق مہتمم گل دستہ ہذا“ اور ”مہتمم ”سفینہ نجات“، دہلی کا شاگرد لکھا ہے۔ ۳ دو جگہ محمد عبدالحکیم خاں حاذق کو مطبع حقانی، دہلی کا مالک لکھا گیا ہے۔ ۴ ایک جگہ ”مختصر فہرست کتب موجودہ دفتر ”سفینہ نجات“ درج ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ ”تمام درخواستیں بنام محمد عبدالحکیم خاں مالک مطبع حقانی، دہلی ہونی چاہئیں۔“ ۵ ان تمام اندراجات سے معلوم ہوا کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کے مہتمم عبدالحکیم خاں حاذق تھے۔ وہ مطبع حقانی، دہلی کے مالک بھی تھے۔ آخری اندراج میں ”سفینہ نجات“ کے دفتر کے عنوان کے آخر میں مطبع حقانی کا نام و پتا لکھا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کے دفتر اور مطبع حقانی کا پتا ایک ہی تھا۔

آئندہ کے طرحی مصرعوں کے بعد اعلان کے آخر میں ”راقم حاذق“ کے اندراج سے پتا چلتا ہے کہ گل دستے کے مدیر و مرتب حاذق ہی ہوں گے۔ گل دستے کے دفتر مطبع حقانی کے پتے کا مشترک ہونا اس جانب اشارہ کناں ہے کہ مطبع حقانی اور گل دستہ ”سفینہ نجات“ کا مالک ایک ہی شخص ہے۔ مطبع حقانی کے مالک بھی حاذق تھے یوں یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کے مالک بھی وہی ہوں گے۔

ان اندازوں اور شواہد سے معلوم ہوا کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کے مالک، مدیر و مرتب اور مہتمم ایک ہی شخص محمد عبدالحکیم خاں حاذق تھے۔ حاذق کا جب مطبع اپنا تھا تو فطری طور پر ان کا گل دستہ بھی یہیں سے طبع ہوتا ہوگا۔ مطبع اور گل دستے کے پتے ایک ہونا یہ بھی واضح کرتا ہے کہ گل دستہ ”سفینہ نجات“ کی اشاعت مطبع حقانی، دہلی سے ہوتی تھی۔

گل دستہ کے موجودہ شمارے میں منشی شیخ بھیکن کا کلام بھی شائع ہوا ہے۔ لیکن ان کا صرف تخلص ہی گل دستہ کے مہتمم عبدالحکیم خاں حاذق سے ملتا ہے۔ شخصیت ان سے بالکل علاحدہ ہے۔ دونوں کے نام میں واضح فرق ہے (محمد عبدالحکیم خاں۔ منشی بھیکن) دونوں کے توطن میں بھی فرق ہے۔ حاذق مہتمم گل دستہ کا تعلق دہلی سے تھا جب کہ منشی شیخ بھیکن کا وطن دھرن گاؤں تھا۔ اسی طرح منشی شیخ بھیکن کو حمیر بزم سرور خن اور تلمیذ مولوی ناصر خاں نذر آبادی لکھا ہے لیکن محمد عبدالحکیم خاں کے ساتھ ایسا کوئی اندراج موجود نہیں۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ منشی شیخ بھیکن کا حوالہ مذکورہ شمارے میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک خود ان کے ذکر میں اور دوسرے ان کے بیٹے منشی شیخ امیر صادق کے تعارف میں لیکن دونوں جگہ ان کا تعلق گل دستہ ”سفینہ نجات“ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ان شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد عبدالحکیم خاں حاذق مہتمم گل دستہ ”سفینہ نجات“ اور منشی شیخ بھیکن حاذق ممبر بزم سرور خن دو علیحدہ شخصیتیں ہیں اور دونوں میں تخلص کے سوا کوئی امر مشترک نہیں اس سے اُس ذرا سے امکان کی بھی نفی ہوتی ہے جس میں منشی شیخ بھیکن کو محمد عبدالحکیم خاں کی عرفیت میں باور کیا جاسکتا تھا۔

گل دستہ ”سفینہ نجات“ انتہائی کم یاب ہے اور تواریخ ادب میں اس کا مذکور بھی نہیں۔ اب تک مجھے اس کے محض دو شماروں کی موجودگی کی اطلاع ہے۔ ایک تو یہی پیش نظر شمارہ ہے۔ ایک دوسرے شمارے کا حوالہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے دیا ہے۔ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نعت ”کلیات آزاد“ میں شامل کی جس کا ماخذ انھوں نے ”سفینہ نجات، بمبئی، اپریل سنہ ۱۹۰۰ء“ کو لکھا ہے۔ یہ نعت انھیں افسر صدیقی امرہوی کے ذریعے دست یاب ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اس کے لیے ان کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ بے اس اندراج میں گل دستہ کا نام تو درست ہے لیکن شہر کا نام درست نہیں۔ اسے بمبئی کے بجائے دہلی ہونا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلطی افسر امرہوی صاحب مرحوم سے ہوئی ہے۔

گل دستہ ”سفینہ نجات“ کی کم یابی اور اہمیت کے پیش نظر اُس ایک دست یاب شمارے کا عکس پیش کیا جا رہا ہے جو میرے پیش نظر ہے اور جس کی بنیاد پر یہ تحقیقی مضمون تحریر کیا گیا۔

حواشی و کتابیات

۱۔ اردو کے چند نعتیہ گل دستے (مضمون)، مجلہ نعت رنگ کراچی، شمارہ اگست ۲۰۱۲ء، ص ۲۲۷

۲۔ سفیرِ نجات، دہلی، اگست ۱۹۰۳ء، پشت ورق، ص ۲ کا شروع

۳۔ ایضاً، ص ۷-۱۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۶ اور پشت ورق ص ۲ کا آخر

۵۔ ایضاً، پشت ورق ص ۲

۶۔ کلیات آزاد، از: مولانا ابوالکلام آزاد، مرتب: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، کراچی ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ

پاکستان، اشاعت اول، ۱۹۹۷ء، ص ۴۳، حاشیہ

۷۷۷

۲
اعظم جناب بی بی محمد عبدالقادر صاحب سودا کر کیا سہی و سکری
مخول فیض سخن برادرزادہ و شاگرد حضرت سعید کیا سہی

ہمارے جناب ہے ہمارے مدینہ
بلالو تجھے شہر پار مدینہ
چہنم میرے تلون میں ظہر مدینہ
نہ دیکھی نہ دیکھی ہمارے مدینہ
قیامت میں وہ شہر ہمارے مدینہ
جو مائے آئے کرد و غبار مدینہ
اگر دیکھ لیتا ہمارے مدینہ
شرف گلن پر کتابا ہے خازنہ
مر آئے نسیم ہمارے مدینہ
رقم اسمیں ہے وصف خازنہ
کرون شوق سے تین شاعر مدینہ
نہ جڑھتا ہمارا بنا و قار مدینہ
میسر ہو پردہ دگر مدینہ
اگر یاد آئے ہمارے مدینہ
ازل سے ہون امید و بار مدینہ
کہ آئے در شہر پار مدینہ
ازل سے ہے دل خواستگار مدینہ
ہیں منقول نقیض و نگار مدینہ
ترا۔ ہجر آئے شہر پار مدینہ

و کیا جانے زابہ و قار مدینہ
چہ مدت سے دل خواستگار مدینہ
پہلے مرے دل کے پوشت آہی
نہ ایسا کہ جو غنچہ دل شکفتہ
بچائے گا دوزخ سے ہم عاصی کو
نکالوں میں آنکھوں میں سرے کے لیے
صفت باغ جنت کی لائندہ اعلا
فزون باغ جنت سے چہ شکستہ
ہو غنچہ مری آرزو کا شکفتہ
نیکون کھلے پر شمع حاسد کے لیے
جو اک جان کے بدلے ہون لاکہ چائے
نہوتا اگر رود خد شاہ عالم
وصال شہنشاہ عالم کسی دن
میرنا مرا خلد میں ہوگا مشکل
نجانے بلاتین کے کب سرور دین
سکندر سے چہ مرتبہ میں زیادہ
ہو کیا قصیر گلزار بہت پہ ماں
مرے صفحہ دل پہ بر فز ازل سے
مولا ہے آشا آشا آشا ہمیشہ

۱
منبر بابت ماہ اگست سن ۱۳۱۲ھ مطابق جمادی الثانی ۱۳۱۲ھ جلد ۱

بسم اسماء الرحمن الرحیم

مصحف طرح

بلالو شہر ذمگی و قار مدینہ

ایرجہ جناب فیاض البوا الفخر محمد شوقی علی خان صاحب کیا و شاگرد
حسان الہند و امر ظلم

کہ خلد برین ہے شاعر مدینہ
نہ ہو مکی حسن زان یہ ہمارے مدینہ
شفق بھی ہے ادنی غبار مدینہ
ہے آنکھوں میں اپنے غبار مدینہ
پلا دے شے خوشگو اور مدینہ
یہ رستہ ترا خاکسار مدینہ
انجہ تو ہی اسے خار زار مدینہ
بہار مدینہ بہار مدینہ
سبیل اسے دل بے قرار مدینہ
کہاں پہنچا ہے شہسو اور مدینہ
غلام شہر نا مدار مدینہ

ہے یہ رتبہ آشکار مدینہ
بدلتے رنگ عالم ہزاروں
نکست بھی ہے شہر فرشتے
نہیں لال ڈورے ہیں اسمیں نایان
کہاں ہے قوائے ساقی دین پران
تجھے اپنی آنکھوں میں رکھتے ہیں حور
کہیں حسرت دل کے چھلے تو ہو میں
کہا دے ان آنکھوں کے بجلی لایہ
تیری بے قراری تجھے کہہ رہی ہے
مکانا شکستوں کو بے کر کے دم میں
ہے شکر خدا۔ ہے یہ آیراج ازل سے

نعتیہ نجات دہلی		۴	بیت ماہ گشت
مقامات عالی کی گنتی جو پتھر کی	۱	ہوا سب سے پہلے شمار مدینہ	بیت ماہ گشت
مہین بھی نکا ہوں میں کرتا ہے عالم		آرٹھ بھی ہیں خاکسار مدینہ	
اشرف جناب نواسیچا نجاتی انصا حسب شاگرد جناب ایرج		بلا لوشہ ذی وقار مدینہ	
دکھا دو مجھے ہی دیار مدینہ		بلا لیجئے پتھر پار مدینہ	
ان آگروں سے دیکھو ہمار مدینہ		جو ملجائے محکو خیار مدینہ	
نگاہوں اچھی اپنی آگروں میں اسکو		جہان روزون امنی ظار مدینہ	
سہیت سٹھ آگروں میں جو جہ میری		اٹا مرجا شہوار مدینہ	
کہا پورٹ سے سرش پر آن میں ہے		مری جان دل سٹی شہر مدینہ	
جنین ادھیہ پتھر پان ہوں میں پی تہا		وطن جو بہارا دیار مدینہ	
خدا سے یہی زور و شیبہ انتخاب ہے		اکرون سر سے رکھنا مدینہ	
جو ہو حکم اسکو زور باریت کا جو کہو			
ایسا میں جناب محمد الیاس صاحب سہا کن چلیا نہ رشتا کرد		بے قبر پارہ جوار مدینہ	
مولا حبش صاحب مدرس مدرسہ ملیا نہ چلیا نہ مراد آباد		مجھے بھی دکھا دو دیار مدینہ	
مر سے جبکہ یہ بے قرار مدینہ		کرے جس جگہ شہر پار مدینہ	
سرا ہاتا ہوں ہند میں یا شہر میں		جو مشہور ہیں کو ہمار مدینہ	
خدا ایا تو پتھر پان سے جو کو و طان پر		چھٹا ہے یہ کرد و خیار مدینہ	
عرب میں ہوں و کھیتا شوق دل ہے		عجاوب ہیں سیل و نہار مدینہ	
زہر سات میں انکو بار دل سمجھتا		جو ہے خادم تاج دار مدینہ	
جو دیکھتے تو شیب قدر شیب ہے		مجھے روز ملتے ہیں بار مدینہ	
قدیم چہ سے میں سلا طہین عالم			
مکروں نہ جنت کے ہرگز ہی رضوا			

۳		نظر آئے نگار کب دیار مدینہ	برائے کب آرزو یا آئے
ترا حسن اے پتھر پار مدینہ		دم نزع بناا شکار مدینہ	کے مہین مد و مہرے ہی زیادہ
راگرتا ہے انتہا مدینہ		جوان عربہ شہوار مدینہ	ہیں عالم کھین میں ہی پتھر مگر داس
ترا لطف اے شہر پار مدینہ		نگاہ کریم شہوار مدینہ	پریشان رہے کیوں طبیعت پر م
شرف رکھتے ہیں خاکسار مدینہ		سہا مرگ مدحت نگار مدینہ	پایا ہوا سب رسولوں میں حق کو
اسد جناب شہی عطا جان صاحب ملیہ جناب رضوان سلمہ		سچہ چھپا اے خاکسار مدینہ	وہ ہے کون عالم میں جسے نہیں ہے
کہ جن پر خدا ہے بہار مدینہ		وہ زمینوں میں نقش و نگار مدینہ	خدا کے لیے میری جانب ہی ہے
شہر گل عطر پار مدینہ		زیمن سے جب اٹھا خیار مدینہ	تامی سلاطین عالم پہ لچکر
زمین سے جب اٹھا خیار مدینہ		ردانی میں ہر جوئے باطل مدینہ	مکان باغ جنت میں پائے گلا کر
مرا تپ میں شیب ٹانے تار مدینہ		مرامی میں شیب ٹانے تار مدینہ	اسد جناب شہی عطا جان صاحب ملیہ جناب رضوان سلمہ
حرم کے درختوں میں پار مدینہ		تراز وئے الفت میں پار مدینہ	سچہ چھپا اے خاکسار مدینہ
سرا زوئے الفت میں پار مدینہ		چہ بہوار ہر زہ کڈا رہ مدینہ	وہ زمینوں میں نقش و نگار مدینہ
چہ بہوار ہر زہ کڈا رہ مدینہ		طیور ارم میں نشانہ مدینہ	بسا دیتی ہے ایک جوتے میں عالم
جو جلوہ دکھائے بہار مدینہ			ادھیہ بے سات طبعے فلک کے
			لگاتی ہے تسنیم و کوثر پی چھینے
			شب قدر سے ہیں کہیں بڑکے ایل
			ہیں خوش ذائقہ بیوہ لمبے جناکے
			دل و جان عالم ہے پاک رکھتا
			ہنیں زاہد کیرون کو خطرہ ذرا ہی
			کھستان جنت ہے قرآن طہین
			شریب جائیں با صفا دو دھان کے

سفینہ نجات دہلی		باب ۵ - اگست ۱۹۴۸ء	
۴	۵	۵	۵
یہ تاتا ہے آپ بقا کے پیالے سیان پر جو مانگو ابھی باؤ آتش مکملین - عالیجناب نواب محمد اکبر علی خاں صاحبہ رئیس سراو آباد	جہان کیون نہ ہو خواہ سنگا برکت لبہائے مین دل کے بڑے مین جان ہنو اور ملکوں مین حکم ملے جسکے ہو اک اور ہی لطف آئے جو اسجا جسے شوق سے تانتی ہو ارم ہی چمہائے روئے زمین میں نہیں ہے نگاہیں نہ لوئیں جو نہیں کر اس دل آویز مین دلکشی مین ہیں نور جوا لگو مینین ٹھنڈک جسے دیکھتے ہی جو چشموں سے سبز و تروتا ہو لوت ہیں نہ پر طالب سیر و شیت چنان ہو مشافات شہور روئے زمین سے وہ گلگون نہ ہو چاند سورج کے رنج توا پر نرا لی گھٹا چہا ہے اوس سے سنب و روز ہے شوق حدت گرا ہو جہان مدینہ تو ہے روکے ہو وہ صیقل مقدر پہ کتنا ہو نازان یہ ترسے گا یا کوئے دل سے کہی ہو	مدینہ مین ہو خاکسار مدینہ چے یہ قول ہر خواہ سنگا برکت چلی ہے نسیم بہار مدینہ علامہ ملی بے قرار مدینہ طفیل رشتہ تا ہمار مدینہ	جو پور عسک شہر یار مدینہ فدا کروں جنت پہ باغ جنان کو - کل آرزو کیوں شگفتہ نہ تو نے متاثر آئے گلزار طیبہ جلیل اذل بخشے حکم کو ہی غفار عالم
ارشدہ ابوالنصر جناب نواب محمد رشید الدین احمد خاں صاحبہ رہیں سراو آباد شاگرد حضرت حسام الدین		کہیں گل سے بہتر مین خار مدینہ ترے صدقے اے شہسو آرمینہ برس جائے ابر بہار مدینہ کہلا لالہ کو مہسار مدینہ یہ دریا بھی ہے بے قرار مدینہ بے وہ قلعہ استوار مدینہ ملا جھکھو سر کرد یار مدینہ خدا جانتا ہے و تبار مدینہ یہ نعمت تری خاکسار مدینہ ہمار جنات ہے شارب مدینہ یہ کہتا ہے ہر خاکسار مدینہ	
چمن سے ہے افزون بہار مدینہ مری خاک کو بھی فدا نہ دتا جا خزان سے ہے پامالی گلزار عالم دل سخت مین ہے مگر داغ افشا صد اول کی صورت ہے جو جان سے نہ جو خجین فلک سے بھی ٹوٹا ہوا باغ جنت مین بے روک دال کوئی اداسی عزت محمد سے پوچھو تری خاکسار یا خازنہ مہر مدینہ فدا ہے حرم جے گلستان حسینہ دو عالم جو چاہوں تو سا مل دین			

سفری آ نکھ میں ابہ غبار مدینہ

ذرا دیکھا اے شہسوار مدینہ

سر سے دل ٹوٹا جدار مدینہ

چھوٹا اپنے دامن میں قدر مدینہ

لعیب جو سرا ظاہر مدینہ

کہ ہوں میں ازل سے شہر مدینہ

لگا آنکھ میں تو غبار مدینہ

نظر آ میں مگر شہسوار مدینہ

تہنا ہے پیدا ہوں خار مدینہ

دکھا فی خدا نے بہار مدینہ

رخصوات - حسان الہند محمود اختر جناب خواب حاجی رضوان علی

نکھ میں ابہ غبار مدینہ

ذرا دیکھا اے شہسوار مدینہ

سر سے دل ٹوٹا جدار مدینہ

چھوٹا اپنے دامن میں قدر مدینہ

لعیب جو سرا ظاہر مدینہ

کہ ہوں میں ازل سے شہر مدینہ

لگا آنکھ میں تو غبار مدینہ

نظر آ میں مگر شہسوار مدینہ

تہنا ہے پیدا ہوں خار مدینہ

دکھا فی خدا نے بہار مدینہ

رخصوات - حسان الہند محمود اختر جناب خواب حاجی رضوان علی

۷

شہر ہمارے فلک ہی مقابل

نبوت مدینہ کے ہوئے تو کعبہ ہو

اگر اسطر فضا کی وہ حرف کہہ دے

خدا دن وہ آئے کہ تکبیر کو دے

حادثہ - جناب شہر کی شہر کعبہ حسان الہند محمود اختر جناب خواب حاجی رضوان علی

تعلیم مولوی ناصر خان فاضلہ آبا دی

بلوچ شہر ہمارے مدینہ

نبوت مدینہ کے ہوئے تو کعبہ ہو

اگر اسطر فضا کی وہ حرف کہہ دے

خدا دن وہ آئے کہ تکبیر کو دے

حادثہ - جناب شہر کی شہر کعبہ حسان الہند محمود اختر جناب خواب حاجی رضوان علی

۷

سپاہی صاحب جناب محمد ریاض الدین صاحب تاج و عطر خلف طہر	چہ خوش - دل کو میرے بہار مدینہ	دیکھا دے مجھے شہر یار مدینہ
جناب مولوی غلامی احمد صاحب مرحوم تلکد خاؤق مستحق گلہ دست ہزار	سبا کل گل خلد ہون تکو ذرا ۴	بہین گل سے بہتر ہے طار مدینہ
	مرے پیچم دلین صبا ہر خالق	لگا دے تو لا کر غبار مدینہ
	تو پیچا دے جلدی گم ہے دلین جنت	چون اپنی آنکھوں سے خلیہ مدینہ
	مقدر پیکر تاجہ رک رک ام کے دارا	ہے دیکھا صہبوں نے دیار مدینہ
	نہ تر و ت کا اب بابغ جنت فیضان	کر یا داکئی ہے بہار مدینہ
	ریا کھن حزن تنگہ قوت سے آیا	بلا دوا سے طہر یار مدینہ
سعدی - جناب سعد الدین خزان صاحب ساکن پٹیلان ضلع	دیکھا دے خدا دیار مدینہ	تیرا ہے اب واقف کار مدینہ ۳
مرا و آباد ش کرد مولانا بخش صاحب مدرس مدرستہ پٹیلان	لگاؤت میں آنکھیں میں شوقی	جو لمبا نے جو کھو غبار مدینہ
	مجھے ایسی بینائی دے یا اکھی	نظر آئے یاں سے دیار مدینہ
	وہ صورت اگر خرابین دیکھ پاؤں	تو جو خاکت میں جان شہر مدینہ
	تو سعدی کو دیکھا دے آئینہ مولا	۵۵ رشک خزان نو بہار مدینہ
صادق - جناب بی بی بیچ امیر صاحب خلف الرشید جہانگیر	صدا دے	
بہکین صاحب عمیر بزم کسر و سخن - انڈو ہر ننگ و ان -	لگا لگا جھکا لے پیرن ابجا پیر کسر کو	ہے جنت سے بڑ کمر دیار مدینہ
	سوچ جاؤت میں ہی جو فضل تھا	کروں صدقہ دل جان شان مدینہ
	کھلتا ہے دلین مرے خار قوت	دکھا دے خدا کھنڈار مدینہ

سے پہلا ہوا لالہ زار مدینہ	سفری آسمان پر تہ چسائی نہیں ہے
وہ خوبش رنگ ہے سبز و زار مدینہ	چرا جس سے رہتا ہے ریشم نظر کا
اگر ما پھر آ یا غبار مدینہ	صفائے آئینہ اپنے دل کا کروں کا
کوئی تہ بھی ہے بے قرار مدینہ	سبب کوئی پیرتی بادی پہیلی
چرما جس کے دلین غبار مدینہ	کیا آ سکو سرباب و دون جہان میں
کہین یا کرتے ہیں خار مدینہ	تھما سے پاؤں کے چما لو بڑھ بڑھ کے پیر
وہ کیسے یہ غبار مدینہ	شکل پاتے ہیں جہں سے لاکھوں جہاں کی
تو چتا ہو بے قرار مدینہ	فلک کی طرح کیوں زمین بل برہی
وہ دارالامان سے دیار مدینہ	پناہ ملتی جو جگہ ہر بلا سے
ہسار گل اچھت ہار مدینہ	سوچم خزان سے ہے امین ہمیشہ
اٹھتا یا مرے دل نے بار مدینہ	نہ سنبھلا کسی سے بھی بار تحیت
کہلا گئیو سے مشک بار مدینہ	گھٹا چھائی سفر چین تویت یہ جو ہا
ادھر لا ادھر لا غبار مدینہ	بدشاہوں کا محل باجواہر سے زائر
خضر بر شہر ذی وقار مدینہ	صبا تو ہی حالت مرے مرض کرد
لے عطر سنبل بہار مدینہ	لے زلف کا ٹیری دہوون جو اسکو
ہوں وہ طوطی سبز و زار مدینہ	مرے دم سے خضرون کے جھلکے ہیں
کہاں اوڑ کے پیچا غبار مدینہ	صہب الہی کے واسن پہ پیر
تماشا لے شہنا سے تار مدینہ	بہار یار، شب قدر کی ہے دیکھتا
کوئی روتا ہے بے قرار مدینہ	تہ خاؤں کے بادل میں کھلی نہیں ہے
	تری فکر رشتین نے رضو ات دلہائے ۴
	زسین سخن میں بہار مدینہ ۴

سختیہ نجات دہلی	۱۳	بابت ماہ اگست سنہ ۱۴۱۴ھ
نگی دل کی رو یا مین مگر کجیٹا دو مرا نجات یا دور جو لیجائے بشریب	ملائے خدا شہر یار مدینہ جنوں اپنی آنکھوں سے خار بند	ہوا با عیث افتخار مدینہ جو مدینوں سے ہمایا تفسار مدینہ سہارا رنج انشعاب مدینہ نہ ہمایا کوئی بھی حکم کسار مدینہ ستا نے نہیں مور و مار مدینہ تہ پہ قول اختر شعار مدینہ وہ پہ طوطیاں عیار مدینہ جو ہے قسا بل اعتبار مدینہ برون سے نہایت ہے عیار مدینہ ہوئے ٹوٹ کر شرمسار مدینہ دھوپ قلم اسخوار مدینہ دم پاسبان حصار مدینہ قنات کی ہے کارزار مدینہ کھینچے س کہری ذوالفقار مدینہ سوم تو سن شہسوار مدینہ جو فرقت سے ہو سو گوار مدینہ
فروغ - جناب بی بی محمد حسین صا صاحب مراد آبادی تلمیذ جناب مکین	قدوم شہر نام دار مدینہ ورود مبارک سے دور اب ہوا ہے مدینہ کو حضرت کا تشریف لانا زبان ورود و مبارک سے پہلے مدینہ کے صحرا نشینوں کو کیا ڈر سمادرات کے دائرے کا بے مرکز جو آنکھوں کے حق میں ہے کھل جواہر وہی معتبر ایک عالم میں ہوگا جو ہے بی بہنوں کا بیان ہے گداہ تعجب کیوں ہو کہ دروار نا حق نہیں جبکی مانند روئے زمین یہ گروہ مخالفین کے حق میں ہے اٹھ کو جنگ جو یان ذوالآ کے دیکھیں نہیں نگاہ کے واپرائے کوئی کرے ایک کاوے سے پالال لاکھوں جہان کی ستائش کے قابل ہے وہ کی	فروغ آمد و شہ مدینہ میں کجیٹا مبارکیت رستہ ذی وقار مدینہ

عاصیہ آہنا حافظہ فقیہ خان صاحب مود اگر نا کہو تلمیذ حضرت	۱۱	شہر قی مود
یرا جان و دل ہے شارب مدینہ یر حاکم جنان ہے بہار مدینہ دکھاد و بجے اسو یار مدینہ چہ خاصہ مرا مشک باب مدینہ دل و جان سے ہوں دوستدار مدینہ شب و روز کرتے ہیں کلام مدینہ سری آنکھوں میں ہے شہر مدینہ عجب شان ہے تاجدار مدینہ کسیدان سوئے لار زار مدینہ بالو مجھے شہر یار مدینہ جے مر خوب اسکو بہار مدینہ اگر ہو کو بلوائے خار مدینہ بیان کس سے ہوا افتخار مدینہ بنی آہنا ہے علم کسار مدینہ	تجلی لقا ہے دیار مدینہ سورگ کو چہ طیبہ کا رشک چہین ہمایاں لقا ہے شہر برد عالم شہر زلفین سے ہوئی لکٹا ہون ہر دم مستحکم نہ لقا ہے ہوا کی تہیک فرشتے پہی تلمیذ ہر ہند کے خادم سے عیث احمد ہے خود ہوا ہون شریے درنگے خادم ہیں شاہ و کداس اے شہر شہر ملامت اسرار مدینہ شہر و وزیر ہیں ہون - ہشتاب کلیستان پر شہر انہیں ملبل دل دلون باغ جنت کچھن ہول بہرگز حسب خدا جیکہ ہے تہہ کچھ کچھ شفا مرض مصیبت ہوئی ہے عیسیٰ عمر کی - نہایت ہی عجلہ لقا در صاحب	بہت شک ہون بیان سک دینے لقا ترا جو ہو کجیٹا ستا ہے ہر دم نہیں خواہش ہے و ظلمان جنت بالا میں لگی اپنے حوران جنت
بالو مجھے شہر یار مدینہ بالا بلاس اے شہر یار مدینہ فقط چاہتا ہوں دیار مدینہ کے جب و مان شہر یار مدینہ		

توت بلبل ترا سے بہار مدینہ چو پائے بین مکر فرار مدینہ خدو بہ لب لب و جوار مدینہ وہ شا و اب ہے سرخ زار مدینہ رہن گے ہی یاد گار مدینہ رک گل ہیں عاشق کو خار مدینہ چڑھ ہے فلک پر خار مدینہ مین درمیں ہے بہار مدینہ بالا کو شہر ذی وقار مدینہ کر سولا ہے موت لگا رہدینہ	۱۴۸ مین گلزار جنت کا ایشیا نہیں تو نرمل اُنہ بولی ہے رحمت خدا کی تہا ہے بار لب لب مکر سیری بخل جہن سے جنت کا ہے تختہ تختہ مین گے نہ جنت میں ہی داغ افست تماشا ہے روضہ مکر کے لئے پوجو کشا لوٹ پاؤں نہیں بہار طے ہنگام ہے کیوں بلبل روضہ بیان ہمیں ہی مدینہ میں بند و ستان زمین غزل گلز میں کیوں نہو منیر - جہاں ہستی محمد میں خان صاحب مولو و خوان کمنہ جلی لور	دکھا دیکھا بہار مدینہ نہ عورین ہوں کہن خان شادینہ ازل ہے ہوں میں جان شادینہ نظر آئے جو گلزار مدینہ مین گل سے بہتر ہے خار مدینہ نہ دیکھا کسی دن و بار مدینہ ترے در پہا سے شیر بار مدینہ اگر دیکھ لے وہ بہار مدینہ بلا لوجے شہر بار مدینہ	۱۴۹ بلا کر خچے شہر بار مدینہ فروں خلد سے ہے بہار مدینہ خدا یا دکھا دیے بہار مدینہ قرار آئے تب بلبل دل کو میرے دعا ہے مریضیاں بچا لے مدینہ ابھی مرا یہ سحر ہے کیسا جنگ نام ہے تلخی کو سر فلک بھی تشکر ہے بہر جنت کی نہ ادھ ہکا جاتا ہوں سوز و قوت سے آہ	سفینہ نجات دہلی ۳۱۱ مہتاب ہر جہاں ہے ہی عہد الوہ و ذہا صاحب از سہا ضلع جنوبی ارکاٹ ۱۵۰	بہت ہے بچے انتظار مدینہ ہے جہر مل خدشت گذار مدینہ گل بابا فرودس خار مدینہ گیا مین نہ بارب دیار مدینہ مقابل ہو جبہ دم حصار مدینہ مرا حاکمی ہے شہوار مدینہ ہے ابر کر مہم سار مدینہ رہے کیوں نہ تہ نہرہ نار مدینہ پہنچ جاؤں تا مین دیا یہ مدینہ بلا لوجے شہر بار مدینہ دل و جان سے ہم ہیں شادینہ	ابھی دکھا دیے دیار مدینہ ہے شاہ فلک اقیار مدینہ فروں خلد سے ہے بہار مدینہ لگا یا تہ آنکھوں سے کہیں کا پڑ نظر تہ نہ ڈالین گے قہر جنات پر بچے ضلع روضہ مکر کے کیا علم محمد کے مرقہ کے سائے کی خاطر خدا کی ہے رحمت کا با دل پرستا خدا یا تو اتنا کرم کہ ہے کر دے جہاں مست رکھو بلکہ نرد کی ہے مشا ہر نہیں کہہ ہی خواہش نہا کی مولانا جناب مہاشی مولانا بخش صاحب مدرس مدرکسہ ملیکھا نر ضلع سرا و آباد	قمر ہے کہ ہے وا خدار مدینہ ہے آنکھیں مین باجو سار مدینہ مہ ہے لوٹ جہر بہار مدینہ برائے خدا شہر بار مدینہ ہے کیا خوب گرو و خار مدینہ آہا برقع اے شہوار مدینہ	شفیق ہے کہ ہے لار زار مدینہ یہ دل ہے کہ خاک و بار مدینہ وہ نگین مین نقش و نگار مدینہ غلاموں پہ اب تو نکلی کرم جو ہو چہرے کو غار تو آنکھوں کو کمر سر راہ بیچے ہیں مشتاقی لاکھوں
---	--	--	--	---	--	--	---	--

ماہ اگست سنہ ۱۹۰۴

۱۶

نعت رنگات و رنگ

شأن صابر حضرت شیخ علاؤ الدین علی احمد صابر کی شان میں غزلیات میں مختصر

سراخ عوری - مہیت ایک آنہ

شان مجھ کو ملی سلطان نظام الدین اولیا کی شان میں غزلیات و نثر - قیمت ۱
عروس انعت خدیجہ نعتیہ ادو ہندی بہا شا زبان میں مولفہ حمیدہ بیگم صاحبہ
نہایت عمدہ کتاب ہے قیمت ایک آنہ - درکست و دیگر

فشا مل مکہ قریب ار - رسالہ انشکاف سوز اک ان امراض کا نہایت چھان
ت سائر علائق کلمہ ہے قیمت ۱۰ - خوش بینہ رحمت رفعتہ دیوان نہایت

کلام ہے قیمت ۱۰ - حجابا لک رحمت یہ بی نسبتہ دیوان ہے قیمت ۲
نعتہ درگاہ خواجہ احمد بہارک اجمیر کی نہایت صحیح خوش نقل قیسادہ و بی

رنگین ایک آنہ - علاوہ ازین نقشہ کند - مدنیہ درگاہ صوفی پاک - درگاہ سلا
نظام الدین اولیا - طاعت سجدہ ملی فی حدود ویشیہ اور ایک آنہ - خطبرے دس بارہ

قیمت کہ نہایت خوبصورت - فی عدد ایک آنہ - المثنیٰ بہر عبدالحق نظام دینی
اطلااح طرح

یہ حدیث ہے کہ کاش در پیر ملجا نے ٹہکا نا محک و بہکنا - اجتناب قافیہ - حکم روغنیہ
۱۰ - تمیز یک ہ - آنکھ کے پرے میں ڈیرہ نظر یا مجھے ہر دا - جلوہ - قافیہ - مجھ روغنیہ -

غزلیں جدا جدا کا خدیو اور علیہ آبی پامکین و زعدم اندھا کی شکایت مثلاً - نامم
حضرات !

ابرار بعد لکھتے جوئے شرم آئی ہے مگر سکھم اندک غنیہ قدرت میں نہیں جب وہ چاہتا ہے کہ
سو تاجہ گلہ شدہ شہو رخ کہ بادے میں ہی ہی مجھے - میں کو شمش میں ہون کہ گلہ شد

وقت پہ بلکہ پانچ پر نکلا کہ اگر اندک خوشنور سوا قویہ اپا ایسا ہی ملا سجدہ فرمائیں کہ
راقم حاذق غفرل

۱۵

بالو مجھے شہر یار مدینہ
جو دیکھے کہ بی کلمہ ابر مدینہ
سچے افرون ارم سے بہا بدینہ
لما لو سے شہر یار مدینہ

پیر کو نہ درود خدا کے لئے اب
ہو گلزار جنت کا بہر رنگ بہار
شہنشاہ کہتا ہے جنت میں خود ان
منیر آپ کا ایک ادنیٰ ہے خادم

نیر بر ہما - جناب ابوالحسنات سید محمد مدلیح الرحمان
صاحب بہر ہما وی ساکن ارکان نامیر مکی تلید صالح اللہ
ازل میں بنے سات طبعہ ملکے

ہزار ہی ہی علان جا جو با نوری
لگاؤں شیشم ٹپا آشوب ایمان
وہ بلبل ہوں رنگین دھنچے میں کہ
ہوا جیتے ہی باغ جنت میں عمل

وہ سر بھی کہ دین کا وہ ایمان شیخ
پیری آرزو ہے سروں و مانتیہ
کھڑی باغ میں کہو زکرس جگہ
میں تیر بہر ہما حسن جہان میں

کرتب ذیل جدید الطبع ہرین
(اگر آپ کا بی چاہتا ہے تو شکائیے)
شان خواجہ حضرت خواجہ بزرگہ اجمیری کی شان میں غزلیات میں مختصر
سراخ عوری - قیمت ایک آنہ -

میں تیر بہر ہما حسن جہان میں
شال رس نامدار مدینہ

مجید امجد کی ایک نایاب نعت

ABSTRACT:

A unique poem written by famous Urdu poet Majeed Amjad has now been traced out. This is a rare Naatya poem which was composed by the late poet at the age of 23, when he was the Editor of UROOJ. This is the first article on Naatia poetry of Majeed amjad.

نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف اور کثیر المعنی ہونے کے باوجود اس کے مفاہیم و معانی کے درمیان ایک خاص ربط ہے۔ نعت آپ، جناب، سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لیے مخصوص ہے۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا میں نعت کی تعریف اور اس کی حدود و قیود کا تعین کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

نعت سے مراد وہ نظم جو رسول اللہ کی شان میں کہی جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں واضح ہدایت فرمائی: خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود و سلام بھیجا کرو (آیت: ۵۶) اس آیت سے نعت کی قدر قیمت واضح ہو جاتی ہے۔

عربی زبان و ادب میں نعت کے لیے مداح النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا المدائح النبویہ وغیرہ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نعت کا لفظ سب سے پہلے فارسی میں مدحت آل جناب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عام ہوا۔ اردو شعرا نے فارسی کے خوان نعت سے جو لطف اٹھایا، اس میں آقا نام دار کی تعریف کے لیے استعمال کیا جانے والا لفظ نعت بھی شامل ہے۔ مسلمانوں میں امام الانبیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر درود و سلام اور ان کی تعریف و توصیف محسوس و لامحسوس طریقے سے فرضیت کے درجے پر متمکن ہے۔ مسلم معاشرے کی عمارت اس وقت تک درست بنیادوں پر استوار نہیں ہو سکتی جب تک آپ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کی مودت اور محبت کا جزو نہ بن جائے۔ دنیا کے دیگر مذاہب اور عقائد زندگی کے ماننے والوں نے اپنے انبیا اور اوتاروں کے ساتھ دو طرح کے رویے اختیار کیے:

i۔ کچھ قوموں نے نہ صرف اپنے انبیا کی تصاویر بنائیں بلکہ ان کے بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا۔ یوں مرحلہ وار اللہ تعالیٰ کا تصور ان کی ذہنوں سے محو ہوتا چلا گیا۔

ii۔ کچھ معاشرے ایسے بھی تھے جو اپنے پیغمبروں کی تعلیمات تو کیا ان کا نام تک نہ محفوظ رکھ سکے۔ قیامت تک ان کو اہل عقل و دانش کی طرف سے اس ناقدر شناسی کے طعنے کا ”صدقہ جاریہ“ پہنچتا رہے گا۔ اسلام میں مدحت سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معیار خود ذات باری تعالیٰ نے متعین کیا۔ نعت رسول ایک محبوبہ دل براں صنف ہے۔ اس کی موضوعہ ہستی محبوب خلق ہی نہیں محبوب خدا بھی ہے، یوں محبوبیت کے اس سفر کی طوالت کا ادراک بھی ذات خداوندی ہی کو ہے۔ ابن الفارس جیسے صاحب حال کہتے ہیں:

”اری کل مدح فی النبی مقصرا، وان بالغ المثنی علیہ و اکثر اذا لله

اثنی بالذی ہوا ہلہ، علیہ فما مقدار ما تمدح الوری۔“ ۲

یعنی حضوری نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جتنی بھی مدح کی جائے وہ تشنہ رہے گی۔ خواہ نعت گو جتنا چاہے مبالغہ کرے۔ جب اللہ ہی نے آپ کی وہ مدح کی جس کے آپ اہل تھے تو دنیا کی مدحتوں کی کیا اوقات ہے؟

جدید اردو نظم کے گل سرسبد مجید امجد (۱۹۱۴ء-۱۹۷۴ء) کے مذہبی تصورات کو اب تک سرسری اور رسمی انداز سے دیکھا گیا ہے۔ ان کے بارے میں ناقدین ادب کا رویہ عمومی طور پر صم بکم عمی فہم لا یرجعون کی تفسیر رہا ہے۔ قابل احترام ادیبوں کا ایک طبقہ ابتدا ہی سے مجید امجد کو مذہب سے نفور اور بے زار بتاتا ہے۔ یہ تصور محل نظر ہے۔ اگر ہم ان کی نظم و نثر کا بہ غور جائزہ لیں تو مجید امجد کے ہاں ایک نئی تلی، سلجھی ہوئی، متوازن شخصیت کا سراغ ملتا ہے۔ ان کے نانا حکیم مولوی نور محمد جھنگ شہر میں ایک خاص مذہبی مقام اور مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت تھے۔ ان کا شمار اپنے عہد کی معروف روحانی شخصیات میں ہوتا تھا۔ مجید امجد کے خانوادے سے متعلق جنید امجد نے ان کے سوانحی کوائف مرتب کرتے ہوئے ۱۱/ جون ۱۹۷۶ء کو فیصل آباد کے اخبار روزنامہ ”غریب“ میں شائع ہونے والے محمد ابراہیم قاسم کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ اس مضمون سے مجید امجد کے خاندانی پس منظر کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”میاں نور محمد اپنے عہد کے متبحر حنفی العقیدہ عالم، مفسر قرآن، شارح حدیث

رسول، فارسی کے شاعر، منجم اور مشہور حکیم تھے۔“ ۳

مجید امجد کے دادا حافظ عبدالکریم قادریہ نقشبندیہ سلسلے کے مبلغ تھے۔ ۳۰ والدین کے باہمی اختلافات اور پھر علیحدگی کے سبب مجید امجد کی ابتدائی تعلیم ان کے ننھیال میں ہوئی۔ ان کے نانا حکیم نور محمد مرحوم نے انھیں قرآن وحدیث کی تعلیم کے علاوہ اس دور کی رائج کردہ کتابیں بھی پڑھائیں۔ ان میں عربی اور فارسی شاعری کے مجموعے بھی شامل تھے، ریڈیو پاکستان کے نمائندے سے ہونے والے ایک مصاحبے میں ابتدائی تعلیم کے حوالے سے مجید امجد کہتے ہیں:

”جب اتنے عرصے کے بعد گزرے ہوئے وقت کی طرف خیال کرتا

ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو میری پرورش جس ماحول میں ہوئی

اس میں مجھے زیادہ تر فارسی، عربی، طب، منطق اور اس قسم کے دوسرے علوم

پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کالج کے ساتھ ساتھ میں ایک مسجد میں بھی زیر تعلیم

رہا۔“ ۵

ابتدائی سطح پر یہی تربیت تھی جس نے آگے چل کر مجید امجد کی فکری شناخت پرداخت میں اہم کردار ادا کیا۔ مجید امجد کے ہاں مکتب کی اسی کرامت کی بہ دولت ابتدا ہی سے عشق رسول کا ایک بے کنار دریا موج زن دکھائی دیتا ہے۔ حکیم محمد افضل ہرل کے ایک اصلاحی کتابچے ”بھٹکا ہواراہی“ کے دیباچے میں وہ سرکار ہر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو اس کائنات کا مقصود کل قرار دیتے ہیں:

”ملت اسلامیہ آج ایک روندے ہوئے بے بس تنکے کی طرح شاہراہ حیات

پر دم توڑ رہی ہے اور یہ سب کچھ دنیا کی تاریخ کے ایک پُر آشوب دور کے

اندر ہو رہا ہے۔ آج دنیا ایک خونی بھنور میں پھنسی ہوئی ہے، حیران و

ششدرہ کھڑی ہے، آج مشرق و مغرب کے سیاستین ایک نئے دور کا

خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہر ایک نئے نظام کی ادھیڑ بن میں ہے، اک نیا

جہان بسانے کی فکر میں ہے لیکن اس نئے دور کی کنجی نہ ماسکو میں ہے اور نہ

واشنگٹن میں نہ لندن میں اور نہ سان فرانسسکو میں۔ یہ نیا جہاں، مدینے میں

سونے والے کملی پوش آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی خاک پاک کے ایک ایک ذرے

کے اندر آباد ہے، یورپ و ایشیا کے مدیروں کو گہ دو کہ وہ نیا نظام، تیرہ سو

سال ہوئے مکے کا ایک یتیم لاچکا ہے اور وہ دنیا دستور قرآن حکیم کے اور پر

صدیوں پہلے سے مفصل و مکمل موجود ہے۔ کاش مسلمان آج اس گھنا ٹوپ

اندھیرے کے اندر دنیا کے فلاح و نجات کی وہ ابدی مشعل جو فاران کی چوٹی
پر دنیا کے رہبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فروزاں کی تھی۔“ ۶

مجید امجد کے شعری کلیات مرتبہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا میں مجید امجد کی دو مندرجہ ذیل نعتیں شامل ہیں:

i۔ نو بہار گلستان معرفت۔ یعنی اے روح روان معرفت: محبوب خدا سے۔ ۷

ii۔ شہر مکہ بتوں کی بستی ہے۔ چار سو تیرگی برستی ہے: نعتیہ مثنوی۔ ۸

یہ دونوں نعتیں ابتدائی دور کی ہیں اور مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔، ان میں مدحت رسول کا بیانیہ
پیراے میں اظہار ملتا ہے۔ پہلی نعت شریف میں محبوب خدا سے سرور عالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و
توصیف کا حق ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جب کہ نعتیہ مثنوی میں آپ کی ولادت باسعادت سے
پہلے اور بعد کے حالات کو واقعاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نعتیہ مثنوی پر علامہ اقبال کی واقعاتی
نظموں کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ دونوں نعتوں کا سال تخلیق بالترتیب ۱۹۳۲ء
اور ۱۹۳۳ء ہے۔ ساہیوال میں قیام کے دنوں میں مجید امجد کا ادبی مقام عروج پر تھا اور وہ ادبی حلقوں
میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ انھی دنوں ان کی ملاقاتیں سید منظور حسین نقوی نقشبندی
(مکان شریفی) اور ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم سے ہوئیں، دونوں صاحبِ حال بزرگ تھے۔ ان مجالس نے
مجید امجد کی شخصیت میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی آخری عمر کی نظموں میں جو صوفیانہ لہجہ محسوس ہوتا
ہے اس کے پس منظر میں یہی محفلیں اپنا رنگ جماتی دکھائی دیتی ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید ان صدق رس
مجالس کی گواہی کچھ یوں دیتے ہیں:

”سید منظور حسین نقوی مکان شریفی کی کوٹھی کی بیٹھک میں ان کے دوستوں
اور ان سے اکتساب فیض کرنے والے ان کے مریدوں کی محفلیں آباد رہتی
تھیں۔ میں اکثر اپنی والدہ ماجدہ کے کہنے پر اپنے والد (ڈاکٹر الف د نسیم)
کسی گھریلو کام کی یاد دہانی کروانے کے لیے ان محفلوں میں جا بیٹھتا تھا۔
یوں کچھ فقر، عاجزی، مسکینی کی باتیں میرے کانوں میں بھی پڑ جاتی تھیں۔
سید منظور حسین نقوی باشرع صوفی تھے۔۔۔ یوں تو مجید امجد کی شاعری میں
ابتدا ہی سے ان کی درویشی اور فقر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن ان کا وہ میں کا
استعمال جو ان کی کھلاڑی (آٹو گراف) جیسی نظموں میں ہے، ان کا خاتمہ

منظور حسین شاہ صاحب کی محفلوں میں بیٹھنے سے ہوا۔ میرا خیال ہے کہ ان صحبتوں نے مجید امجد کی اناشکنی میں خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔“ ۹

ان محفلوں میں موضوع بننے والی عرفانی گفت گو میں عشق رسول کو بنیادی حیثیت رہی ہوگی۔ علم و دانش کے کیا کیا نہ لعل و گہر بکھیر دیئے گئے ہوں گے۔ سید صاحب مرحوم کے نعتیہ شعری مجموعے بام عرش کا پیش لفظ تحریر کرنے کی سعادت بھی مجید امجد کے حصے میں آئی۔ نعت کی صنف کے بارے میں مجید امجد کا تنقیدی شعور ان کے اس موضوع کی حساسیت سے آشنا ہونے کی دلیل ہے۔ الاستدراک کے عنوان سے تحریر کردہ اس دیباچے سے سرسری طور پر گزرنا ممکن نہیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے نعت کی صنف کے بارے میں مجید امجد کے تصورات و نظریات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں نعت ایک انتہائی حساسیت کی حامل صنف ہے۔ اس کی تخلیق کے عمل میں شاعر کا ہر لحظہ با محمد ہوشیار کے ارشاد عالیہ کی طرف متوجہ رہنا لازم ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف میں مبالغہ شرک اور کمی اہانت بیان کے زمرے میں آسکتی ہے۔ لکھتے ہیں:

”صنف نعت ایک نہایت ادق اور نہایت وقیع صنف ہے۔ شعر اور اس کے اوزان میں جکڑے ہوئے الفاظ کا سلسلہ اپنی تمام اثر اندازیوں کے باوجود، توصیف رسول کے اظہار کے مقام پر آکر عاجز ہو جاتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جب تک حقیقت رسالت کی عظمت کا ادراک کامل حاصل نہ ہو، لکھنے والے کا بھٹک جانا ایک یقینی امر ہے، اور سب سے بڑھ کر ضروری شرط یہ بھی ہے کہ نعت نویس عشق رسول کے جذبات صادق سے بہرہ مند ہو اور یہ جذبہ اس کے اعمال و تصورات پر حاوی ہو۔ یہ عشق رسول کا جذبہ روح نعت ہے اور مقام مصطفوی کا سچا ادراک جان نعت ہے۔ دونوں صفات ایک ہی جلوے کا پرتو ہیں اور یہ صفات جب آئینہ شعر میں منعکس ہوں گی تو نعت اس رتبے کو پہنچ سکے گی، جو اس کا مقصود ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ مروجہ نعتیں اس معیار پر پورا نہیں اترتیں۔ یہاں یہ بات مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ بعض جلیل القدر شعرا کا نام لے کر ان کی ان نعتوں کا ذکر کیا جائے جن کے بیان کی معنویت اس نازک اور مشکل مقام پر آکر مطالب مقصود تک نہیں پہنچ سکی۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف

میں ذرا سی لغزش، نعت کو حدود کفر میں داخل کر سکتی ہے۔ ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے۔ ذرا سا غلو ضلالت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ ذرا سا عجربیان اہانت کا باعث بن سکتا ہے۔ فن شعر کے لحاظ سے اس کام کے لیے کمال خن وری اور نفس مضمون کے لحاظ سے اس کے قدح میں بدل سکتی ہے۔ ذرا سا غلو ضلالت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ ذرا سا عجربیان اہانت کا باعث بن سکتا ہے۔“ ۱۰

اسی مضمون میں وہ آگے چل کر لکھتے ہیں:

”فن شعر کے لحاظ سے اس کام کے لیے کمال خن وری اور نفس مضمون کے لحاظ سے اس کے لیے کمال آگہی درکار ہے، اور پھر ان دونوں چیزوں کو جلا جس چیز سے ملتی ہے وہ عشق کا سرمدی، جذبہ جو لفظوں کو تجلیات سے بھر دیتا ہے اور معانی میں وسعتیں سمو دیتا ہے۔ یوں نعت ایک مقدس آزمائش ہے۔ بیان عقیدت کی رو سے جو ہر ایمان کی آزمائش اور غایت غایات کی جستجو کے ضمن میں قوت ادراک کا امتحان سچی نعت لکھنے والوں کا مرتبہ انسانی اکتسابات کی معراج ہے۔ اس کا ہر سانس دیدار حبیب کی منزل ہے۔ وہ فرشتوں کا ہم زبان ہے۔ وہ تمام ارواح مبارکہ کا ہم نوا ہے اس کی زبان پر اس سلی علیہ السلام کی مدح ہے جس کی مدح خود ذات باری نے کی ہے۔ اس کی فکر لامحدود کی حدیں متعین بھی ہیں۔ وہ قدم قدم پر نص قرآنی کا پابند ہے۔ اس کا ہر لفظ زنجیری احتیاط بھی ہے۔“ ۱۱

یہ تحریر انھی ابد آثار محفلوں کا ثمر ہے۔ مجید امجد کی شاعری کے فراموش کردہ سرمائے میں ایک نادر و نایاب نعت شریف کا حوالہ دینا بھی یہاں ضروری ہے۔ یہ نعت جھنگ سے شائع ہونے والے رسالے ”الفلاح“ کے نومبر ۱۹۳۷ء کے شمارے میں شامل ہے، ان دنوں مجید امجد جھنگ میونسپلٹی کے رسالے عروج کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ۱۲ اس رسالے کے سرپرست سید مبارک شاہ بغدادی تھے اور ادارت دوست محمد سلیمانوی کے ذمے تھی۔ اس نعت کو اختصار کے باوجود اردو شاعری میں معراج ناموں کی روایت کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اردو میں معراج ناموں کی روایت خاصی پرانی ہے۔ اس کی ابتدا جنوبی ہند میں قطب شاہی اور عادل شاہی ریاستوں میں

ہوئی۔ علامہ اقبال کی شہرہ آفاق شعری تصنیف جاوید نامہ کی تخلیق کے پس منظر میں بھی ابتدائی طور پر معراج نامہ لکھنے کی خواہش کا سراغ ملتا ہے۔ یہ نعتیہ نظم طالب اور مطلوب کے درمیان عشق و محبت کا عاشقانہ اور صادقانہ اظہار کی غمازی کرتی ہے۔ آپ جناب سرکارِ مصلیٰ علیہ السلام کی آمد پر آسمانوں کو سجایا جا رہا ہے۔ اور ایسا کیون نہ ہو کہ آج وہ ہستی عرش کی مہمان ہے جس کی خاطر اس جہان رنگ و بو کو تخلیق کیا گیا۔ یہ ایک نبی محترم کا سفر معراج ہی نہیں بل کہ اس کھوئے ہوئے مقام کی واپس منتقلی ہے جو شجر ممنوعہ کا ذائقہ چکھنے کے نتیجے میں بہو ط آدم علیہ السلام پر منج ہوا تھا۔ آسمانی مخلوق یعنی حورین و فرشتے عرش معلیٰ کو سجانے اور سنوارنے میں لگے ہیں کیوں کہ آج عرشوں کے لیے عید کا دن ہے۔ نعت شریف ملاحظہ ہو:

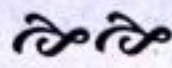
ہے عاشق رسول، خدائے رسول آج
اور ہے خداوندائے لقاءِ رسول آج
ہے آستانِ قدس پہ پائے رسول آج
ہیں سب یہ اہتمام برائے رسول آج
ہے آفتابِ ذرہ پائے رسول آج
عرشِ بریں پہ دیکھو وہ آئے رسول آج
حسنِ ازل ہے مستِ ادائے رسول آج
کونین پر ہے فیضِ عطائے رسول آج
جنت کی ہر کلی ہے فدائے رسول آج
یہ امجدِ حزیں یہ گدائے رسول آج

ہے جبرئیلِ محوثنائے رسول آج
ہے شاہدِ مدینہ، فدائے خدائے پاک
پابندیِ زمان و مکاں مٹ کے رہ گئی
حوروں نے آسمانوں کے ایوانِ سجادے
اللہ رے یہ طنطنہ آمدِ رسول
عرشِ بریں کے تاروں میں سرگوشیاں ہیں آج
حسنِ ازل کے چہرے سے پردے سرک گئے
ڈوبی ہوئی ہے نور میں کونین کی فضا
ہیں گل نگار وادیِ اسریٰ کے راستے
ٹھکرا رہا ہے قیصر و کسریٰ کی سلطنت

ندرت، بے ساختگی اور روانی کی شاعرانہ فضا میں عاشقِ رسول، آستانِ قدس، شاہدِ مدینہ، گل نگار، محوثنائے رسول، طنطنہ آمدِ رسول، پابندیِ زمان و مکاں، حسنِ ازل اور وادیِ اسریٰ جیسی خوب صورت تراکیب نے نعت شریف کو خوش آہنگ بنا دیا ہے۔ اس پر مستزاد رعایتِ لفظی (خدا، رسول، جبرئیل، حسن، چہرہ، پردہ، گل، کلی، وادی، راستے)، صنعتِ تضاد (آفتاب، ذرہ، قیصر و گدا) کی وہ فنی مہارتیں جو اس نعت کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہیں۔

مجید امجد کے ہاں نعت رسول مقبول ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے بے شک باقاعدہ وسیلہ اظہار نہ بھی ہو تو نعت کے استغاثے اور انسان دوستی کے موضوعات ان کی نظم میں

صوفیانہ انداز میں آئے ہیں۔ اگر مواد کم ہے تو یہ یاد رہے کہ مجید امجد اس کار دشوار کے فکری و فنی تقاضوں سے آشنا ہیں۔ اگر ہر وہ شعر نعت کا ہے جس کو پڑھ کر قاری کا خیال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا جائے تو ایسے اشعار بھی مجید امجد کے شعری کلیات سے مل جائیں گے۔



حوالہ جات

- ۱۔ اسلامی انسائیکلو پیڈیا، قسط ۳۶، مرتبہ، سید قاسم محمود، لاہور، مکتبہ شاہکار، ۱۹۷۹ء، ص: ۲۱۰
- ۲۔ سید علی ثانی، سید، ذکر رسول کا مقام و مرتبہ، مشمولہ، صوت ہادی، ساہیوال، شمارہ خاص، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸
- ۳۔ جنید امجد، صورت معنی معنی صورت، فیصل آباد: مثال پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴
- ۴۔ جنید امجد، صورت معنی معنی صورت، ص ۱۵
- ۵۔ مجید امجد سے ایک نایاب مکالمہ، مشمولہ، کلیات نثر مجید امجد، مرتبہ، محمد افتخار شفیع، لاہور: کتاب سرائے، ۲۰۱۶ء، ص ۱۹۷
- ۶۔ مجید امجد، بھٹکا ہوارا ہی کے لیے چند سطور، مشمولہ، کلیات نثر مجید امجد، ص ۷۵
- ۷۔ مجید امجد، کلیات مجید امجد، مرتبہ، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، لاہور: الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۸۵
- ۸۔ مجید امجد، کلیات مجید امجد، ص ۲۵۶
- ۹۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، صدر نگ کوئین اور موقلم مانی، مضمون، مشمولہ، یہ دنیائے امروز میری ہے، لاہور: پنجاب یونیورسٹی اور ی انٹل کالج، ۲۰۱۵ء، ص ۷۳
- ۱۰۔ منظور حسین مجبور، سید، بام عرش، لاہور: ماورا پبلشرز، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲
- ۱۱۔ منظور حسین مجبور، سید، بام عرش، ص ۱۲
- ۱۲۔ اسلم ضیا، ڈاکٹر، جہان مجید امجد، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۴

حداائق بخشش کے صنائع بدائع پر ایک اور نظر

ABSTRACT:

Collection of Naatia Poetry of Aala Hazrat Ahmad Raza Khan Brailvi carries ample examples of stylistic beauty of use of similar formed words of different meanings in order to beautify couplets in literary terms. This article cites some beautified couplets from that collection. Use of words carries similarities of sound and forms of words in the same verse by the poet have been highlighted in this article.

حضرت رضا بریلوی کا شاعرانہ کلام کمیت کے لحاظ سے بہت سے شاعروں کے کلام سے خاصا کم ہے، لیکن کیفیت کا یہ عالم ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود ابھی مزید بہت کچھ لکھے جانے کی گنجائش ہے۔

شاعری کا قنی پہلو فکری پہلو کے مقابلے فن کار کی توجہ اپنی جانب زیادہ کھینچتا ہے اور اس کی تفصیل عام قاری کو بھی اچھی لگتی ہے۔ حضرت رضا بریلوی کی شاعری کے دونوں پہلوؤں پر اگر چہ کافی لکھا جا چکا ہے مگر میرا خیال ہے کہ قنی پہلو پر فکری پہلو کی نسبت کم توجہ دی گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کلام میں برتی گئی صنائع بدائع پر ہمارے اہل قلم نے خوب خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ اس کے باوجود بعض ایسی خوبیاں بیان ہونے سے رہ گئیں، جو سامنے کی چیز نہیں ہیں۔ اگر چہ وہ تعداد میں زیادہ نہیں ہیں۔ اس تحریر میں کچھ ایسی ہی خوبیوں کو ظاہر کیا جائے گا۔ ان میں کچھ کو شاید نام بھی نہیں دیے گئے ہیں۔

(i) پہلے ایک مقطع ملاحظہ فرمائیے:

ہے تو رضا نرا ستم جرم پہ گر لجائیں ہم
کوئی بجائے سوز غم ساز طرب بجائے کیوں

خط کشیدہ دونوں لفظ تحریر میں بھی اور تلفظ میں بھی اتنے قریب ہیں کہ اگر عبارت یا مصرع میں نہ ہوں بلکہ الگ الگ ہوں تو ان کی دوئی کا تصور بھی محال ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ماہر رسم الخط کو تحریر میں یہ جداگانہ نظر آئیں مگر سامع سے ان کے مفہوم پر غور کیے بغیر دو (۲) لفظ سمجھنے کی امید بہت کم ہے۔ اس کے باوجود دونوں کے معنی اتنے جداگانہ ہیں کہ ان میں کوئی ذرا سا بھی علاقہ نہیں۔ ہمزہ کا ہونا یا نہ ہونا (بجائے اور بجائے)، یا پہلے بجائے کی ”ب“ کو جدا کر کے لکھنا (یعنی بہ جائے) کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے دعوایے بالا کی تردید ہوتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں جس صفت کا ذکر کیا گیا ہے وہ تحریر سے نہیں بلکہ تلفظ اور سماعت سے متعلق ہے۔ خواہ اُس کا کوئی نام ہو۔

(ii) ایک شعر ہے :

تیرے بے دام کے بندے ہیں ریسان عجم

تیرے بے دام کے بندی ہیں ہزارانِ عرب

”بے دام“ دونوں مصرعوں میں ہے مگر الگ الگ معنی میں ہے۔ پہلے ”بے دام“ کا مطلب ہے بلا قیمت، یعنی ایسے غلام جو خریدے نہ گئے ہوں (ظاہر ہے کہ ایسے غلام بے حد وفادار ہوا کرتے تھے) اور دوسرے بے دام کے معنی ہیں ”بغیر بندھن والے“ یعنی جن کو باندھ کر نہ رکھا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ صنعت ہمارے علمِ بلاغت میں بہت پہلے سے ہے اور اس کا استعمال شعرا کرتے آئے ہیں۔ ایسی حالت میں اس صنعت کے استعمال پر شاعر کی بہت زیادہ تحسین نہیں کی جاسکتی اس لیے کہ اس میں کوئی نئی یا خاص بات نہیں ہے لیکن جو خاص بات ہے وہ قاری کو تب معلوم ہوتی ہے جب وہ دونوں مصرعوں میں بے دام صفت کے ہر دو (۲) موصوف پر غور کرتا ہے۔ بندے یعنی غلام ہیں تو مفت کے ہیں اور بندی یعنی قیدی ہیں تو بغیر بندھن کے ہیں قیدی ہر وقت قید سے رہائی چاہتا ہے، موقع ملے تو فرار بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ قیدی ایسے ہیں کہ ان کو ”دام“ یا ”کوٹھری“ میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر مزید لطف یہ ہے کہ ”بندے“ اور ”بندی“ کے تلفظ میں بڑی مماثلت ہے اگر ان دونوں لفظوں کو کوئی جلدی میں بولے اور یاے معروف و یاے مجہول پر زور نہ دے تو دونوں لفظوں کا الگ لفظ ہوتا بھی معلوم نہ ہو لطف بالائے لطف یہ ہے کہ یہ بندی ہزارانِ عرب ہیں۔ جو بے عقل پرندے ہیں اور آزادی کے ساتھ ہواؤں میں اڑنے کے عادی ہیں ان کو قفس میں بند رہنا بھلا نہیں لگتا۔ ان سب باتوں پر غور فرمائیے تو معلوم ہوگا کہ یہ شاعری کی کوئی معمولی صنعت نہیں ہے۔

(iii) ایک شعر اور ملاحظہ فرمائیے:

مے کہاں اور کہاں میں زاہد

یوں بھی تو جھکتے ہیں جھکنے والے

”مے“ اور ”میں“ دونوں الگ الگ لفظ ہیں مگر تلفظ میں اتنے قریب ہیں کہ مغائرت

کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ دونوں ایک چھوٹے مصرع میں ہیں جس میں کل چھ ۶ الفاظ ہیں۔ دو (۲)

یہ اور چار (۴) ان کے علاوہ۔ اس سے شعر کا حسن دو بالا ہو گیا ہے۔

(iv) ایک رباعی کا مصرع ثانی ہے:

ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ

”ان سا“ ایک (۱) بار اور ”انسان“ دو (۲) بار آیا ہے۔ ”انسان“ میں ”ان سا“ سے ”نون“

زائد ہے۔ مصرع میں ان تینوں لفظوں کے ایک ساتھ آجانے سے صوتی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔ شاید

اہل بلاغت نے اس خوبی کو کوئی نام نہیں دیا ہے۔

(v) حدائق بخشش حصہ دوم میں ”نظم معطر“ کی ایک رباعی کے دو مصرعے اس طرح ہیں:

جاں بخش مرا پائے عبدالقادر

جا بخش تہ لوائے عبدالقادر

پہلے مصرع میں ”بخش“ سے پہلا حرف نون غنہ ہے، نون بالا اعلان نہیں۔ اگرچہ پیش نظر

نسخے میں ”نون بالا اعلان ہی طبع ہوا ہے (یہ سہو کتابت ہے) اب دونوں مصرعوں کے ابتدائی الفاظ کو

پڑھ کر دیکھیے۔ تیزی سے پڑھنے اور روانی میں سنے میں دونوں مصرعوں کا آغاز ایک جیسا لگتا ہے۔

یہ بھی صنعت گری ہی ہے۔

(vi) بلاغت میں ایک صنعت ہوتی ہے واسع الشفتین۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ عبارت یا شعر

پڑھیں تو ہونٹ سے ہونٹ نہ ملیں۔ بحر الفصاحت میں مولانا نجم الغنی خاں نجمی رام پوری نے اس کی

مثال میں چھ (۶) شعر لکھے ہیں۔ پہلا شعر محمد امین بناری کا ہے۔ وہ اس طرح ہے:

جی سے کہہ دو کہ آہ سرد کے ساتھ

ٹھنڈے ٹھنڈے چلے تو چل نکلے

بحر الفصاحت میں مولانا نجم الغنی خاں نجمی کی تفصیل پسندی کا یہ عالم دیکھا جاسکتا ہے کہ ایک

حدائق بخشش کے صنائع بدائع پر ایک اور نظر

ایک صنعت کی مثالوں میں متعدد شاعروں کے چالیں چالیں، پچاس پچاس شعر نقل کر دیتے ہیں اور صفحے کے صفحے سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ مگر اس صنعت کی مثال میں مندرجہ بالا شعر کے علاوہ انہوں نے پانچ شعر اور نقل کیے ہیں، جن میں دو، نظیر اکبر آبادی کے اور ایک ایک میر نجف علی بیباک، نظام اور انشا کے ہیں۔ صاحب بحر الفصاحت شعر و ادب کے بڑے عالم تھے۔ رام پورا سٹیٹ کی رضا لائبریری کے ناظم اعلیٰ بھی رہے۔ ذاتی کتب خانہ بھی اچھا خاصا تھا۔ محنت سے کبھی نہیں گھبرائے۔ اشعار تلاش کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہوگی۔ لیکن اردو کے دو ادین میں اُن کو پانچویں کے بعد چھٹا شعر دستیاب نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ مشکل صنعت ہے۔ شعر کی بات تو الگ رہی اگر ہم کوئی ایسا جملہ بولنا چاہیں جس کی ادائیگی میں لب ایک دوسرے سے نہ ملیں تو بڑی مشکل سے کامیابی ملے گی۔ شاعری میں تو اور بھی بہت سی پابندیاں ہوتی ہیں۔

لیکن جناب رضا بریلوی نے انتہا درجے کی مصروفیات ہوتے ہوئے اس صنعت میں بارہ اشعار کی ایک نعت عطا فرمائی ہے، جس کو پڑھتے رہیے ہونٹ نہیں ملیں گے۔ یہ نعت حدائق بخشش کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ چونکہ یہ جلد عموماً دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے یہ نعت تمام و کمال یہاں نقل کر رہا ہوں تاکہ قارئین کی دلچسپی کا سامان ہو۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ جناب رضا بریلوی اگر شاعر ہی ہوتے اور شاعری کے علاوہ اُن کی دیگر مصروفیات نہ ہوتیں تب کیا کچھ کر کے دکھا دیتے اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ نعت پاک یہ ہے۔

سید کونین ، سلطان جہاں
ظن یزداں ، شاہ دیں ، عرش آستان
گل سے اعلیٰ، گل سے اولیٰ، گل کی جاں
گل کے آقا، گل کے ہادی، گل کی شاں
دلکشا ، دلکش ، دلآرا ، دلستاں
کانِ جان و جانِ جان و شانِ شاں
ہر حکایت ، ہر کنایت ، ہر ادا
ہر اشارت دل نشین و دل نشان
دل دے ، دل کو جان ، جاں کو نور دے
اے جہانِ جانِ دے جانِ جہاں !

آنکھ دے اور آنکھ کو دیدار نور
روح دے اور روح کو روح جنان
اللہ اللہ یاس اور ایسی آس سے
اور یہ حضرت ، یہ در یہ آستان
تو ثنا کو ہے ثنا تیرے لیے
ہے ثنا تیری ہی دیگر داستان
تو نہ تھا تو کچھ نہ تھا ، مگر تو نہ ہو
کچھ نہ ہو ، تو ہی تو ہے جانِ جہاں
تو ہو داتا اور اوروں سے رجا
تو ہو آقا اور یادِ دیگران
الہا ہے شرک و شر سے دور رکھ
ہو رضا تیرا ہی غیر از این و آن
جس طرح ہونٹ اس غزل سے دور ہیں
دل سے یوں ہی دور ہو ہر ظن و ظال

(صفحہ ۵۰-۴۹)

(vii) عربی فارسی اور اردو میں شاعری کی انیس بحریں رائج ہیں۔ ان میں ایک بحر وافر بھی ہے۔ بحر وافر کے بارے میں مولانا نجم الغنی خاں ٹنچی بحر الفصاحت میں رقم طراز ہیں:

”مُفَاعِلَتُنْ مُفَاعِلَتُنْ مُفَاعِلَتُنْ دُوبَار۔ وافر فا کے کسرے سے اس لیے کہتے ہیں کہ اس بحر میں شعر بہت کہے گئے ہیں یا اس بحر میں دکات کثرت سے ہیں۔ یہ بحر عربی سے خصوصیت رکھتی ہے۔ ریختہ میں مستعمل نہیں بعض شعراے فارس نے بہ تکلف اس میں شعر کہے ہیں۔“

وافر مثنیٰ سالم: طالب کہتا ہے

ڈرا کے کہا بھلا بے بھلا خفا جو ذرا ہوا صنم
مرا بھی ذرا بگلہ نہ رہا ہنسا جو گیا مجھے یہ ستم

ڈراک کہامفا علثن بلا ب بلا مفا علثن خفاج ذرامفا علثن هواؤ صنم مفا علثن
مراب ذرامفا علثن گلہ ن رہامفا علثن ہساج گیا مفا علثن مجے یہ ستم مفا علثن

(قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ایڈیشن ۲۸۴)

اس بحر کی مثال کے لیے بھی عجبی صاحب کو مذکورہ بالا ایک شعر ہی دستیاب ہوا انہوں نے اس کتاب کی مثالوں کے لیے خود بھی شعر کہے ہیں، لیکن اس بحر کی مثال کے لیے ایک مصرع بھی نہیں کہا۔ حضرت رضا بریلوی نے اس بحر میں ایک طویل نعت عطا فرمائی ہے حدائق بخشش حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیے:

زمین و زماں تمہارے لیے مکین و مکاں تمہارے لیے

بچ نین و پختاں تمہارے لیے بنے دو جہاں تمہارے لیے

اس نعت میں پینتیس (۳۵) اشعار ہیں۔ نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ اسلامیات خصوصاً فقہ حنفی کے

اپنے عہد کے عظیم ترین عالم اور کتنے ہی دیگر علوم و فنون کے ماہر، عبقری شخصیت کے حامل اس یگانہ روزگار ہستی کی قدرت شاعرانہ میں بھی کسی طرح کا شک نہیں کیا جاسکتا۔



حدائق بخشش کے متن کا المیہ

ABSTRACT:

HADAIQ-E-BAKHSISH the poetic Naatia collection of Aala Hazrat Ahmad Raza Khan Brailvi (R.A) has been published by various publishing organizations and Sharer Misbahi has also come with a new version with the implied claim of error free edition. Even then the collection of poetry of Aala Hazrat could not be brought at error free standard. This article cites some composing errors with the suggestion to take into account in the next edition, if possible.

حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اُن کے کسی ہم عصر عالم نے اعلیٰ حضرت کا خطاب دیا اور یہ خطاب ان پر ایسا چسپاں ہوا کہ جب کبھی مطلقاً ”اعلیٰ حضرت“ بولا جائے تو اپنے پرائے سب سمجھ لیتے ہیں کہ قائل کا اشارہ کس طرف ہے۔ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

اعلیٰ حضرت نے جہاں دین برحق کے دوسرے شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے وہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت کے اظہار کے لیے نعتیہ شاعری کو چنا اور اس میں وہ مقام حاصل کیا کہ ”امام نعت گویاں“ کہلائے۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ان کے کلام کے ساتھ وہ اعتنا نہیں برتا گیا جو اس کا حق تھا۔ اب تک حدائق بخشش کا ایسا نسخہ تیار نہیں ہوا جو اغلاط سے مکمل پاک ہو۔ ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی صاحب نے کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس سے پہلے شمس بریلوی صاحب نے جو نسخہ تیار کیا تھا اس میں بھی کئی اغلاط ہیں۔

ڈاکٹر شرر مصباحی صاحب نے اپنے مرتب کردہ نسخے کے آغاز میں ”حدائق بخشش کا فنی و عروضی جائزہ“ پیش کیا ہے۔ یہ ایک قابل قدر کام ہے لیکن جیسا کہ نعت رنگ شمارہ ۲۵ میں ڈاکٹر صابر

سنبھلی صاحب نے اپنے مضمون میں کئی باتوں کا ذکر کیا جو قابل غور ہیں۔ اس سلسلہ میں میں بھی دو ایک باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ حضرت کی ایک مشہور نعت ہے:

سونا جنگل رات اندھیری چھائی بدلی کالی ہے

سونے والو جاگتے رہو چوروں کی رکھوالی ہے

مصباحی صاحب نے صفحہ ۳۱ پر اس نعت کے مختلف اوزان لکھے ہیں۔ ان میں نویں نمبر پر یہ وزن بھی لکھا ہے۔ فعل فعولن فعلن فعل فعل فعولن فعولن فع۔ یہ وزن غلط ہے۔

مصباحی صاحب کے نسخہ میں صفحہ ۲۳ پر اعلیٰ حضرت کا شعر یوں ہے:

ذرے مہر قدس تک تیرے توسط سے گئے

حدِ اوسط نے کیا صغریٰ کو کبریٰ نور کا

یہاں ”گئے“ کی جگہ ”گئے“ ہونا چاہیے۔ اصول یہ ہے کہ جس حرف پر جو آواز نکلتی ہے وہاں وہی حرف ضروری ہے۔ اسی طرح ”زمین و زماں تمہارے لیے“ ہے۔ مصباحی صاحب کے نسخہ میں پوری نعت میں ”لئے“ کی جگہ ”لئے“ لکھا ہے جو کہ غلط ہے۔

ڈاکٹر مصباحی صاحب نے صفحہ ۹ پر اعلیٰ حضرت کے مصرعے ”رنگ رومی شہادت پہ لاکھوں سلام“ کے بارے میں تحقیق کر کے فرمایا ہے کہ اس مصرعے میں ”رنگ رومی شہادت“ نہیں بلکہ ”رنگ روئے شہادت“ ہے۔ اس تحقیق پر اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

حدائق بخشش کے بعض اشعار میں مجھے بھی تردد ہے۔ اگر مصباحی صاحب ان کے بارے میں تحقیق کی زحمت گوارا فرمائیں تو بجد ممنون ہوں گا۔

۱۔ پل سے اتارو راہ گزر کو خبر نہ ہو

جبریل پر بچھائیں تو پر کو خبر نہ ہو

(یہاں ”اتارو“ کی جگہ ”گزارو“ ہونا چاہیے)

۲۔ ایسا گمادے اُن کی ولا میں خدا ہمیں

ڈھونڈھا کرے پر اپنی خبر کو خبر نہ ہو

(یہاں ”کرے“ کی جگہ ”کریں“ ہونا چاہیے)

۳۔ سر غیبِ ہدایت پہ غیبی درود

عطر جیبِ نہایت پہ لاکھوں سلام

حدائق بخشش کے متن کا الیہ

(یہاں ”ہدایت“ کی جگہ ”بدایت“ (بمعنی ابتداء) ”ہونا چاہیے“)

۴۔ زلبہ مسجد احمدی پر درود

دولتِ جمیشِ عسرت پہ لاکھوں سلام

(یہاں ”زابد“ کی جگہ ”زائد“ ہونا چاہیے)

۵۔ جسے تیری صفِ نعال سے ملے دو نوالے نوال سے

وہ بنا کہ اس کے اگل سے بھری سلطنت کا ادھار ہے

(یہاں ”ادھار“ کی جگہ ”ادھار“ (بمعنی ناشتہ) ”ہونا چاہیے“)

۶۔ شمع تابان کا شائہ اجتہاد

مفتی چار ملت پہ لاکھوں سلام

(اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں ائمہ مجتہدین کا ذکر ہے مگر

سلام رضا میں یہ شعر ازواجِ مطہرات کے ذکر سے متصل ہے۔ میں

نے سلام رضا پر جو تفسیریں لکھی ہیں اس میں اسے ”شافعی، مالکی، احمد،

امام حنیف چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام“ سے متصل لکھا ہے۔)

۷۔ تیری قضا خلیفہ احکامِ ذوالجلال

تیری رضا حلیف قضا و قدر کی ہے

یہ شعریوں ہونا چاہیے:

تیری رضا حلیفہ احکامِ ذوالجلال

تیری قضا حلیف قضا و قدر کی ہے

ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب نے اپنے مضمون میں اعلیٰ حضرت کے شعر:

اے برور تو نماز عبدالقادر

اے ربخ تو نیاز عبدالقادر

کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ شعر رضا اکیڈمی بمبئی والے نسخہ میں نہیں ہے۔ یہاں میں یہ واضح

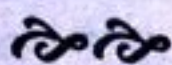
کردوں کہ حدائقِ بخشش کے متن میں لا پرواہی (یا دھاندلی) کا سلسلہ پرانا ہے۔ میرے پاس حدائقِ

بخشش کے ۶ نسخے ہیں ان میں سے صرف اسلامی کتب خانہ لاہور کے مطبوعہ نسخے میں صفحہ ۵۵ پر یہ شعر

ہے۔ حد تو یہ ہے کہ محترم ٹمس بریلوی صاحب کے مرتبہ نسخے سے بھی یہ شعر غائب ہے۔

اے حضرت سے محبت و عقیدت کا تقاضا یہ ہے کہ حدائق بخشش کا ایک ایسا نسخہ تیار کیا جائے جو اغلاط سے مکمل پاک ہو۔ یہ کام کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ اس کے لیے کمیٹی بنائی جائے جس میں مقتدر علمائے کرام بھی ہوں اور فن عروض کے ماہر شعراء بھی۔ اس کام کے لیے مارہرہ شریف میں موجود حدائق بخشش کا مخطوطہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

مجھے امید ہے کہ ہند میں موجود علمائے کرام اس طرف توجہ دیں گے۔ ۱۳۴۰ھ میں اے حضرت کا ۱۰۰ واں عرس مبارک ہوگا۔ اگر اس موقع پر عوام اہلسنت کو یہ تحفہ مل جائے تو بڑی خوش نصیبی کی بات ہوگی۔



کرناٹک میں اردو کی نعتیہ شاعری

ABSTRACT:

KARNATAKA has contributed much towards Urdu in the shape of poetry, prose, journalism, research and linguistics etc. Poets and Poetesses belonging to Karnataka, who contributed towards genre of Naat have been introduced in this article, after showing some historical back ground of Urdu literature.

سرزمین کرناٹک نے تاریخ کے ہر دور میں اردو زبان و ادب کی آبیاری اور چمن بندی میں بلاشبہ ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ شاعری ہو یا نثر، لسانیات ہو یا صحافت، سائنسی ادب ہو یا ادب اطفال، ہر لحاظ سے کرناٹک کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے اردو کو گنج ہائے گراں مایہ سے نوازا ہے۔ خاص طور پر شاعری کی تقریباً جدید و قدیم اصناف و ہیئت میں طبع آزمائی کی گئی ہے ظاہر ہے کہ ان میں صنف نعت گوئی بھی ہے۔ جو بڑی عظمت و اہمیت کی حامل ہے۔

تاریخی حیثیت سے اردو میں نعت گوئی کی روایت نئی نہیں۔ یہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود اردو شاعری، عہد قدیم سے لے کر آج تک شاید اردو کا کوئی شاعر ہو جس نے نعتیہ اشعار نہ کہے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی نے خاص شغف اور لگاؤ کے ساتھ کہے ہیں اور پورے پورے دیوان یادگار چھوڑے ہیں کسی نے محض تکلفات سے کام لیا ہے اور اکا دکا نعتیہ غزلیں ہی کہی ہیں۔ کچھ نے اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں اور کچھ اوسط و ادنیٰ سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

اردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں نعتوں کا کتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا۔ اس کا اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے اردو شاعری کا تسلسل سے مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ذخیرہ کا زیادہ حصہ بعض دوسرے موضوعات کی شاعری کی طرح معمولی درجے کا ہے لیکن ایک حصہ ضرور ایسا ہے جو فکر و فن کے معیاروں پر پورا اترتا ہے اور بلند پایہ شاعری کے زمرے میں آتا ہے۔

ایک طرف تو اردو میں نعتیہ شاعری کی یہ وسعت اور عظمت ہے اور دوسری طرف ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس نوع کی شاعری تقریباً ہر زمانے میں دہلی دہلی سی رہی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ میرے خیال میں اس کی واحد وجہ ہمارے ناقدین و محققین کی بے اعتنائی ہے کہ عرصے تک وہ اردو کی تقدیری شاعری یعنی حمد و نعت و منقبت کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے ادبی و تخلیقی سطح پر اس کے اعتراف میں بخل سے کام لیتے رہے ہیں۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ اس شاعری کا تعلق براہ راست جذبے کی شدت اور سرمدیت سے ہے جہاں دل کی صاف اور سچی آواز سنی جاتی ہے۔ ایسی شاعری اپنی تاثیر اور دلنشینی کی وجہ سے شاعر اور قاری دونوں کے سچے محسوسات کی ترجمان ہوتی ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اب حالات بدل رہے ہیں، برف پگھل رہی ہے۔ آج مقدار و معیار دونوں اعتبار سے فن نعت میں قابل قدر اضافہ ہو رہا ہے۔

اس وقت برصغیر ہندوپاک میں استحکام نعت اور فروغ نعت کی منظم تحریک وجود میں آچکی ہے۔ نعت رنگ دنیائے نعت اور جہان نعت جیسے یک موضوعی رسالے نکل رہے ہیں۔ صرف اتنی ہی نہیں، مختلف مکاتب فکر و عقیدہ اور مسلک و مذہب سے وابستہ معتبر ترقی پسند جدید اور جدید تر شعرا تسلسل سے نعتیہ شاعری کر رہے ہیں اور ہندوپاک میں جتنے ادبی رسائل نکل رہے ہیں مثلاً سیپ، سیارہ اور فنون (پاکستان)۔ پیش رفت، شاعر، ایوان اردو و معارف وغیرہ (ہندوستان) کے ادبی ماہنامے، اپنے آغاز میں نعتوں کا بڑا حصہ اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ نعت کی یہ بے پناہ مقبولیت رسول مقبول حضرت سلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟

اردو شاعری کے ہر دور اور ہر مقام کے شعری نمونوں میں نعتیہ اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ”اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام“ میں حضرت خواجہ بندہ گیسو دراز (م: ۸۲۵ھ) کے کچھ اشعار کو اردو نعت کا اولین نمونہ قرار دیا ہے۔ بطور مثال یہ شعر نقل کرتا ہوں:

اے محمد جلو جم جم جلوہ تیرا

ذات تجلی ہووے گی نین سپورن سہرا

نویں صدی ہجری کے مختلف صوفی شعرا خواہ وہ گلبرگہ و بیدر کے ہوں یا بیجاپور و بنگلور و میسور کے، ان کے یہاں نعتیہ اشعار کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں مقامی رنگ و رجحان اور موسیقیت کے ساتھ محبت کی حلاوت اور جذبے کی گرمی بھی موجود ہے۔

دورِ حاضر میں یعنی آزادی ہند کے کرناٹک کے نعت گو شعرا کی جستجو میں جب تاریخ و تذکروں اور کلیات و دوادین کامیں نے جائزہ لیا تو تقریباً ایک سو شعراء کی فہرست میرے سامنے آئی جن کی نعتیہ عطائیں فکرو فن کی خوبیوں کے باعث لائق مطالعہ ہیں مگر یہ کام انتہائی طولانی اور دیدہ وری کا ہے جو ایک مبسوط تحقیقی و تنقیدی مقالے کا متقاضی ہے۔

سردست میں ان نعت گو شعراء کا بطور خاص ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن کی شاعری کا بڑا حصہ نعتوں پر مشتمل ہے اور صاحب کتاب ہیں۔ ایسے شعراء کی تعداد مکمل طور سے دو درجن ہے۔ دوسری فہرست ان کی ہے جو ادبی و شعری لحاظ سے معتبر اور صاحب کتاب شاعر ہیں، ان کی تعداد یقیناً دو درجن سے کچھ زیادہ ہے۔ جن کا مجموعہ غزلوں کا ہو یا نظموں کا، ان کا آغاز عموماً حمد و نعت ہی سے ہوتا ہے۔ ان مجموعوں کے خالق اگرچہ باقاعدہ نعت گو نہیں مگر ان کی نعتیہ شاعری تمام محاسن سے معمور ہے۔ ان کی نعتوں میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت اور وارفتگی، قلبی وابستگی اور تعلق خاطر کا بے پایاں اظہار ہوا ہے۔

ان تمہیدی سطور کے بعد اب میں دورِ حاضر میں کرناٹک کے چند نعت گو شعرا کا تذکرہ پیش کرنا چاہتا ہوں، حافظ کرناٹکی ایک خوش فکر، خوش گوا اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ بچوں کے شعری ادب میں ایک خاص لہجہ رکھتے ہیں اس لہجے کی جھلک ان کی نعتوں میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ اردو نعت کی ایک توانا آواز ہیں، بچوں کے تو مقبول و محبوب شاعر ہیں ان کی شاعری سادہ و سہل ہونے کے ساتھ ساتھ پیغامِ عمل سے بھی مملو ہے۔ اب تک حمد و نعت میں آپ کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی نعتوں میں جذبہ کی فراوانی کے ساتھ ساتھ اظہار کا سلیقہ اور انتہائی احتیاط بھی موجود ہے۔ نعتیہ شاعری ہمیشہ سے ہی ”بامحمد ہوشیار“ کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے ہر شاعر نعت کہتے ہوئے ڈرتا اور گھبراتا ہے۔ جناب حافظ نے باضابطہ منظوم سیرت نگاری بھی کی ہے۔ مگر ان کے دیگر نعتیہ اشعار میں بھی سیرت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشبو مہک رہی ہے اور ان کی تمنا ہے کہ وہی خوشبو مسلمان معاشرے میں مجسم ہو جائے لیکن وہ اپنے معاشرے کی موجودہ صورتحال سے شاکی بھی ہیں:

محمد کی سیرت کو بھولے ہوئے ہیں

ہم عصیاں کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں

ان کی نعتوں کا مجموعہ ”شمع ہدی“ ہے جس کے ذریعہ انہوں نے بچوں کے ذہن میں یکسوئی کے ساتھ اپنے پیارے نبی کی محبت کا جذبہ پیدا کرنے، ایمان و اعتقاد کو پختہ کرنے اور ان کی ظاہری و باطنی

تربیت اسلامی اصول و اعتقاد کے مطابق کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد نے سب کو مروت سکھائی

صداقت محبت سخاوت سکھائی

ڈاکٹر سید شاہ مدار عقیل دنیائے نعت میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ ”ردائے رحمت“ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں نعتیہ غزلوں کے ساتھ ساتھ جدید لب و لہجہ میں آزاد نظم کے فارم میں بھی نعتیں بڑی تعداد میں کہیں۔ شاعری میں علیست، شعریت اور مذہبیت کے تینوں زاویوں کو برابر سے ایک جگہ دیکھنا ہو تو جناب عقیل کی شاعری کو دیکھنا چاہیے۔ مثال ملاحظہ فرمائیے:

عروج ہستی آدم کی لازوال مثال

مقام سدرہ کی عظمت تمام آپ کے نام

ڈاکٹر راہی فدائی جدید نعتیہ شاعری کا ایک معتبر نام ہے۔ ”مہبط انوار“ آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے جب کہ ”یا صاحب الجہال“ منظوم سیرت نگاری کا ایک خوبصورت نمونہ ہے۔ راہی فدائی کی نعتوں میں ندرت و سلاست کے ساتھ والہانہ عقیدت، نیاز مندانہ وارفتگی اور دربار نبوی سے لگاؤ داخلی کیفیات کا بے پناہ شوق نمایاں نظر آتا ہے۔ آپ نے اپنی نعتوں میں آیات ربانی اور احادیث نبوی کی تعلیمات اور سیرت سرور عالم کو بڑے موثر انداز میں نظم کیا ہے:

دشمن جاں تھے عمر، فاروق اعظم ہو گئے

خار رشک گل بنے، شعلے بھی شبنم ہو گئے

ان کی وہ چشم کرم، اعداء کے سرخم ہو گئے

جناب اسد اعجاز ایک ایسے خوش قسمت شاعر ہیں جنہوں نے دوسری اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کے ساتھ نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ آپ کی نعتوں کا مجموعہ ”آبروئے سخن“ شائع ہو چکا ہے۔ جس میں حمد و مناجات اور منقبت بھی ہیں۔ جو شاعر کی پختہ گوئی اور زور بیان کا بین ثبوت ہیں۔ شاعر کو سرکارِ دو عالم سے جو عشق و محبت اور عقیدت ہے ان کی تمام نعتوں میں مختلف انداز سے اسی کا اظہار ہوا ہے۔ حسرت حاضری اور کیفیاتِ حضوری کے رنگ بھی ان کی فضائے نعت پر چھائے ہوئے ہیں۔ دوری میں حضوری کی کیفیت کا اندازہ صرف ایک شعر سے کیجیے:

گنبدِ خضریٰ نظر آئے گا چشمِ دل سے دیکھ

اے اسد اعجاز تجھ سے کب مدینہ دور ہے

آج کا انسان جس انتشار و اضطراب، بے چینی اور بحران کا شکار ہے اس کے تمام مسائل اور دکھ

درد کا علاج شافع محشر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت غلامی میں ہے۔ اگر انسانیت کو آج حقیقی امن و سکون اور راحت و طمانیت درکار ہے تو اسے یہ نعت حضور اکرم کے قدموں میں ہی مل سکتی ہے۔

ذکر رسول پاک سے حاصل ہوا سکون

جب بھی دل و جگر میں ذرا بے کلی ہوئی

جناب ریاض احمد خمار عصر حاضر کے ایک ایسے شاعر ہیں کہ جن کی غزلوں کا مجموعہ ”جزیرہ امیدوں کا“ جب نظر نواز ہوا تو ان کی غمزہ اور اداس شخصیت درد و الم کی شاعری کے آئینہ میں منعکس ہو گئی اور جب ان کی حمد و نعت پر مشتمل کتاب ”سرحد یقین کی“ سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ خمار ایمان و یقین کی سرحد کی جانب جادہ عشق پر گامزن ہیں اور محبت و عقیدت کا والہانہ نغمہ الاپتے ہوئے اس منزل کی سمت رواں ہیں جو حضرت محسن، امیر، اور رضا کی راہوں سے ہوتا ہوا حضرت حسان بن ثابتؓ تک پہنچا ہے۔

کہتے ہیں جس کو لوگ مدینہ منورہ

بے شک وہ سرزمین ہے سرحد یقین کی

خمار کی نعتیہ شاعری تمام تر ان کے ٹوٹے ہوئے دل کی آواز ہے۔ جس میں کوئی تصنع نہیں وہ اپنی محبت اور قربت کا اظہار بڑے آسان پیرائے میں سادگی اور سلاست کے ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس کی روحانی کیفیت دل کی تہوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ خمار کی نعتوں میں خلوص و محبت ہے۔ بے ساختگی اور روانی ہے۔ تڑپ ہے، چاہت ہے اور اسی چاہت کا دم بھرتی ہوئی ان کی شاعری ان کے داخلی رموز کا دلکش اظہار ہے:

جان لیجئے عشق میں ڈوبے بغیر مدحت خیر الوری ہوتی نہیں

خمار عشق محمد میں جو ہیں غرق انہیں زیاں کی فکر نہ ارمان سود ہوتا ہے

عشق رسول کا لازمی تقاضہ اتباع رسول ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں، شاعر کو جہاں متاع عشق رسول حاصل ہے۔ وہیں وہ اسوۂ رسول پر گامزن ہونے کی ضرورت و اہمیت سے بھی واقف ہے:

زندگی میری بسر آپ کی تقلید میں ہو

ہے یہ خواہش یہ تمنا یہی حسرت آقا

مجھے ان کی ایک نعت، جس میں بظاہر شاعر نے اپنا درد و غم بارگاہ رسالت میں پیش کیا ہے مگر یہ ان کا ذاتی کرب و الم نہیں بلکہ یہ نعت اجتماعی آشوب، عصری آگہی اور ملی شعور کا مرقع ہے۔ بڑی پسند

آئی صرف ایک شعر ملاحظہ ہو:

نئی الجھنیں نئی مشکلیں نئے مسئلے نئی آفتیں

نئے امتحان ہیں قدم قدم نہ کہوں میں ان سے تو کیا کروں

جناب منیر احمد جامی گذشتہ تین دہائیوں سے پرورش لوح و قلم میں مصروف ہیں بہت پہلے حمدیہ مجموعہ ”حرف ناتمام“ منظر عام پر آیا، پھر نعتوں کا مجموعہ ”نقش لاثانی“ دنیائے نعت میں ان کی منفرد شناخت کا باعث بنا اور اب غزلوں کا مجموعہ ”اختراع“ ان کے زرخیز ذہن کی نشاندہی کر رہا ہے۔ منیر جامی کی نعت گوئی میں عشق رسول کی وارفتگی کے ساتھ ساتھ صوفیانہ اپروچ بھی نظر آتا ہے۔ جوان کے فکری میلان کا اشاریہ ہے۔

وہی نظر ہے زمانے میں کامیاب نظر جو نقش پائے محمد کو ڈھونڈتی ہوگی

دل و نگاہ جہاں غرقِ عشق احمد ہوں وہاں پہ حسنِ عقیدت کی آگہی ہوگی

جناب اکمل آلدوری کرناتک کے ممتاز و معروف شاعر ہیں جن کا نعتیہ مجموعہ ”نور و ظہور“ شائع ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے مجموعہ غزل ”ساغرِ اخلاص“ اور مجموعہ رباعیات ”سلگتے پھول“ کے نام سے دنیائے شاعری میں پیش کر چکے ہیں۔ آپ کی نعتیہ شاعری میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اخلاص و عقیدت اور عشق و محبت کی ورافتگی کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ ایک نعت کے دو اشعار دیکھ لیجیے:

آگئے ختم نبوت کی سند لے کر حضور آگئی خلقت سمٹ کر زیرِ دامانِ رسول

تذکرہ ہے آپ کی رفعت کا جب قرآن میں پھر کسی کی کیوں ہوتا جِ بیاں شانِ رسول

جناب عبدالقدیر شاہر بنگلوری مرحوم معروف و مقبول مترنم شاعر تھے۔ آپ نے غزلوں کے دو مجموعے ”سازِ فطرت“ اور ”آوازِ فطرت“ شائع کیے نیز نعتوں کا ایک مجموعہ ”نذرانہ عقیدت“ پیش کیا۔ آپ نے زیادہ تر روایتی شاعری کی ہے اور نعتیں بھی رسمی و روایتی انداز کی کہی تھیں:

جسے بخشی گئی دین اور دنیا کی جہاں گیری

وہی ہے شافعِ محشر وہی اک کملی والا ہے

جناب سلام نجمی بھی مشاعروں کے معروف مقبول مترنم شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ”تابہ افق“ اور حمد و نعت و منقبت کا مجموعہ ”جذبہ اطہر“ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کے کلام میں بھی روایتی نعت گوئی کے تمام مسلمات موجود ہیں، ایک نعت کے یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

کتنا پر کیف ہے کس قدر جانفزا کتنا دلکش ہے ذکر و بیاں آپ کا

سُرنگوں کیوں نہ ہو جائے نجی وہیں ذکر شاہ ہدیٰ ہو جہاں آپ کا
جناب کوثر جعفری بھٹکی مرحوم ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ ”موجِ سخن“ ہے جو دراصل من کی وہ موج ہے جو بے اختیار شعر کے قالب میں ڈھل کر ہمیں سرخوشی و مستی عطا کرتی ہے۔ کوثر کی دوسری جہت نعت نگاری ہے جو اپنے خلوص، والہانہ وارفتگی، بحرِ محبت کی طغیانی اور آبشارِ عقیدت کی روانی کے باعث بڑی بلند اور اوجِ سخن کے مقام پر فائز ہے۔ کوثر جعفری کی اصل شناخت ان کے نعتیہ مجموعہ کلام ”اوجِ سخن“ میں شامل نعتیں ہیں۔

عشق رسول کے بغیر نعت گوئی ممکن نہیں بقول میر تقی میر ”عشق بن یہ ادب نہیں آتا“ کوثر کی نعتیہ شاعری دل کی شاعری ہے جو دل والوں کو متاثر کرتی ہے، چند اشعار دیکھیے:

ہے سودائے عشق نبی میرے سر میں بگوئے نہ آئیں مری رہگزر میں
محبت میں نہیں اندیشہ سودو زیاں مجھ کو کہ بخشا ہے نبی کے عشق نے درِ نہاں مجھ کو
ہری ہر کے نور احمد سورج کرناٹکی نے شعری مجموعہ ”صبحِ امید“ کے بعد نعتیہ مجموعہ ”تجلیات“ بھی پیش کر دیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

جو شخص مصطفیٰ کا مددگار ہو گیا اللہ پاک اس کا مددگار ہو گیا
سورج نبی کے عشق میں کیا ہو گئے مگن خوابیدہ بخت آپ کا بیدار ہو گیا
جناب عبدالستار مائل ٹمکوری کا شعری مجموعہ قدیل شائع ہو چکا ہے۔ نعتیہ مجموعہ ”نذرانے“ کے ذریعہ آپ نے بارگاہِ رسالت میں عقیدت و محبت کے پھول نذر کیے ہیں۔

کچھ ایسا علم رسالت مآب لائے ہیں کہ ذہن و فکر میں اک انقلاب لائے ہیں
اندھیرا چھٹنے ہی والا ہے کفر کا مائل وہ کارِ خیر کا ایک آفتاب لائے ہیں
جناب رزاق کوثر میسور کی ادبی و شعری سرگرمیوں میں بے حد متحرک و فعال کردار ادا کرتے رہے ہیں، آپ کی نعتیہ شاعری کا مجموعہ ”اعتراف“ کا کلام جذبے کی فراوانی اور احساسات کی شدت کے ساتھ خلوص و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ بطور نمونہ ایک نعت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آپ میرے دین و ایمان میری دنیا آپ ہیں آپ ہیں میرا مقدر میری عقبیٰ آپ ہیں
ہر تہی داماں نے پائی آپ سے اپنی مراد ہر امید تشنہ لب کے حق میں دریا آپ ہیں
جناب رزاق اثر کا نعتیہ مجموعہ ”حص حص الحق“ (اور حق ظاہر ہو ہی گیا) دسمبر ۲۰۱۳ میں شائع ہوا ہے۔ اس سے پہلے ۲۰۰۲ میں نعت و منقبت پر ایک مجموعہ ”بیاض تنہا“ شائع ہوا ہے۔ علاوہ ازیں

پانچ شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آپ قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر ہیں اور نعت گوئی کے آداب و اسالیب سے اچھی طرح واقف ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ احتیاط اور تقاضائے ادب و احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

مسلسل آنکھ سے بہتے ہیں آنسو نام لیتے ہی ہے کیسا غم سمجھ میں کچھ نہیں آتا رسول اللہ

ان کے ویلے سے ہی خدا کا پتہ ملا ان کا تو کائنات پہ احسان ہے بہت

جناب آغا اختر عباس اختر علوی نے بیشتر اصناف نثر و نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ آپ بنگلور کی بے حد متحرک شخصیت ہے۔ آپ نے غزلوں کے علاوہ حمد و نعت اور سلام و مرثیہ بھی خوب خوب لکھا ہے۔ ”چشم جم“، اور ”ضرب عزا“ کے نام سے آپ کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نعتیہ شاعری میں روایتی لب و لہجہ کے باوجود عشق و محبت کی وارفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے:

دامانِ نبی تھام لو اللہ ملے گا اللہ کا طالب ہے طلبگارِ محمد

اللہ کا مرثدہ ہے یہ بندوں کو اے اختر جنت کا ہے حقدار و فادارِ محمد

ضلع بنگلور کے شہر چن پٹن کی فضاؤں میں شعر و ادب کو برگ و بار اور خصوصیت کے ساتھ نعت گوئی کے فن کو پروان چڑھانے والی ناقابل فراموش شخصیت حضرت زین العابدین تقدیر مرحوم و مغفور کی تھی آپ ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر تھے کہتے ہیں کہ تقریباً تمام نوجوان شعرائے چن پٹن آپ کے حلقہ شاگردی میں شامل تھے۔ آپ کی زندگی میں آپ کا نعتیہ مجموعہ ”نوشتہ تقدیر“ کے عنوان سے شائع ہوا البقیہ تمام کلام آپ کے انتقال کے بعد آپ کے وارثوں نے شائع کرایا۔ نمونہ کلام ملاحظہ کیجیے:

آجائے نظر مصحف رخسار محمد مدت سے ہوں میں تشنہ دیدار محمد

کیوں کرنے اثر زمزمہ سخی کا ہو اس کی تقدیر ہے اک بلبل گلزار محمد

جناب عبدالحق جوہر صدیقی نے اپنی غزلوں کا مجموعہ ”آوارہ لکیریں“ پیش کیا۔ پھر مجموعہ نعت و منقبت ”صلو علیہ وسلم“ کے عنوان سے شائع کیا۔ چند نعتیہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

آدمیت کے شرف کا تاج پر انوار ہے برسر عرش معلیٰ نقش پائے مصطفیٰ

ہے خدا کی شان رزاقی کا یہ فیضان خاص دو جہاں کو کر دیا مہماں سرائے مصطفیٰ

محمد حبیب صابر شاہ آبادی مرحوم ملک کے معروف و مقبول نعت گو شاعر تھے آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً ۴۵ سال خدمت شعرو سخن میں صرف کئے جن کا بیشتر حصہ نعت گوئی پر مشتمل ہے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ رحمت عالم، سلسلہ انوار، ضامن نجات اور تہذیب منورہ

جن کی نعتیں کافی عظمت و اہمیت کی حامل ہیں۔ آپ کے نعتیہ کلام کے موضوعات میں تنوع ہے۔ خیالات میں جدت اور ندرت، جذبات میں گہرائی و گیرائی اور فکر کی بلند پروازی ہے۔ صاف و شگفتہ اور رواں دواں اسلوب میں خلوص و محبت اور عقیدت کا اظہار کمال ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیں:

مسلمان کی تعریف جو بھی ہو لیکن ہے مومن وہی جو غلام آپ کا ہے

نہ الفاظ صابر نہ آواز صابر کلیم آپ کا ہے کلام آپ کا ہے

ڈاکٹر سید شاہ خسرو حسینی عصر حاضر کے وہ معروف نعت گو شاعر ہیں جنہوں نے اردو کے ساتھ فارسی اور ہندی میں بھی کثرت سے نعتیں کہی ہیں۔ آپ کا نعتیہ مجموعہ ”ورفعنا لک ذکرک“ شائع ہو چکا ہے جو دراصل حضرت خولجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ادبی و شعری ورثہ کی توسیع ہے اور خوشی کی بات یہ ہے موصوف نے اس روحانی و شعری سلسلہ کو پوری توجہ، انہماک اور استعداد کے ساتھ جاری ساری رکھا ہے۔ یہ پورا مجموعہ کلام خلوص و محبت کے جذبے سے سرشار، عشق و عقیدت کی خوشبو سے معطر ایمان و یقین کی کیفیت اور تسلیم و رضا کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ بطور مثال:

مدینہ کو جانے کو جی چاہتا ہے وہاں سے نہ آنے کو جی چاہتا ہے

رہوں ان کے قدموں میں ہے یہ تمنا اور آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

ڈاکٹر وحید انجم ایک قادر الکلام اور خوش فکر شاعر ہیں، دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ صنفِ نعت پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس فن میں مہارت حاصل کی ہے۔ ”ابر رحمت“ آپ کا مجموعہ کلام ہے۔ آپ کے نعتیہ کلام میں فکر کی گہرائی اور خلوص کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے:

زمانہ دور کرتا تھا غریبوں اور یتیموں کو

محبت سے گلے ان کو لگانے مصطفیٰ آئے

سید صبیح حیدر صبیح مرحوم، معروف نعت گو شاعر تھے جن کی خوبصورت نعتوں کا مجموعہ ”پہلی ضیاء“ شائع ہو چکا ہے۔ خلوص و محبت اور عشق و عقیدت کے اظہار، جذبات کی گہرائی اور احساسات کی شدت کے اعتبار سے آپ کا نعتیہ کلام کافی اہمیت و عظمت کا حامل ہے۔ یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

ہر لمحہ میں خدا سے دعا مانگتا رہوں

کٹ جائے میری زندگی عشق رسول میں

”نشاط نور“ عبدالستار خاطر کا دلکش نعتیہ مجموعہ ہے۔ آپ کے پورے نعتیہ کلام پر جذب و مستی،

وجد و شوق، حسرت و تمنا اور جستجو و آرزو کی فضا مسلط ہے۔ شعر دیکھیے:

خاطر کے سوا میرے کچھ پاس نہیں خاطر

لے جانے سے قاصر ہوں سوغات مدینے میں

ابھی تک یہاں جن شعراء کا ذکر ہوا ہے وہ سب نعتیہ شاعری میں اپنے خصوصی انہماک شغف اور لگاؤ کے باعث امتیازی مقام رکھتے ہیں اور جنہوں نے دوسرے شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ نعتیہ مجموعوں کی اشاعت کا خصوصی اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن اس وقت ایک بڑی تعداد ان معتبر شعراء کی بھی ہمارے سامنے ہے جنہوں نے باقاعدگی کے ساتھ نہ سہی مگر تسلسل کے ساتھ عمدہ نعتیہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے تفصیلی تذکرہ قلم انداز کرتے ہوئے صرف چند نام لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ان شعراء میں شاہ ابوالحسن ادیب، آزاد ساحری، ابراہیم ذائق، محمد علی فائق، سید احمد ایثار، محمد حسین فطرت بھٹکی، محمد حنیف شباب، مظہر محی الدین، عزیز بلگامی، ضیا کرناٹکی، الف احمد برق، انور مینائی، راہی قریشی، محبت کوثر، گوہر تریکیر وی، سید احمد راحل، سلیمان خطیب، سہیل نظام، ساغر کرناٹکی، شاد باگل کوٹی، وغیرہ۔

آخر میں کرناٹک کے چند غیر مسلم نعت گو شعراء کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جن کی مادری زبان کنڑا ہے مگر انہوں نے اردو زبان میں اپنی عقیدت و محبت کا اظہار جس لب و لہجہ میں کیا ہے وہ یقیناً ہر پہلو سے قابل داد ہے۔ ڈاکٹر کے۔ مدنا منظر شہر گلستاں بنگلور کے معروف شاعر، مقبول میڈیکل پریکٹیشنر اور سماجی کارکن تھے۔ اردو، ہندی، کنڑا اور انگریزی چاروں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ اردو میں آپ کے چار شعری مجموعہ منظر عرفان، حسن عرفان، منظر بہ منظر اور مجموعہ حمد و نعت تجلیات شائع ہو چکے ہیں۔ بطور نمونہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

اخلاق کا عالم کیا ہوگا اطوار کا عالم کیا ہوگا
حق جس پہ فدا ہے وہ حسن سرکار کا عالم کیا ہوگا

جب شان تکلم ہوتی ہے قربان خموشی پر جس کے
پھر ایسے رسول امی کی گفتار کا عالم کیا ہوگا

ہبلی کے ونکیا کاتل کلا دگی اردو نعت گوئی میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں ان کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ ان کی نعت گوئی ذہنی کاوش یا محض (Mehant) کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ان کے دل کی آواز اور ان کے طبع شاعرانہ کی فکری جولان گاہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاتل کلا دگی (Kaladagi) کی نعتوں میں ہر جگہ ایک ایسی سادگی ہے جو ایک طرح کی پرکاری لیے رہتی ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

تیری باتوں کا اثر آج بھی باقی ہے مگر جن سے غافل ہے مسلمان رسول عربی
ہم کو مل جائے گا ہر درد کا درماں جس میں تو نے بخشا ہے وہ قرآن رسول عربی
فقیری میں لٹا دیتا ہوں جو کچھ پاس ہے میرے مری دنیا میں جو بھی ہے اثاثہ سب محمد کا
شری رام چند راء جو شاعری میں راج پریمی کے قلمی نام سے معروف ہیں۔ گلبرگہ کے ضلع کے
رہنے والے، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے قدیم گریجویٹ ہیں اور گذشتہ نصف صدی سے پرورش لوح و
قلم میں مصروف ہیں۔ آپ کا ایک شعری مجموعہ ”نوائے سحر“ شائع ہو چکا ہے جس کے آغاز میں حمد و
نعت اور منقبت کی بڑی تعداد موجود ہے۔ آپ کا نعتیہ کلام عقیدت و محبت اور وفور جذبات کا آئینہ ہے۔
فرماتے ہیں:

یہ اشک ندامت کے، تو انمول رتن ہیں

لایا ہوں یہی ساتھ میں سامانِ مدینہ

گیان چند مرکیہ جدید لب و لہجہ کے خوش فکر شاعر ہیں جو شہر گلستاں بنگلور کی ادبی فضا کو چار
چاند لگا رہے ہیں آپ نے دیگر اصناف شاعری کے ساتھ ساتھ نعتیہ اشعار بھی بہت ڈوب کر کہے ہیں
جس میں برجستگی، روانی اور محبت و عقیدت کی فراوانی ہے۔ دیکھیے:

آپ کی یاد ہم کو ستاتی رہی اور خوشبو مدینہ کی آتی رہی

آہٹیں مون تھیں، لفظ خاموش تھے یہ ہوا پھر بھی کلمہ سناتی رہی

لوگ بچپن تھے لوگ حیران تھے، ہر طرف نفرتوں کے ہی سلسلن تھے

کی عطا آپ نے علم کی روشنی، جودل و جان میں جھللاتی رہی

اب میں اس موضوع کے ایک دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں اور وہ ہے اردو نعت میں خواتین
کی خدمات اور حصہ داری۔ اس تعلق سے ادھر کئی تحقیقات و تصنیفات برصغیر ہندوپاک میں سامنے
آچکی ہیں۔ اس وقت خود ریاست کرناٹک کی نعت گو شاعرات کی ایک فہرست ہمارے سامنے ہے۔
جن میں چند کا ذکر ضروری ہے۔

ڈاکٹر صغریٰ عالم مرحومہ گلبرگہ کی معروف نعت گو شاعرہ تھیں۔ حمد و نعت پر مشتمل آپ کے دو
مجموعے ”محراب دعا“ اور ”باب جبریل“ شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی نعتوں میں بڑی سادگی و سلاست
کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف، تسلیم و اطاعت اور خلوص و عقیدت کا بیان ملتا ہے
ملاحظہ فرمائیں:

خدا جو بخش دے، مجھ کو کروں شمس و قمر صدقے
نہیں میری مگر یہ کائنات بحر و بر صدقے
امت کو اپنے نور سے آراستہ کیا
اک نور مستقل ہے جہاں جا کے دیکھیے
محترمہ سیدہ اختر مرحومہ شادی کے بعد حیدر آباد سے منتقل ہو کر بنگلور میں مقیم تھیں۔ شاعری کی
تقریباً تمام اصناف میں مشق سخن کرتی تھیں مگر نعت گوئی سے خصوصی شغف تھا ایک نعت کے چند اشعار
ملاحظہ فرمائیے:

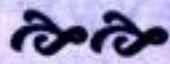
چھیڑ کے ساز لالہ دھوم مچا گیا کوئی
روح جہاں تھی محو خواب آ کے جگا گیا کوئی
دشمن جاں پہ بھی رہیں عدل و کرم کی بارشیں
عدل و کرم کو کس قدر عام بنا گیا کوئی
محترمہ زیر ابول مرحومہ کی نعتوں کا مجموعہ ”مہکتے پھول“ شائع ہو چکا ہے۔ آپ کی نعتیں عشق و
محبت کے جذبہ صادق کے ساتھ نسوانی احساسات کی بھی ترجمانی کرتی ہیں۔ انداز دیکھیے:

یاد آئے جب مجھے زہرا حرم کے واقعات
میں تڑپ کر رہ گئی آنسو بہا کر رہ گئی
ہمیں بھی حشر میں کوثر نصیب ہو یا رب
ہمارا ساقی وہ خیر الانام ہو جائے
محترمہ حسنی سرور معروف فلشن نگار اور شاعرہ ہیں، آپ کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے
ہیں۔ آپ کی شاعری کا بنیادی استعارہ روشنی ہے۔ نعت کے اشعار دیکھیے۔ نعت کے نور سے آپ کی
شاعری کیسی روشن ہے:

انگلیاں ہو گئیں پر نور صحیفہ روشن
نعت گوئی سے ہوا ہے مرا خامہ روشن
میں کہ ایک ذرہ ناچیز ہوں حسنی لیکن
عشق احمد نے کیا میرا نصیبہ روشن
محترمہ رضیہ یاسمین راز و انمباڑی تامل ناڈو کی رہنے والی ہیں مگر شادی کے بعد گزشتہ کئی
دہائیوں سے بنگلور میں مقیم ہیں۔ شاعری کی دوسری اصناف کے ساتھ نعت گوئی میں بھی طبع آزمائی کی
ہے۔ انہیں رسول اکرم سے گہری اور سچی عقیدت و محبت تھی۔ جس کا اظہار ان کی نعتیہ شاعری میں
خوب خوب ہوا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مٹوں گی میں ناموس محبوب حق میں
یہی ہے مری زندگانی کا حاصل
تشنہ لبی کا میری ہے راز یہ تقاضا
پی لوں گی جب وہ دیں گے کوثر کا جام کہنا
محترمہ شہوار بیگم کولار کی مشہور شاعرہ ہیں۔ بچوں کے شعری ادب میں بھی آپ کی ناقابل
فرا موش خدمات ہیں آپ نے نعتیہ شاعری بھی خصوصی لگاؤ اور شغف کے ساتھ کی ہے۔ یہ اشعار
دیکھیے:

و اللہ مدینے کا کیا خوب نظارہ ہے اس خاک کا ہر ذرہ رخشندہ ستارہ ہے
 بیگم نے بھی آقا کی مدحت کے تصور میں گلہائے عقیدت سے دل اپنا سنوارا ہے
 ان شاعرات کے علاوہ فریدہ رحمت اللہ، نجمیہ خانم زرگس، زہرا قاطرہ، مہ جبین نجم، شائستہ
 یوسف، ریحانہ بیگم، نیلو فرنا یاب، شبانہ ثنین، صباح نکبت اور فرزانه فرح وغیرہ کرناتک کی ایسی شاعرات
 ہیں جو دیگر اصناف سخن کے ساتھ ساتھ خوبصورت نعتیہ شاعری بھی کر رہی ہیں۔ آخر میں یہ بھی عرض کر
 دوں کہ یہاں میں نے اس گلشن سے چند کلیاں ہی منتخب کی ہیں ان کے علاوہ بھی نئی نسل کے درجنوں
 شعراء ہیں جن کے ہاں مستقبل کی نعتیہ شاعری کے امکانات بہت روشن اور واضح ہیں۔



ڈاکٹر محمد سہیل شفیق۔ کراچی

انجمن ترقی اردو میں ذخیرہ نعت و منقبت

ABSTRACT:

Anjuman-e-Tarqqi-e-Urdu has been historically discussed in this article since it was founded in 1903 in India, till the death of Baba-e-Urdu in 1961 and resuming Secretary ship of the same by Late Jamil Uddin Aali. Story of publication of Books of different topics has also been narrated. Aali went further ahead with his achievement of laying foundation of Urdu University. Urdu Lughat Board, Karachi and Urdu Science Board, Lahore were also founded under shadow of Anjuman. Anjuman holds a big library having large number of books on variant topics in Urdu, Persian, Arabic, English, German and French. Research papers and hand written scripts have also been preserved therein. Books pertaining to the genre of Naat and Manqabat in the shape of Poetry or Prose have also been delineated herein in the end of the article for the purpose of extending ease to researchers.

انجمن ترقی اردو کا قیام جنوری ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک شعبے کے طور پر علی گڑھ میں عمل میں آیا۔ پہلے صدر پروفیسر آرنلڈ، اور سیکریٹری مولانا شبلی نعمانی منتخب ہوئے۔ مولانا شبلی کی کوششوں سے بہت سے اہل قلم انجمن کے رکن بنے اور مدد پر آمادہ ہو گئے۔ یہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ اسی پر لکھنؤ کے ایک اخبار ”ہندستانی“ میں شکایت چھپی کہ انجمن ترقی اردو، ہندوؤں کو شریک نہیں کرتی۔ مولانا شبلی نے جواب میں لکھا کہ اعتراض خلاف واقعہ ہے۔ ”انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام ایک ہندو مترجم (منشی نرائن پرشاد ورما) کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی۔ یعنی کتاب ”پیغمبران ہند“۔

علمی مقاصد کے اعتبار سے انجمن ترقی اردو کو سرسید کی ”سائنٹفک سوسائٹی“ کی صدائے باز گشت سمجھا جاتا تھا۔ مغربی سائنس اور فلسفے کے تراجم پر بار بار زور دیا جاتا تھا۔ شبلی کی ادارت کے دور میں دو ترجمے شائع ہوئے: ”فلسفہ تعلیم“ اور ”رہ نمایان ہند“۔ انگریزی اور عربی و فارسی سے ترجمہ کرنے کے لیے آٹھ دس کتابیں اور انتخاب کی تھیں۔ ان میں سے ایک (تاریخ تمدن از بکل) چند سال بعد چھپی۔ ۲

شبلی نعمانی کے بعد ان کی جگہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی (رئیس حبیب گنج) کا انتخاب دسمبر ۱۹۰۵ء میں ہوا۔ اواخر ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۰ء تک شروانی صاحب انجمن کے سیکریٹری رہے۔ میر ولایت حسین جوعلی گڑھ میں مدرسے سے بڑھ کر اقامت خانوں کی منتظمی کے باعث مشہور تھے۔ ان سے شروانی صاحب کو بہت مدد ملی۔ میر صاحب نے انجمن کی تہی دستی دیکھتے ہوئے، کتابوں کی اشاعت اپنے ذمہ میں لے لی۔ چنانچہ پانچ سال میں انجمن کی پانچ کتابیں ان کی معاونت سے چھپ کر شائع ہوئیں جن میں ایک، پولین کی سوانح پانچ جلدوں میں چھاپی گئی۔ ۳

شروانی صاحب سیکریٹری کے عہدے سے دست بردار ہونے کے بعد ان کی جگہ مولوی عزیز مرزا صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ تعلیمی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ رنگون میں وہ شعبہ ترقی اردو کے سیکریٹری منتخب ہوئے۔ کالی داس کے ٹانک ’وکری اروسی‘ کا اردو ترجمہ ان کی یادگار ہے۔ انھوں نے اصطلاحات علمیہ کے بنیادی کام پر خاص توجہ کی۔ ۴

۱۹۱۱ء میں عزیز مرزا کے انتقال ۵ کے بعد علی گڑھ کی تعلیمی کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی میں صاحب زادہ آفتاب احمد نے اس کا سیکریٹری مولوی عبدالحق کو نامزد کیا۔ ۶ مولوی صاحب کا سیکریٹری منتخب ہونا اور انجمن کا دفتر اورنگ آباد منتقل ہونا انجمن کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا۔ اورنگ آباد منتقلی کے وقت ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا۔ اس میں ایک رجسٹر، چند پرانے اور غیر مرتب مسودات، ایک قلم دوات... اس کی کل کائنات تھی۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۰۳ء سے ۱۹۱۲ء کے اخیر تک سات نئی کتابیں شائع کی تھیں: فلسفہ تعلیم، القمر، القول الاظہر، رہ نمایان ہند، پولین اعظم، امرائے ہندو، تاریخ تمدن (جلد اول)۔

۱۹۱۲ء میں سیکریٹری کی ذمہ داری کی انجام دہی کے لیے مولوی عبدالحق کے انتخاب نے خود مولوی صاحب کے لیے ایک بالکل نیا اور وسیع میدان کھول دیا تھا اور وہ ایسے تازہ شوق اور ولولے کے ساتھ اس اقلیم جدید میں داخل ہوئے جو سرکاری عہدہ داری یا تصنیف و تالیف کے عام مشغلوں

میں پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ انجمن، مولانا کے لیے زندگی کی نئی دھن اور سب سے بڑا مقصد حیات بن گئی۔ ۵۔

انجمن کی نئی تنظیم کے سلسلے میں نواب عماد الملک (سید حسین) بلگرامی صدر منتخب ہوئے۔ بلگرامی صاحب ہندوستان کی اسلامی تہذیب و شرافت کا ایک نمونہ تھے۔ ان کی مساعی کا ایک عنوان انجمن ترقی اردو کی سرپرستی تھی۔ وہ خود اردو نیز انگریزی کے انشا پرداز ادیب تھے۔ بلگرامی صاحب کی تحریک سے اعلیٰ حضرت نظام نے انجمن کی سرپرستی اور بارہ سو روپے سالانہ کی امداد منظور کی۔ دو سال بعد یہ رقم پانچ ہزار سالانہ کردی گئی جس نے انجمن کو مضبوط کر دیا۔ ۹۔ سرمائے کی فراہمی کے ساتھ، تقریر و تحریر سے لوگوں کو مقاصد انجمن کی طرف متوجہ کرنے کا کام جاری تھا۔ اخبار و رسائل میں اس کی رودادیں اور اطلاعات چھپوانے کے علاوہ مولوی عبدالحق اردو کو علمی اور تعلیمی زبان کی حیثیت سے تسلیم کروانے کے لیے برابر وکالت کرتے رہتے تھے۔ ان کی تحریک سے اکثر ارباب صحافت انجمن کی حمایت میں مضامین لکھتے اور ترقی اردو کا ہر طرف چہ چا ہوتا رہتا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہونے لگی تھیں۔ سب سے پہلی شاخ صوبہ اورنگ آباد کے ضلع پر بھتی میں بنی۔ پھر جالندہ، بھوپال، کان پور، لکھنؤ میں شاخیں قائم ہوئیں۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد چالیس کے قریب تھی۔ نئی کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا کام آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ چل رہا تھا۔ تاریخ، سوانح، تذکرہ، فلسفہ وغیرہ موضوعات پر چند ترجمے اور تصنیفات چھاپی گئیں۔ ان میں حفظانِ صحت اور نباتات پر عام فہم رسالے اور میر تقی میر کا قدیم تذکرہ ”نکات الشعرا“ لائق ذکر ہیں۔ کتابوں کا ظاہری یا معنوی معیار یورپ کی اعلیٰ مطبوعات کی سطح تک نہیں آیا تھا مگر قدم ضرور بڑھ رہے تھے اور اردو کو ایک جدید علمی زبان بنانے کی آرزو قوی تر ہوتی جا رہی تھی۔ مغربی علوم کے ترجموں میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کی اصطلاحات ہوتی ہیں جن کے مرادف مشرقی زبانوں میں نہیں ملتے۔ جس کے لیے مولوی صاحب نے اصطلاحات علمیہ کی لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۰۔

۱۹۲۰ء سے ہمیں انجمن کے حوصلوں میں بلندی اور علمی منصوبوں میں نمایاں وسعت نظر آتی ہے۔ وہ دوسرے مفید تراجم و تصانیف کے علاوہ، زبان کے ایسے بنیادی کاموں کو اٹھاتی ہے جیسے اصطلاحات علوم جدیدہ، اصطلاحات پیشہ وراں، انگریزی سے اردو کی، اور خود اردو کی بڑی لغت۔ ۱۹۲۱ء انجمن کے لیے بہت ہی مبارک سال تھا کہ جنوری کے پہلے ہفتے میں خود مولوی صاحب کی ادارت میں رسالہ ”اردو“ بڑی آن بان کے ساتھ جاری ہوا۔ ۱۱۔

۱۹۲۳ء میں مولانا کی اقامت گاہ کے قریب انجمن کے دفتر، عملے اور مطبع کے واسطے ایک علیحدہ مکان لیا گیا۔ یہ مدت سے شکستہ بے کار پڑا تھا، اس کی درستی کرائی گئی، ”اردو باغ“ کے نام سے افتتاح کی رسم ادا کی گئی۔ یہاں انجمن کا ٹائپ کا چھاپہ خانہ لگایا گیا۔ اب تک اس کی مطبوعات مختلف مطابع میں پتھر پر چھپتی تھیں۔ ۱۲

۱۹۲۶ء میں انجمن کے صدر نواب عماد الملک بلگرامی کا انتقال ہو گیا۔ مجلس نظام نے مرحوم کی جگہ سید راس مسعود صاحب (م: ۱۹۳۷ء) کو صدر انجمن منتخب کیا جو ان دنوں حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے۔ موصوف کے دورِ صدارت میں انجمن کی رفتار ترقی جاری رہی۔ آمدنی بڑھتے بڑھتے پچاس ہزار روپے سالانہ سے بڑھ گئی۔ ۱۳

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ کی مجلس مشاورت کے فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکز دہلی کو قرار دیا گیا۔ مولوی عبدالحق صاحب نے حیدرآباد کی ملازمت کو اردو کی خدمت پر قربان کیا۔ اورنگ آباد کی سکونت ترک کر دی۔ بیش قرار مشاہرے سے زیادہ یہ ہجرت ان پر شاق تھی۔ دہلی کو انجمن کی منتقلی ۱۹۳۸ء میں عمل میں آئی۔ یہاں سے انجمن کے ایک اور دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دور میں انجمن ترقی اردو ایک مستقل ادارہ بنی اور ترقی اردو کے مقاصد استقلال و تسلسل کے ساتھ انجام دیے۔ پچیس برس کی سعی و محنت سے سو کے قریب نئی کتابیں اردو میں شائع کیں۔ دوسہ ماہی رسالے ”اردو“ اور ”سائنس“ جاری کیے۔ ۱۴ جابجا شاخیں، اردو کتب خانے اور کتب کھولے۔ ۱۹۳۷ء میں ان کی تعداد سو سے متجاوز ہو گئی تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جس وقت انجمن علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوئی تو کل کائنات ایک ٹوٹا ہوا صندوق تھا اور اب جب یہاں سے دہلی روانہ ہوئی تو مطبوعات کے ذخائر مال گاڑی کے کئی ڈبوں میں لادے گئے۔ خود مولوی صاحب کا بیش بہا ذاتی کتب خانہ اور لغت اردو کا دفتر جو حیدرآباد سے براہ راست دہلی گیا۔ بجائے خود ایک الگ اثاثہ تھا۔ ۱۵

۱۹۳۷ء میں سر راس مسعود کے انتقال کے بعد سر اکبر حیدری کی تحریک سے سر تیج بہادر سپرو ۱۶ صدر منتخب کیے گئے۔ یہ انتخاب انجمن کی اسی کوشش و خواہش کا ایک ثبوت تھا کہ اردو ملک بھر کی مشترک زبان اور فرقہ واری تنازعات سے محفوظ رہے۔ ۱۷

انجمن کی ورود دہلی کی رسم دھوم دھام سے اردو کانفرنس کے انعقاد سے منائی گئی۔ یہ انجمن ترقی اردو کی طرف سے پہلا عام اور ”کل ہند“ اجتماع تھا۔ اس کے عام اجلاس، علمی نمائش اور مشاعرے کی

تاریخیں ۲۹-۳۰ دسمبر رکھی گئی تھیں۔ کانفرنس کا صدر نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیم ریاست حیدرآباد کو چنا گیا تھا۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کے آخر میں مولوی عبدالحق نے اپنی تقریر میں انجمن کی اب تک کی کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا:

”اب تک انجمن نے ۱۳۰ کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے کئی درجے کر رکھے ہیں۔ عام پڑھے لکھے لوگوں کے پڑھنے کی کتابیں، درسی کتب، علوم و فنون خاص کر سائنس کی کتابیں، مختلف لغت کی کتابیں، شائستہ زبانوں کی اعلیٰ تصانیف کا ترجمہ، قابل قدر پرانی اور نایاب کتابوں کی اشاعت، اردو شعرا کے نادر قلمی تذکرے... ان کتابوں کے شائع ہونے سے، نیز انجمن کے رسالہ اردو کے مضامین سے اردو زبان و ادب کے متعلق خاصا انقلاب ہو گیا۔ تحقیق و تنقید کا نیا باب کھل گیا اور جس زبان کی ابتدا ولی سے کی جاتی تھی، اس کی عمر میں دو سو برس کا اضافہ ہو گیا۔“ ۱۸

۱۹۳۹ء میں انجمن نے ایک پندرہ روزہ اخبار ”ہماری زبان“ کے نام سے جاری کیا۔ یہ اخبار آج بھی انجمن ترقی اردو (ہند) سے باقاعدہ شائع ہوتا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں مولوی عبدالحق نے اپنا عمر بھر کا اندوختہ انجمن کی نذر کر دیا۔ یہ سینتالیس ہزار روپے سے کچھ زیادہ رقم تھی اور اس اعتبار سے کہ ایک متوسط الحال فرد کی تیس برس کی سخت محنت کی کمائی تھی، لاکھوں کی قیمت اور ایثار و فیاضی کی نادر مثال کا مرتبہ رکھتی ہے۔ ۲۰

دسمبر ۱۹۳۹ء میں دہلی میں اردو کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تو گاندھی جی نے اردو کو مسلمانوں اور ہندی کو ہندوؤں کی زبان دے دیا۔ ۱۹۴۴ء میں ہندو مہاسبھا کے صدر سارکر نے بڑے پیمانے پر Anti Urdu Week (اردو مخالف ہفتہ) منانے کا اعلان کیا جس نے مسلمانوں کے جذبات کو بری طرح مجروح کیا۔ ۲۱ آزادی ملتے ہی یوپی کی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے صوبے کے دفتروں، عدالتوں اور مدارس سے اردو کو یک قلم خارج کیا۔ حالانکہ یوپی وہ صوبہ ہے جہاں اردو نے وہ ترقی اور عروج حاصل کیا جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لیے قابل رشک ہے۔ ۲۲

آزادی ہند کے بعد حالات کے جبر کے تحت انجمن کو پاکستان میں پناہ لینا پڑی۔ انجمن کی شاخیں پورے ملک میں تھیں۔ تقسیم کے بعد پاکستان کی شاخوں کا الحاق ہندوستان کے مرکز سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ پاکستان کے لیے ایک نیا مرکز قائم کیا جائے۔ اس معاملے

میں بڑی بحث رہی کہ یہ مرکز لاہور میں ہو یا کراچی میں۔ آخر یہ طے پایا کہ کراچی ہی میں رکھا جائے جو مرکزی حکومت کا بھی دارالحکومت ہے اور اس سے امداد ملنے کی بھی توقع ہے۔ اور سندھ کی حکومت بھی ضرور کچھ نہ کچھ مدد دے گی۔ ۲۳ کراچی آنے اور ایک وسیع مکان مل جانے کے باوجود مولوی صاحب بھارت کا مرکز اور سابقہ وطنیت چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ سال بھر سے زیادہ وہ اسی رائے پر قائم رہے حتیٰ کہ بعض اوقات کراچی کے احباب مایوس و مکرر ہو جاتے تھے۔ لیکن بالآخر انھیں بھارت کو چھوڑنا پڑا۔ انجمن کا ایک سال تعطل اور تذبذب میں گزرا۔

۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو کے پاس تقریباً دو لاکھ روپیہ نقد اور مطبوعات، کاغذ وغیرہ کوئی تین لاکھ روپے کا مصدقہ اثاثہ تھا۔ فروخت کتب و رسائل سے اس کی آمدنی کم و بیش پینسٹھ ہزار اور حیدر آباد کی امداد ملا کر ایک لاکھ روپیہ سالانہ سے بڑھ جاتی تھی۔ نقد و جنس کا سارا اثاثہ بھارت کی حکومت نے غصب کر لیا۔ مولوی صاحب کا ذاتی کتب خانہ تک اسی کی حرص و ہوس کا لقمہ بنا۔ بلوائی غنڈوں نے ان کے کپڑے، برتن، گھر کا سامان، اور ایک موٹر لوٹ لی۔ کتب خانہ کچھ زیادہ ہی بیش بہا ہوگا۔ اسے وہاں کے معزز حکام اور متوسلین نے دبا لیا۔ صرف وہ کتابیں اور مسودات جنہیں مرتب کرنے کے لیے دریا گنج سے عربک کالج اور پھر محلہ چوڑی والاں کے مکان میں لے آئے تھے، بچ گئیں اور بہ مشکل تمام جناب مولوی صاحب کے بچے کچھے سامان کے ساتھ کراچی پہنچ گئیں ورنہ عمر بھر کے علمی شوق کا سرمایہ آزادی ہند کے سر صدقے ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں حیدر آبادی امداد کی یکسالہ رقم کسی نہ کسی طرح کراچی میں مل گئی تھی۔ آخر میں بیس ہزار روپیہ حکومت پاکستان کی جانب سے موصول ہوا۔ ۲۴

مئی ۱۹۴۸ء سے انجمن کا اخبار ”قومی زبان“ کراچی سے جاری کر دیا گیا اور انجمن ترقی اردو پاکستان کا نیا دستور بھی مرتب ہو گیا تھا، تاہم صحیح معنوں میں مستقل طور پر انجمن ۱۹۴۹ء سے پاکستانی ادارہ بنی۔ ۲۵ اسی سال انجمن کے سابقہ صدر، سر تیج بہادر سپرو کا طویل علالت کے بعد الہ آباد میں انتقال ہوا جسے قدرت کی طرف سے بھی ایک اعلان خیال کرنا چاہیے کہ انجمن کا ہندوستان کا دور ختم، اور نئی مملکت پاکستان میں عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کا جدید آئین مرتب کر کے ۱۹۴۸ء ہی میں اس کی از سر نو رجسٹری کرائی گئی تھی۔ پاکستان میں اس کے پہلے صدر سر شیخ عبدالقادر منتخب ہوئے لیکن سال بھر کے بعد ان کا انتقال ہو گیا اور ۱۹۵۰ء میں مجلس نظمانے مولوی عبدالحق کو صدر انجمن منتخب کیا۔ ۲۶ انجمن نے پاکستان آ کر پہلی بڑی اور نئی مملکت کی نمائندہ اردو کانفرنس اپریل ۱۹۵۱ء میں کراچی میں منعقد کی۔ گورنر جنرل

پاکستان خواجہ ناظم الدین نے اس کا افتتاح کیا۔ کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں پہلی اور سب سے اہم قرارداد یہ تھی کہ کل پاکستان اردو کانفرنس حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ رسمی طور پر اردو کے قومی اور سرکاری زبان ہونے کا اعلان کرے۔ یہ قرارداد ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے پیش کی۔ انجمن کا ایک بڑا کارنامہ ”ترقی اردو کالج“ کی تاسیس بھی ہے۔ جولائی ۱۹۵۰ء میں سندھ یونیورسٹی نے ”اردو کالج“ کا الحاق منظور کر لیا۔ ۲۷ ۱۹۴۹ء سے محمد احمد سبزواری کی زیر ادارت ”معاشیات“ جاری ہوا، سہ ماہی ”اردو“، ۱۹۵۰ء، جبکہ ”سائنس“ اور ”تاریخ و سیاسیات“ ۱۹۵۱ء سے جاری ہوئے۔ ۲۸

انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام مخطوطات کی اشاعت و ترتیب و تدوین میں مشفق خواجہ (۱۹/ دسمبر ۱۹۳۵ء - ۲۰۰۵ء) نے بھی معاون انجمن کی حیثیت سے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۵۷ء میں خواجہ صاحب کا مولوی عبدالحق سے تعارف ہوا جو ان کی وفات تک جاری رہا۔ خواجہ صاحب، مولوی عبدالحق کی زندگی ہی میں انجمن کے اہم ترین رسائل ”اردو“ اور ”قومی زبان“ کے مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مولوی عبدالحق نے انھیں ”قاموس الکتب“ کا مدیر بھی مقرر کر دیا۔ ۱۹۷۳ء میں خواجہ صاحب نے اگرچہ انجمن کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن قلبی طور پر انجمن سے تعلق برقرار رہا اور علمی تعاون کرتے رہے۔ ۲۹

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال (۱۶/ اگست ۱۹۶۱ء) کے بعد انجمن ترقی اردو کا انتظام و انصرام اختر حسین صاحب (یکم مارچ ۱۹۰۲ء - ۱۵/ جولائی ۱۹۸۳ء) نے سنبھالا وہ تقریباً ۲۱ سال انجمن کے صدر رہے۔ ۳۰ ساتھ ہی ۱۹۶۲ء سے جمیل الدین عالی صاحب نے انجمن کے معتمد اعزازی کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ معتمد کی حیثیت سے عالی صاحب نے اپنی نگرانی میں تین سو سے زیادہ علمی و ادبی کتابیں شائع کیں اور ان کتابوں کے پیش لفظ تحریر کیے جو ”حرفِ چند“ کے عنوان سے چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔ ۱۳ نومبر ۲۰۰۲ء کو ڈاکٹر جمیل الدین عالی کی کوششوں سے جامعہ اردو کا قیام عمل میں آیا۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کے دوسرے صدر اختر حسین کی وفات کے بعد قدرت اللہ شہاب (۱۹۱۸ء - ۱۹۸۶ء) کو صدر انجمن مقرر کیا گیا۔ جس وقت انھیں صدر مقرر کیا گیا وہ اسلام آباد میں تعینات تھے اس لیے وہ کراچی کے سفر میں رہتے اور یہاں کے انتظامات کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ شہاب صاحب کے بعد نور الحسن جعفری (۱۹۲۱ء - ۱۹۹۶ء) انجمن کے تیسرے صدر بنے۔ جعفری صاحب کے دور میں تحقیقی مقالوں کی کتابی شکل میں اشاعت کا آغاز ہوا نیز دیگر اشاعتی سرگرمیوں

پر خصوصی توجہ دی گئی۔ ۳۱۔ جعفری صاحب کے انتقال کے بعد ۱۴/ دسمبر ۱۹۹۶ء کو انجمن کے متولی، وفاقی معتمد مالیات اور ماہر اقتصادیات آفتاب احمد خان کو اتفاق رائے سے انجمن کے نئے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔ ۳۲۔ ۲۰۱۳ء میں فاطمہ حسن صاحبہ نے انجمن کے معتمد اعزازی کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں جس کے بعد انجمن کی فعالیت میں اضافہ ہوا۔ انجمن کے موجودہ صدر جمیل الدین عالی کے صاحبزادے ذوالقرنین جمیل ہیں۔

انجمن کے زیر سایہ دو بڑے علمی ادارے بھی قائم ہوئے جو انجمن کے شروع کیے ہوئے کام سر انجام دے رہے ہیں: 'اردو لغت بورڈ کراچی'، اور 'اردو سائنس بورڈ لاہور'۔ انجمن ہی کی تحریک اور پیہم کوششوں کے نتیجے میں قومی سطح پر نفاذ اردو کے لیے وفاقی اور مختلف صوبائی حکومتوں اور نجی سطح پر جو کام ہو رہا تھا اس سے استفادہ کرتے ہوئے وفاقی حکومت نے "مقتدرہ قومی زبان" اسلام آباد تشکیل کی۔ مقتدرہ ایک خالص سرکاری ادارہ ہے جس کا مقصد قومی زبان کو سرکاری دفاتر میں نافذ کرانا ہے۔ انجمن کی بیشتر مطبوعات اردو زبان و ادب میں لازمی حوالوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انجمن کے کارنامے ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں۔ انجمن کے اس کردار پر خود انجمن کی تاریخ کے علاوہ دوسری کئی تصنیفات و تحقیقی مقالہ جات موجود ہیں۔ یہاں ہم نے انجمن کی تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ انجمن کی ایک بڑی دولت اس کا کتب خانہ ہے۔ انجمن کا کتب خانہ نادر و نایاب، مخطوطات، مکتوبات اور کتابوں سے مالا مال اور علم و ادب کے متعدد گوشوں پر محیط اپنی نوعیت کا واحد کتب خانہ ہے جس میں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، جرمن اور فرانسیسی کتابوں کا ذخیرہ ہے جس سے استفادے کے لیے دنیا بھر سے محققین آتے ہیں۔ اس کے اردو، فارسی اور عربی کے قلمی نسخوں کی توضیحی فہرستیں مرتب ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

پیش نظر مضمون میں افادہ عام کے لیے انجمن کے ذخیرہ نعت و منقبت کی فہرست ۳۳ پیش کی

جارہی ہے۔

فن نمبر	عنوان	مصنف/ مؤلف	ناشر/ مطبع	سنہ طبع	مقام اشاعت
7.22.2	باغ مدینہ	عاشق حسین ہاتف	آئیں دکن پریس	1318ھ	حیدر آباد
7.22.3	م۔ن	فدا خالدي دہلوی	اشتیق پرنٹنگ پریس	1983ء	کراچی

7.22.4	بوستان نعت	مرزا محبوب علی بیک صف	تاج پریس	1339ھ	حیدرآباد
7.22.5	بہار بے خزاں	-	سعادت پریس	-	بلند شہر
7.22.6	بہار خلد	کفایت علی کلنی مراد آبادی	-	1258ھ	-
7.22.7	بہارستان (جلد دوم)	محمد محی الدین قلعہی خاطر	تجری پریس	1296ھ	بنگلور
7.22.8	بہارستان منقبت (غوث اعظم)	عبدالقادر فقیر قادری	اعجاز محمدی پریس	1311ھ	حیدرآباد
7.22.9	بیاض مدینہ	عاشق حسین خان ہاتف	شوکت اسلام پریس	-	ایضاً
7.22.10	گلشن جانفزا	شرر لکھنوی	لیکٹرن پریس	-	لاہور
7.22.11	ذکر جمیل	ماہر القادری	انتظامی پریس	-	حیدرآباد
7.22.12	نبی کریم ﷺ کا ذکر مبارک بلوچستان میں	ڈاکٹر انعام الحق کوثر	امپرنٹ پریس	1983ء	لاہور
7.22.13	قاب قوسین	اقبال عظیم	پنجاب بک ہاؤس	1984ء	کراچی
7.22.14	ثنائے خواجہ کوئین	درد اسعدی	الائیڈ پرنٹنگ پریس	1983ء	حیدرآباد
7.22.16	شامل نامہ حضرت رسول	-	رحمانیہ پریس	1337ھ	مدراں
7.22.17	جنان السیر	عبدالحی احقر	محمدی پریس	1301ھ	بنگلور
7.22.18	گلبن نعت	غلام سرور قادری	ریچپوٹ پرنٹنگ پریس	1909ء	لاہور
7.22.21	ارمغان اہل دل (نعت و منقبت)	شبیر مخفی علمی قادری	ایجوکیشنل پریس	-	کراچی
7.22.23	چارگل	محمد صادق الحسینی	نظام المطابع	-	مدراں
7.22.24	چشمہ فیض بنوں	مرتبہ: احمد علی قمر	عطاء الرحمن پریس	1306ھ	مدراں
7.22.25	چمنستان رائج	عبدالرزاق رائج	-	1303ھ	-
7.22.27	حبیب العافیں	حبیب علی شاہ حبیب	مختار الملک پریس	1281ھ	حیدرآباد
7.22.28	رسالہ	شمس الدین	-	1275ھ	-

7.22.29	منحمننا	عبدالعزیز خالد	میرائی پرنٹرز	1966ء	کراچی
7.22.32	حمد و نعت	-	مرتضائی پریس	-	آگرہ
7.22.34	چناباں فردوس (نسیم)	مولوی کفایت علی	محمدی پریس	1270ھ	کانپور
7.22.35	جنت و وفات نامہ	کافی	-	-	-
7.22.36				1283ھ	
7.22.37				1282ھ	
7.22.39	در بار رسول ﷺ	خواجہ دل محمد	رہنیت پرنٹنگ پریس	1916ء	لاہور
7.22.41	جنان السیر	مولانا مولوی شاہ عبدالحی	مطبع فردوسی	1318ھ	مدراں
7.22.46	ریاض البچان	محمد باقر آگاہ	رحمانی پریس	1285ھ	حیدرآباد
7.22.47					
7.22.48					
7.22.54	زمزمہ نعت	محمد محسن خاں متین	اعظم پریس	-	حیدرآباد
7.22.55	ساغر دکن (حصہ اول)	شیخ احمد شیدا	اعظم پریس	1335ھ	حیدرآباد
7.22.56	سبیل نجات	عنایت	محمدی پریس	1265ھ	کانپور
7.22.58	سراپائے سید المرسلین	محمد عبدالرزاق رانج	نوکلشور پریس	1899ء	کانپور
7.22.59	سرپائے رسول ﷺ	محمد محسن کاکوروی	مصطفائی پریس	1270ھ	-
7.22.67	شکوہ نعت	شیخ رمضان علی	مجتبائی پریس	1312ھ	لکھنؤ
7.22.73	شمع محفل	-	مرغوب ایجنسی	1917ء	لاہور
7.22.74	صراط المستقیم	محمد وزیر	-	1216ھ	بمبئی
7.22.77	فراید درنواید	محمد باقر آگاہ	رضوی پریس	1306ھ	بنگلور
7.22.85	کشت خلد	حبیب یوسف شریف	افضل پریس	1354ھ	حیدرآباد
7.22.87	کلام کوثر	کوثر	-	-	-
7.22.88	کلمہ لا الہ الا اللہ	-	نظامی پریس	1291ھ	کانپور

لکھنؤ	1328ھ	احمدی پریس	زینب بی بی محبوب	گلبن نعت	7.22.89
لاہور	1909ء	دبک راجپوت پریس			7.22.90
امرتسر	1281ء	ادریض ہند پریس			7.22.219
حیدرآباد	-	شوکت الاسلام پریس	-	گلدستہ احمدی (حصہ دوم)	7.22.91
حیدرآباد	-	اعظم پریس	علاء الدین احمد حاجی	گلدستہ حاجی	7.22.91
مدراں	1310ھ	مطبع شرفیہ	علی احمد خاں رفعت	گلدستہ نعت	7.22.93
حیدرآباد	1313ھ	نظام دکن پریس	کیف	گلدستہ کیف (حصہ اول)	7.22.94
حیدرآباد	1328ھ	ہیک پرنٹنگ پریس	-	گلدستہ محبوب دکن	7.22.95
				(حصہ اول)	7.22.96
کانپور	1885ء	نولکشور پریس	محمد محسن کاکوروی	گلدستہ محسن	7.22.97
					7.22.98
					7.22.99
					7.22.100
					7.22.101
حیدرآباد	1319ھ	ابوالعلائی پریس	مرتبہ: سید حسین	گلدستہ محمدی (حصہ اول)	7.22.102
حیدرآباد	-	گلزار ابراہیم پریس	محمود علی حرف سید عبداللہ بقا	گلزار مومنین (مایہ بقا)	7.22.103
حیدرآباد	-	عزیز دکن پریس	عبدالرحمن مدراسی شاطر	گلستان نعت شاطر (حصہ دوم)	7.22.104
بمبئی	1291ھ	حیدری پریس	قاضی ابراہیم	مجموعہ مدحیات و مناقبات	7.22.108
ایضاً	-	حیدری پریس	ایضاً	مجموعہ نجم الضیاء	7.22.109
حیدرآباد	-	شمس الطابع	-	مجموعہ نورنامہ، شمائل	7.22.110
		عزیز دکن پریس		نامہ، کلمہ نامہ، عہد نامہ	7.22.111
-	-	-	-	مجموعہ وفات نامہ رسول، قصہ ولی حلیمہ قصہ	7.22.114
حیدرآباد	۱۳۲۹ھ	برہانہ پریس	سرور	مجموعہ وفات و قصہ حضرت	7.22.115
				لوہی قرنی، مناجات بیوہ	

7.22.116	ترتیل	سید اختر حسین اختر	آفسٹ پریس	-	کراچی
7.22.120	مدینہ الانوار	نامی	نظام الطابع	1310ھ	مدراں
7.22.124	مجزرات امیر المومنین	-	محمدی پریس	1265ھ	-
7.22.148	تحفہ الاخوال (مناقب علی)	طیبی	حیدری پریس	1270ھ	بمبئی
7.22.149	مولود احمدیہ	شاہ رؤف احمد رافت	-	-	ایضاً
7.22.150	مولد شریف بہادیہ دیگر	شہید، کافی	نظامی پریس	1286ھ	کانپور
7.22.151	مولود مرغوب القلوب	شاہد	-	-	-
7.22.152	نعت اور اسلام	وحیدہ نسیم	اوکھائی پریس	1985ء	کراچی
7.22.153	میخانہ تصور	آباد پبلی کھتی	اسٹینڈرڈ پرنٹنگ پریس	1982ء	ایضاً
7.22.159	ناصر العاشقین	ناصر	مخز الطابع	1322ھ	لکھنؤ
7.22.164	نذر امجد (مسدس)	سید احمد حسین امجد	عماد پریس	-	حیدر آباد
7.22.165					
7.22.166	نذر صوفیہ (حصہ اول)	مرتبہ: اسد علی	حامی الاسلام پریس	1913ء	دہلی
7.22.167	نظم برحق	محمد فیاض الدین فیاض	محبوب شاہی پریس	1300ھ	حیدر آباد
7.22.168	نعت سروری	غلام سرور	نولکشور پریس	1911ء	کانپور
7.22.169	نور ظہور	احمد حسین مائل	-	1304ھ	-
7.22.171	نور نامہ و شمائل	-	نظامی پریس ۱	1293ھ	کانپور
7.22.173	نامہ، کلمہ نامہ	-	نولکشور پریس	1873ء	-
7.22.172	نور نامہ	فاضل	انوار محمدی پریس	1308ھ	-
7.22.174	رائے بہادر کی نعت	حسن نظامی	محبوب طبع پریس	1926ء	دہلی
7.22.175	فروض جلید عرف نعت سعید	محمد سعید	کریمی پریس	1310ھ	بمبئی
7.22.185	نوید سخن	مشرف علی مشرف	نولکشور پریس	1213ھ	لکھنؤ

7.22.186	وفات نامہ	-	محمدی پریس ۱	1261ھ	لکھنؤ
7.22.187			مصطفائی پریس ۱		
7.22.188			میر حسن رضوی پریس	1281ھ	
7.22.208	ہدیہ فاضل	محمد حسام الدین فاضل	اعظم پریس	1352ھ	حیدرآباد
7.22.208	یادگار دستگیری	غلام دستگیر	محبوب شاہی پریس	1317ھ	ایضاً
7.22.214					
7.22.215					
7.22.216	وفات نامہ: دائی	شہیدی، علمی شہید	چشمہ فیض ۱	1304ھ	لکھنؤ
7.22.217	حلیہ، قصیدہ		وکتوریہ پریس	1301ھ	لاہور
7.22.218	برگ گل (دیوان مان)	سید محمد مرتضیٰ نیرومنی بین	حدیقتہ العلوم پریس	-	میرٹھ
7.22.220	مدح رسول کریم ﷺ	میر بہادر علی سید	-	-	-
7.22.221	حدیث قدسی	مرتبہ: قاضی محمد عمر	مصطفائی پریس	1297ھ	کانپور
7.22.222	دعائے بحر (مناجات شائق)	سید اعظم علی شائق	شمس الاسلام پریس	1327ھ	-
7.22.223	چمنستان بے نظیر	محمد ابراہیم شاطر	رحمانی پریس	1327ھ	مدراں
7.22.224	مخمس نعتیہ	محمد محسن کاکھوی، امیر مینائی	شام اودھ پریس	1275ھ	-
7.22.225	مدح خیر المرسلین	ایضاً	ایضاً	1292ھ	-
7.22.229	عقائد آگاہ	محمد باقر آگاہ	-	-	-
7.22.231	سلام ارمغانِ حرم	محمد قاسم مسلم افریقی	نظامی پریس	1955ء	لکھنؤ
7.22.232	سیرت نبوی	شیخ محمد عثمان پونوی	برقی کوثر پریس	1952ء	بنگلور
7.22.244				1951ء	
7.22.245	بادہ عرفان	محمد عبداللہ فائق کرتپوری	باب الاسلام پریس	1955ء	کراچی
7.22.246	ہدیہ شاد	مرزا رحمت اللہ بیگ	صاحب دکن پریس	1323ھ	حیدرآباد
7.22.247	گلزار معرفت	امداد اللہ امداد	فیروز پرنٹنگ	1323ھ	ایضاً
7.22.292			پریس		

7.22.251	ہجرت نامہ	مسکین	-	-	-
7.22.253	مجموعہ بست و یک رسائل	امیر حافظ	-	1301ھ	-
7.22.256	بہار خلد	کفایت علی کافی مراد آبادی	گلشن احمدی پریس	1288ھ	لکھنؤ
7.22.261	دائی حلیمہ و حضرت	شہید	نظامی پریس	1292ھ	کانپور
7.22.262	بلال		فردوسی پریس	1278ھ	
7.22.270			خیر خواہ دکن پریس	1292ھ	بنگلور
7.22.271					
7.22.265	مجموعہ وفات نامہ، حلیمہ شریف، حضرت بلال	کافی شہید، شہیدی	بھگواں داس پریس	-	-
7.22.276	بہار خلد (ترجمہ شامل النبی)	کفایت علی کافی مراد آبادی	-	1261ھ	-
7.22.282	ریاض الجنان	آب آگاہ	رحمانی پریس	1285ھ	-
7.22.283	سرپائے رسول اکرم ﷺ	محمد محسن کاکوروی	شام اودھ پریس	-	-
7.22.285	خزینہ نعت	بشیر رداری	ایجوکیشنل پریس	1968ء	کراچی
7.22.286	گلشن فردوسی	حکیم معصوم علی شیخ فتحپوری	محمدی پریس	-	کانپور
7.22.287	الاسماء المنظومہ	حمید صدیقی حمید لکھنوی	نامی پریس	-	لکھنؤ
7.22.289	منتخب نعتیہ اشعار	شفیق بریلوی	مرکز علوم اسلامیہ	1973ء	کراچی
7.22.290	الاسماء الحسن منظوم	عبدالرحمن دانش	فیروز سنز	-	لاہور
7.22.291	نعتیہ مشاعرہ	عیش ٹونگی	ایجوکیشنل پریس	1972ء	کراچی
7.22.293	درود ان پر	لیکنا امر وہوی	سندھ آفٹ پرنٹرز	1975ء	ایضاً
7.22.294	ذکر حبیب المعروف متاع کارواں	شفیق اکبر آبادی	ایجوکیشنل پریس	1975ء	ایضاً
7.22.295	بادۂ عرفاں	نعیم تقوی	افریضائی پریس	1979ء	-
7.22.299	متاع عزیز	عزیز لدھیانوی	فیاض پریس	1980ء	لاہور
7.22.300	فریاد طاہرہ	محمد فاضل	اقبال بک ڈپو	1981ء	کراچی

7.22.301	جواہر النعت	عزیز صابری	بزم یوسفی	1981ء	ایضاً
7.22.398					
7.22.302	کلام منقبت	مرتبہ: سید فضل المتین	نیشنل فن پینٹنگ پریس	-	حیدر آباد
7.22.303	لالہ صحرا	رئیس امر وہوی	ادارہ دین جدید	-	کراچی
7.22.305	ورفتنا لک ذکرک	راجا رشید محمود	پاپولر پبلشرز	1977ء	لاہور
7.22.306	حدیث شوق	راجا رشید محمود	ورک مین پرنٹرز	1982ء	ایضاً
7.22.307	عطر کلام غنی مجموعہ سلام	مظہر حسین انس	اشاعشری	-	دہلی
7.22.308	ایک جن کی نعت	حسن نظامی دہلوی	دلی پرنٹنگ ورکس	1927ء	ایضاً
7.22.309	ذکر خیر الانام	حنیف اسعدی	طابع برادرز پرنٹرز	1984ء	کراچی
7.22.310	حمد	درد اسعدی	الائیڈ پریس	1985ء	حیدر آباد
7.22.312	مینار حرم	بشیر فاروق	احمد برادرز	1986ء	کراچی
7.22.313	آہ فرات	اختر نسیم	کاروان مشرق	1986ء	ایضاً
7.22.315	گلگشت بہشت	میر سید علی شائق	سید پبلی کیشنز	1964ء	ایضاً
7.22.316	گلزار مغفرت	ایضاً	ایضاً	-	ایضاً
7.22.317	وحدت و مدحت	جمیل عظیم آبادی	راشد پبلی کیشنز	1987ء	ایضاً
7.22.318	بہشت عقیدت	واثق ذائق بنگلوری	انجمن غلامان مصطفیٰ دربار سلیمیہ	1986ء	ایضاً
7.22.319	شمس الضحیٰ	قمر وارثی	بزم ارباب سخن	1987ء	ایضاً
7.22.320			پاکستان	1985ء	
7.22.321	ارمغان حافظ	حافظ عبدالغفار حافظ	بزم رضا	1985ء	ایضاً
7.22.328			ایضاً	1985ء	
7.22.457			فضلی سنز	2002ء	
7.22.393			بزم رضا	1998ء	

7.22.322	خورشید رسالت	خورشید ایچ پوری	تکلیل پرنٹنگ پریس	1987ء	ایضاً
7.22.327	صلی اللہ علیہ وسلم				
7.22.323	نعت ہی نعت	نیر اسعدی	احمد برادرز	1987ء	ایضاً
7.22.324	اظہار عقیدت	صدیق فتح پوری	حسان پبلی کیشنز	1987ء	ایضاً
7.22.325	حرا کا چاند	محمد صابر کوثر	مکتبہ کوثر	1987ء	ایضاً
7.22.326	مدارج النعت	سید حسین علی لویب داپچی	مشہور آفست پریس	1986ء	ایضاً
7.22.329	لوائے حمد	بقا نظامی	ادارۃ القرآن پریس	1988ء	ایضاً
7.22.330	حمد و نعت	ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم	مرشد پرنٹنگ پریس	1984ء	لاہور
7.22.331	مدارج رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں	صبا متھراوی	مکتبہ اردو خیابان صبا	1972ء	کراچی
7.22.332	حضور صلی اللہ علیہ وسلم	اختر لکھنوی	احمد برادرز	1988ء	ایضاً
7.22.333	ارمغان عقیدت	مرزا مقبول بیگ بدخشان اڈاکٹر عبدالغنی	رہبر پرنٹرز	-	لاہور
7.22.334	جمال	عبدالرحمن جامی	-	-	-
7.22.335	رحمت لقب	اقبال صفی پوری	مرکز نعت صفی پوری پریس	1988ء	کراچی
7.22.336	شہر علم	سہیل غازی پوری	یقین آرٹ پریس	1987ء	ایضاً
7.22.337	اردو نعت کا شرعی محاسبہ	شمس بدایونی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	1988ء	ایضاً
7.22.338	منارۃ نور (مجموعہ نعت)	حیرت اللہ آبادی	افریسیا پرنٹنگ پریس	1989ء	-
7.22.339	۱۵ ویں صدی ہجری کا پہلا انتخاب صلی علی محمد	-	جامع مسجد باب الاسلام آرام باغ	-	کراچی
7.22.340	نعتیہ کلام	ندیم نیازی عیسیٰ	ندیم اکیڈمی	-	-
7.22.341					
7.22.342	ضوفشاں	محبت خان بگلش	ادارۃ علم و ادب	1990ء	-
7.22.343	(نعت و منقبت)				

-	1989ء	ٹی ایس پرنٹرز	سید حسین شاہ فدا	ارمغان عقیدت	7.22.344
-	1990ء	اقبال اکادمی پاکستان	ڈاکٹر ریاض مجید	اردو میں نعت گوئی	7.22.345
-	1991ء	بزم نعت پبلی کیشنز	عرفان رضوی	صحاب کرم	7.22.346
-	1990ء	براٹ فیوچر پبلی کیشنز	عرفان رضوی	راہ حجاز	7.22.347
-	1989ء	ایضاً	ایضاً	ابر رحمت	7.22.348
-	1991ء	بزم نعت پبلی کیشنز	عرفان رضوی	صحاب فیضان	7.22.349
-	1989ء	مکتبہ خورشیدیہ	عرفان رضوی	گہر ہائے فروزاں	7.22.350
-	1989ء	براٹ فیوچر پبلی کیشنز	ایضاً	مشعل عشق	7.22.351
-	1986ء	منظور عظمت پبلشرز	انجم رحمانی	صاحب الجمال	7.22.352
-	1991ء	نیو ایک لٹریچر انجمن نیو ایک	عبدالرحمن عبد	عرفان عبد	7.22.353
-	1992ء	کتب خانہ عزیز	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	نقش قلم	7.22.354
-	1992ء	ایجوکیشنل پریس	بقا نظامی عظیم آبادی	شہپر جبریل علیہ السلام	7.22.355
-	1991ء	ایضاً	لیث قریشی	تاباں تاباں	7.22.356
-	1991ء	نوصف پرنٹرز	مولانا جامی بدایونی	زاد آخرت	7.22.357
-	1990ء	رضا بک لنکرز	کاوش زیدی	بکھور حق تعالیٰ	7.22.358
-	1991ء	رضا بک لنکرز	ماجد علی کاوش زیدی	مدحت خیر الانام	7.22.359
-	1991ء	نیو یارک اردو انجمن	عبدالرحمن عبد	عرفان عبد	7.22.360
-	1988ء	مکتبہ خورشیدیہ	عرفان رضوی	گہر ہائے فروزاں	7.22.361
-	1980ء	مکتبہ قصری	قصری کانپوری	نورازل	7.22.362
-	1981ء	مکتبہ ندیم	صبہ اختر	اقراء	7.22.363
-	1387ھ	جمعیت الفلاح	نثار احمد	نوائے سروش	7.22.364
-	-	ایسٹ پبلشرز	جمیل نقوی	ارمغان جمیل	7.22.365

7.22.366	قاب قوسین	اقبال عظیم	فیر فین پبلشرز	1992ء	-
7.22.367	رہبر و رہبر ال	صوفی مسعود احمد بہر محبوبی	مرکزی انجمن بہر اسلام	1993ء	-
7.22.368	ذکر ارفع	مبارک مونگیری	مہلک مونگیری اکیڈمی	1994ء	-
7.22.369	نعت رنگ	صبح رحمانی	اقلیم نعت	1996ء	-
7.22.370	چراغ حرا	محمد زبیر فاروقی / شوکت اللہ آبادی	ایجوکیشنل پریس	۱۹۹۵ء	کراچی
7.22.371	طوبی	پروفیسر ہارون رشید	عالم پرنٹرز	1995ء	-
7.22.372	ورد نفس	خواجه ریاض الدین عطش	آئی۔ این۔ ایس۔ پبلی کیشن پریس	1992ء	-
7.22.373	ذکر صل علی	عزیز الدین خاکی	ایجوکیشنل پریس	1994ء	-
7.22.383		القادری			
7.22.374	حرف عقیدت	محمد کمال اظہر	جہانگیر بک ڈپو	-	-
7.22.375	اللہ و رسول ﷺ	ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم	معظم پرنٹرز	1993ء	-
7.22.376	کاروان حرم	ایضاً	ایضاً	1991ء	-
7.22.377	زمزمہ سلام	ایضاً	ایضاً	1993ء	-
7.22.378	حمد و نعت	ایضاً	ایضاً	1991ء	-
7.22.379	جادۂ نعت	صبح رحمانی	ممتاز پبلشرز	1993ء	-
7.22.380	نعت رنگ	ایضاً	اقلیم نعت	1996ء	-
7.22.381	تاباں تاباں	لیث قریشی	ایجوکیشنل پریس	1991ء	-
7.22.382	آپ ﷺ	حنیف اسعدی	اقلیم نعت	1996ء	-
7.22.384	سرکار عالم ﷺ	لطیف اثر	لیزر لائن پرنٹرز	1995ء	-
7.22.385	شافع محشر ﷺ	ایضاً	ایضاً	1995ء	-
7.22.386	طور سے حراتک	افرمہ پوری	پرنٹو گراف پریس	1996ء	-

7.22.387	کعبہ و طیبہ	ابوالاتیاز ع۔ س۔ مسلم	معظم پرنٹرز	1993ء	-
7.22.388	زمرہ درود	ایضاً	مقبول اکیڈمی	1993ء	-
7.22.390	عکس کعبہ و روضۃ البیت	ایضاً	-	-	-
7.22.391	دستہ گل	فاضل عثمانی	-	1992ء	-
7.22.392	اساس	سرشار صدیقی	-	1990ء	-
7.22.394	علامہ اقبال اور میر ججاز	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	اظہر سنز پرنٹرز	1994ء	-
7.22.395	حرا کا چاند	محمد صابر کوثر	مکتبہ کوثر	1987ء	-
7.22.396	ایقان	جمیل نظر	جمیل نظر فاؤنڈیشن	1994ء	-
7.22.397	انوار	کرم حیدری	منز اپرنٹنگ کارپوریشن	1993ء	-
7.22.399	نور سخن	نور احمد میرٹھی	سہیل پریس	-	-
7.22.400	خزینہ حمد	مرتبہ: طاہر سلطانی	لولہ چمنستان حمد فٹ	1996ء	-
7.22.401	حرف عقیدت	محمد کمال اظہر	جہانگیر بک ڈپو	1994ء	-
7.22.402	رحمت بے کراں	جاوید اقبال ستار	نہال پریس	1995ء	-
7.22.403	نبی الحرمین ﷺ	صوفی رہبر چشتی	مرکزی انجمن رہبر	1995ء	-
7.22.438			اسلام پاکستان		
7.22.404	تابندگی	خمار انصاری	برم تخلیق و ب پاکستان	1995ء	-
7.22.405	نعت میری زندگی	طاہر سلطانی	لولہ چمنستان حمد فٹ	1997ء	-
7.22.406	اجمل و اکمل	محسن احسان	القلم	1996ء	-
7.22.407	نعت رنگ - ۴	صبح رحمانی	اقلیم نعت	1997ء	-
7.22.408	نعت رنگ - ۵	ایضاً	ایضاً	1998ء	-
7.22.409	سز کن فکاں	مانی فاروقی	المہدی مطبوعات	1997ء	-
7.22.410	خدائے ذوالجلال	محبت خان بگلش	ادارہ علم و ادب	1996ء	-

-	1998ء	حلقہ نیاز و نگار	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	اردو کی نعتیہ شاعری	7.22.411
-	1998ء	جہان حمد پبلی کیشنز	طاہر سلطانی	جہان حمد	7.22.412
-	1998ء	المہدی مطبوعات	مانی فاروقی	بے کنارہ کوثر	7.22.413
-	1999ء	دہستان آرزو پاکستان	روشن علی عشرت	شاخ طوبیٰ	7.22.414
-	1998ء	فضلی سنز	عزیز احسن	اردو نعت اور جدید اسالیب	7.22.415
-	1999ء	نصرت حسان نعت کنسل پاکستان	اقبال عظیم	زبور حرم کلیات نعت	7.22.416
کراچی	۱۹۹۹ء	ایوان علم و ادب	محمد ذکی دہلوی	صحیفہ انوار	7.22.417
-	1997ء	مرکزی انجمن سہروردیہ	انوار عزمی	آدم تارحت عالم علیہ السلام	7.22.418
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	نام بنام حمد و ثناء	7.22.419
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	نام بہ نام مدحت	7.22.420
-	2000ء	جہان حمد پبلی کیشنز	طاہر سلطانی	جہان حمد	7.22.421
-	2000ء	ایضاً	ایضاً	حمد میری زندگی	7.22.422
-	2000ء	مکتب آل مشفق	زاہد فتح پوری	نقش اولین (حمدیہ)	7.22.423
-	-	-	-	اور نعتیہ کلام)	7.22.443
-	-	نیو فائن پرنٹرز	عبد الغفور قمر	انتخاب نعت - ۱	7.22.424
-	-	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۲	7.22.425
-	-	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۳	7.22.426
-	1997ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۴	7.22.427
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۵	7.22.428
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۶	7.22.429
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۷	7.22.430

-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۸	7.22.431
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۹	7.22.432
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۱۰	7.22.433
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۱۱	7.22.434
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۱۲	7.22.435
-	1998ء	ایضاً	ایضاً	انتخاب نعت - ۱۳	7.22.436
-	1993ء	مرکزی انجمن رہبر اسلام پاکستان	خولجہ صوفی مسعود احمد	رہبر رہبر	7.22.437
-	2001ء	الفیصل اردو بازار	جعفر بلوچ	بیعت	7.22.439
-	-	-	خان اختر ندیم	اعتراف	7.22.440
-	1999ء	محمود مہموں لٹری سوسائٹی	جگن ناتھ آزاد	نسیم حجاز	7.22.441
-	2002ء	پاک صابری پرنٹرز	ناصر کاسکھوی	دیار گل	7.22.442
-	2003ء	شرکت پرنٹنگ پریس	سید نفیس الحسنی	برگ گل	7.22.444
-	2003ء	ایس ایس پرنٹرز	مولانا محمد عبدالحامد قادری	جذبات حامد (حصہ اول)	7.22.445 7.22.467
-	2004ء	مکتبہ رضویہ	رضا اللہ حیدر	مدینہ یاد آتا ہے	7.22.446
-	2004ء	مہر نیر اکیڈمی پرنٹیشن	کوکب نورانی اوکاڑوی	نعت اور آداب نعت	7.22.447
-	2006ء	گیلانی پبلی کیشنز	جاوید اختر	مرے دل پر کعبے کا در کھلا	7.22.448
-	2004ء	کلر کوڈ پرنٹرز	نصیر احمد	سفر پل صراط کا	7.22.449
-	2004ء	ذکی پرنٹرز	رشیدہ عیاں	فانوس مفت رنگ	7.22.450
-	2005ء	-	شاعر علی شاعر	ارمغان نعت	7.22.451
-	2004ء	مرکز انجمن رہبر اسلام پاکستان	صوفی رہبر چشتی	رہبر نعت	7.22.452

7.22.453	تمکیل وفا	بیگم سلطانہ ذاکر ادا	اوکھائی پریس	1999ء	-
7.22.454	طار مدینہ: کلام طیب	محمد طیب راقم علیگ	مدرسہ حفظ القرآن مکتبہ راقم علیگ	-	-
7.22.455	بادشوا آرزو	محمد فیروز شاہ	فیض الاسلام پرٹنگ پریس	2004ء	-
7.22.456	پیامبر مغفرت مخزن	ابوالہجر ساجد علی	بزم احباب	۲۰۰۰ء	حیدر آباد
7.22.489	نعت مقبول	ساجد اسدی	اسدی		
7.22.457	ارمغان حافظ (نعتیہ دیوان)	حافظ عبدالغفار حافظ	فضلی سنز	2002ء	-
7.22.458	مرے دل پہ کعبے کا در کھلا	جاوید منظر	گیلانی پبلی کیشنز	2006ء	-
7.22.459	تفہیم منظوم	مخدوم علی ممتاز	دنیاۓ ادب	1999ء	-
7.22.460	یار رسول عربی ﷺ	اختر اندوری فدائی	بلال پبلی کیشنز	2009ء	-
7.22.461	مینارہ نور	حیرت اللہ آبادی	افریشا پرٹنگ پریس	1989ء	-
7.22.462	ورفعنا لک ذکرک	سید ذوالفقار حسین نقوی	احمد برادرز	2006ء	-
7.22.463	سائبان	حیات نظامی	جہان پبلی کیشنز	2010ء	-
7.22.464	فانوس مفت رنگ	رشیدہ عیاں	ذکی پرنٹرز	2004ء	-
7.22.465	سائبان	حیات نظامی	جہان پبلی کیشنز	2010ء	-
7.22.466	میثاق: شعر عقیدت	سرشار صدیقی	مسعود پرنٹرز	2002ء	-
7.22.468	رب العالمین	سجاد نخن	پاک صابری پرنٹرز	2001ء	کراچی
7.22.469	جلاہ رحمت	صبح رحمانی	نعت ریسرچ سینٹر	2009ء	-
7.22.470	سائبان	حیات نظامی	جہان حمد پبلی کیشنز	2010ء	-
7.22.471	الہام کی بارش	شاعر علی شاعر	ایضاً	2009ء	-
7.22.472	غنچہ	ولایت علی میر	میر ایجو کیشنل	2011ء	-
7.22.473			سوسائٹی		

-	2005ء	ارباب ادب	پروین اختر	سرطیبہ	7.22.474
-	2012ء	جہان حمد پبلی کیشنز	طاہر سلطانی	نعت روشنی	7.22.475
-	2010ء	بزم رنگ ادب	ڈاکٹر محمد شرف حسین انجم	نعتیہ ترویجیاں	7.22.476
-	2012ء	جہان حمد پبلی کیشنز	خمار فاروقی	مکارم اخلاق	7.22.477
-	2012ء	ایضاً	طاہر سلطانی	نعت روشنی	7.22.478
-	2011ء	برہم تخلیق لب پاکستان	ایاز صدیقی	ثنائے محمد ﷺ	7.22.479
-	2013ء	جہان حمد پبلی کیشنز	طاہر سلطانی	نعت رحمت	7.22.480
-	2008ء	رائٹرز بک فاؤنڈیشن	رفیع بدایونی	رفیع نعتیں	7.22.481
-	2012ء	نعت ریسرچ سینٹر	عزیز احسن	امید طیبہ ری	7.22.482
-	2012ء	شرکت پرنٹنگ پریس	ریاض ندیم نیازی	بحر تجلیات	7.22.483
-	2013ء	جہان حمد پبلی کیشنز	فرقان اویسی	نعت عظمیٰ	7.22.484
-				(مجموعہ نعت)	7.22.485
-					7.22.486
-	-	کریمین پبلی کیشنز	پیر الحاج گلشن الہی	سیر گلشن (مجموعہ حمد و نعت و مناقب)	7.22.487
-	2015ء	نیاز مندان کراچی	رونق حیات	پاؤں چھونے کی طلب	7.22.488
-	2000ء	اقلیم نعت	صبح رحمانی	نعت رنگ - ۱۰	7.22.490
-	2001ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۱	7.22.491
-	2002ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۳	7.22.492
-	2002ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۴	7.22.493
-	2003ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۵	7.22.494
-	2004ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۶	7.22.495

-	2004ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۷	7.22.496
-	2005ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۸	7.22.497
-	2006ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۱۹	7.22.498
-	2008ء	نعت ریسرچ سینٹر	ایضاً	نعت رنگ - ۲۰	7.22.499
-	2011ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۲۲	7.22.500
-	2014ء	ایضاً	ایضاً	نعت رنگ - ۲۳	7.22.501
					7.22.502
-	2001ء	الرحمن پرنٹر و پبلشرز	مرتبہ: آفتاب کریمی	سفیر نعت - ۲	7.22.503
-	2003ء	ایضاً	ایضاً	سفیر نعت - ۳	7.22.504
-	2003ء	ایضاً	ایضاً	سفیر نعت - ۴	7.22.505
-	2005ء	ایضاً	ایضاً	سفیر نعت - ۵	7.22.506
لاہور	2006ء	المدينہ دارالاشاعت پاکستان	پروفیسر محمد فیروز شاہ	رنگ نعت (نعت) رنگ شمارہ ۱۹ تا ۱ سے نعتوں کا انتخاب	7.22.507
-	1998ء	اقلیم نعت	صبح رحمانی	نعت رنگ - ۵	7.22.508
-	2009ء	نعت ریسرچ سینٹر	عزیز احسن	شہر توفیق	7.22.509
-	2005ء	اقلیم نعت	آفتاب کریمی	قوسین	7.22.510
-	2010ء	نعت ریسرچ سینٹر	حافظ عبدالغفار حافظ	بہشت تضامین	7.22.511

صحیح صحیح

حوالہ جات

- ۱۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخ ترقی اردو، ۱۹۸۷ء، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۱۳
- ۲۔ ایضاً، ص ۱۵
- ۳۔ ایضاً، ص ۱۸
- ۴۔ ایضاً، ص ۱۹
- ۵۔ عائشہ کنیل برنی، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو پاکستان کی علمی و تحریری خدمات ایک تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ۲۰۱۳ء،

کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ص ۴۵

۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخ ترقی اردو، ص ۲۰

۷۔ (۱۸۹۴ء میں مدرسہ العلوم علی گڑھ سے بی اے کی تکمیل بعد مولوی عبدالحق چند سال مدرسہ آصفیہ حیدرآباد کے صدر مدرس رہے۔ ریاست کی معتمدی امور عامہ میں مدتوں مترجم کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۰۱ء میں ناظم (ڈائریکٹر) تعلیم کے مددگار، اور چند ماہ کے بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کیے گئے۔

۷۔ ایضاً، ص ۲۸-۲۹ ۸۔ ایضاً، ص ۳۴ ۹۔ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۴۱ ۱۱۔ ایضاً، ص ۲۶ ۱۲۔ ایضاً، ص ۴۸

۱۳۔ ایضاً، ص ۵۶ ۱۴۔ ایضاً، ص ۶۷

۱۵۔ سر تاج بہادر کاشمیری خاندان آخری مغل سلاطین کے دور میں دار الخلافہ دہلی میں مقیم رہا اور ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد الہ آباد چلا آیا تھا۔ قانون دانی کی اعلیٰ قابلیت کی بہ دولت تاج بہادر وائس رائے کی مجلس انتظامی کے رکن مقرر ہوئے۔ برطانیہ کی ”پریوی کونسل“ میں شامل کیے گئے۔ ہندوستان کے ممتاز ترین افراد میں شمار ہوتے تھے۔

۱۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخ ترقی اردو، ص ۸۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۸۔ عائشہ کفیل برنی، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو پاکستان کی علمی و تحریری خدمات ایک تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۹۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۱۳ ۲۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۲۱۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، پنجاہ سالہ تاریخ ترقی اردو، ص ۱۸۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۸۲ ۲۳۔ ایضاً، ص ۲۲۹

۲۴۔ ایضاً، ص ۲۳۳ ۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳۲

۲۶۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۲۷۔ عائشہ کفیل برنی، ڈاکٹر، انجمن ترقی اردو پاکستان کی علمی و تحریری خدمات ایک تاریخی، تحقیقی و تنقیدی جائزہ، ص ۱۲۸

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۰۵ ۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۸

۳۰۔ ایضاً، ص ۲۳۱ ۳۱۔ ایضاً، ص ۲۴۰

۳۲۔ اس فہرست کے حصول میں تعاون کے لیے راقم، انچارج (کتاب خانہ انجمن ترقی اردو) اور سید صبیح رحمانی (نعت ریسرچ سینٹر) کا شکر گزار ہے۔

مالیگاؤں کا نعتیہ ادب اور اشفاق انجم

ABSTRACT:

Mali Gaoon is a prominent City in India where Urdu poetry flourished and various poets came out with their devotional poetry in praise of Holy Prophet Muhammad (S.A.W). Dr. Ashfaq Anjum 's distinctive position has been reflected in this article to show his poetic characteristics particularly in genre of Naat . Comparison has also been done with other poets of similar genre to distinctively highlight unique diction and content of poetry of Dr. Ashfaq Anjum.

نعت وہ واحد اور متبرک صنف سخن ہے جس میں صرف اور صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و توصیف بیان کی جاتی ہے۔ اس کی ابتدا خود حضور کی حیات مبارکہ میں ہوئی۔ حضرت حسان بن ثابتؓ اور حضرت کعب بن زبیرؓ جیسے شعراء نے آپ کی شان اقدس میں نعتیہ قصائد کہے اور حضرت کعب بن زبیرؓ کو حضور نے خوش ہو کر اپنی چادر عنایت فرمائی۔

اردو شاعری کے آغاز ہی سے دیگر اصناف کے ساتھ ہی نعت بھی کہی جانے لگی تھی۔ یہ ایسی متبرک اور پرکشش صنف سخن ہے کہ مسلم تو مسلم غیر مسلم شعراء نے بھی نعت گوئی کو اپنے لئے وجہ افتخار جانا ہے۔ مالیگاؤں، بھارت کی ریاست مہاراشٹر کا مشہور شہر ہے جہاں اردو بولنے، لکھنے، پڑھنے والوں کی اکثریت ہے۔ اسے آج ساری دنیا میں اردو کا مرکز اور مسجدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہاں بنکر برادری کی اکثریت ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد شمالی ہند سے، خصوصاً یوپی اور خاندیش کے مختلف علاقوں سے آنے والے مہاجرین نے مالیگاؤں کو اپنا وطن ثانی بنالیا۔ مالیگاؤں میں ابتداً مالی سماج کے لوگ رہتے تھے جو کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ شمالی ہند کے مہاجرین یہاں پارچہ بانی کی صنعت کے لئے سازگار ماحول دیکھ کر یہیں کے ہو رہے اور ہاتھ ماگ (ہتھ کرگھا) پر رنگین ساڑی

بننے کا کام شروع کیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ پورے مہاراشٹر میں اور اس سے لگے ہوئے علاقوں میں بارڈروالی رنگین ساڑی (نوگزی ساڑی) کا چلن تھا۔ جب ذرا فراغت نصیب ہوئی تو وہ شعر و ادب کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ شمالی ہند میں پریس کی آمد کے بعد شاعری اور افسانہ نگاری کو پر لگ گئے۔ اخبارات و رسائل کی اشاعت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ پھر چوں کہ یہاں آنے والے اپنے ساتھ اپنی تہذیب، زبان، بول چال کا لہجہ بھی ساتھ لائے تھے اس لئے ابتداء میں بقول ڈاکٹر اشفاق انجم:

”یہاں کی ابتدائی شاعری کا بہترین نمونہ وہ ہے جس میں خاندیشی اور فارسی

زبان میں کہے گئے مرثیے اور مراٹھی آمیز نعت اور غزلیں ہیں۔“

لیکن دھیرے دھیرے ان کی شاعری اور زبان سے خاندیشی اور فارسی کے اثرات ختم ہوتے گئے اور شعراء دبستانِ دہلی و لکھنؤ کی اتباع میں نکسالی اردو میں شعر کہنے لگے اور قنوج، میرٹھ، الہ آباد سے شائع ہونے والے رسائل اور گلدستوں میں شائع بھی ہونے لگے۔ ڈاکٹر اشفاق انجم اپنے تحقیقی مقالے ”شعراءِ مالیگاؤں“ میں لکھتے ہیں:

”اب تک جو سب سے قدیم گلدستہ دستیاب ہوا ہے وہ ”پیامِ عاشق“ قنوج

ہے جس کے ۱۸۹۲ء کے دو شمارے راقم کے پاس ہیں۔ ان میں مالیگاؤں

کے شعراء کا کلام بھی شائع ہوا ہے لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ آنے والے

مہاجرین میں شعراء اور ذی علم حضرات یقیناً شامل تھے جن کے ہاتھوں

یہاں اردو نے آنکھیں کھولیں اور ادب کی شمعیں روشن ہوئیں۔“

شعر و ادب کے بڑھتے ہوئے ذوق اور فراغت کے اثرات بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں

نمایاں ہوئے اور مالیگاؤں سے ”افتخارِ سخن“، ”معیارِ سخن“، اور ”بہار“ نامی ماہانہ گلدستے شائع ہونے

لگے۔ جن میں مقامی شعراء کے علاوہ برصغیر کے شعراء کی طرحی غزلیں اور نعتیں شائع ہوتی تھیں۔ ان

کے علاوہ میرٹھ، الہ آباد، دہلی، لکھنؤ سے نکلنے والے گلدستوں میں بھی مالیگاؤں کے شعراء کے کلام

شائع ہوتے تھے۔

دورِ اوّل:

ڈاکٹر الیاس صدیقی اپنے مقالے ”مالیگاؤں میں اردو نثر نگاری“ میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۵ء میں

مالیگاؤں کے ایک شاعر عبدالکریم عطا کا نعتیہ دیوان شائع ہوا۔ جو اردو لائبریری مالیگاؤں میں موجود ہے۔ اس میں شامل ایک نعت کے چند شعر:

دلا ہم کو محمد کی حمایت ہے تو کیا غم ہے
ہمیں حضرت کے کلمہ پاک کا ورد و وظیفہ ہے
رہیں گے مومن و خلد برس میں عیش و عشرت سے
عطا خاطر پریشاں ہونہ محشر کے عذابوں سے
اگرچہ کل کھن بھی جو قیامت ہے تو کیا غم ہے
اگرچہ قبر کی شدت نہایت ہے تو کیا غم ہے
اگر دنیاۓ فانی میں مصیبت ہے تو کیا غم ہے
تجھے نعت نبی لکھنے کی عادت ہے تو کیا غم ہے

اس نعت کے ساتھ ہی بیسویں صدی کے آغاز میں کی جانے والی نعتیہ شاعری کا موضوع بہت محدود رہا۔ ”شفاعت، دیدار کی حسرت، آپ کے در پر مرنے کی آرزو، مدینہ کا سفر“ جیسے خیالات و جذبات ابتدائی دور کی نعتیہ شاعری کا خاصہ رہے ہیں۔ یہ نعتیہ شاعری بھی کسی وقتی ضرورت (مشاعرے، میلاد کی مجلس، ایام محرم وغیرہ) یا نعتیہ طرحی مشاعروں کی مرہون منت رہی۔ اس لئے جذبے کی شدت اس وقت کے شعراء کے کلام میں کم ہے۔ ہاں شاعری اور فکری و فنی لحاظ سے اس دور کی نعتیہ شاعری کی اہمیت اپنی جگہ، مگر اندرونی کیفیات اور دلی جذبات و عشق رسول کی شدت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ درج ذیل اشعار دیکھئے:

راہ طیبہ میں مجھے پرواہ کیوں ہو خضر کی
جو مدینے کی زیارت کے لئے جاتے ہیں
جو ہو جائے یا اور مقدر ہمارا
مدینے پہنچ جائیں صابر اگر ہم
شوقِ دل جب خود ہی میرا رہ نما ہو جائے گا
پیشوائی کے لئے ان کی ملک آتے ہیں
تو مسکن ہو احمد کے در پر ہمارا
عجب اوج پر ہو مقدر ہمارا

۱۹۰۰ء سے قبل کی نعتیہ شاعری ”مدینے کی زیارت اور آپ کے در پر پہنچنے کی حسرت، شفاعت کی خواہش، عذاب سے نجات کی تمنا“ تک محدود رہی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینہ منورہ سے متعلق شنیدہ و محررہ باتیں ہی نظم کی گئیں۔ اس وقت غریبی اور مفلسی کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں چند ہی اصحاب استطاعت نے حج کی سعادت حاصل کی تھی۔

دوسرا دور:

بلاشبہ بیسویں صدی کے آغاز سے تقریباً ۴۰ سال تک (ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل تک) کو مالیگاؤں کی شاعری (نعتیہ و غزلیہ دونوں) دوسرے دور میں داخل ہو گئی تھی۔ اب مالیگاؤں

کے شعراء شمالی ہند سے شائع ہونے والے رسالوں کے مطالعے اور ان میں کلام کی اشاعت کے سبب شاعری کے بدلتے رجحانات، نئے تشبیہ و استعارات اور تعلیم کی روشنی میں نئے خیالات و فکری روش میں تبدیلی کے خوگر ہو گئے تھے۔ اس لئے اس دور کی نعتیہ شاعری حسرت مدینہ اور قیام مدینہ کی گفتگو سے آگے بڑھ کر دلی جذبات کی آئینہ دار بن گئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ دینی مدارس کے قیام، دینی تعلیمات کے فروغ نے شعراء کے خیالات کو وسعت دی اور وہ نعتیہ شاعری میں آپ کی سیرت و کردار کے واقعات بھی نظم کرنے لگے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ حسرت دیدار اور زادِ سفر کی مشکلات کا ذکر بھی نعت رسولؐ میں اپنی جگہ قائم رہا۔ یہ اشعار دیکھئے:

بخش دینے کو ہے اللہ کی رحمت اچھی بخشوانے کو ہے حضرت کی شفاعت اچھی
آپ دکھلا دیں اگر پرتو عارض اپنا تب میں جانوں گا میں اچھا مری قسمت اچھی

حافظ مراد

ہر شے میں تیرے نور کا جلوہ ہے یا نبی موسیٰ نہیں کہ طور سے ہو لو لگی ہوئی
تشنہ ہوں عشقِ چشمِ جنابِ رسول کا مرقد میں کیوں نہ آنکھ ہو میری کھلی ہوئی
بندگی کا ہے مزہ جب کہ ہو اُلفت تیری بے نمک کھانے میں آتی نہیں لذت اچھی
ساری مخلوق ہوئی آپ کے باعث پیدا سارے نبیوں سے ملی تم کو رسالت اچھی
مقصد ہمارے شعروں سے آتی ہے بوئے مشک مصرفِ صفِ زلف میں ہم صبح و شام ہیں

مولانا اسحاق مقصد

یہ نعتیہ اشعار واضح طور پر اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ دینی مدارس، دینی تعلیم اور اخبارات و رسائل اور کتابوں کے مطالعے نے شعراء کے خیال و فکر کو نئی جہتیں عطا کیں اور انھوں نے نعت میں آپ کے زلف و رخسار، شفاعت کے یقین کو نظم کرنے کے ساتھ ساتھ صنائع کا بھی بر محل استعمال کیا ہے۔ ”بے نمک کھانے میں آتی نہیں لذت اچھی“ اور ”مقصد ہمارے شعروں سے آتی ہے بوئے مشک“ اس لئے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے تیسری دہائی تک نعتیہ شاعری کا کینوس بھی وسیع ہو گیا تھا۔

تیسرا دور:

۱۹۳۶ء سے ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔ اس تحریک سے نوجوان نسل میں سرمایہ داروں

سے نفرت کے ساتھ خدا بیزاری کی لہر بھی چل پڑی تھی اور علامہ اقبال کو بھی کہنا پڑا تھا کہ:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

ایک طرف اردو نثر و نظم میں شدت پسندی، خدا بیزاری کے ساتھ غریبی مفلسی کا رونا، روٹی، کپڑا مکان کی ضرورت خاص موضوع بن رہے تھے تو دوسری طرف دین پسند شعراء و ادباء نے مذہبی اور اخلاقی قدروں کی حفاظت کی بھرپور کوشش کی اور حمد و نعت کے دامن کو ایک وسیع منظر نامے میں بدل دیا۔ اسی کے ساتھ اخلاقی اقدار اور سماجی، معاشرتی و تہذیبی ورثے کی حفاظت میں نظم اور مضامین لکھے جانے لگے۔ اس دور میں تعلیم کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا تھا۔ برصغیر کے عوام انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہو رہے تھے۔ سائنسی ترقی نے ملکوں شہروں کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ اس کا اثر مالیگاؤں کی نعتیہ شاعری پر بھی ظاہر ہوا۔ اس دور کے شعراء دینی اور عصری درس گاہوں سے جڑے ہوئے تھے اس لئے اب نعت کے مضامین میں بھی تنوع اور نیا پن آ گیا تھا۔ اس دور میں بھی نعت و حمد کم کم کہی جاتی تھی مگر دینی مدارس سے جڑے ہوئے علماء اور اہل علم حضرات نے نعتیہ شاعری اور اخلاقی، سماجی، تہذیبی اور ملکی و ملی مسائل کو اپنی غزل، نظم اور نعت و حمد کا موضوع بنایا۔

ایسے لوگوں میں محمد یوسف عزیز، مولانا جمال الدین لبیب، مولانا عبد المجید وحید، منشی سراج الدین سراج شامل ہیں۔ عقیل رحمانی، منشی سراج اور محمد نذیر تابش ایسے شعراء ہیں جنہوں نے نعت کے سوا کسی اور صنف کو ہاتھ نہیں لگایا۔ زائر حرم عقیل رحمانی (متوفی ۱۹۷۷ء) کے پانچ نعتیہ مجموعے شائع ہوئے۔ (۱) نوائے عجم ۱۹۶۲ء، (۲) شاہنامہ حرمین ۱۹۶۶ء، (۳) جلوۂ فاراں ۱۹۶۸ء، (۴) گلبانگ حجاز ۱۹۶۸ء، (۵) گلزار حرم ۱۹۷۲ء۔ محمد نذیر تابش (متوفی ۲۰۱۵ء) کا نعتیہ مجموعہ ”متاع تابش“ ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔

متاع تابش کی شاعری ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان کے حالات کے پس منظر میں کی جانے والی شاعری تھی۔ اس دورانیے میں مالیگاؤں میں کئی پریس جاری ہو چکے تھے مگر شعراء نے اپنے کلام کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لی۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر اشفاق انجم صاحب کا جنہوں نے ”شعرائے مالیگاؤں“ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر تمام شعراء کے غزلیہ و نعتیہ اشعار کو یکجا کر دیا۔ ذیل میں زائر حرم عقیل رحمانی اور تابش مالیگانوی کا کلام نمونہ پیش خدمت ہے:

لوٹ آیا مدینے سے یہ قسمت کا ستم ہے جاں کیوں نہ فدا ہو گئی اس بات کا غم ہے
انوار ہی انوار نظر آتے ہیں واللہ جن آنکھوں میں سرے کے عوض خاکِ حرم ہے

تم ہو عقیل زار کے آقا، اتنا کرم ہو جائے خدا

دور ہو اس کا ضعفِ بصارت صلی اللہ علیہ وسلم
عقیل رحمانی مرحوم



ان کی بتلائی ہوئی راہ سے ہٹ کر مت چل
اک ایسے رہ نما آئے اک ایسے شہ سوار آئے
رجیمی ہو تو ایسی ہو کریمی ہو تو ایسی ہو
شب اسری نمازوں کی کمی بیشی بہانہ تھی

ان کی ہر بات کو مضبوطی سے پکڑے رہنا
ہزلوں سل کی منزل جو پل بھر میں گزرا آئے
عزیزوں، دوستوں کیا دشمنوں پر جس کو پیدا آئے
خدا خود چاہتا تھا میرا پیارا بار بار آئے
محمد نذیر تابش

یہی وہ دور تھا جس میں ادیب مالیگانوی غزل کی پہچان بنے۔ مسلم نظم کے قافلہ سالار ہوئے۔
سہیل رباعیات کے بادشاہ ہوئے۔ اختر نظم، غزل، رباعی میں باکمال ہوئے۔ ان اساتذہ نے اپنے
شاگردوں کی تربیت کے لئے ادبی انجمنیں قائم کیں اور ماہانہ طرحی نشستیں منعقد کی جانے لگیں اور
مالیگاؤں برصغیر میں اردو کے محفوظ قلعے کے طور نمایاں ہونے لگا۔ ان اساتذہ نے نعتیں بھی کہیں مگر
طرحی مشاعروں کے لئے لیکن ان کی نعتوں میں نیا پن اور بدلتی قدروں، تبدیل ہوتی ہوئی زبان کے
اثرات بھی نمایاں تھے۔ مثلاً:

ایک پوشاک میں لاکھ پیوند ہیں
اس کے گھر میں نہیں ایک نانِ جویں

پھر بھی خوش حال ہیں پھر بھی خرسند ہیں
جس کی مٹھی میں دونوں جہاں بند ہیں

ادیب مالیگانوی

سبز گنبد کے مکیں تم پو سلام
جسم اطہر نور، روح پاک نور

سرورِ دنیا و دیں تم پر سلام
جلوہ شمع یقیں تم پر سلام

مسلم مالیگانوی

محمد مصطفیٰ کے آستانے کا گدا ہوں میں
اسے کہتے ہیں اُلفت جو اویسؓ باصفانے کی

چٹائی لے گئی سبقت مری تخت سلیمان پر
کئے قربان دندان اپنے سب حضرت کے دندان پر
منشی سراج

پئے تبلیغ دین حق امام الرسلین آمد
بجا باشد اگر غارِ حرا نازد بجاہ خود

گنہ گارانِ امت را شفیع المذنبین آمد
کہ آں جاوہی اول بر امام الرسلین آمد

مولانا جمال الدین لیب

ان تمام شعراء میں ادیب مالیگانوی مرحوم جو غزل کے امام تھے۔ جن کی شاعری میں گل و بلبل، جام و مینا، امیری غریبی، ناصح و محتسب جیسے استعاروں کے ساتھ نئی شاعری کی آہٹ بھی تھی۔
احساسِ عمل کی چنگاری جس دل میں فروزاں ہوتی ہے اس لب کا تبسم ہیرا ہے اس آنکھ کا آنسو موتی ہے
ہم نے تو کبھی دیکھا ہی نہیں، تم کو ہے خبر دنیا والو دن کیسے اچھے آتے ہیں رخِ قسمت کیسے پلٹتی ہے؟
رکھ کے سر اُن کے آستانے پر عشق ہنستا رہا زمانے پر
ادیب صاحب کی غزل نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کے ترنم میں گھل کر سارے ہندوستان
میں پھیل گئی اور وہ آل انڈیا مشاعروں کے مقبول و کامیاب شاعر بن گئے۔ سارے برصغیر میں
مشاعروں کے توسط سے انھوں نے بدلتی شاعری، عوام کے بدلتے رجحان کو دیکھا، سمجھا، پرکھا اور اسے
اپنی شاعری میں برتا۔

ڈاکٹر اشفاق انجم نے ایسے ہی شعراء اور ایسے ہی ادبی ماحول میں اپنا شعری سفر شروع کیا اور
حضرت ادیب کی شاگردی اختیار کی۔ کچھ اشفاق انجم کا میلان طبع، کچھ حضرت ادیب مالیگانوی کی
تربیت و اصلاح اور ترقی پسند تحریک کا عروج ساتھ ہی جدید شاعری کی گرم خشک ہوائیں، ان تمام
عوامل نے انجم صاحب کی شاعری پر نمایاں اثر مرتب کئے اور انھوں نے اس طرح کے اشعار کہے:

دھوپ چڑھتی چلی آتی ہے بچالو مجھ کو اپنے پیکر میں ذرا دیر چھپا لو مجھ کو
میں یہاں آیا ہوں تہذیب کا پیکر بن کر گر سنبھلنا ہے تمہیں پہلے سنبھالو مجھ کو

جدید شاعری نے جب ترقی پسند شاعری پر ”شبِ خون“ مارا تو اس کا اثر انجم صاحب پر بھی
پڑا۔ مگر انھوں نے لایعنی اشعار کہنے کی بجائے قدیم غزل کے مطالعے، ترقی پسند غزل کے انقلاب
کے نعرے اور جدید شاعری کے صحرا اور کوہساروں سے ملا جلا ایک انفرادی لہجہ اپنایا جو فیض احمد فیض کی
رومانیت، جاں نثار اختر کی غنائیت، احمد فراز کی عاشقی سے مل کر بنتا ہے۔

چراغ بن کر جلا کروں میں ترے لئے اور کیا کروں میں
تم اپنی زلفوں میں رات باندھو سحر کی خاطر دعا کروں میں

انجم صاحب کے نئے اسلوب (جدیدیت اور روایت کے آمیزے) کی ایک مثال یہ بھی ہے
کہ محرم الحرام کے ایام میں ایک غیر طرچی سالے میں انجم صاحب بھی شریک ہوئے اور سلام پڑھا۔
جس کا مطلع آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔

اک نظر دیکھ کے کہہ دیتا جو پیسا پانی آسمانوں سے کئی روز برستا پانی شاعری اور ادب کی دیگر اصناف کے ساتھ تنقیدی مضامین بھی ان کے سب سے جدا طرز کے ہوتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے بچپن سے جوانی کا تمام زمانہ شہر کے تعلیم یافتہ اور عمر دراز و جہاں دیدہ بزرگوں کے ساتھ گزارا ان سے چھیڑ چھیڑ کر ادبی اصطلاحات، فنی اصول و ضوابط پر بحث کی۔ اسی کے ساتھ ہر وقت کچھ نیا کرنے کی دھن، ترقی کرنے، علم میں اضافہ کرنے کے شوق نے انھیں ادبی، تعلیمی میدان میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا حالانکہ بی اے، بی ایڈ کر کے وہ ایک مقامی ہائی اسکول میں معلم ہو گئے تھے مگر پیشہ معلمی سے جڑے رہنے کے ساتھ ہی ایم اے کیا۔ ”تذکرہ شعرائے مالیگاؤں“ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مہاراجہ سیاجی گائیگاڑ کالج مالیگاؤں میں لیکچرار کی حیثیت سے تقرر ہوا، ریڈر اور ہیڈ آف اردو پرشین ڈپارٹمنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پونہ یونیورسٹی میں اردو پرشین عربک بورڈ آف اسٹڈیز کے چیئرمین رہے۔ اس دوران آپ کی رہنمائی میں کئی اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ آج بھی اتر مہاراشٹر یونیورسٹی جлгаؤں میں ریسرچ گائیڈ ہیں اور سینئر ٹاٹ کالج مالیگاؤں میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرتے ہوئے ان کے اندر ایک نئے اشفاق انجم نے کروٹ لی اور انھوں نے صوفی ازم کا مطالعہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے مالیگاؤں کے نقش بندی، چشتی سلسلے کے بزرگ اور پیر طریقت صوفی نورالہدیٰ سے بیعت ہوئے۔ کالج کے اوقات سے فراغت کے بعد فرصت کے اوقات میں صوفی صاحب اور دیگر علماء و مشائخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ صوفی صاحب سے تصوف کی باریکیوں کو جاننے کی کوشش کی۔ سلوک کی کئی منزلیں طے کیں۔ اس طرح ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ باطن کے ساتھ ظاہری وضع قطع بھی تبدیل ہو گئی۔ اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ انھوں نے نعت کی پُر بہار وادی میں قدم رکھا اور چند برسوں میں ہی ”صلو علیہ وآلہ“ نامی نعتیہ مجموعہ شائع ہو گیا۔ اس کے بعد ”چراغ معرفت“ کے نام سے ان کے پیر و مرشد و بزرگ صوفی نورالہدیٰ کے مختصر حالات زندگی بھی منظر عام پر آئے۔

انجم صاحب نے دوران تحقیق جب شعرائے مالیگاؤں کا مطالعہ کیا تو ان کے شعری محاسن اور فن و زبان کی کمزوریوں کا بھی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ ان کا تجزیہ کیا۔ شعراء کے گھریلو، سماجی، معاشرتی، تعلیمی پس منظر میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا۔ اس محنت شاقہ کا اثر یہ ہوا کہ ان کے اندر یہ شعور بیدار ہوا کہ شعر کیسے ہونے چاہئیں؟ اس پس منظر میں جب ہم ان کی نعتوں کے مجموعے ”صلو

علیہ وآلہ“ کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس چیز کو نعت کے منافی سمجھتے ہیں خود بھی اس سے حتی الامکان اجتناب کرتے ہیں۔ ”نعت رنگ“ (پاکستان، شمارہ نمبر ۲۲) میں ان کا مضمون ”نعت میں ضماؤ کا استعمال“ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ضماؤ کے استعمال پر بحث کی ہے۔ اس بات کو انھوں نے اپنے مجموعہ کے پیش لفظ میں بھی مختصراً ذکر کیا ہے اور آپ کے تعلق سے ضماؤ کے استعمال میں خود بھی بے حد احتیاط سے کام لیا ہے۔ ذیل کے اشعار اس کی عمدہ مثالیں ہیں جن میں ذہن میں آنے والا جواب اور لفظ بھی ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم“ ہی ہوتا ہے۔

کس کے لئے وجود میں آئی ہے کائنات اس دائرے کا نقطہ پرکار کون ہے ؟
 اک پل میں دو جہان کے رستے سمٹ گئے تو سن ہے کیسا؟ صاحب رہوار کون ہے ؟
 درج ذیل اشعار میں بھی ضمیر غائب میں ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم“ کا ہی محل صاف نظر آتا ہے
 حضور سامنے ہوں اور (آپ) جان نذر کروں یہ التجا، یہ تمنا، یہ خواب ہے اللہ
 محسوس ہو رہے ہیں (آپ) لگ جلد سے بھی قریب دیدار کر رہا ہوں خدا کی کتاب میں
 ڈاکٹر اشفاق انجم نے جہاں حضور کے لئے ضمیر ”آپ“ استعمال کی ہے وہیں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ازراہ ادب حضور کے اسمائے مبارکہ بھی نظم کرنے سے گریز کیا ہے۔ بیشتر انھوں نے ”رسول کریم، نبی، حضور“ جیسے القاب و خطابات پر اکتفا کی ہے اور ان کی اس شعوری کوشش نے ان کے کلام کو ایک نئے اسلوب اور جہت سے آشنا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

اعزاز یہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہوا پھر کوئی آسمان میں داخل نہیں ہوا
 سورج زمین چاند فلک بلکہ کائنات کوئی مرے نبی کے مماثل نہیں ہوا
 پھولوں کا حسن رنگوں کی بو چھار کون ہے آ! دیکھ تو سہی پس دیوار کون ہے
 اس کو بھی بخشا جس نے کلیجہ چبا لیا دنیا میں ایسا صاحب ایثار کون ہے
 پلک نہ جھپکی اس کے آگے اک لمحہ آنکھیں ایسی، ایسی بصارت کس کی ہے
 بدن میں چاند کی تشکیل کر رہا ہوں میں درود روح میں تحلیل کر رہا ہوں میں
 لگا کے پائے مقدس کی خاک آنکھوں میں چراغِ مردہ کو قندیل کر رہا ہوں میں
 نبی نے دستِ کرم اس قدر کشادہ کیا زمیں تو خیر، فلک نے بھی استفادہ کیا
 یہ طور و جلوہ نہیں کرسی و حضوری ہے یہاں چراغ نے سورج سے استفادہ کیا

تہذیب و تمدن کا چشمہ پھوٹا ہے عرب کے صحرا سے یہ حسن ثقیف حسن جہل صدقہ ہے مرے صحرائی کا
دیکھا نہ چشم گرم سے رحمت پناہ نے مہتاب بہہ نکلتا پگھل کے زمین پر
ظلمتوں میں بھنور رکھ دیا ہر صنم توڑ کر رکھ دیا
سایہ کملی کا پایا جہاں دھوپ نے اپنا سر رکھ دیا
انجم صاحب کے اس اسلوب یا رویے نے انہیں نئے طرز سے آشنا ہی نہیں کیا بلکہ مضامین کے
تنوع کے ساتھ ہی ایسی ایسی زمینوں میں شعر کہنے کی توفیق عطا کی جن میں اب تک نعت کہنے کا کسی کو
خیال بھی نہ آیا ہوگا۔ ملاحظہ ہو:

اس حیثیت سے یہاں تک قبول ہے دنیا مرے رسول کے قدموں کی دھول ہے دنیا
رسولِ اول و آخر میں امتیاز ہے یہ نبی کا صدقہ ہے آدم کی بھول ہے دنیا
دنیا ئے دوں نگاہ رسالت پناہ میں روشن سائیک چراغ ہے دستِ گناہ میں
مجھے خواہش نہیں سلی زمیں دے آسمل دیدے مگر کوئے نبی میں ایک چھوٹا سا مکمل دیدے
کاسہ بکف ہمیں نہیں سرکار پاؤں میں رکھ دی ہے بادشاہوں نے دستار پاؤں میں
سیہ گلیم پہ مقراضِ نور چلنے لگی وہ چاند غار سے نکلا تو رات ڈھلنے لگی
شہ مدینہ کے جلوؤں کی آرزو اور میں گلوں سے چاند ستاروں سے گفتگو اور میں
تمنا پابہ رکاب ہے گناہ زادِ سفر لرز رہا ہوں کہ روضے کے روبرو اور میں
لپٹ کے دامنِ اقدس سے خوب رویا جائے حیا سی آتی ہے یہ حسن آرزو اور میں
ڈاکٹر اشفاق انجم کے اس رویے نے ان کے اسلوب کو ایک اور خوبی سے آشنا کیا کہ انھوں
نے نعت میں حمدیہ عناصر کی آمیزش سے ایک عجیب سا حسن پیدا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

الہی! نور ہو نازل مکانِ خوشبو دے پڑھوں درود تو میری زبان خوشبو دے
مرے مولا! ترے محبوب کی توصیف کرنی ہے میں عجز ہوں میں گفتگو ہوں مرے منہ میں نبل دیدے
ہم نے تو بس چاند کے ٹکڑے دیکھے ہیں مالک وہ انگشت شہادت کس کی ہے
مجھے تو حشر میں ان کے حوالے کر دینا ترے جلال سے اک اضطراب ہے اللہ
اللہ ربِ کریم کے دربار میں حاضری اور سرکارِ دو عالم کے در پرند راتہ درود و سلام کی سعادت
حاصل کرنا ہر مسلمان کی تمنا و خواہش ہے۔ یہی کچھ جذبات و احساسات یقیناً انجم صاحب کے دل میں
بھی ابتداء سے ہی رہے ہوں گے۔ صوفی صاحب سے بیعت ہو جانے کے بعد ان میں مزید شدت

پیدا ہو گئی۔ حرمین پہنچنے کی حسرت انھیں بے چین کرنے لگی۔ اسی کے ساتھ غزل گوئی کا مزاج، اس خواہش اور محرومی نے انھیں نعت گوئی پر آمادہ کیا اور وہ اپنی خواہش، اپنے جذبات و احساسات اور خیالات و اشعار کی صورت میں اللہ اور اس کے حبیب کے حضور پیش کرنے لگے۔ ان اشعار میں بھی وہی تمام روایتی باتیں ہیں لیکن دلکش اسلوب اور علامات و استعارے کے خوبصورت استعمال سے ان کے اشعار میں ندرت کے ساتھ ساتھ دل آویزی بھی پیدا ہو گئی ہے۔

آپ کے ہجر میں یوں آنکھ سے آنسو نکلے	جیسے ظلمت میں چمکتے ہوئے جگنو نکلے
نبی کے ہجر میں ایسے اداس رہتا ہوں	قفس میں جیسے پرندہ دکھائی دیتا ہے
ظلمتوں میں بھنور رکھ دیا	ہر صنم توڑ کر رکھ دیا
میں یہاں دل مدینے میں ہے	درمیاں میں سفر رکھ دیا
جب کہا یا محمد مدد	بادباں پر بھنور رکھ دیا

درج بالا اشعار سے جہاں ان کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی حسرتوں، تمنائوں اور محرومیوں کا احساس ہوتا ہے۔ وہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاعری کے تبدیل ہوتے منظر نامے، بدلتے اسلوب نے ان کی نعتیہ شاعری کو ایک نیا پن نیا طرز بیان دیا اور نئی جہتوں میں قدم بڑھانے میں بڑی مدد کی ہے۔ جس طرح سلیم کوثر، افتخار عارف اور منور رانا نے نعت میں جدید لفظیات تشبیہ و استعارے کے ساتھ ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ مثلاً سلیم کوثر کے یہ شعر:

اس کی خوشبو سے معطر ہے مرا گھر سارا	آپ کے شہر سے اک آدمی آیا ہوا ہے
دیوار پہ لکھا تھا کبھی نام محمد	اب تک ہے اُجالوں کا بسیرا مرے گھر میں
نبی کا ذکر کرو اور راستے میں رہو	دروہ پڑھتے رہو اور رابطے میں رہو
افتخار عارف کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے:	

مدحت شافع محشر پہ مقدر رکھا	میرے مالک نے مرے بخت کو یا رورکھا
میں نے خاکِ درِ حسان کو سرمہ جانا	اور ایک ایک سبق نعت کا ازبر رکھا
منور رانا کے بھی چند شعر بطور مثال پیش ہیں:	

ہاں مجھ کو مزادینے کیلئے تو چھین لے ایک اک چیز مگر	ہوئوں پہ محمد رہنے کے سنگھٹوں میں مدینہ رہنے کے
ایک لمحے کی بھی چھٹی نہ مدینے میں ملے	قید ہو جاؤں تو کنجی نہ مدینے میں ملے
جس طرف آنکھ اٹھاؤں ترے جلوے مل جائیں	چاہے اک پھول کی پتی نہ مدینے میں ملے

جدید شاعری کی انھیں خنک اور تازہ ہواؤں میں انجم صاحب نے بھی اپنے دل کے درد کو روشن کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔

حضور دید کی خواہش ہے، اور چراغِ حیات
ہوا کے رخ پہ سر رہ گزار رکھتے ہیں
بس ایک شب کا بئیرا نصیب ہو جائے
جہاں اُترتے ہیں تاروں کے قافلے آقا
پرودیا ہر اک انساں کو ملکِ وحدت میں
تمام بکھرے قبیلوں کو خانوادہ کیا
یہ طور و جلوہ نہیں کرسی و حضوری ہے
یہاں چراغ نے سورج سے استفادہ کیا
مسکراتا رہا تازہ رہا ہر موسم میں
دل تھا یا سینہ اطہر میں گل تر رکھا
اردو کی شیرینی اور لطافت میں جدید شاعری کی نئی لفظیات نے جہاں اضافہ کیا وہیں یہ بھی
ایک حقیقت ہے کہ مابعد جدیدیت کے نام پر:

سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی
اس قسم کی شاعری اور اس سے کہیں زیادہ بے معنی یا معماتی شاعری بھی ہو رہی ہے۔ اس کا اثر
نعت گوئی پر بھی پڑا اور سلیم شہزاد کو اس طرح کا نعت کا شعر کہنا پڑا:

حطب، حمالہ، گردن، مونج ری
حصارِ حاویہ میں بوالہب ہے
مانا کہ یہ سورہ لہب سے استفادہ ہے مگر عام قاری کی پہنچ سے دور ہے۔ ایسی نعتیہ شاعری کے
ساتھ مالیگاؤں میں روایتی انداز کی نعت بھی کہی جاتی رہی جو شاعر (مُشاعر) کے گلے اور ترنم کے
باعث قبول عام کی منزل میں ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ ایسی روایتی نعتوں میں سچے جذبوں کی اثر پذیری
اور آنکھوں میں نمی لے آنے کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر ہارون فراز:

”اردو نعت گوئی میں اسلوب کی یکسانیت بہت واضح ہے جب کہ عہدِ حاضر کا
جدید ذہن آج کچھ نیا پن چاہتا ہے۔ طرزِ بیان اور فکر کے نئے آفاق کا
خواہش مند ہے۔ ”صلو علیہ وآلہ“ میں جدید علامات، تشبیہات اور
استعارات کے سبب تازگی، نئے پن اور نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ نئی غزل
کے معتبر شاعر ڈاکٹر اشفاق انجم نے جب تصوف کی مقدس وادی میں قدم
رکھا تو نعت گوئی پر بھی بھرپور توجہ دی۔ اس لئے ان کے یہاں طرزِ ادا کا
انوکھا پن بھی ہے اور سلیقہ مندی بھی، ان کے یہاں عاشق کا سوز، عشق کی سر
مستی و بے خودی ضرور ہے مگر شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اس کا

شعور ہر وقت بیدار رہتا ہے اس لئے قلم کو کہیں لغزش نہیں ہونے پاتی اور یہی
نعت گوئی کی پہلی شرط ہے۔“

اس پس منظر میں درج ذیل اشعار ڈاکٹر ہارون فراز کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں:

معجزہ ہے یہ درود و نالہ شب گیر کا
روضہ اقدس پہ دل گم، عقل گم، آواز بند
ناز ہے مجھ کو، نبی کے حلقہ بیعت میں ہوں
مجھے بھی شوق ہے معراج پر پہنچنے کا
جگر میں درد ہے آنکھیں لہولہاں مگر
میں آسمان کے تلے جل رہا ہوں برسوں سے
ہو گیا ہے موم ہر حلقہ مری زنجیر کا
آنسوؤں کے بیچ موقعہ تھا کہاں تقریر کا
بس کہ احساں مند ہوں اشفاق اپنے پیر کا
ربخ رسول کے دیدار کی تمنا ہے
مرض شدید ہو بیمار کی تمنا ہے
حضور سایہ دیوار کی تمنا ہے

آج نعتیہ شاعری بھی دو قسم کی ہو گئی ہے۔ ایک مشاعرے اور ترنم سے پڑھی جانے والی نعتیہ
شاعری۔ دوسری کتابوں، رسالوں میں شائع ہونے والی نعتیہ شاعری۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے یوں
سمجھئے مشاعروں اور ترنم والی شاعری میں سیرت کے چند مخصوص اور کچھ ضعیف احادیث سے ماخوذ
واقعات ہی نظم کئے جاتے ہیں جو عوام کے ذہن پر فوراً اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف
رسالوں اور کتابوں کی شاعری میں سیرت کے اچھوتے واقعات، معجزات اور کردار کو پیش کرنے کی
کوشش کی جاتی ہے۔ اس پس منظر میں ہم اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری کا مطالعہ کریں گے تو درج ذیل
عنوانات کے تحت نعتیہ شاعری کی انفرادیت نمایاں ہوگی۔ معراج پر لاکھوں اشعار کہے جا چکے ہیں
اشفاق انجم کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہو سلسلہ کا ہکشاں یا مہ و انجم
مجھے بھی شوق ہے معراج پر پہنچنے کا
کون پہنچا عشق کی معراج تک
اک پل میں دو جہان کے رستے سمٹ گئے
سرکار کا نقش کف پا جاگ رہا ہے
ربخ رسول کے دیدار کی تمنا ہے
یہ شرف کس کا ملا صلی علی
تو سن ہے کیسا؟ صاحب رہوار کون ہے؟
معراج کی شب ہے صل علی تو مانگ لے جو کچھ مانگ سکے
یہ رات وصال یار کی ہے موقع ہے سخن آرائی کا
مدینہ جانے کی حسرت، گنبد خضریٰ اور روضہ اقدس پر حاضری، اپنی بے بسی، بے سروسامانی،
عشق رسول جیسے عنوانات ہر اردو شاعر، چاہے اس نے نعتیں کم ہی کہی ہوں، سب کے یہاں ملتے ہیں
مگر وہی سادے انداز میں ”لگا دیں گے بستر در مصطفیٰ پر“، ”کاش میں روضہ اقدس کا کبوتر ہوتا“،

”خاکِ پاچوم لوں حسرت ہی رہی“، ”عشق میں آپ کے مرجانے کو جی چاہتا ہے“ تقریباً ہر شاعر کی نعت میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ یہی مفہوم ملتا ہے۔ اس کے برخلاف جب ہم اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری میں تلاش کرتے ہیں تو یہی حسرت، بے کسی، بے سرو سامانی، آپ سے دوری کے واقعات نئی لفظیات کے ساتھ انوکھے انداز میں سامنے آتے ہیں جو نہ صرف دل کو چھو جاتے ہیں بلکہ ذہن میں محفوظ بھی رہ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے:

دل ٹوٹ نہ جائے انجم کا اس عاشق کا سودائی کا	آنکھوں کی تسلی کیا کہئے محرومِ غبارِ راہ سے ہے
لکھ دوں گا ساری نیکیاں اس کے حساب میں	پہنچا دے کوئی مجھ کو نبی کی جناب میں
فقیروں کی انجم یہی اک صدا ہے	زیارت ، زیارت ، زیارت ، زیارت
شہرِ مدینہ ہم کو دکھا دو صلی اللہ علیہ وسلم	جس کے کنکر ہیرے موتی ہشام و سحر ہیں سونا چاندی
مجھے پتوار دے کشتی کو میری بادباں دیدے	میں طوفاں میں گھرا ہوں اور مدینے کا ارادہ ہے
بوسہ لے لیتا ہوں انجم روضے کی تصویر کا	حسرت دیدار جب حد سے سوا ہو جائے ہے
خالی ہے مگر زمبیل مری رونا ہے شکستہ پائی کا	دیدار نبی کے روضے کا سرمہ ہے مری بینائی کا
سفرِ خلا کا بھی انجم کے پا پیادہ کیا	نبیؐ کے عشق میں کچھ ایسا جذب طاری تھا
خاکِ درِ رسول سے پہلے وضو کریں	ہے جن کو حوصلہ کہ پڑھیں گے نمازِ عشق
جاگتی آنکھوں سے میں گنبدِ خضریٰ دیکھوں	اس تمنا میں تڑپتا ہوں مرا جاتا ہوں
آنکھیں لہو فشاں رہیں سینہ جلا کرے	اس وقت لطف ملتا ہے عشقِ رسول میں

سلیم کوثر کی ایک مختصر سی نظم ہے جس میں انہوں نے مدینہ میں زندگی گزارنے اور وہیں مرجانے کی آرزو بیان کی ہے جو جدت اور ندرت میں اپنی مثال آپ ہے۔

اے کاش مدینہ جاؤں کبھی

کوئی ایسا کام نکل آئے

جو صرف مجھی کو آتا ہو

جو صرف مجھی کو کرنا ہو

وہی کرتے کرتے جینا ہو

وہی کرتے کرتے مرنا ہو

اے کاش مدینہ جاؤں کبھی

انھیں آرزوؤں کا اظہار انجم صاحب نے بھی بالکل اچھوتے انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح لفظوں میں اپنی دلی کیفیات کو بیان کیا ہے کہ وہ کیفیات سب کے دل کی آواز معلوم ہونے لگتی ہیں۔

حضور سامنے ہوں اور جان نذر کروں یہ التجا یہ تمنا یہ خواب ہے اللہ
ملا کے خاکِ مدینہ میں سرخرو کر دے یہاں غلام کی مٹی خراب ہے اللہ
ممکن نہیں پر ایک تمنا ہے کیا کروں دو گز زمین چاہئے سرکار پاؤں میں
نعت گوئی کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ اشعار میں اپنی اور مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کر کے آپ
سے دعا کی گزارش، شفاعت کی تمنا اور پستی و بربادی کا منظر آپ کے حضور پیش کیا جائے جس کی
اولین مثال ہے مولانا حالی کی ”اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے“ اس کی اتباع میں شعرائے
کرام نے بھی آپ کے حضور استغاثہ پیش کیا ہے مگر اس میں اکثر نے آپ کو (نعوذ باللہ) اللہ کے
اوتار کا درجہ دے دیا ہے۔ مگر اس طرح کی فریاد میں بھی انجم صاحب نے بے حد احتیاط سے کام لیا
ہے۔ ”فریاد“ کے عنوان سے انجم صاحب کی نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں:

حضور ملت بکھر رہی ہے، ہماری صورت بگڑ رہی ہے سیاهی آنکھوں میں پھر رہی ہے دلوں کی دنیا اجڑ رہی ہے
حضور ظلمت کی کیا شکایت ہے روشنی روشنی کی دشمن لہو خود اپنے لہو کا پیاسا ہے زندگی زندگی کی دشمن
چمکتے گنبد ہیں مسجدوں کے منارے بے حد بلند آقا نمازیوں سے صفیں ہیں خالی تماشے ہیں دل پسند آقا
بھلا کے سب روح کے تقاضے بدن کو علماء سجا رہے ہیں نمازیں اجرت پہ ہو رہی ہیں امام روزی کما رہے ہیں
امیر ملت میں کھیلتے ہیں غریب و مسکین ترس رہے ہیں کہیں لبوں پر گلابِ شبنم، کہیں پہ آنسو برس رہے ہیں
نئے زمانے کی روشنی میں ہماری نسلیں بھٹک رہی ہیں رعائیں امت کی بیٹیوں کے سرہں سے آقا سرک رہی ہیں

غموں سے انجم ہے دل شکستہ خوشی کا کچھ اہتمام آقا

دہائی آقا، دہائی آقا، درود آقا، سلام آقا

اسی کے ساتھ ان اشعار پر بھی غور کیجئے:

کٹیں گے کیسے تمنا کے راستے آقا چراغ جیسے مرے خواب بجھ گئے آقا
ہر ایک سمت سے یلغار ہے مصیبت کی میں چھوڑ بیٹھوں نہ امید، حوصلے آقا
مجھے سنبھالنے میں اس زمین پر ہوں جہاں رتھوں کے ساتھ ہی چلتے ہیں زلزلے آقا
یہاں سکون میسر نہیں کسی صورت دیار امن و اماں میں بلائے آقا

تمام قوم پریشاں ہے صرف میں ہی نہیں خدا کے واسطے لطف و کرم مرے آقا
ان اشعار میں انجم صاحب نے اپنی اور مسلمانوں کی حالت زار بیان کی ہے اور آپ سے
لطف و کرم، مہربانی، شفاعت اور دعا کی ہی گزارش کی ہے۔ اس کے ساتھ انجم صاحب نے حمد اور دعا
و مناجات میں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے جذبات کو سادے مگر جدید لفظیات اور اسلوب کے ساتھ
اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ حمد کے دو تین اشعار ملاحظہ ہوں:

قلم میں رنگ انوکھے کہاں سے آتے ہیں	خیال ذہن کے رستے کہاں سے آتے ہیں
دراز ہے نہ جھروکے ہیں آسمانوں میں	ہوائے خلد کے جھونکے کہاں سے آتے ہیں
دلوں میں پیار کے جذبات کون بھرتا ہے	یہ ماہ تاب سے چہرے کہاں سے آتے ہیں
”صدف“ میں کون پروتا ہے خوش نما موتی	”گلاب جیسے فرشتے“ کہاں سے آتے ہیں
اسی طرح مناجات کے یہ اشعار بھی اپنے آپ میں ایک زمانے کے درد کو سمیٹے ہوئے ہیں۔	
خوابوں کی تعبیر دکھا دے اللہ سائیں	یا ان کو زنجیر پنہا دے اللہ سائیں
میرے گھر میں کچھ کرنیں تو آجائیں گی	ہمسایوں کے دیپ جلا دے اللہ سائیں
میرے اندر ویرانی سی ویرانی ہے	تو چاہے تو سورگ بنا دے اللہ سائیں
انجم کا دل رکھ لے ورنہ ڈر لگتا ہے	دیواروں سے سر ٹکرا دے اللہ سائیں

نئے اسلوب، جدید لفظیات، دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے الفاظ، اظہار کا انوکھا انداز، یہ
اور ایسی بہت سی باتیں اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری کے خصوصیات کہی جاسکتی ہیں۔ صلو علیہ وآلہ، د
راصل اطاعت الہی، عشق رسول اور راہ سلوک کے راہی کے دل کی آواز ہے جو صفحہ قرطاس پر آنے
کے بعد ہر دل کی آواز بن جاتی ہے کیوں کہ اشفاق انجم کی نعتیہ شاعری حمد و نعت کے مروجہ راستے سے
جدا اور مشاعروں کی نعتیہ شاعری سے پرے سچے اظہار کی شاعری ہے۔ اس سلسلے میں میں مزید کچھ نہ
کہتے ہوئے صلو علیہ وآلہ میں شامل بشر نواز (اورنگ آباد دکن) کے مضمون ”پل صراط“ کے اقتباس پر
اپنی بات ختم کرتا ہوں۔ بشر نواز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

”اشفاق انجم بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے کے درمیان اپنی
شناخت بنانے والے شعراء میں شامل ہیں۔ ان شعراء میں لسانی اور ہمبستی
تجربوں کی جسارت بھی تھی۔۔۔۔۔ اشفاق انجم کی کامیابی یہ ہے کہ انھوں

قرطاس مُصلّیٰ ہے تو سجدے میں قلم ہے
یہ منزلت مدح شہنشاہِ اُمم ہے

(ابرار عابد)



عہدِ نو کی ضد کہ روح ارتقا نافذ کرو
قلب کہتا ہے کہ عشقِ باصفا نافذ کرو
عقل کہتی ہے فقط سود و ربا نافذ کرو
عشق کہتا ہے نظامِ مصطفیٰ نافذ کرو

(رئیس امر وہوی)

نعت اور حب رسول کے تقاضے! (ایک گفتگو)

معروف دانشور اور مذہبی اسکالر جناب احمد جاوید لاہور سے کراچی تشریف لائے تو انھوں نے 28 اگست 2016 کی شام کراچی پریس کلب میں ایک طرحی مشاعرے میں شرکت فرمائی۔ نعت پیش کرنے سے قبل منتظمین کے اصرار پر انھوں نے نعت اور اظہار حب رسول کے تقاضوں پر بھی مختصراً گفتگو فرمائی۔ نعتیہ ادب میں احتیاط کے پہلوؤں پر مبنی چند نکات توجہ طلب ہیں چنانچہ احمد جاوید صاحب کے خطاب کا متن نعت رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

حسن اظہار کے بغیر سچائی کا بیان ہو بھی جائے تو وہ ادھورا رہتا ہے اور بعض مرتبہ مضر نکلتا ہے۔ نعت گوئی کے کچھ فنی آداب اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کے روحانی اور معاشرتی مظاہر کیا ہیں؟ ایک مختصر سی گفتگو کر کے میں رخصت چاہوں گا۔ مسلمانوں کے احساسات و جذبات کا سارا نظام دوستونوں پر بنی ہوئی عمارت کی طرح ہے۔ یعنی مسلمان اپنی افتاد طبع میں اور اپنے بنیادی مزاج میں دو احوال کا حامل ہوتا ہے، اور ان دو احوال کو اپنے اندر رکھنا اور اپنے مسلمان ہونے کے احوالی اسباب ہونے کی حیثیت سے انھیں تسلسل سے رکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ ایمان لانا! کیوں کہ یہ ایمان کے شاہد ہیں۔ تو وہ جو دو احوال جن سے مسلمانوں کا سارا نظام جذبات و احساسات چل رہا ہے وہ ہیں خشیت الہی اور حب رسول! تو یہ دو چیزیں اگر ہمارے مزاج میں بنیادی محرکات کے طور پر موجود ہیں تو ہم نے گویا رسول اللہ کا عاجز مگر سچا امتی ہونا کو الیفائی کر لیا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن جن جہتوں سے مز کی بنا کر بھیجے گئے تھے... تزکیہ کہتے ہیں ہدایت پر نفس کا راضی ہو جانا، ہدایت پر نفس کا مطمئن ہو جانا، یہ تزکیہ ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تزکیے کے واحد ضامن تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ایک خاص جہت سے اپنے خدام کا تزکیہ فرمایا کرتے وہ ایک

جہت یہ ہے کہ نفس کے غالب ترین احوال کی حیثیت سے وہ اللہ کی خشیت اور اللہ کے رسول کی محبت کو اپنے تمام احساسات و جذبات کی اصل بنانے کے لائق ہو جایا کرتے تھے۔

میرے خیال اور میری ناچیز رائے میں ہمارے تنزل، انحطاط اور ہماری ہر درجے پر شرمندہ کر دینے والی بے بسی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تعلق باللہ اور تعلق مع الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ بنیادی فطری تقاضے نظر انداز کر رکھے ہیں حتیٰ کہ ہماری دینی تعلیم کے نظام میں بھی ان بنیادی احساسات کی تخم کاری اور ترویج کا وہ اہتمام نہیں ہے جو رسول اللہ کی مجلسوں میں پایا جاتا تھا۔ کیوں کہ انسان جس چیز کو اہمیت و وقعت دیتا ہے، یعنی انسان کی بناوٹ ایسی ہے یہ جس چیز کو بہت ضروری بہت اہم سمجھ کر قبول یا اختیار کرتا ہے، یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کے احساسات کا نظام اس چیز پر نہ چلے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ میں اللہ کو مانوں اس کی شان کے ساتھ، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤں آپ کی شان کے ساتھ اور وہ ان دونوں ہستوں سے تعلق کے احوال، احساسات اور جذبات سے محروم رہ جاؤں۔ مطلب یہ انسان کی بناوٹ کے خلاف ہے۔ یہ غیر فطری ہے۔ گویا اللہ سے نہ ڈرنا اور رسول اللہ پر ہر سانس کے ساتھ نثار ہوتے نہ رہنا یہ غیر فطری ہے۔ یعنی اس کا غیر دینی اور غیر عقلی ہونا بعد میں دیکھا جائے گا، یہ غیر فطری ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کرے کہ رسول اللہ پر ایمان اور آپ کی کامل اتباع کے سچے عزم کے ساتھ اس کی بدولت، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ دو بنیادی احوال مرحمت فرمادیں کیوں کہ جیسا انیق احمد کہہ رہے تھے اس پر مسلم انفرادیت، مسلم اجتماعت اور مسلم ریاست سب کا دار و مدار ہے۔ اور جو انھوں نے بہت اچھی بات فرمائی کہ انسانوں کا معاشرتی آئیڈیل مساوات رہا ہے۔ یعنی انسانوں نے بہتر معاشرے کے لیے جو سب سے زیادہ بڑا خواب دیکھا ہے اس خواب کا عنوان مساوات ہے وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ یعنی مساوات انسانی معاشرے کی بہترین صورت کا وہ آئیڈیل ہے جو ہمیشہ ذہن میں رہا کبھی عمل میں نہ آ سکا۔ لیکن رسول اللہ نے انسانوں کو ایمان کی بنیاد پر ایک دوسرے کا جذباتی، ذہنی اور عملی بھائی بنا کر دکھا دیا یعنی رسول اللہ نے مساوات کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے آئیڈیل مواخات کو عمل میں لا کر دکھا دیا۔ مواخات کو عمل میں لانے کا جو بے نظیر کارنامہ ہے وہ رسول اللہ نے ان دو احساسات کو اپنے ماننے والوں کا مدار وجود بنا کر برپا کیا۔ لوگ ایک دوسرے کے بھائی بھائی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے ہو گئے تھے یہ آپ کی محبت ہے جو آپ کے امتیوں کو ایک دوسرے کا ایسا بھائی بنا سکتی ہے کہ نسبی بھائی بعد میں آئے گا یہ نسبی بھائی پہلے آئے گا۔

تو یہ وجہ ہے کہ رسول اللہ کی محبت آپ سے محبوبیت کا شرف حاصل کرنے کے لیے نسب کوئی Final (حتمی) یا decisive (فیصلہ کن) چیز نہیں تھا، نسبت بنیادی چیز تھی۔ یہ نسبت ہے جو بلال حبشیؓ کو سیدنا عمر فاروق اعظمؓ کی زبان اقدس سے ”سیدنا“ کہلواتی ہے۔ ہم اگر بس اس نسبت کو اپنے وجود کے بہترین احوال کے ساتھ قبول کر لیں تو امید ہے کہ کم از کم اگر ہم ریاست اسلامی نہ بنا سکے، معاشرہ اسلامی بنانے میں یقیناً کام یاب ہو جائیں گے۔ مسلمانوں کی معاشرتی وحدت و مواخات حب رسول کی زندہ، جیتی جاگتی بنیاد پر، یہ ہمارا آئیڈیل ہے اور اس آئیڈیل کو آسانی سے عمل میں لانے کا یہ راستہ ہے کہ اللہ سے ڈرنا سیکھو اور رسول اللہ پر مرنا سیکھو۔

دوسری بات نعت گوئی کے ایک دو لوازم کے بارے میں..... کیوں کہ یہاں سب بہت کہنے مشق، قادر الکلام اور صاحبان کیفیات شعرا بیٹھے ہوئے ہیں تو ان کو اس کی ضرورت نہیں، ویسے ہی کہہ رہا ہوں..... نعت کے چند ضروری عناصر ہوتے ہیں، جن کو بالکل نظر انداز کر کے نعت وجود میں نہیں آسکتی۔

ایک یہ کہ نعت رسول اللہ کی جناب میں اظہار محبت ہے اللہ کے شکر کے ساتھ! یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت اس دنیا ہی میں نہیں، اللہ نے جنت میں پہنچایا تو وہاں بھی۔ دنیا و آخرت میں اللہ کی سب سے بڑی رحمت اور نعمت رسول اللہ خود ہیں۔ دنیا میں رہیں گے تو دنیا کا مرکز ہیں، جنت میں رہیں گے تو جنت کا مرکز ہیں۔ اور جنت کی کوئی بھی چیز رسول اللہ کے ہم پلہ نہیں ہے۔ اس وجہ سے دعا کرو کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمارے گناہ بخشے اور ہمیں رسول اللہ کی مشفقانہ شفاعت کا مستحق بنائے اور کیا عجب ہے کہ ہمیں رسول اللہ سے مرافت کی توفیق بھی جنت میں مل جائے کہ جنت کی سب سے بڑی دو نعمتیں ہیں؛ رویت باری تعالیٰ اور معیت رسول اللہ۔ تو یہ دونوں نعمتیں حاصل کرنے کی تیاری کرو! دل کے لیے اللہ سے ڈرنا لذیذ بنا دو، دل کو اللہ کی خشیت کی طرف راغب اور مائل کرو کسی احساس جبر کے بغیر۔ اور اسی طرح رسول اللہ کے عاشق بننے کی بجائے رسول اللہ کے عاشق ہونے کا ثبوت دو! اللہ مجھے اور آپ کو، سب کو توفیق عطا فرمائے۔

نعت کے جو ضروری عناصر ہیں ان میں سے ایک اظہار محبت ہے اپنی اوقات میں رہتے ہوئے۔ کیوں کہ رسول اللہ انسانوں کے درمیان جاری نظام عشق و محبت میں نہیں آتے۔ آپ نعوذ باللہ، نعوذ باللہ کوئی عام محبوب نہیں ہیں۔ رسول اللہ سے بیٹوں کی طرح محبت نہیں ہو سکتی، رسول اللہ سے والدین کی طرح محبت نہیں ہو سکتی، رسول اللہ سے کسی بھی محبوب کی طرح کی محبت نہیں

ہو سکتی۔ کیوں کہ رسول اللہ کی محبت میں بھی ایک زور وحدت ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا یعنی اس میں کسی کو شریک نہیں رکھا جاسکتا۔ تو رسول اللہ کی محبت ہے ایک ناچیز امتی کے دل کی سب سے بڑی متاع جو وہ اپنی بے بضاعتی کے باوجود سرکارِ دو عالم کی خدمت میں پیش کرنے کا شوق رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میرا یہ جو ناچیز سا تحفہ ہے وہ اس بارگاہِ سخاوت میں، اس بارگاہِ فیاضی میں، بارگاہِ رحمت میں اللہ کی تائید کے ساتھ قبول ہوگا۔ مطلب یہ کہ اظہارِ محبت بھی محبت کے عمومی اسالیب میں نہیں، اپنی اوقات میں رہتے ہوئے اور آپ کے محبوب خدا ہونے کے مرتبے کو نظر میں رکھتے ہوئے۔ رسول اللہ کے لیے یہ تو کوئی لقب ہی نہیں کہ آپ محبوبِ امت ہیں، کبھی یہ استعمال نہیں ہوا کیوں کہ یہ تو آپ کی کسرِ شان ہے۔ آپ کے لیے لقب ہے محبوبِ الہ، محبوبِ خدا، محبوبِ جبرئیل۔ تو مطلب یہ کہ جو خدا کا محبوب ہو اس کے عاشق کو اپنی اوقات میں رہنا چاہیے۔ اللہ بڑا غیرت والا ہے، بڑا حمیت والا ہے وہ اپنے محبوب کے حضور میں کسی بھی ضروری حد سے تجاوز قبول نہیں فرمائے گا۔

دوسرا یہ ہے کہ نعت میں ایک بحرِ حمد یہ رو بھی دوڑنی چاہیے کہ یا اللہ تیرا احسان، یا اللہ تیرا شکر کہ تو نے مجھے اپنے حبیبِ مکرم کا امتی بنایا، کہ تو نے مجھے آخرت کے لیے پُر امید رہنے کا سبب عطا فرمایا۔ اگر رسول اللہ سے تعلق نہ ہو تو اپنی آخرت کے لیے پُر امید رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا، ٹھیک ہے نا؟ تو یہ جو ایک تشکر کی رو ہے یہ نعت کو گویا اس کی معنوی اٹھان عطا کرتی ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ ایسی نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرتے ہوئے میں نعت لکھ رہا ہوں اور اس نعمت کو دینے والے کے تشکر کے اظہار کا راستہ اس نعت میں نہیں مل رہا تو یہ بڑی کمی کی بات ہے۔ اور تیسرا یہ کہ اگر کوئی کہے کہ اللہ کے لیے کوئی ایسا لقب بتا دو کہ جس میں اس کی تمام صفاتِ جمیلہ و جلیلہ شامل ہو جائیں، اللہ کی شان میں ایسا ایک Phrase (فقہہ) بنا دو تو میں کم از کم کہوں گا وہ Phrase ہے الہ محمد۔ اللہ کے وصف کو اپنی انتہائی بلندی پر اگر بیان کرنا چاہو تو اسے کہہ دو ”الہ محمد“ اب اس میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی شان گویا اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہم نے بیان کر دی۔ تو اسی طرح رسول اللہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تعلق کا ایک لاشریک مزاج ہے، اس میں وہ کسی کو مداخلت نہیں کرنے دیتا، نہ اللہ نہ اللہ کے رسول۔ تو اللہ اس سے خوش ہوگا کہ اسے الہ محمد کہا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے خوش ہوں گے کہ انھیں عبد اللہ کہا گیا ہے رسول اللہ کی ہر شانِ بندگی کے دائرے میں بیان ہوگی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ہر شانِ الوہیت کے درجے میں بیان ہوگی، تو اس میں اختلاط نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی رسول اللہ کو اللہ کی بندگی سے الگ کر کے ڈیفائن کرنے کی جو بھی کوشش ہوگی وہ اللہ کو بعد میں رسول

اللہ کو پہلے ناراض کرے گی۔ تو میری محبت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ مجھے اپنے منہ زور جذبات کی تسکین سے زیادہ اپنے محبوب کی خوشنودی عزیز ہونی چاہیے۔ نعت گوئی کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ اپنے جذبات محبت کی تسکین میرا موضوع نہیں ہے، یہ تو شرک کے برابر ہے کہ میں اپنی تسکین چاہتا ہوں اللہ کے رسول کی تعریف کر کے۔ یہ تو گویا اپنے لیے کہا گیا ناں؟ اس میں مطلب سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہو جائیں۔ آپ کا معبود راضی ہو جائے، آپ خوش ہو جائیں۔ تو اللہ نے بھی اپنی محبت کی انتہا پر ”عبدہ“ کہا، اسی طرح رسول اللہ بھی اپنے تعارف کا انتہائی کلمہ عبد اللہ ہونا بتاتے ہیں۔ یہ شان بندگی ہمارے لیے تو شرف ہے ہی رسول اللہ کے لیے بندگی نعوذ باللہ کوئی نقص تھوڑی ہے، یہ تو اللہ کی طرف سے دیا گیا سب سے قیمتی تحفہ ہے جو اللہ نے خاص رکھا اپنی کتاب میں۔ تو اس تحفے کو رسول اللہ کے دستِ عظمت سے چھیننے کی کوشش نہ کرو، یہ چھیننے کی کوشش ہے۔

یہ دو آداب فنی اہتمام کے ساتھ، لفظ پر مناسب قدرت کے ساتھ، جمالیاتی شعور کی مناسب تربیت کے ساتھ اگر ہم دو یہ آداب نعت گوئی کے عمل میں رسول اللہ کے دکھائے اور بتائے ہوئے معیار تک لے جائیں تو ہم نے گویا نعت گوئی کی روایت کو رسول اللہ کے ساتھ تعلق کی روایت کا سب سے کارگر اور مؤثر مظہر بنا دیا۔ نعت گوئی کی روایت اگر اخلاص اور درست محبت کے ساتھ پروان چڑھ جائے، رواج پکڑ جائے تو رسول اللہ سے تعلق رکھنے والے احساسات و جذبات کسی بھی تحریر کسی بھی لٹریچر کے مقابلے میں جلدی منتقل ہو جائیں گے۔ تو نعت گو حضرات اور نعت خواں حضرات دونوں پر یہ فریضہ دعوت عاید ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ کے ساتھ تعلق کے لیے درکار احساس کو پھیلائیں اپنے سامعین و مخاطبین میں مگر ان شرائط کے اندر رہتے ہوئے۔

ۛۛۛ

محمد جنید عزیز خان - کراچی

نعت اور تنقیدی شعور (مذاکرہ)

ABSTRACT:

Dr. Professor Abu Sufyaan Islahi, Professor Arabic, visited Pakistan for a short while from Ali Garh (Bharat). Director Naat Research Centre, Dr. Aziz Ahsan, arranged a symposium on the topic of Critical Consciousness of poets of Arabic, Persian and Urdu languages for creating devotional poetry i.e. genre of Naat. Professor Sahar Ansari and Professor Anwar Ahmad Zai also participated in discussion. Dr. Aziz Ahsan, remained present as host moderator during discussion. The symposium has now been transcribed for publishing in 26th issue of NAAT RANG.

ڈاکٹر عزیز احسن: آج میرے لیے یہ بہت ہی مسرت کا لمحہ ہے کہ ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب، علی گڑھ سے تشریف لائے ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری صاحب ہمارے بزرگوں میں ہیں اور یہیں کراچی میں تشریف رکھتے ہیں انھوں نے بھی ہماری دعوت پر اس محفل میں شرکت فرمائی ہے اور..... میں کیا کہوں کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے..... جناب پروفیسر انوار احمد زئی، چیئر مین بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن بھی یہاں تشریف رکھتے ہیں۔

میں یہ چاہ رہا تھا کہ چوں کہ نعت ریسرچ سینٹر کے چیئر مین پروفیسر انوار احمد زئی بھی یہاں

ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، علی گڑھ، بھارت سے کراچی تشریف لائے تو نعت ریسرچ سینٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ڈاکٹر عزیز احسن نے، منگل: یکم ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق ۱۲ جنوری ۲۰۱۶ء (رات ساڑھے سات بجے)، ”نعت اور تنقیدی شعور“ کے موضوع پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا۔ اس مذاکرے میں مہمان خصوصی جناب پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کے علاوہ پروفیسر سحر انصاری اور پروفیسر انوار احمد زئی نے حصہ لیا۔ ڈاکٹر عزیز احسن، میزبان کی حیثیت سے مذاکرے میں شامل رہے۔

موجود ہیں اور میں خاکسار (عزیز احسن) نعت ریسرچ سینٹر کا ڈائریکٹر ہوں۔ صبیح رحمانی، نعت ریسرچ سینٹر کے سیکریٹری جنرل ہیں جو آج کل کینیڈا میں ہیں۔ پروفیسر ابوسفیان اصلاحی صاحب کے مضامین، نعت رنگ میں باقاعدگی سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ پروفیسر سحر انصار صاحب کے بھی مضامین شائع ہوئے ہیں اور انھوں نے ایک بہت بڑا کام یہ کیا کہ ہماری درخواست پر میرزا مظہر جان جاناں کی ایک فارسی نعت کا چند منٹوں میں منظوم ترجمہ کر دیا جو نعت رنگ میں شائع ہو چکا ہے۔ ان مقتدر حضرات کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نعت پر اور نعتیہ ادب میں تنقیدی شعور کے حوالے سے کچھ باتیں ریکارڈ کر لوں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ نعت رنگ کے ذریعے ہم نے تنقیدی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور نعت کے حوالے سے تنقید کے ضمن میں، عمومی طور پر لوگوں کا شرح صدر نہیں ہوا ہے۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ حضرات فرمائیں کہ عربی خاص طور پر پروفیسر ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب آپ تو عربی کے حوالے سے ہمیں بتائیے کہ عربی نعت میں تنقیدی شعور کس طرح کارفرما رہا ہے وہ کیسا رہا ہے اور نعت کے عربی کے مآخذ کیا کیا ہیں۔ پروفیسر سحر انصاری صاحب اردو کے چوں کہ تنقید نگار بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں یہ بھی بتائیں گے اور کچھ میں بھی عرض کروں گا۔ تو بتائیے کہ کہاں سے بات شروع کی جائے۔

پروفیسر سحر انصاری: عربی سے نعت شروع ہوئی ہے اور عربی کو تقدم حاصل، اس لیے ڈاکٹر پروفیسر ابوسفیان اصلاحی گفتگو کا آغاز فرمائیں۔

عزیز احسن: عربی سے چوں کہ نعت کا آغاز ہوا ہے اس لیے اصلاحی صاحب سے درخواست ہے کہ وہ عربی نعتیہ ادب کے حوالے سے ہمیں کچھ بتائیں۔

اصلاحی: جہاں تک کہ عربی میں نعت گوئی کا تعلق ہے تو ایک طریقے سے قبل نبوت ہی سے اس کا آغاز ہو گیا تھا۔ بہت سے ایسے قصیدے اور بہت سی ایسی چیزیں مل جائیں گی جو نعت گوئی کے حوالے سے پیش کی جاسکتی ہیں اور اس کے بعد جب نبوت کا آغاز ہوا تو شعراء الرسول کے حوالے سے ایک پوری ٹیم تھی اور یہ اصحاب رسول ﷺ تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ ان کے سامنے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے اوصاف و کمالات اور ان کے اخلاق عالیہ یہ سب چیزیں ان کے سامنے تھیں اور اسی کو پیش نظر رکھ کر وہ اللہ کے رسول ﷺ کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ تو یوں بالخصوص قبل نبوت اور نبوت کے بعد کی شاعری کو ایک طریقے سے اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ سیرت نگاری کا ایک بہت بڑا مآخذ ہے۔ یہ اس لیے کہ اس شاعری کا بہت بڑا حصہ اللہ کے رسول ﷺ کی نظروں

سے گزرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ایسا شعر ہے جس سے آپ کا نظریاتی تصادم یا نظریاتی ٹکراؤ ہے تو وہاں آپ بڑیک لگاتے اور اس پر تنقید کرتے، اسے روکتے بلکہ ایک بار کا واقعہ ہے کہ کچھ اشعار ایسے پڑھے جارہے تھے جن کا مفہوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کو غیب کا بھی علم ہے تو فوراً آپ نے منع کیا۔ گویا اس سے متبادر ہے کہ شعراء الرسول ﷺ کی شاعری یا شعراء الرسول سے پہلے کی شاعری جو ہے اس کو بہت ہی اہمیت و عظمت حاصل ہے اور سیرت نگاری کے سلسلے میں اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ (عزیز احسن سے مخاطب ہوتے ہوئے) شبلی کی سیرت النبی ﷺ میں یہ چیز موجود نہیں ہے۔ کس قدر جہاں دیدہ آدمی تھا سرسید جس نے یہ تحریر کیا کہ سیرت نگاری کا تصور ہم بغیر عربی شاعری کے کر ہی نہیں سکتے۔ جیسے قرآن کریم اور حدیث، سیرت نگاری کے بنیادی source ہیں۔ اسی طرح جو سیرت نگاری کے چار پانچ بنیادی sources ہیں جن کے بغیر سیرت نگاری کے عوامل و محرکات سامنے آ ہی نہیں سکتے ہیں ان میں عربی شاعری کی یہی قابل ذکر حیثیت ہے۔ سرسید نے جب خطبات احمدیہ کا آغاز کیا ہے تو آپ دیکھیے کہ انھوں نے بیس پچیس تیس شعر کوٹ کیے ہیں۔ ابھی میں نے اپنے ایک مضمون میں یہ وضاحت کی کہ سیرت النبی ﷺ کی ترتیب میں کلام عرب سے استشہاد کو اور آگے بڑھایا جانا چاہیے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی ﷺ میں کچھ اشعار نقل تو کیے ہیں، لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو جس کا سرسید نے آغاز کیا تھا اس کو سیرت کے مآخذ میں بڑھایا جانا چاہیے تھا لیکن سیرت النبی ﷺ میں یہ اسلوب تحقیق موجود نہیں ہے۔ ابھی شبلی کی سیرت النبی میں جو عربی اشعار ہیں اس پر میرا ایک مضمون، مجلہ علوم اسلامیہ (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں شائع ہوا ہے۔ ان کے نقل کرنے میں کہاں کہاں سہو ہوا ہے۔ وہ سب میں نے point out کیا ہے۔

عزیز احسن: آپ کی گفتگو سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ پہلے یہ طے ہو جائے..... اور

یہ آپ ہی سے ہمیں معلوم ہوگا کہ عربی شعراء نے زیادہ تر حسنِ صوری کی بات کی ہے یا جمالِ سیرت واسوہء رسول کریم ﷺ کا ذکر زیادہ کیا ہے؟

اصلاحی: اچھا سوال آپ نے کیا..... میرا یہ مضمون ”المدح النبوی! ایک مطالعہ“ جو نعت رنگ

میں ابھی آیا ہے یہاں بھی دیکھیے خاص طور سے وہ شاعری جو صحابہ کرام یا دیگر شعراء نیز تابعین کی شاعری رہی ہے۔ اس ضمن زیادہ تر شائل النبی موضوع بحث رہے۔ تو ان لوگوں نے نعلین مبارک اور دیگر چیزوں پر توجہ نہ دے کر اوصاف نگاری پر توجہ مرکوز کی ہے۔ گویا شائل النبی ﷺ ان کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتنا ہے۔ شائل النبی ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا اخلاق اور آپ کا کردار کیسا

تھا۔ آپ معاشرے کے ساتھ پیش کیسے آتے تھے..... یا دین کی تبلیغ کا طریقہ کار کیا تھا۔ یا جو مخالفین تھے ان کے ساتھ آپ کا کس طریقے سے discussion ہوتا تھا۔ ان تمام چیزوں کو اس [شاعری] میں highlight کیا گیا ہے۔ لیکن دو سو سال کے بعد یہ شاعری شروع ہوئی ہے۔ تو ابونواس کی شاعری کے بارے میں آپ دیکھیے۔ اندلس کے جو شعراء ہیں اس کے بعد عہد عباسی کے شعراء ہیں یا نیچے آئے تو یہاں میں دیکھتا ہوں کہ ان لوگوں نے ان موضوعات یعنی نعلین اور آپ ﷺ کے حلیے پر زیادہ توجہ دی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی چیز ہے..... آپ دیکھیے کہ جو نعت کے مباحث ہونے چاہئیں۔ جس میں دانشورانہ، عالمانہ انداز ہو وہ دو سو سال سے پہلے والی شاعری میں ہے۔ دو سو سال کے بعد اس میں عالمانہ انداز آپ نہیں دیکھیں گے۔ اس میں رونے اور اپنے گناہوں کی معافی کا انداز ملتا ہے۔ شفاعت کا بار بار ذکر آتا ہے۔ no doubt کہ آپ ﷺ شفیع المذنبین ہیں..... اس طرز پر یہ ساری چیزیں یہاں ملتی ہیں۔ لیکن دو سو ڈھائی سو سال پہلے آپ جائیے تو آپ کا کردار کیا تھا نیز آپ کا دین کی تبلیغ اور اشاعت قرآن کے سلسلے میں کیا طریقہ کار تھا، ان پر خصوصی گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن ڈھائی سو سال کے بعد زیادہ تر ہم نے صرف تو صنفی یا تعریفی گفتگو کی ہے۔ لیکن اس توصیف میں آپ کا اخلاقی معیار کیا تھا، معاشرتی و سیاسی کیا کردار کیا رہا..... ان پہلوؤں پر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے گفتگو کی ہے..... آپ دیکھیے، یہ بات تو اردو کے سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ جب حضرت حسان بن ثابتؓ سے کئی بار آپ ﷺ نے کہا کہ یہ جو میرے مخالفین ہیں ان کا تم جواب دو۔ تو اس جواب میں یہ چیزیں تھوڑی شامل ہیں کہ آپ کا بال کیسا تھا، آپ کی آنکھ کیسی تھی۔ آپ کی آواز کیسی تھی۔ آپ کا لباس کیسا تھا۔ ان نکات پر اپنی توجہ مبذول نہ کی..... میں حضرت حسان بن ثابت اور عربی نعتیہ شاعری کے حوالے سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کے اوصاف عالیہ کو موضوع شاعری بنایا گیا ہے۔ اور یہ بات میں نے کہیں تھوڑی سی لکھی بھی ہے..... یہ تو معلوم ہی ہے کہ پورے پاکستان میں نعت گوئی کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے۔ اسی طرح نعت خوانی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ جبکہ سب سے پہلے جسے اولیت ہم دیں گے وہ توحید اور قرآن کریم کو دیں گے۔ تو اس حوالے سے پوری عربی شاعری کا جب میں تجزیہ کرتا ہوں تو اس میں حمد ہے ہی نہیں..... یہ ایک زبردست قسم کا فقدان ہے۔ ایک طویل مدت کے بعد اسماعیل صبری انیسویں صدی کا جدید شاعر ہے اس نے کئی حمد یہ نظمیں کہی ہیں۔ کچھ شعراء کے یہاں حمد ملتی ہیں۔ لیکن یہ کہ باقاعدہ موضوع بنایا گیا ہو۔ پورے پورے حمد یہ مجموعے ہوں اس کا فقدان ہے۔ اردو میں بھی حمد یہ شاعری

سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اسماعیل میرٹھی اور حالی کا تتبع کیا جاتا تو یہ سلسلہ توحید چل پڑتا۔

عزیز احسن: لیکن اب ہمارے ہاں حمدیہ مجموعے آرہے ہیں۔

اصلاحی: اللہ کرے کہ ایسا ہو! اللہ کرے کہ ایسا ہو!..... اچھا تھوڑی سی گفتگو میں کرنے

جار ہا ہوں لیکن اسے مسلکیت سے نہ جوڑیں..... میرے لیے سحر انصاری صاحب نے بہت پہلے ایک

لفظ استعمال کیا تھا..... ان کو یاد نہیں ہوگا۔ میں آج یاد دلا دیتا ہوں۔ پندرہ بیس سال پہلے آیا تھا

..... اس وقت شعبہ اردو میں تھے آپ [سحر انصاری]۔ میری تھوڑی سی گفتگو ہوئی تھی آپ کے

کمرے میں۔ وہاں سے ہم جب نکلے تو پروفیسر ظفر اقبال صاحب نے بتایا تھا کہ آپ نے میرے

بارے میں کہا تھا کہ بہت ہی rationalist ہیں..... پر حقیقت تو ہے کہ میں کسی مسلک کو نہیں مانتا

ہوں۔ میرا مسلک اسلام ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے اردو شعرا دو سو ڈھائی سو سالہ

عربی شاعری کو بنیاد بنائیں۔ کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا معتبر اور مستند قسم کا چہرہ متاثر ہو رہا ہے

..... بہت سی اردو نعتیہ شاعری پڑھتا ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ بخدا تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ

شاعری اگر ہمارے پیش نظر ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اس کی طرف نہیں پہنچیں گے بلکہ اللہ کے رسول

ﷺ کی اساسی حیثیت کو جس طرح قرآن نے پیش کیا ہے وہ پیش نظر ہوگی اور جہاں تک کہ آپ

نے تنقید کے حوالے سے کہا ہے۔ عربوں میں تنقید اردو سے پہلے آئی ہے..... رسالت سے قبل

عرب کے ادبی میلوں (اسواق العرب) میں تنقید کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ سوق عکاظ کی ادبی اور تنقیدی

روایات کی داستان ”مصادر الشعر الجاہلی“ میں بخوبی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ خود اسواق پر کافی لکھا جا چکا

ہے۔ عہد جدید میں بھی عربوں کو ہم پر اولیت حاصل ہے۔ کیوں کہ وہ فرنج سے واقف ہیں۔ جیسے

ہندوستان میں ہم ہندی جانتے ہیں اسی طریقے سے ہر عرب جو پڑھا لکھا اور ناقد ہے وہ فرنج ضرور

جانتا ہے۔ انگریزی بھی وہ سب جانتے ہیں۔ تو مغرب سے وہ بہت پہلے متاثر ہوئے اور ہم سے پہلے

واقف ہوئے۔ لیکن جہاں تک نعت کا حوالہ ہے۔ نعت کے حوالے سے مجھے اب تک کوئی ایسی چیز

نہیں ملتی کہ اردو میں جس طریقے سے نعتیہ تنقید آئی ہے کہ نعت کو کیسا ہونا چاہیے، اس کے مضامین

کیسے ہوں اس کی ہیئت کیا ہو، اس کی زبان کیا ہو..... میں سمجھتا ہوں کہ عربی نعت گوئی کے حوالے

سے جو عربی تنقید ہے وہ اردو کے مقابلے میں بہت طفلانہ ہے۔ لیکن جہاں تک صرف عمومی تنقید کا ذکر

ہے۔ تو وہ ہم سے بہت آگے ہیں لیکن نعتیہ تنقید کے تناظر میں ان کے یہاں کوئی کام نہیں ہوا ہے۔

عزیز احسن: سحر انصاری صاحب! آپ بتائیے یہ جو فرما رہے ہیں کہ عرب فرنج سے زیادہ

واقف ہیں۔

سحر انصاری: میرے ذہن میں ایک اور بات جو آئی۔ جو آپ نے ابھی فرمایا کہ شامل کی طرف جو توجہ ہوئی تو اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے کے جو نام حضور ﷺ کے ہیں انہیں مخالفین نے محنت، موحد، مے مد۔ تو یہ مے مد جو ہے یہ تو ایک ہاتھی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تو گویا بڑی ڈراؤنی اور ایسی غیر انسانی شبیہ حضور ﷺ کی اس زمانے میں پیش کی جاتی تھی۔ یہ الفاظ جو تھے اور بلکہ بعد میں یہ جو ملعون رشدی کا ہے اس نے بھی موہد کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تو یہ سب وہ تھا اور باز نطنی جو کلچر تھا وہاں عیسائیت کے سلسلے میں موزائک کی انہوں نے گویا وہ تجسیم جو کی حضرت عیسیٰ کی وہاں ان کے لیے بال اور ان کے زلفین اور ان کا چہرہ، نورانی ہالہ اور یہ چیزیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں تصویر کشی تو ممنوع تھی۔ اس لیے عرب شعراء نے اس پر زیادہ توجہ دی۔ کہ آپ کے شامل کو زیادہ واضح کیا جائے اور اس میں آپ ﷺ کے تمام سراپا کو انہوں نے بیان کیا۔ اور وہ روایت پھر پوری اسلامی دنیا میں پھیل گئی۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ جو صحابہ اور تابعین نے ہی دیکھا باقیوں نے تو سنا اور پڑھا اور اس پر قیاس کیا کہ زلف واللیل ہے اور چہرہ والضحیٰ ہے۔ تو ایک تو یہ صورت حال ہے۔ عزیز احسن: ایران میں تو زیادہ تر ایسی ہی شاعری ہوئی۔

سحر انصاری: جی ہاں، جی ہاں! اب جہاں تک اردو ہے۔ اس میں تو دکنی دور سے ہی نعت کے اشعار ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ہے قلی قطب شاہ ہے۔ اس کے یہاں ہے۔ پھر اس کے علاوہ جو مثنویات لکھی جاتی تھیں ان میں جو مثنویات ہندو قصوں سے ماخوذ ہیں ان میں تو نعت یا حمد نہیں ہے۔ لیکن جو مسلم معاشرے کو ذہن میں رکھ کے لکھی گئی ہیں ان میں سب سے پہلے حمد اور نعت کے ہی اشعار ملتے ہیں۔ کیوں کہ سب سے پہلی جو مثنوی ہے نظامی کی کدم راؤ پدم راؤ تو اس میں تو یہ نہیں ہے۔

عزیز احسن: معاف فرمائیے!..... مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں حمد بھی ہے اور نعت بھی ہے۔

سحر انصاری: ہاں تو الگ سے تو نہیں لیکن یہ روایت چلی کہ خود ہندو بھی مثنویاں کہتے تھے یا دیوان اپنا شروع کرتے تھے تو وہ بھی حمد و نعت اور منقبت کا اہتمام کرتے تھے..... اب جو آگے یہ سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بہت کچھ نعت گو ہمارے ہاں شاعری میں موجود ہیں لیکن سب سے اہم جو ہیں وہ مولانا محسن کا کوروی اور امیر مینائی۔ امیر مینائی کے قصائد جو ہیں وہ تو عربی سے واقف تھے اور ان کے اشعار بھی بعض جگہ عربی کے ملتے ہیں تو اس میں اس کا اہتمام ہے۔ پھر اس کے بعد محسن

کا کوروی ہیں انھوں نے بھی بہت اس میں کام کیا۔ پھر مولانا احمد رضا خان ہیں ان کے یہاں بھی۔ وہ تو آپ سمجھ لیجے کہ عربی میں بھی وہ ایک مقام رکھتے تھے۔ اور پھر اس کے بعد مولانا حالی..... یعنی وہ تو contemporary ہیں تقریباً۔ مولانا حالی اور مولانا امام رضا..... لیکن مولانا حالی نے کیوں کہ اس وقت سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے وہ اس لیے انھوں نے ان واقعات کو اور اسوہء حسنہ کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا کہ جس سے عام آدمی متاثر ہو۔

عزیز احسن: آپ نے حالی کے حوالے سے جو گفتگو فرمائی ہے اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ ہمارے حسن عسکری صاحب نے حالی پر اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے تو نبی کریم ﷺ کی ایسی صفات گنائی ہیں کہ ایسے کام تو وہ خود بھی کر سکتے ہوں گے۔

سحر انصاری: جی ہاں انھوں نے کہا کہ وہ غریبوں کا بلجا ضعیفوں کا ماویٰ..... وہ اپنے پرانے کا غم کھانے والا..... انھوں نے کہا یہ تو ہم بھی کر سکتے ہیں..... یہ لکھا انھوں نے..... لیکن بات یہ ہے کہ جو اثر ان اشعار کا ہے وہ اس کے بعد کتنوں ہی نے لکھا لیکن وہ اثر نہیں پیدا ہو سکا۔ تو بات یہ ہے کہ لسانیات میں دو رخ ہیں۔ کہ زبان کے دو رخ ہوتے ہیں synchronic and diachronic تو diachronic جو ہے تو وہ ماضی کا ادب ہے یا ماضی کی زبان ہے اور synchronic وہ ہے جو محاورہء امروز ہے۔ جو چیز محاورہء امروز میں کہی جاتی ہے اس کا زیا اثر ہوتا ہے۔ یعنی میر تقی میر کیوں اتنے تمام شعراء پر فضیلت رکھتے ہیں؟..... کہ ان سے جب کسی نے کہا کہ آپ ہمیں اپنے اشعار سنائیے تو انھوں نے کہا کہ میرے شعر آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم تو انوری اور خاقانی کے شعر سمجھ لیتے ہیں تو آپ تو ہماری زبان میں کہتے ہیں۔ تو انھوں نے کہا کہ انوری اور خاقانی کی شرحیں لکھی جا چکی ہیں، میری کوئی شرح نہیں لکھی گئی ہے۔ میری شاعری کو سمجھنے کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا پڑتا ہے۔ تو گویا Sochiology of Language اس کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے چوں کہ سرسید نے کہا تھا کہ ہم استعارات خیالی سے گریز کر کے وہ زبان لکھیں کہ جو دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ حالاں کہ وہ از دل خیزد بردل ریزد بھی کہہ سکتے تھے مگر اس کو انھوں نے اس آسان زبان میں ترجمہ کر کے وہ بات کہی۔ اس کو حالی نے اپنایا اور اس طرح وہ مسدس آسان زبان میں لکھی کہ جو ہر شخص آسانی سے پڑھ سکے۔ ہمارے خود لڑکپن میں قرآن کریم کی تلاوت کے بعد حالی کی مسدس ضرور پڑھی جاتی تھی۔ اس لیے کہ اس میں جس طرح انھوں نے بنایا کہ.....

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلادی
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہء کیمیا ساتھ لایا

تو یہ چیزیں جو ہیں یہ تو اور پھر حالی کے بارے میں اس طرح تنقید کے حوالے سے میں کہنا چاہوں گا کہ کئی ہمارے انگریزی داں، فرانسیسی داں اور بڑے مغربی علوم کے ماہرین نے یہ کہا کہ سرسید انگریزی سے نابلد تھے۔ سنی سنائی باتوں پر تکیہ کیا انھوں نے۔ میں نے ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ اس کے بعد کئی لوگ مغرب میں بھی گئے۔ بیشتر زبانیں بھی مغرب کی جانتے ہیں۔ پی ایچ ڈی بھی ہیں اور بڑی بڑی انھوں نے اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ لیکن آج تک حالی نے جو مقدمہ، شعر و شاعری لکھ دیا ہے اس سے باہر نہیں نکلے۔ کیوں کہ اس میں کہا ہے انھوں نے کہ شاعری کا اثر سوسائٹی پہ کیا ہوتا ہے؟..... سوسائٹی کا اثر شاعری پہ کیا ہوتا ہے..... اور پھر آورد کیا ہے اور آمد کیا ہے۔ شاعری کے اثرات کیا ہوتے ہیں۔ اس سے باہر کوئی نہیں نکلا آج تک۔ مثالیں بدل سکتے ہیں آپ۔ لیکن فریم ورک جو ہے وہ وہی ہے۔ تو اس لحاظ سے حالی کی مسدس کے بعد پھر اقبال کا بڑا اہم نام ہے۔ انھوں نے فارسی میں تو بہت کچھ لکھا۔ لیکن اردو میں بھی ان کے جو ہیں وہ اشعار:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اور پھر اردو میں بھی کہ اگر بہت سے لوگ اس کو مانتے نہیں لیکن نعت ہی ہے یہ:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

تو یہ سب ہے اور پھر اس کے بعد..... وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے..... یہ تو میں اکثر مثال میں پیش کرتا ہوں کہ بہت سے لوگ ”سبل“ کے معنی بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ لیکن انھوں نے پیش اور لام کی تکرار سے جو غنائیت پیدا کی ہے وہ کمال کا مصرع ہے یہ۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیء سینا

تو یہ جب معیار ہو اس کے بعد پھر اس قسم کی نعت کہ..... میں سو جاؤں یا مصطفیٰ کہتے

کہتے..... ارے بھی مصطفیٰ ﷺ تو جگانے کے لیے آئے تھے۔ تو اس قسم کی جو نعت ہے.....
 عزیز احسن: معذرت کے ساتھ میں عرض کروں گا کہ اس کا تناظر ذرا مختلف ہے۔ سونے سے
 موت اور جاگنے سے حشر میں اٹھنا مراد ہے۔

سحر انصاری: وہ تو ہے مگر وہی بات تنقید والی!..... تو اس کی گرفت ضروری ہے جناب۔ وہ
 جو ہے..... وہ بجلی کا تڑکا تھا یا صوتِ ہادی..... وہاں سونے کا سوال نہیں ہے۔
 اصلاحی: میں ایک شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سو گئے تھے جتنے سود و زیاں کے فتنے

نیند بہتر ہے کہیں عالم بیداری سے

عزیز احسن: یہ تناظر بدل گیا۔ یہ سب ہے لیکن نعت کے حوالے سے جو تنقید شروع ہوئی ہے،
 جس میں تھوڑا سا کام میرا بھی ہے۔

سحر انصاری: بہت ہے آپ کا کام۔

عزیز احسن: تو ہمیں نعت کے حوالے سے جو مروجہ تنقیدی نظام آیا ہے، پورا کا پورا۔ اس میں
 سے کس خاص نظام سے نعتیہ ادب کی تنقید کو منسلک ہونا چاہیے۔ یہ بات آپ ہی بہتر بتا سکتے ہیں۔
 سحر انصاری: دیکھیے ایک تو یہ تھا کہ ہمارے ادیب رائے پوری صاحب نے کچھ اس طرح کی
 کوشش کی تھی..... لیکن جدید انداز میں حقیقت یہ ہے کہ آپ نے، ابوالخیر کشفی صاحب نے اس پر
 زیادہ توجہ دی ہے۔ اس کے بعد ہمارے ابوسفیان اصلاحی صاحب نے۔ بعد نہیں کہہ رہا ہوں یقیناً
 انہیں بھی فضیلت حاصل ہے۔ یہ تین اہم نام ہیں۔ سب سے پہلے تو حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ
 مبارک کو اس طرح کہ ”رفعنا لک ذکرک“ تو اس کے بعد کس کی مجال ہے کہ جو ان کے ذکر کو مزید
 بڑھائے۔ کا ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد است

لیکن یہ کہ سوئے ادب کے بعض اتنے پہلو نکلتے ہیں اور لوگ جو ہیں وہ اپنے حال اور وجد کی
 کیفیت میں اور بہت زیادہ سرشاری کی کیفیت میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ پھر کچھ
 تصوف کے لوگوں نے..... کہ احمد اور احد میں میم کا پردہ ہے اور یہ کہ اس قسم کی باتیں بھی آئیں
 کہ جن کو بعض لوگ نہیں سمجھ سکے۔ جن تک یہ چیزیں نہیں پہنچی تھیں انہوں نے اس کو استعمال کیا۔ پھر
 بھکتی تحریک نے بھی نعتیہ شاعری کو خاصا مجروح کیا..... میں تو یہ کہوں گا۔ کہ رام اور رحیم ایک ہے۔ یہ
 بھکتی تحریک کی تعلیمات میں شامل ہے۔ تو اس لحاظ سے اب جو ہمیں نعت کی تنقید کی طرف توجہ دینی

چاہیے اس میں زبان، بیان، اسلوب اور پھر جو ضعیف روایات ہیں، ان کو جو لوگ نظم کرتے ہیں، ان سے گریز کرنا چاہیے اور اس کی ضرورت نشاندہی کرنی چاہیے۔ پھر یہ کہ یہ جو چیز چلتی ہے کہ فلمی گانوں کی طرز پہ نعتیں لکھی جاتی ہیں اسکی مذمت ہونی چاہیے۔ پھر یہ بات کہ ہم نے ہندو کلچر سے یہ چیز لی ہے۔ وہاں نند لال کے لیے کہا جاتا ہے جو جھولا جھول رہا ہے۔ اور ماتا میں نہیں مکھن کھایو..... قسم توری ماتا میں نہیں مکھن کھایو..... تو وہ تو مکھن چور ہے۔ اب آپ نے اس کے لیے کہ جھولا جھلائے محمد کو..... اس قسم کی چیزیں جو ہیں یہ میرا خیال ہے کہ سوئے ادب کے زمرے میں آتی ہیں۔ تو اس حساب سے تنقید کو ایک سطح کے ساتھ رکھنا چاہیے اور اس کے کچھ اصول متعین ہوئے بھی ہیں۔ لیکن مزید اصول متعین ہوں کیوں کہ جب تک Principles of Criticism سامنے نہیں آئیں گے Theory of Criticism اس وقت تک عام آدمی اس کی پیروی نہیں کر سکے گا۔ تو اس کی بھی ضرورت ہے۔

اصلاحی: مسدس کا بار بار ذکر آیا۔ مسدس کے حوالے سے سرسید کی ایک بات ضرور نقل کی جائے گی۔ سرسید نے یہ کہا تھا کہ جب قیامت میں مجھے اٹھایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ کیا لائے ہو تو میں اللہ سے یہ کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا کے لایا ہوں۔
مشترک آوازیں: یہ تاریخی جملہ ہے۔

اصلاحی: شاعری کے حوالے سے ہمارے جذبی صاحب کی جو کتاب آئی ہے ”حالی کا سیاسی شعور“ سحر انصاری: جی ہاں، جذبی صاحب کی کتاب..... بہت عمدہ۔ بہت عمدہ!
عزیز احسن: پروفیسر انوار احمد زئی تشریف فرما ہیں۔ نعت کے حوالے سے آپ TV پر بھی بہت گفتگو فرماتے رہتے ہیں اور ان سے ہم استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ان سے جاننا چاہیں گے نعت رنگ میں جو ہم نے تنقیدی سلسلہ شروع کیا ہے اس ضمن میں ان کی کیا رائے ہے اور تنقید نعت کے حوالے سے ان کے نظریات کیا ہیں؟

پروفیسر انوار احمد زئی: بسم اللہ الرحمن الرحیم..... یہ تو یقیناً تمام لوگوں کے ساتھ زیادتی ہے کہ دو انتقادی اور دو مستند پروفیسرز کے بعد مجھے کچھ عرض کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ لیکن میں ربط قائم کرنے کی کاوش کروں گا۔ اس میں اضافے کا میری طرف سے کچھ دعویٰ نہیں ہو سکے گا..... اور ہو بھی نہیں سکتا..... اور یوں بھی میں اکتساب کے لیے یہاں حاضر ہوں۔ امتحان کے لیے اور تحدیث کے لیے۔ کوئی تنقید کے لیے یا اضافے کے لیے نہیں..... ایک تو میں یہ عرض

کرنا چاہتا ہوں ڈاکٹر عزیز احسن صاحب! کہ جس طرح سحر بھائی نے فرمایا اور ڈاکٹر اصلاحی نے بھی اعتراف کیا..... کہ آپ نے جو نعت کے تعلق سے تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے یہاں سامنے بیٹھ کر تعریف کرنے کی بات نہیں ہے..... یہ ایک حوالہ بن گیا ہے..... اور آپ نے کمال یہ کیا ہے کہ جس طرح ڈاکٹر (اصلاحی) صاحب نے ابھی عربی نعت اور حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے نعت کی صورت گری فرمائی ہے۔ آپ نے اپنے تحقیقی مقالے میں اس کا بہت مربوط مضبوط اور متاثر کن حوالہ دیا ہے..... اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں اور صحیح طور پر یاد کر پارہا ہوں آپ کے ان حوالوں کو اور دیگر لوگوں کے۔ تو ڈاکٹر (اصلاحی) صاحب! جس طرح آپ نے فرمایا کہ حضور ﷺ کی آمد سے پہلے بھی نعت کا سلسلہ تھا۔ تو نعت کا تو مفہوم پہلے قابل ذکر شخصیت کے حوالے سے کوئی قابل ذکر بات کو یا نظم کرنا یا بیان کرنا تھا۔ لیکن بات یہ ہوئی کہ جب حضور تشریف لائے تو کوئی اور قابل ذکر رہا نہیں۔ اور اس اعتبار سے جب لوگوں نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے نعت کو آپ ﷺ کی توصیف اور ثنا اور تعریف اور شائے اور بیان و کردار و عمل کا حوالہ بنایا، بنیاد جب انھوں نے مرتب کی تو پھر یہ منسوب ہو کر نسبت پا کے حضور ﷺ سے نعت جو ہے وہ پھر آپ ﷺ ہی کے لیے مخصوص ہو گئی۔ جس طرح حمد، اللہ رب العزت کے لیے ایسے نعت حضور ﷺ کے لیے ہو گئی۔ تو ایک کمال بات یہ کہ نعت کو یہ انتہائی عروج..... اوج ثریا پہ پہنچی تو آپ ﷺ سے نسبت اس کو مل گئی۔ اب نعت جو کہیں گے تو وہ پرانا والا Diction نہیں آئے گا کہ جو قابل ذکر ہے اس کی کوئی قابل ذکر بات۔ نہیں اب تو نعت صرف آپ ﷺ کا حوالہ بن گئی۔ ایک تو یہ بہت اہم بات ہے۔ دوسری بات یہ کہ..... سرسید کے تعلق سے میں عرض کروں۔ میں نے ایک جگہ کہا تھا۔ سحر بھائی شاید موجود تھے۔ کہ وہ جو اکابر سرسید سے واقف ہیں انھوں نے سرسید کی آدھی تصویر پیش کی ہے۔ انگریزی تعلیم اور اخلاقیات اور یہ سب جو ہم کہہ دیتے ہیں۔ اصل میں تو انھوں نے یہ کہا تھا کہ اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلو اور مگر اپنی روایت سے اور دین سے اور جو مذہبی رویہ اس سے بے خبر نہ رکھنا۔ ان کے مخطوطات میں ہے یہ۔ بے خبر نہ رکھنا..... اور اگر ایسا کیا تو تم دیوانے کے ہاتھ میں تلوار دو گے۔ تو ایسی صورت میں آپ پھر آجائے ان کی طرف کہ جو انھوں نے کام کیا اور پھر جو حالی کے بارے میں انھوں نے ناز سے یہ بات کہی ہے کہ حالی سے لکھوالا یا ہوں مسدس۔ یہ ان کی اس مرتب ذہنی کا بھی ثبوت ہے کہ وہ کس طرف آرہے تھے۔ جس کو ہم نہیں سمجھ پاتے اور بڑی آسانی سے ان کو ایک خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ پھر ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر میں بغرض اصلاح یہ بات کروں اپنے

لیے..... کہ سعدی کا جو کام ہے اس کام میں جو اخلاقیات ہے اور ان کی نسبت بھی ہے، وہ اگر سامنے نہیں آتی تو میرا خیال یہ ہے کہ حالی مسدس نہیں لکھتے۔ یہ ایک تسلسل کا نام ہے۔ یعنی جہاں انھوں نے گلستان و بوستان والی بات کی تو بوستان سے تو ڈپٹی نذیر احمد کی اصلاحی تحریک آتی ہے..... توبۃ النصوح ہو، یا بنات النعش ہو، یا مراۃ العروس ہو..... اور دوسری طرف جو گلستان کا تسلسل ہے وہ میرے خیال میں حالی کی اس کیفیت کا آرہا ہے جس کا حوالہ دیا ابھی سحر بھائی نے۔ تو اس میں ایک تاریخ بھی ہے، ترتیب بھی ہے۔ تہذیب بھی ہے، تعلیم بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عقیدے کے تعلق سے حضور ﷺ کی ذات گرامی کی تصویر بھی ہے۔ تو یہ ایک تسبیح کی صورت یہ دانے جو ہیں وہ ایک ڈوری میں پروئے گئے ہیں..... ان کا اگلا تسلسل میں یہ سمجھتا ہوں کہ اقبال ہیں۔ اور اقبال کی جو نظمیں جس طرح سحر انصاری صاحب قبلہ نے اپنی گفتگو میں حوالہ دیا وہ اپنی جگہ۔ مگر ایک لفظ یا اصطلاح ابھی گفتگو میں آئی تھی ”آمد“ اور ”آورد“ تو میں یہاں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ ٹھیک ہے ع آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں..... غالب صریح خامہ نوائے سرودش ہے..... لیکن بعض چیزوں کے لیے اپنے ذہن کو مرتب بھی کرنا پڑتا ہے اور غالباً نعت کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ نعت کے لیے جب آپ ایک مرکزیت کو سامنے رکھ کے اور تصور کو آمیز کر کے اور پھر مرتب کرتے ہیں اپنے خیال کو اور منظوم کرتے ہیں تو یہ آورد ہی کا انداز ہوتا ہے۔ توصیف اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عنایت ہے وہ اپنی جگہ لیکن آپ کی جو کاوش ہے وہ ادھر ڈالتی ہے۔ پیراڈائز لاسٹ کی بات کرتے ہیں جون ملٹن کی تو وہ آمد ہے۔ لیکن جب پیراڈائز ریکیں اس نے لکھی تو وہ آورد ہے۔ بچنے کے لیے لکھی ناں! سوچ کے لکھی ناں! جواب میں لکھی ناں! لیکن اقبال کے تعلق سے میں یہ سوچتا ہوں..... پھر قابل اصلاح میری سوچ ہے..... کہ شکوہ جو ہے وہ آمد نہیں ہے وہ آورد ہے۔ جواب شکوہ شاید آمد ہے۔ اس لیے کہ جواب شکوہ انھوں نے پہلے سوچا لیکن وہ کہنے کے لیے وہ فضا نہیں تھی۔ فضا میں پہلے وہ ہم زبان ہوئے لوگوں کے جو بہت ساری تشکیک کی باتیں ذہن میں رکھتے تھے۔ ان کے ہم آواز ہونے کے بعد جب لوگوں نے کہا ہاں واقعی یہ بات تو ہے..... جرات آموز مری تابِ سخن ہے مجھ کو۔۔۔۔۔ شکوہ اللہ سے خاتم بدہن ہے مجھ کو

تو لوگ جب ان کی طرف متوجہ ہوئے تو پھر انھوں نے وہ بات کہی جو وہ کہنا چاہتے تھے.....

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں۔

احسن: نعت کے حوالے سے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے ع سوئے قطاری کشم ناقہء بے زمام را..... یہ تصور ہر نعت گو کا رہا ہے یا رہنا چاہیے جو نعت کو عملی زندگی میں رائج کرنا چاہتا ہے۔ اور مسلمانانِ عالم کو حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے قریب رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی نعت میں جو پیغام کی بات ہے وہ ضرور پیش نظر رہے۔

انوار احمد زئی؛ ڈاکٹر صاحب! میں عرض کروں کہ نعت ایک کل کا نام ہے۔ اور میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ کو نقد و نظر کے پیمانے بھی بدلنے پڑیں گے جب آپ تنقیدِ نعت کی طرف آئیں گے۔ اس میں بھی آپ کو یہ سوچنا پڑے گا کہ کون کون سے پہلو عمومی تنقید کے ہو سکتے ہیں اور نعت کے لیے کون سے خصوصی پہلو تراشے جائیں جو کہ نقد و نظر کے منصب پر پورے اتریں..... اور جس طرح کہ ڈاکٹر اصلاحی نے ابھی فرمایا تھا کہ اس وقت کے جو شعراء تھے انھوں نے جو باتیں کیں جو نظم کے موضوعات بنائے۔ نعت کے موضوعات بنائے۔ بعد کے آنے والوں نے نہیں بنائے۔ تو ایک تو یہ ہے ناں کہ وہ بنا سکتے تھے۔ اس لیے کہ بقول آپ (اصلاحی) کے وہ دیکھ رہے تھے۔ وہ شاہد تھے، وہ گواہ تھے۔ بعد کی جتنی بھی نعتیں ہوئی ہیں وہ ہم پہلے سے کہے گئے خیال کو پھر سے مرتب کر کے بیان کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تو ذاتی مشاہدہ تھا وہ بیان کر رہے تھے، نظم کر رہے تھے۔ یہاں پھر ہم سوچتے ہیں کہ وہ کیا ہوں گے اور اس انداز میں کہتے ہیں کہ ع کیا ہوں گے حضور!!! تو میں یہاں بات ختم کرنا چاہ رہا ہوں کہ اس عہد میں نعت کے تقاضے بھی بدلے ہیں۔ نعت کہنے والوں کے انداز بھی بدلے ہیں..... اور نعت کے مخاطبین جو ہیں وہ بھی بدلے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ہمیں عصری اور عہد کے اعتبار سے فرق نظر آتا ہے۔ اور یہ جو نعت کے تقاضے بدلے اس میں شاید ایک بات یہ بھی کہ لوگ تسلیم کر رہے ہیں..... جس طرح آپ (عزیز احسن) نے غیر رسمی گفتگو میں فرمایا تھا کہ اللہ کے کلام کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ غالباً وہ لوگ کہ جو اس دائرے میں نہیں ہیں وہ بھی اب تسلیم کر چکے کہ اللہ کے کلام کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے اس لیے وہ غیر مبدل ہے وہ بدلا نہیں جاسکتا۔ لیکن اگر اس عقیدے پر کامل ایمان رکھنے والوں کو تشکیک کے مرحلے تک لانا ہے متزلزل کرنا ہے تو وہ جو حب رسول ﷺ کی نعمت انھیں نصیب ہوئی ہے اس کو کم تر کر دیا الگ کر لو۔ تو یہ خیال جن لوگوں کو ہوا ہے وہ اس کو مضبوط کرنے کے لیے مربوط کرنے کے لیے نعت کو مضبوط کر رہے ہیں۔

عزیز احسن: اصل میں حب رسول ﷺ کی بہت ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ بغیر حب رسول ﷺ کے معاشرے میں وہ اقدار پروان نہیں چڑھ سکتیں جو حضور ﷺ نے پیدا فرمائی ہیں یا جو

راج فرمائی ہیں۔

احسن: آپ کچھ فرما رہے تھے..... ڈاکٹر اصلاحی صاحب!

اصلاحی: دیکھیے سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ میرا یہ خیال بہت قابل لحاظ اور قابل اعتنا نہ ہو..... ابھی آپ (احمد زئی) نے شیخ سعدی کی اخلاقیات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے یہ کہا کہ حالی کے یہاں اس کا تاثر پایا جاتا ہے۔ اس سے متاثر ہوئے حالی۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ مسدس حالی کے نیچے ”مد و جزر اسلام“ لکھا ہوا ہے۔ شیخ سعدی کے ہاں یہ چیز نہیں ہے۔ اخلاقیات ضرور ہے لیکن یہ احساس ارتقا ہے۔ آپ پوری تاریخ اسلام مسدس حالی میں پڑھ سکتے ہیں۔ دیکھیے! لمبا مضمون لکھنا آسان کام ہے۔ لیکن اس میں سلاست ہو، شاعری میں کمال ہو وہ بالکل ایسی زبان میں گفتگو کرے کہ معاشرہ سمجھ لے بڑا دشوار کام ہے۔ حالی کے بارے میں یہ بات بڑے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے پوری تاریخ اسلام کو بڑے سلیقے سے پڑھا تھا۔ کم از کم یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ انھوں نے تاریخ اسلام کو بگاڑا ہے۔ اس کے Style پر گفتگو ہوتی ہے لیکن اگر حالی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ انھوں نے کسی سے متاثر ہو کر مسدس لکھی۔ تو میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔

انوار احمد زئی: وہ تسلسل ہے۔

اصلاحی: تسلسل بھی نہیں۔ سعدیات کا بالکل تسلسل یہاں نہیں ہے۔ میں یہ کسی تامل کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ یہ مسدس حالی کا اپنا کام ہے۔ سرسید کا بھی اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ سرسید کا دخل صرف اتنا تھا کہ جس زبان کو وہ آسان، سلیس اور باقاعدہ معاشرے کی ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ یعنی سوشل اسٹائل ہو۔ وہ حالی نے ان سے ضرور لیا تھا۔ اسٹائل انھوں نے سرسید سے لیا اور مسدس کے مفہوم، مباحث ان کے ذاتی مطالعے کا حصہ تھے۔ ایک بات تو میں یہ کہنا چاہوں گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سحر انصاری صاحب نے جو یہ بات کہی ہے کہ جب ہم نعت کے حوالے سے تنقید کی گفتگو کرتے ہیں تو اس بات کو یعنی مسلک کو ہم چھوڑیں۔ یقین جانے جب تک مسلک کو آپ نہیں چھوڑیں گے۔ صحیح تنقید نہیں لکھ سکتے۔ نعت کے بارے میں تنقیدی اصول کیا ہوں۔ اس کے قواعد کیا ہوں۔ اس مرحلے پر مسلک کو بھول جائے۔ اس کے بعد ہی صحیح طریقے سے ہم کچھ کہہ سکتے ہیں۔ معجزوں کے غیر محتاط بیان کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ حضور اکرم ﷺ کی شخصیت کا استخفاف ہوا ہے۔ میرا جہاں تک خیال ہے۔ تو ان تمام چیزوں کو بھی point out کیا جائے۔ دیکھیے پیغامات ہر

زمانے کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ قرآن ہر زمانے کے لیے ہے۔ تو ہم عصر حاضر سے قرآن کریم اور اللہ کے رسول ﷺ کو بھی relate کر سکتے ہیں۔ علم باطن کا تصور تفاسیر، صوفیہ کرام اور نعت گو شعرا کے یہاں بہت ہے۔ اس طرح کی باتیں کی جائیں گی تو اللہ کے رسول ﷺ کی ذات پر بھی چھینٹے آئیں گے اور قرآن پر بھی۔ کیوں کہ قرآن کریم اور اللہ کے رسول ﷺ کا کوئی پہلو مخفی نہیں ہے۔ قرآن میں خود آیا ہے..... كِتَابٌ فَصَّلْتُ اٰيٰتُهُ..... یعنی قرآن کریم کے تمام مباحث واضح ہیں کیوں کہ یہ کتاب مبین ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ اسی توضیح و تفسیر کے لیے آئے تھے۔ قرآن، عربی و مبین میں آیا تھا اور اس کو اللہ کے رسول ﷺ نے پوری طرح سے واضح کر دیا۔ اسی لیے قرآن کریم میں جو ”فَاَصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ“ (تو تم کھول کھول کر بیان کر دو) آیا ہوا ہے اور اسی مفہوم کی صراحت یوں بھی کی گئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ط۔ یعنی اب تکمیل دین کے سلسلے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا گویا اللہ کے رسول ﷺ کی ذات اور قرآن کریم کے تمام پہلو پوری طرح مبرہن ہیں۔ تو نعتیہ ادب میں ہم یہ اصول بنائیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کو اس طرح پیش کیا جائے کہ جیسے وہ ہیں۔ تقاضے اور لفظیات و اسلوبیات بدلتے رہیں گے۔ لیکن ان تقاضوں میں کوئی ایسی چیز نہ آئے کہ جس سے اللہ کے رسول ﷺ کی ذات پر حرف آئے۔ یہ خاص طور سے نعت گو شعراء کے پیش نظر رہے۔

عزیز احسن: ڈاکٹر صاحب! اس میں ایک پہلو.....

انوار احمد زئی: میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ آپ (اصلاحی صاحب) کا فرمایا مستند ہے۔ لیکن اس کے باوجود سعدی کے ہاں ہے..... (بلغ العلیٰ بکمالہ) تو اشارہ تو ہو گیا ناں۔ یہ 580 ہجری میں پیدا ہوئے تھے اور ایک سو گیارہ سال جیئے۔ تو ان کا عہد اور ان (حالی) کا عہد بہت مختلف ہے۔ لیکن میں نے اس لیے یہ بات کہی کہ جو پہلو سارے کے سارے ان کی اخلاقیات میں آئے ہیں۔ وہ اخلاقیات آئینہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے اس پوری تحریک سے دو ہی متاثر ہوئے ہیں نثر میں ایک، نظم میں ایک۔ میں نے تسلسل کہا یہ نہیں کہا کہ وہ متاثر تھے۔

عزیز احسن: جناب! نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے جس مسلمان نے بھی کچھ کہا ہے اس کا تسلسل چل رہا ہے۔

انوار احمد زئی: جی فکری تسلسل!

اصلاحی: ابن خلدون نے فلسفہ عمرانیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے مقدمہ میں کہا ہے کہ

تہذیبی تسلسل میں ہر آدمی کا کچھ نہ کچھ contribution ہوتا ہے۔ تمدن نام ہی اسی کا ہے۔ ثقافت ایک طویل تواتر کے بعد آتی ہے، مختلف اقوام کے اپنے اپنے کارنامے ہوتے ہیں۔
عزیز احسن: شاہ ولی اللہ نے ارتقا قات کے حوالے سے بات کی ہے۔ وہ بھی تسلسل ہی کی بات ہے۔

اصلاحی: حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے یہ بات کی ہے۔ اگر اس کے مضامین پیش نظر ہوں تو ہم اپنے نعتیہ اصول کی تخلیق میں صحیح خطوط پر ہوں گے۔

عزیز احسن: جی ہاں۔

اصلاحی: ابھی گفتگو جو آئی تھی، سرسید کی انگریزی تعلیم کے حوالے سے..... عام طور سے سرسید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قوم کو انگریز بنانا چاہتے تھے۔

عزیز احسن: جی کر شان!

اصلاحی: یہ صداقت اور دیانت کے برعکس ہے..... خاص طور سے میں یہاں جمال الدین افغانی کا حوالہ دوں گا کہ جمال الدین افغانی جیسا جہاں دیدہ انسان بھی بغیر پڑھے سرسید پر تبصرہ کرتا ہے کہ سرسید فرقہ و نیچریہ کے بانی ہیں۔ میں یہ بات کہتا ہوں کہ اگر جمال الدین افغانی، سرسید کو پڑھتے تو ہرگز یہ بات نہیں کہتے۔ ان کا جو رسالہ ”العروة الوثقی“ ہے۔ اس میں انھوں نے سرسید کے بارے میں اتنی غلط بات کہی ہے کہ سرسید نے ایک ادارہ ہندوستان میں قائم کیا ہے جو طلبہ کو عیسائی بنانے کے لیے سرگرم ہے۔ اس کے بعد ایک پوری chain ہے کہ عربوں کے یہاں بھی سرسید کے بارے میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ سرسید نے مدرسہ کی بنیاد ڈالتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ہم بچوں کو انگریزی پڑھائیں گے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنی تہذیب اور اپنی روایت کو کسی قیمت پہ نہیں چھوڑیں گے۔ جس طریقے سے دیگر سائنسز اور دیگر علوم کے شعبے تھے اسی طرح پہلے دن سے باقاعدہ عربی، فارسی اور اسلامی علوم کے شعبے تھے۔ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ پہلے ہم یہ چاہیں گے کہ ہمارے بچوں کو مذکورہ زبانوں پر عبور ہو اگر ایسا نہ ہو تو اپنی روایات سے کٹ جائیں گے۔ اپنی ثقافت سے بہک جائیں گے۔ میں نے ابھی دس صفحے کا مضمون ”سرسید کا ثقافتی تصور“ اور دس صفحے کا مضمون ”سرسید کا دینی تصور“ تحریر کیے ہیں۔ ان مضامین میں، میں نے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کیا تھے۔ یعنی ان کے ثقافتی اور دینی تصورات دین اسلام سے پوری طرح جڑے ہوئے ہیں۔ وہ تمسک بالکتاب اور اعتصام بحبل اللہ سے پوری طرح واقف تھے۔ انھوں نے تہذیب الاخلاق میں بین

الاقوامی تقاضوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔

انوار احمد زئی: ڈاکٹر صاحب انھوں نے یہ تک لکھا ہے کہ اگر یہ کچھ نہیں کیا تو تمھاری قبروں میں تمھاری ہڈیاں چنچیں گی اور تم کچھ نہ کر سکو گے!

عزیز احسن: اصلاحی صاحب کو جانا بھی ہے۔ لیکن میں ایک اور چھوٹی سی بات کرنا چاہتا ہوں..... سحر انصاری صاحب! میرا تصور یہ ہے کہ دو قسم کے لٹریچر ہیں۔ ایک معلوماتی اور دوسرا تاثراتی۔ Literature of Power اور Literature of knowledge۔ نعت دونوں کا امتزاج ہے۔ تو ہمیں Literature of knowledge کے حوالے سے کس قسم کی تنقید کی ضرورت ہے اور Literature of Power کے حوالے سے کس قسم کے لٹریچر کی ضرورت ہے؟

سحر انصاری: ظاہر ہے کہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زبان کا مسئلہ کتنا اہم ہے اور اب جو اردو زبان بھی دوسری زبانوں کی طرح بحران کا شکار ہو رہی ہے کہ جب سے یہ موبائل آیا ہے۔ ای میل آیا ہے۔ کمپیوٹر آیا ہے۔ انٹرنیٹ آیا ہے۔ تو الفاظ کی تحریر سے ہماری نسلیں دور ہوتی چلی جا رہی ہیں..... اور بہت عرصہ نہیں گزرے گا کہ آنے والی نسلیں اردو کے رسم الخط کو بھی پوری طرح سے ادا نہیں کر سکیں گی۔ لکھ سکیں گی۔ ایک طرف تو اشتہارات ہیں۔ کہ جو کچھ میٹھا ہو جائے جیسے چھوٹے چھوٹے لفظ بھی رومن میں لکھے جا رہے ہیں۔ پھر جتنے بھی پیغامات موبائل سے جا رہے ہیں وہ سب رومن میں جا رہے ہیں۔ تو ایک تو یہ بہت ہی alarming بات ہے کہ جب زبان ہی آپ کی اس level پر اس سطح پر نہیں رہے گی جس سطح پر آپ ان مضامین کو ادا کر سکیں کہ دوسروں تک اس کا ابلاغ ہو سکے تو ہر بات جو ہے وہ ایسی ہو جائے گی کہ صدا بھرا۔ ایک تو سب سے پہلے زبان کا مسئلہ ہے جس پر ہم کو سوچنا چاہیے کہ ہم اس کے لیے کس سطح پر کیا کام کر سکتے ہیں۔ کیوں کی نعت کی زبان بھی کوئی مقررہ زبان نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ قرآنی تلمیحات آتی ہیں۔ اس لیے جب تک ہمارے نوجوان ان سے واقف نہ ہوں۔ اور جس جس طرح سے حضور ﷺ کا تذکرہ قرآن میں ہوا ہے..... تو وہ پوری طرح اس کو سمجھ نہیں سکیں گے..... اور ان کے لیے آپ جو تنقید لکھیں گے وہ ایسی ہوگی کہ اس کو وہ پوری طرح نہیں سمجھ سکیں گے۔ اب جو فیشن ایبل رجحان ہے وہ تو یہ ہے کہ صاحب، لاکاں اور دریدا اور اسٹرکچرلزم اور پوسٹ ماڈرن ازم۔ اب پوسٹ ماڈرن ازم کا تو معاملہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی روایت کو تاریخ کو کسی سند کو مانتے ہیں نہیں ہیں۔ تو اب اس صورت میں جب

ذہنوں کی اس طرح تیاری ہو رہی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کلن جدید لذیذ تو بچے تو اسی کی طرف دوڑ رہے ہیں پھر۔ تو اس کو پہلے تو رد کرنا چاہیے۔ ان دلائل کے ساتھ کہ جس سے معلوم ہو کہ..... جس طرح روایت کی بات تھی، تسلسل کی بات تھی۔ تو ٹی ایس ایلٹ نے بہت اچھی بات کہی ہے Tradition اور Orthodoxy میں فرق ہونا چاہیے۔ روایت اور قدامت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ روایت جو ہے وہ کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ کبھی ایسے اوجھل ہو جاتی ہے جیسے دریا پہاڑ کے پیچھے آ گیا ہے لیکن ختم نہیں ہوا ہے۔ تو ہر نسل اس روایت کو اپنے شعور کے مطابق دریافت کرتی ہے۔ تو اس روایت کو ہمیں اس عہد میں دریافت کرنا ہے جو پندرہ سو سال سے چلی آرہی ہے اور اس سے پہلے سے بھی۔ اس لیے کہ جب قصائد میں وہ پوری روایتیں آرہی ہیں (ظاہر آپ اس کو زیادہ جانتے ہیں) کہ ٹھہر جاؤ اس خرابے کے پاس..... تو یہ بانٹ سعاد جو ہے اور یہ ساری باتیں تو جاہلیہ ہی سے چلی آرہی ہیں۔ تو تسلسل روایت کا ہے۔ قدامت کا نہیں ہے۔ تو اس کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

عزیز احسن: میں نے یہ عرض کیا تھا کہ D QUENCY نے literature of knowledge اور literature of power دو قسم کے ادب کہے تھے۔ یہ دونوں علاحدہ علاحدہ ہیں۔ جو معلوماتی ادب ہے وہ تو یہ ہے کہ آپ کو ایک خبر دیدی۔ لیکن ہمارے ہاں نعت میں تو حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے خبر بھی دی جاتی ہے اور تاثر بھی پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نعت کو مؤثر ادب اور معلوماتی دونوں قسم کے ادب کا میں امتزاج سمجھتا ہوں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟

اصلاحی: امتزاج تو ہے لیکن اس دور میں خاص طور سے knowledge کے بغیر کوئی بات نہیں کی جانی چاہیے..... ابھی یہاں حب رسول ﷺ کا ذکر آیا۔ اسی مانج کے حوالے سے عرض داشت ہے کہ ایک حب رسول ﷺ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ایک عشق رسول ﷺ کا۔ حب رسول ﷺ کا سارا تعلق مانج سے ہے۔ عشق رسول ﷺ کا تعلق مانج سے نہیں ہے۔ میں یہاں ایک مضمون کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے توقع ہے کہ سحر انصاری صاحب کی نظر سے hundred percent گزرا ہوگا۔ عشق کے عنوان سے تقریباً تیس بیچ کا مضمون خلیل الرحمان اعظمی کا ہے۔ میری ناقص نگاہ میں ایسا مضمون آج تک نہیں لکھا گیا..... اسے ضرور پڑھا جائے۔ بے پناہ عالمانہ قسم کا مضمون ہے۔ کیوں کہ خلیل الرحمان اعظمی عالم آدمی تھے۔ دوسری بات۔ خاص طور پر میں عزیز احسن صاحب سے کہنا چاہوں گا کہ جب آپ نعت کے اصول، قواعد و ضوابط پر گفتگو کریں تو معروف کتاب ”دین کا قرآنی تصور“ ضرور پڑھیں یہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی کتاب ہے جس میں hundred

صفحات انہوں نے عشق پر لکھے ہیں۔ عشق کیا ہے اور حب کیا ہے۔ اس کتاب کی مدد سے اس میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ پورے قرآن کریم میں کہیں بھی عشق کا لفظ نہیں آیا ہے۔ بس قرآن یا سرورِ کونین ﷺ کی ذات سے جو ہمارا تعلق ہو اس میں علم ضرور شامل ہو ورنہ ہم بھٹک جائیں گے۔ اللہ کے نزدیک علمی تقویٰ ہی معتبر ہے اگر متقی بے علم ہے تو اس کا بھٹکنا ناگزیر ہے۔ اس لیے قرآن میں بار بار تفکر اور تدبر کی بات کہی گئی ہے۔ تو گویا کہیں بھی قرآن یہ نہیں کہتا کہ بغیر کسی خبر، کسی علم اور تفقہ کے کوئی بات کی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب بھی نعت کہی جائے یہ بات ضرور ہمارے پیش نظر ہو کہ اس میں علم کو راہ نما بنایا جائے۔ یعنی براہِ راست ہمارا تعلق knowledge سے ہو۔ تب ہی وہ نعت قرآن و حدیث کی رو سے قابلِ قدر ہوگی اور اس میں بے راہروی کے امکانات معدوم ہوں گے۔

عزیز احسن: پروفیسر سحر انصاری صاحب کچھ کہنا چاہ رہے ہیں؟

سحر انصاری: ایک تو جوش ملیح آبادی کا قول یاد آ گیا۔ اقبال کی عشق پرستی کو اسی حوالے سے کہتے تھے کہ قرآن کریم میں تو عشق کا لفظ آیا ہی نہیں۔ تفکر و آیت ہے یا تعقلون آیا ہے۔ دوسرے مجھ ناچیز نے بھی ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ جب اقبال یہ کہتے ہیں کہ

عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

تو اس سے میں بالکل بھی اتفاق نہیں کرتا۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی جو ذاتِ مبارکہ تھی اس میں عشق کا جتنا درجہ تھا اتنا ہی عقل کا بھی درجہ تھا۔ عقل کبھی بولہب نہیں ہوتی۔

عزیز احسن: یہ ایک اور پہلو نکل آیا۔ پروفیسر انوار احمد زئی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

انوار احمد زئی: خود اقبال نے یہ بات کہی ہے ناں:

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تو وہ تو انہوں نے اعتراف کیا کہ پاسبانِ عقل [ساتھ ضرور] رہے۔

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی..... یا

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشاے لبِ بامِ ابھی

لیکن بات یہی ہے..... اقبال نے خود یہ بات کہی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ عقل کی

انتہا کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا ”حیرت“۔ اور کیا اچھی بات ہے ”سدرۃ المنہجا“ عقل کی بھی انتہا ہے۔ لیکن جب ان سے پوچھا عشق کی انتہا..... تو انہوں نے کہا عشق کی کوئی انتہا نہیں۔ تو ان سے کہا گیا کہ آپ نے تو خود کہا ہے کہ عشق کی انتہا چاہتا ہوں..... تو انہوں نے کہا دوسرے مصرعے میں اعتراف بھی تو ہے..... مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔ اقبال عشق کی تائید کرتے ہوئے عقل کی تردید میں بھی مشروط انداز اختیار کرتے ہیں۔

عزیز احسن: میں یہ سمجھتا ہوں کہ عشق کا لفظ چوں کہ فارسی میں زیادہ استعمال ہوا ہے اور وہ محبت کی انتہائی کیفیت کو جس میں بہت زیادہ intensity ہے۔ بہت زیادہ شدت بھی ہے۔ اس کو وہ عشق کا نام دیتے ہیں۔ تو ہمارے ہاں جو عجمی شعراء ہیں ان کے ہاں یہ لفظ زیادہ آیا ہے۔ اصلاحی: عجمی شعراء کہہ کر آپ نے کچھ وکالت کر لی۔

عزیز احسن: بہت بہت شکریہ آپ حضرات کا کہ آپ تشریف لائے اور یہ خرد افروز گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو ان شاء اللہ کاغذ پر بھی آئے گی اور شائع بھی ہوگی۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)!





انہی سے عشق کرو، ان کے راستے میں رہو
درود پڑھتے رہو اور رابطے میں رہو

(سلیم کوثر)

پروفیسر محمد اسلم اعوان۔ گوجرانوالہ

خواجہ محمد دیوان کی نعت گوئی

ABSTRACT:

Diwan Chand was a Hindu converted Muslim who was known as Khawaja Muhammad Diwan after embracing Islam. The article placed below contains a brief life sketch and some devotional poems of Diwan Sahib, written in mixed language i.e. blending of Urdu and Punjabi. It is also stated herein that Dr. Mian Rafiq Ahmad, Ph.D. (Canada) has compiled Naatia poetic collection of Khawaja Muhammad Diwan titled "Sabri Gulzar" comprising of 500 pages. Khawaja Muhammad Diwan was a devotee lover of Prophet Muhammad (S.A.W).

خواجہ محمد دیوان (۱۸۶۷ء-۱۹۴۰ء) نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کی سکونت بمقام کانگھیاں تحصیل دسواہ ضلع ہوشیار پور (حال مشرقی پنجاب بھارت) میں تھی۔ پیدائشی نام دیوان چند اور والد کا نام لالہ پولورام تھا۔ جو زرگر (سناہ) اور ساہوکار تھے۔ دیوان چند والدین کی اکلوتی زینہ اولاد اور بڑی منتوں مرادوں سے تین بڑی بہنوں کے بعد پیدا ہوئے تھے۔

چار سال کی عمر میں دیوان چند کے والد لالہ پولورام کا انتقال ہو گیا اور چھ سال کی عمر میں والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ ابھی پرائمری سکول کے طالب علم تھے کہ نو دس سال کی عمر میں مسلمان بچوں کے ساتھ مسجد میں چلے جاتے اور آہستہ آہستہ مسجد کے خطیب سید غلام احمد سے قرآن مجید پڑھنے کے ساتھ ساتھ نماز پڑھنے کا طریقہ سیکھ لیا۔

ایک دن آپ کے چچا آتمارام نے ایسی حالت دیکھ کر سخت سست کہا اور سرزنش کی کہ تو اپنا دھرم چھوڑ کر مسلمان ہوا چاہتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اسی چچا نے کہا کہ دیوان چند تمہارے والد نے ہزاروں روپے لوگوں کو بطور قرضہ دے رکھے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری جائیدادیں ہیں۔ اپنا انتظام تم خود ذمہ داری سے انجام دو۔ جب ذرا سیانے ہو جاؤ گے تو تمہاری شادی کر دی جائے گی۔ اس وقت

آپ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ تمام کاغذات و اسٹامپ چچا سے لیے اور اُن پر تحریر کر دیا۔ ”میں نے قرضہ وصول کر لیا۔“ جدی جائیداد میں سے ایک مکان چچا آتمارام کے نام ہبہ کر دیا۔ ایک مکان جناب سید حافظ غلام احمد جن سے قرآن پاک کا درس لیا ہبہ کر دیا۔ ایک مکان اور دکان سلطان محمد ذیلدار کے نام ہبہ کر دی اور خود ذیل دار صاحب کے دیوان خانہ میں رہائش کر لی۔ ذیلدار سلطان محمد کی رہائش موضع کانتھال میں ہی تھی جو بڑے عام فاضل اور صاحب ذوق تھے۔ ایک دن دیوان چند نے ذیلدار سلطان محمد کے ذرائع سے مسجد میں اعلان کر دیا کہ میں یعنی دیوان چند نے مذہب اسلام قبول کر لیا ہے اور اسلامی نام دیوان چند سے ”دیوان محمد“ رکھا گیا ہے۔ جیسے ہی یہ اعلان ہوا، آپ کے عزیز و اقارب اور دیگر ہندو برادری نے ذیلدار سلطان محمد خان کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ ذیلدار صاحب نے ہمارے نابالغ بچے دیوان چند کو ورغلا کر مسلمان کر دیا ہے۔ اور یہ خبر اس دور کے ہفت روزہ اخبار ”سراج الاخبار“ جہلم میں شائع ہو گئی۔ جس کا عنوان مندرجہ ذیل تھا:

دوسو ہبہ ضلع ہوشیار پور

”چودھری سلطان محمد خان ذیلدار جو بڑے خلیق اور ہر دلعزیز ہیں اُن کی سعی سے ایک زرگر ہندو لڑکا مسلمان ہو گیا۔“

(”سراج الاخبار“، صفحہ نمبر ۵، مورخہ: ۲۲/ جنوری ۱۸۹۳ء)

عدالت نے ذیلدار صاحب اور دیوان چند کو مع فریقین سمن جاری کر دیئے۔ مقررہ تاریخ پر جب عدالت میں دونوں فریقین حاضر ہوئے۔ ہندوؤں کے دلائل سننے کے بعد جب مسلمانوں کی باری آئی تو دیوان چند نے عدالت کے روبرو و صاف بیان تحریر کروایا کہ میں نے باہوش و حواس برضا و رغبت مذہب اسلام قبول کیا ہے۔ اس میں میرے ہندو عزیز و اقارب کو میرے ذاتی معاملات میں دخل در انداز ہونے کی ضرورت نہیں، لہذا اس بیان پر مقدمہ خارج ہو گیا۔

آبائی مذہب ہندومت چھوڑ کر دین اسلام کو قبول کرنے کی عظیم سعی مشکور بارگاہ خداوندی میں یوں مقبول و منظور ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے خواجه محمد دیوان کا سینہ عشق محمد سے روشن و متور کر دیا۔ اور حُب نبوی میں یوں مستغرق ہوئے کہ آپ نے لافانی انداز میں بے شمار نعتیں لکھیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے بے پایاں روحانی رفعتوں سے نوازا کہ آپ تہجد کے پابند پانچ وقت کی فرض نمازوں کے ساتھ درود شریف کثرت سے پڑھتے آپ ہمیشہ علی الصبح بیدار ہوتے، دیر سے سوتے، نماز فجر سے فارغ ہو کر

مصلیٰ پر بیٹھے رہتے۔ اور عشاء کی نماز کے بعد بھی عموماً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مصلیٰ پر بیٹھتے۔ اکثر نعت شریف کی کتابیں پڑھتے رہتے اور خود بھی نعتیں لکھتے۔! آپ کی روحانیت کا شہرہ ضلع ہوشیار پور ہی نہیں بلکہ اس کے بیرون دُور دراز تک پھیل گیا۔

ڈاکٹر میاں رفیق احمد پی ایچ۔ ڈی (کینیڈا) نے ۱۲۸۔۱۷ پیپلز کالونی فیصل آباد سے ۱۹۹۲ء میں ”صابری گلزار“ کے عنوان سے پانچ سو ۵۰۰ صفحات پر مبنی خواجه محمد دیوان کا نعتیہ کلام، کلیات کی صورت میں ایک جلد میں شائع کیا۔ یوں خواجه محمد دیوان کا نعتیہ کلام، اُردو، پنجابی زبان کے نعتیہ ذخیروں کی صنف میں نمایاں مقام حاصل کرتے ہوئے، ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

نمونہ کلام (انتخاب)

مناجات

شروع کرتا ہوں میں بنام کریم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یا خداوند! تُو مجھ پر رحم کر

اے میرے معبود رب العالمین

کر عطا کُن نبی تُو اے رحیم

تُو ایماں سے مجھے پُر نور کر

بُغض و کینہ عَجَب و حسد و کُز و فر

پیروی سُنّت کی بھی کرتا رہوں

محو کر ایسا تُو اپنی ذات میں

خوابِ غفلت سے رہوں بیدار میں

یا علیم و یا سمیع و یا بصیر

اپنے فضل و کرم سے تُو یا لطیف

اور مجھ کو بخشو شرم و حیا

اپنے دروازے مجھے منظور کر

میں ہوں عاصی تیری رحمت بے بہا

مشکلیں میری سبھی آسان کر

علم و حلم و عقل دے ہو واں اذہن

ہے سخاوت کام تیرا اے کریم

ہے دُعا تجھ سے اے مالک بحر و بر

ان بلاؤں سے مجھے آزاد کر

یاد تیری میں ہی دم بھرتا رہوں

تاناہ ہوشیطان میری گھات میں

تیری الفت میں رہوں سرشار میں

کر دے مجھ عاجز کو تُو روشن ضمیر

دُور کر دل سے خیالات کثیف

بد اعمالوں سے مجھے لینا بچا

نہ پھروں آوارگی میں در بدر

صدقہ احمد مجتبیٰ بخشو خطا

کیا کروں کس سے کہوں تیرے ہوا

نامہ اعمال میرا ہے سیاہ

تیرے دروازے ہوا جاؤں کہاں

تو کرم سے تارے تو تر جاؤں میں

جام وحدت کا تو دے مجھ کو پلا

کردے مجھ کو صاف مانند گہر

ماؤ کا حرف میرے دل سے کھو

میرے سترے ۲ بخت مولا دے جگا

اپنی ذات کبریا کا واسطہ

کچھ تیرے دربار میں پرواہ نہیں

سمھناں ۴ بھائیوں کو خدا یا بخش دے

کون مولیٰ مجھ کو کر دے گارہا

اپنی رحمت سے خدا کر دے صفا

نیک ہوں یا بد، جیسا تراہاں

دل دے مقصد سارے تب ہی پاؤں میں

شادرکھ مجھ کو طفیل مصطفیٰ

اے خدا ہر وقت مجھ پہ رکھ نظر

معرفت کا بیج میرے دل میں بو

کر کرم جھب ۳ مست دیوانہ بنا

گل خدائی کا تجھے ہے واسطہ

سب مرادیں میری پوری ہوں آ میں

اپنی اُلفت اور نبی کی حُب دے

صابری کی التجا کچھ قبول

واسطے پاک آل و اصحاب رسول

۱۔ ہواں۔ یعنی ہو جاؤں۔ بن جاؤں ۲۔ یعنی سوئے ہوئے

۳۔ جھب دی۔ (پنجابی زبان کا لفظ ہے) یعنی جلدی

۴۔ سب کو، تمام کو، سمھناں پنجابی زبان میں سب کو کہتے ہیں۔

دُرود پاک

صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد

احمد پیارا مجھے نام محمد مصطفیٰ

کیسا یہ پیارا نام ہے

اتے! جن سے دین اسلام ہے

صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد

کیسا یہ پیارا نام جی

صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد

خاص حبیب کبریا صلیٰ علیٰ محمد

دو جگ جن کا غلام ہے

اسی پاک نام کا ورد کرو

صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد

جن کی دو جگ میں دھوم دھام جی

تیس ۲ یاد رکھو صبح و شام جی
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
نام ان کے طہ یسین جی
اور شفیع المذنبین جی
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
اوہ ۳ خاص رب دے دلدار جی
اوہ ہیں بخشاؤں ہار جی
نام آپ کے ہیں اول آخر
نام آپ کے طیب طاہر
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
دیکھو پڑھ کے کلمہ پاک جی
جن کی دو جگہ ۴ دے وچ دھاک جی
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
اے ساڈے ۵ پاک رحمن جی
تیرے نبی توں ہوں قربان جی
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
یارب کریو اپنا کرم
اتے ۶ عشق نبی وچ نکلے دم
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد
اے پاک جل جلاں جی
کر دے عشق نبی میں کمال جی
صلیٰ علیٰ نبینا صلیٰ علیٰ محمد

اسی پاک نام کا ورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
وہ رحمت للعالمین جی
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
ساری امت دے غم خوار جی
اسی پاک نام داورد کرو
نام آپ کے ہیں باطن ظاہر
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
جس میں نام شہ لولاک جی
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
جتنے بھائی مسلمان جی
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
دو جگہ وچ رکھو لاج شرم
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد
کرے صابری عرض الہیے حال جی
اسی پاک نام داورد کرو
صلیٰ علیٰ شفیعنا صلیٰ علیٰ محمد

۱۔ پنجابی زبان میں ”اور“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ۲۔ ختم

۳۔ یعنی دونوں جہانوں میں

۴۔ ہمارے

☆☆

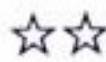
۵۔ وہ

۶۔ اور

اب ہو گیا ہے مجھ کو سودائے محمد
دن رات یہی کرتا ہوں رو رو کے دعائیں
دن رات یہی کرتا ہوں رو رو کے دعائیں
سر مہ کی طرح شوق سے آنکھوں میں لگا لوں
ہائے کچھ پاس نہیں چارہ چلتا نہیں میرا
ہے صابریؑ کی التجا شب و روز خدا سے
دن رات یہی ورد مرا ہائے محمد
مل جائے محمد کہیں مل جائے محمد
مل جائے کہیں خاک کف پائے محمد
سر بیچ کے لیتا ہوں میں سودائے محمد
دم تیرے ہی قدموں میں نکل جائے محمد



صورت نبی کی دل کو میرے لبھار ہی ہے
شاخوں میں برگ و گل میں نور نبی سایا
نور محمدی کی پھیلی ضیاء جہاں میں
گر مجھ کو ملنا چاہو میرے نبی کو مانو
پردہ اٹھا کے دل سے پھر ذات حق کو دیکھو
کلیاں چنک رہی ہیں صل علی کو پڑھ کر
تم بھی پڑھو عزیز و صل علی کو دل سے
اُن کو نہ خوف محشر جو عاشق نبی ہیں
دل میں سار ہی ہے آنکھوں میں آرہی ہے
ہر طرف ذات احمد کیا جھللا رہی ہے
اس روشنی سے دُنیا سب جگمگا رہی ہے
قرآن میں ذات باری سب کو جتا رہی ہے
شکل محمدی ہی جلوے دکھا رہی ہے
نام نبی کا کلمہ بلبُل بھی گارہی ہے
دیکھو نبی کی محفل کیسی سُہارہی ہے
بخشش کا ذات حق کی مرثدہ سُنا رہی ہے



جن کا نام محمد پیارو
پر گھٹ بھٹے محمد جب چونھ ۲ دیس ہوا اُجیالا
جن کا نام محمد پیارو
کلمہ کی جب بین بجی سب گونج اُٹھا تہہ و بالا
جن کا نام محمد پیارو
باج گئیو اسلام کا ڈنکا، گفر کیا تہہ و بالا
جن کا نام محمد پیارو
دھرت اکاس ۵ کو داس کیا، سب دیس بھیومتوالا
جن کا نام محمد پیارو
وہ تو دُؤں جگ میں اُجلا
بھاگ جگے، جگ جاگ اُٹھا، جبریل نے علم سنبھالا
وہ تو دُؤں جگ میں اُجلا
بُت پو جن کی ریت مٹی سب، سب کھٹا ۳ کرم نکلا
وہ تو دُؤں جگ میں اُجلا
بھانچ پڑی جب کوٹ ۴ گفر میں بیچ بھیو سب اُعلیٰ
وہ تو دُؤں جگ میں اُجلا
کنکر ۵ تھر بول اُٹھے ایہہ نور خدائے تعالیٰ
وہ تو دُؤں جگ میں اُجلا

فوج ملائک ساتھ ہوئی جب عرش سدھائے بالا
سب نبیوں نے سیس دھرے ہے تیر دام نرالا
جن کا نام محمد پیارو
رحمت عالم نین لگو مازاغ کا کا جل کالا
وہ تو دہنوں جگ میں اُجالا
جن کا نام محمد پیارو
سیس مکٹ لولاک لَمَّا کا موہنڈے کے کبل کالا
گل وچ کفنی خفی جلی دی ہتھ وحدت دی مالا
جن کا نام محمد پیارو
راج بھیو جب دیس عرب سب راجن نے سرڈالا
وہ تو دہنوں جگ میں اُجالا
جن کا نام محمد پیارو
تاج شفاعت سر پر ہے سو ہے لَمَّت دار کھوالا
نبیائ داسردار محمد مہر نبوت والا
جن کا نام محمد پیارو
لولاک لَمَّا شان ہے جس کی کہے وہ باری تعالیٰ
کنکرا کنکر، پتھر دیہن گواہی ایسا نبی نرالا
جن کا نام محمد پیارو
واللیل کے گیسو نگھ ۱۲ سو ۳۱ جیویں ۳۱ چندھ لے ہلا
وہ تو دہنوں جگ میں اُجالا
جن کا نام محمد پیارو
مَن رانی بولی بولے وحدت بھیس سنبجالا
آپ خداوند عاشق جس داواہ واہ رتبہ اعلیٰ
جن کا نام محمد پیارو
عشق رسول اللہ ہے جس نوں اُس دارتبہ بالا
صابری جس نے کلمہ پڑھیا نار سے کیا دخالا
جن کا نام محمد پیارو
وہ تو دہنوں جگ میں اُجالا

۱۔ جب حضرت محمد کا ظہور ہوا۔ ۲۔ چاروں طرف

۳۔ کھوٹا مذہبی راستہ، کھوٹا دھرم ۴۔ کفر کے قلعہ میں بھکڑ مچ گئی۔

۵۔ دھرتی اور آکاش، یعنی زمین و آسمان آپ کے غلام اور تابع ہو گئے۔

۶۔ سر پر تاج ہے ۷۔ موہنڈے، یعنی کندھے پر

۸۔ جب عرب میں آپ کے قدموں آگیا اور آپ کی حکومت قائم ہو گئی تو دنیا بھر کے حکمران آپ کے سامنے

تھک کر آپ کے ماتحت اور تابع ہو گئے۔

۹۔ آپ نے گمراہوں کو تاریکی سے نکال کر اسلام کا روشن اور آسان راستہ بتا دیا۔

۱۰۔ بتا ہے۔ ۱۱۔ کنکر اور پتھر آپ کی نعت کی گواہی دیتے ہیں۔

۱۲۔ مکھ سوہن، یعنی چہرہ مبارک پر سجتے ہیں۔

۱۳۔ جویں یعنی جس طرح چاند کے ارد گرد ہالہ ہے۔



نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس!

جھبڈی ۲ نالو اپنے دوارے	اے حبیب اللہ دے پیارے
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	۳ جیوڑاتے ہو یا ہے اداس
ہندوچ رُل دا میں ۴ نیٹ کمینہ	اے میرے سرور ماہ جپنہ
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	۵ ہے مدینہ آپ داباس
ایہودل وچ لگڑی آسایے	دم داہیگا کی بھرواسالا
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	تورے قدموں میں نکلے سانس
اے میرے ماہی مدینے والے	رورو ۸ اکھیاں نیر اچھالے
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	مینوں اپنے نالو پاس
میرے مقصد دلی دلاؤ	پاک جمال دی بھکھیا ۹ پاؤ
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	سب کارج ہوون راس
میں پر اپنا کرم کما کے	پاک جمال دی بھکھیا پا کے
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	کر دو دوئی داناس ۱۰
اوس شہ لولاک دا صدقہ	یا رب تیری ذات دا صدقہ
نبی جی پوری کیہڑے ویلے ہوؤ سموری آس	خوش بے سارا اجلاس

۱۔ اے میرے پیارے نبی جی، آپ کے پاس میری حاضری کی اُمید، آس کب پوری ہوگی۔

۲۔ جلدی ۳۔ دل بہت زیادہ اداس ہے۔ ۴۔ بہت زیادہ

۵۔ بنے، رہنے کی جگہ (باسی ہوتا) ۶۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے؟

۷۔ میرے دل میں بس یہی اُمید لگی ہے۔

۸۔ زار و قطار، روتے ہوئے میری آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی ہیں۔

۹۔ بھیک ۱۰۔ دوئی کو ختم فرمادیں۔

نبی محمد آئیو

نبی محمد آئیو

جنگل وچ منگل لائیو

بارھویں تاریخ ربیع الاول دن دوشنبہ پائیو وقت صبح دے پاک محمد جگ میں قدم نکائیو

نبی محمد آئیو

اجڑیا دیس بسائیو

جنگل وچ منگل لائیو

بی بی آمنہؓ دے گھر خوراں پریاں دین ودھائیو اے بی بی تیں پر فضل اللہ دا جس نبی محمدؐ جائیو

نبی محمد آئیو

بی بی تیرے بھاگ سوائیو

جنگل وچ منگل لائیو

فارسؓ کی سب آگ بجھی بٹاں سداں سیس نوائیو قیصر و کسریٰ دھوئے سب کفر شرک اٹھ دھائیو

نبی محمد آئیو

ڈنکا دین بجائیو

جنگل وچ منگل لائیو

گھر عبد اللہ جنم لیو مائی آمنہؓ گود کھڈائیو تل اشلے کرے چند بائل جبریلؑ ٹھولا جھولائیو

نبی محمد آئیو

حلیمہؓ دودھ پلائیو

جنگل وچ منگل لائیو

چند اتار دوکھن کیتا ایسا معجزہ آن دکھائیو پاک محمد حبیب اللہ دے عرشاں تے بلوائیو

نبی محمد آئیو

ایسا رب نے لاڈ لڈائیو

جنگل وچ منگل لائیو

رب دُرود نبی پر بھیجے تم بھی پڑھو پڑھائیو راضی ہووے تاں رب باری پہلے نام نبی دادھئیو

نبی محمد آئیو

پھر خاص حضوری پائیو

جنگل وچ منگل لائیو

۱۔ حضرت آمنہؓ کو خوریں، نبی پاکؐ کی پیدائش پر مبارکبادیں، دے رہی ہیں۔

۲۔ اے خوش قسمت خاتون، تجھ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہوا ہے کہ تیرے گھر میں حضرت محمدؐ پیدا ہوئے۔

۳۔ (معنی بیان نہیں کیا گیا ہے) ۴۔ فارس کا آتش کدہ بجھ گیا۔ اور بتوں نے آپؐ کے سامنے سر جھکا دیا۔

۵۔ آپؐ نے اپنی انگلی مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے کر دیا۔

۶۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی حُب آپؐ کو عطا فرمائی۔

میرے سوہنے محمد پیلے نبی جی میں تو رہے قربان
درس! تیرے بن یا نبی جی مند انمانی داحال
جی میرے سوہنے محمد پیلے نبی جی میں تو رہے قربان
تیری خاطر سیدائیں تاں پھر دی آں دیس بدلیں
جی میرے سوہنے محمد پیلے نبی جی میں تو رہے قربان
دَر ۲ تو رہے کو چھوڑ کر کس در جاواں میں
جی میرے سوہنے محمد پیلے نبی جی میں تو رہے قربان
کو ہڑ ۳ خدا کے لاڈ لے تیں ہتھ ہمری ڈور
جی میرے سوہنے محمد پیلے نبی جی میں تو رہے قربان
بھانویں اوگن ہار ہو بخشیا جاوے گا
جی مورے سوہنے محمد پیارے نبی جی میں تو رہے قربان

- ۱۔ اے میرے پیارے نبی آپ کی زیارت کے بغیر آپ کی محبت میں دیوانہ ہوں اور مرا حال عجیب ہو گیا ہے۔
- ۲۔ آپ کا در اقدس۔
- ۳۔ آپ ہی مجھ بے کس کا بھرم رکھنے والے ہیں مجھے آپ پر فخر ہے۔
- ۴۔ واپس تشریف لائیے۔



ایہو ہردم دل وچ چا سیدا!
آپ دا ہو کر شاہا میں ہو رکس در جاواناں
ایسا کون طبیب جو مرضاں کٹے
ایہو ہردم دل وچ چا سیدا!
میں نر اس ۲ پھڑکے کا سہ آپ دے در آ پڑا
توری ۳ دید کی بھکھیا ۴ مانگت ہوں
ایہو ہردم دل وچ چا سیدا!
بخشوا پنا پاک لقاء سیدا!
کس نوں اپنا حال روو کے جا میں سناواناں
توری دید ہے میری دوا سیدا!
بخشو اپنا پاک لقاء سیدا!
بدیاں دیکھ نہ جھڑکیو تخی آپ دار تہہ بڑا
ایہو خاص ہے میری صدا سیدا!
بخشو اپنا پاک لقاء سیدا!

یا نبی سر آپ دے سو ہے لولا کی تاج جی
 واہ وا آپ دی نیاری شان نبی
 ایہو ہر دم دل وچ چا سیدا!
 وچ اندھیری گھدے منکر نکیر آویں گے جب
 اس بات کا دل میں ہے خوف بڑا
 ایہو ہر دم دل وچ چا سیدا!
 آپ کو اللہ نے بخشا دو جہاں کا راج جی
 کہا اللہ نے پیاروں عرشیں آسیدا!
 بخشو اپنا پاک لقا سیدا!
 بھرٹھا کر پوچھیں گے محمدی ہمتا تیرا کلب
 اُس ویلوے ۶ آن گل لا سیدا!
 بخشو اپنا پاک لقا سیدا!

۱۔ میرے دل میں ہر وقت آپ کی زیارت کا شوق سلا یا رہتا ہے۔

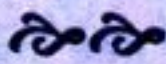
۲۔ نر اساجس کی امیدیں ہر طرف سے ٹوٹ کر آپ سے وابستہ ہو گئی ہیں۔

۳۔ آپ کی زیارت۔

۴۔ بھیک

۵۔ جلدی۔

۶۔ وقت



اقبال سہیل کا ایک نعتیہ قصیدہ (تقابلی مطالعے کی روشنی میں)

ABSTRACT:

Iqbal Sohail's Qasida in praise of Prophet Muhammad (S.A.W) has brought into focus for study in comparison of similar type poetical attempts of Urdu poets like Sauda and Munir Shikoh Abadi and Persian Poets like Khaqani and Urfi Shirazi. Discriminative aspects of poetic approach of Iqbal Sohail have been delineated to show uniqueness of beauty of expression and associations of words chosen for hinting light, beauty and love. Thought content of Qasida of Iqbal Sohail has also comparatively been found error free than poetic work of others under reference.

اقبال سہیل (۱۸۸۴ء-۱۹۵۵ء) علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی۔ (علیگ) اور سید سلیمان ندوی کے نامور معاصر تھے۔ وہ غیر معمولی ذہانت و فطانت اور بے نظیر قوتِ یادداشت کے مالک تھے۔ عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ سے بخوبی واقف اور اردو فارسی دونوں زبانوں کے قادر الکلام شاعر تھے۔ سید سلیمان ندوی نے بحیثیت شاعران کی دو خوبیوں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ایک ان کا شاعرِ طبعی و فطری ہونا، دوسروں صنفِ قصیدہ و غزل دونوں پر بیک وقت قدرت رکھنا۔ چنانچہ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

”شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو پڑھ لکھ کر قابلیت کے زور سے

شاعر بنتے ہیں دوسرے وہ ہیں جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہو کر آتے ہیں وہ

کچھ نہ بھی پڑھتے تو بھی شاعر ہی ہوتے۔ پہلے لوگ بہ تکلف شاعر بنتے ہیں

اور دوسرے فطری شاعر ہوتے ہیں، البتہ تعلیم ان کی شاعری کو جلا دیتی ہے۔ ہمارے دوست اقبال سہیل دوسری قسم کے شعرا میں ہیں یعنی فطری و طبعی شاعر ہیں۔“
آگے رقم طراز ہیں:

”پرانے شعرا میں قصیدہ گو اور غزل گو شعرا الگ الگ ہوتے تھے۔ قصیدہ گو غزل میں اور غزل گو قصیدہ میں کامیاب نہیں ہوتے تھے کیوں کہ دونوں کی زبانیں الگ ہوتی ہیں۔ مگر مستثنیٰ اشخاص بھی ہیں جو دونوں مملکتوں پر ایک ساتھ حکمران ہیں۔ جیسے قدامت میں سعدی، متوسطین میں عرّاقی اور اخیر دور میں مولانا شبلی مرحوم۔ سہیل صاحب بھی انہی مستثنیٰ قابلیت کے لوگوں میں ہیں جو قصیدہ اور غزل دونوں پر قدرت رکھتے ہیں۔“

سہیل کی غزل گوئی سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم سر دست ان کی قصیدہ گوئی کے حوالے سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری پر قدرت کاملہ کے باوجود سہیل نے شعر گوئی کو ہمہ وقتی مشغلہ نہیں بنایا، پھر جو کچھ کہا اسے محفوظ رکھنے کی کوشش بھی نہیں کی بلکہ بقول خود:

”دوسروں کی محنت سے جمع شدہ سرمائے کو بھی ضائع کر دیا۔“

یہی وجہ ہے کہ ”کلیات سہیل“ میں غزلیات کی طرح قصائد بھی محدود تعداد میں ملتے ہیں پھر بھی ان کی شاعرانہ عظمت کا یہ عالم ہے کہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے ”انتخاب قصائد اردو“ میں ان کا بھی ایک قصیدہ شامل ہے بلکہ یوں کہیے کہ انہی کے قصیدے پر اس انتخاب کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ نعتیہ قصیدہ ہے اور اس کا مطلع حسب ذیل ہے:

کرے تار شعاعی لاکھ اپنی سعی امکانی رفو ہوتا نہیں اب صبح کا چاک گر بانی
سہیل کا یہ قصیدہ ان کی قصیدہ گوئی اور نعت گوئی دونوں کا شاہکار ہے لیکن اس پر تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کہ انہوں نے یہ قصیدہ سودا کے نعتیہ قصیدے کی زمین میں ان کا تتبع کرتے ہوئے کہا ہے۔ سودا کا مطلع درج ذیل ہے:

ہو واجب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی نہ ٹوٹی شیخ سے زنا رتبیج سلیمانی
اب جہاں تک سودا کا تعلق ہے تو یہ زمین انہوں نے خود نہیں نکالی بلکہ اس باب میں فارسی کے مشہور قصیدہ نگار خاقانی شروانی کا تتبع کیا ہے البتہ خاقانی کا قصیدہ نعتیہ نہیں بلکہ حکیمانہ اور رثائیہ ہے

اس کا مطلع یوں ہے:

نثارِ اشکِ من ہر شب شکر ریز است پنهانی کہ ہمت رازنا شو نیست بازانو و پیشانی ۴
(ہر رات میرے دانہ ہائے اشک کا بکھرنا سرِ عروسِ شکر ریزی کے مشابہ ہے
اس لیے کہ بلند ہمتی کا زانو و پیشانی سے تعلق زن و شوہر کے تعلق کی مانند ہے)
لیکن خاقانی کا یہ قصیدہ نہایت ادق ہے۔ اس کے بیشتر اشعار مجھ پر کھل نہ سکے۔ بعض نسبتاً
آسان شعر ترجمے کے ساتھ نمونے کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں:

دل از تعلیم غم پیچد معاذ اللہ کہ بگذارم کہ غم پیر دبستان و دل طفل شبستانی
(دل غم کی تعلیم سے پیچ و تاب کھا کر بھاگنا چاہتا ہے۔ پناہ بخدا کہ میں اسے چھوڑ دوں یعنی
نہیں چھوڑوں گا۔ دل کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ غم پیر دبستان ہے اور دل طفل شبستان ہے)
ہستم حرص را چشم و شکستم آرز را دندان چوں میم اند خطِ کاتب چوں سیں در حرف دیوانی
(جس طرح کاتب کی تحریر میں میم کی آنکھ بند ہوتی ہے، اسی طرح میں نے حرص کی آنکھیں بند
کر دی ہیں اور جس خطِ دیوانی میں سین کے دندانے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں، اسی طرح میں
نے لالچ کے دانت توڑ دیے ہیں)

مرا آئینہ وحدت نماید صورتِ عنقا مرا پروانہ عزلت دہد ملک سلیمانی
(گوشہ تنہائی کے آئینے میں مجھے عنقا کی صورت دکھائی دیتی ہے اور کنج عزلت
کا پروانہ مجھے ملک سلیمانی عطا کرتا ہے)

چہ آزادند درویشاں از آسیب گراں باری چہ محتاجند سلطاناں بہ اسباب جہاں فانی
(درویش لوگ آسیب گراں باری سے کس قدر آزاد ہیں اور بادشاہ لوگ سامان
جہاں بانی کے کس قدر محتاج ہیں؟)

بد اسطانی کورا بود رنج دل آشوبی خوشا درویشیا کورا بود گنج تن آسانی
(کیا ہی بری ہے وہ بادشاہت جسے پریشانی خاطر کا رنج لاحق ہو اور کیا ہی خوب ہے
وہ درویشی جسے آرام و راحت کا خزانہ میسر ہو)

پس از سی سال روشن گشت بر خاقانی ایس معنی کہ سلطانیت درویشی و درویشی است سلطانی ۵
(تیس سال بعد خاقانی پر یہ بات منکشف ہوئی کہ بادشاہت درحقیقت درویشی ہے
اور درویشی درحقیقت بادشاہت ہے)

یہاں یہ اشعار اس طرف توجہ دلانے کے لیے نقل کیے گئے کہ سودا نے اپنے قصیدے کی تشبیہ میں جو حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز اختیار کیا ہے تو اس کا ماخذ خاقانی کا زیر بحث قصیدہ ہے۔ موازنے کے لیے سودا کے قصیدے سے تشبیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہ دل ہووے نہیں کچھ جمع سے غنچے کو حاصل جز پریشانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروج دستِ ہمت کو نہیں ہے قدر پیش و کم سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی
اکیلا ہو کے رہ دنیا میں گر چاہے بہت جینا ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمرِ خضر طولانی
برنگِ کوہ رہ خاموش حرفِ ناسزا سن کر کہ تابد گو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی
کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو کہ زیب ترک چشم یار ہے سرمہ صفا ہانی
اس میں کوئی شک نہیں کہ سودا کا یہ قصیدہ مطلع و تشبیہ سے لے کر گریز تک جدت و طرفگی کا حامل ہے اور سودا نے بطور خاص تشبیہ میں خاقانی کا کامیاب تتبع کیا ہے۔ لیکن اس قصیدے کا نعتیہ حصہ بہت کمزور ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ سودا علوم اسلامیہ اور رسول اکرم کی حیات طیبہ اور سیرت و شمائل نبوی سے بڑی حد تک ناواقف تھے۔ اس باب میں ان کا منبع علم چند ضعیف روایات اور بعض مشہور مضامینِ نعت تک محدود تھا۔ مثلاً:

(۱) حضرت آدم کی پیشانی میں نور احمدی کا موجود ہونا۔

(۲) روایت لولاک کما خلقت الافلاک۔

(۳) حضور پاک کا شافع محشر ہونا۔

(۴) آپ کا کمال عدل و انصاف۔

(۵) جسم اطہر کے سایہ مبارک کا زمین پر نہ پڑنا۔

پھر ان مضامین کے نظم میں بھی سودا ندرت یا تازگی کا کوئی پہلو پیدا نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ پہلے دو مضامین انھوں نے روایتی انداز میں نظم کیے ہیں ملاحظہ ہوں:

ملک سجدہ نہ کرتے آدمِ خاکی کو گر اس کی امانت دارِ نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

اسی کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا مراد الفاظ سے معنی ہے تا آیاتِ قرآنی

اس کے بعد انھوں نے مضمون شفاعت نظم کیا ہے، لیکن یہاں وہ جدت کی کوشش میں جادہ

اعتدال سے ہٹ گئے ہیں:

خیالِ خلق اس کا گرشع کافراں ہووے رکھیں بخشش کے سر، منت یہودی اور نصرانی
 زباں پر اس کی گذرے حرف جس جا کہ شفاعت کا کرے واں ناز آمرزش پہ ہراک فاسق وزانی
 جہاں تک مضمون عدل و انصاف کا تعلق ہے تو سودا نے یہاں سب سے زیادہ زور طبع صرف
 کیا ہے لیکن ان کی باتیں سب خیالی ہیں جن کا سیرت شامل نبوی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

رکھا مسند پہ آجب سے قدم ان نے شریعت کی کرے ہے موج بحر معدلت تب سے یہ طیغانی
 اگر نقصان پر خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو گرہ کو آگے کے دو ہیں کرے غرق آن کرپانی
 پلے ہے آشیاں میں باز کے بچہ کبوتر کا شاں نے گرگ کو گلے کی سو پی ہے نگہبانی
 ہما آسا ہے پرواز ملخ اوج سعادت پر کرے ہے مور چڑھ کر سینہ دڈ پر سلیمانی
 کھلے ہے غنچہ گل باغ میں خاطر سے بلبل کے جواب اور اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی
 البتہ سایہ مبارک کے معدوم ہونے کے سلسلے میں سودا نے حسن تعلیل کا ایک دلکش پہلو
 پیدا کیا ہے:

نہ ہونے سے جدا سائے کے اس قامت سے پیدا ہے قیامت ہووے گادل چسپ وہ محبوب سلطانی
 لیکن اس کے بعد حضرت یوسفؑ کے تذکرے میں استخفاف کا انداز پیدا ہو گیا ہے:

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسفؑ ثانی
 معاذ اللہ یہ کیسا حرف بے موقع ہو اسرزد جو اس کو پھر کہوں تو ہووےں مردودِ مسلمانی
 کدھرا ب فہم ناقص لے گیا مجھ کو، نہ یہ سمجھا کہ وہ مہر الوہیت ہے یہ ہے ماہِ کنعانی
 اس کے بعد قصیدے کے اختتامی اشعار ہیں لیکن انھیں اس قصیدے کا کمزور ترین حصہ کہنا
 چاہیے کیونکہ اس میں سودا نے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے معاذ اللہ عبد و معبود کے درمیان فرق کو
 مٹانے کی جسارت کی ہے کہتے ہیں:

جو صورت اس کی ہے لاریب ہے وہ ہے صورتِ ایزد جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی
 حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر کہ دیکھا جن نے ان کو ان نے دیکھی شکلِ یزدانی
 یہاں ضمناً یہ عرض کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں عرتی شیرازی کا نعتیہ قصیدہ میمہ
 بھی بہت مشہور ہے اور اس میں بھی نعت کی بنیاد زیادہ تر خیالی مضامین پر رکھی گئی ہے ممکن ہے کہ سودا
 نے اس قصیدے کو بھی پیش نظر رکھا ہو اس کا مطلع یہ ہے:

اقبال کرم می گزدار باب ہم را ہمت نکشد نیشتر لاؤنم را
(عالی حوصلہ لوگ امرا کے لطف و کرم سے اذیت محسوس کرتے ہیں
کیوں کہ انھیں امیروں کے انکار و اقرار کی تاب لانا دشوار ہوتا ہے)
اس قصیدے کے چند نعتیہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تا شیر بردسہم تو از حکم کواکب تفسیر دہد ہیبت تو طعم، نعم را
(اے رسول پاک آپ کے خوف کی وجہ سے ستاروں کے خواص زائل ہو
جاتے ہیں) [یعنی خمس ستارہ بھی سعد بن جاتا ہے] اور آپ کی ہیبت کی وجہ سے
نعمتوں کا ذائقہ تبدیل ہو جاتا ہے] یعنی زہر آلود کھانا بھی بامزہ ہو جاتا ہے)

انعام تو بردوختہ چشم و دہن آرز احسان تو بشکافتہ ہر قطرۂ یم را
(آپ کے انعام نے لالچ کی آنکھ اور اس کا منہ بند کر دیا ہے اور آپ کے احسان
نے) [بخشش کے لیے موتیوں کی تلاش میں] سمندر کے ہر قطرے کو چیر ڈالا ہے)

تا ذات ترا اصل مہمات نخواند نشید قضا ترجمہ لفظ اہم را
(جب تک آپ کی ذات پاک کو اصل مہمات کہہ کر پکارا نہ گیا، اس وقت
تک قضا و قدر کو لفظ ”اہم“ کا ترجمہ سننا نصیب نہ ہوا)

تا مجمع امکان و وجوبت ننوشتند مورد متعین نشد اطلاق اعم را
(جب تک آپ کی ذات والا صفات کو مجمع امکان و وجوب نہ لکھا گیا، اس
وقت تک مفہوم اعم کے اطلاق کا محل متعین نہ ہو سکا)

تقدیر بہ یک ناقہ نشاید دو محمل سلمائے حدوث تو ولیلائے قدم را
(قدرت کے ہاتھوں نے ایک ہی اوٹنی پر آپ کے حدوث کی سلمیٰ اور قدم
الہی کی لیلیٰ کے دو کجاوے کس دیے ہیں)

تا نام ترا افسر فہرست نکردند شیرازہ مجموعہ غبستد کرم را بے
(جب تک آپ کا نام نامی سر فہرست نہ رکھا گیا، مجموعہ کرم کی شیرازہ
بندی نہ ہو سکی)

لیکن یہاں سودا و عرقی کے موازنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تتبع کی کوشش کے باوجود سودا، عرقی
کی بلند فکری سطح تک پہنچنے سے قاصر رہ گئے ہیں۔

اب ہم اقبال سہیل کے قصیدے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ چوں کہ یہ قصیدہ نعتیہ ہے۔ اس لیے سہیل نے یہ التزام کیا ہے کہ اس کی تشبیہ کے ہر شعر میں جلوہ و نور یا لطف و سرور یا حسن و عشق یا باغ و بہار کا کوئی نہ کوئی تلازمہ ضرور رکھا جائے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

تلازمات نور

ابھی تک کہہ رہا ہے ذرہ ذرہ دشتِ ایمن کا
ادھر دوشیزہ کرنوں کا ٹکنا سمت مشرق سے
ادھر صبح گریباں چاک کاراہِ عدم لینا
قیامت ہے قیامت جلوۂ جاناں کی عریانی
ادھر بزمِ جہاں سے رخصتِ شمعِ شبتانی
ادھر خورشیدِ عالم تاب کا آغازِ رخسانی

تلازمات بہار

کہیں دوشِ صبا پر رقص کرنا نکبتِ گل کا
ادھر غنچوں کے لب پروردِ یافقہ جاری ہے
ادھر سبزے کا جاگ اٹھنا خمارِ خوابِ نوشیں سے
کہیں شاخِ نشیمن پر عنادل کی حدی خوانی
ادھر محوِ اقامت ہے قطارِ سروِ بستانی
ادھر بادِ سحر سے زلفِ سنبل کی پریشانی

تلازمات حسن و عشق

تمناؤں کا حشر اٹھا ہے پھر ویرانہ دل میں
چمن میں جس طرف دیکھو نظر بازوں کا جھرمٹ ہے
نہ جانے حسن ہے یا عشق اتنا جانتے ہیں ہم
جنوں نے دل کو دی پھر دعوتِ شوریدہ سامانی
الہی! کوچہ قاتل ہے یا صحنِ گلستانی
ہمیں کھینچے لیے جاتا ہے کوئی جذبِ پنہانی
نعت کے لحاظ سے سہیل کے قصیدے کی یہ تشبیہ موقعِ محل اور مقتضائے حال کے عین مطابق ہے۔ اس لیے کہ آئندہ ذکر کیے جانے والے مضامین سے اس کا ربط و تعلق ظاہر و باہر ہے۔ اس کے برخلاف سودا کے قصیدہ نعتیہ کی تشبیہ اگرچہ حکیمانہ و فلسفیانہ افکار و خیالات پر مبنی ہونے کی بنا پر دلچسپ اور پرکشش ہے لیکن مضمونِ نعت سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی۔ اسی طرح سودا کے قصیدے کا مطلع بھی اگرچہ فکر اور ندرت خیال کے لحاظ سے چونکا نے والا ہے لیکن نعتیہ قصیدے کے لیے مناسب و موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ کیوں کہ اس میں کفر کو تمغائے مسلمانی کہا گیا ہے اور علامتِ کفر زنار کے بالمقابل حاملِ لواے اسلام شیخ کو عاجز و بے بس دکھلایا گیا ہے۔ یہی اعتراض محسن کا کوروی کے معرکہ آرا قصیدہ لامیہ پر بھی کیا گیا ہے کہ اس کی تشبیہ میں بھی کفر اور علاماتِ کفر کا تذکرہ اس زور و شور سے کیا گیا ہے کہ اس کے مقابلے میں اسلام دبتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن سہیل نے ایسے کسی

اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی بلکہ معاملہ برعکس رکھا ہے۔

تشبیہ کی طرح سہیل کے قصیدے کی گریز بھی بہت خوب ہے کیوں کہ یہاں تشبیہ سے نعت اس طرح بے ساختہ برآمد ہوئی ہے جس طرح کلی سے پھول برآمد ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

کمال عاشقی ہے آپ مرنا اپنے جلوؤں پر مرے مذہب میں خود بینی کو کہتے ہیں خدادانی
خود اپنی شکل دیکھی پردہ برقی تجلی میں تعجب کیا اگر تھی دیدہ موسیٰ کو حیرانی
کہاں کا دشت ایمن طور کیا، برقی تجلی کیا یہ سب کچھ تھی جمال مصطفیٰ کی پر تو افشانی
گریز کے بعد مدح یا نعت شروع ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سہیل کے زیر بحث قصیدے کا سب سے منفرد اور دلکش حصہ یہی ہے۔ اس انفرادیت کے کئی پہلو ہیں: اول یہ کہ سہیل نے نعت کی بنیاد جن مضامین پر رکھی ہے وہ روایتی اور بار بار کے باندھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بیشتر سہیل کے ہاں پہلی بار سلک نظم میں پروئے گئے ہیں مثال کے طور پر نعت کے یہ ابتدائی اشعار دیکھیے:

محمد وہ کتاب کون کا طغرائے پیشانی محمد وہ حریم قدس کا شمع شبستانی
محمد یعنی وہ حرف نخستیں کلکِ فطرت کا محمد یعنی وہ اعضائے توقیعات ربانی
وہ فاتح جس کا پرچمِ اطلس زنگاری گردوں وہ انسی جس کے آگے عقل کل طفل دبستانی
وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے وہ فارق زہد سے جس نے مثالیاداغ رہبانی
وہ ناطق جس کے آگے مہر بربل بلبیل سدرہ وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطق ربانی

نعت گو سہیل کا دوسرا امتیازیہ ہے کہ ان کے اکثر و بیشتر مضامین نعت کا ماخذ و مصدر آیات قرآنی، احادیث نبوی اور کتب سیرت و شمائل ہیں جنہیں سہیل نے اعلیٰ درجے کی شاعرانہ فن کاری و ہنرمندی کے ساتھ نظم کیا ہے چنانچہ ان کے نعتیہ اشعار حقائق پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ شکوہ بیان، روانی، موسیقیت اور تازگی و طرفگی کی صفات سے بھی متصف ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان میں معنوی مناسبات اور لفظی رعایات کا بھی پورا اہتمام کیا گیا ہے۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر کلام شاعر کو سحر حلال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ عادل جس کی میزان عدالت میں برابر ہے غبار مسکنت ہو یا وقار تاج سلطانی
وہ جامع جس نے یکجا کر دیے بکھرے ہوئے طے مٹادی جس نے آ کے باہمی تفریق انسانی
وہ آموزِ فطرت جس نے سب سے پہلے دنیا میں بتائے اہل عالم کو حقوق جنس نسوانی
وہ گنجورِ معارف جس کے اک اک حرف میں پنہاں نکات فلسفی، اسرار نفسی، راز عمرانی

وہ کشف سرائے جس نے کھولا چند اشاروں میں علوم اولین و آخرین کا گنج پنهانی
سہیل کے اس نعتیہ قصیدے میں بعض ایسے خوب صورت اشعار بھی ہیں جن کی مثال نعتیہ
شاعری کے پورے ذخیرے میں بہ مشکل مل سکے گی۔ مثلاً:

تراشہ جس کے ناخن کا ہلال آسماں منزل غسالہ جس کے تلوؤں کا زلال آب حیوانی
نہیں مہر درخشاں اس کے فیض جبہ سائی سے چمک اٹھا ہے چرخ چار میں کا داغ پیشانی
نعت میں انبیائے سابقین کا ذکر بالعموم آتا ہے اور آنا بھی چاہیے لیکن بعض اوقات یہ تذکرہ
شایان شان نہیں ہوتا۔ سہیل کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ انبیاء و رسل کے ذکر میں حفظ مراتب کو ملحوظ
رکھتے ہیں۔ زیر بحث قصیدے سے بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وہ مقصود دو عالم مستغاث قاصی و دانی کیا جس نے مکمل نسخہ اخلاق انسانی
مبشر جس کی بعثت کا ظہور عیسیٰ مریم مصدق جس کی عظمت کا لب موسیٰ عمرانی
تعالیٰ اللہ ذاتِ مصطفیٰ کا حسن لا ثانی کہ یکجا جمع ہیں جس میں تمام اوصاف امکانی
دعائے یونسی، خلق خلیلی، صبر ایوبی جلال موسوی، زہد مسیحی، حسن کنعانی ۸
کسی مضمون کو کم سے کم الفاظ میں ادا کرنا، ایجاز کہلاتا ہے اور تکرار بے فائدہ سے بچتے ہوئے
خوبی و دل آویزی کے ساتھ قدرے تفصیل سے پیش کرنے کو اطناب کہتے ہیں۔ سہیل کو دونوں
طرز ادا پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ زیر بحث قصیدہ نعتیہ کے اشعار اکثر و بیشتر ایجاز کے حامل
ہیں لیکن واقعہ معراج کا ذکر انھوں نے اطناب کے پیرائے میں کیا ہے۔ اس سلسلے کے بھی چند اشعار
ملاحظہ ہوں:

حریم ام ہانی میں حضور آرام فرما تھے در دولت پہ قدسی و ملک تھے محو در بانی
وہ چشم زکسیں تھی بند لیکن چشم دل وا تھی سرھانے طالع بیدار کرتا تھا مگس رانی
ادب سے آ کے جبریل امیں نے یہ گزارش کی کریں سرکار بزم نور تک تشریف ارزانی
سنی روح القدوس سے جب طلب بزم حضوری کی اٹھے اوردی براق پاک پر دادِ سبک رانی
براق برق پیکر لے چلا یوں ذاتِ انور کو فضا میں تیر جائے جس طرح بجلی کی تابانی
حضور اس طرح گزرے گنبد مینائے گروں سے نظر جس طرح شیشے سے گزر جائے بہ آسانی

سہیل کے قصیدہ نعتیہ کے کسی قدر تفصیلی تجزیے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منیر
شکوہ آبادی کے ”قصیدہ در نعت“ موسوم بہ ”فریاد زندانی“ کا بھی ذکر کیا جائے۔ حسن اتفاق کہ منیر

کا قصیدہ بھی سودا ہی کی زمین میں ہے۔ اس کا مطلع اس طرح ہے:

ربخ احباب سے ظاہر ہوا ہے بغض پنہانی صفائی کے گواہوں میں ہے کاذب صبح پیشانی
منیر شکوہ آبادی امیر اور داغ کے معاصرین میں ہیں۔ انھوں نے قصیدہ گوئی کے فنی لوازم کا
اہتمام کرتے ہوئے باکثرت قصائد لکھے ہیں۔ ۹۱ ان کا زیر بحث قصیدہ اس لحاظ سے ایک معرکہ
آرا قصیدہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ شعوری طور پر سودا کا تتبع کیا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی ہر طرح
ان سے آگے نکل جانے کی کوشش کی ہے چنانچہ سودا کا قصیدہ ۳۸ اشعار پر مشتمل ہے تو منیر نے
اپنے قصیدے کی تعداد ابیات ۱۹۸ رکھی ہے۔ اسی طرح قصیدے کے تمام اجزائے ترکیبی میں عموماً اور
مضامین نعت کے بیان میں انھوں نے سودا سے کہیں زیادہ زور طبع صرف کیا ہے مثلاً سایہ مبارک
کے معدوم ہونے کا مضمون سودا نے صرف ایک شعر میں اس طرح ادا کیا تھا:

نہ ہونے سے جدائے کے اس قامت سے پیدا ہے قیامت ہووے گا دلچسپ وہ محبوب سبحانی
تو منیر نے اسی مضمون کو سات شعروں میں اس طرح باندھا ہے:

کہوں کیا سایہ پر نور کے معدوم ہونے میں سمجھوں کے تو سن فکرت نے کی ہے اس میں جولانی
نہ ہوتا جمع یہ سایہ اگر مدامت میں نہ ہوتی خوش سواد اس مرتبہ اقلیم روحانی
سیاہی چشم وزلف حور کی اس کی بدولت ہے قلم نے لوح پر لکھے اسی سے حکم ربانی
کلام پاک میں واللہ اسی کو حق نے فرمایا امانت ہے قسم کے واسطے یہ ظل نورانی
یہی تو پردہ دار عاشق و معشوق ٹھہرا تھا شب معراج بن کر کی اسی نے نور افشانی
اسی سائے نے شاید لے لیا ظل حمایت میں کہ طوبیٰ کی ملائک کرتے ہیں اتنی نگہبانی
بنی شام جوانی بھی اسی سائے کے صدقے میں لباس کعبہ نے پائی اسی سے مشک افشانی
ان سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ منیر، سودا کے دائرے سے باہر نہیں جاتے یعنی
جس طرح سودا روایتی یا خیالی مضامین پر نعت کی بنیاد رکھتے ہیں وہی کیفیت منیر کی بھی ہے مثال کے
طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

نہیں ممکن کرے کوئی گمانِ بطنِ نورانی عبث باندھے ہے پتھر پیٹ پر مہر سلیمانی
بڑھے گی اس قدر حیرت جو صبرِ پاک دیکھے گا بنے گا سورہ صاداک نظر میں چشمِ قربانی
مگر فرشِ زمیں پر روضہ اقدس بنانا ہے سروں پہ ڈھوتے ہیں حور و ملائکِ حشمتِ پیشانی
سوا پایا مزا، اصلی وطن سے آپ کے دل میں اتر کر لامکاں سے آئیں جب آیاتِ قرآنی

جو زربخشی کی خاطر نام لکھے وہ فقیروں کا نوالہ کھائے سونے کا دہان میم مہمانی
جو اس کے گیسوئے پر نور حکم عام فرمائیں کسی گھر میں نہ کرنے پائے جمعیت پریشانی ۱۰
ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ منیر باوجود شاعرانہ قادر الکلامی اور طباعی کے روایت کے
دائرے میں محصور ہیں۔ اس کے برخلاف اقبال سہیل اس حصار کو توڑنے میں کامیاب نظر آتے ہیں
اور جیسا کہ تفصیل سے ذکر کیا گیا یہی ان کا نشان امتیاز ہے۔ البتہ ”عیب ے جملہ بگفتی ہنرش نیز
بگو“ کے بہ مصداق اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ سہیل کے زیر بحث نعتیہ قصیدے میں دعا
کا حصہ مفقود ہے حالانکہ منقبتی قصائد کا عموماً اور نعتیہ قصائد کا خصوصاً یہ ایک اہم اور ضروری جز ہے۔



حواشی

۱۔ کلیات سہیل، اقبال سہیل خاں سہیل، مرتبہ عارف رفیع، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء، ص ۷

۲۔ ایضاً، ص ۸

۳۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۔ کلیات خاقانی، مطبع نول کشور ۱۲۹۳ھ، ص ۲۴

۵۔ دیوان خاقانی شروانی، انتشارات ارسطو ۱۳۶۲، ایران، ص ۳۳۵-۳۴۰

۶۔ انتخاب قصائد اردو، مرتبہ: ڈاکٹر ابو محمد سحر، طبع چہارم، ۱۹۹۵ء، ص ۳۴-۳۶

۷۔ کلیات عرفی شیرازی، بہ کوشش غلام حسین جواہری، ایران، سنہ ندارد، ص ۹-۱۱

۸۔ کلیات سہیل، ص ۳۰-۳۴

۹۔ انتخاب قصائد اردو، ص ۱۲۸-۱۳۶

امین راحت چغتائی۔ اسلام آباد

اختر ہوشیار پوری کی نعت..... ایک مطالعہ

(۲۰/ اپریل ۱۹۱۸ء۔ ۱۸/ مارچ ۲۰۰۷ء)

ABSTRACT:

Akhtar Hoshiarpuri was a renowned poet who contributed towards genre of Naat with his five poetry collections, besides 11 collections of general poetry. Humiliation, Respectful attitude and modern trend of expression with new style have made him unique in the field of Naat creators. Some stylistic couplets have been cited here in order to strengthen the narrative of writer for the purpose of introduction of the late poet.

میں اختر ہوشیار پوری مرحوم کی شاعری کے ساتھ نصف صدی سے زیادہ عرصہ بسر کر چکا ہوں اور انھیں زندگی کے آخری لمحوں تک ویسا ہی تازہ فکر پایا جیسا انھیں ۱۹۳۸ء میں اپنی پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔ اُن کی شاعری میں کہیں تھکن کا احساس ہے نہ انھوں نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ مجموعی طور پر اُن کے سولہ مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور ”خیر البشر“ اُن کا چودھواں (۱۹۹۹ء) مجموعہ کلام ہے اور نعت نگاری کے لحاظ سے چوتھا۔ اُن کے نعت کے دو مجموعے ”برگِ سبز“ اور ”بجٹی“ بالترتیب ۱۹۸۷ء اور ۱۹۹۷ء میں نظر نواز ہوئے۔ ۱۹۹۸ء میں منعقد ہونے والی قومی سیرت کانفرنس میں وزیراعظم جناب محمد نواز شریف نے بذاتِ خود انھیں ”موخر الذکر“ مجموعے پر انعام دیا تھا جو جناب اختر ہوشیار پوری نے کانفرنس ہال میں ہی وزیراعظم کے خود انحصاری فنڈ میں دے دیا تھا۔ اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت نگاری پر ملنے والے انعام کا اس سے زیادہ مبارک مصرف اور کیا ہو سکتا تھا۔

جناب اختر ہوشیار پوری جس طرح جدید اردو غزل کو نیا اسلوب اور لہجہ دینے والے اکابر شعرا میں شمار ہوتے ہیں اُسی طرح جدید نعت میں بھی اُن کا لہجہ نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ اُن کی نعت کے پانچوں مجموعوں میں تین خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ اول: عجز و انکسار، دوم: حدادب اور

سوم: غیر روایتی موضوعات اور تینوں اوصاف کا اسلوب بیان نیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ”برگ سبز“ ۱۹۸۸ء کی مختلف نعتوں کے یہ تین اشعار پڑھیے:

قرطاس کا سینہ ہے، مری نوکِ قلم ہے یہ معجزہ نعتِ خداوندِ حرم ہے

☆☆

قلم کارو! حرا سے حرف کی آواز آتی ہے کہ اب آواز کے سورج کو دلی میں نکلنا ہے

☆☆

اُن کی گلیوں کی اگر خاک میسر آ جائے آئینہ ہو کہ نہ ہو، آئینہ گر بن جاؤں
اب مجتبیٰ کے یہ اشعار دیکھیے۔ مواجہہ شریف سامنے ہے جہاں بڑے بڑوں کا دامنِ صبر ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے مگر مجتبیٰ کے شاعر کے عجز اور حسنِ طلب کا اسلوب نرالا ہے۔
میں نے ہاتھوں پہ سجایا ہے لبوں کو اختر اور پھیلا دیا ہاتھوں کو کہ چھلکے چھاگل
اس شعر کو بار بار پڑھ کر یہ احساس شدت سے غالب رہتا ہے کہ معاصر شعرا کے ہاں ایسا نادر و نایاب اسلوب کم کم نظر آتا ہے جس میں دربارِ رسول کے تمام آداب بھی ملحوظ خاطر ہوں اور عاجزانہ طلب بھی ہو۔ پاسِ ادب کے ساتھ مدحتِ سرائی کا ایک اور انداز دیکھیے:

وہ درگہ مکرم، وہ درسِ گاہِ عالی مٹی کا ہر ہیوٹی انسان ہو گیا ہے

مجتبیٰ کے غیر روایتی موضوع اور اسلوب کا بھی ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہنگامِ اذال، حرفِ کانمِ چوم کے خوش ہوں جب نامِ ترا آئے، قلمِ چوم کے خوش ہوں

اب آئیے تیسرے مجموعہ ”رسالتِ مآب“ ۱۹۹۹ء کی طرف نعتیہ ادب کے قارئین و ناقدین یہ کلام پڑھنے کے بعد محسوس کریں گے کہ جناب اختر ہوشیار پوری بڑی خاموشی سے نعت کے جدید شعرا کی ذہنی تربیت کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی نعتیہ فضا یکسر مختلف ہے۔ اس میں نہ صرف مذکورۃ الصدر کتابوں کے اوصاف برقرار ہیں بلکہ اکثر مقامات پر خیال کی ندرت، الفاظ کی جدت اور معانی کی لطافت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا ہے کہ آنکھیں فرطِ عقیدت سے چھلکتی ہیں تو روح انوکھے کیف و سرور سے سرشار ہوتی ہے۔ یہی نہیں نعت کی صورت میں عصرِ حاضر پر مرتب ہونے والی سیرتِ رسول کے اثرات کا ظہور بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً:

آپ کا طرزِ کلام و گفتگو سنتی رہیں تب کہیں چٹکی ہیں کلیاں بادِ صبح و شام سے

☆☆

یوں فرشتے ہیں عرش پر جیسے کوئے خیر الانام ہوتا ہے
 ☆☆
 میں لوٹ لوٹ کے آتا ہوں دیکھنے تجھ کو کہ جیسے میرا پلٹنا ہی رقصِ آہو ہے
 ☆☆
 کوئی فرشتہ سپردِ قلم کرے آکر بیان کرنے لگا ہوں میں داستانِ رسول
 ☆☆
 درودوں کی صداؤں کے تصدق میں اپنے قد سے اونچا ہو گیا ہوں
 ☆☆
 تو نے انساں کو بلند اتنا کیا سوچتا ہوں اب گداؤں کو میں شاہوں کے مقابل سمجھوں
 ☆☆

اختر یہ عرصہ، عرصہ ختم الرسول ہے روزِ ازل کی صبح بھی، یومِ نشور بھی
 میں نے یہ چند اشعار یونہی منتخب نہیں کر لیے بلکہ انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے
 کہ جناب اختر کی نعت میں ایک نیا پن تو ہے ہی مگر یہ اُسے عصرِ حاضر کے دوسرے نعت گو شعرا سے
 متمیز بھی کرتا ہے۔ اُن کے اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان میں جدید عہد کے تقاضوں کی جھلک بھی ہے
 اور ذات و صفات دونوں حوالوں سے لکھی جانے والی نعت کا دلاویز امتزاج بھی۔ اُن کی نعت کیف
 افزا شاعری کے ذیل میں بھی آتی ہے اور عقل و خرد کو شکار ہونے سے بھی بچاتی ہے۔ ہمارے عہد میں
 توحید و رسالت کی حد فاصل کو جن نعت گو شعرا نے بڑی احتیاط سے سمجھا ہے اُن میں سرِ فہرست تو حفیظ
 تائب ہیں مگر اُن کے ہمراہ اب اختر ہوشیار پوری بھی ہیں۔

جناب اختر کا چوتھا مجموعہ نعت ”خیر البشر“ ۲۰۰۰ء ہے۔ جسے وزارت مذہبی امور انعام سے بھی
 نواز چکی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلٹ نے ایک بار کہا تھا کہ شاعری کا پہلا منصب مسرت بہم پہنچانا ہے۔ وہ
 خود مذہبی آدمی تھا۔ مذہب اور ادب میں کسی خط امتیاز کا قائل نہیں تھا۔ اُس نے مسرت کی کوئی وضاحت
 نہیں کی۔ یہ روحانی بھی ہو سکتی ہے اور مادی بھی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ مسرت روح کے ذریعے
 ہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا اور فکر و عمل سے سرشار ہو کر نعت تخلیق
 کرتا ہے تو یہ اُس کی محض ذاتی روحانی مسرت نہیں ہے بلکہ حضور و حتمی مرتبت کا ہر امتی اس سے سرشار
 ہوتا ہے اور ”خیر البشر“ میں بھی کچھ ایسی ہی سرشاری ہے۔ کتاب میں کہیں مایویسی، اندھیروں
 یا ناکامیوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی کے باعث بہاروں کی آمد، خوشبوؤں کی

اڑان، سنبل وریحاں کی مہکار کا ذکر ہے۔ یہ سب رجائیت کی علامتیں ہیں اور اختر خود:

خدا کرے کہ زمانہ بھی نیند سے جاگے سحر کے وقت میں جب اُن کا نام لے کے اٹھوں
کہتا ہوا لوگوں کو پیامِ حیات دے رہے ہیں۔

اس مجموعے میں فضائل و شمائل کا بیان زیادہ ہے اور رنگ تغزل بھی اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ
بھرپور ہے اور ادھر اختر کی بعض غزلوں پر بھی نعت کا رنگ چھایا ہوا ہے اب دونوں رنگوں کی گھلاوٹ
سے یہ شعر تخلیق ہوا:

مری داستانِ حیات میں ترے نام ہی کی بہار ہے تری صبح ہی کے گلاب ہیں تری شام ہی کی بہار ہے
اور فضائل کی عظمت نے اس شعر کو جنم دیا۔

زمانہ تو یہاں سے ہے وہاں تک محمد ہیں مکان و لامکاں تک
اب اسی مزاج کے چند اور اشعار دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ جناب اختر کے ہاں نئی نعت نے فروغ
پایا ہے یا نہیں؟

شعور آدمی نے کروٹیں لیں گلستانِ مدینہ کی ہوا سے

☆☆

کب بامِ افق پر کچھ دھرا ہے سورج تو حرا سے پھوٹا ہے

☆☆

آپ سے حال و ماضی ہوئے سربہ خم اور فردا ہے عقدہ کشا آپ سے

☆☆

پہلے اُن کا نام لکھا اور پھر لب رکھ دیئے آفرینش کی حدیثِ دلربا کہتے ہوئے

اور ۲۰۰۳ء میں ”خاتم المرسلین“ (پانچواں مجموعہ نعت) مرتب کرنے تک جناب اختر

ہوشیار پوری ”سند امتیاز“ (۷/ جولائی ۱۹۹۸ء) اور تمغہ امتیاز (۲۳/ مارچ ۱۹۹۹ء) سے سرفراز ہو چکے

تھے۔ ”خاتم المرسلین“ کی طباعت کے وقت وہ عمر کی ۸۵ منزلیں طے کر چکے تھے اور آج میں خود اُن

کے نعتیہ مجموعوں کا جائزہ لیتے وقت بفضلہ ۸۷ سال کے مراحل میں ہوں، الحمد للہ!

نعت کے ضمن میں وہ خود بہت محتاط شاعر تھے۔ ”خاتم المرسلین“ کے پیش لفظ ایک طرزِ احساس

میں وہ بصدِ عجز کہہ چکے ہیں کہ نعت کہتے وقت توحید و رسالت کا امتیاز ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر رہا نیز کوئی

لفظ یا ترکیب ایسی نہیں جو شائستہ دربارِ نبی نہ ہو اور یہ درست ہے اُن کی ہر نعت میں مقامِ آشنا التجا

اختر ہوشیار پوری کی نعت.... ایک مطالعہ

ہے۔ مدینے سے وابستگی کے ہزاروں اظہار ہیں اور ہر اظہار میں ایک قرینہ ہے بلکہ زیر نظر مجموعے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کوئی نعت ایسی نہیں جو مدینے کی برکات کے ذکر سے خالی ہو اور چوں کہ یہاں مدینہ موضوعِ سخن ہے اس لیے اسلوبِ سخن میں غزل کا رنگ در آیا ہے۔ مثلاً:

وجہ بہار زیست مدینے کا پھول ہے میری رگوں میں خوں نہیں، حب رسول ہے

☆☆

کیا کہوں لطفِ نبی کا اعجاز مکہ جاگا ہے، مدینہ جاگا

☆☆

شہرِ نبی میں چھاؤں بھی، لطفِ شگفتگی بھی ہے روشنی سحر بھی ہے، چاند کی چاندنی بھی ہے

☆☆

سوادِ وادی طیبہ ہے صحنِ امن و سکون کہ اس کے حلقے میں تفریقِ نام و ذات نہیں

☆☆

پاہی لیں گے کسی روز منزل قافلے چل دیئے ہیں مدینے

دوسرا پہلو جو اس کتاب میں بہت نمایاں ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وجہ کائنات ہونا ہے اور انھی کو شمع مہر بھی کہا گیا ہے اور چاند کا اجالا بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو نعمتِ جاں اور دولتِ ہستی سے تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی وہ چوکھٹ ہے جس سے زمانے کا بھلا ہوتا ہے۔ یہیں سراپا غزل کے انداز کا بھی ایک بولتا ہوا شعر نظر سے گزرے گا۔ ملاحظہ فرمائیں:

جنش لب میں شگوفوں کی چٹک ہے پنہاں بات کے لہجے میں اندازِ صبا ہوتا ہے

جنابِ اختر نے ”مجتبیٰ“ کے پیش لفظ میں خود بڑے شوق سے یہ اقرار کیا ہے کہ میں نے نعتِ جوش سے نہیں ہوش سے کہی ہے اور اپنی اوقات کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ عشقِ رسول، اطاعتِ رسول کے سوا کچھ نہیں خود خالقِ ہر دو جہاں اپنی محبت کو اتباعِ رسول سے مشروط کر رہے ہیں۔ اب آخر میں جنابِ اختر ہوشیار پوری کا ایک غیر فانی شعر ملاحظہ فرمائیں:

ارض طیبہ میں میرے نبی کا وجود جیسے قرآنِ اختر ہو جزدان میں

۴۶۵

نعیم صدیقی..... ایک منفرد نعت گو

ABSTRACT:

Naeem Siddiqi was a prominent religious scholar, poet and Editor of a periodical Journal Saiyyara. He contributed towards creative literature of genre of Naat in Urdu besides presenting biographical study of Prophet Muhammad (S.A.W). This article delineates features of devotional poems written by Naeem Siddiqi in order to showing literary worth.

قرآن پاک کے نزول سے قبل الہامی صحائف میں النبی الممتظر ملتا ہے۔ چنانچہ راہبوں اور نجومیوں نے بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا تذکرہ کیا اور پیش گوئیاں کیں۔ پھر قرآن پاک نازل ہونا شروع ہوا تو خود رب کائنات نے قرآن مبین میں درود کی ابتدا کی اور نعت کا حکم دیا۔ حدیث شریف میں بھی ایسے واقعات مذکور ہیں جو نعت کے ذیل میں آتے ہیں۔ ہجرت کے بعد حضرت حسان بن ثابت اور دیگر شعرا نے نعتیں لکھیں۔ جب عرب سے نکل کر عجم میں اسلام کا ظہور ہوا تو فردوسی سے لے کر شیخ سعدی تک تمام نامور شعرا نے اعلیٰ پائے کی نعتیں اور قصائد لکھے۔

اردو زبان اور ادب میں نعت گوئی کی روایت اور ارتقا اردو زبان کے ارتقا کے ہم قدم رہا۔ جنوبی ہند میں جو مولود نامے، نور نامے اور قصائد لکھے گئے ان میں اردو نعت کا سرمایہ فنی سے زیادہ تبلیغی اور مقصدی ہے البتہ شمالی ہند میں شعرا نے نعت گوئی کے فن کو فکری اور فنی جہت دی۔ لکھنؤ میں کئی ایک شعرا کا سرمایہ زیادہ تر نعت پر مشتمل نظر آتا ہے اور نعتیہ دیوان لکھے گئے۔ امیر مینائی اور محسن کا کوروی اور آگے چل کر حالی کی نعتیہ شاعری نے نعت گوئی کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ اب نعت گوئی کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا اور مضمون آفرینی اور خیال بندی میں صنائع و بدائع کا بکثرت استعمال ہونے لگا۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی جو ایک بڑے عالم دین اور محبت رسول تھے، انھوں نے منطق و ہیئت اور نجوم و ہندسہ کی اصطلاحات کو شامل نعت کیا اور اس دور میں نعت کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔

اقبال کا کلام عشق رسول اور پیام قرآن سے بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک رجحان ساز شاعر تھے اور ان کے بہت سے نعتیہ اشعار زبان زد عام ہیں۔ حالی، اقبال اور ظفر علی خان نے سیرت پاک کے اہم واقعات اور تعلیمات رسول کو نعت کا موضوع بنایا اور استمداد و استغاثہ کو جزو نعت بنایا تو نعت گوئی کا کینوس وسیع ہوتا گیا۔ نعیم صدیقی نے نعت گوئی کی ابتدا کی تو نعتیہ کلام اور اس کے موضوعات کا یہ سارا تناظر ان کے سامنے تھا۔

نعیم صدیقی کی شاعری کا دورانیہ ستر سال پر محیط ہے۔ ۱۹۳۲ء سے تادم واپس یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگرچہ ابتدا میں انھوں نے دیگر اصنافِ شعر کے ساتھ نعت میں بھی طبع آزمائی کی لیکن ۱۹۶۳ء میں جب انھوں نے ادبی پرچہ ماہنامہ ”سیارہ“ جاری کیا تو نعت کی ترویج ان کے مشن کا جزو اعظم بن گئی اور نعت کے دور نو میں جوار تھا ہوا، اس میں ماہنامہ ”سیارہ“ کا کردار نمایاں ہے۔

نعیم صدیقی کی زندگی مقصدیت کے تابع رہی اور ان کی تخلیقات میں مقصدیت کی چھاپ نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے نعت گوئی میں بھی مقصدِ حیات سے صرف نظر نہیں کیا۔ اپنی نعت گوئی کے اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

”میں نے ساری شاعری اس شعور کے ساتھ کی ہے اور اسی شعور کے ساتھ

نعت لکھ کر میں نے محسوس کیا ہے کہ میں لادینیت کے خلاف خدا پرستی کے محاذ

کو مضبوط کر رہا ہوں۔“

کسی شخصیت کے فکرو فن اور افکار و نظریات کی قدر و قیمت کے تعین اور اس کی بہتر تفہیم کے لیے اس کے نظریہ فن کا جاننا ناگزیر ہوتا ہے۔ نعیم صدیقی ادب میں مقصد کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں اور مقصد سے مراد نظریہ حیات ہے جس پر ادب کی عمارت تعمیر کی جانی چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جس کے مطالعے کے بعد قاری محسوس کرے کہ فکر و نظر کی راہوں پر ترقی کا کوئی قدم اٹھایا ہے۔ ان کے بقول ”شعر میں جمالیات کے ساتھ پیغمبرانہ روح بھی ہونی چاہیے اور پیغامِ شعر اس طرح ہونا چاہیے جیسے کسی پیکر میں روح ہوتی ہے کہ وہ دکھائی نہیں دیتی مگر کام کرتی ہے۔“

اسی طرح نعیم صدیقی اپنی نعت گوئی کے حوالے سے اپنے نظریہ فن کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

”میں نے جس نظریے کو دل میں رچا کر نعت کے میدان میں کام کیا، وہ یہ تھا

کہ ہر وہ شعری کاوش نعت میں داخل ہے جس کا مرکزی سرچشمہ تخلیقِ محبت

رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ حتیٰ کہ آزاد نظم کی کوئی لمبی نیل ہی کیوں نہ ہو، اس کی روح بھی جذبہ عقیدت رسالت ہے تو اس کا ہر پھول، اس کی ہر پتی اور ہر کوپل نعت کی تعریف میں شامل ہے۔“ ۳

ان کے مجموعہ نعت اور رسائل و جرائد میں اور غیر مطبوعہ نعتوں کے مطالعے سے ان کے اس نقطہ نظر کی تصدیق ہوتی ہے۔ انھوں نے نعت کی تخلیق میں اس نقطہ نظر اور نظریے کو اوجھل نہیں ہونے دیا اس لیے نعت ان کے ہاں روایتی پن یا محض فنی ریاضت کا عکس نظر نہیں آتی۔ ان کی جملہ تخلیقات کا مرکزہ اسلام ہے اس لیے ہر جگہ ادب برائے زندگی کا نظریہ موج زن نظر آتا ہے۔ اسی نظریے کی پاسداری میں ان کی نعتوں میں معنویت کی ایک جیسی لہر نظر آتی ہے۔ البتہ نعت گوئی میں انھوں نے آداب نعت کا پورا پورا خیال رکھا ہے اور الفاظ و تراکیب ایسے منتخب کیے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے شایان شان ہیں۔ وہ نعت گوئی جیسے کارِ مبارک کی نزاکتوں سے پوری طرح آگاہ ہیں اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں:

”میرے سامنے تین تقاضے بہ یک وقت رہتے ہیں۔ حضور کی دعوت انقلاب کا ابھارنا، اس انقلاب کی روح کو کارفرما کرنے کے لیے ہی نعت کے پیرایوں میں نت نئے وضاحتی تجربے کرنا (حتیٰ کہ اصطلاحات اور الفاظ و تراکیب کے دائروں میں ایجادیں کرنا) اور فنی و لسانی حسن کی حباب آسانازک لطافتوں کا تحفظ کرنا بلکہ ان کو نشوونما دینا۔“ ۴

نعت گوئی میں ایک مشکل مقام آتا ہے جہاں ذرا سی لغزش، ذرا سی کوتاہی اور ذرا سا غلو نعت گو کو بہت دور لے جاتا ہے۔ اس مشکل مقام سے گزرنے کے لیے الوہیت اور مقام رسول کا کامل شعور ان کے پیش نظر رہا ہے۔ یہ معاملہ اتنا نازک ہے کہ جنید و بایزید بھی توازن برقرار نہیں رکھ سکتے۔ نعت گو دوہرے رجحانات کی کشمکش سے گزر رہا ہوتا ہے اور عشق رسول میں ڈوب جاتا ہے۔ بقول ماہر القادری:

اک سمت محبت ہوتی ہے اک سمت شریعت ہوتی ہے
یہاں محبت کو شریعت کے پل صراط سے گزرنا ہوتا ہے۔

نعیم صدیقی کی نعتیں اور سیرت پر شاہ کار تصنیف ”حسن انسانیت“ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ان کے دل میں محبت کا دریا موج زن ہے۔ عشق و محبت کی وارفتگی اور عقیدت و ارادت کی لہر ان کے سرمایہ نعت میں اپنے تمام رنگوں کے ساتھ اتر آتی ہے۔ ان کی نعتوں میں منفرد جذب و شوق کے

مناظر ابھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک نعت کا ایک بند ملاحظہ ہو:

ہے مضطرب سی تمنا کہ ایک نعت کہوں
میں اپنے زخموں کے گلشن سے تازہ پھول چنوں
پھر ان پہ شبنم اشکِ سحر گہی چھڑکوں
پھران کی لڑیاں پرو کے تمھاری نذر کروں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں ۵

اور یہ نعت اس شعر پر اختتام پذیر ہوتی ہے:

حضور ایک ہی مصرع یہ ہوسکا موزوں
میں ایک نعت کہوں، سوچتا ہوں کیسے کہوں ۶

حسنِ سلیقہ، گہری درد مندی اور شدید احساسِ یہاں نمایاں ہے۔ اس نعت میں قوم کی زبوں حالی اور ہمارے قومی و معاشرتی رویوں کی عکاسی بھی ہے اور اس میں مولانا حالی، اقبال اور ظفر علی خاں کی روایت کا تسلسل بھی نظر آتا ہے:

عقیدتیں بھی ترے ساتھ کافری بھی پسند
قبول نکتہ توحید، بت گری بھی پسند ۷

نعیم صدیقی نے اگرچہ روایتی ہیئتوں اور پیانوں میں بہت سی نعتیں کہی ہیں لیکن نعت کی تخلیق کے لیے جدید اور ہنسی پیکر بھی تراشے ہیں مثال کے طور پر:

میرے نبی!

میرے نبی محترم:

میرے نبی:

تو مرے دل کی روشنی، تو مری جاں کی تازگی

حرم سے تار و شلم، یرو شلم سے تابہ عرش

طویل ہے تیری گلی ۸

قومی صورت پر استمداد و استغاثہ کو حالی نے اہمیت دی، اقبال اور ظفر علی خاں نے اس میں اضافے کیے۔ اس روایت کو توانا کرنے میں نعیم صدیقی بھی پیش پیش رہے۔ انسانی دکھ درد کی الم ناک تصویریں ان کی نعتوں میں موجود ہیں:

اے میرے نبی صدق و صفا
بن باپ کے عاجز بچے جب افلاس کے گھر میں پلتے ہیں
اور ان کے افسردہ چہرے جب پیٹ کی آگ میں جلتے ہیں
کچھ جھوٹی امیدوں سے ان کو جب بیوہ ماں بہلاتی ہے
ایسے میں تڑپتا ہے یہ دل، ایسے میں تری یاد آتی ہے ۹
اسی طرح قومی اور ملی مسائل اور غم ناک واقعات ان کی نعت میں عام ملتے ہیں:

امت پہ کتنی آج گراں ہوگئی حیات
ارزاں بہت ہی خونِ مسلمان ہے اے حضور
لاشے تڑپ رہے ہیں سردار وزیر تیغ
کیا پُرفتن یہ حشر کا سماں ہے اے حضور ۱۰

اگرچہ حالی، اقبال، ظفر علی خاں اور حفیظ کے ہاں عقیدتوں کی پختہ روایت خاصی توانا تھی اس کے باوجود نعیم صدیقی کے ہاں ثروتِ افکار اور اندازِ بیاں کی فروانی نے اسے اور توانا کیا ہے۔ انھوں نے نعت گوئی، اقبال کا نعتیہ کلام خصوصاً ”فریادِ امت“ اور ظفر علی خاں کی نعتیں پڑھ کر شروع کی البتہ ڈکشن الگ ہے۔ الفاظ کے دروبست، ردیف قافیہ کی غنائیت اور ازان و بحور میں جہاں استفادے کی مثالیں موجود ہیں وہاں نئے تجربات کی جھلکیاں بھی ان کے ہاں عام ہیں۔ مزید یہ کہ انھوں نے سیرت کے انقلابی پہلو کو نعت میں بھی اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

”نعیم صدیقی کے نزدیک نعتِ رسول اکرم شاعرانہ زورِ بیان کے نمونے کی

بجائے حیاتِ افروزِ اسلامی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔“ ۱۰۔ الف

نعیم صدیقی نے آزاد نظم کے بیٹی پیکر کو اپنی نعت کے لیے بار بار استعمال کیا لیکن کہیں بھرتی کا احساس نہیں ہوتا۔ آزاد نظموں میں ”گرداب و گہر“ ان کے بیٹی اور سالیبی روئے کی نمائندگی کرتی ہے۔ انھوں نے بیس پچیس صفحات پر مشتمل طویل نعتیں بھی لکھی ہیں لیکن ان طویل نظموں میں بھی ان کی اپنے فن پر گرفت مضبوط ہے ڈاکٹر تحسین فراقی نے درست کہا کہ:

”نعیم صدیقی نے آزاد نعت گوئی میں کامیاب تجربے کیے ہیں اور عجیب بات

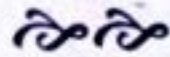
یہ ہے کہ طویل آزاد نعتوں میں بھی نعت کے Tempo میں فرق نہیں

آتا۔“ ۱۱

نعیم کے مجموعہ نعت کے کئی ایڈیشن پاکستان اور بھارت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا دوتین مجموعوں کے برابر نعتیہ کلام زیر ترتیب ہے۔ نعت گوئی میں انھوں نے نعت کو ایک بلند آہنگ دیا۔ انھیں اپنی فنی خوبیوں کا ادراک ہے:

”میرے ہاں زمینوں کا انتخاب، بحروں کی ترتیب، توانی اور ردیف کے نظام اور نظم کے لیے نئی بیٹوں کی تشکیل کے لیے جو چیزیں معیار رہی ہیں ان میں سر فہرست آہنگ ہے..... نئے نئے موضوعات، نئے اسالیب، نئی تراکیب و اصطلاحات اور نئے استعارات خیالات کی تصویر کشی کے لیے اختیار کرنے پڑے۔“ ۱۲

اس آہنگ نے قاری کو متوجہ کیا لیکن کہیں کہیں مفہوم و معانی کو نقصان پہنچا البتہ نعت کے لب و لہجے میں حسن کا اضافہ ہوا۔ نعت گوئی کے علاوہ نعیم صدیقی نے پاکستان میں نعت گوئی کو ”سیارہ“ کے ذریعے جو فروغ دیا وہ لائق تحسین ہے۔ یہ اقدام اس قدر قوی ثابت ہوا کہ آزاد خیال مدیران بھی اپنے جرائد میں نعت کو جگہ دینے لگے ہیں اور یہ رجحان وقت کے ساتھ قوی ہو رہا ہے۔



حوالہ جات:

- ۱۔ نور کی ندیاں: نعیم صدیقی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۸
- ۲۔ ماہنامہ ”چراغِ راہ“، کراچی، اگست ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۶۳
- ۳۔ نور کی ندیاں، ص ۹
- ۴۔ ایضاً، ص ۲۵
- ۵۔ ایضاً، ص ۲۷
- ۶۔ ایضاً، ص ۲۷
- ۷۔ ایضاً، ص ۲۱
- ۸۔ ایضاً، ص ۷۴
- ۹۔ اردو میں نعت گوئی: ڈاکٹر ریاض مجید، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۴۹۸
- ۱۰۔ مجلہ ”شام و سحر“، جلد دوم، لاہور، ص ۱۳۱
- ۱۰۔ الف۔ ایضاً
- ۱۱۔ ماہنامہ ”چراغِ راہ“، کراچی، اگست ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۶۷

امجد اسلام امجد کا نعتیہ آہنگ

ABSTRACT:

Amjad Islam Amjad has contributed towards devotional poetry i.e. genre of Hamd and Naat by presenting his book "Asbab". Poetic style and diction of the poet of ASBAD have been hinted in this article to elaborate expression and content in perspective of modern trends of Urdu Naatia Poetry. There are numerous references of contemporary unrest among the Muslim Ummah in poetry written by Amjad Islam Amjad in highly sounded creative diction.

نئی اردو نعت میں استغاثے نے بڑی حد تک مکالمے کی صورت اختیار کر لی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج کا بے سکون اور مضطرب معاشرہ نہ صرف اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محروم ہو چکا ہے بلکہ ان گنت سامراجی برائیوں نے شائستگی، سنجیدگی اور متانت کے تصور ہی کو دھندلا دیا ہے۔ آتشِ نمرود ہر گھر کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ زندہ مسائل نے انسان سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا ہے قوت برداشت سے محروم انسانی معاشرہ حیوانی معاشرے میں تبدیل ہو رہا ہے۔ زنجیر ہلانے کی رسم قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ عمل کے دستک دنیا شاید اس کی یادداشت سے محو ہو چکا ہے۔ زخموں کی شال میں لپٹا ہوا انسان تنہائی کے اداس جنگل میں زندہ ہے۔ درندوں کے درمیان زندہ دنیا اس کا اپنا انتخاب ہے یہ بکھرا ہوا انسان اپنی شیرازی بندی کے لیے تاجدارِ کائنات حضور رحمت عالم کے در اقدس پر کھڑا ہے رحمتوں کا آرزو مند ہے۔ ایک امتی اپنے پیغمبر کے درِ عطا پر اپنی محرومیوں کی چادر بچھا کر نظرِ کرم کی بھیک نہیں مانگے گا تو اور کیا کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ درِ خدا کے بعد درِ حضور کی امیدوں کا آخری مرکز ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ درِ خدا کے ساتھ حضور کا درِ عطا بھی کبھی مقفل نہیں ہوتا۔ آج تک کوئی انسان دعاؤں کے ان مراکز سے خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ امجد اسلام امجد کا مجموعہ حمد

و نعت ”اسباب“ بھی اسی اسلوبِ نو کا آئینہ بردار ہے۔

امجد اسلام امجد نے آئینہ خانے میں حیرتیں تخلیق کی ہیں۔ ان حیرتوں کے پس منظر میں ہیں اندر کی روشنیوں کا ظہور ہوا ہے۔ ”اسباب“ کا ہر شعر اور ہر معراج انھی کائناتی سچائیوں کی تخلیقی تصویر ہے۔ روحانی اور وجدانی انکشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ فکر و نظر کی پگڈنڈی پر پھیلا ہوا ہے اور یہ پگڈنڈی خاکِ مدینہ کو بوسہ دے کہ آسمانوں کی طرف محورِ داز ہے۔

امجد اسلام امجد کے ہاں دعاؤں کی قبولیت حیرتوں کا باعث بنتی ہے۔ اللہ کی الوہیت، ربوبیت اور حاکمیت کی روشنی ہر چیز کو یقینِ کامل کے حصار میں لے آتی ہے۔ امجد اسلام امجد کا منفرد اور دلکش اسلوبِ جوان کی غزل اور نظم میں نمایاں ہے۔ ان کی نعت میں بھی انھی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جا بجا تاریخی حوالے بکھرے ہوئے ہیں کہیں ان کا اظہار علامتوں میں ہوا ہے اور کہیں استعاروں میں، کہیں تاریخ نے تلمیحات کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے اور کہیں شاعر نے براہِ راست ان واقعات سے اکتسابِ شعور کیا ہے۔ شاعر نے مناسکِ حج کو تخلیقی سطح پر محسوس کیا ہے۔ یہ احساسِ قدم قدم پر پھول کھلاتا چلا گیا ہے۔ ”اسباب“ کا ورق ورق انھی پھولوں سے مہک رہا ہے۔

بنیاد اس کی حضرت آدم نے خود دیکھی یہ گھر ہماری گم شدہ جنت کا خواب ہے
امجد اسلام امجد کا شعورِ نغمہ کبھی بھی ہنگامہ آرائی کی نذر نہیں ہوا۔ موصوف اپنے اظہار کی کوتاہی پر کبھی بھی کپڑا ماز نہیں کرتے۔ پہلے دلکش اور ہلکے رنگوں سے تصویر بناتے ہیں اور پھر اس تصویر سے دھیمے لہجے میں ہمکلام بھی ہوتے ہیں۔ پُر سکون ندی کی طرح اپنی منزل کی جانب رواں دواں رہتے ہیں۔ بحرِ ثنا کی امواج درود پڑھتے ہوئے ساحلِ مدینہ کو چوم لیتی ہیں۔ ”اسباب“ کا حمد یہ حصہ بندے کو کائنات کی ازلی سچائیوں پر اعتماد کرنے کا ہنر سکھاتا ہے اور ان کی نعت ایک اُمتی کو حضوری اور حاضری کے آداب سے آگاہ کرتی ہے۔

وہ جو ایک تل سی زمین ہے تری کہکشاؤں کے درمیان اسے کیوں چنارے واسطے کیوں کیا مرا آشیاں
اسے کھول میرے شعور پر وہ جو راز ہے پس کن نکاں

ہمارا عہد اجارہ داری کا عہد ہے۔ ہر زوایہ نگاہ خود قریبی، خود نمائی اور خود ستائی کے اندھیروں میں گم ہے۔ خدا بننے کا فتنہ ہر ذہن میں سلایا ہوا ہے۔ انسانی حقوق کا تصور ہی ناپید ہو چکا ہے پانیوں اور ہواؤں کو بھی تجوریوں میں مقفل کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ اولادِ آدم کو جھوٹی اناؤں کا رزق بنایا جا رہی ہے۔ امجد کے خیامِ آرزو و ذرا جھانک کر تو دیکھیے، شاعر کے اندر کا سارا دکھ دامنِ شعر میں

سمٹ آیا ہے۔

اُس نے تو سب کے واسطے پیدا کیا ہے رزق مشکل ہے یہ کہ بانٹنے والوں کا کیا کریں

اندازِ طلب بے ساختہ ہے۔ منافق ساعتوں کے گرد و غبار کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

اس سرزمین پر بھی کوئی معجزہ اتار دستِ دعا کے کا سے میں کچھ بھیک ڈال دے

یہ بے حسی کا زہر رگوں سے نکال دے اس شب کو اپنے فضل و کرم سے اجال دے

مولا! ترے کرم کے طریقے ہیں بے شمار

شاعر ”اسباب“ کی حمد و نعت میں وطن کی مٹی سے گہری وابستگی کا ظہور ہوا ہے۔ اس خطہ پاک

پر بسنے والے مفلوک الحال انسانوں سے ان کی کمٹمنٹ غیر مشروط اور غیر متزلزل ہے۔ وطن کی مٹی

کو نیلام گھر کی زینت بنانے والوں کا المیہ بیان کرنے کے بعد آپ بارگاہِ خداوندی میں حروفِ التجا

لے کر حاضر ہوتے ہیں اور اپنے انفرادی اور اجتماعی قرطاس و قلم کے سپرد کرتے ہیں۔

جہاں کروڑوں سیاہ، پیلے نحیف بچے شکم کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں

اور اپنی کہی ہوئی اداس ماؤں کے خشک سینوں سے بھوک پیتے ہیں

جن کے مرنے کی سداۓ ملت فقط پسینہ ہے جس کے بدلے وہ زندہ رہنا خریدتے ہیں

شاعر حیرتوں کے سمندر میں گم ہو جاتا ہے اور تصویرِ عجز بن کر بارگاہِ خداوندی میں اپنے تجسس

کا اظہار یوں کرتا ہے۔

بجا کے عالم موجود ہے تری تخلیق اس آئے میں مرے نقش گر کہاں ہے تو

”اسباب“ کی شاعری باہواصلہ طور پر بے خبر انسانوں کا نوحہ بھی ہے وہ مسافر جو اپنے راستوں

سے بے خبر ہیں نشانِ منزل تک ان کی نگاہ میں نہیں، جہاں دھوپ برستی ہے، ریت میں اپنے خیمے لگاتی

ہے، بحر انوں کا جامد سرچڑھ کر بول رہا ہے۔ رات کا اندھیرا سنگین سے سنگین ہوتا جا رہا ہے مگر اپنی زمین

سے وابستگی سلامت رہتی ہے۔

تیرے عرشوں سے اب ہم پرہن برسیں یا کال مولا! ہم نے نام پرندے کیسے چھوڑیں ڈال

حقیقت یہ ہے کہ کربلا کا سفر آج بھی جاری ہے۔ جلے خیموں کی راہ آج بھی صفِ ماتم

بچھا رہی ہے۔ وقتِ حسینؑ کی تلاش میں ہے، زندگی کو شعورِ کربلا کی تلاش میں ہے، نیزوں پر قرآن

پڑھنے والوں کی تلاش ہے امجد کہتے ہیں:

سروں کو ہاتھوں پہ لے کے چلنے کے مدعی ہیں ہزار لیکن کسی کے رستے میں کربلا کا سفر نہیں ہے

کہاں گئے اے زمیں وہ راہِ وفا کے جو یا کہ لاکھ اہلِ نظر ہیں لیکن نظر نہیں ہے
ہم کربلا کا نام تو لیتے ہیں لیکن کوئی سر ہتھیلی پر رکھ کر سوئے کربلا روانہ نہیں ہوتا۔ شاعر نے اسی
تضاد کو ابھارا ہے۔ شاعر کو خاکِ وطن کی یاد ستانے لگتی ہے۔ وہ خاکِ وطن جو انگنت کربلاؤں میں گھری
ہوئی ہے۔

مولا! مرے وطن پہ کیوں شامِ فرات رک گئی ختم بھی ہو کہیں یہ اب کرب و بلا کا سلسلہ
شاعر بارگاہِ خداوندی میں تصویرِ حیرت بن جاتا ہے حروفِ دعا اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتے ہیں۔
بنامِ روحِ محمد اب آسرا دے دے ہمارے نقشہٴ اعمال کی طرف مت دیکھ
بس اس بھنور سے نکلنے کا راستہ دے دے

امجد کا لہجہ دعائیہ ہے ہر لفظ کا پیر ہن التجائیہ ہے۔

کہیں دکھائی نہ دے اور ہر طرف موجود بشر کی سوچ سے باہر خیال ایسا ہے
دل میں ہے ربِ کعبہ تو کعبہ ہے سامنے آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پہ لگتا ہے خواب سے
اپنی تمام انفرادی اور اجتماعی محرومیوں کا ذکر کرنے کے بعد انھیں ایک ہی راستہ دکھائی دیتا ہے
اور وہ بے ساختہ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں ان کی آواز روشنی میں نہا جاتی ہے۔ بے یقینی کی فضا
کا دامن تارتا رہو جاتا ہے اللہ اور اُس کے رسول کی رحمتیں قلم کو تھام لیتی ہیں۔

بے چارگی کا رزق ہوئی آبروئے دل ہم کو ہمارا کھویا ہوا افتخار دے
عظمتِ رفتہ کی بازیابی کے سفر پر نکلنے کی آرزو جاگتی ہے تو ربِ تشنہ پر تمناؤں کے پھول کھل
اٹھتے ہیں۔

امجد ہے اب بھی وقت پہ پس ماندہ زندگی یادِ خدا میں، عشقِ نبی میں گزار دے
”اسباب“ کی شاعری دنیا کے حمد و نعت میں نئے موسموں کی نوید لے کر طلوع ہوتی ہے مدینے
کی خوشبو بھری ہواؤں سے شام جاں معطر ہے۔

عجب ہے شہرِ محمد کی آرزو امجد کہ میرا دل تو سنبھلتا نہیں سنبھالے سے
لکیر پٹنے کا رواج اب ختم ہو رہی ہے اور اسے ختم ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ فرسودگی کی کوئی
بھی شکل خطہٴ علم و ہنر کا مقتدر نہیں سایہٴ دیوار بھی فرسودہ موسموں کو دامنِ آرزو میں جگہ نہیں دیتا۔ ہم
جانتے ہیں کہ سورج کی روشنی کبھی بھی اجالنے کے جوہر سے محروم نہیں رہتی، رنگ کبھی بھی اپنے چہرے
پر نقاب نہیں ڈالتے، صبا کبھی بھی مقفل دروازوں پر دستک نہیں دیتی اور خوشبو کبھی بھی حروفِ تازہ کا

دامن چھوڑنے کا غیر تخلیقی عمل سے مراسم استوار نہیں کرتی۔ امجد کی تازہ کاری کی چند مثالیں دیکھیے:

آپ سے سایۂ سعادت میں آخری شام مانگتا ہوں میں
کوئی بھی سورج مگر اس کے حسبِ حال نہیں وہ ایک شخص کہ جس کی کوئی مثال نہیں

تازہ ہواؤں کی بندش سے سانس بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔ نظم وضبط کا ہر زاویہ بکھر جاتا ہے لیکن امجد اسلام امجد نے ان زاویوں کو بکھرنے نہیں دیا اور نہ آپ نے کسی سطح پر فرسودگی سے سمجھوتہ کیا ہے اکیسویں صدی کا ہر روشن دماغ فرسودگی کی نفی کر کے اپنے اندر تخلیقی کی تازگی اور نئے پن کو محفوظ رکھتا ہے۔ امجد نے اپنے تخلیقی وجود کو تحفظ کی یہی چار دیواری فراہم کی ہے جدید اردو نعت کے ہر منطقے کا یہی موسم ہے۔ دلکش اسلوب مدحت نئی لفظیات سے ہاتھ ملا رہی ہے۔

گیا تھا جب تو کوئی اور آدمی تھا میں میں اپنے آپ سے واقف ہوا مدینے میں



وسیم بریلوی: نئی نعت کا پیشرو شاعر

ABSTRACT:

Waseem Brailvi has established his position as modern trend setter of Naatia Poetry. He has also supervised numerous research thesis on the topic of Naat in India. Literary introduction of Waseem Brailvi has been presented in the article, showing his modern trend in the field of expression and beauty of thought content. Some contemporary modern poets of Naat have also been referred from amongst Indian and Pakistani poets, to strengthen the view point of introducing Waseem Brailvi as Modern Naatia poet.

کھڑی ہیں دست بستہ خوشبوئیں پھولوں کی پلکوں پر
کسی کا جیسے نعت پاک کہنے کا ارادہ ہے

شعور کی رو خود بخود ماضی کے ان ایام میں چلی گئی جب یہ اور اس طرح کے اشعار کانوں میں
پڑتے تھے تو نعت کی محفلوں، جلسوں اور مشاعروں میں گھڑی بھر کو ایک نئی دنیا آباد ہو جاتی تھی اور ایک
تازہ ہوا کے جھونکے مشام جاں کو معطر کر دیتے تھے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ قمر گوٹوی صاحب نے
وسیم بریلوی پر اپنی زیر طبع کتاب کا مسودہ دیا اور اصرار کرنے لگے کہ یہ ناچیز بھی کچھ لکھے۔ میرے ایک
عزیز دوست اور شاعر ڈاکٹر عمیر منظر اکثر یہ شعر بڑی وارفتگی کے ساتھ پڑھتے اور اپنے مخصوص انداز و
الفاظ میں کہتے ہیں 'اردو کی نعتیہ شاعری میں وسیم بریلوی کے اس شعر کا کوئی جواب نہیں ہے:

فلک کو میزبانی کی سعادت جب ملی ہوگی

تو بے چاری زمیں کی رات آنکھوں میں کئی ہوگی

بے شک اردو فارسی کی نعتیہ شاعری کے ذخائر میں تغزل کے ایک سے بڑھ کر ایک نمونے

موجود ہیں، جن میں نازک خیالی اور ندرت بیان اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے لیکن خیال کی یہ نزاکت، اسلوب کی یہ ندرت اور لب و لہجہ کی یہ تازگی کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی، اور وہ بھی اس سادگی کے ساتھ جو اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتی ہے، دل سے نکلتی، دل میں اتر جاتی ہے۔

دراصل شاعری تخلیقی عمل ہے، محض صنائی یا اختراع ہرگز نہیں، جو لوگ اوزان و قوافی کو شاعری سمجھتے اور لفظوں کی صنعت گری میں لگے رہتے ہیں، مصرعوں کی نوک پلک سنوارتے عمر گزر جاتی ہے، شاعری کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی، کاریگری ہو جاتی ہے، فن لطیف کا دروا نہیں ہوتا کیونکہ یہ جذبوں کے جمالیاتی اظہار کا فن ہے، الفاظ جب احساس سے ہم آہنگ ہوتے ہیں تو شعر میں جان پڑتی ہے۔ ورنہ لاکھ الفاظ کے موتی پرودیں، لعل و زمرد لے آئیں، چاہے جتنا رنگ و روغن بھریں وہ بے روح بدن ہوتا ہے، مکان بے مکین۔ کسی نے کتنی خدا لگتی بات کہی ہے کہ 'نغمے تو آدمی کی روح میں رب صوت و آہنگ، مالک حرف و نوا، خالق اظہار و بیان رکھ دیتا ہے۔ یہ صوت و نوا آدمی کے ساتھ نشو و نما پاتی ہے اور پھر کسی لمحہ اس کا اظہار ہو جاتا ہے، مگر وسیم بریلوی کو جس نے بھی دیکھا سنا ہے وہ شخصیت کا سراپا شعر ہونا یا کسی کے تار نفس کی ہر تان کا نغمہ سرمدی ہو جانا بہ آسانی سمجھ سکتا ہے۔

یاد نہیں آتا کہ وسیم بریلوی کو میں نے پہلی بار کب اور کہاں دیکھا تھا، پٹنہ یا کلکتہ کے کسی مشاعرے میں یا ٹیلی ویژن کی آمد کے ساتھ اس کے پردے پر، میرے لیے استاذ گرامی حسان العصر علامہ شبینم کمالی کے بعد یہ کسی شاعر کی دوسری شخصیت تھی جس کے ریشمی سراپا اور اس کے لب و لہجہ کی لطافت و نزاکت میں ناقابل تصور مطابقت تھی اور جس کے الفاظ و احساس کی ہم آہنگی ماحول پر چھا جانے کی بے پناہ قوت رکھتی تھی۔ اب اس واقعہ کو تیس پینتیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن کوئی اور ان کی جگہ نہ لے سکا۔ ان دونوں میں ایک اور قدر مشترک بھی تھی اور وہ تھی ان کی نعت گوئی اور نعت میں ان کے لب و لہجہ کی جدت و ندرت۔ اس مدت میں نئی غزل کی کئی آوازیں ابھریں اور ڈوب گئیں، مشاعروں کے اسٹیج پر تو کیسے کیسے فنکار اور گویے آئے اور گئے لیکن جو پائدار مقبولیت و محبوبیت وسیم نے پائی وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

نصف صدی کے طویل عرصے میں یہ لازوال مقبولیت کسی کے حصہ میں نہیں آئی، ان کے پیشروؤں میں بھی صرف جگر مراد آبادی نظر آتے ہیں جو طویل عرصہ تک مشاعروں کی دنیا پر چھائے رہے لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ (نہ دنیا اتنی پھیلی تھی نہ اتنی کٹی تھی نہ ایسی تیز رفتار تھی۔ ابھی پرانی قدریں زندہ تھیں اور ان کو اس شکست و ریخت سے دوچار ہونا باقی تھا جو آنے والے وقتوں نے دیکھا)۔ یاد

وسیم بریلوی: نئی نعت کا پیشرو شاعر

آتا ہے کہ ایک مصلحہ میں وسیم بریلوی سے کسی صحافی نے ان پر عمر کا اثر نظر نہ آنے کا راز جاننا چاہا تھا اور وہ کوئی تشفی بخش جواب دینے کی بجائے صرف اتنا کہہ کر رہ گئے تھے کہ قدرت نے جس معصوم شکل و صورت کے ساتھ دنیا میں بھیجا ہے اسی معصومیت کے ساتھ دنیا سے واپسی کروں گا۔ دراصل اس سادگی، شائستگی اور طہارت کو کوئی اور نام دیا ہی نہیں جاسکتا جو قدرت نے ان کی شخصیت اور شاعری میں رکھی ہے۔

بلاشبہ لالہ کی حنا بندی فطرت خود بہ خود کرتی ہے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس پر خارجی عوامل کا اثر نہیں ہوتا، ماحول کے سرد و گرم اسے متاثر نہیں کرتے یا یہ کسی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ حق تو یہ ہے کہ اظہار و بیان کی اس منزل کو پانے کے لیے ایک مدت کی مشق و مزاوت اور ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے بلکہ اس کا تقاضہ عبادت کی طرح کرنے کا ہوتا ہے۔ وسیم بریلوی کی شاعری اور شخصیت دونوں اس حقیقت کا آئینہ ہے۔ وہ اپنی شاعری بالخصوص نعت گوئی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں لیکن وہ اپنے عہد اور اپنے ماحول سے گہرا ارتباط بھی رکھتی ہے:

وسیم کیسے زمانہ ہمیں بھلائے گا

ہمارے شعروں میں اک دور سانس لیتا ہے

وسیم کی شاعری اپنے عہد کی ایک درد آگیز داستان سناتی ہے، ان کے ہر لفظ میں ایک ٹیس اور

ہر لے میں ایک آہ سی محسوس ہوتی ہے جو ایک چنگاری سی دلوں میں اتار دیتی ہے لیکن ایک عجیب سی مٹھاس اور ایک بے حد پر کیف نغمگی کے ساتھ۔ وہ احتجاج بھی کرتے ہیں تو کچھ اس انداز سے کہ:

تم گرانے میں لگے تھے، تم نے سوچا ہی نہیں

میں گرا تو مسئلہ بن کر کھڑا ہو جاؤں گا

کھلی چھتوں کے دیئے کب کے بجھ گئے ہوتے

کوئی تو ہے جو ہواؤں کے پر کترتا ہے

چراغ راہ کی قسمت پہ رحم آتا ہے

ہوا کے زور سے لڑتا بھی اور جلنا بھی

دھوپ کے ایک ہی موسم نے جنہیں توڑ دیا
اتنے نازک بھی یہ رشتے نہ بنائے ہوتے

ہنسی جب آئے، کسی بات پر آتی ہے
اداس ہونے کا اکثر سبب نہیں ہوتا

میں اپنے پاؤں میں زنجیر ڈال کر خود ہی
یہ سوچتا ہوں کہ آخر مری خطا کیا ہے

غزل کے نازک آئینہ میں غم روزگار کی حکایتیں پیش کرنا کوئی وسیم بریلوی سے سیکھے۔ وسیم نے ترقی پسندی کے دور میں آنکھیں کھولیں، جدیدیت کا عروج و زوال دیکھا، مابعد جدید رجحانات کا زمانہ بھی دیکھ رہے ہیں۔ اس دوران شعر و ادب کی دنیا کیا سے کیا ہو گئی، کتنوں نے اپنا قبلہ بدلا، آستانے بدلے اور روئے سخن بدل لیا لیکن وسیم بریلوی کو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے شعوری طور پر اپنی ایک راہ نکالی تھی جس سے وہ کبھی نہیں ہٹے۔ بہ غور دیکھیں تو وہ ان شعراء میں ہیں جو اردو کی دونسلوں کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بالخصوص اردو کی نعتیہ شاعری کو جن شعرا نے جدید حسیت، نئی لفظیات اور فکری و فنی تازگی سے ہمکنار کیا، ان میں ایک نام وسیم کا بھی ہے۔ بلکہ جس طرح نئی غزل کے پیش روؤں کا ذکر آتے ہی سب سے پہلے یاس یگانہ چنگیزی کا نام ذہن پر دستک دینے لگتا ہے پھر شاد، فراق، فانی، اصغر، حسرت اور جگر کے نام آتے ہیں۔ اسی طرح نئی نعت کے پیش روؤں میں سب سے پہلے وسیم کا نام، ذہن پر دستک دیتا ہے۔ وسیم آج ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے شہرت و مقبولیت کے جس مقام پر ہیں، وہاں ان کے تعلق سے مشکل ہی سے کسی کا ذہن اس جانب جائے گا کہ ان کی شاعری کا ابتدائی و تشکیلی دور نعتوں، مرثیوں اور نوحوں کا ہے اور یہ کہ اپنے شعری سفر میں انہوں نے نعت پاک کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا ہے کہ وہ نعت گوئی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔ یقیناً اس میں اس ماحول کا بڑا ہاتھ ہے جس میں وسیم کی نشوونما ہوئی۔ انہوں نے بریلی میں آنکھیں کھولیں جس کی فضا امام احمد رضا بریلوی اور حضرت حسن بریلوی کی نعتوں اور سلاموں سے معطر تھی، ان کی ابتدائی زندگی کا ایک بڑا حصہ رامپور میں گزرا جس کو اردو شعر و ادب میں ایک دبستان کا درجہ حاصل رہا ہے اور ان کے والد نسیم مراد آبادی

خود بھی شاعر تھے۔

اردو میں نعت گو شعراء کی بڑی طویل فہرست ہے۔ ابتدا سے آج تک شاذ و نادر ہی کسی شاعر نے اپنے دیوان یا مجموعہ کلام کا آغاز حمد و نعت سے نہ کیا ہو لیکن ایسے شعراء انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جنہوں نے نعت گوئی میں اپنی شناخت بنائی ہو یا نعت میں فکر و فن کے نئے گوشے روشن کئے ہوں۔ لیکن ہماری بد قسمتی ہے کہ ان مٹھی بھر عند لیبان حریم قدس کے فکر و فن کی قدر و قیمت جاننے یا ان کے کلام کے تنقیدی مطالعہ کا کوئی نظام فروغ نہ پاسکا۔ پچھلے پندرہ بیس سال میں نعتیہ شاعری کے مطالعہ کو ضرور کچھ فروغ حاصل ہوا ہے۔ رسالہ 'نعت رنگ' کراچی نے بہت اچھی کوششیں کی ہیں۔ اس حوالے سے ابھرنے والے بعض قلم کاروں مثلاً راجا رشید محمود، عزیز احسن، حسرت کاس گنجوی، ڈاکٹر سید شمیم گوہر وغیرہ کے کاموں کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ابھی تک اردو کی نعتیہ شاعری کا کوئی مربوط مطالعہ سامنے نہیں آسکا۔ آیا ہو تو میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ حالانکہ نعت گو شعراء پر برصغیر کی یونیورسٹیوں میں اب تحقیقی مقالے بھی لکھے جارہے ہیں اور ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی دی جا رہی ہیں۔ ایسی کئی پی ایچ ڈی خود وسیم بریلوی کی نگرانی و رہنمائی میں بھی ہو چکی ہے لیکن یہ تحقیق اور اس نوعیت کے مطالعے اس لئے نتیجہ خیز نہیں ہوتے کہ نہ تو کام کا معیار متعین ہوتا ہے، نہ نعت کے صنفی ارتقا کی تاریخ اور وسعت ہی سامنے ہوتی ہے۔ جب بھی یہ کام ہوا اردو میں وسیم بریلوی کی نعت گوئی کے صحیح مقام و مرتبہ کا تعین ہو سکے گا۔

ابھی تک تو ہم اردو نعت میں فکر و فن کے تعلق سے باتیں کرتے ہیں تو مرزا محمد رفیع سودا اور کرامت علی شہیدی سے شروع کر کے غلام امام شہید، کافی مراد آبادی، محسن کاکوروی، امیر مینائی، امام احمد رضا بریلوی اور حسن بریلوی پر قصہ تمام کر دیتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ حالی، شبلی، اقبال، محمد علی جوہر اور ظفر علی خاں سے امیر مینائی، محسن کاکوروی، بیدم شاہ وارثی، اکبر وارثی، امام احمد رضا بریلوی، آسی غازی پوری، بہنر اولکھنوی، حفیظ جالندھری اور ماہر القادری تک پہنچتے پہنچتے ہماری سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں۔ بہت زور مارا تو حالی، شبلی اور اقبال کے زیر اثر نعت کے موضوعات میں آنے والی وسعت اور تنوع وغیرہ پر گفتگو کر کے اپنی باتوں میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کر لی حالانکہ ۱۹۵۰ء کے بعد کی اردو شاعری پر ایک سرسری نظر بھی ڈالیں تو اردو نعت کے تعلق سے مطالعہ کا ایک بڑا وسیع کینوس ابھر کر سامنے آتا ہے۔ علامہ قنیل دانا پوری، ضیاء الدیوبی، واقف عظیم آبادی، نجم خیر آبادی، مہر شکروی، رازالہ آبادی، قمر سلیمانی، ادیب مکن پوری، بیکل اتساہی، اجمل سلطان پوری، حفیظ بنارس، شبنم کمالی، علقمہ شبلی،

وسیم بریلوی، حبیب ہاشمی، عثمان عارف نقشبندی، جوہر بجنوری، قمر گوٹوی، کوکب حیدر آبادی، اعجاز کامٹوی، نیر دموہی، ابوالجہاد زاہد، طلحہ رضوی برقی، حبیب رہبر پرتا پگڈھی، عزیز بگھروی، رباب رشیدی لکھنوی، مختار احمد عاصی، ابرار کرتپوری، تابش مہدی، ناز انصاری اور پاکستان میں عبدالعزیز خالد، حفیظ تائب، عاصی کرنالی، مظفر وارثی، حافظ لدھیانوی اور نعیم صدیقی وغیرہ پر نگاہیں ٹھہر جاتی ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والی نسل میں صبیح رحمانی بڑا ہی نمایاں نام ہے جس نے نعت کے حوالے سے نئی شعریات دریافت کی ہے۔ ہندوستان میں یہ کام چند رہبان خیال، عنبر بہراپچی، طاہر فراز اور حلیم حاذق جیسے شعراء کر رہے ہیں۔ چونکہ اس وقت اس عہد کے نعت گو شعرا کی کوئی باضابطہ فہرست یا ان کے کلام کے نمونے ہمارے سامنے نہیں ہیں، اسلئے عین ممکن ہے کہ کئی اہم نام چھوٹ رہے ہوں لیکن اس مختصر فہرست سے بھی اردو میں نعت گوئی کی نصف صدی کا جو منظر نامہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ بہت ہی وسیع، وسیع اور کثیر الابعاد و ہمہ جہات ہے۔

یہ ذکر پہلے ہی آچکا ہے کہ نئی نعت کے پیش روؤں کا ذکر کیجئے تو وسیم بریلوی کا نام سب سے پہلے ذہن پر دستک دیتا ہے۔ نعت کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کے فروغ میں بھی وسیم بریلوی کی خدمات نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ ان کی نگرانی و رہنمائی میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی (بریلی) میں جو اردو کے نعت گو شعراء بالخصوص امام احمد رضا بریلوی کی شعری و نثری خدمات پر الگ الگ تحقیقی کام ہوئے ہیں، وہ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ نئی نعت کے پیش روؤں میں مظفر وارثی، بیکل اتساہی، شبنم کمالی اور ان کے بعض دیگر معاصرین کے نام بے شک زیادہ وسیع و باوزن ہیں۔ وسیم اپنے ان ہم عصروں سے عمر میں بھی کم ہیں اور میدان شعر و سخن میں بھی بعد میں آئے۔ پھر یہ کہ ان شاعروں نے زیادہ تو اتر اور تسلسل سے نعتیں کہی ہیں اور عین ممکن ہے کہ وسیم کی نعتیہ شاعری کی ضخامت ان سے بہت کم ہو لیکن نعت میں نئے رنگ و آہنگ اور نئی لفظیات کے برتاؤ میں ان کو ان پر سبقت بھی حاصل ہے اور یہ رجحان ان کی نعتوں میں زیادہ نمایاں بھی ہے۔



عبدالمنان طرزی کا نعتیہ آہنگ

ABSTRACT:

"TALA'AL BADRO ALAINA" a collection of devotional poetry of Abdul Mannan Tarzi has been reviewed in this article. Poetic narrative of Tarzi has been admired due to impressive creative expression and authenticity of text. It is also admirable that Abdul Mannan Tarzi is a Hafiz-e-Qur'an and has some knowledge of Arabic language which supported his creative text in Naatia Poetry.

سرور کائنات، فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف میں کائنات کی تمام مخلوقات بشمول چاند و پرند اور شجر و حجر ہمہ دم مصروف رہا کرتی ہیں۔ یہ وہ ذات بابرکات ہے جس کی مدح میں خود خداوند کریم بھی شامل ہے اور اس کی خدائی بھی۔ یہ ایسی مدح و ستائش ہے جس نے شاعری کی دنیا میں نعت کی صنف کو وجود بخشا۔ یعنی شاعری کی ایک ایسی صنف جو آں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و کردار، عادت و اطوار اور کمالات کے بیان کے لیے مخصوص ہو۔

ہر شاعر نعت کہنے کو اپنا فریضہ جانتا ہے۔ لیکن نعت تو مدح و ستائش کے الفاظ کے ڈھیر لگا دینے کا نام نہیں بلکہ یہاں جذبے کا تقدس الفاظ کو زندگی اور پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ عقیدت جتنی شدید ہوگی، جذبہ جتنا توانا ہوگا نعت کی اثر آفرینی بھی اسی اعتبار سے زیادہ یا کم ہوگی۔ عقیدت و محبت فقط الفاظ یا تعریف و توصیف کا نام نہیں بلکہ عقیدت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ حتی المقدور ممدوح کے رنگ میں خود کو ڈھال لینے کی کوشش کی جائے۔ آپ کا اسوہ، آپ کی طرز زندگی کو انتہائی الفت و محبت کے ساتھ اپنی حیات میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر ایسا ہوا تو عقیدت و محبت کی سرشاری کی زبان سے جو الفاظ نکلیں گے وہ ایک خاص جذبے کے ترجمان ہوں گے اور ایسے میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شاعر بے خودی میں پکار اٹھے طلع البدر علینا!

عبدالمنان طرزی ایک پروفیسر ہیں، شاعر ہیں لیکن وہ حافظِ قرآن بھی ہیں اور عاملِ سنن بھی۔ ایسے میں ان کی زبان سے بے ساختہ اگر طلع البدر علینا کے الفاظ نکلتے ہیں تو انہیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ اسی استحقاق نے ان کی نعتوں کے مجموعہ ”طلع البدر علینا“ کو شعری افق پر دیکھنے دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس نعتیہ مجموعے میں چاند کی ٹھنڈی روشنی کا عکس ہی نہیں بلکہ جذبے کی صداقت کی منہ بولتی تصویر بھی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ آغاز حمد سے ہوا ہے۔ یکے بعد دیگرے تین حمد غماز ہیں کہ شاعر کو خالق و مخلوق اور معبود اور عبد کے رشتے کا بھی شعور ہے۔ بات رسمی اور روایت کی پیروی کی ہوتی تو ایک حمد کہہ لی جاتی۔ لیکن یہاں ایک نہیں تین تین حمد اور پھر اس کے بعد نعتوں کا سلسلہ۔ پہلے خالق کی بڑائی بار بار اور اسی اعتبار سے محبوب کی مدح سرائی سلسلہ در سلسلہ۔ حمد میں شاعر نے محبوب حقیقی کی شناخت کی کا شرف حاصل کرتے ہوئے اس کی قدرت اور بزرگی کا یوں اعتراف کیا ہے :

میں بندہ ترا تو میرا خدا، سبحان اللہ سبحان اللہ
بندے سے خدا کا یہ رشتہ، سبحان اللہ سبحان اللہ
میں حرفِ دعا، تو دستِ عطا، سبحان اللہ سبحان اللہ
محتاج ترے ہیں شاہ و گدا، سبحان اللہ سبحان اللہ
حمد تیری ہی خدایا دولتِ نادار ہے
جس نے یہ اعزاز پایا اس کو کیا درکار ہے
حکم کے پابند تیرے ہیں نظامِ دو جہاں
تیری قدرت ہے مسلم اور تو مختار ہے

عبد اور معبود کے رشتے کے قبول کرنے میں جذب و کیف کی یہ مستی کہ نظامِ دو جہاں کے مختار کی حمد کو اپنے لئے اعزاز تصور کرے اور دستِ عطا کے سامنے شاہ و گدا ہر ایک کو حرفِ دعا قرار دینا شاعر کے جذبے کی سرشاری کی بین دلیل ہے۔ یہی سرشاری خلاق کائنات کے ممدوح کی طرف رخ کرتی ہے تو دیکھئے کہ اظہار کی کیفیت کس طرح بدلتی ہے۔ شاعر محبوبِ خدا اور خود اپنے محبوب کو کس طرح خراج پیش کرتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کو کبھی جمالِ بزمِ عرفاں اور ضیائے شمعِ ایماں قرار دیتا ہے، کبھی ماہِ اسریٰ اور شکوہِ سرا دنیٰ کہتا ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ ہر صورتِ حال میں شاعرانہ غلو کے باوجود حقیقت یا حق کی شناخت پر حرف نہیں آتا بلکہ ساری کاوشیں حقیقتِ عظمیٰ کی شناخت کا پہلو بن جاتی ہیں۔ فقط چند اشعار

نموناً ملاحظہ کرتے چلیں:

بلاشبہ تو بشر ہے، تو کبھی خدا نہیں ہے
تو ضیائے شمعِ ایماں، تو جمالِ بزمِ عرفاں
یہ عروجِ ماہِ اسری، یہ شکوہِ سرِ ادنیٰ
وہی زندگی سنوارے، وہی عاقبت بنالے
زخموں کا مداوا مرے کچھ اور نہیں ہے
روشن ترے کردار کی قدیل ہے ایسی
اگر مہر و مہ و انجم میں نورِ مصطفائی ہے
رہا دل اسیر جس کا وہ فریبِ شوق ٹھہرا
یہ ہوا کے سرد جھونکے جو شمیمِ زلفِ آقا
کہاں تک ناتواں دل، ہجر کا بارِ گراں اٹھائے
گھٹا جاتا ہے دم، ہر ریشہٴ دل ٹوٹا جاتا ہے
جس رات کا سرمایہ نہ ہو تیرا تصور
وہ دل جو تری یاد سے نا آشنا ٹھہرے

کوئی کیا بتائے لیکن تو کیا ہے کیا نہیں ہے
ترے حسن کا تبسم کہیں نارسا نہیں ہے
تری طرح لامکاں تک تو کوئی گیا نہیں ہے
ترے راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نہیں ہے
یا سکیدِ خضریٰ ہے، یا پھر اس کا مکیں ہے
دشمن نے بھی مانا ہے تو صادق ہے امیں ہے
تو نورِ مصطفیٰ عکسِ جمالِ کبریائی ہے
تجھے آرزو بناتے تو کچھ اور بات ہوتی
مرے واسطے بھی لاتے تو کچھ اور بات ہوتی
توجہ آپ کی اب ہے ضروری یا رسول اللہ
بڑھی جاتی ہے حد سے ناصوری یا رسول اللہ
اس شب کو شبِ قدر کی عظمت نہ ملے گی
اس دل کو کبھی حق کی ہدایت نہ ملے گی

نعت کی صنف کو بہت آسان تصور کیا جاتا ہے۔ تعریف و توصیف کے دریا بہانے کو عام طور پر اچھی نعت تصور کیا جاتا ہے لیکن اصل میں نعت کا فن پلِ صراط سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کے عمل کے مصداق ہے۔ بلاشبہ تمام تعریفیں اس خالق کائنات کے لیے ہیں جو وحدۃ لا شریک ہے اور اس کے بعد توصیف کے کلمات کسی پر ختم کیے جاسکتے ہیں تو وہ بھی اسی وحدۃ لا شریک کے محبوب یعنی شہِ کونین کی ذاتِ گرامی ہے۔ اور مادح اور ممدوح کے درمیان جو کچھ بھی ہے اس پر سلامتی سے گزرنے کا فن نعت گوئی کا فن ہے۔ یعنی حضور کے اوصاف تو بیان ہوں لیکن اس طرح کہ لا شریک کے تصور کو کہیں سے ذرہ برابر بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اور یہی وہ فن ہے یا نکتہ رسی یا پلِ صراط ہے جہاں اکثر شاعر نا کام رہ جاتا ہے۔ عقیدت کے جذبات اسے غلو پر آمادہ کر دیتے ہیں اور غلو میں لا شریک کا شریک بنا ڈالتے ہیں اور یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ حضور کی توصیف کرتے ہوئے ان کی ذات کو ختم کر ڈالا اور اسے خدا کی ذات میں شامل کر دیا۔ دراصل شناختِ اصل وہ ہوا کرتی ہے جو اپنی بنیاد پر کھڑی ہو نہ کہ یہ دوسری ذات کا سہارا پائے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غلو کی حدیں بھی مقرر کر دینی پڑتی ہیں۔ بلاشبہ بات یا

نکات کی ترسیل کے لیے غلو ایک لازمی عنصر ہے اس کے بغیر صحیح طریقے سے بات کی ترسیل ممکن نہیں ہو پاتی لیکن نعت کہتے ہوئے غلو میں بھی اس بات کا انتہائی خیال رکھنا لازمی ہے کہ لاشریک کی صفات کا کوئی شریک نہ ٹھہرے اور غیر موجودات کی صفات کے ساتھ کائنات کی اور خالق کائنات اور خالق کائنات کے رشتے کا اظہار نامہ بن جائے۔ اس لیے نعت میں سب سے اہم حصہ اُسوے کے بیان کا ہوا کرتا ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نعت گو جذبی اور عملی طور پر اُسوے کا اسیر اور پابند نہ ہو جائے۔ دیکھئے کہ طرزی کس طرح اس منزل سے بھی کامیاب گزرتے ہیں۔ فقط چند اشعار اور قارئین کے حسن نظر کے سامنے آجائیں تو عشق و عرفان کی منزل کی شناخت اور شاعر کے شعور اور سلیقہ اظہار کی شناخت بھی ہو جائے۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

کہیں وہ یسین اور طہ ہیں والشمس و ضحاہا
یہ سب کی سب ہیں نہیں کی نعتیں ہلے حسن بیل سے پہلے
وہ منزل قرب کی جس کی سند قوسین او اذنی
علو کا پوچھنا کیا تاحد عرش بریں تم ہو
سماعت کیا بصارت کیا یہ ماوحنی وہ اذ یغشی
حرارت قلب کی تیرے حریم کن فکاں تک ہے
نظر کی حد ہے مازاغ البصر کی معنویت میں
تری رفتار کی گرمی صراطِ کہکشاں تک ہے
ہے لب جبریل پہ الا قلیلا کی سند
صاحب لولاک کی شانِ عبادت دیکھ کر
سر محشر صدا ہر سمت ہوگی نفسی نفسی کی
لب آقا پہ لیکن ربّ ہب لی امتی ہوگا

مجھ کو نہیں معلوم کہ طرزی عربی زبان سے کتنا واقف ہیں۔ لیکن وہ حافظِ قرآن بھی ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مقامِ محمود سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے اکثر اُسوے کے بیان میں قرآن سے استفادہ کیا ہے۔ کہیں کہیں مقطعات بھی پرکاری سے اپنے اشعار میں صرف کر لئے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ شاعر کو اردو زبان پر ہی قدرت نہیں بلکہ اردو میں عربی فارسی کی روایت سے اچھی طرح واقف ہے۔ کبھی کبھی سہل ممتنع میں بھی وہ اپنے جذبہ دل کو اس طرح

پیش کر جاتے ہیں کہ مدح کا حق ادا ہو جاتا ہے۔ سہل ممتنع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

جسے عشق محبوب داور رہے گا	وہ ہمراہ سلمانؑ و بوذرؑ رہے گا
رسالت کی دے گی کھلے منہ گواہی	اگر بند مٹھی میں کنکر رہے گا
دل کو ہر دم ہے انتظار اپنے	اب تو ذی الحج کے ہی مہینے کا
سارے دیوانے ایک جیسے ہیں	اک جنوں ہے مگر قرینے کا

”طلع البدر علینا“ تو نعتوں کا مجموعہ ہے لیکن طرزی صاحب کی فکری جولان گاہ نے دیگر اصنافِ سخن پر بھی اپنی کندیں ڈالی ہیں اور ”رفتگاں و قائماں“ تو ایک ایسا ستارہ تقدیر بن کر ان کی شاعری کے افق پر چمکا ہے جس نے دنیائے ادب میں شاعرانہ تنقید کی ایک نئی طرح ڈال دی ہے۔ چنانچہ ”سیرت الرسول، دستار طرح دار، نارنگ زار، مناظر نامہ، منظور جائزے“ کے علاوہ ”تعارف“ تبصرہ اور منظور تاریخ“ کا ایک نیا باب ادب کی دنیا میں کھل گیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ در بھنگے جیسے کو ردہ شہر سے اتنے سارے ادبی ستارے اچانک کس طرح جگمگا اٹھے! کیا واقعی در بھنگے کا ادبی افق اتنا وسیع و عریض ہے کہ وہاں کا ہر شاعر ایک ستارہ نہیں بلکہ اپنی جھولی میں کہکشاں سجائے رکھتا ہے۔ کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ در بھنگہ یا متھلا کی سرزمین علمی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے اتنی زرخیز رہی ہے کہ وڈیا پتی اپنی سرزمین متھلا سے اٹھ کر بنگال کی سرزمین کے لیے ایک مثال بن گیا۔ مصوری کی دنیا میں تو متھلا اسکول نمایاں ہے ہی لیکن اردو شعروادب کی دنیا میں بھی متھلا یا در بھنگے کی سرزمین کو ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ داغ دہلوی کے وابستگان کی شکل میں ہو یا امیر مینائی کے تلامذوں کی صورت میں اردو زبان و ادب کے معیار اور اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر اپنی ایک شناخت رکھتی ہے۔ مولانا خیر رحمانی، سعادت پیغمبر پوری، محسن در بھنگوی، عبدالعلیم آسی وغیرہ کے نام تو اہم ہیں ہی۔ لیکن اس سرزمین کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ بہار کے تین علامہ میں ایک علامہ اجتہادی حسین رضوی بھی اس سرزمین سے وابستہ رہے۔ آج کی دنیا تو مظہر امام کے نام سے اچھی طرح واقف ہے لیکن کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ مظہر امام کے ماموں کا جلیل جالوی کا تعلق بھی داغ سے رہا۔ لیکن ایک خاص نکتہ یہ بھی ہے کہ زبان کے معیار کے اعتبار سے تو یہاں کے شعرا داغ اور کچھ امیر سے بھی منسلک رہے لیکن فکری اعتبار سے یہاں کے اکثر شعرا داغ کی پیروی کی بجائے علامہ شوق نیوی کے زیر اثر فکری معیار کو کبھی آلودہ ہونے نہیں دیا۔ طرزی نے بھی اس معیار کو خوب خوب نبھایا ہے۔ اس مجموعے میں کچھ قطعات بھی شامل ہیں۔ ایک قطعہ ملاحظہ ہو :

وہ لمحہ بڑا کیف پرور رہے گا
 حیاتِ آفریں خوب منظر رہے گا
 میں باچشمِ غم چوم ہی لوں گا روضہ
 سلام علیک زباں پر رہے گا

یقیناً عشقِ محمد کے طفیل طرزی صاحب کی دعا بارگاہِ رب میں مقبول ہوئی اور انھیں حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس پاک سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد ان کے قلب پر جو تاثرات نقش ہوئے ہیں ان کو بھی اشعار کا پیرا ہن عطا کر دیا ہے۔ جو نظم کی صورت میں بعنوانات یوں ہمارے سامنے آئے ہیں 'مثلاً طوافِ کعبہ' 'سعی صفا و مردہ' 'زم زم اگر پی لیجیے' 'عرفات کا وقوف' 'مزدلفہ شب گزاری' 'وہ منیٰ کے چار دن' 'آؤرمی کر لیں' 'ترے روضے کی جالی ہے' 'مسجد نبوی' 'حرم سے حرم تک' وغیرہ۔ ان میں آخر الذکر نظم طویل نظم ہے اور خوبصورت نظم قرار دی جاسکتی ہے۔ ان نعتیہ شاعری کے مطالعے کے بعد بس ایک دعا دل سے نکلتی ہے کہ

اللہ کرے زورِ قلم اور ز یادہ !



حفیظ الرحمن احسن کی حمدیہ، نعتیہ شاعری (ایک جائزہ)

ABSTRACT:

Hamd -o-Naat Poetry of Hafiz ur Rahman Ahsan has been analyzed in this article in order to show quality of expression and content. A detailed introduction of the poet has also been given here to highlight his pen work of prose and poems. All the writings of Hafiz ur Rahman Ahsan are Islamic thought oriented. His poetry of Hamd and Naat also carry contemporary sensibility. The unpublished literary work of Hafiz ur Rahman Ahsan is much more than his published books.

حفیظ الرحمن احسن ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۴ء پر ور ضلع سیالکوٹ کے ایک معزز متوسط دینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جناب عبدالعزیز صاحب کی کل آٹھ اولادوں میں حفیظ صاحب کا تیسرا نمبر ہے۔ ان کے گھر کا ماحول دینی تھا اس لیے ان کی دینی تربیت گھر پر ہی ہوئی۔ اُن کو شرافت، اعلیٰ اخلاق اور دین داری کا پہلا سبق اپنے بزرگوں سے ملا۔ اُن کی شخصیت پر والدہ ماجدہ اور والد محترم دونوں کے نقوش مرتب ہوئے۔ یہ اُن کی خوش بختی تھی کہ گھر میں ان کو نہ صرف دینی بلکہ علمی و ادبی فضا بھی میسر آئی جس کی بدولت ان کے اندر چھپے ہوئے ادیب کی تربیت ہوئی۔ ان کے بچپن کے دور میں بچوں کے لیے ہفت روزہ رسالہ ”پھول“ شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے رسالہ ”پھول“ کا مکمل فائل گھر میں محفوظ تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسے سارا پڑھ ڈالا۔ اس دور کے جن ادبی جرائد سے وہ روشناس ہوئے اور کم عمری کے باوجود ذوق و شوق سے پڑھے ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

ماہنامہ رومان، نیرنگ خیال، ہمایوں اور ادب لطیف۔ اس کے علاوہ دیوان سنگھ مفتون کا اخبار ”ریاست“ چراغ حسن حسرت کا ”شیرازہ“ اور حمید نظامی کا ہفتہ وار ”نوائے وقت“ باقاعدگی سے زیر

مطالعہ رہے۔ یہ اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ میٹرک کی عمر کو پہنچتے پہنچتے وہ ملک کی بہت سی دینی ادبی شخصیات اور ان کے خیالات سے واقف ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے دور طالب علمی میں ڈپٹی نذیر احمد، علامہ راشد الخیری، عبدالحلیم شرر، پریم چند، کرشن چندر، نسیم حجازی، نعیم صدیقی، شورش کاشمیری، میاں ایم اسلم کے علاوہ مولانا مودودی کو جم کر پڑھا۔ حفیظ الرحمن احسن نے مرے کالج سیالکوٹ سے گریجویشن کی اور ایم اے عربی اسلامیہ کالج سول لائنز سے کے سابق طالب علم سے پرائیویٹ پاس کیا۔ ایم اے عربی کے امتحان میں انھوں نے تیسری پوزیشن اور درجہ امتیاز حاصل کیا۔ بعد ازاں انھوں نے ایم اے اُردو کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

۱۹۵۹ء میں انھوں نے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں عربی کے لیکچرر کی حیثیت سے تدریسی کیریئر کا آغاز کیا۔ ستمبر ۱۹۶۲ء میں تبدیل ہو کر گورنمنٹ کالج سرگودھا میں چلے گئے۔ ۱۹۶۳ء میں یہ عارضی ملازمت ختم ہو گئی۔ کیونکہ پبلک سروس کمیشن میں ایک دفعہ منتخب نہ ہو سکے اور دوسری دفعہ انٹرویو میں شریک نہ ہو سکے۔ چند مہینے بے کار رہنے کے بعد انھوں نے ستمبر ۱۹۶۳ء میں مرے کالج سیالکوٹ میں عربی کے معلم کے طور پر دوبارہ ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۶ء میں مرے کالج کی ملازمت چھوڑ کر لاہور میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ یہاں ایک سال تک ”اشاعت تعلیم“ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ (مذکورہ کالج کو ۱۹۷۲ء میں ہاشمی میموریل کالج آف کامرس میں ضم کر دیا گیا) ۱۹۶۶ء ہی میں انھوں نے اپنا اشاعتی ادارہ ”ایوانِ ادب“ قائم کیا اور یہی مصروفیت اب تک چلی آرہی ہے۔ تاہم ان دنوں اپنی علالت کی وجہ سے اپنے اشاعتی ادارہ کی طرف بھی ان کی توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ وہ مرے کالج سیالکوٹ کالج میگزین کے طالب علم مدیر بھی رہے۔ مرے کالج میں تدریسی فرائض سرانجام دیتے ہوئے پروفیسر آسی ضیائی سے مسلسل مشورہ و خن کیا جس سے ان کو شاعری اور زبان کے بہت سے اسرار و رموز سے شناسائی حاصل ہوئی۔ جب ۱۹۶۶ء میں لاہور میں اقامت اختیار کی تو طاہر شادانی جیسے اساتذہ و خن سے مسلسل رہنمائی لیتے رہے۔

۱۹۷۰ء کی آخری سہ ماہی میں ماہنامہ ”سیارہ ڈائجسٹ“ لاہور سے وابستہ رہے۔ اس مختصر دور میں بعض بہت اہم تحریریں لکھنے کا موقع میسر آیا۔ ۱۹۷۶ء میں لاہور سے جناب مظفر بیگ کی ادارت میں شائع ہونے والے ہفت روزہ ”آئین“ سے وابستہ ہوئے اور یہ وابستگی کئی سال تک قائم رہی۔ زندگی کے اسی دور میں انھیں ممتاز دینی شخصیت جناب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے قربت کے مواقع میسر آئے۔ اس طرح ان کی شخصیت کی تعمیر اور کردار سازی میں مولانا کے افکار، نظریات اور ان کی

رفاقت کا بہت بڑا حصہ ہے۔

وہ ۱۹۷۶ء ہی میں جناب نعیم صدیقی کے ادارت میں شائع ہونے والے ادبی ماہنامے ”سیارہ“ کے ساتھ وابستہ ہوئے۔ یہ وابستگی اب تک قائم ہے۔ اس وقت وہ اس ماہنامے کے اعزازی مدیر و منتظم کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ”سیارہ“ ۱۹۷۶ء سے ضخیم ادبی اشاعتوں کی صورت میں شائع ہو رہا ہے اور اب تک اس کی ۶۰ خاص اشاعتیں سامنے آچکی ہیں۔

ان کی تصنیفات اور مرتبات اردو ادب میں بیش قیمت اضافہ ہیں۔ گوانھوں نے بہت کم لکھا ہے لیکن جتنا بھی لکھا ہے بشمول نثر و نظم کے وہ ادبی چاشنی اور ”ادب برائے زندگی“ کا حسین امتزاج ہے۔ اسے حالات کی ستم ظریفی کہا جائے یا معاشرے کی بے حسی کہ ان کی تصنیفات میں سے ابھی کئی ایک اشاعت کے مرحلے سے نہیں گزریں۔ ان کے شعری مجموعے اور دیگر نگارشات جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

☆ غبارِ خزاں (فصلِ زیاں کے انداز کی غزلیں اور نظمیں)

☆ نوائے راز (غزلیں ۱۹۵۶ء سے ۱۹۲۰ء تک)

☆ ستارہ شام ہجراں کا (۱۹۹۸ء تک اور کچھ متفرقات)

☆ موجِ سلسبیل (حمدیہ شاعری)

☆ رشحاتِ تسنیم (نعتیہ شاعری)

☆ نغماتِ طفلی (بچوں کے لئے نظموں کا جامع مجموعہ جو کلیات کی شکل میں چھپ سکتا ہے)

☆ کلامِ احسن (متفرق منظومات)

ان کا مطبوعہ مجموعہ کلام ”فصلِ زیاں“ ہے یہ بے نظیر بھٹو کے دور اول پر بہ زبانِ غزل تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے ایک تاریخی ریکارڈ کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ حفیظ الرحمن احسن نے نثری ادب پر بھی مقدور بھر کام کیا ہے لیکن ان تصنیفات کی اشاعت کا کام ابھی زیر التوا ہے۔ نثری کام کی تفصیل یہ ہے:

☆ صراطِ مستقیم: دینی موضوعات پر ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہونے والی تقریروں کا مجموعہ ہے۔ ان

تقریروں کی تعداد (چھیاسی) کے لگ بھگ ہے۔

☆ مَوْقُومُؤں: متفرق دینی و علمی اور ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ”سیارہ“ کی تحریریں بھی

اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔

☆ اسلام کا سرچشمہ قوت: سید مودودی صاحب کے ”الجمعیتہ“ کے ۱۹۲۵ء کے ادارتی مضامین جن کا پہلا ایڈیشن حفیظ الرحمن احسن نے مرتب کیا ہے۔

☆ ادارہ آفاق۔ لاہور: (تعلیمی اداروں کا وفاق) کے لیے کام جناب حفیظ الرحمن احسن نے لگ بھگ دو سال کے متفرق منصوبوں پر تصنیف و تدوین اور نظر ثانی کا کام کیا ہے۔ یہ کتب پہلی سے آٹھویں جماعت کی اردو اور اسلامیات کے نصابوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ کتب پر احسن صاحب کا نام مختلف حیثیتوں سے درج ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ احسن صاحب نے رسالہ ”سیارہ“ کے لیے ادارتی تحریریں بھی لکھیں اور تنقیدی و تجزیاتی مضامین بھی۔ یہ تحریریں ان کے نثری سرمائے کا حصہ ہیں۔

حفیظ الرحمن احسن کا حلقہ ادب لاہور سے گہرا تعلق قائم رہا۔ یہ حلقہ ۱۹۸۰ء میں قائم کیا گیا۔ اسے قائم کرنے والوں میں جناب سراج منیر، پروفیسر فروغ احمد، سید اسعد گیلانی، جناب طاہر شادانی، ڈاکٹر تحسین فراقی، جناب جعفر بلوچ اور حفیظ الرحمن احسن وغیرہ شامل ہیں۔ یہ حلقہ پندرہ سال تک اپنا کام کرتا رہا۔ ابتدائی دس سالوں میں ہفت روزہ اجلاس ہوتا تھا جبکہ آخری پانچ سالوں میں پندرہ روزہ اجلاس منعقد ہوتے رہے۔ ان اجلاسوں میں بڑی مثبت تنقید ہوتی تھی (ادب کے حوالے سے)۔ اس حلقے کو لاہور کے ادبی حلقوں میں بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔

حمدیہ اور نعتیہ شاعری

حفیظ الرحمن احسن ایک کہنہ مشق ادیب و شاعر ہیں۔ علمی و دینی گھرانے سے تعلق ہونے کی بناء پر انھیں حمدیہ اور نعتیہ شاعری سے خاص شغف ہے اور حمدیہ اور نعتیہ شاعری ان کے اسلوب کا خاص وصف ہے۔ اس فن میں ان کا جذبہ اور خلوص دونوں پاکیزہ اور کامل نظر آتے ہیں۔ انھوں نے حمدیہ و نعتیہ شاعری زیادہ تر غزل کی ہیئت میں کی ہے۔ اس حوالے سے ان کا مجموعہ کلام ”موجِ سلسبیل“ ہے جو ابھی اشاعت کے مراحل سے نہیں گزرا۔ مگر ہمیں کامل یقین ہے کہ یہ مجموعہ چھپنے کے بعد اردو شاعری کے حمدیہ اور نعتیہ سرمائے میں ایک خوبصورت اضافہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ انسانی فکر و نظر اس کے ادنیٰ سے حصے کا بھی احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ انسان تو کائنات میں ایک حقیر سی مخلوق ہے۔ وہ رب ذوالجلال والا کرام کی تعریف و توصیف کا حق کیسے ادا کر سکتا ہے؟ انسان کا عمل محدود اور عقل محدود تر ہے۔ اس کی عقل تو اس قابل بھی نہیں کہ صفات ربانی کا مکمل ادراک ہی کر سکے۔ اس کا بیان تو بہت بڑی بات ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ: ”اگر دنیا کے تمام

درخت قلمیں اور تمام سمندر روشنائی بن جائیں تو بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور صفات کی تعریف و توصیف کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ ”اگرچہ ان کے ختم ہونے کے بعد ایسے ہی سات سمندر روشنائی کے اور مہیا کر لیے جائیں۔ تاہم انسان اپنی تمام کمزوریوں اور کم مائیگیوں کے باوجود اپنی بساط کے مطابق حمد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ اردو زبان میں حمد لکھنے کے لیے کوئی خاص ہیئت مقرر نہیں بلکہ یہ شاعر کی مرضی پر موقوف ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے لیے وہ جو ہیئت چاہے منتخب کر لے۔

چنانچہ قصیدہ، غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی، نظم معری، آزاد نظم، مخمس، مسدس غرضیکہ شاعر حمد کے لیے کسی بھی ہیئت کا انتخاب کر سکتا ہے۔ حمد قدیم ترین صنفِ سخن ہے۔ فنی اور تکنیکی انداز سے ہٹ کر دیکھیں تو کائنات میں خدا کی تعریف و توصیف کا آغاز تخلیق کائنات سے بھی پہلے ہوا تھا۔ تخلیق آدم سے قبل خدا کے فرشتے شب و روز اس کی تعریف و توصیف اور تسبیح و تہلیل میں مصروف تھے۔ تمام کتب سماویہ خدا کی تعریف و توصیف سے لبریز ہیں۔ انسانی رشد و ہدایت کی آخری کتاب ”قرآن مجید“ کا تو آغاز ہی حمد خداوندی ہے ہوتا ہے اور اختتام بھی۔ عربی اور فارسی شاعری میں حمد و مناجات کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ اردو میں شاعروں نے اپنے دیوان ترتیب دیتے وقت حمدیہ اشعار سے ابتدا کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اردو میں حمد کی تاریخ اردو شاعری کے ساتھ ہی شروع ہوتی ہے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم شعرا نے بھی اس روایت کی پاسداری کی ہے اور خدا کی حمد لکھی ہے۔

حفیظ الرحمن احسن نے حمدیہ شاعری کے لیے زیادہ تر غزل کی ہیئت استعمال کی ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف مشیتِ خاکی کے بس کا روگ نہیں اور اپنی اسی کم مائیگی کا ذکر کرتے ہوئے احسن صاحب کہتے ہیں:

ہے اس کی حمد سے عاجز مری زباں کیا کیا

ثنا سے اس کی ہے قاصر یہ خوش بیاں کیا کیا

انھوں نے اللہ تعالیٰ کی ثنا کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ان کی عقیدت

اور جذبہ خلوص کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے صرف رسماً ہی حمدیہ شاعری نہیں کی بلکہ اس موضوع پر ان کا قلم خلوص و عقیدت سے بارگاہ ایزدی میں سجدہ ہائے نیاز ادا کرتا نظر آتا ہے۔

مجھے فکر سود و زیاں ہو کیوں، سر کا ہش دل و جاں ہو کیوں

ترا فیصلہ مرا فیصلہ جو تری رضا، وہ مری رضا

ترا ذکر میری اساس ہے، ترا شکر میرا لباس ہے

ترے در پہ سجدہ گزار ہے مرا ہر نفس، مری ہر نوا

حمد کی ایک صورت مناجات کہلاتی ہے۔ حمد اور مناجات دونوں میں اگرچہ اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف ہوتی ہے لیکن مناجات کا انداز دعائیہ اور التجائیہ ہوتا ہے۔ احسن کی متعدد حمدیہ غزلوں میں مناجات کا رنگ نمایاں ہے۔ جس میں وہ بڑی عاجزی و انکسار سے اللہ تعالیٰ سے طلبِ رحمت کرتے نظر آتے ہیں۔

تیری رحمت کا آسرا چاہوں

اور پھر اس کے بعد کیا چاہوں

تیری چوکھٹ پہ جا کے بیٹھا رہوں

قرب کا تیرے سلسلہ چاہوں

.....

تو ہی میرے دل میں مکیں رہے، رگِ جاں سے بھی تو قریں رہے

ترے در پہ میری جبیں رہے، یہی طلب، یہی التجا

مرے حال پر بھی ہو اک نظر، میں ہوں تیرا احسن بے ہنر

ترے نام سے، ترے نام پر میری ابتدا میری انتہا

موجودہ دور ابتری اور زبوں حالی کو دور ہے۔ حالات پہلے کبھی اس طرح نہ بگڑے تھے۔ تمام

معاشرتی، تہذیبی اقدار مٹ کر نابود ہو چکی ہیں۔ مسلم ممالک کو چن چن کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ احسن

بھی اسی معاشرے کے فرد ہیں اور بہ حیثیت شاعر حالات کی اس ستم ظریفی پر ان کا دل کڑھتا ہے۔

چنانچہ وہ مولا کریم کی نگاہ التفات کے منتظر ہیں۔

ہیں بحر و برفساد کے مسکن بنے ہوئے

ہر سو ہیں مکر و زور نے جالے تے ہوئے

ٹوٹیں گے کب تمدنِ حاضر کے سومات

اے رب کائنات!

جو رستم کی گرد سے راہیں اٹی ہوئیں

بارود کے دھوئیں سے فضا میں پٹی ہوئیں

کیوں چھار ہی ہے زیست پہ غم کی سیاہ رات
اے رب کائنات!

ادبی اصطلاح میں ”نعت“ کا لفظ سرکارِ دو عالم سید المرسلین رحمۃ اللعالمین جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف اور مدح کے لیے مخصوص ہے، نعت دراصل ایک مسلمان کی طرف سے سرکارِ دو عالم کی بارگاہ میں عقیدت کا نذرانہ ہے۔ کسی شخص کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول کو اپنی ذات، ماں باپ، اولاد، مال و دولت، جاہ و حشمت اور دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر محبوب نہ رکھے۔

نعت گوئی کا آغاز عربی زبان میں رسول اکرم کی حیات طیبہ میں ہی ہو گیا تھا۔ مشرکین کی ہجو گوئی کے مقابلے میں حضرت حسان بن ثابت انصاری آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن و محامد بیان کرتے اور کفار کی بدگوئی کا جواب دیتے۔ یہ دراصل صحابہ کرام کی آپ سے محبت و عقیدت کا تقاضا تھا۔ بعض مواقع پر ابوسفیان کی ہجو گوئی پر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسان کو حکم دیا کہ اس کا جواب دیں۔ چنانچہ حضرت حسان کے نعتیہ قصائد عربی ادب کا انمول اور قابلِ قدر خزانہ ہیں۔ آپ کے محامد کے ذکر میں حضرت حسان کے یہ اشعار آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔

وَأَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِي
وَ أَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبْرَأً مَنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَأَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

(اے نبی! آپ سے زیادہ خوبصورت میری آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا
اور آپ سے زیادہ حسین کسی عورت نے جنم ہی نہیں دیا۔ آپ ہر قسم کی کمی اور
خامی سے پاک و مبرا ہیں۔ گویا آپ کی تخلیق آپ کے پسندیدہ محاسن کے
ساتھ کی گئی ہے۔)

کم و بیش بائیس صحابہ کرام اور حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ الزہرا کے نعتیہ اشعار عربی ادب کی آج بھی زینت ہیں۔ کعب بن زہیر امام بصری اور احمد شوقی کے قصائد نعت میں قابلِ قدر سنہری باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فارسی میں عطار، انوری، سعدی، عرفی مولانا رومی اور مولانا جامی کی نعتیں مشہور خلافت اور زبان زد عام ہیں۔

اردو شاعری بھی فارسی کے زیر سایہ ارتقا کی منازل طے کرتی رہی ہے۔ چنانچہ نعت گوئی کی روایت اسے فارسی ہی سے ملی ہے۔ اردو میں سب سے پہلے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نعتیہ اشعار منظر عام پر آئے۔ اردو کے تمام شعرا بلا تخصیص مسلم و غیر مسلم نے اپنی مثنویوں اور دیوانوں کی ابتدا میں بطور تبرک نعتیں لکھیں۔ اردو میں بطور خاص خواجہ میر درد، امیر مینائی، مولانا ظفر علی خان، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، حافظ مظہر الدین، نعیم صدیقی، احمد ندیم قاسمی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، عبدالعزیز خالد، اعظم چشتی اور محمد علی ظہوری نے خصوصی طور پر نعت پر توجہ دی۔ محسن کا کوروی اور امیر مینائی کا سارا کلام نعت کے لیے مخصوص ہے۔ مولانا حالی اور علامہ اقبال کا نعتیہ کلام بھی اپنی فن نزاکتوں، عقیدت و احترام اور محبت و الفت کے جذبات کا ٹھکانہ مارتا سمندر ہے۔

حفیظ الرحمن احسن سچے عاشق رسول ہیں اپنے بے پایاں عشق کا اظہار انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری میں انتہائی عجز و انکسار کے ساتھ کیا ہے۔ وہ حضرت محمد کی ثنا کے لیے الفاظ کا چناؤ بڑے سوچ بچار کے بعد کرتے ہیں۔ وہ واقعات اور مناظر کی تصویر کشی اس طرح کرتے ہیں کہ قاری پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

گوںجا ہوا ہے ان کا ترانہ مکاں مکاں	دہرا رہی ہے ان کا فسانہ اذال اذال
ہے جلوہ گاہِ طور کا عالم وہاں وہاں	پہنچا ہے اُن کا نورِ بنوت جہاں جہاں
آئے جب آپ پھیلے اجالے افق افق	ہر منظرِ جمال تھا پہلے دھواں دھواں
احسن تمہی نہیں ہو ثنا خوانِ مصطفیٰ	کرتی ہے ان کا ذکر مبارک، زباں زباں

ان کی نعت کا صوتی آہنگ اور طرز ادا اتنی خوبصورت ہے کہ روح سرشار ہواٹھتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ: ”آپ کا اسوہ تمام بنی نوع انسان کے لیے نمونہ ہے۔“ دورِ حاضر میں ترقی اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت کے نام پر معاشرے میں جو بے راہ روی نظر آتی ہے، احسن اس سے خائف تو ہیں لیکن وہ اپنے رب سے پُر امید بھی ہیں کہ ظلمت کا اندھیرا ضرور چھٹے گا اور ان کا یہ رویہ بہت صحت مندانہ ہے۔

بھٹک رہے ہیں سفینے محیطِ ظلمت میں	منارِ نورِ نبی کا نظام ٹھہرے گا
وہ دن قریب ہیں جب ہر نگاہ کا مقصود	جمالِ اسوۂ خیر الانام ٹھہرے گا
برائے تشنہ لباب، لطفِ ساقی کوثر	مدارِ گردشِ کاسِ الکرام ٹھہرے گا

انسان خطا کا پتلا ہے۔ بشری کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ احسن اپنی کمزوریوں کی پردہ

داری نہیں کرتے اور یہی ان کی کسر نفسی منکسر المزاجی کی دلیل ہے۔

بے نیاز متاع دنیا کر بندہ حرص ہوں، غنا چاہوں
کر عطا مجھ کو دولتِ اخلاص ہوں مریض ہوں، شفا چاہوں
پاؤں توفیقِ اتباعِ رسول الفتِ شاہِ دو سرا چاہوں
اور ان کا یہ شعر (اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ) کی کھلی تفسیر ہے۔
جو کئے مجھے سے، جُودوں اس سے

سب سے الفت کا رابطہ چاہوں

موجودہ دور میں ہر طرف افراتفری، نفسا نفسی اور اخلاقی پستی کا عالم نظر آتا ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ گزشتہ دو صدیوں میں انسان نے مادی اور سائنسی میدان میں بہت حیران کن ترقی کر لی ہے۔ لیکن اس کی روحانی، ذہنی اور شخصی گراؤ، پستی اور بد حالی کا گراف بھی بہت اونچے درجے پر پہنچ چکا ہے۔

حفیظ الرحمن احسن کا حمدیہ اور نعتیہ شاعری پر مشتمل مجموعہ ”موجِ سلسبیل“ روحانی زبوں حالی کے دور میں ایک اچھی کاوش ہے اور بگڑی اخلاقیات کو صحیح نہج پر لانے کے لیے ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو قادر مطلق ہے وہ ہمارے مانگنے سے بھی بڑھ کر نوازتا ہے۔ بشرطیکہ مانگنے کا طریقہ پُر خلوص اور ریاکاری سے پاک ہو۔ احسن کی حمدیہ شاعری اسی خلوص کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

جہاں تک ان کی نعتیہ شاعری کا تعلق ہے تو ان کی نعتیہ شاعری بھی معیارِ اعلیٰ پر فائز نظر آتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس ذات باری تعالیٰ کے محبوب ہیں، اس ذات نے خود اپنے محبوب کی مدح سرائی کی ہے اور اپنے بندوں سے بھی تقاضا کیا ہے کہ اس کے محبوب کی بڑھ چڑھ کر تعریف و توصیف کریں۔ شاعروں اور ادیبوں نے جہاں محبوب مجازی کی مدح سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں، وہیں احسن جیسے آشفۃ سر عاشقوں نے اپنے محبوب سرورِ کونین کی تعریف و توصیف کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں۔



اخذ و استفادہ

۱۔ حفیظ الرحمن احسن، موجِ سلسبیل (حمدیہ شاعری)

۲۔ حفیظ الرحمن احسن، رشحاتِ تنیم (نعتیہ شاعری)

فراغ رہووی کی نعتیہ شاعری

ABSTRACT:

Fragh Rohvi's Naatia poetry's collection "MIRA AAIYNA MADINAH" (MY MIRROR MADINAH) has been introduced in this article by reviewing the poetry in the context of religious poetry done by various other poets and showing some distinctive features of poetry written by Fragh Rohvi. Sensitivity of theme has also been brought into discussion in order to show importance of purity of thought and expression.

اردو شاعری میں نعت نگاری کی روایت قدیم ہے۔ مگر جس طرح مرثیہ نگاروں بالخصوص انیس و دبیر نے واقعہ کربلا کے سلسلے میں بہت سے حقائق، جنگ کے منظر و پس منظر، اسلامی طرز معاشرت، شہادت اور طریقہ غم گساری کے اظہار میں کسی محتاط رویے کو مد نظر نہیں رکھا ہے اسی طرح اردو نعت گو یوں نے بھی اس صنف کے حدود کی پاس داری میں عدم توازن و احتیاط کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ دلیل یہ کہ اگر ہم حمد، نعت اور منقبت بہ نظر غائر مطالعہ کریں تو عنوان، نام، مقام اور بعض مخصوص تلمیحات اور اشارات سے قطع نظر یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ تخلیق حمد ہے، نعت ہے یا منقبت؟ یہ ایک تلخ اور تفصیلی بحث ہے اس لئے یہاں اس پر گفتگو ممکن نہیں۔ البتہ اتنا عرض کیا جاسکتا ہے کہ شاعری میں مبالغہ، غلو اور تخیلی پروازوں کے لئے بے حد گنجائش موجود ہیں مگر جب متذکرہ اصناف پر طبع آزمائی کی جاتی ہے تو ہم پر بہت سی مذہبی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اگر ان کا خیال نہ رکھا جائے تو فنی و ادبی نقطہ نظر سے تخلیق کتنی ہی پر تاثیر اور آفاق گیر کیوں نہ ہو اس کی صنفی اور موضوعاتی حیثیت لائق اعتنا نہیں رہتی۔ ربو بیت و توحید کے قرآنی مفاہیم، رسول و رسالت کے مہینہ تصورات اور سیرت کے مستند واقعات پر دسترس اگر حمد و نعت کی تخلیق کے لئے ضروری ہیں تو منقبت کسی بزرگ کے ارفع

کردار اور صرف منشاء اسلام کے مطابق واقعات اور خالص اسلامی تعلیمات سے مزین افعال و حقائق کے اظہار کی اجازت دیتی ہے لیکن اللہ کی شان، رسولؐ کی مدحت اور اولیاء کی توصیف بیان کرنے میں معمولی سی چوک یا محدود و متعین دائروں کا ایک دوسرے دائرے میں نفوذ اور ذات و صفات کے بیان میں غلو و اشتراکیت وغیرہ کو کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ متذکرہ اصناف کی تخلیق کے لئے مذہبی علوم کی شناسائی کے باوجود شاعرانہ تعلیات سے پرہیز اور اظہار پر شعور کی گرفت کا ہونا لازمی ہے ورنہ صاحب علم بھی رو میں بہہ کر راستے سے بھٹک سکتا ہے۔ اس مثال مفکر اسلام علامہ اقبال کے یہاں بآسانی مل جاتی ہے۔ ان کی غزل کا مطلع ہے:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اللہ کو لباس مجاز میں دیکھنے تمنا مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ اسلامی نظریہ توحید کے بالکل منافی ہے۔ اسی طرح ان کی نظم ”التجائے مسافر“ کے اگرچہ کئی شعر ایسا نکعدو ایاک نستعین کے مفہوم سے متصادم ہیں مگر یہ شعر:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی

مسح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

محبوب الہی کی عقیدت میں نبی و غیر نبی کے فرق و امتیاز ہی کو ختم نہیں کرتا بلکہ بزرگ شخصیتوں کے مقابل انبیاء و رسل کے مرتبوں کو بھی کمتر ثابت کر دیتا ہے۔ ان امثلہ کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب اقبال جیسا مفکر جذبے پر جذباتیت، فکر پر تخیل، وجدان پر شعور اور مذہبی حدود پر عمومی خیالات کے بہاؤ پر قابو نہیں پاسکا تو اردو کے دیگر شعراء نصوص اسلامیہ کے گہرے مطالعہ کے بجائے عام نعت گوئی کی روایت پر چلتے ہیں ان کے یہاں خالص مذہبی احساس کی شاعری عمل میں آئے بڑی حد تک غیر ممکنات سے ہے۔

پہلے مذکورہ بالا اجمالی گفتگو اس لئے کی ہے کہ فراغ رہووی کے نعتیہ مجموعے ”مرا آئینہ مدینہ“ پر اپنے مختصر تاثرات پیش کر سکوں۔ اگرچہ فراغ رہووی کے یہاں بھی کچھ ایسے اشعار موجود ہیں جو روایت کے تحت تخلیق کئے گئے ہیں مگر ان کی شاعری کا بڑا حصہ ان کے محتاط تخلیقی رویے کا مظہر ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

حسن یوسف بھی بہت خوب ہے تسلیم، مگر
 قابل رشک ہے نبیوں میں سراپا تیرا
 چھوڑیں گے نہ ہرگز جیتے جی ہم آپ کا دامن شاہِ ام
 ”جو تیرا نہیں وہ میرا نہیں“ اللہ کا جب فرمانا ہے
 کسی جامِ جم کی حاجت نہیں اے فراغ مجھ کو
 مرے واسطے بہت ہے مرا آئینہ مدینہ
 نشانی ہے ابد تک کے لیے ام الکتاب اس کی
 کہ جس کے نور سے دنیائے ایمانی منور ہے
 ہوئی امامت جو مصطفیٰ کی تو مقتدی سارے انبیاء تھے
 مرے نبی کا جو مرتبہ ہے عطا کئے وہ مقام ہوگا
 موت آئے تو رہ شاہِ ام پر آئے
 دل میں مومن کے یہ ارمان جواں ہوتا ہے
 ہم پہ وا ہو جائے گا خود بابِ رحمت ایک دن
 جاگزیں دل میں ہے جب الفت رسول اللہ کی
 ان کا ہر قول و عمل قرآن کی تفسیر ہے
 ہم ادا کرتے رہیں سنت رسول اللہ کی
 یوں تو آئے جہاں میں پیمبر بہت
 آپ سے کوئی اعلیٰ و برتر نہیں
 آپ کی ذاتِ اقدس پہ نازاں ہیں سب
 کیا بشر، کیا ملک، کیا، فلک، کیا زمیں
 کون انساں جا رہا سوئے سدرہ دیکھئے
 جو نہ پہلے ہو سکا وہ واقعہ ہونے کو ہے

یہ اشعار شاعر کے وجود کی گہرائیوں میں موجزن محبت رسول کے احساسات، مذہبی حقائق کے
 ادراک اور سیرتِ اقدس کے مطالعے کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ اظہار میں ندرت اور سادگی کا
 عنصر غالب ہے جس کی وجہ سے اشعار براہِ راست ذہن و دل پر اثر انداز ہو کر قاری کے ایمان میں

تازگی و حرارت پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثل ذات کے مختلف پہلوؤں اور اپنی بے لوٹ عقیدت کی ترجمانی کے لئے جناب فراغ رہووی نے جہاں غزل کی ہیئت میں زیادہ تر نعتیں تخلیق کی ہیں وہیں بہت سی نئی اور قدیم اصناف کو بھی بطور وسیلہ قبول کیا ہے جن میں رباعی، دوہا، ماہیا اور ہائیکو بھی شامل ہیں۔ ذیل میں ہر صنف کی صرف ایک ایک مثال پیش کی جا رہی ہے:

دنیا میں اندھیرا ہی اندھیر ہوتا

یہ سانجھ نہ ہوتی نہ سویرا ہوتا

آتا نہ اگر دین محمد ہم تک

ہر گھر میں جہالت کا بسیرا ہوتا

(رباعی)

انساں ہو کر پاگئے پل بھر میں معراج

سچ پوچھو تو ہیں وہی نبیوں کے سر تاج

(دوہا)

جلوے بکھرے تھے

جس دم سدرہ سے آگے

آقا گزرے تھے

(ہائیکو)

مہمانِ خدا تم سا

عرشِ معلیٰ پر

کوئی نہ ہوا تم سا

یہ مثالیں ہر صنف کے مخصوص آہنگ اور خارجی اصولوں کی پابندیوں سے آگہی اور موضوع کے

ساتھ برتاؤ کے خوب صورت امتزاج اور ترسیل کے مؤثر طریقہ کار کا پتہ دیتی ہیں۔

”مرا آئینہ مدینہ“ کے سرورق پر اگرچہ ”نعتیہ کلام“ کی سرخی موجود ہے مگر جناب فراغ رہووی

نے کلام کی تدوین میں ایک خاص اہتمام کو برقرار رکھا ہے مثلاً یہ کہ غزل نما ہیئت کی فارم میں سب سے

پہلے حمد یہ کلام ہے یعنی اللہ کی تعریف و توصیف کو اولیت دی گئی ہے پھر حرفِ دعا کے عنوان سے اللہ کے

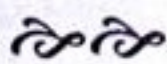
حضور میں اپنی حاجات کو پیش کیا گیا ہے اور نعتوں کا سلسلہ شروع ہو کر اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ یہی قرینہ رباعی، دوہا، ہائیکو اور ماہیا میں بھی برقرار رکھا گیا ہے جو مجموعے کو انفرادی حیثیت عطا کرتا ہے۔ مگر سرورق پر درج عنوان سے سے واضح نہیں ہوتا ہے کہ مجموعے میں حمد و مناجات بھی موجود ہیں۔

میں نے فراغ رہووی کے مجموعے میں موجود نعتیہ کلام ہی کو موضوع بحث بنایا ہے جب کہ اس میں حمدیں اور مناجاتی نظمیں بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

ترقی پسندی تحریک اور جدیدیت کی تحریک کے بنیادی اصولوں میں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے اس لئے ان تحریکوں کے خالص فنکاروں نے حمد و نعت جیسی اصناف کے تخلیقی رجحان کو شدید نقصان پہنچایا لیکن تحریکوں کے گئے چنے فنکاروں کو چھوڑ کر لا تحریک کے فنکاروں نے جہاں مذہب بیزار عقائد اور مغرب کی الحادی فکریات کو ذہنی، عملی اور تخلیقی سطحوں پر مسترد کیا وہیں دیگر روایتی اصناف کے ساتھ حمد و نعت جیسی اصناف کو بھی ادبی منظر نامے پر زندہ و تابندہ رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اپنی نوجوان نسلوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ فنی قدروں اور پابند اظہاری ہیئتوں کی اہمیت کا احساس بھی بیدار کیا یہی وجہ ہے آٹھویں دہے کی مابعد جدید لا تحریک کے فنکار اپنے اسلاف کی روایت کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔ بات آہی گئی ہے تو یہ اظہار بھی ضروری ہے کہ بعض حضرات جو نئی نسل کو ترقی پسند تحریک یا جدیدیت کی توسیع قرار دے رہے ہیں یا اس نسل کی انفرادی حیثیت کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پیدا کر رہے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ نئی نسل کے تخلیقی ادب کے امتیازات میں جہاں اور بہت سے عناصر موجود ہیں وہیں اہم عنصر مذہب اور بیشتر نئی اصناف کے ساتھ اس کی قدیم اصناف کے احیاء کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

جناب فراغ رہووی لا تحریک کے اہم شعراء میں شامل ہیں اور ان کا مجموعہ ”مرا آئینہ مدینہ“ اس تحریک کی مذہب سے والہانہ عقیدت، نعت کی قدیم ہیئت اور رباعی جیسی مشکل صنف پر طبع آزمائی کے ساتھ دوہا، ہائیکو اور ماہیا جیسی نئی اصناف پر قدرت لا تحریک کی امتیازی خصوصیات اور تحریکی ادب سے جدا تخلیقی جہات کی آئینہ دار ہے۔

جناب فراغ رہووی نے حمد و نعت جیسی پاکیزہ اور مقدس اصناف کے مجموعے کی کوئی قیمت نہیں رکھی ہے اس سے ان کے بلند خیالات اور طہارتِ احساس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔



انور جمال کی نعت گوئی

ABSTRACT:

Anwar Jamal's devotional poetry has been introduced in this article. Anwar Jamal presented two collections of Naatia Poetry 'Lo La Ka Lama' and 'Hasonat Jami Khisalehi' in 1984 and 2000 respectively. The first one was a Sestet formed poem. This form of poetry requires command in expression of views and composition of words and the poet fulfilled the requirement at his best. Anwar Jamal bears consciousness of form and content of Naatia poetry and has also expressed his view point in foreword of 'Lo La Ka Lama' which shows his critical approach. Examples of some couplets have also been laid down in the article from poetry presented in the book Hasonat Jami Khisalehi. This is a brief introduction of poetic work of Anwar Jamal in the genre of Naat.

پروفیسر انور جمال (انور حسین بھٹی) ملتان کے معروف شاعر ہیں۔ وہ یکم اپریل ۱۹۴۸ء کو پیدا ہوئے۔ ملتان کے ایک پوسٹ گریجویٹ کالج کے پرنسپل رہے۔ اس سے قبل مختلف کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۳۱/ مارچ ۲۰۰۸ء کو ریٹائر ہوئے۔

انور جمال نے شاعری، تنقید، تحقیق، مزاج اور خاکہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ ان کی اب تک ۱۰ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ”لولاک سما“ (نعتیہ مسدس) ۱۹۸۴ء، ”نصف النہار“ (مجموعہ غزل) ۱۹۹۱ء، ”پراگندہ طبع لوگ“ (خاکے۔ انشائیے) ۱۹۹۳ء، ”ادبی اصطلاحات“ (تحقیق و تنقید) ۱۹۹۴ء۔ ”تیرے بعد“ (مجموعہ نظم و غزل) ۱۹۹۹ء، ”حسن جمع خصالہ“ (نعتیں) ۲۰۰۰ء، ”ادبی اشارات“ (تحقیق) ۲۰۰۰ء، ”تاویلات“ (تحقیق و تنقید) ۲۰۰۳ء، ”تشنگی ہجر ہے“ (شاعری) ۲۰۰۷ء، ”بوہے باریاں“ (پنجابی شاعری) ۲۰۱۰ء۔

انور جمال نے شاعری میں نام پیدا کیا اور خوب صورت شعر کہے۔ انھوں نے نعتیہ شاعری کی۔ ان

کی دو کتب شائع ہوئیں۔ پہلی ”لولاک کما“ اور دوسری ”حسنات جمیع خصالہ“۔ ان کی نعتیہ شاعری میں رسالت مآب سے محبت اور قلبی وابستگی موجود ہے۔ نعت خلوص دل سے ہی کہی جاسکتی ہے جس کے اندر محبت کا چراغ روشن ہوتا ہے۔ وہ نعت کہتا ہے ورنہ یہ اعزاز نصیب نہیں ہوتا۔

انور جمال کی شاعری کی پہلی کتاب ”لوکا ک سما“ نعتیہ مسدس ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی یہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس دیباچے (حرف عجز) میں انور جمال لکھتے ہیں:

”اگر ہم نعت گوئی کا فروغ چاہتے ہیں اور سیرت طیبہ کی قندیل کی روشنیاں عام کرنا چاہتے ہیں تو نعت میں ایسے مضامین کی حوصلہ افزائی کی جائے جن کا تعلق اسوۂ حسنہ سے ہے۔ جن کا واسطہ رحمت عالم کی انقلاب آفریں حیات سے ہے۔ جن کا رشتہ اخلاق نبوی سے ہے۔ جن کا علاقہ عقیدت و محبت کے متوازن جذبوں سے ہے۔ جن مضامین سے انسانی ذات میں تحقیق کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جن کی دلوں سے مودت اور احترام کے الاؤ سلگتے ہیں اور جن سے ایمان کی کلیاں مہکتی ہیں۔“

بے بس ہے علم و درک و خبر اس مقام پر	ہیں طائر خیال و تفکر کے خام پر
وجدان و عقل ہوش جھکیں اس کے نام پر	حیرت بجاں ہے آدمی اس کے نظام پر
تر ہے جبین فن، عرق انفعال سے	بالا ہے وہ گماں سے خرد سے خیال سے
اس کے بعد ایک سو نعتیہ بند ہیں۔ ان میں سے چار بند پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں:	
لوح و قلم بنے تھے نہ تصویر کائنات	آب و ہوا نہ رنگ نہ موسم نہ واقعات
پھل پھول تھے نہ پیڑ نہ کانٹے نہ ڈل پات	جن و ملک نہ انس نہ جامد نہ ذی حیات
برگ حملِ سخن سے بھی پہلے کی بات ہے	
تخلیقِ حرف کن سے بھی پہلے کی بات ہے	

آدم کے دل کو نسخہ احمد عطا ہوا

سازِ ازل کو نعمۂ سرمد عطا ہوا

اسمِ عظیم سید امجد عطا ہوا

دنیا کے پہلے شخص کو ابجد عطا ہوا

پرکارِ جاں کو نقطۂ محور دیا گیا

آئینہ خیال کو جوہر دیا گیا

لکھوں اگر حضور کے احسان کم سے کم سطح فلک بنے میرا دیوان کم سے کم
دریا درخت سب ہوں قلمدان کم سے کم پھر جا کے لکھا جائے گا عنوان کم سے کم

حماد جس کی رب جہاں کی زبان ہو

تعریف اس رسول کی کس سے بیان ہو

اس مسدس کا آخری بند:

اے تو، کہہ کر تیری ذات سے محکم ہے میری ذات اے تو، کہ تری نعت پہ نازاں قلم دوات
مجھ پر سدا رہی ہے تیری چشم التفات یہ نعت خوں ہو حشر میں بھی تیرے سات سات

حیرت میں ہوں ملک مرے اوج نصیب پر

محشر کے لوگ رشک کریں مجھ غریب پر

نامور نقاد جابر علی سید مرحوم نے اس مسدس پر اعلیٰ رائے دی ہے۔ سید صاحب کی یہ خوبی تھی کہ وہ مروت میں نہیں لکھا کرتے تھے۔ وہ اپنی رائے کو قائم کرتے تھے۔ انور جمال پر انھوں نے اظہار خیال ہے تو دراصل یہ ان کی قلب کی سچائی ہے۔ سید مرحوم نے فرمایا:

”انور جمال عہد جدید کے نعت سراؤں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ جذبہ

نعت متعدد ہستیوں میں ابلاغ پاسکتا تھا اور ہر ہیئت میں اس کا تاثر یکساں

نہیں ہو سکتا۔ ہر چند کہ مرکزی احساس ایک ہی ہے تاہم ہیئت کا انتخاب طرز

احساس کے متعین کرنے میں کافی دخل رکھتا ہے۔ نعت جیسی پاکیزہ اور متانت

آمیز صف شاعری کے لیے مسدس ہیئت کا انتخاب اس میں تاریخی شعور،

معنوی ارتقاء، اور ہمتی جمالیت کے در آنے کا یقینی ضامن ہے جب نعت کے

ساتھ تاریخی شعور شامل ہوگا تو لامحالہ ایک ایسی نوعیت کا تاثر ہاتھ آئے گا جسے

ہم عصر از تاثر سے بڑی حد تک مختلف و متمیز پانے پر مجبور ہو جائیں گے۔

مسدس نعت لکھ کر انور جمال نے اس مقبول عوام صنف کو ایک نئے موڑ پر کھڑا

کر دیا ہے جہاں سے نئے افق احساس اور ادراک کے ہویدا ہوں گے اور

بیشتر شعراء اس نعتیہ کارنامے کو اپنا سرعشق بنانا پسند کریں گے۔ اس کا زور اور

تاثیر، آہنگ اور اسلوب اپنی نوع کے آپ ہیں اور رنگ میں واضح طور پر

منفرد نظر آتے ہیں۔“

جس وقت یہ مسدس شائع ہوئی اس وقت انور جمال کی عمر ۳۶ برس کی تھی لیکن ان کے کلام میں فنی پختگی دکھائی دیتی ہے اس کے ساتھ نبی پاک سے روحانی وابستگی اور تاریخی شعور نمایاں ہے اور انھوں نے مضامین کو نئے انداز میں پیش کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ انھوں نے شاعری کے اسرار و رموز پر ابتداء میں ہی دسترس حاصل کر لی تھی ورنہ سید مرحوم کی داد حاصل نہ کرتے۔

ان کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ”حسنت جمع خصالہ“ ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا یعنی پہلے ہدیہ نعت ”لولاک لما“ کے ۱۶ سال بعد اس پر ڈاکٹر عاصی کرناٹی مرحوم نے نظر ثانی کی تھی اور دوسرے مجموعہ کلام پر انھوں نے دیباچہ ”انور جمال کی نعت گوئی“ لکھا۔ ڈاکٹر عاصی کرناٹی نے اپنے دیباچے کی ابتداء میں لکھا:

”انور جمال شعر و ادب کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ نعت گوئی میں بھی اس کا بڑا نام ہے۔ ”لولاک لما“ اس کا مطبوعہ مسدس ہے جو اس کے عشق و عقیدت، علم و خیر اور استعداد و مہارت کی تحریری دستاویز ہے اور جس کی قبولیت اور مقبولیت اس کے سلیقہ نعت گوئی کی روشن دلیل ہے۔ اب وہ ایک نعتیہ مجموعہ ”حسنت جمع خصالہ“ کے نام سے بارگاہ رسالت کی نذر کر رہا ہے تفصیل تو آگے عرض کروں گا۔ یہاں ایک جملے میں نہایت ذمہ داری کے ساتھ ایک بات کہہ دوں کہ انور جمال کی یہ نعتیں اس نعت گوئی کے سرمائے میں ایک بیش بہا اضافہ ہیں۔“

اس شعری سعادت کو انھوں نے تین حصوں میں تقسیم کیا:

i۔ حمد رب ذی الجلال والاكرام

اس میں حمدیہ شاعر کی تعداد تین ہے ان میں سے ایک ایک شعر کو نقل کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

سحر طلوع ہوئی ہے اس اہتمام کے ساتھ

دعا دعا تری خوشبو، ازاں ازاں تری یاد

.....

رات کی تاریک باطن سے سحر کر کے طلوع

پھر اسے سورج کی کرنوں سے سجا دیتا ہے وہ

.....

صبحوں کا ترنم ہو کہ پھولوں کا تبسم

ہر حسن میں تو جلوہ جما ہے مرے مولا

اب ایک خوبصورتی دیکھیے۔ حمد باری تعالیٰ کے ساتھ رات ختم ہونے کا اور سحر کے طلوع ہونے کا تصور سامنے آتا ہے۔ ایک نئی صبح کی خواہش ابھرتی ہے گویا ہم نے اپنی تمام امیدیں باری تعالیٰ سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ یہی ہمارے ایمان اور یقین کی دلیل ہے۔

ii۔ یا ایہا المرءل

اس حصے میں ۱۶ نعتیں ہیں۔ تین نعتوں سے دو، دو شعر پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

آمد سید لولاک لما ، بسم اللہ	نغمہ صل علی ، صل علی ، بسم اللہ
حشر میں نعت کی جب میں نے اجازت چاہی	داور حشر نے خود مجھ سے کہا ، بسم اللہ

منزل کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور بس	اور وہ رسول پاک کا اُسوہ ہے اور بس
سچ پوچھیے تو حشر گر کائنات میں	فردوس کوئی ہے تو مدینہ ہے اور بس

چمن وہی تسکین وہی ہے وقت نزع یا سمن وہی ہے	رحمت عالم اس کا رتبہ ، صلی اللہ علیہ وسلم
جس میں چلیں بلا مقدر جس میں کہیں وہ غلام مقدس	جس میں بسیں دو شہر مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم

iii۔ یا الیہ المذثر

تیسرے حصے میں ۱۲ نعتیں ہیں۔ ان نعتوں سے بھی تین سے دو، دو شعر پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

میں ظلمت و حرماں کے دہانے پہ کھڑا ہوں	روشن ہے تری ذات سے کونین کا سینہ
ہو عشق ترا میری تمناؤں کا مرکز	ترے ہی لیے ہوا مرا مرنا مرا جینا

گر ہی جائے نہ کہیں کچے مکان کی صورت	کلیہ جسم کی دیوار ، رسول عربی
دل میں اک حسرت ناکام لیے پھرتا ہوں	ہاں وہی خواہش دیدار ، رسول عربی

لکھ اے قلم حضور رسالت مآب میں اک نعت پاک حاصلِ ایماں کہیں جے
 سر بہر سجدہ خم ہو ترا حرف حرف پر آنکھوں کی کیفیت کہ چراغاں کہیں جے
 میں نے انور جمال کے دو نعتیہ مجموعوں کا صرف تعارف پیش کیا ہے۔ نعت اور حمد سے صرف
 حسن اور خوبی تلاش کرنے کی سعادت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اللہ اور رسول کا ذکر آئے تو تجزیہ نگار اپنا
 رنگ بدل کر خود کو رحمت کے بہاؤ کے سپرد کر دیتا ہے کیونکہ یہ درود و سلام کا مقام ہے۔

انور جمال کی نعتوں میں عقیدت کی خوشبو ہے، روشنی ہے، زیارت کی تڑپ ہے۔ انھوں نے
 خوبصورت لفظوں میں اظہارِ عقیدت کیا ہے۔ گویا اپنی آخرت آسان کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت
 اور زندگی دے تاکہ انھیں مزید نعتیں لکھنے کی سعادت حاصل ہو۔

انور جمال ملتان کے چند اہم شعراء میں شمار ہوتے ہیں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ غزل اور
 نظم کہنے والے انور جمال سے نعت گو انور جمال مختلف ہے۔ اس مقام پر اور ہی رنگ ہے اور ہی
 تاثر ہے میں نے ان کی نعتیہ شاعری کا مختصر سا تعارف پیش کر سکتا ہوں اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔

آنکھوں کی کیفیت کہ چراغاں کہیں جیسے



نظیر رضوی الہ آبادی

ABSTRACT:

A collection of Naatia poetry has been traced and introduced here. Nazeer Illah Abadi/Dehlavi 's devotional poetry was published titled SADA-E-HARAM by his companions without mentioning date of publication. The book was barrowed from Hazrat Hassaan Hamd-o-Naat Book Bank Karachi, maintained enthusiastically by Ghos Mian and some couplets reproduced here for the sake of introduction of craftsmanship of a good Poet. Nazeer Ilah Abadi/Dehlavi 's poetic work is worth heeding for bring in lime light.

آپ کا اسم گرامی ڈاکٹر سید محمد نذیر حسن رضوی جبکہ تخلص ”نظیر“ اور قلمی نام ”نظیر رضوی الہ آبادی“ ہے۔ بعد میں آپ اپنے آپ کو دہلوی بھی لکھنے لگے تھے۔ آپ کے والد گرامی کا نام مولوی سید آل حسن ہے۔ آپ علامہ شفق عماد پوری کے نبیرہ (پوتے) اور سید محمود حسن رضوی نقشبندی (صاحب شمع حرم) کے بڑے بھائی ہیں۔ ۱۹۱ مارٹن روڈ کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ قاری حافظ محمد فاروق لکھتے ہیں کہ:

”صنّف غزل میں آپ کو جو ملکہ حاصل تھا اس سے بے نیاز ہو کر آپ نے ایک عرصے سے حمد و نعت و منقبت اور مذہبی شاعری کو اپنایا ہوا ہے.....
نظیر صاحب قیام پاکستان کے بعد سے اب تک منسٹری آف فارن افیئر میں سٹی کورٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ کراچی، اسمبلی سنٹرل سیکریٹریٹ، انکم ٹیکس، پاسپورٹ وغیرہ حکومت پاکستان کراچی میں بحیثیت کیریئر خدمات انجام دیتے رہے۔“

”صدائے حرم“ نظیر رضوی الہ آبادی دہلوی کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جس سے آپ کے تعارف کے

حوالے سے اور کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ تا حال جتنے ماخذات میرے سامنے ہیں ان میں بھی کہیں آپ کا ذکر نظر نہیں آتا حالاں کہ آپ کا نعتیہ مجموعہ ”صدائے حرم“ مطبوعہ موجود ہے۔

”صدائے حرم“ چھوٹے سائز میں ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کا کل علمی و شعری اثاثہ درج ذیل ہے۔ اولاً علامہ شفق عماد پوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حمد (۵۲ اشعار کی) ایک نعتیہ رباعی، ایک نعت (۱۰ اشعار کی) ایک نعتیہ نظم (۵۱ اشعار کی) ایک نعت (۵ اشعار کی) ”توحید و تحمید“ کے عنوان سے ایک رباعی، اور ”فلسفۃ الہیات“ کے عنوان سے دو رباعیاں ہیں اغلب امکان یہ ہے کہ یہ رباعیاں بھی علامہ شفق عماد پوری کی ہیں۔ وضاحت نہیں ملتی (واللہ اعلم)

”صدائے حرم“ میں نظیر رضوی الہ آبادی ثم دہلوی کی شعری نگارشات:

☆ منظوم ترجمہ ”اعوذ باللہ“ مع وجہ تسمیہ

☆ منظوم ترجمہ ”بسم اللہ“ مع شان نزول تفسیر و خواص نثر میں۔

☆ منظوم مضامین ”سورۃ فاتحہ“۔ بہ طرز مثنوی مولانا روم (علیہ الرحمہ)۔

☆ ”تفسیر سورۃ فاتحہ“ نثر میں۔ فضائل، تعبیر خواب، سورۃ فاتحہ کا نقش معظم، اعداد (برائے شفاءِ امراض)

☆ أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (سورہ محمد: ۲۴) کا منظوم ترجمہ۔

☆ وَلَقَدْ يَسْرُنَ الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ (سورہ القمر: ۳۲) کا منظوم ترجمہ۔

☆ لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ أَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُفٌ رَحِيمٌ (سورہ التوبہ: ۱۲۸) کا منظوم ترجمہ صفحہ مسدس میں ایک بند۔

☆ سورۃ نبی اسرائیل کی ایک یاد و آیات کا منظوم ترجمہ۔

☆ سورۃ ”التین“ کا ترجمہ و تفسیر منظوم۔

☆ سورۃ ”القدر“ کا ترجمہ، شان نزول، تفسیر منظوم۔

☆ سورۃ ”التكاثر“ کے مضامین، شان نزول و تفسیر منظوم۔

☆ ایک نظم بہ عنوان ”ماہصل زندگی“ (۱۸ اشعار)

☆ ”اللہ ہو“ مسدس کے ۵ بند۔..... ایک نظم ”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ“۔

☆ بہ عنوان ”حاصل عشق“ مسدس کا ایک بند۔..... ایک نعتیہ قطعہ۔

☆ ایک نظم ”پیام ماہ رمضان“ (۱۸ اشعار)..... ایک نظم ”نغمہ دلکشا“ (مسدس کے ۵ بند)

☆ سات نعتیں بہ عنوان ”نور حق“ ”دامان نبی“ ”ساقی کوثر“ ”رشک مسیح“ ”شمع کعبہ“ ”منزل عشق نبی“ ”گلزار مدینہ“۔

☆ ”ماصل عشق“ مولانا روم علیہ الرحمہ کے ایک شعر کا فارسی میں ترجمہ (۱۵ اشعار)

☆ شب معراج پر ایک نظم (پہلے حصے میں ۱۵ اشعار دوسرے حصے میں ۱۴ اشعار)

☆ ایک نظم بہ عنوان ”سیپارہ غم“۔ ایک ”سلام“ (مسدس میں) ایک سلام (۲۵ اشعار) ”سلام اس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی“، زمین میں) ایک اور سلام ”یا نبی سلام علیک“ کی زمین میں۔

☆ ”مرقع غم“ (۲۶ اشعار)..... التحیات کے بعد کی دُعا کا منظوم ترجمہ..... ”عہد نامہ“ کا منظوم

☆ ترجمہ۔..... ایک اور سلام (۹ اشعار) ایک دُعا (۳ اشعار)

”صدائے حرم“ پر قطعہ تاریخ اشاعت استاد الاستاد، شاعر اعظم، لسان الحستان مولانا شاہ ضیاء القادری بدایونی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر کیا ہے جس کا ہجری سال ۱۳۸۰ھ ہے۔ میرے حساب سے ۱۳۸۰ھ کا سال عیسوی ۱۹۶۰ء بنتا ہے۔ لیکن ”صدائے حرم“ ۱۳۸۰ھ یا ۱۹۶۰ء میں شائع نہیں ہوئی۔ کیونکہ صفحہ ۷۳ پر نظیر رضوی نے اپنی اہلیہ جمیلہ خاتون کی رحلت پر جو قطعہ لکھا ہے اس پر ۲ نومبر ۱۹۶۱ء تاریخ منظوم کی ہے یہی ان کی اہلیہ کی وفات کی تاریخ ہے۔ یقیناً ”صدائے حرم“ اس کے بعد ہی شائع ہوئی ہے جس کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اسی لیے میں نے قطعہ تاریخ کے سال ۱۳۸۰ھ کو اس کے سال اشاعت کے طور پر قبول نہیں کیا۔ (منظر عارفی)

”صدائے حرم“ پر ایک اور قطعہ تاریخ (بغیر سال کے) عبدالعلی اظہار نقوی سہوانی ثم دہلوی نے بھی تحریر کیا ہے۔ تقریظ نگار الحاج سید محمد عبدالسلام القادری (صدر انجمن امانت اسلام کراچی و سجادہ امانی و ربانی) ہیں۔ ”وجہ تسمیہ صدائے حرم“ کے عنوان سے نظیر رضوی الہ آبادی ثم دہلوی نے تحریر کی ہے۔ جس میں اپنے دو مسلمانوں کے حوالے سے کچھ گفتگو بھی فرمائی ہے۔ اہل شوق میرے مآخذ میں اس کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ ”حقیقت“ کے عنوان سے ایک تحریر احسان الحق (ایم اے۔ ایل ایل بی ایڈوکیٹ) کی بھی شامل کتاب ہے۔ الحاج سید محمد اکبر حسین نقشبندی، مجددی عزیزی غالباً ”صدائے حرم“ کے مرتب ہیں ان کے نام کے ساتھ ”حسن سعی“ لکھا گیا ہے۔

اتنا کچھ لکھنے اور لکھوانے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی لکھنے والا نظیر رضوی الہ آبادی کا مختصر سا تعارف بھی لکھ دیتا۔ یا شاعر موصوف خود اپنے بارے میں چند سطریں اور تاریخ ولادت تحریر فرما دیتے تو آج

ہمارے سامنے ان کا تعارف بھی متشکل ہو جاتا۔ امید ہے کہ مزید تحقیق کسی اچھی منزل تک ضرور پہنچائے گی۔ اس حوالے سے کوئی صاحب باحوالہ تعاون فرمائیں تو شکرگزار ہوں گا، منظر عارفی

(0322 2559854)

حمدیہ و نعتیہ کلام نظیر رضوی الہ آبادی
اللہ ہو

جس کے اذکار سے دل منور ہوا
جس کے پرتو سے روشن مقدر ہوا
جس کی گفتار سے دل مسخر ہوا
شان میں اس کی ہے یہ صدا کو بہ کو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

جس کا مسکن ہے شہ رگ سے بالکل قریں
جس کے قبضے میں ہیں آسمان و زمین
جس نے کی ہے متور بشر کی جبین
اُس کے نغمے ہیں پھیلے ہوئے چار سو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

جس نے ذروں میں سورج نمایاں کیا
جس نے انساں کی ہستی پہ احساں کیا
جس نے دنیائے دل کو درخشاں کیا
اُس کی آٹھوں پہر دل کو ہے جستجو

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

وہ کریم و علیم و رحیم و بصیر
اُس سے بڑھ کر نہیں کوئی بھی دیگر
دل کی آواز کیا ہے یہی ہے نظیر!
اُس کی رحمت ہے لا ریب لا تنقضوا

اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

”نغمہ دل کشا“

پڑھے غلوں دل سے اب، صلے علی محمد
 ہے یہ نجات کا سبب، صلے علی محمد
 پڑھتے ہیں جن و انس سب، صلے علی محمد
 آپ بھی پڑھیے با ادب، صلے علی محمد
 صلے علیٰ حبیبنا، صلے علی محمد
 صلے علیٰ معیننا، صلے علی محمد
 کون گیا ہے عرش پر، کس کو ملا ہے یہ مقام
 خاتم انبیاء ہو تم، سارے رسولوں کے امام
 ملتے ہیں دونوں لب بہم، جس نے لیا تمہارا نام
 کیسا ہے پیارا شیریں نام، لطف و کرم بہ خاص و عام
 صلے علیٰ شفیعنا، صلے علی محمد
 صلے علیٰ رفیعنا، صلے علی محمد
 سرور دو جہان ہو، کیوں نہ ہو تم پہ سب کو ناز
 شاہ و گدا سبھی ہوئے در سے تمہارے سرفراز
 اے میرے کارسازِ غم، ٹوٹ نہ جائے دل کا ساز
 چشمِ کرم ادھر بھی ہو، کون ہے تم سا غم نواز
 صلے علیٰ معیننا، صلے علی محمد
 صلے علیٰ بنینا، صلے علی محمد
 دونوں جہاں کے تاج دار، میری طرف بھی اک نظر
 ٹوٹے دلوں کے غم گسار، میری طرف بھی اک نظر

دل ہے گنہ سے شرمسار، میری طرف بھی اک نظر
دیدہ دل ہے اشک بار، میری طرف بھی اک نظر

صلیٰ علیٰ کریمنا، صلیٰ علیٰ محمد
صلیٰ علیٰ رحیمنا، صلیٰ علیٰ محمد

ہے یہ نظیر کی دُعا، صدقہ حبیب پاک کا
بخش دے اس کے ہر گنہ، تو ہے کریم اے خدا

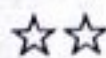
تو ہے علیم اور بصیر، تیرا ہے اس کو آسرا
سارے جہاں پہ مہرباں، کوئی نہیں ترے سوا

صلیٰ علیٰ نذیرنا، صلیٰ علیٰ محمد
صلیٰ علیٰ منیرنا، صلیٰ علیٰ محمد ۳



نعت بعنوان ”نور حق“

نظر سر بہ سجدہ ہے سوئے محمد	کہ ہے حسن حق حسن روئے محمد
اک آئینہ حق ہے روئے محمد	ہے معجز نما گفتگوئے محمد
دل و جاں سے قرباں ہوئے اک نظر میں	عمر آئے جب رو بروئے محمد
ہمیشہ تو یہ بات مد نظر رکھ	نظر سوئے رب، دل ہو سوئے محمد
تری زندگانی کا حاصل یہی ہے	تصور میں ہر دم ہو روئے محمد
خدا جذبہ شوق میں وہ تڑپ دے	چلوں سر کے بل میں بہ کوئے محمد
تجسس کناں چشم مخلوق پائی	تھی روز جزا جستجوئے محمد
دم نزع جب بند آنکھیں ہوں اپنی	خدایا نظر آئے روئے محمد
مقام ادب ہے یہ اے شوق منزل	نظر آ رہا ہے وہ کوئے محمد
تصویر میں، آنکھوں میں، دل میں یکیں ہے	وہ حسن دو عالم، وہ روئے محمد
نظیر ! اب نہیں کوئی باقی تمنا	ہے کافی مجھے یاد روئے محمد ۴



نعت بعنوان ”دامانِ نبی“

عالم ہے کہ منت کش احسانِ نبی ہے
 اللہ غنی دیکھیے کیا شانِ نبی ہے
 اُمدا ہوا سرِ چشمہ فیضانِ نبی ہے
 دل اپنا کھنچا جاتا ہے جو جانبِ منزل
 لوئی سے اشد ہے پہ ہوئے چاند کے ٹکڑے
 رضواں تری جنت کی ضرورت نہیں مجھ کو
 آوازِ کفِ پا ہے بلالِ حبشی کی
 کافور کیا جس نے زمانے کی سیاہی
 دشمن ہوئے اخلاقِ شہِ دیں سے مسلمان
 آنکھوں میں نظیر اپنے لیے اشک کے دریا
 کونین پہ چھایا ہوا دامانِ نبی ہے
 خلاقِ دو عالم بھی شاخوانِ نبی ہے
 کیا منبعِ رحمت درِ ایوانِ نبی ہے
 اعجازِ کرم کسٹرِ دامانِ نبی ہے
 یہ معجزہ ، یہ قوتِ ایمانِ نبی ہے
 صدرِ شکِ جنانِ گوشہِ دامانِ نبی ہے
 کیا شانِ سرِ عرشِ غلامانِ نبی ہے
 وہ روشنی شمعِ فروزانِ نبی ہے
 یہ معجزہ خُلق ہے یہ شانِ نبی ہے
 بیٹھا ہوا پیشِ درِ ایوانِ نبی ہے ۵



نعت بعنوان ”ساقی کوثر“

آئینہ بنا ذرہ ذرہ
 بھٹکا نہ مسافر منزل سے
 سرکارِ دو عالم نورِ خدا
 مغموم دلوں کو شاد کیا
 خوشبو سے جہانِ دل کی گلی
 اے گیسوئے مشکیں کیا کہنا
 رحمت کی گھٹا پُر کیف فضا
 سب تشنہ لبوں کی پیاس بجھی
 وحدت کی شعاعیں گھیرے ہوئے
 اے نورِ حقیقت کیا کہنا
 یہ جذبِ کشش اے صلے علی
 اے شمسِ متور کیا کہنا
 اے ہادی و رہبر کیا کہنا
 مخلوق کے رہبر کیا کہنا
 اے شافعِ محشر کیا کہنا
 ہوتی ہے معطر کیا کہنا
 اے زلفِ معنبر کیا کہنا
 اے صلے علی اے صلے علی
 اے ساقی کوثر کیا کہنا
 توحید کی کرنیں چاروں طرف
 اے نور کے پیکر کیا کہنا
 اب حُسن پس پردہ نہ رہا

جلوے ہیں کہ سٹے آتے ہیں اے قلب منور کیا کہنا
 اک فیض کا دریا بہتا ہے دنیا ہے کہ اُمّی آتی ہے
 منہ مانگی مرادیں پاتے ہیں اے خاصہ داور کیا کہنا
 اک نورِ نظیر وہ روشن ہے دنیا سے عرشِ معلیٰ تک
 اے دیدہ روشن کیا کہنا اے قلب منور کیا کہنا ۱

نعت بعنوان ”رہکِ مسیح“

اپنی خلش کا چارہ گر حال کوئی بتائے کیوں
 عشقِ نبی میں درد کا لطف نہ کوئی پائے کیوں
 رہکِ مسیح کا مریض نازِ دوا اٹھائے کیوں
 چارہ گردوں کے پھیر میں، غم کا بھرم گنوائے کیوں
 مرکزِ حق پہ ہو اگر، آنکھ تری جی ہوئی
 جلوۂ حسن کے سوا، کوئی نظر میں آئے کیوں
 دل میں ترے اگر رہے یادِ حبیبِ کبریا
 خانہ چشم میں ترے، حسنِ بیاں سمائے کیوں
 جس نے تمہاری یاد میں، اپنی مٹا دی زندگی
 گردشِ روزگار سے، کوئی اُسے ڈرائے کیوں
 جو ہے مریضِ مصطفیٰ، چھیڑ نہ چارہ گر اُسے
 خوگرِ غمِ ازل سے ہے، نازِ دوا اٹھائے کیوں
 عکسِ جمالِ پاک سے، شمعیں جو ضوفاں ہوئیں
 اُن کے فروغِ خاص کو، باوقفا بجھائے کیوں
 جلوۂ یارِ دیکھنا، سہل نہیں ہے اے کریم
 تابِ نگاہ جب نہ ہو، شوقِ نظر بڑھائے کیوں

جو ہے غلام مصطفیٰ ، وہ ہے حقیقت آشنا
سامنے غیر کے نظیر! دست طلب بڑھائے کیوں بے

☆☆

نعت بعنوان ”شمع کعبہ“

کعبہ دل جگر مدینہ ہے	جان اہل نظر مدینہ ہے
کیوں میں پوچھوں کدھر مدینہ ہے	جب کہ پیش نظر مدینہ ہے
جو غلاموں کو بادشاہی دے	اُسی آقا کا گھر مدینہ ہے
رج کعبہ تو فرض ہے لیکن	شمع کعبہ کا گھر مدینہ ہے
اُس کو نیرنگیوں سے کیا نسبت	جس کی شام و سحر مدینہ ہے
عکس اُس کا ہے سارے عالم پر	شمع ہر رہ گزر مدینہ ہے
لے چلا ہے کمال شوق جدمر	خوش ہوا دل! اُدھر مدینہ ہے
اہل ادراک جانتے ہیں اُسے	مرکز بحر و بر مدینہ ہے
اہل عرفاں کا قول ہے یہ نظیر!	عارف ہر نظر مدینہ ہے ۵

☆☆

نعت بعنوان ”منزل عشق نبی“

وہ بزم تصور میں آکر ، آنکھوں میں سمائے جاتے ہیں
آغاز کی منزل ختم ہوئی ، انجام بنائے جاتے ہیں
معراج کی شب کعبے سے نبی ، تاعرش بلائے جاتے ہیں
جلوے جو بشر سے پنہاں تھے ، آنکھوں کو دکھائے جاتے ہیں
ذرات جہان قلب و جگر ، آئینہ بنائے جاتے ہیں
خور وید رسالت کے جلوے ، آنکھوں کو دکھائے جاتے ہیں
بخشش سے نبی اکرم کی ، عاصی بھی بچائے جاتے ہیں
دوزخ سے نکالے جاتے ہیں ، فردوس میں لائے جاتے ہیں

انوار کی بارش ہوتی ہے ، آئے ہیں بہارِ خلد لیے
 پڑمردہ کلیاں کھلتی ہیں ، اعجاز دکھائے جاتے ہیں
 روشن ہے چراغِ بزمِ حرم ، اے صلے علیٰ اے صلے علیٰ
 انوارِ حقیقت کے جلوے ، ہر دل میں سمائے جاتے ہیں
 اعجازِ نظر کا کیا کہنا ، ویرانہ دل آباد ہوا
 بُت خانے کی ظلمت دور ہوئی ، دل کعبہ بنائے جاتے ہیں
 یہ عشقِ نبی کی منزل ہے ، آساں نہیں طے کرنا اس میں
 آنسو بھی بہائے جاتے ہیں ، اور سر بھی کٹائے جاتے ہیں
 سرکارِ دو عالم نورِ خدا ، گنجینہ معنی صلے علیٰ
 دنیا کے ذرے ذرے کی ، نظروں میں سمائے جاتے ہیں
 اعجازِ نظیرِ خستہ جگر ، کیا کہنا اُن کی مدحت کا
 آنکھوں کو نظارے جنت کے ، ہر وقت دکھائے جاتے ہیں ۹



نعت بعنوان ”گلزارِ مدینہ“

ایمان جو پختہ ہو جائے ، جینے کا قرینہ آجائے
 طوفانِ حوادث مٹ جائیں ، ساحل پہ سفینہ آجائے
 اُس شمسِ منور کی تابش ، گر سینہ بہ سینہ آجائے
 ذراتِ جہانِ دل چمکیں ، دامن میں خزینہ آجائے
 پڑ جائے جو اُس کی دل پہ نظر ، معراجِ محبت حاصل ہو
 تقدیرِ متور ہو جائے ، تکمیل کا زینہ آجائے
 اُس ماہِ مبیں کی اُلفت میں ، جو ڈوب کے ابھرے کیا کہنا
 تسنیم کی موجیں پیدا ہوں ، ساحل پہ سفینہ آجائے

لیک سے گونجے دل کی زمیں، ہو کعبہ خضر پیش نظر
قسمت سے خدایا وہ ساعت، وہ دن وہ مہینہ آجائے
داس جو نبی کامل جائے، بل جائیں بلائیں سر سے نظیر!
دروازہ جنت کھل جائے، گلزارِ مدینہ آجائے!



”سلام“ (مسدس)

سلام اُس پر خدا ملتا ہے جس کے عشق اُلفت سے
سلام اُس پر گنہ بخشے گا رب جس کی شفاعت سے
سلام اُس پر گھر برسائے جس نے اجرِ رحمت سے
سلام اُس پر نہ کوئی بڑھ سکا جس کی سخاوت سے
سلام اُس پر قیموں بیکسوں پر جس نے غم کھائے
سلام اُس پر کہ جس نے رحمتوں کے پھول برسائے

سلام اُس پر نہ گھبرایا جو آلام و مصیبت سے
سلام اُس پر نہ گھبرایا کسی دنیا کی طاقت سے
سلام اُس پر نکالا جس نے ہم کو قعرِ ظلمت سے
سلام اُس پر جو واقف ہے رموزِ شانِ وحدت سے
سلام اُس پر جو ہے اُمی لقب گنجینہ عرفاں
سلام اُس پر کہ جس کی شان میں نازل ہوا قرآن

سلام اُس پر جو دشمن سے بھی پیش آیا محبت سے
سلام اُس پر جو سب کے کام آیا لطف و رحمت سے
سلام اُس پر مشرف جو ہوا خالق کی قربت سے
سلام اُس پر ہوا واقف جو رازِ خاصِ وحدت سے
سلام اُس پر درود اُس پر تصدق جان و دل اُس پر
سلام اُس پر نہیں جس کا کوئی بھی ثانی و ہمسر

سلام اُس پر رہا جو دور سارے عیش و عشرت سے
 سلام اُس پر گزاری زندگی جس نے قناعت سے
 سلام اُس پر مشرف جو ہوا انوار وحدت سے
 سلام اُس پر رہی جس کو غرض ہر دم عبادت سے
 سلام اُس پر جو ہمدردِ جہاں ہے شافعِ محشر
 سلام اُس پر جو ہے لطف و کرم کا مخزن و مصدر

سلام اُس پر کیا نزدیک تر جس نے حقیقت سے
 سلام اُس پر بچایا جس نے ہم کو کفر و ظلمت سے
 سلام اُس رحمتِ دیں پر کہ جس نے اپنی رحمت سے
 نظیر! اِس خاکِ داں کو بھر دیا انوارِ وحدت سے
 سلام اُس پر جو ہے فریادِ رس اور شافعِ محشر
 سلام اُس پر جو ہے تشنہ لبوں کا ساقی کوثر ۱۱

☆☆

”سلام“

سلام اُس پر کہ جس سے ہو گئی روشن شبِ اسری
 سلام اُس پر جو پل میں دیکھ کر عرشِ بریں آیا
 سلام اُس پر کہ چمکے نور سے شمس و قمر جس کے
 سلام اُس پر کہ جس کے عکس سے لعل و گہر چمکے
 سلام اُس پر جسے اُمت ہی پیاری ہے دو عالم میں
 سلام اُس پر کہ جس کا فیض جاری ہے دو عالم میں
 سلام اُس پر کہ جس نے رات دن حق کی عبادت کی
 سلام اُس پر کہ جس نے راہِ مولا میں سخاوت کی
 سلام اُس پر کہ جس نے آبرو رکھ لی غریبوں کی
 سلام اُس پر کہ جس نے دلِ دہی کی غم نصیبوں کی

سلام اُس پر کہ جس نے درد مندوں سے محبت کی
 سلام اُس پر جس نے بے نواؤں کی اعانت کی
 سلام اُس پر کہ جس سے کعبہ دل ہو گیا روشن
 سلام اُس پر کہ جس سے جگمگائی وادی ایمن
 سلام اُس پر کہ جس آواز سے دشت و جبل لرزے
 سلام اُس پر کہ جس سے عرصہ جنگ و جدل لرزے
 سلام اُس پر کہ جس کے حکم سے ٹوٹا درِ خیر
 سلام اُس پر مٹایا جس نے ظلم و جور کا دفتر
 سلام اُس پر تقریر! آیا جو رحمت بن کے دنیا میں
 سلام اُس پر کرے گا جو شفاعت سب کی عقبیٰ میں ۱۲

☆☆

”سلام“

سلام اُس پر کہ جو محبوب رب العالمین ہو کر
 دکھانے منزلِ حق آیا جو حق الیقین ہو کر
 تصور صاحبِ لولاک کا دل میں مکیں ہو کر
 دکھاتا ہے جو منزلِ رہبرِ راہِ یقین ہو کر
 سلام اُس پر کہ جس کی انگلیوں سے چشمے بہ نکلے
 کیا سیراب سب کو رحمت للعالمین ہو کر
 سلام اُس پر کہ جس نے کر دیا ہے شادماں اُس کو
 جو اُس کی بزم میں آیا کوئی اندوہ گیں ہو کر
 سلام اُس پر تصدق جان و دل اُس مہرِ عرفاں پر
 ہوا کونین میں جو آشکارا نیریں ہو کر

سلام اُس پر نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا
 جو اُس کے سامنے آیا کوئی چیں بہ جبیں ہو کر
 سلام اُس پر درود اُس پر وہ سرتاج رُسل جس نے
 غریبوں کے دلوں میں گھر کیا دُرِ خمیں ہو کر
 جو محبوب خدا ہے نازشِ خلاقِ عالم ہے
 اُسی کا نور چکا آفتابِ مرسلین ہو کر
 خدا نے یہ شرف بخشا نظیر! اک فخرِ انساں کو
 نہ پہنچے لامکان تک دیکھیے، روح الامیں ہو کر ۱۳

☆☆

”حاصلِ عشق“

خانہ دل سے یہ آتی ہے صدا
 عشق کا حاصل ہے عشقِ مصطفیٰ
 عقل کی حد سے گزر کر اے نظیر!
 بحرِ عشقِ مصطفیٰ میں ڈوب جا
 جس کو عشقِ مصطفیٰ حاصل ہوا
 اُس کا دامنِ نعمتوں سے بھر گیا ۱۴

☆☆

”چارِ مصرعے“

اے کاش وطن اپنا مدینہ ہوتا
 اس دہر میں جینے کا قرینہ ہوتا

ہوتا جو کہیں قرب تو منزل ملتی
 سو بار بھی مرجاتا تو جینا ہوتا ۱۵

حوالے

۱۔ صدائے حرم/نذیر حسن ظہیر الہ آبادی قم دہلوی/بہ اہتمام: سید منظور الحسن حیدری رکن بزم شفق کراچی/ تاریخ اشاعت ندارد/ علم و عمل بک ڈپو ایمپریلس مارکیٹ صدر کراچی/ ملنے کا پتا: سید منظور الحسن حیدری، حرمین پرنٹرفیش محمد فتح علی روڈ نزد دھانی چوک کراچی/ صفحہ ۷۱/ بنگلہ یہ حضرت حسان محمد و نعت بک بینک کراچی، ہانی، غوث میاں۔

۲۔ ص ۳۶

۳۔ ص ۴۰

۴۔ ص ۴۱

۵۔ ص ۴۲

۶۔ ص ۴۲

۷۔ ص ۴۳

۸۔ ص ۴۳

۹۔ ص ۴۳

۱۰۔ ص ۴۳

۱۱۔ ص ۶۹

۱۲۔ ص ۷۰

۱۳۔ ص ۸۰

۱۴۔ ص ۲۸

۱۵۔ ص ۲۸

نیاز سواتی کی نعت پر ”مسدسِ حالی“ کے اثرات

ABSTRACT:

Niaz Sawati's poetry carry similarities of thought and pattern of expression borrowed from Maulana Altaf Hussain Hali. This article shows similarity of sensibility and textual relativity of poetry of Niaz Sawati with the Sestet of Hali. Subject matter of both Hali and Niaz Sawati is the same and both poets have put their inner feelings in their utterances. Hence the poetic voices become identifiable.

مولانا الطاف حسین حالی کی طویل نظم ”مد و جزر اسلام“ المعروف ”مسدسِ حالی“ اردو میں قومی شاعری کا اولین سنگ میل ہے۔ سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی حالی کی یہ طویل نظم ۱۸۷۹ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوئی تو اسے قبولیت خاص و عام حاصل ہوئی۔ عام طور پر کسی فرمائش کے تحت لکھے گئے فن پارے میں تاثر پذیری کا اعلیٰ شعری معیار قائم نہیں ہو پاتا لیکن ”مسدسِ حالی“ کو اس سلسلے میں یوں استثناء حاصل ہے کہ یہاں تو فرمائش محض ایک محرک بنی جب کہ اس طویل قومی نظم میں بیان کردہ مضامین کا لاوہ تو شاعر کے دل و دماغ میں نہ جانے کب سے پک رہا تھا جس کی حرارت میں درد مندی اور خلوص پر مبنی شاعر کے احساسات و جذبات کی تمام تر حدیں اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود تھیں۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے بجا طور پر اسے ایک الہامی کتاب کا درجہ دیتے ہوئے اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوتا ہوا ایک ستارہ قرار دیا ہے:

”یہ ایک الہامی کتاب ہے۔ اس کو تاریخ ارتقا کے ادبِ اردو میں ایک سنگ

نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک تارہ ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع

ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔“

حالی نے اپنی اس طویل نظم کا خاکہ تیار کرتے ہوئے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا۔ پہلے حصے

میں قبل از اسلام دورِ جاہلیت کی قبائلی زندگی کا نقشہ کھینچا۔ دوسرے حصے میں ظہورِ اسلام کی برکات اور مسلمانوں کے عروج کی داستان رقم کی جب کہ تیسرے حصہ مسلمانوں کے زوال اور زبوں حالی کا نوحہ ہے۔ اس کی وضاحت خود حالی نے اپنی اس تصنیف کی اشاعتِ اول کے دیباچے میں یوں کی ہے:

”اس مسدس کے آغاز میں پان سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس اہتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی امی سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابرِ رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم میں سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خط و خال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے، اور کیا ہو گئے۔“ ۲

یہاں ان تینوں حصوں سے متعلق ایک آدھ بند مثال کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تینوں حصوں کا اپنا مخصوص مزاج سامنے لایا جاسکے اور محسوس کیا جاسکے کہ شاعر نے ان تینوں حصوں کے اپنے اپنے خاص ماحول کے پیش نظر کس قدر اپنی منفرد شعری مہارت کا ثبوت دیا ہے زمانہء جاہلیت میں عربوں کی قبائلی زندگی میں باہمی افتراق و انتشار اور روزمرہ زندگی کے وحشی پن کا منظر نامہ یوں پیش کیا ہے۔

قبیلے قبیلے کا بت اک جدا تھا	کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزم پہ وہ ناکہ پر فدا تھا	اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہرِ انور	اندھرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ	ہر اک لوٹ اور مار میں تھا یگانہ
فسادوں میں کٹتا تھا ان کا زمانہ	نہ تھا کوئی قانون کا تازیانہ
وہ تھے قتل و غارت میں چالاک ایسے	دردے ہوں میں بے باک جیسے ۳

جہالت کی اس تاریک رات میں اس عظیم ذات کا ظہور ہوتا ہے جس کی سیرت و کردار کی کرنیں جہالت کی ان تاریکیوں کو تہذیب و اخلاق کی روشنیوں میں بدل دیتی ہیں اور دکھوں کی ماری انسانیت

سکھ کا سانس لیتی ہے۔

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
ادا خاکِ بطحانے کی وہ ودیعت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
بڑھا جانبِ بوقبس ابرِ رحمت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
دعائے خلیل اور نویدِ مسیح

حالی نے اس مقام پر تین چار ایسے بند تخلیق کیے ہیں جو نعتیہ شاعری کی اعلیٰ مثال ہیں۔ ان بندوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کی ایسی جھلکیاں پیش کی ہیں جن کی بدولت انسانی معاشرے میں سماجی سطح کا ایک ایسا عظیم انقلاب برپا ہوا جس کی کرنوں سے انسانیت کا قیامت مستنیر ہوتی رہے گی۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
یتیموں کا والی، غلاموں کا موئی

خطا کار سے درگزر کرنے والا
مفسد کا زیر و زبر کرنے والا
اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اور اک نسخہٴ کیمیا ساتھ لایا

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا جب اس دنیا سے پردہ فرمانے کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی عظیم تعلیمات کی بدولت ایک ایسی تربیت یافتہ قوم اس دنیا میں چھوڑی جس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا کی گئی تربیت کی بنیاد پر پوری دنیا کی پیشوائی کی۔

جب امت کو مل بھی چکی حق کی نعمت
رہی حق پہ باقی نہ بندوں کی حجت
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی
ادا کر چکی فرض اپنا رسالت
نبی نے کیا خلق سے قصدِ رحلت
کہ دنیا میں جس کی مثلیں ہیں تھوڑی

تاہم جب اسی بے مثل قوم نے اپنے نبی کی تعلیمات سے روگردانی اختیار کرنا شروع کر دی تو نتیجے کے طور پر تاریخی اصول کے تحت یہ قوم بھی تنزل کا شکار ہوئی۔ حالی نے اپنی اس طویل نظم میں اس تنزلی کا بھی دردناک نوحہ قلم بند کیا۔

برے ان پہ وقت آ کے پڑنے لگے اب
وہ دنیا میں بس کرا جڑنے لگے اب

بھرے ان کے میلے پچھڑنے لگے اب بنے تھے وہ جیسے بگڑنے لگے اب
ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر گھٹا کھل گئی سارے عالم پہ چھا کر

.....
نہ ثروت رہی ان کی قائم نہ عزت گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن ان سے ایک ایک رخصت مٹیں خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت
رہا دین باقی نہ اسلام باقی اک اسلام کا رہ گیا نام باقی بے
حالی کی اس طویل نظم نے اردو کی قومی شاعری کو ہر دور میں متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اقبال کی ”شکوہ“ اور ”جوابِ شکوہ“ جیسی شاہکار نظموں میں بھی ہیئت سے لے کر موضوعات و مضامین تک ”مسدسِ حالی“ کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

قومی و ملی شاعری کے علاوہ اردو کی نعتیہ شاعری میں بھی اس نظم کے اثرات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ حالی نے اپنی اس نظم میں نعتیہ شاعری کا ایک ایسا انداز متعارف کرایا جس کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے عقیدت کا اظہار ان کی سیرت و کردار کے اعلیٰ معیار کے اعتراف کی صورت میں کیا گیا۔ وہ سیرت و کردار جس کی پیروی کی صورت میں انسانی بستیوں میں ذہنی و روحانی حوالے سے انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح پر فکری و سماجی انقلاب برپا ہوا۔

نیاز سواتی (۱۹۳۱ء-۱۹۹۵ء) خطہ ہزارہ کے وہ نمایاں شاعر ہیں جن کی شہرت اپنے علاقے سے نکل کر ملک کے دوسرے معروف ادبی حلقوں میں بھی پہنچی۔ ان کی معروف وجہ شہرت طنز و مزاح پر مبنی ان کا واقع کلام ہے۔ تاہم ان کی نعتیہ شاعری بھی اپنا ایک معتبر مقام رکھتی ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں جابجا ”مسدسِ حالی“ کے اثرات یوں محسوس کیے جاسکتے ہیں کہ وہ اکثر اپنی قدرے طویل نعتیہ نظموں میں لگ بھگ وہی انداز اختیار کرتے ہیں جو ”مسدسِ حالی“ کا امتیاز ہے۔ نیاز سواتی اپنی ایک نعتیہ نظم ”ظہورِ قدسی“ میں دنیائے قبل از اسلام کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:-

ذرا سی بات پر اہل عرب آپس میں لڑتے تھے
ذرا سی بات پر اک دوسرے کو قتل کرتے تھے
بجائے حق تعالیٰ کے، خدا اصنام ہوتے تھے
عرب میں سب قبائل کے جدا اصنام ہوتے تھے

غلاموں پر ستم ڈھانے کو وہ جائز سمجھتے تھے
انھیں ہر وقت تڑپانے کو وہ جائز سمجھتے تھے ۸

آگے چل کر اسی نظم میں بعثتِ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات دکھاتے ہوئے ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ ”مسدسِ حالی“ کے اثرات نمایاں طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

کیا حق آشنا انسان کو آ کر محمد نے
محمد نے کیا شیر و شکر آ کر قبائل کو
تمدن کو نکھار دینِ حق لا کر محمد نے
محمد نے بنایا معتبر آ کر قبائل کو ۹

اسی طرح ایک اور طویل نعت میں بھی یہی صورت ملتی ہے جس میں دورِ جاہلیت کے قابلِ مذمت رسم و رواج پر روشنی ڈالنے کے بعد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی برکات کا والہانہ انداز میں ذکر کیا ہے۔

ابنِ آدم کی نظروں میں عزت نہ تھی
جب محمد کی دنیا میں بعثت ہوئی
بنتِ حوا کی کوئی بھی وقعت نہ تھی
اس کو وقعت ملی اس کو عزت ملی
ختم کر دی غلامی سدا کے لیے
رخِ پلٹ کے ہی چھوڑا وہ حالات کا
چاک پردہ کے امتیازات کا ۱۰

”بعثتِ نبوی“ کے عنوان سے ایک نعتیہ نظم میں نیاز سواتی نے ”مسدسِ حالی“ کا وہی انداز اپنایا ہے جس میں انھوں نے بعثتِ نبوی سے ماقبل اور مابعد حالات کا تقابل اور موازنہ کیا ہے۔

سرکارِ دو عالم جب آئے ، الحاد کی ظلمت دور ہوئی
اس شمعِ نورِ ہدایت سے ، یہ سب دھرتی پر نور ہوئی
صحرائے عرب وہ خطہ تھا ، دنیا میں نہ جس کی وقعت تھی
یہ ان کا کرم ہے دنیا میں ، جو ارضِ عرب مشہور ہوئی ۱۱

”ظہورِ قدسی“ کے زیرِ عنوان ایک نظم کی ابتدا میں خدا کی زمین پر جہالت کی تاریکیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نظم کے آخری حصے میں حضور پر نور کے ظہورِ قدسی کے فیوض و برکات بیان ہوئے ہیں۔

چار سو تھیں جہالت کی تاریکیاں
آپ آئے تو ہر سو سویرا ہوا
ظلمتوں میں گھری تھی خدا کی زمیں
کفر کا دور جگ سے اندھیرا ہوا ۱۲

نیاز سواتی نے اپنی پابندِ نعتیہ نظموں کے علاوہ آزاد نعتیہ نظموں میں بھی جابجا لگ بھگ وہی

نیاز سواتی کی نعت پر ”مسدس حالتی“ کے اثرات

انداز اختیار کیا ہے۔ وہ اپنی ایک آزاد نعتیہ نظم ”طلوع آفتاب رسالت“ کی ابتدا ان لائنوں سے کرتے ہیں۔

نہ تھا تصور کسی بھی قانون کا عرب میں زمین انسان کے لہو سے، عرب کی، سیراب ہو رہی تھی
حیا و اخلاق کا جنازہ نکل چکا تھا خدا کا موجود تھا نہ کوئی بھی نام لیوا
چراغِ ایمان کے سارے گل تھے ۱۳

اسی نظم کا اختتام ان لائنوں پر ہوتا ہے جن میں خوشبوئے نبوت کی مہکاروں اور آفتاب رسالت کی ضواریوں کا ذکر ملتا ہے۔

عرب کی دھرتی پہ ایک ایسا گلاب مہکا کہ جس کی خوشبو سے ساری دنیا ہوئی معطر
عرب سے وہ آفتاب ابھرا کہ جس کی ضو سے تمام دھرتی پہ چار سو ہو گئے اجالے ۱۴
ایک نظم ”آمدِ داعیِ اسلام“ کا آغاز بھی اس تیرہ و تار فضا کی تصویر آفرینی سے ہوتا ہے جس میں سر زمینِ عرب کفر و الحاد کے بادلوں میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

کفر سے سب فضا تیرہ و تار تھی تیرگی تھی، اجالا کہیں بھی نہ تھا
کفر کے بادلوں سے گھری تھی زمین ابنِ آدم خدا سے نہ تھا آشنا
ابنِ آدم کی کوئی نہ توقیر تھی سب فضائے عرب خونِ آلود تھی ۱۵
یہی نظم اپنی اختتامی لائنوں میں کفر کی کالی گھٹاؤں کے چھٹنے اور تعلیماتِ نبوی کی خوشبوؤں سے فضاؤں کے معطر ہونے کی نوید دیتی ہے۔ وہ تعلیماتِ نبوی جن کے طفیل انسانیت نے زندگی گزارنے کے سلیقے اور قرینے سیکھے۔

آپ نے آ کے جینا سکھایا ہمیں زندگی کا قرینہ بتایا ہمیں
آپ نے ہی دیا نطقِ مظلوم کو حق نہ حاصل تھا جینے کا محکوم کو
آپ نے ابتدا کی نئے دور کی کفر کی دور کالی گھٹائیں ہوئیں

خوشبوؤں سے معطر فضا میں ہوئیں ۱۶

ایک اور آزاد نظم ”محسنِ انسانیت“ میں بھی نیاز سواتی نے یہی انداز اپناتے ہوئے آفتاب رسالت کے طلوع ہونے سے قبل دنیا کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو توحید اور تہذیب کی روشنی سے نا آشنا ظلمت کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی ہے۔

ہر سمت اندھیرے چھائے تھے

جب تک نہ محمد آئے تھے

ہمراہ نہ جب تک وہ اپنے پیغامِ خدا کا لائے تھے

تہذیب سے دنیا عاری تھی

توحید کی لو سے دور بہت، مخلوقِ خدا کی ساری تھی

ادہام تھے اور محصور تھے ہم

توحید سے کوسوں دور تھے ہم ۱۷

اس نظم کے آخر میں شاعر نے اس احسانِ عظیم کا ذکر کیا ہے جو محسنِ انسانیت نے پورے عالم

انسانیت پر کیا اور ان کا یہ احسان تا قیامت انسانیت کے ماتھے کا جھومر بن کر جگمگا تا رہے گا۔

سرکارِ دو عالم نے آکر اس دنیا کو پر نور کیا

ہر سمت اندھیرا کفر کا تھا وہ آپ نے آکر دور کیا

احسان یہ ہم پر آپ کا ہے

حق سے جو شناسا آج ہیں ہم ۱۸

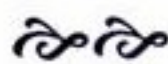
یوں دیکھا جائے تو نیاز سواتی کے نعتیہ کلام پر ”مسدسِ حالی“ کے اثرات اس حد تک ضرور

مرتب ہوئے ہیں کہ ان کی مذکورہ نعتیہ نظموں میں خاص طور پر مسدس میں بیان کیے گئے ابتدائی دو

حصوں یعنی دورِ جاہلیت کا بیان اور بعثتِ نبوی کا ذکر پر نور جا بجا ہوا ہے۔ جہاں تک مسدس کے

تیسرے حصے یعنی مسلمانوں کے تنزل کے بیان کا تعلق ہے تو یہ منظم انداز میں ان کے ہاں نہیں پایا

جاتا البتہ غیر منظم انداز میں مختلف نعتوں میں اس کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔



حوالہ جات

۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخِ ادبِ اردو، ترجمہ: مرزا محمد عسکری، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۰۱

۲۔ الطاف حسین حالی، مسدسِ حالی، تاج کپنی لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰

۳ تا ۷۔ ایضاً ص ۱۹-۲۰-۲۱-۲۲-۲۳ بالترتیب

۸۔ نیاز سواتی، مدحِ پیغمبرؐ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵۷

۹ تا ۱۸۔ ایضاً ص ۵۸-۶۲-۸۰-۹۰-۵۵-۵۶-۶۲-۱۹۱-۱۹۲ بالترتیب

شوکت عابد کی ملی شاعری..... ایک تجزیاتی مطالعہ

ABSTRACT:

Poetry of Shaukat Aabid contains his heart felt pain for Muslim Ummah. He has called Muslims towards teachings of Holy Prophet Muhammad (S.A.W) that every Muslim is a family member of all Muslim population of the world. This feeling has aroused the sense of creating poems in perspective of world wide cruelty being faced by Kashmir, Palestine, Afghanistan, Iraq and other Muslim countries. This article focused upon the poetry written by Shaukat Aabid in perspective of Palestine. The poetry reflects thought provoking campaign for awakening spirit of brotherhood among Muslims of the world. Some soul touching couplets cited to show impressiveness of poetic voice in the article besides presenting whole poem at the end.

شوکت عابد کسی دینی یا سیاسی جماعت سے انسلاک کے بغیر بھی ایک ایسے دل کے مالک ہیں جس میں قومی اور ملی درد شدت سے دفور کرتا ہے یہ کیفیت ان میں آج کی نہیں اسی زمانے کی ہے، جب شعر و شاعری سے ان کے سمبندھ کو بہت زیادہ دن نہیں ہوئے تھے وہ طالب علم تھے کہ ڈھا کہ لہورنگ ہوا۔ ہمارے نوے ہزار سے اوپر مسلح پاک جوان لڑے بغیر اپنوں کی سازش و بے غیرتی سے دشمن کے قیدی ہو گئے تب شوکت نے نہایت درد و کرب کی کیفیت میں ڈوبی ہوئی نظم لکھی:

”آج ڈھا کہ لہورنگ ہے“

دنیا بدل گئی مگر شوکت کی کیفیت قلبی میں کوئی تغیر نہیں آیا امت مسلمہ ان کے نزدیک جسد واحد ہے حدیث بھی یہی ہے کہ یہ جسد واحد ہے کہ ایک حصے پر زخم لگے تو دوسرے حصے کو تکلیف ہوتی ہے خیال کیجیے اس امت کے جسد واحد پر آج کتنے زخم لگے ہیں مسئلہ کشمیر، مسئلہ شام، مسئلہ افغانستان و عراق اور ان سب سے پرانا مسئلہ، مسئلہ یعنی فلسطین۔ جب زخم پرانا ہو جائے تو اس پر پڑیاں جم

شوکت عابد کی ملی شاعری.... ایک تجزیاتی مطالعہ

جاتی ہیں جسم کے بقیہ حصے بھی اسی زخم کو حقیقت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں لیکن جب اس پہڑی کو کھرچ دیا جائے تو زخم پھر سے ہرا ہو جاتا ہے رسنے لگتا ہے۔

مسئلہ فلسطین جسے آج امت مسلمہ نے ایک تلخ کھر در حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہے اسرائیل کا ظلم بھی حقیقت مظلوم فلسطینیوں کی مظلومیت بھی حقیقت مگر ہمارے دل درد مند کے مالک شوکت عابد اس حقیقت کو قبول کرنے سے انکاری ہیں وہ متنبہ کرتے ہیں:

جس آگ میں جلتے ہیں دردو بام فلسطین

کل اپنے گھروں تک نہ پہنچ جائے یہی آگ

اور یہ تنبیہ کتنی سچی ہے افسوس یہ آگ کابل میں، دمشق میں، قاہرہ میں، سری نگر میں غرض عالم اسلام کے ایک قابل لحاظ حصے کو یہ آگ جھلسائے دیتی ہے خود پاکستان دہشت گردی کے خلاف نام نہاد امریکی جنگ میں شرکت کے سبب آگ اور خون میں لہو لہان ہے سو اس بحران سے نکلنے کا واحد راستہ شوکت یہ تجویز کرتے ہیں:

آتی ہے فلسطین کی گلیوں سے صدا آج

اے مردِ جواں امتِ مسلم کے ذرا جاگ

مگر سوال یہ ہے ”امت مسلم کے جواں مردوں“ کے جاگنے کے معنی کیا ہیں؟ اخبارات بتاتے ہیں کہ فلسطین کے نہتے بچوں اور عورتوں پر جب اسرائیل بم برساتا اور راکٹوں کی بارش کرتا ہے تو امت مسلمہ میں غالباً سب سے شدید عمل پاکستان میں ہوتا ہے، جہاں جلسے جلوس نکلتے ہیں اسرائیلی پرچم نذر آتش کیے جاتے ہیں اور اس کے ظلم و ستم کی کھل کر مذمت ہوتی ہے لیکن ایسا برہا برس سے ہو رہا ہے ان جلسوں اور مذمتی قراردادوں سے نہ تو اسرائیل کے ظلم میں کمی آئی ہے اور نہ طوقِ مظلومیت فلسطینیوں کی گردن سے اترتا ہے۔ تو پھر کیا ہو؟ شوکت بتاتے ہیں کہ ”امت مسلمہ کے مرد جواں“ کے جاگنے کا اولین تقاضا تو یہی ہے کہ وہ فلسطین کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھیں اور اسے اپنے قلب کی گہرائی میں ڈوب کر محسوس کریں جیسا کہ شوکت کی نظم سے ظاہر ہے:

جو ارضِ فلسطین میں بہا ہے مراخوں ہے

دل میرا ہے وہ تنگ ستم سے جو کٹا ہے

ماتم کدہ جاں میں مرے جھانک کے دیکھو

اک مجلسِ غم ہے جو شب و روز بپا ہے

☆☆

دل جس کا پھٹا غم سے وہ اک باپ بھی میں ہوں
بارود سے جھلسا ہوا چہرہ بھی مرا ہے
وہ بھائی ہوں پوشاک ہے تر جس کی لہو میں
سنے سے لگے باپ کا لاشہ بھی مرا ہے

☆☆

سمار ہوا ہے جو مکاں میرا مکاں ہے
اجڑا ہے جو بے دردی سے میرا ہی چمن ہے
دل اپنا فلسطین سے جدا کر نہیں کر سکتا
یہ ارض فلسطین بھی میرا ہی وطن ہے

گویا امت مسلم کی بیداری کے معنی ”پورے وجود“ کو اپنا وجود سمجھنا اور اس کے دکھ کو اپنے دکھ کی طرح محسوس کرنا۔ شوکت بتاتے ہیں کہ جب امت مسلمہ کے جوانوں میں یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو دوسرے مرحلے میں اپنے دکھوں اور غموں کے تذراک کے لیے انھیں آنحضرت سے ایک رشتہ نمازہ ایک زندہ تعلق استوار کرنا ہوگا کیوں کہ بقول شوکت:

یہ سلسلہ جبر تھے گانہ کسی طور
ظالم کے تسلط سے رہائی نہ ملے گی
جب تک شہ امت سے جڑے گی نہ یہ امت
پستی سے مسلمان کو بلندی نہ ملے گی

☆

حقیقت بھی یہی ہے کہ:

ہو جائے قوی تر شہ بطحی سے جو نسبت
کھل جائے اگر دل میں در عشق محمد
چوں کہ شاعر کی شہ بطحی سے نسبت قوی ہے کہ وہ شاعر کے مانا بھی ہیں لہذا وہ امت مسلمہ کی طرف سے غم دیدہ و نادام درخواست گزار ہیں:

امید کرم لے کے میں غم دیدہ و نادام
دیکھی نہیں جاتی ہے زبوں حالی ملت
آیا ہوں بالآخر سر دربار مدینہ
رحمت کی نظر کیجیے سرکار مدینہ

مجھے قوی امید ہے کہ شوکت عابد کی یہ مناجات جو سرکارِ مدینہ کے دربار میں کی گئی ہے رائگاں نہیں جائے گی اور اسی نظرِ رحمت سے امتِ لاچار میں ایک بار پھر آثارِ بندگی پیدا ہوں گے اور اسی احساسِ بندگی سے وہ بیداری، حرارت اور تغیر جو امتِ مسلمہ کی تقدیر کو بدلنے کے لیے دوائے اکسیر ثابت ہوں گے! انشاء اللہ!

اے شاہِ امم اُمّتِ لاچار کی سن لیں
(غزہ میں اہلِ فلسطین پر اسرائیلی مظالم کے تناظر میں)

اے چشمِ فلک دیکھ ذرا سُوئے فلسطین
بارود کی بو پھیلی ہوئی ساری فضا میں
ہر سُو نظر آتا ہے یہاں حشر کا منظر
ہے ایک قیامت سی پیا آج غزہ میں
پھر دشمنِ حق، حق کو دبانے کے ہے درپے
پھر دامِ مصیبت میں مسلمان ہے گرفتار
پھر ارضِ فلسطین میں بہانے کے لیے خوں
اس عہد کے چنگیز و ہلاکو ہوئے تیار
پھر سینکڑوں ماؤں کی اجڑنے لگیں گودیں
برباد ہوا جاتا ہے آباد فلسطین
ہر کوچہ و بازار میں ہنگامِ اجل ہے
زندوں کی طرح لگتا ہے آزاد فلسطین
جس آگ میں جلتے ہیں دروہامِ فلسطین
کل اپنے گھروں تک نہ پہنچ جائے یہی آگ
آتی ہے فلسطین کی گلیوں سے صد آج
اے مردِ جواں امتِ مسلم کے ذرا جاگ
بس میں ہوا گر میرے میں اک حشر اٹھا دوں

فریاد و فغاں سے درود یوار ہلا دوں
 اے اہل فلسطین تمہیں نذر کروں کیا
 اک حرف تسلی کے سوا میں تمہیں کیا دوں
 افسوس کہ خود اپنی تقاصیر کے ہاتھوں
 محروم ہوا مسجد اقصیٰ سے مسلمان
 افسوس کہ باقی نہ رہی جرأت و ہمت
 رخصت دلِ مسلم سے ہوئی قوتِ ایمان
 باقی نہ رہا جذبہ ہمدردی و ایثار
 دل ہو گئے دنیا کی محبت میں گرفتار
 نیرنگی خوش حالیِ مغرب کے اثر سے
 مشرق بھی ہے افکارِ فرنگی کا پرستار
 غیرت سے حمیت سے ہے محروم مسلمان
 نے حریت فکر نہ ہے عظمت کردار
 محرومِ سماعت ہے فلسطین کی فریاد
 ہے بسترِ غفلت پہ پڑی امت بیمار
 صوفی بھی ہے رنگینیِ دنیا کے اثر سے
 عشاق ہوئے عشق کی گہرائی سے محروم
 قائم رہے کس طرح سے منبر کا تقدس
 عالم بھی ہوں جب دانش و دانائی سے محروم
 امیدِ کرم لے کے میں غم دیدہ و نادیدہ
 آیا ہوں بالآخر سرِ دربارِ مدینہ
 دیکھی نہیں جاتی ہے زبوں حالیِ مسلم
 رحمت کی نظر کیجیے سرکارِ مدینہ
 اکو بے عمل و غازی گفتار کی سن لیں

اک شاعر غم نام و گنہگار کی سن لیں
 سرکارِ مدینہ دل بیمار کی سن لیں
 اے شاہِ امم امت لاچار کی سن لیں
 جو ارضِ فلسطین میں بہا ہے مراخوں ہے
 دل میرا ہے وہ تیغِ ستم سے جو کٹا ہے
 ماتم کدہ جاں میں مرے جھانک کے دیکھو
 اک مجلسِ غم ہے جو شب و روز پیا ہے
 دل جس کا پھٹا غم سے وہ اک باپ ہوں میں بھی
 بازو دے ٹھلسا ہوا چہرہ بھی مرا ہے
 وہ بھائی ہوں پوشاک ہے تر جس کی لہو میں
 سینے سے لگے باپ کا لاشہ بھی مرا ہے
 سمار ہوا ہے جو مکاں، میرا مکاں ہے
 اجڑا ہے جو بے دردی سے میرا ہی چمن ہے
 دل اپنا فلسطین سے جدا کر نہیں سکتا
 یہ ارضِ فلسطین بھی میرا ہی وطن ہے
 انبار یہ لاشوں کا اٹھانا نہیں ممکن
 جو دیکھ رہا ہوں وہ بتانا نہیں ممکن
 دل چور ہے زخموں سے، زباں گنگ ہے میری
 میرے لیے یہ عید منانا نہیں ممکن
 پرواز کی طاقت ہے نہ منزل کی لگن ہے
 یہ حال رہا گر، تو نہ بدلیں گے یہ حالات
 دیتے ہیں گواہی یہی تاریخ کے صفحات
 ”ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات“
 منہ زور ہو، عیار ہو دشمن، تو مقابل

کردار کا اک حیدر کراڑ ہے درکار
 بکھری ہوئی امت کو بچانے کے لیے پھر
 شیخ احمد سرہندیؒ سا سالار ہے درکار
 مجبور ہوں اتنا کہ بجز نالہ و فریاد
 بار غم دل اپنا میں کم کر نہیں سکتا
 دل گیر ہوں اتنا کہ نہیں طاقت اظہار
 رودادِ فلسطین رقم کر نہیں سکتا
 یہ سلسلہ جبر تھمے گا نہ کسی طور
 ظالم کے تسلط سے رہائی نہ ملے گی
 جب تک وہ امت سے جڑے گی نہ یہ امت
 پستی سے مسلمان کو بلندی نہ ملے گی
 ہو جائے قوی تر شیعہ بطحا سے جو نسبت
 پاسکتے ہیں ہم آج بھی کھوئی ہوئی عظمت
 گھل جائے اگر دل میں در عشق محمد
 اس امت مسلم کی بدل سکتی ہے قسمت

۴۳۷

مطالعات نعت

آنکھ کا روزن بند کریں اور دل کا دریچہ باز کریں
یاد نبی میں آؤ ہم بھی نعتِ نبی آغاز کریں
(تحسین فراقی)

نعت رنگ ۲۵ — ایک تفصیلی جائزہ

(نعت رنگ کے سلور جوبلی شمارے پر خصوصی اظہار خیال)

ABSTRACT:

Naat Rang 25th edition has been reviewed in this article. All prose and poems presented there in have been commented. Some comments are detailed one and some short. Naat Rang gaining momentum of promoting genre of Naat in the fields of Creativity, Research and Criticism. All such reflections are available in the edition under review, besides poetic impression of praising efforts of Editor of Naat Rang by Dr. Riaz Majeed. Silver Jubilee edition of Naat Rang deserves high appreciative sentiments for possessing presentational beauty of content and form.

نعت رنگ کا شمارہ نعت کی تہذیب و تفہیم میں ایک اہم اور اپنی نوعیت کے منفرد جریدے میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ نعت کی ترویج اور تشکیل کے لیے جتنے مختلف زاویوں سے نعت رنگ کے ادباء اور ناقدین نے کام کیا ہے وہ اس موقر جریدے کی پہچان بن چکا ہے۔ ”نعت رنگ“ کے پچیسویں شمارے کو بلاشبہ اپنے لوازم اور متن کے حوالے سے وہی اہمیت حاصل ہے جو کسی بھی موقر ادبی و دینی جریدے کے سلور جوبلی نمبر کو حاصل ہونا چاہیے۔ ”نعت رنگ“ کے لیے عمومی سطح پر نعت رنگ ۲۵ کی اشاعت کے لیے خصوصاً ”نعت رنگ“ کے مدیر جناب سید صبیح رحمانی اور ان کے رفقاء مبارک مباد کے مستحق ہیں۔

نعت رنگ ۲۵ کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو رنگوں کی ایک ایسی کہکشاں بھی نظر آتی ہے جس میں روایت اور جدیدیت کے تمام حسین رنگ نظر آتے ہیں۔ فہرست کو دھنک کا خوبصورت نام دیا گیا ہے جس سے ”نعت رنگ“ میں رنگ کے خوبصورت لفظ کا حسن سمٹ کر آ گیا۔ مہمان مدیر سے نعت کے

حوالے سے ادارہ یہ لکھوانے کی روایت نعت رنگ کا خاصہ بن گئی ہے۔ نعت اور مذہبی ادبیات کے علاوہ دوسرے شعبہ ہائے ادب کے اہم ادباء، شعراء اور ناقدین سے نعت کی ادبی روایت کو دیکھنے کا عمل عمدہ بھی ہے اور روایتی تفہیم سے ہٹ کر تنقید و تحسین کے نئے درجہ بھی وا کرتا ہے جو بجائے خود ایک داد طلب عمل ہے۔ نعت رنگ ۲۵ کے مہمان مدیر معروف افسانہ نگار اور افسانے کے اہم نقاد جناب مبین مرزا ہیں۔ مبین مرزا برصغیر پاک و ہند کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں جن کے ہاں کہانی اپنے فطری تغیرات کے ساتھ پیش ہوتی ہے۔ زیر نظر ابتدائی ”نعت اور اردو کی شعری تہذیب“ اردو نعت کے تہذیبی سفر کی داستان ہے جس میں نعت رنگ کے کردار کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ میں ابتدائی پر گفتگو کروں کچھ باتیں ابہام کے حوالے سے ہونا ضروری ہیں کہ نعت رنگ ۲۵ کے اس ابتدائی کے حوالے سے جب مختلف ادباء و شعراء سے گفتگو ہوئی تو انہوں نے اس طرزِ تحریر کو کسی حد تک گنجلک، مبہم اور پیچیدہ پایا۔ میں یہ اُس عمومی رائے کا اظہار کر رہا ہوں جو مجھ تک مختلف صورتوں میں پہنچی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابہام کیا ہے؟ ابہام عمومی طور پر اُس تحریر میں سمجھا جاتا ہے جس کے متعلق قاری یہ سمجھے کہ ادیب کا احساس اُس تک اُس روانی سے نہیں پہنچا جس سے سمجھنے کے لیے قاری کو ایک ذہنی تحریک کا احساس ہو۔ میراجی سے کسی نے پوچھا کہ آپ کی نظمیں مبہم ہوتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ میراجی نے جواب دیا کہ میری نظمیں ہر قاری کے لیے نہیں ہیں اُن کے لیے ہیں جو انہیں سمجھنے کے لیے ذہنی مشقت پر تیار ہوں۔ اسے آپ ایک شاعر کا خود پر ظاہر کردہ اعتماد بھی کہہ سکتے ہیں لیکن یہ مبہم ہونے کی وضاحت نہیں ہے۔

مبین مرزا کے زیر نظر مضمون میں مجھے ابہام محسوس نہیں ہوا کہ اُسے سمجھنے کے لیے غیر معمولی ذہنی مشقت درکار نہیں۔ وہ مشقت جو مجھے کافکا، مارکیز، میراجی یا راشد کو پڑھتے ہوئے درکار ہوئی تھی۔ مبین مرزا مجھے قدرے آسان لگے اور اگر بارِ خاطر نہ ہو تو مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ وہ کسی قدر مصنوعی بھی لگے۔ انہوں نے یہ پیچیدگی بڑی محنت سے لمبے لمبے جملوں کے ذریعے سے حاصل کی۔ اُن کے چند لمبے جملے اگر یہاں درج کیے جائیں تو شاید یہ بات آپ حضرات تک پہنچے۔ خاطرِ نشان رہے کہ یہاں تہذیبی صلابت سے مراد سیاسی مقتدرہ کا استحکام نہیں ہے بلکہ وہ قوتِ اظہار ہے جو عامۃ الناس کی زندگی اور ثقافتی مظاہر میں روحِ مظاہر میں روحِ عصر کی صورت جلوہ نما رہی ہے اور جس کے ذریعے ہم برصغیر میں ایک نیا ادبی ڈسکورس قائم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں عام آدمی سے لے کر اہل نظر اور اہل فلسفہ ہی نہیں بلکہ قلندروں

اور خاص طور پر ملامتی فرقے اور ترک کی منزل کے صوفیہ تک کے یہاں ذات الہیہ کے سلسلے میں تو بے احتیاطی یا بے نیازی دیکھی گئی ہے یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیکھی جاسکتی ہیں لیکن کیا مجال جو آپ کو محض نام کا ایک مسلمان بھی حرمتِ رسول کے معاملے میں غافل یا بے لحاظ مل جائے۔

طویل جملوں کی کنسرکشن دراصل ایک آرٹ ہے۔ مارکیز کے ناول ”تہائی کے سوسال“ ”Hundred Years of Latitude“ میں اس فن کی معراج نظر آتی ہے۔ مبین مرزا کے ہاں مجموعی جملے کی ساخت میں کسی قدر بے ربطی کا احساس ہوتا ہے جو روایتی اذہان کے لیے تحریر کو قدرے مشکل بنا دیتا ہے۔ میں نے آغاز میں مرزا صاحب کے لیے ”مصنوعیت“ کا سخت لفظ استعمال کیا وہ دراصل اُن کے علمی مرتبے کو کم کرنے کی کوشش نہیں تھی بلکہ طویل جملے کی کنسرکشن کے دوران کو ما اور ختمہ کے استعمال کے بغیر تحریر بے ربطی کا احساس پیدا کرتی ہے اور یوں تحریر آسان فہم نہیں رہتی۔

مبین مرزا کی یہ تحریر (ابتدائیہ) اپنے متن کے لحاظ سے اس شمارے کی چند بہترین تحریروں میں سے ایک ہے۔ برصغیر کی شعری تہذیب و تمدن میں مذہب کی کارفرمائیوں کے اثرات کا جائزہ اس مقالے کی بنیاد ہے۔ مذہب (دین) اسلام اور اردو شاعری کے درمیان رشتہ پرانا لیکن کچھ کٹا پھٹا سا تھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ برصغیر کے تقریباً تمام بڑے غزل گو اتفاق سے مسلمان ہیں لیکن خود مذہب اسلام کے اثرات ان شعراء کے ہاں غزل کی سطح پر نظر نہیں آتے۔ بظاہر تو یہ بات درست ہی نظر آتی ہے کہ ولی سے لے کر حسرت تک غزل تمام بڑے شعراء کی شاعری مذہب کے اثرات سے بالاتر زندگی کے ایک ایسے رخ کی تصویر سازی کرتی ہے جہاں انسانی جذبات و تخیلات کسی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کرتے نظر نہیں آتے۔ ولی، میر، سودا، مصحفی، آتش، ناسخ، مومن، غالب اور داغ سبھی کے ہاں نعت اور حمد برائے برکت ہے۔ غالب جیسے قادر الکلام شاعر کے ہاں ایک فارسی نعت کو چھوڑ کر دین کے حوالے سے روایتی سطح پر کلام نہیں ملتا۔ دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ میں جذبات کی فراوانی تو موجود رہی لیکن اُسے محبوب کے سطحی تصور سے ہمیشہ آلودہ رکھا گیا۔ ایسے سطحی جذبات سے آلودہ تخیلات میں محبوب کا روایتی اور کسی حد تک عامیانه تصور ہی ابھر سکتا تھا تو ایسے میں نعت کیسے کہی جاتی۔ محبوب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہارِ عقیدت صرف فنی پختگی نہیں چاہتی، عقیدے اور عقیدت کے درمیان ایسا تال میل چاہتی ہے جو آقا کی شان کے مطابق ہو۔ میری دانست میں درست عقائد اور درست سمت میں رواں عقیدت کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ جہاں یہ رشتہ کمزور ہوا وہاں آپ کو عمدہ نعت اور بہتر مذہبی شاعری کے نمونے نظر نہیں آتے۔

عقائد اور عقیدت کے درمیان ایک عمدہ تال میل کی مثال اقبال کی شاعری ہے۔ اللہ پر غیر متزلزل ایمان اور آقا کی رحمۃ للعالمینی پر مضبوط یقین اس رشتے کی بنیاد ہے لیکن یہ بنیادی عناصر نصیب کتنوں کو ہوتے ہیں اور جن کے نصیب میں یہ ہوں وہ اس سے کہاں تک استفادہ کرتے ہیں۔ مبین مرزا کے ابتدائیہ میں انہوں نے عشق رسول کو ایک مسلمان کی زندگی کا سراسر نجی معاملہ قرار دیا ہے بادی النظر میں عشق رسول نجی کے ساتھ ساتھ اجتماعی فکر کی اساس بھی بن جاتا ہے۔ ۲۰۱۵ء میں رسالت مآب کی شان میں کچھ ملعونوں نے ہرزہ سرائی کی تو یہی عشق رسول جو حقیقت کے اندرون میں تخلیقی و تہذیبی توانائی کا منبع تھا یکا یک ہماری اجتماعی معاشرتی زندگی کے خدو خال متعین کرنے لگا۔ گویا عشق رسول وہ طاقتور ترین جذبہ ہے جو فرد کی تخلیقی توانائی سے لے کر معاشرے کے تہذیبی عناصر کو مرتب کرنے کا ایک اظہار یہ ہے۔ اب اگر غزل کو اردو شعری تہذیب کا منبع سمجھا جائے تو دو سطحوں پر اس کو سمجھنا ضروری ہوگا۔

اول: تصوف

دوم: مابعد الطبیعیاتی مسائل

ان دونوں صورتوں میں اردو غزل انسان اور خدا کے درمیان رشتے کو کائناتی سطح پر سمجھنے کی ایک صورت بن جاتی ہے۔ خدا، انسان اور کائنات کی تثلیث ہی ہماری مذہبی مدحیہ شاعری (اور کسی حد تک مذہبی نثر) کی بنیاد ہے لیکن اس ٹرائیکا کو سمجھتے ہوئے ہم صوفیانہ طرز احساس کو علاحدہ نہیں کر سکتے۔ وہی صوفیانہ طرز احساس جس نے ہماری غزل کو تو ایک نئے رنگ میں رنگا ہی تھا ہماری تہذیبی شناخت کو متعین کرنے کا باعث بھی بنا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اردو متصوفانہ غزل کی ڈومینشین، بنیادی طور پر مذہب کے ساتھ منسلک انہی خیالات کی آبیاری کر رہی تھی جس نے آگے چل کر (بیسویں صدی) میں اُس وقت اعلیٰ مذہبی مدحیہ شاعری کی بنیاد رکھی اور پھر غزل کا آہنگ نعت میں ڈھلنے لگا۔

ظرفِ بینائی کو دیدارِ شہِ لوح و قلم!!

وصفِ گویائی کو توفیقِ ثناء چاہیے ہے

(نصیر ترابی۔ مشمولہ نعت رنگ ۲۵، ص ۸۳۶)

غزل نے شعری تمدن کو جس صورت میں ترتیب دیا وہ طرز احساس نعت تک منتقل ہونے کے باعث بیسویں صدی کے آغاز سے ہی بڑی اور توانا مدحیہ شاعری سامنے آنے لگی۔ اقبال، ظفر علی خان، حفیظ جالندھری اور محسن کا کوروی تک غزل کا یہی خوبصورت آہنگ مدحیہ تخلیقات میں منتقل ہونے لگا۔ اگرچہ اس سفر کو کم از کم تین صدیاں لگیں لیکن میری رائے میں متصوفانہ اور مابعد الطبیعیاتی احساس کی غزل اپنے عروج

پر پہنچ کر نعت اور مذہبی مدحیات کے لیے جگہ خالی کر رہی ہے۔ جگہ خالی کرنے اور نعت کو مکمل جگہ بنانے میں اگرچہ ابھی لگ بھگ نصف صدی اور بھی چاہیے ہے لیکن اس عمل کا آغاز ہو چکا ہے۔

مبین مرزا کے اس نکتے سے میں مکمل طور پر متفق ہوں کہ برصغیر کی شعری روایت میں غیر مذہبی تخلیقات کی بھرمار ہونے کے باوجود تخلیق کی زیریں سطح پر مذہب کا رنگ غالب رہا۔ قصیدہ، مثنوی، غزل، شہر آشوب جیسی اصناف کسی نہ کی سطح پر نعت کے لیے راستہ ہموار کرتی رہیں لیکن یہ غیر محسوس اور لاشعوری عمل تھا جس کے اثرات آج ہم ۲۰۱۶ء میں نعت رنگ کی تحریک اور عشق رسول کے حوالے سے کثیر مقدار میں ہونے والی شاعری کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ مبین مرزا اس تہذیبی رویے کو شاعریا ادیب کے ہاں اُس کے بنیادی عقائد کی صورت میں تلاش کرتے ہیں لیکن میرا خیال اس سے ذرا سا مختلف ہے۔ مرزا صاحب غزل کے اُس طاقتور لحن کو نظر انداز کر گئے جو غزل کے روایتی محبوب کے پردے میں کسی بڑے طرز احساس کو جنم دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری رائے میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کی غزلیہ تخلیقات میں اللہ کے قائم کردہ نظام کو انسان اور عظمت انسان کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش ہی اردو ادب و شاعری میں نعتیہ اور حمدیہ تخلیقات کی پیشکش کے لیے نقطہ آغاز تھیں اور میری دوسری رائے ہے کہ غزل اپنے عروج کو چھو کر اب مذہبی ادبیات کے لیے غیر محسوس طریقے سے جگہ خالی کر رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں ہماری غزل کے بڑے نام تو اتر سے حمد و نعت پیش کر رہے ہیں۔ ان کا دفور شوق اور وارفتگی انہیں آقا کریم کے دربار میں پیش ہو کر حال دل بیان کرنے کا جذبہ اُن کی تخلیقات میں گہرائی و گیرائی تو پیدا کر رہی رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اردو کی شعری روایت میں نعت اور تنقید نعت کے لیے نئی نئی راہیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس پر نظم کے بڑے شعراء کے ہاں بھی نعتیہ نظموں کے لیے ایک احساس پیدا ہو رہا ہے۔

کسی بھی تخلیق کار کی تخلیقی اہلیت پر اُس کا معاشرہ اور ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔ برصغیر کا عمومی مزاج جذبات سے منسلک اور طاقت کی مرکزیت کا حامی رہا ہے۔ یہی مزاج مذہب سے بت کا شاہد بھی رہا ہے۔ اسلام اور اسلامی تہذیب کے عناصر برصغیر میں کم عمر سہی لیکن فکری سطح پر طاقتور رہے ہیں۔ اب ہندو شعراء کے ہاں نعت مبارک کا لکھا جانا دو سطحوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

☆ اسلام کا طاقتور تمدنی اور فکری نظام ☆ نبی اکرم کی شخصیت کی رحمۃ للعالمین کے اثرات

وجہ کچھ بھی ہو یہ بات طشت از بام ہے کہ اسلام کی طاقتور فکر اور تہذیبی اساس نے ایک بڑی فکر کو متاثر کیا۔ مختصراً مبین مرزا کا ابتدائیہ ایک کامیاب فکری کوشش ہے جس میں گزرے ادوار کا تاریخی

سطح پر نہایت عمدہ جائزہ لیا گیا ہے۔ مدیر نعت رنگ نے نعت اور تنقید و تحسین نعت کے سلسلے میں نعت رنگ کی کوششوں کا جائزہ لیا اور اس بات پر اطمینان کا اظہار بھی کیا کہ وہ کام درست سمت میں جاری ہے۔ انہوں نے فروغ نعت کے جن نئے آفاق کی جانب اپنی تحریر میں اشارہ کیا وہ نعت سے محبت رکھنے والوں کو نئے راستوں پر چلنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ عالمی اردو کانفرنس میں نعت کے سیشن کی شمولیت ہو یا انجمن ترقی اردو میں مذاکرہ نعت، حلقہ ارباب ذوق کراچی میں تنقید و تحسین نعت کے سلسلے ہوں یا ادبی رسائل کے نعت نمبرز کی اشاعت مجبان نعت کے لیے یہ نوید حوصلہ افزا اور اطمینان قلب کا باعث ہے کہ نعت پر کام اب ہر سطح پر جاری ہے۔ آخر میں انہوں نے اُن مجبان حمد و نعت کو یاد کیا جو دنیا سے جا چکے لیکن اپنے کام اور آقا کریم سے محبت کے باعث یاد رکھے جائیں گے۔

مرحوم ثناء خوان رسول کو نام بہ نام خراج تحسین پیش کرنا بھی ایک نہایت عمدہ روایت ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے نعت رنگ کے پچیسویں شمارے کی اشاعت پر ادارے کو مبارک باد پیش کی اور ایک دعائیہ قصیدہ رقم کیا۔ نعت رنگ کے لیے جس کے شعر، شعر سے محبت اور دعا پھوٹی ہوئی محسوس ہو رہی ہے نہایت عمدہ کلام ہے۔ میں نے کہیں پہلے بھی لکھا ہے کہ موضوعاتی شاعری عمومی شاعری سے اس لحاظ سے مختلف ہوتی ہے کہ اُس میں شاعر کے پاس موضوع سے باہر نکل کر اُسے ایک ناظر کے طور پر دیکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ شاعری لفظوں کے کم سے کم اور درست استعمال کا معاملہ ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے کہیں کہیں قصیدے کی روایت سے باہر بھی ایک دوستانہ فضا کو جنم دیا جو نعت رنگ کی ان سے محبت کی تو غماز ہے ہی دوستوں اور نعت رنگ کے ساتھیوں سے بھی اُن کے قرب کی نشاندہی کرتی ہے یوں اس دعائیہ قصیدہ میں خود نعت رنگ تو مرکزی کردار اختیار کرتا ہی ہے بہت سے دوست بھی کردار بن کر سامنے آتے ہیں۔ اُن کی اس محبت کا مرکزی نقطہ نعت اور نعت رنگ بن کر ابھرتے ہیں۔

خوشا وہ چند دن جو نعت کی فضاؤں میں جیئے

حرم کی سردی، ولا فزا ہواؤں میں جیئے

قصیدہ دعائیہ کا یہ شعر سرنامہ بن کر ابھرتا ہے۔

نہ ڈگ گئے لو کبھی چراغِ نعت رنگ کی

مدیر ہی نہیں اب آپ، امین بھی ہیں سوچے

اس خوبصورت تخلیق کے لیے ڈاکٹر ریاض مجید یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔ باب تجید کے عنوان

سے قائم باب میں حفیظ تائب کا ایک حمد یہ اور داغ دہلوی کا ایک نعتیہ شعر موجود ہے۔ دونوں اشعار خوبصورت ہیں خصوصاً داغ کا نعتیہ شعر لفظی و معنوی حسن میں اپنی مثال آپ ہے۔

باب تجمید میں تین دعائیہ نظمیں شامل ہیں۔ پہلی نظم ”مناجات“ کے عنوان سے احمد ندیم قاسمی کی ہے۔ احمد ندیم قاسمی ہمارے عہد کے نامور شعراء میں سے ایک تھے زیر نظر نظم کسی حد تک رواروی میں کہی گئی محسوس ہوتی ہے۔ کسی بھی حمد یہ نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ قاری کو اُس کے لفظوں کے دروبست میں اللہ کے جمال یا جلال کی شدت محسوس ہو۔ قاسمی صاحب کی زیر تبصرہ نظم میں ایسی کوئی کیفیت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر اس نظم کے آخر میں اُن کا نام نہ ہوتا تو شاید یہ اوسط درجے سے بھی کم کی ایک نظم شمار ہوتی۔ مدیر نعت رنگ سے گزارش ہے کہ فن پارے کے معیار پر نظر رکھی جائے۔ بڑے ناموں کی فہرست سازی بعض اوقات پورے پرچے کے ادبی معیار پر سوالیہ نشان لگا دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ احمد ندیم قاسمی کے ہاں بڑی یا عمدہ شاعری موجود نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ بڑے سے بڑا فن کار بھی ہر فن پارے میں اپنی عظمت قائم نہیں رکھ پاتا۔ ہمیں نعت رنگ میں احمد ندیم قاسمی کی اس سے بہتر تخلیق کی امید تھی۔ پیرزادہ قاسم کی نظم ”شورِ ازل“ ایک خوبصورت تخلیق ہے۔ زمانوں کو کردار کی حیثیت سے پیش کرتی ہوئی اس نظم کا حسن اُس کی تیز رفتاری میں چھپا ہوا ہے۔ تہذیبوں کی تصویر بناتی ہوئی اس تخلیق میں حسنِ ازل کی تلاش مرکزی نقطے کے طور پر سامنے آتی ہے سید شوکت کی نظم ”مناجات“ اوسط درجے کی نظم ہے جس میں انفرادی آہنگ میں رب کریم کے حضور دعا کی گئی ہے۔

مقالات کے حصے میں پہلا اور شاید اس شمارے کے بہترین مقالہ جات میں سے ایک ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحریر ”تحقیق نعت صورت حال اور تقاضے“ ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے اپنے خاص معروضی انداز میں تحقیق کی موجودہ صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر جامعات میں ہونے والی سندی تحقیق کو پیش آنے والے مسائل اور اس تحقیق سے حاصل ہونے والے فوائد پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل عموماً معروضی انداز اختیار کرتے ہوئے عمومی گفتگو کرتے ہیں لیکن زیر نظر مضمون میں وہ شاید پہلی بار خود کو معروضی نہیں رکھ پائے اور شخصیات کا ذکر کر گئے۔ فرماتے ہیں:

”..... ورنہ کراچی یونیورسٹی میں ۲۰۰۳ء میں تو ایک کام ایک زندہ

شاعر، کالم نویس، اور ایک ادبی ادارے کے ایک عالی مقام منصب دار پر،

جن کا ذکر معاصر ادب پر لکھی جانے والی کسی معیاری تاریخ ادب میں شاید کبھی نہ آ سکے گا لیکن ان پر ان کی زندگی ہی میں ان کی خواہش اور ان کے سماجی اثرات کے نتیجے میں پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ”ایک فاضل“ نگران نے صرف دو ماہ کے عرصے میں لکھوا دیا اور ایسے ناجائز طریقے بھی اختیار کیے کہ تمام ضوابط کو پس انداز کر کے سند بھی دلوادی.....“ (نعت رنگ ۲۵، ص ۸۲)

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ڈاکٹر صاحب کی تمام باتیں درست ہوں گی لیکن اب وہ شاعر اور کالم نگار بھی دنیا سے جا چکے ہیں اور ڈاکٹر موصوف بھی اپنے کیے کو بھگت رہے ہیں اب اس معاملے کو ختم کر دینا چاہیے سارا سوشل میڈیا سیلف پراجیکشن کا ایک بہت بڑا میلہ بن چکا ہے۔ تقریبات کرنا ہمارے شاعروں اور ادیبوں کا خاصہ ہے۔ ایسے میں جامعات کا کام بھی زندہ شخصیات کے زیر اثر کسی حد تک آلودہ ہوا ہے لیکن ایسا نہیں کہ تمام زندہ ادیب اور شاعر دباؤ ڈال کر اپنی شخصیت پر مقالہ لکھواتے ہیں ہم کتنی ہی ایسی شخصیات کو جانتے ہیں جو خود ایسی کسی کوشش سے انکار کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل میرے استادوں میں سے ہیں اور میں بصد عز و ادب ان سے درخواست کروں گا کہ ہمیں ان کے قلم سے ہمیشہ خالص علمی اور تحقیقی کام کی امید ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید اردو نعت میں تخلیق و تنقید و تحقیق کا ایک بڑا نام ہیں۔ روایتی تنقید کے حوالے سے ان کا کام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیر نظر مضمون ”برسبیل نعت — الفاظ و تراکیب“ کے بنیادی موضوع (Thesis) سے بصد عز و احترام اختلاف کر رہا ہوں کہ معاملہ نعت اور ادب کا ہے۔ ادبی سطح پر جب ہم کسی تخلیق کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس تخلیق پر اثر انداز عوامل کا اندازہ نہیں لگا سکتے کہ تخلیق ایک بہت پیچیدہ اور مشکل عمل ہے۔ تخلیق سادہ اور اکہرا عمل نہیں۔ یہ پرت در پرت ہے۔ تخلیق وہ نقطہ اتصال ہے جو اندر کی کائنات اور باہر کی دنیا کے درمیان ایک ایسا رشتہ قائم کرتا ہے جو فکری سطح پر تخلیق کار کو ایک نئی اور ان دیکھی دنیا میں لے جاتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ تخلیق کار کو نیا اور تبدیل شدہ کرنے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی تحریر سے ایک اقتباس اس عمل کو سمجھنا مزید آسان کر دے گا۔

”فن اپنی طرف لوٹنے کا وظیفہ ہے۔ اندر کے ان دیکھے جہان کو صورت پذیر

کرنے کی کاوش ہے۔“

کروشے نے کہا تھا:

”فن وجدان یا تاثرات کے اظہار کے سوا کچھ نہیں۔ وجدان اس وقت فن بنتا ہے جب روح اُس میں غرق رہتی ہے۔ اس عالم وجدان میں جھوٹ سچ کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ حسن کا احساس غالب ہوتا ہے۔“

اب ڈاکٹر وزیر آغا اور کروٹے کے لفظوں سے میں تو یہ سمجھ پایا ہوں کہ فن شعور اور لاشعور کے درمیان کی کسی کیفیت کا نام ہے۔ شعوری حیثیت میں موضوع کا احساس اور لاشعوری سطح پر اُس موضوع کے فن بننے کا عمل نہایت پیچیدہ ہے۔ فن کی یہی خاص کیفیت جب فن کار پر بار بار طاری ہوتی ہے تو وہ اسلوب کہلاتی ہے۔ اسلوب وہی تخلیقی سیال ہے جو فن کار کے جسم میں لہو کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہے۔ گویا فن مکمل طور پر شعوری عمل نہیں ہے۔ اگر فن مکمل طور پر شعور کے ساتھ عمل پذیر نہیں ہوتا تو پھر ایسے میں لفظوں اور تراکیب کا سوچا سمجھا استعمال کیسے ممکن ہے؟ ڈاکٹر صاحب (ریاض مجید) نے اپنے مضمون میں الفاظ و تراکیب کی بُنت اور اُس کے استعمال کی درجنوں فوری تراکیب بیان کی ہیں۔ مضمون پڑھ کر میں خاصا حیران بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب یقیناً فن، وجدان اور شعور و لاشعور کے درمیان تیرتے تخلیقی جہان کی رنگارنگی سے واقف ہیں تو پھر شعوری سطح پر خبر اور اطلاع کے سطح پر فن کو رکھ کر دیکھنے کی اس کوشش کا کیا مقصد؟ ادب کی تشکیل مکمل طور پر شعوری عمل نہیں ہے کہ یہ خواب اور بیداری کے درمیان کی صورت حال ہے خیال اپنے لفظ اور تراکیب بھی خود لاتا ہے۔

تراکیب کی بُنت، مصرعے کی موزونیت یا نثر پارے میں لفظوں کے دروبست میں تمام حصہ شعور کا نہیں ہوتا۔ اگر یہ مکمل طور پر شعوری عمل ہوتا تو شعر میں جذبہ، تاثر، کیفیت اور تناسب جیسے ماروائی تصورات کا ذکر ہی نہ ہوتا۔ وزیر آغا نے تو فن کو تخلیق کار کو اپنے سامنے آئینہ ہو جانے کا عمل بتایا ہے لیکن یہ آئینہ بدست ہونے کا عمل اکیلے فن کار کی کوشش نہیں ہے بلکہ بعض اوقات تخلیق میں موجود چاک (Gaps) کو قاری یا ناظر کی قوت متخیلہ پوری کرتی ہے لیکن یہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا بیان شاید یہاں مناسب نہیں ہے۔ اعلیٰ تخلیق صرف تخلیق کار کے لاشعور کے کچھ حصوں کو شعور تک لاتی ہے بلکہ قاری کے شعور کو بھی اُس کے لاشعور کے مقابل لاکھڑا کرتی ہے۔ (انشاء اللہ اس نقطے پر تفصیلی مضمون پیش کروں گا) ڈاکٹر ریاض مجید اپنے مضمون میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:

”نعت کے اظہار میں نادرہ کاری کو آمیز کرنے کے لیے ہمارے پاس لاحقوں سابقوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ بس ذرا توجہ کی ضرورت ہے۔ ہم دستیاب ذخیرے کو نہ صرف نعت رنگ کر سکتے ہیں بلکہ عقیدت

نگاری کی تمام صنفوں میں استعمال کر سکتے ہیں مثلاً آور کے ساتھ
زور آور، نعت آور، حمد آور، منقبت آور وغیرہ۔“ (مضمون بر سبیل نعت —
الفاظ و تراکیب مشمولہ نعت رنگ ۲۵، ص ۹۴)

(ڈاکٹر صاحب سے معذرت کے ساتھ) اگر الفاظ، تراکیب، لاحقے، سابقے اور مرکبات
شعری بُت میں ایسے ہی ٹانگے جاسکتے ہیں تو پھر شاعری کے لیے ایک عدد سابقوں لاحقوں کی کتاب
اور اردو لغات کی ضرورت ہوتی۔ فن کی تخلیق، تخلیق کار پر اترنے والا وہ خاص لمحہ ہوتا ہے جب تخلیق
کار لاشعوری سطح پر اپنے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے اور اُس کی ذات غیر ذات بن جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ
تخلیق کار وہ نہیں رہتا جو اُس لمحے سے پہلے تھا بلکہ خود تخلیق کا حصہ بن جاتا ہے۔ تخلیق اُس خاص لمحے
کی کہانی ہے جب شاعر یا ادیب کے سامنے صرف احساسِ حُسن بن کر رہ جاتا ہے۔ ایسے مرحلے پر
شاعر سچ اور جھوٹ سے بے نیاز ہو کر دائرہ حسن کا کچھ حصہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لمحے کی کہانی کو
غالب نے اپنے مصرعے میں بیان کیا تھا:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

معاملہ عمومی ادبیات و شاعری کا تھا لیکن مذہبی و مدحیہ ادبیات میں فن کار کے لاشعور پر کچھ تو
مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ مذہبی و مدحیہ ادبی تخلیق کے دوران تخلیق کار کی مذہبی انفرادیت تخلیق کار کو
اُس کی لاشعوری کیفیات میں سامنے آئینہ ہی نہیں کرتی بلکہ وہ مالکِ کائنات اللہ رب العزت کے
سامنے اپنی نم آنکھوں، مرتعش دل اور کانپتے جذبوں کے سامنے جا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ شعور و لاشعور کے
درمیان ڈولتی اس مختلف و منفرد کیفیت میں اپنے جینیاتی (Genetical) کوڈ ڈھیشیت میں اور معاشرتی
عوامل کے اثرات کے ساتھ یک بیک حاضر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں احترام اور منا جاتی احساس اُس
شخصیت کے پیچھے ایک بڑے فکری عنصر کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی بتائی ہوئی
تراکیب دراصل شعر گھڑنے یا انجینئرڈ شاعری (Engineered Poetry) کی تراکیب ہیں جس میں
ایک خبر یا اطلاع کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ جذبہ، تاثر یا کیفیت کا ایسی شاعری سے عموماً اعلیٰ سطح پر تعلق
پیدا نہیں ہو پاتا۔ ایسے اشعار ہمارے ارد گرد بڑی مقدار میں تخلیق ہوتے ہیں اور پھر جلد ہی معدوم ہو
جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کی نعت کا ایک شعر ہے:

پورے قد سے جو کھڑا ہوں تو یہ تیرا ہے کرم
مجھ کو جھکنے نہیں دیتا ہے سہارا تیرا

شعر سادہ اور ہر کیفیت ہے۔ پورے شعر میں کوئی ترکیب یا کسی اور طرح کی لفظی صنایع نہیں بلکہ عام آدمی کو یاد رہ جانے والے شعر کی خوبصورتی وہ تناسب ہے جو شعور اور لاشعوری کیفیات میں تناسب سے جنم لیتا ہے۔ اسلوب لفظوں کے انجینئر ڈ استعمال سے تشکیل نہیں پاتا۔ روایتی شاعری اور طرحی مشاعروں نے ہمارے شاعروں، ناقدین اور قارئین و سامعین کے ذہنوں میں آفاقی شاعری کا کوئی تصور ابھرنے نہیں دیا۔ گہرا مطالعہ اور خیال کے ساتھ دیر تک سفر میں رہنے سے عمدہ، اعلیٰ اور آفاقی شاعری کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے لیکن یہ بہت محنت طلب کام ہے کہ ایک ہی خیال کو آپ زاویہ بدل بدل کر مختلف شکلوں میں تلاش کریں۔ اس سے کہیں آسان کام یہ ہے کہ روایتی مضمون کی شعری گھڑائی کے بعد اُس میں پہلے سے تیار شدہ تراکیب، مرکبات یا لاحقوں سابقوں کو چسپاں کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد ہمارے روایتی نعت گو شعراء کا غد قلم لے کر تیار ہو چکے ہوں بلکہ یہ تمام لاحقے، سابقے، مرکبات و تراکیب تو اب تک استعمال بھی ہو چکے ہوں گے ڈاکٹر صاحب کو اپنے مریضوں کے لیے کسی نئے نسخے کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ فن پارے کی تخلیق کے دوران اثر انداز عوامل کی مکمل فہرست نہیں بنائی جاسکتی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ تخلیقی عمل کو ایسے آسانی سے سمجھا جاسکے۔

فن پارے کی تخلیق کے دوران اثر انداز عوامل کی فہرست سازی کی جائے تو ایک نامکمل اور ادھوری تصویر حاصل ہوگی۔

☆ فن کار کی شخصیت پر اثر انداز معاشرتی عوامل

☆ فن کار کی انسانیت میں چھپی گرہیں

☆ موضوع

☆ فن کار کے نظریات، رجحانات اور میلانات

☆ فن کار کی خواہشات

☆ فن کار کے آدرش اور خواب

☆ سماج کی معاشی حالت

یہ فہرست ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ یہ مکمل ہو بھی نہیں سکتی کہ خود فن ایک پیچیدہ عمل ہے جسے ابھی مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکا۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے مضمون میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں:

”نعت میں مادہ کاری کے حصول کے لیے یہ بات ذہن میں رہے کہ صرف

تراکیب سازی کی جمع آوری اور اُن کے استعمال محض سے بات نہیں بنتی
پورے مصرع اور شعر کے ماحول میں اس ترکیب کا ہم آہنگ ہونا ضروری
ہے۔ لفظی طور پر نہیں معنوی طور پر۔“ (ایضاً، ص ۹۷)

بالکل درست۔ ترکیب سازی کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ ترکیب اپنی بُنت میں شعر
کے ماحول سے ہم آہنگ ہو جائے۔ مصنوعی یا علاحدہ محسوس نہ ہو۔ یہیں سے اشعار عمدہ سے اعلیٰ
اور پھر اعلیٰ سے آفاقی کی جانب سفر کرتے ہیں۔ ترکیب سازی اور سابقوں لاحقوں کی مدد سے لفظوں
کی تشکیل کا عمل کسی حد تک میکانیکی (Mechanical) محسوس ہوتا ہے جو فن اور تخلیق کے عمل کو کسی حد
تک سادہ تو کرتا ہے جو عام آدمی کے لیے قابل قبول ہو لیکن اس عمل میں گہرائی پیدا نہیں ہوتی یوں شعر
ایک خبر یا اطلاع کا درجہ اختیار کر لیتا ہے۔ بنیادی طور پر میرا اختلاف لفظوں اور تراکیب کی اس طرح
تیاری سے نہیں بلکہ ان کے میکانیکی استعمال سے ہے۔ اسلام آباد میں مقیم نعت کے ایک شاعر نے اپنے
پاس کمپیوٹر کی مدد سے قافیوں کی ایک فہرست تیار کی ہے۔ مبتدی حضرات یقیناً اس فہرست سے فائدہ
اٹھا سکتے ہیں لیکن یہ بھی تو ضروری ہے کہ ہم اپنے نوآموز شعراء وادباء کو فن اور تخلیق کی حقیقی مشکل سے
روشناس کروائیں۔ اس سے ہو سکتا ہے کہ شعراء کی تعداد کم ہو جائے لیکن معیار کا بہتر ہونا ضروری ہے۔
ڈاکٹر عزیز احسن اس بار بھی ہمیشہ کی طرح نعت اور نعتیہ ادب میں تخلیق، تنقید اور تحقیق کے ضمن
میں محتاط رویوں اور لفظوں کا صحیح اور محتاط استعمال کے حوالے سے ایک عمدہ تحریر لے کر آئے ہیں۔ لفظوں
کے صحیح استعمال میں تلفظ، معنی، عروض، صنائع بدائع، ہیئت اور جمالیات کو انہوں نے موضوع سخن بنایا
ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے اسی مضمون میں شترگر بہ (بیان کا عیب) سمجھانے کی غرض سے دو اشعار
مثال میں پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے درخواست ہے کہ عیب بتاتے ہوئے بھی اس معیار کے
اشعار پیش نہ فرمایا کریں۔ مضمون کے آخر میں نعت کیا ہے؟ کے عنوان سے انہوں نے ۲۸ مختلف
موضوعاتی البعاد کی طرف اشارہ کیا ہے جو نعت یا متعلقات نعت ہو سکتے ہیں۔ یہ فہرست بہت عمدہ ہے
اور ڈاکٹر عزیز احسن درست طور پر ہمارے نعت نگاران اور ناقدین کی رہنمائی فرما رہے ہیں۔ ڈاکٹر
عزیز احسن کے مختلف مضامین کے مطالعے سے مجھ تک جو احساس پہنچا وہ یہ ہے کہ عزیز احسن عقیدت
اور عقیدہ کے درمیان توازن اور درست سمت میں سفر پر زور دیتے ہیں۔ اُن کی رہنمائی ہمارے نئے
نعت گو حضرات کے لیے بہت اہم ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوب خالص تحقیقی ہے۔ تنقید کا لہجہ نسبتاً نرم
اور کسی حد تک دلچسپ ہونا چاہیے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی تحریریں نرم، شیریں اور رواں

اسلوب کی حامل ہیں جبکہ ڈاکٹر عزیز احسن کے ہاں روانی اور سلاست تو ہے لیکن کسی قدر سختی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ مقالہ بھی اس شمارے کے ایک دو بہترین مقالات میں سے ایک ہے میں ڈاکٹر عزیز احسن کو اتنی اہم اور عمدہ تحریر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد میرا (کاشف عرفان) کا ایک مقالہ ”اردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات“ موجود ہے۔ آپ حضرات کی توجہ کا منتظر ہوں۔

پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد انور کا تحقیقی مضمون بلاشبہ تحقیق کے نئے دروا کرتا ہے آپ نے ”طلع البدر علینا“ کے اشعار کا محل وقوع اور معنی بیان کیے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف روایات میں لفظوں کے فرق کو بھی پیش کیا ہے۔ اس خوبصورت نعتیہ نظم کو کس موقع پر پڑھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو مختلف آراء ہی پیش نہیں کی بلکہ دونوں طرف کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے قارئین کو خود فیصلہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ بہر حال یہ ایک خوبصورت تحقیقی مضمون ہے جس میں تحقیق کے تمام اصول و ضوابط کا خیال رکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور ڈاکٹر اصغر علی بلوچ (فیصل آباد) کی مشترکہ تحقیق ”مذہب عالم کا فلسفہ اخلاق اور اردو نعت نگار“ نہایت عمدہ کاوش ہے۔ یہ مقالہ بھی تحقیقی ہے اس میں تنقید کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقالے کا لب و لہجہ خالص علمی اور سنجیدہ ہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر قریشی کا مضمون ”ملی شاعری میں نعتیہ عناصر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے تناظر میں“ ایک بے مثال تحقیقی و تنقیدی مضمون ہے جس میں جنگ ۱۹۶۵ء کے دوران لکھے جانے والے لہو کو گرما دینے والے نغموں میں مناجاتی عناصر کی تلاش کی گئی ہے۔ تنقید کا حصہ بھی خاصا عمدہ ہے۔ آج ستمبر ۲۰۱۶ء میں پھر سے جنگ کی باتیں ہو رہی ہیں ایسے میں اس مضمون کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

غلو اور شرک کے سد باب کے لیے لکھا گیا ڈاکٹر اشفاق انجم کا مضمون ”نعت میں منفی عناصر“ ڈاکٹر عزیز احسن کے مضمون کی توسیع (Extension) معلوم ہوتا ہے۔ مدیر نعت رنگ ایک ہی طرح کے مقالہ جات کو اگر علیحدہ علیحدہ شماروں میں لگا دیتے تو مناسب ہوتا۔ بہر حال یہ بھی اپنی جگہ ایک عمدہ کاوش ہے۔ گوہر ملسیانی کا مضمون ”نعت اور رسول اکرمؐ کے تقاضے“ نعت کو درست طور پر سمجھنے اور قرآن و حدیث کے عین مطابق اپنے اشعار ڈھالنے کا سبق دیتا ہے۔ گوہر ملسیانی لکھتے ہیں:

”(ایسی احادیث) جن کی سندات مشکوک ہیں۔ ان کو روایت اور درایت

کے حوالے سے دیکھ لینا چاہیے اور قرآن کی تصریحات کے خلاف پا کر انہیں

یا ان کی صفات کو نعت کہتے ہوئے اسلوب و بیان کی زینت نہیں

بنانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ نعت رحمت و محبت کے بجائے زحمت و خسارہ بن جائے۔“ (نعت رنگ ۲۵، ص ۳۰۵)

گوہر ملیانی سینئر نعت گو شاعر اور نقاد ہیں۔ ایسے مضامین کی ضرورت ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ اس لیے بھی ہے کہ سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم پر ہر شخص جیسا کہہ رہا ہے ویسا ہی پیش کر رہا ہے۔ اس آزادی نے لوگوں میں احتیاط کا شعور ہی ختم کر دیا ہے یوں فکر اور فن پر قدغن نہ ہونے کے باعث اب شعراء اُس احتیاط کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں جو نعت اور حمد کہتے ہوئے ایک حمد و نعت گو شاعر کے سامنے ہونی چاہیے۔ ایسے میں گوہر صاحب جیسے استاد ہی ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں اور انہوں نے اس مضمون میں رہنمائی کا حق ادا کیا۔

مولانا احمد رضا خان کے نعتیہ دیوان ”حدائق بخشش“ کے متن میں مختلف اغلاط کی وضاحت کرتا ہوا ڈاکٹر صابر سنبھلی کا مضمون ”حدائق بخشش اور کلیات حسن کے متن کا المیہ“ عمدہ کاوش ہے جس میں تحقیق کی سطح بہت بلند اور عمدہ ہے۔ فاروق ارگلی نے ہندوستان سے اردو کے سکھ نعت گو شعراء کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ فاروق صاحب کی نثر خوبصورت اور اسلوب نہایت جاندار ہے۔

کھاریاں ٹی سے پروفیسر ڈاکٹر اشفاق جلالی نے علامہ نور بخش توکلی کی قصیدہ بردہ شریف کی شرح ”العمدۃ“ کو موضوعِ سخن بنایا ہے جس سے قصیدہ بردہ شریف کے حوالے سے کچھ نئی معلومات حاصل ہوئی۔ کراچی سے ڈاکٹر شہزاد احمد ”نعتیہ کلیات کی روایت — ایک مطالعاتی جائزہ“ لے کر تشریف لائے خالص تحقیقی مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ معلومات کا ایک بڑا خزانہ آپ کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اُس پر مستزاد یہ کہ ڈاکٹر شہزاد احمد جیسا ادبی اسلوب بھی میسر آجائے تو ہم کیوں نہ اپنی قسمت پر رشک کریں۔ بہت عمدہ معلوماتی مقالہ جس میں ایسے شعراء کی فہرست سازی کی گئی ہے جن کی نعتیہ کلیات شائع ہو چکی ہیں۔

منظر عارفی کا مضمون ”اردو نعتیہ اشعار میں چٹائی، غارِ حرا اور جو“ کے تذکروں کا بیان کرنا ہے۔ مضمون کا عنوان نعتیہ اشعار کے حوالے سے ہے تاہم پورے مضمون میں ایک شعر غارِ حرا کی مناسبت سے شامل ہے۔ غالباً منظر عارفی صاحب کو اس مضمون کے عنوان کو اس کے متن سے ملانہ سکے اگرچہ یہ مضمون نبی اکرمؐ کی غذا اور آپؐ کی سادہ زندگی کے حوالے سے بہت علمی کاوش ہے تاہم اردو شاعری کے حوالے سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ مکتوب نگاری کے حوالے سے ایک طویل مقالہ ڈاکٹر داؤد عثمانی کا ”نعت نامے اور نقد نعت“ ہے۔ انہوں نے خطوط میں شامل عمدہ آراء کو پیش کیا

اور خطوط کے ذریعے ”نعت رنگ“ میں ہونے والے مختلف عوامل کے حوالے سے معلومات فراہم کیں۔ خورشید ربانی نے سرائیکی شاعری میں نعت کے پھولوں کو چنا جن کی بھینی بھینی خوشبو ہم اب بھی اپنے گرد محسوس کر رہے ہیں۔ ساجد نظامی نے ایک قدیم نعتیہ مجموعہ ”گلدستہ معرفت“ کا تعارف پیش کیا۔ مقالات نعت کے آخری حصے میں قمر وارثی نے حمد و نعت کی ترویج میں دبستان وارثیہ کے کردار کا جائزہ لیا۔ سچ یہ ہے کہ فروغ حمد و نعت میں خود قمر وارثی اور دبستان وارثیہ کا کردار بہت نمایاں ہے۔ اللہ قمر وارثی کو عمر خضر عطا فرمائے اور ان کے کام میں برکت عطا فرمائے۔

حریم عقیدت کے عنوان سے مختلف شعراء کے کلام پر ناقدین نعت نے نظر ڈالی ہے تقریباً تمام شعراء کا کلام عمدہ اور دل کو چھونے لینے والا ہے۔ جن شعراء کے گوشے ترتیب دیے گئے ہیں ان میں انور شعور، جلیل عالی اور سید ضیاء الدین نعیم شامل ہیں۔ سید ضیاء الدین نعیم کے دو خوبصورت نعتیہ اشعار دیکھیں:

شعور و فہم کے پیغام بر خدا کے رسول
وفا تمام یقین سر بسر خدا کے رسول

اللہ اور نہیں ہے کوئی مگر اللہ

یہ درس دیتے رہے عمر بھر خدا کے رسول

فکرو فن کے عنوان سے قائم باب میں خالص تحقیقی اور علمی مباحث چھیڑے گئے۔ ان شخصیات میں جن کے حوالے سے گفتگو ہوئی۔ علامہ یوسف بن اسماعیل النہانی، اقبال، محسن کا کوروی، مرزا دبیر، سید انشاء، مولانا ظفر علی خان، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر محمود احمد غازی اور سرشار صدیقی کی مختلف تخلیقات کے حوالے سے اساتذہ فن کی گفتگو نے ذہن و دل کو معطر کیا۔ پروفیسر انور احمد زئی کی تحریر پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر اور ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی کا مقالہ ”المدح النبوی“ — ایک مطالعہ“ عمدہ تحریریں ہیں۔ حاصل مطالعہ کے عنوان سے قائم باب میں کتب نعت کا تعارف اور تبصرہ ڈاکٹر عزیز احسن کے قلم سے ہے اور سچ پوچھیے تو اس حصے کا ذائقہ ہی علاحدہ ہے۔ ”ایوان مدحت“ میں مختلف شعراء کرام کی خوبصورت حمد یہ اور نعتیہ تخلیقات نے مزہ دیا۔ آخر میں نعت رنگ کی ترویج و ترقی اور بہتری کے لیے قارئین کے خطوط نے شمارے کے وقار میں اضافہ کیا۔ خطوط میں احمد صغیر صدیقی، ڈاکٹر عبدالکریم اور فراست رضوی کے خطوط ہمیں شمارے سے مکمل آگاہی دیتے ہیں۔ آخر میں عطیہ کتب کی فہرست موجود ہے۔ ۹۵۰ صفحات کی ضخامت لیے ہوئے پچیسویں نعت رنگ نے ہم

تشنگان نعت و تحسین نعت پر تشنگی کو کم کیا ہے جس کے لیے نعت رنگ کی مکمل ٹیم خصوصاً سید صبیح الدین رحمانی اور ڈاکٹر عزیز احسن کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ آخر میں ایک تجویز کہ نعت رنگ میں مستقل عنوان کے تحت نعت کے حوالے سے کسی نہ کسی اہم شخصیت سے انٹرویو کیا جائے تاہم یہ انٹرویو روایتی سوالات سے ذرا ہٹ کر ہوں۔ اس کے لیے میں نے کچھ سوالات پر مشتمل خاکہ تیار کیا ہے جسے

ان شاء اللہ آئندہ پیش کروں گا۔



نعت اور جدید تنقیدی رجحانات..... ایک تجزیاتی مطالعہ

ABSTRACT:

Kashif Irfan's book "Naat Aur Jadeed Tanqidi Rujhanaat" has been reviewed in this article. The poetry of genre of Naat has first time been discussed in light of Modernism, Post-Modernism and Structuralism. Anthropological aspects have also been hinted for understanding the undercurrent of Islamic ideology and love of Prophet Muhammad (S.A.W) in Muslim Society. Kashif has tried to apply the Critical theories of Modernism, Post Modernism and Structuralism to elaborate poetic attempts of Naatia Poets in praise of Holy Prophet Muhammad (S.A.W). Taking the modernity in consideration, the book is aptly received as blossom of Spring of Criticism in the literature of genre of Naat.

اردو شاعری کے ارتقا کے ساتھ ہی نعتیہ شاعری بھی اپنے بھرپور نقوش قائم کرنے لگی تھی لیکن بالوجہ اس کی ادبی قدر افزائی (EVALUATION) کی طرف، ایک طویل عرصے تک، ناقدین متوجہ نہیں ہو سکے۔ تکلف برطرف، یہ کام ”نعت رنگ“ کے اجرا (اپریل ۱۹۹۵ء) سے قبل، خواب و خیال ہی تھا۔ اب جبکہ نعت رنگ کے اجرا کو بیس برس پوری ہو چکے ہیں اور اس کتابی سلسلے کا پچیسواں شمارہ اکیسویں برس میں شائع ہو چکا ہے۔ نعت کی تنقیدی جہتیں مختلف مضامین، مقالات اور کتب کے ذریعے سامنے آنے لگی ہیں۔ کاشف عرفان نے نعتیہ شعری سرمائے کو جدید اور مابعد جدید تنقیدی رجحانات کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے اور نعت ریسرچ سینٹر کو ان کی کتاب ”نعت اور جدید تنقیدی رجحانات“ شائع کرنے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ کاشف کی یہ کتاب ان کے جدید ادب اور جدید تنقیدی رجحانات کے سنجیدہ مطالعے کی روشن مثال ہے۔ جس کو انھوں نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے:

i۔ اُردو نعت اور روایت کا ارتقاء

ii۔ اُردو نعت اور جدیدیت (Modernism)

iii۔ اُردو نعت پر مابعد جدیدیت (Post Modernism) کے اثرات

iv۔ اُردو نعت اور وقت کی ماورائی جہات

v۔ اُردو نعت پر ساختیات (Structuralism)

vi۔ حمد و نعت اور فرد کا نفسیاتی نظام

ان عنوانات سے موضوع کی گمبیرتا کا اندازا کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کاشف سے قبل ان موضوعات کو تفصیل سے نعت کے کسی نقاد نے نہیں چھیڑا تھا۔ جزوی طور پر میں نے کچھ موضوعات کو Touch کیا تھا۔ جیسے میرے مضمون ”ایک حمد کا تجزیاتی مطالعہ“ (مشمولہ نعت رنگ ۷) اور ”نعتیہ شاعری میں متنی رشتوں کی تلاش“ (مشمولہ نعت رنگ ۲۲)۔ لیکن وہ مضامین جدید تنقیدی رجحانات کی تفہیم کے حوالے سے کسی معلوماتی لوازم اور جدید تنقیدی رجحانات کے اطلاقات کے مفصل بیان پر مبنی نہیں تھے۔ دراصل مجھے نعت کے قارئین کی سادہ مزاجی اور تنقید بیزاری کا علم بھی تھا جس نے کچھ ادق موضوعات کو چھڑنے کی ہمت پیدا نہیں ہونے دی۔ کاشف جواں سال ہیں اس لیے انھوں نے یہ بیڑا اٹھالیا اور الحمد للہ! آج میں اس قابل ہو سکا ہوں کہ ان کی کتاب پر اپنی رائے دے سکوں۔

اس تبصرے میں میری کوشش یہ ہوگی کہ کاشف عرفان کے زیر غور آنے والے نکات کا خلاصہ بھی پیش کر دوں اور جہاں مناسب معلوم ہو اپنی رائے بھی درج کر دوں۔ کتاب کا پہلا باب ”اُردو نعت اور روایت کا ارتقاء“ ہے۔ اس باب میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

مصنف کے نزدیک، روایت ہمہ سمتی (MultiDimensional) عمل ہے جو ادب، تہذیب، تاریخ اور ثقافت سے منسلک ہے۔ اس کا تعلق ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے ہے۔ اس کی ایک چوتھی سمت (Fourth Dimension) ”ماورائی یا مابعد الطبیعیاتی“ سمت بھی ہے جو اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کاشف کے بقول ماورائی یا مابعد الطبیعیاتی حقائق خود روایت کو زمان و مکان (Time & space) ایک نئی جہت عطا کرتے ہیں۔

پھر وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ ادبی روایت کا تعلق زبان سے ہے اور یہ ایسا ثقافتی ورثہ ہوتی ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا ہے۔ یہ ماضی حال اور مستقبل کو ان کی مشترک اور مختلف ہر

نعت اور جدید تنقیدی رجحانات..... ایک تجزیاتی مطالعہ

دو خصوصیات کے باعث ایک دوسرے سے جوڑتی ہے۔ اس کے بعد وہ ایک نقش یعنی گرافیکل شکل بنا کر بتاتے ہیں کہ ”روایت موجود سے ناموجود کی جانب سفر ہے اور یہ سفر یک سمتی نہیں ہوتا۔“ گرافیکل شکل میں انھوں نے ”روایت..... ماضی..... حال..... مستقبل..... ماورائیت“ کو دکھایا ہے۔

روایت کے ارتقائی عمل پر اثر انداز عوامل کی فہرست بھی وہ یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ نہ تو یہ مکمل ہے اور نہ ہی مکمل ہو سکتی ہے کیوں کہ روایت کا ارتقائی عمل پیچیدہ اور وسیع ہے:

i۔ تاریخی تناظر ii۔ مذہبی اثرات iii۔ لسانی دائرہ

iv۔ معنی کی مختلف جہات v۔ سائنس اور منطق کا ارتقائی عمل

vi۔ اجتماعی ادبی تغیرات vii۔ انفرادی صلاحیت viii۔ تقابلی منطق

ix۔ مابعد الطبیعیاتی عوامل (موجود سے ماوراء کو سمجھنے کا عمل) x۔ تصور کائنات

ناقدین کے لیے ان کا مشورہ ہے:

”ادب پارے کے ادب پارے سے تقابل میں لفظ و معنی اور انفرادی فکری و فنی سطح کے ساتھ ساتھ آفاقی فن پاروں کا وہ معیار جو روایت قائم کرتی ہے نقاد کی نظر میں رہنا ضروری ہے۔“

مغربی منہاج تنقید کے حوالے سے وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ:

”مغربی تنقید روایت کے ارتقائی عمل کو سمجھنے اور آگے بڑھانے کے لیے ”اسلوبیات“ کی اصطلاح استعمال کر رہی ہے..... اور یہ کہ اسلوبیات بنیادی طور پر کسی فن کار کے انداز تحریر کو دوسرے فن پاروں سے الگ کر کے سائنسی طور پر سمجھنے کا عمل ہے۔“

اسلوبیاتی تجزیہ مذہبان کی کسی بھی سطح کو لے کر کیا جاسکتا ہے۔ لسانیات میں زبان کی چار سطحیں ہوتی ہیں:

i۔ صوتیات (Phonology) ii۔ لفظیات (Morphology)

iii۔ نحویات (Syntax) iv۔ معنیات (Semantics)

کوئی بھی زبان ان چاروں عناصر سے مل کر متشکل ہوتی ہے خالص لسانیاتی تجزیوں میں کسی بھی سطح کو الگ سے بھی لیا جاسکتا ہے لیکن ادبی اظہار کے تجزیے میں ہر سطح کے تصور میں زبان کا کُلھی تصور شامل رہتا ہے۔

اسلوبیاتی تجزیہ میں ان لسانی امتیازات کو نشان زد کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے کسی فن پارے، مصنف، شاعر، ہیئت، صنف یا عہد کی شناخت ممکن ہو۔ کاشف عرفان نے شاعری میں آفاقیت کے آٹھ عناصر کی نشاندہی کی ہے:

i- ماورائیت ii- زمان و مکان کی قید سے آزادی iii- وقت کے کسی نئے منطقے کی تلاش

iv- انسانی زندگی سے اخذ کردہ موضوعات v- شعریت اور فنی گرفت

vi- فکری پختگی vii- تہذیبی اثرات

viii- تائید غیبی

پھر وہ بتاتے ہیں کہ ان تمام اجزاء کے ہوتے ہوئے بھی شعر عظیم یا آفاقی نہیں ہو پاتا۔ اس لیے اجزاء کا تناسب اور تائید غیبی کو بھی شعر کی آفاقی حیثیت کے عناصر میں شامل کرتے ہیں۔ وہ نعتیہ تخلیقات میں آفاقی عناصر کی تلاش اور فن پارے کو سامنے رکھ کر مصنف کا مطالعہ کرنے ہی کو تنقید کا جوہر بتاتے ہیں۔ انھوں نے نعت کی تنقید کے لیے کچھ اصول بھی بنانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

☆ نعت ایک ادبی صنف ہے جس کا تعلق مذہبی ادبیات سے ہے۔

☆ ادبی صنف ہونے کی حیثیت سے یہ ادبی تنقید سے ماوراء نہیں ہے۔

☆ نعت تخلیق کار کی فکر اور فن کے لحاظ سے آفاقی، عظیم، عمدہ، درست اور نادرست ہو سکتی ہے۔ ہر نعت کا معیار ایک نہیں ہو سکتا۔

☆ نعت پر تنقید کرنے والوں کی نظر میں (خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال کیے گئے الفاظ کو پرکھتے ہوئے) عزت و احترام کا معیار ہونا چاہیے۔

کاشف عرفان نے اردو نعت اور جدیدیت کو نکات کی صورت میں سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے اور کچھ نکات پیش بھی کیے ہیں، مثلاً:

☆ اجتماعی شعور اور لاشعور کا مطالعہ ☆ شناخت بحیثیت اکائی ☆ معنی کی مرکزیت

☆ زمین سے فرد کا تعلق ☆ اساطیری رنگ سے کائنات اور فرد کے درمیان تعلق کا مطالعہ

☆ لفظ و معنی کے درمیان نئے رشتوں کی تلاش ☆ ساخت اور ردِ ساخت کے مسائل

☆ لکھاری اور لکھت (فن کار اور فن پارہ) کے درمیان نئے معنوی رشتوں کی تلاش

پھر وہ بتاتے ہیں کہ:

”جدیدیت بنیادی طور پر جدید حسیّت سے عبارت ہے تاہم یہ اپنے

موضوعات کو ادب سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش ہے۔“

وہ کہتے ہیں کہ جدیدیت تمام علوم کے ساتھ منسلک ہے کہ فرد اور سماج کے درمیان معلوم سے آگے جا کر کچھ نیا سمجھنے کی ضرورت ہے۔..... جدیدیت انسانی ذہن کی وہ چھلانگ ہے جو مکمل ہو جائے تو انسان اپنا ادراک حاصل کر لیتا ہے۔ گویا کہا جاسکتا ہے کہ خود کو ڈھونڈنا جدیدیت کا مرکزی نکتہ ہے۔ بڑی شاعری کے لیے انھوں نے..... مرکب اور کسی حد تک پیچیدہ اذہان کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔

اردو نعت میں جدید فکر کے ساتھ نمایاں تخلیقی اور تنقیدی کام کے کم ہونے کی وجوہات پر غور کر کے انھوں نے چند کا ذکر اس طرح کیا ہے:

غزل کی کلاسیکی روایت، نعت کو تنقید سے ماورا خیال کرنا، روایتی تصور محبوب، نعت کو ادبی صنف تصور نہ کرنا، نعت کو صرف نعت خوانی کے حوالے سے پہچاننا، سیرت نبی کے گہرے مطالعے کا فقدان۔

کاشف عرفان نے نذر صابری کی لکھی ہوئی ایک نعتیہ غزل پیش کرتے ہوئے اسے لفظوں کی ایمائیت اور فکر کے حُسن کی بنا پر ایک بڑی تخلیق قرار دیا ہے۔ اس نعتیہ غزل کا مطلع ہے:

بت کدہ صفات میں تنہا خدا نما صنم

جھک گئے سامنے ترے کفر کے سب خدا صنم

یہاں مجھے یہ محسوس ہوا کہ خوبصورت غزل کو نذر صابری نے نعت کا نام دے کر پیش کر دیا اور کاشف اور دوسرے ناقدین نے اس کو سراہا بھی لیکن یہ غور نہیں کیا کہ لفظ ”صنم“ بت اور حسین انسان (بالخصوص نسائی حسن) کے تصور سے بلند تصور کا کبھی بھی حامل نہیں رہا ہے۔ اردو شعرا نے کبھی بھی یہ لفظ مجازی محبوب کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جو ”راعنا“ کا لفظ ممنوع الاستعمال ہوا ہے، نعت کی تخلیق میں اس کا دھیان رکھنا لازمی ہے۔ جدید نعت کے ضمن میں مذہبی تقدس کا ذکر کرنے کے باوجود کاشف نے لفظ ”صنم“ کی کراہت پر غور نہیں کیا۔ میں نذر صابری کی اس نعتیہ غزل کو بنت اور اظہار کی خوبصورتی کے باوجود نعتیہ ادب میں شامل کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ پھر خیال رہے کہ یہ غزل کسی فلمی گانے کی بنیاد پر لکھی ہوئی ہے۔

جدیدیت کی تھیوری کے اطلاقات میں کاشف کہیں تو بالکل صحیح مثال دینے میں کامیاب ہوئے

نعت اور جدید تنقیدی رجحانات..... ایک تجزیاتی مطالعہ

ہیں لیکن کہیں کہیں انھوں نے قریب کے شعرا اور ان کے نسبتاً کمزور کلام کا حوالہ دے کر اپنے نظریے کی Grahnduer کو خود مجروح کر دیا ہے۔ جدیدیت کی تلاش میں شہرِ نعتیہ ادب کی تفصیلی سیر بہت ضروری تھی جو وہ نہ کر سکے۔ یہاں مثالیں دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے صرف اشارہ کر دیا ہے۔

اردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات

اس باب میں کاشف نے جدیدیت کی تفہیم کے لیے چار نکات پیش کیے ہیں: زمین سے رشتہ اور جڑوں کی تلاش اور اجتماعی شعور سے آگاہی، نفسیات کی مدد سے لاشعور میں جھانکنے کا عمل جو لاشعور سے اجتماعی لاشعور تک پہنچتا ہے، اساطیری حوالوں سے ادب کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش، جدیدیت لفظ و معنی کے رشتے تلاش کرتی ہے۔ جدیدیت کا تعلق ساختیات سے ہے۔

مابعد جدیدیت کو بھی انھوں نے درج ذیل نکات کی صورت میں سمجھانے کی کوشش کی ہے:

مابعد جدیدیت زمانے کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی، نظریاتی اور ادبی کروٹوں کے پھیلتے ہوئے آفاق سے ہم رشتہ ہوتا ہے۔ یہ (مابعد جدیدیت) جدیدیت ادب کی ارضی سطح سے مشاہدہ ہے جبکہ مابعد جدیدیت آفاقی سطح سے معائنہ ہے۔ یہ تخلیق کے اندر اور باہر کی دنیا کے درمیان ہم آہنگی کی تلاش کا نام ہے۔ آفاقیت اور وسعت مابعد جدیدیت کی ایک اہم کڑی ہے۔ لامحدودیت، مابعد جدیدیت کو جدیدیت سے ممتاز کرتی ہے۔ مابعد جدیدیت کائنات کی حدود میں پھیلاؤ اور کائنات کی لامحدودیت کو سمجھنے کا عمل ہے۔

مابعد جدیدیت تاریخ، عمرانیات اور لسانی رشتوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ (نعت نگاری میں تاریخی تناظرات اور عمرانیات کے علوم کے زیر اثر عرب معاشرے سے برصغیر کے تہذیبی تعلق کو سمجھنے کی کوشش مابعد جدیدیت کا موضوع رہی ہے۔)..... مابعد جدیدیت زندگی کی پیچیدگی (Complexity) کو ادب کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش ہے۔ ☆ معنی کی کثرت مابعد جدیدیت کا اہم موضوع ہے۔

پھر وہ بتاتے ہیں کہ نعتیہ میدان میں اقبال کی شاعری اُس آفاقی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے جس کی جانب مابعد جدیدیت کا نظریہ اشارہ کرتا ہے۔ نیز یہ کہ اردو نعت میں کائنات کی لامحدودیت کو اللہ کے حکم سے تسخیر کرنے کا عمل واقعہ معراج میں نظر آتا ہے جسے مختلف سطحوں پر مختلف شعراء نے بیان کیا ہے۔

کاشف کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت کی اہم ترین کڑی مابعد الطبیعات ہے۔ انسان دوستی،

نعت اور جدید تنقیدی رجحانات..... ایک تجزیاتی مطالعہ

قدروں کی بقاء کی خواہش، محبت اور موجود کو ماوراء سے جوڑنے کے نظریے کو مابعد الطبیعات کے ذریعے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ خدا اور انسان کے رشتے کو کائنات کی وسعت میں سمجھنے کا عمل ہے۔ خود نعت بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور خدا سے ان کی محبت کو سمجھنے کا عمل ہے۔

مابعد جدیدیت مذہب، منطق اور سائنس کے درمیان اُس نکتہ مشترکہ کی تلاش ہے جہاں علوم کے درمیان مذہبی اور غیر مذہبی کی غیر فطری اور غیر منطقی تقسیم کا اختتام ہو جاتا ہے۔

مابعد الطبیعات ہمیں وقت کی ماہیت کی مختلف سطحوں سے بھی روشناس کرواتی ہے۔ کائنات میں وقت کا تصور (جدید سائنسی تحقیق کے مطابق) خود اضافی (Relative) ہے۔ اضافی یا Relative سے مراد ایسی اشیاء جن کی پیمائش کے پیمانے مختلف اوقات یا مقامات پر مختلف ہو جائیں۔ وقت کی جہات مختلف اوقات یا مقامات پر اللہ کے حکم سے مختلف ہونے کا عمل ہمیں قرآن کریم میں تین مختلف واقعات سے ملتا ہے۔

حضرت عزیرؑ کا واقعہ۔ واقعہ معراج اور واقعہ اصحاب کہف..... لہذا کاشف کے خیال میں، موجود اور ماوراء کے درمیان وقت کی گمشدہ کڑیوں کی دریافت ان تینوں واقعات کی بنیاد بنتی ہے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ مابعد جدیدیت زمانے کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، علمی، نظریاتی اور ادبی کروٹوں کو اپنے عہد کے تناظر میں دیکھنے کا عمل ہے۔ اردو نعت نگاری کا رشتہ جہاں برصغیر کی مٹی سے ہے وہیں عرب کی سرزمین سے بھی ہے۔ برصغیر کی ثقافت اور زبان کا رچاؤ جتنا امام احمد خان بریلویؒ کے ہاں نظر آتا ہے شاید ہی کسی شاعر کے ہاں فنی سطح پر یہ رچاؤ موجود ہو۔

کاشف، علامتی پیرایہ کو آفاقی شاعری کی امتیازی خوبی بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ:

”مابعد جدیدیت جس آفاقیت اور وسعت کی بات کرتی ہے وہ شاعری میں علامت کے موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔“

اس مضمون میں کاشف عرفان نے سید عارف، اقبال، سید ابوالخیر کشفی، آفتاب کریمی، سلیم کوثر، حنیف اسعدی وغیرہم کی شاعری سے مثالیں پیش کر کے اپنا موقف مضبوط کیا ہے۔ علامتی اظہار کے لیے انھوں نے شعرا کے ایسے اشعار پیش کیے ہیں جن میں تلمیحاتی اشارہ از خود علامت میں ڈھل گیا تھا۔ اقبال کے ذکر میں فلسفہ عشق اور فلسفہ تحرک بھی زیر بحث آیا ہے۔

کاشف نے نعتیہ شاعری میں نمایاں موضوعات کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ یعنی: حسن ازل، انسان دوستی، سیرت محمدیہ کے آفاقی پہلو، سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے تناظر میں تہذیبی عناصر، سیرت

نبوی کے اثرات سے پیدا ہونے والی ذہنی پیچیدگی۔

عصر حاضر کی بے چینی کے مظہر کے طور پر انھوں نے صبحِ رحمانی کی ایک نعتیہ نظم پیش کر کے اپنی گفتگو کی اختتامی منزلیں طے کی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ باب قدرے بہتر مثالوں سے جدیدیت کی تھیوری کے اطلاقی پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ تاہم صرف چند مثالوں میں اپنے ارد گرد کے غیر معروف شعراء کی شاعری کو شامل کر لینے سے تلاش و جستجو کی واماندگی کا احساس ہوتا ہے۔

”اُردو نعت اور وقت کی ماورائی جہات“ اس باب میں کاشف نے بتایا ہے کہ اُردو نعت میں وقت کا تصور ماضی، حال، مستقبل اور ماورائیت پر بھی مشتمل رہا ہے اور واقعہ معراج کے معجزے سے وقت کی ماورائیت کا تصور منسلک ہے۔ انسان کو جب پہلی بار فنا اور بقا کے فلسفے کا ادراک ہوا تو اُس کو وقت کے موجود ہونے کا احساس ہوا..... گویا وقت ایسا پل ہے جو بقا کو فنا سے ملاتا ہے۔

آئن سٹائن نے کہا تھا:

"Time is the fourth dimension of the universe"

آئن سٹائن کی تھیوری آف ریلیٹیوٹی (Theorey of Relativity) سے ہی یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کائنات میں کسی بھی چیز کی حد رفتار روشنی کی رفتار ہے۔ اس نظریے نے وقت کی ماہیت کے حوالے سے بہت سے نئے سوالوں کو جنم دیا۔ کیا وقت ایک حقیقت ہے یا محض فریب؟، کیا وقت کائنات کی معروضی حقیقت ہے یا موضوعی؟، کیا وقت کا کوئی آغاز و انجام ہے؟، کیا وقت مستقل حقیقت ہے یا اضافی (Relative)؟ وقت جن چیزوں کے تقابل سے وجود پاتا ہے کیا اُن اشیاء سے وقت کا کوئی حقیقی تعلق ہے؟

سائنسی نظریات کے حوالے سے وقت کو تین مختلف نظریات کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے:

☆ بگ بینگ تھیوری (Big Bang Theorey)

☆ نیوٹن، آئن سٹائن اور سٹیفن ہاکنگ کا تصورِ وقت

☆ بگ کرانچ تھیوری (Big Crunch Theorey)

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

الشمس و القمر بحسبان

”سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں۔“

دوسری جگہ وقت کے حوالے سے ارشاد ہوتا ہے:

”اُس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے۔“

وقت کے حوالے سے قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر وقت (زمانہ) کے حوالے سے انسان کو مختلف پیغامات دیے ہیں۔ اسلام اور قرآن وحدیث کی تعلیمات میں وقت کی باگ ڈور اُس رب ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے جو اس ساری کائنات کو بنانے والا ہے۔ وہ خود کو زمانہ (وقت) بھی کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وقت اُس کی تخلیق ہے۔ وقت کے پیمانے اُس نے مختلف مقامات کے لیے مختلف رکھے قرآن پاک میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے:

”بیشک تمہارا رب اللہ ہے جس نے سب آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش قائم ہوا۔“

اصحاب کہف کے حوالے سے بھی سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

”اور اصحاب کہف اپنے غار میں نو اوپر تین سو سال رہے۔“

قرآن پاک کے مطابق وقت کی ماورائی جہات کا دوسرا اہم ترین تصور ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے حاصل ہوتا ہے۔ زمان کے اعتباری (اضافی) ہونے کا ایک اور ثبوت یہ بھی قرآن سے ملتا ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا کہ خدا کا ایک دن تمہارے ایک ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اقبال کے تصور وقت کے اہم نکات یہ ہیں:

☆ زمان (Time) ایک تخلیقی قوت ہے۔

☆ زمان (Time) ایک ارتقائی قوت ہے۔

☆ زمان (Time) پر قابو پا کر ہی زندگی کے ممکنات کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔

☆ زمان کی دو شکلیں ہیں پہلی شکل زمان حقیقی ہے جو لمحوں کا مرکب ہے اور اس میں تسلسل بھی نہیں

ہے جبکہ دوسری شکل زمان مسلسل ہے جو مختلف اکائیوں (لمحات) کا مرکب ہوتا ہے۔

اقبال کے ہاں زمان حقیقی کا بیان جگہ جگہ ہوا ہے:

خرد ہوئی ہے زمان ومکان کی زناری

نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

”تہذیبی تکمیل کے عمل میں ہمارے ہاں اب نعت فلسفے اور سائنس کے

بڑے مباحث کو شامل کرنے کی حالت میں آچکی ہے۔“

وقت کی ماورائیت کے حوالے سے اس باب میں مختلف شعراء کے اشعار پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم کاشف کو خود احساس ہے کہ انھیں اردو کی عام شاعری میں تو ایسی مثالیں ملیں لیکن نعتیہ شاعری میں اقبال، عبدالعزیز خالد اور عارف عبدالمتمین کے علاوہ دیگر شعراء کے ہاں نعت میں وقت کی تفہیم کی کوشش ان کی نظر سے نہیں گزری۔ ستیہ پال آنند کی ایک نظم کی چند لائیں انھوں نے اس لیے مثال کے طور پر پیش کی ہیں کہ ان میں ”جاوداں زندگی کی جانب قدم بڑھانے کا عمل بنیادی طور پر وقت سے ماورا ایک نئے جہان کی جانب پیش رفت کا اشارہ“ معلوم ہوتا ہے۔

کاشف عرفان کو یقین ہے کہ فلسفے کے مضامین پر مشتمل شاعری کا دور قرآن و سیرت کے گہرے مطالعے کے بعد شعراء، سامع اور قاری کی ذہنی تربیت کے بعد شروع ہوگا! وقت کی ماورائیت، انتہائی گہرا اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کاشف نے اس مسئلے کو چھیڑ کر اچھی خاصی سائنسی اور فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ جس معیار کی نثر لکھی گئی ہے اس معیار کے اشعار، نعتیہ شاعری کے روایتی سرمائے میں تلاش کرنا صحرا کی ریت کو چھلنی سے چھاننے کے مانند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کاشف نے بڑی دیانتداری سے دو تین نام گنوانے کے بعد مستقبل میں آنے والے شعراء کے انتظار کی راہ دکھائی ہے۔

اردو نعت پر ساختیات (Structuralism) کے اثرات

اس باب میں مصنف کتاب نے بتایا ہے کہ ساختیات کا نظریہ سائنس، بالخصوص طبیعیات (Physics) سے منسلک ہے۔ ساختیات رشتوں کے تضادات اور انسلاک کا تہہ در تہہ دائروی نظام ہے جو مشترکات اور مختلفات (Differences) کے رشتوں سے پہچانا جاتا ہے جو پیٹرن (Pattern) کہلاتے ہیں۔ سائنس، نفسیات، ادب اور معاشرتی علوم سب ہی ساختیات سے متاثر ہوئے ہیں۔ ادب میں فن پارہ، فن کار اور قاری کی مثلث کے ساتھ اس کوڈ کو تلاش کرنا بھی ضروری ہے جو اُس فن پارے کو زندگی دینے کا باعث بنا۔

ادب پارہ (فن پارہ) کے پس پردہ ایک علامتی نظام یا کوڈ موجود ہوتا ہے۔ اس کوڈ کو تلاش کرنے کے لیے کاشف نے یہ کہتے ہوئے چھ عناصر کی نشاندہی کی ہے کہ یہ فہرست مکمل نہیں ہے:

- i- فن کار کی لاشعوری کیفیات
- ii- معاشرتی عوامل
- iii- فن کار کی انانیت میں چھپی گریں
- iv- نفسیاتی مسائل
- v- نظریہ
- vi- خواب

نعتیہ ادب میں بڑی اور فکری شاعری کا جب بھی ذکر ہوگا اقبال کا حوالہ اس میں لازمی طور پر

آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کاشف عرفان نے اقبال کی شاعری میں ساختیات کے تناظر میں کوڈ یا گرامر کی تلاش کے لیے درج ذیل پانچ عناصر کی طرف قاری کی توجہ مبذول کروائی ہے:

i۔ محبت رسول ii۔ قرآن سے اخذ کردہ نظام فکر iii۔ ملت کا اجتماعی لاشعوری نظام

iv۔ تاریخ سے ناٹھ v۔ اسلام کا معاشی نظام اور فرد سے اس کا تعلق

اس باب میں کاشف عرفان نے بڑے سنبھل کر شعری نمونے پیش کیے ہیں۔ جن میں ساختیاتی کوڈ کی نشاندہی آسان ہو جاتی ہے۔ اقبال کے علاوہ عہد حاضر کے جن شعرا کے کلام کی مثالیں دی گئی ہیں وہ خاصی حد تک جدید اسلوب کی عکاس ہیں۔ کاشف نے بتایا ہے کہ ”ساختیات بنیادی طور پر اسلوبیات کا حصہ ہے“۔ ان شعراء میں جنید آزر، اختر شیخ، طارق نعیم، حسن رضوی، واجد امیر، وقار صدیقی، جمیری، صبیح رحمانی، کاشف عرفان، سلیم گیلانی، حسن ثار، فرحان، سعود عثمانی، عابد سیال، شوکت مہدی، منظر عارفی، ستیہ پاک آئند، ثروت حسین اور خورشید رضوی وغیرہم شامل ہیں۔ کاشف نے ان شعراء کے کلام کی مثالیں دے کر اپنا موقف واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

حمد و نعت اور فرد کا نفسیاتی نظام

بچپن کے ماحول سے اخذ کیے ہوئے عقائد، فکری زاویے، رسم و رواج، تہذیبی عناصر اور زندگی کے چلن عام طور سے تاحیات انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ایک معاشرے میں جو مشترک اقدار ہوتی ہیں وہ بھی فرد اور سوسائٹی کے لیے ذہنی انسلالات کا سبب بنتی ہیں۔ کاشف نے اپنے مضمون کا آغاز ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی کے بیانے سے کیا ہے۔ کشفی صاحب نے یہ مضمون اپنی آخری عمر میں لکھا تھا۔ وہ بتاتے ہیں:

”ہماری رشیدہ باجی کہتی تھیں کہ جب کلیاں درود شریف پڑھتی ہیں تو کھل کر پھول بن جاتی ہیں۔ اس بات کو سائنس کے میزان میں نہ تولیے۔ اس سے اُس مسلم معاشرے کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ معاشرے اسی طرح پھول بن کر کھلتے ہیں اور اُن کی خوشبو ساری دنیا کی فضاؤں میں تیرتی ہوئی انسانوں اور دوسرے مسافروں کو معطر بنا دیتی ہے۔“

یہ اقتباس دے کر کاشف نے اسلامی معاشرے کے مزاج کی تشکیل کی جھلک دکھادی ہے۔ اسی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ: ”اردو نعت ایک اسلامی معاشرے کے افراد (مسلم و غیر مسلم دونوں) کے

نفسیاتی نظام میں تغیرات پیدا کرتی ہے۔“ اور ”داخلی نظام معاشروں کی بنیاد ہوتا ہے۔“
 داخلی نظام کے حوالے سے نفسیاتِ انسانی کا مطالعہ کرتے ہوئے فرائڈ نے شعور کے پس منظر
 میں لاشعور اور ڈوئنگ نے اجتماعی لاشعور کا تصور پیش کیا۔ کاشف نے لکھا ہے کہ ”اجتماعی لاشعور ادب
 کی سطح پر آرکی ٹائپ (Architype) سے عبارت ہوتا ہے۔“
 یہاں ضروری ہے کہ میں ڈکشنری دیکھوں تا کہ آرکی ٹائپ کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت نہ
 ہو۔ دی فونانا ڈکشنری آف ماڈرن تھاٹ میں لکھا ہے:

A JUNGIAN term for any of a number of prototype phenomena (e.g. the wise old man, the great mother) which form the content of the COLLECTIVE UNCONSCIOUS (and therefore of any given individual's unconscious), and which are assumed to reflect universal human thoughts found in all CULTURES.

کشاف تنقیدی اصطلاحات میں لکھا ہے:

”اجتماعی لاشعور کا مواد ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی ہوتا ہے۔ یعنی یہ کسی فردِ واحد
 سے مخصوص نہیں بلکہ کم از کم کسی ایک گروہ بلکہ اصولی طور سے تو کسی ایک قوم
 اور بالآخر تمام انسانیت پر حاوی ہوتا ہے۔ اجتماعی لاشعور کا مواد فرد اپنی
 زندگی کے دوران حاصل نہیں کرتا بلکہ یہ تو ورثے میں ملے ہوئے جبلی
 سانچے ہیں۔ تفہیم کی اساسی صورتیں اور بنیادی علامات..... انھی کو اصطلاح
 میں آرکی ٹائپ کہا جاتا ہے“ (کشاف تنقیدی اصطلاحات، مرتبہ: ابوالاعجاز
 حفیظ صدیقی، نظر ثانی: ڈاکٹر آفتاب احمد خاں)

آرکی ٹائپ کی اصطلاح نفسیاتی تنقید میں استعمال ہوتی ہے۔ نعت کے قارئین کے لیے اس
 کی وضاحت ضروری سمجھ کر میں نے یہاں کتب کی مدد سے اس کا مفہوم لکھ دیا۔

آرکی ٹائپ کے مفہوم کو ذہن میں رکھیں تب کاشف کی یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ:
 ”نعت، سیرتِ مصطفیٰ یا مذہب کے حوالے سے انسانی شعور اپنی پہلی
 لاشعوری کیفیات کے ساتھ جا ملتا ہے۔“

نعت چوں کہ فنی اظہار ہے اس لیے محمد حسن عسکری کا بیان کردہ یہ نکتہ میں خاطر نشین کر لیں کہ:

”فنی اظہار کامیاب اس وقت ہوتا ہے جب شاعر بذاتِ خود Architype

کو بیان کی قید میں لانے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس سے اپنا ایک شخصی اور ذاتی رشتہ قائم کرے اور اس رشتے کو اظہار کا موقع دے۔“ (صبحِ رحمانی،

اردو نعت کی شعری روایت، صفحہ ۲۸۱)

کاشف نے انسانی ذہن پر ”پیدائش کے بعد دی جانے والی اذان“ کے لاشعور اور پھر شعور پر اثرات کا ذکر کیا ہے اور اقبال کی مثنوی اسرارِ خودی سے فرد کے نفسیاتی نظام کی اسلامی اور اخلاقی تشکیل کے لیے تین مرحلے اخذ کیے ہیں، یعنی: اطاعت، ضبطِ نفس، نیابتِ الہی ماحول کے اثرات کا جس طرح ذکر کشفی صاحب نے کیا تھا، کاشف نے بھی اسی انداز سے اپنے گھریلو ماحول کا ذکر کیا ہے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی محافل، محافلِ میلاد یا محافلِ سیرت میں شرکت کے نتیجے میں اپنی ذہن سازی کی روداد رقم کی ہے۔

پھر وہ بتاتے ہیں کہ فرائیڈ کے کچھ نظریات، انسان کی فطرت کے قرآنی نظریے سے قریب ہیں۔ مثلاً: جذبہء محبت جو لاشعوری جذبہ ہے۔ جذبہء محبت کو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی علیہ السلام کے لیے شدت سے محسوس کرنے میں مسلمان بچے کی پرورش میں مذہبی ماحول کے اثرات اور خود اپنے گھریلو ماحول کا ذکر کر کے کاشف نے اپنا موقف اچھی طرح واضح کیا ہے۔

انسان کے فکری نظام پر اثر انداز ہونے والے سات منطقوں کی بھی انھوں نے نشاندہی کی ہے: الہامی کتب، کائناتی اسرار، عصری حقائق، تبدیل ہوتا ہوا فکری منظر نامہ، شعوری کیفیات، لاشعور سے حاصل ہونے والی پیچیدگی، مذاہب کے معاشرتی تغیرات۔

نعت کی شاعری بھی کاشف کے بقول دو طرح کے شعراء کرتے ہیں:

i۔ ایسے شعراء جو صرف حمد، نعت اور منقبت کہتے ہیں۔

ii۔ ایسے شعراء جو عام شاعری کے ساتھ ساتھ حمد، نعت اور منقبت بھی کہتے ہیں۔

پھر وہ بتاتے ہیں کہ:

”صرف مذہبی شاعری سے منسلک شعراء کے ہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے

محبت کا جذبہ ایک بالکل مختلف فکری سطح پر نظر آتا ہے جہاں عزت، احترام،

تکریم کے جذبات نمایاں ہوتے ہیں۔ لفظوں کا دروبست نہایت سنبھلا ہوا

اور بات کو پردے میں رکھ کر کرنے کا فن بھی نمایاں نظر آتا ہے لیکن فکری سطح

پر روایت سے جڑے ہونے کے باعث ان کے ہاں فن کی سطح پر کوئی نیا ادبی

تجربہ نظر نہیں آتا۔“

یہ بات بتا کر انھوں نے چند اشعار نقل کیے ہیں جن میں عثمان نام، سرو سہار پوری، سلمان رضوی، ہلال جعفری اور احسان اکبر کے ایسے اشعار دیئے ہیں جن میں روایت سے انسلاک ظاہر ہوتا ہے۔ روایتی نعت گو شعرا کے برعکس انھوں نے ایسے شعرا کے اشعار بھی نقل کیے ہیں جن میں نئے انداز سے موضوعاتِ نعت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ ایسے شعرا میں انھوں نے عقیل عباس جعفری، نثار ترابی، اسلم راہی، اختر شیخ، وفا چشتی، انجم خلیق، ڈاکٹر محمد حامد، افتخار عارف، شبنم رومانی، وسیم بریلوی، سید صبیح رحمانی، محسن احسان وغیرہم کو شامل کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی سب کے سب اشعار جدید طرز کے نمائندہ اشعار نہیں کہے جاسکتے ہیں۔ ایسی مثالوں کے لیے کاشف کو کچھ زیادہ تلاش و جستجو کی راہ اختیار کرنی چاہیے تھی۔

اس کے باوجود ان کی پیش کش لائقِ اعتنا ہے۔ ان کا یہ عاجزانہ اظہار یہ بھی ان کے پُر خلوص رویے کا عکاس ہے:

”حمد و نعت کے حوالے سے اس فکری و نفسیاتی عمل کو منطق کی رُو سے سمجھنے کی یہ ایک سنجیدہ اور میری ناقص معلومات کے مطابق پہلی باقاعدہ کوشش ہے جو اگرچہ خام ہے لیکن طویل سفر کے لیے بھی پہلا قدم تو مسافر کو بڑھانا ہی ہوتا ہے سو اس سعیِ خام کو پہلا قدم ہی سمجھا جائے۔ شاید اب جدید علوم اور نعت مبارک کے حوالے سے چراغ سے چراغ جلنے کا عمل شروع ہو جائے کہ علم ہی ملتِ اسلامیہ کے مسائل کا اصل علاج ہے۔“

مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ جزوی طور پر نئے تنقیدی رجحانات کی طرف اشارے تو اس تحریر سے قبل بھی ہوئے تھے لیکن باقاعدہ موضوعاتی تعین کے ساتھ یہ کام پہلی بار کاشف عرفان ہی نے کیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی اس رائے سے مجھے کامل اتفاق ہے:

”کاشف عرفان نے پہلے اردو نعت کی روایت کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے، اور اس کے بعد جدیدیت، مابعد جدیدیت، وقت کی ماورائی جہات، ساختیات، اور نفسیات کی روشنی میں اردو نعت کو سمجھنے، سمجھانے کی سعی کی ہے۔ بلاشبہ یہ عالی ہمتی اور الولعزی (Ambitious) سے عبارت علمی مہم ہے۔ نفسیات و ساختیات، جدیدیت و مابعد جدیدیت اور وقت کے ماورائی

تصورات، معاصر علمی دنیا کے اہم ترین مباحث ہیں، مگر کافی بسیط، پیچیدہ اور ایک قسم کی بین العلومیت کے حامل ہیں۔ ان سب نظریات کو بہ یک وقت نعت کے مطالعے کا تناظر بنانا عالی ہمتی ہی ہے۔“

نعتیہ ادب کی تنقیدی جہتوں کے تقریباً تمام ہی ابعاد صبیح رحمانی کی نظر میں ہیں اس لیے ان کی رائے نے اس کتاب کو مزید وقیع بنا دیا ہے۔ مجھے صبیح کی رائے سے بھی اتفاق ہے:

”کاشف عرفان نے تنقید و تفہیم کے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ آسان نہیں، بلکہ خاصا مشکل ہے۔ تاہم یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ مزاجاً وہ عامی اور اوسط درجے کا آدمی نہیں ہے۔ قدرت نے اُسے بہتر صلاحیتوں سے نوازا ہے اور وہ نئے راستوں کا مسافر ہے۔ کچھ نیا کرنے کی دُھن اُس کے لیے آئندہ زیادہ بڑی اور زیادہ بامعنی منزلوں تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ ان شاء اللہ۔“

کچھ عرصہ قبل تک نعتیہ شاعری پر تنقیدی رجحانات کے دروازے بند تھے۔ پھر جیسا کہ میں نے مختصراً عرض کیا ”نعت رنگ“ کے اجرا کے بعد نقدِ نعت کی راہ ہموار ہوئی۔ نعتیہ ادب کی تخلیقی سرگرمیوں سے منسلک روایتی لوگوں کی نظر میں یہ بدعت (بلکہ گناہ) تھی۔ لیکن اہل فکر و نظر نے نعتیہ شاعری کے لیے تنقیدی رجحانات کے پھیلاؤ کو تائیدِ ربانی سے تعبیر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت رنگ کے اجرا کے فوراً بعد راقم الحروف اور صبیح رحمانی نے بیت اللہ میں یہ دعا کی تھی کہ نعت پر تنقید کرنا اگر سودمند ہے تو یہ تحریک آگے بڑھے، بصورتِ دیگر یہ سلسلہ یہیں رک جائے!..... اللہ رب العزت نے اس نظریے کے فروغ کی راہ ہموار فرمادی..... الحمد للہ!..... یہی وجہ ہے کہ آج نعتیہ ادب میں نئے ذائقے کی تنقیدی کتاب متعارف کرواتے ہوئے مجھے مسرت ہو رہی ہے۔ میں اس کتاب میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی شمولیت کو بھی نیک فال سمجھتا ہوں۔ اللہ انھیں خوش رکھے (آمین)!

ڈاکٹر محمد اشرف کمال۔ بھکر

”اردو نعت کی شعری روایت“۔ ایک جائزہ

ABSTRACT:

The book 'URDU NAAT KI SHAIRY RIWAYAT', compiled by Sabih Rehmani has been reviewed in this article. Salient points have been highlighted to show the matters discussed by different scholars. Each article contains some intellectual light on the topics of Definition of Naat, History of Naat, Trends of Naat and Pre-requisites of the genre of Naat. This write up is a brief introduction of the book under review.

اردو اصناف ادب میں نعت گوئی ہمیشہ سے مقبول و معروف رہی۔ تقریباً ہر دیوان اور مجموعہ کلام میں نعتیہ اشعار مل جاتے ہیں، شاعری کے علاوہ نثری کتابوں کے آغاز میں بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد نعتیہ اشعار بھی مل جاتے ہیں۔ پھر کچھ شعراء نے اپنے آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد و ثنا کے لیے مخصوص کر لیا اور انھوں نے نعت کے علاوہ دوسری اصناف میں شاعری ترک کر دی۔

اس نعتیہ روایت کو اس وقت زیادہ تقویت ملی جب نعت کے حوالے سے مختلف رسائل کا اجرا عمل میں آیا۔ صبیح رحمانی کا نعت رنگ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جنھوں نے نعت رنگ کے ذریعے اردو نعت کی ترویج و فروغ میں عملی اقدامات اٹھائے۔

اردو نعت کی شعری روایت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں مرتب ڈاکٹر صبیح رحمانی نے نعت کے حوالے سے مختلف مضامین کو یک جا کر کے نعت پر تحقیقی و تنقیدی کام کا ایک ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں نعت کی تعریف، تاریخ، رجحانات، اور تقاضوں کے حوالے سے جو مضامین و مقالات شامل کیے گئے ہیں وہ علمی و معلوماتی تو ہی ہیں، اس کے ساتھ ساتھ ان کے نعتیہ ادب میں اس لیے بھی زیادہ وقعت اور قدر و قیمت ہے کہ یہ آنے والے محققین کو نعت کے حوالے سے وہ مواد پیش کرتے ہیں جو آگے جا کر اس موضوع کے بارے میں سنگ میل اور اساسی ماخذ ثابت ہوگا۔

اس کتاب کے حرف آغاز میں صبیح رحمانی نے سیرت رسول ہسے دہنی قلبی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اور ایک خود آگاہ تہذیب کے لیے عصری شعور کے ساتھ ساتھ پس منظری اساس کو بھی بنیادی ضرورت قرار دیا ہے۔ اس حرف آغاز میں انھوں نے اردو میں نعت کی روایت کو سمیٹتے ہوئے نعت کے حوالے سے بہت مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ نعت کے حوالے سے پہلے تحقیقی مقالے کے بارے میں لکھتے ہیں:

”۱۹۵۵ء میں ناگ پور یونیورسٹی (بھارت) سے ڈاکٹر رفیع الدین اشفاق نے ”اردو میں نعتیہ شاعری“ پر پہلا تحقیقی کام مکمل کیا۔ یہ تحقیقی مقالہ ۱۹۷۶ء میں اردو اکیڈمی سندھ، کراچی نے شائع کیا۔“

صبح رحمانی یہ کتاب مرتب کر کے جہاں نعت کے حوالے سے عقیدت و خدمت کا اظہار کیا ہے وہاں اس کتاب کو معلوماتی، تحقیقی و دستاویزی بنانے کی بھی پوری کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں:

”صبح رحمانی کی تدوین کردہ اس کتاب میں نعت کی تعریف، تاریخ، اور نعتیہ کلام سے متعلق رجحانات پر نمائندہ اور معیاری مضامین اشاعت پذیر ہو کر قارئین کی ضیافت طبع کے ساتھ نعت رسول پاک کی قدر و قیمت میں اضافہ کا سبب بنتے جارہے ہیں۔“

اس کتاب میں بلا شک و شبہ نعت اور نعت گوئی کے مسائل کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ نعت کی صنف میں نئے امکانات اور جدید رجحانات خود بخود سامنے آتے چلے جائیں گے اور جن سے صنف نعت کے فروغ کو ضرور فائدہ پہنچے گا۔

نعت کے لغوی معنی تعریف و توصیف کرنا کے ہیں اور اصطلاحی معنی شعری اصناف میں حضرت محمدؐ کی تعریف و توصیف کرنا ہیں۔ اردو میں مختلف اصناف سخن اور مختلف ہیئتوں میں نعت لکھی جا رہی ہے۔ مثلاً: قصائد، مسدس، مخمس، مثنوی، قطعات، رباعیات، مثلث، نظم اور ہائیکو کی صورت میں۔

اس کتاب میں بہت سی ایسی بنیادی باتیں اور مباحث شامل کیے گئے ہیں جو کہ نہ صرف محققین بلکہ عام قارئین کے لیے بھی فائدہ مند ثابت ہوں گے اور ان کے جنرل ناچ میں اضافے کا باعث بنیں گے۔ مثلاً نعت کا لفظ سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا کے لیے کس نے استعمال کیا، اس حوالے سے ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق رقم طراز ہیں:

”نعت کا لفظ جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصف کے لیے حضرت علیؓ سے منقول ہے، غالباً اسلامی ادب میں اس معنی میں پہلی دفعہ کیا گیا ہے۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے اپنے لیے بجائے واصف کے ناعت کا استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

من راہ بداهتہ ہابہ۔ ومن خالطہ معرفتہ احیہ یقول ناعته لمراء قلبہ ولا بعدہ مثلہ صلی اللہ علیہ وسلم (شائل ترمذی، ص ۵۶۷)

”آپ پر یکا یک جس کی نظر پڑ جاتی ہے، ہیبت کھا جاتا ہے۔ جو آپ سے تعلقات بڑھاتا ہے، محبت کرتا ہے۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ کے جیسا دیکھا اور نہ آپ کے بعد آپ کے جیسا دیکھا۔“ ۴

نعت کا آغاز مکہ سے ہوا۔ ابو طالب کے قصیدہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت کے اشعار موجود ہیں۔ جن کو ہم سب سے پہلی نعت قرار دے سکتے ہیں۔ ان کے بعد بچپن کے وہ گیت متاثر کن ہیں جو انھوں نے تاجدار حرم کی شان میں آپ کے مدینہ تشریف لانے پر استقبال کے موقع پر گائے۔ ایک نام اعمش کا بھی ہے جس نے حضور کی شان میں قصیدہ لکھا مگر وہ ایمان کی دولت سے محروم رہا۔ ۵

حضرت حسان بن ثابتؓ وہ جلیل القدر نعت گو ہیں جن کے لیے مسجد نبوی میں ایک منبر مخصوص کر دیا گیا تھا جس پہ کھڑے ہو کر وہ شان نبوی میں اپنے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ حضرت کعب بن زہیرؓ، حضرت عبداللہ بن وائلؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت سفیان بن حارثؓ نے بھی نعتیہ کلام لکھا۔

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا مضمون ”اردو میں نعت گوئی کا ارتقا“ اردو نعت کی روایت پر روشنی ڈالتا ہے۔ قدیم دکنی شاعری سے لے کر عہد حاضر کی شاعری تک نعت لکھنے کے رجحان اور نعت کے شعری نمونوں کو سامنے لایا گیا ہے۔ اس مضمون میں بتایا گیا کہ نعت کی ایک روایت محسن کا کوری پہ ختم ہوتی ہے اور دور جدید کی نعت کا آغاز ۱۸۵۷ء کے بعد کی شاعری سے ہوتا ہے۔ جس میں حالی، شبلی، نظم طباطبائی، ظفر علی خان اور علامہ اقبال کے نام نظر آتے ہیں۔

”علامہ اقبال نے نعت کے حوالے سے جو مضامین پیش کیے اس سے نعت

گوئی کے نئے افق روشن ہوئے۔“ ۶۔

حالی کی مسدس مدو جزر اسلام یا عرض حال بجناب سرور کائنات نے اس دور میں مقبولیت کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد احمد رضا بریلوی نے نعت گوئی میں کمال حاصل کیا۔ مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق دور جدید کا دوسرا دور ۱۹۴۷ء سے پہلے کا دور ہے۔ اس کے آغاز کے بارے میں انھوں نے کوئی اشارہ نہیں دیا۔ شاید یہ اقبال کے بعد کا دور ہے۔

اردو نعت میں وسیع تر امکانات کی صورت قیام پاکستان کے بعد سامنے آئی۔ مضامین نعت کے ماخذات میں قرآن سب سے اہم ماخذ ہے یہاں نعت سے مضامین میں عبدیت، رحمۃ للعالمین، نور محمدی، محبوبیت، عطاء الہی، بنی نوع انسان سے آپ کی رافت و رحمت، فضیلت رسول کریم جیسے مضامین ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث سے بھی نعت رسول مقبول کے اہم مضامین ملتے ہیں۔

ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کے مضمون ”محرکات نعت“ کے حوالے سے نعت سبت خداوندی، عشق رسول، اظہار عقیدت، اطاعتِ رول کا جذبہ، نعت: تبلیغ دین کا وسیلہ، ذکر رسول کو عام کرنے کی خواہش، نعت وسیلہ برکت، روضہ رسول پر حاضری کی خواہش، صوفیائے کرام اور فروغ نعت، دینی مجلسیں اور فروغ نعت محفل میلاد، سیرت کے جلے، عرس اور قوالی ذرائع ابلاغ اور فروغ نعت نعتیہ مشاعرے، اخبارات و رسائل، گراموفون ریکارڈ، فلمیں اور کیسٹ، ریڈیو اور ٹی وی یہ سب وہ ذریعے یا وسیلے ہیں جن سے نعت کو فروغ ملا۔ اس کتاب کے بارے میں احمد جاوید لکھتے ہیں:

”اردو نعت کی شعری روایت دراصل فروغ اور تفہیم نعت کے نئے زاویے

پیدا کرنے والی کتاب ہے جو ہمارے فکر و نظر کی گرد اتارنے کا ذریعہ بن سکتی

ہے۔“ (۷)

ڈاکٹر یحییٰ خٹیب کا مضمون اردو نعت گوئی کے موضوعات اپنے اندر موضوعاتی تنوع لیے ہوئے

ہے۔ نعتِ خالص کے بارے میں یحییٰ خٹیب لکھتے ہیں:

”نعتِ خالص سے مراد وہ نعتیہ کلام ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف

اوصاف کا بیان ہو، جو محامد و محاسن اور تعریف کی حد تک ہی محدود ہو۔ اردو

کے ایسے نعتیہ ذخیرے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی کتابیں بھی اس ضمن

میں موجود ہیں، لیکن واقعات رسول کو نعت کے جن موضوعات کے ذیل میں

قلم بند کیا گیا ہے یہاں اسی کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس ضمن میں ولادت

رسول کو موضوع بنا کر لکھی گئیں نعتیں میلاد نامہ کے ذیل میں شمار کی جاسکتی ہیں۔“ ۸

اس مضمون میں اردو میں میلاد ناموں کی تاریخ بھی شامل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نور نامے، معراج نامے، وفات نامے، اسرائیلیات، اور صدیات کے حوالے سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے۔ ظہیر غازی پوری کا مضمون نعتیہ شاعری کے لوازمات فکری نوعیت کا ہے جس میں نعتیہ اشعار میں لغزش، غلو اور جارحانہ طرز اختیار کرنے کے حوالے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ مجید امجد بھی اس حوالے سے اپنے مضمون صنف نعت میں لکھتے ہیں:

”جناب رسالت مآب کی تعریف میں ذرا سی لغزش نعت گو کو حدود کفر میں داخل کر سکتی ہے..... ذرا سی کوتاہی مدح کو قدح میں بدل سکتی ہے۔ ذرا سا غلو ضلالت کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ ذرا سا عجز اہانت کا باعث بن سکتا ہے فن شعر کے لحاظ سے اس کام کے لیے کمالِ سخن وری اور نفس مضمون کے لحاظ سے اس کے لیے کمالِ آگہی درکار ہے اور پھر ان دونوں چیزوں کو جلا جس چیز سے ملتی ہے وہ عشق کا سردی جذبہ ہے۔ جو لفظوں کو تجلیات سے بھر دیتا ہے۔“ ۹

ظہیر غازی پوری نے مختلف شعروں کی مثال دے کر ان اشعار کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جن میں غلو سے کام لیا گیا ہے۔

زباں پہ بار خدا یا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے

دیگر مباحث کے ساتھ ساتھ ظہیر غازی پوری نے غالب کے درج با شعر کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھا ہے:

”جناب ناوک حمزہ پوری نے لکھا ہے کہ ”اے کاش غالب نے یہ شعر بہ ارادہ نعت کہہ کر طاپنی عاقبت سنوار لی ہوتی۔ حال یہ ہے کہ غالب نے یہ شعر تجمل حسین خاں کے لیے چند ٹکے کی امید میں کہا تھا۔“ ۱۰

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی اردو میں نعت گوئی کا ارتقا کے عنوان سے اردو نعت کی تاریخ پر قلم اٹھاتے ہوئے مختلف حوالوں سے تین شعراء کرام کو اردو نعت کا شعر لکھنے والا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ مولوی

عبدالحق کی کتاب اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ کے مطابق خواجہ بندہ نواز گیسو (م ۸۲۵ھ) کے اشعار کو اردو نعت کا پہلا نمونہ قرار دیا۔ وہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی مرتبہ کتاب مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (جسے ۸۲۵ھ تا ۸۳۸ھ کی تصنیف تسلیم کیا جاتا ہے) میں نعتیہ اشعار کو پہلا نمونہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد فتح پوری کی کتاب اردو شاعری میں نعت کا حوالہ دیتے ہوئے ملا داؤدی کی مثنوی چندائے کوارد زبان کا اولین لسانی وادبی نمونہ اور اس میں شامل نعت کو اردو کی پہلی نعت قرار دیتے ہیں ملا داؤد نے چندائے کوارد ۷۸۱ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں تصنیف کیا تھا۔ ۱۱

ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی اردو نعت کو مستقل حیثیت دینے کے حوالے سے گیارہویں صدی ہجری میں پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ (۱۰۲۰ھ) کا نام لیتے ہیں جنہیں رسالت مآب سے والہانہ عقیدت تھی۔

ڈاکٹر انور سدید اردو میں نعت نگاری ایک جائزہ ۱۹۷۵ء تک میں قلی قطب شاہ سے لے کر ولی، مومن، ظفر، غالب، میر حسن، حالی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، اکبر الہ آبادی، سرور جہاں آبادی، امجد حیدر آبادی، محمد علی جوہر، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، اقبال، حفیظ جالندھری، اصغر گوٹوی، بہزاد لکھنوی، احسان دانش، ماہر القادری، اسد ملتانی، راجہ محمد عبداللہ نیاز، شورش کاشمیری، اثر صہبائی، نعیم صدیقی، عبدالکریم ثمر، عبدالعزیز خالد، حفیظ مآب، حافظ لدھیانوی، اختر سرحدی، جعفر طاہر، شیر افضل جعفری، گویا جہان آبادی، محشر رسول نگری، یوسف ظفر، منیر نیازی، شہزاد احمد، انجم رومانی، مظفر وارثی، اطہر نفیس، انجم نیازی، عبداللہ خاور جیسے نعت گو شعراء کا تذکرہ اور ان کے کلام کا محاکمہ پیش کیا ہے۔

عارف عبدالمبین نے اپنے مضمون ”جدید اردو نعت“ میں عربی میں نعت کے آغاز کے بعد اردو نعت لکھنے والے جدید شعراء کا ذکر کیا ہے۔ ممتاز حسن نے نعت کے فکری زاویے اجاگر کیے۔ جس میں اردو شعراء کے ساتھ ساتھ فارسی شعراء کے کلام کو بھی پیش کیا۔ جن میں فیضی، جامی، قدسی، گرامی، کے نام قابل ذکر ہیں۔

جمال پانی پتی نے نعت گوئی کا تصور انسان کے حوالے سے اس مضمون میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نوری یا بشری صفات کو سامنے رکھا ہے اور اس حوالے سے حالی کی نظم مسدس مدو جزر اسلام پر بات کی ہے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے اپنے مضمون نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم میں شعری گورکھ دھندوں اور لفظوں کی ذومعنویت پر بات کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”لفظوں کی دنیا عجب طلسمات ہے۔ الفاظ کی معنوی سطحیں، درجے اور رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ بازاری زبان کے بعض الفاظ وقت گزرنے کے ساتھ مستند زبان کا حصہ بن جاتے ہیں۔“ ۱۲

عام بول چال میں الفاظ کے معانی کا تعین اور طرح سے ہوتا ہے جب کہ ادبی یا شعری زبان میں معانی کا تعین دوسری طرح کیا جاتا ہے یہاں الفاظ کے اصطلاحی اور علامتی معانی بھی عبارت میں اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔ شعر میں زیادہ تر بات سیدھے سادے انداز میں نہیں کی جاتی بلکہ شعری اظہار بعض اوقات ابہام میں ملفوظ ہوتا ہے۔ نئے علوم میں خصوصاً علم المعانی نے لفظ اور شے کے جوئے رشتے دریافت کیے ہیں ان کے پیش نظر شاعری اور ادب میں معانی کی حیثیت بدل گئی ہے۔ ۱۳ اسی طرح مزید زبان اور الفاظ کی شعبہ بازیوں کے حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں:

”الفاظ کے معانی کا تعین ایک مشکل مسئلہ ہے۔ ہم صنف کے الفاظ میں اپنے تجربات کا عکس بھی تلاش کرتے ہیں پھر پڑھنے والوں کا ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو ادبی تحریروں کو اپنی غلط تاویلات سے مسخ کر دیتا ہے۔“ ۱۴

اچھی خاصی طویل بحث کے بعد وہ نعت کے موضوع کی طرف آتے ہیں جس میں الفاظ اور اس کے معنوی تعلق کو بیان کرتے ہیں۔ مختلف شعراء کے نعتیہ کالم کی مثالیں پیش کرتے ہوئے نعت میں استعمال ہونے والے الفاظ کی معنوی ساخت کو زیر بحث لاتے ہیں۔

احمد ہمدانی نے جدید اردو نعت اور علامت نگاریہ کو موضوع بنایا ہے۔ اور اس حوالے سے قیام خوشبو، نام خوشبو، روشنیوں کے کھیت، صورت اور چراغ، درد کا پھول، صحرا کی شال، ہاتھوں میں کرنوں کا پھول، دھند میں لپٹے باغ، ریگ تشنہ، افق تیرہ، دھند لکوں کافسوں کرنوں کی کند، سوکھے پیڑ کی ٹوٹی شاخ جیسی علامتوں کو بیان کر کے ان کی وضاحت کی ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر ثار ترابی کا مضمون بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے شاعری میں متنی رشتوں کی تلاش کا کام کیا ہے۔ اور متن کثیر المعنویت جہت کا ذکر کیا ہے۔ کاشف عرفان نے ”اردو نعت پر مابعد جدیدیت کے اثرات“ کا جائزہ لیا ہے۔ اور جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک کے سفر کو بھی بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

مابعد جدیدیت ایک ایسے ذہنی رویے اور ادبی مزاج کا نام ہے جس میں تاریخی و ثقافتی صورت حال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ مابعد جدیدیت تخلیق پر بٹھائے جانے والے پہروں کی کسی بھی شکل کو

تسلیم نہیں کرتی۔ ۱۵۔

پروفیسر محمد فیروز شاہ کا مضمون نعت میں جدید طرز احساس ان کے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہوا مضمون ہے اس مضمون میں جدت تشبیہات واستعارات، ندرت فکر و خیال، ہم عصر فضا کی صدا، والہانہ وابستگی کا اظہار جذبہ و احساس کا ترفع، جمال محبوب کے تذکار حسن سیرت کی ضو، فریاد کی لے، لچ پال نسبتوں کا تفاخر، احیائے تہذیب اسلام کی خوش بو، کے حوالے سے نعتیہ اشعار دیے ہیں اور ان پر فکری حوالے سے قلم اٹھایا ہے۔

سحر انصاری کا مضمون نقدِ نعت۔ تناظر اور تقاضے کے عنوان سے اردو نعت کا منظر نامہ تذکرے سے جدید نعت تک کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

تحقیقِ نعت: صورتِ حال اور تقاضے کے عنوان سے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جامعات میں ہونے والے اردو نعت کے حوالے سے تحقیقی کام پر بات کی ہے۔ لکھتے ہیں:

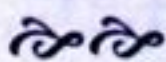
”اب تک دو سو سے زیادہ مقالات، پی ایچ ڈی، اور ایم فل دونوں سطح پر،

ادبی شخصیات کے احوال و آثار پر لکھے جا چکے ہیں۔“ ۱۶۔

اس مضمون میں انھوں نے مختلف نعت گو شعرا کا احوال بیان کیا ہے جو کہ تحقیقی مقالے کا موضوع بنائے گئے ہیں۔ ان کے خیال میں نعت گوئی پر تحقیق و مطالعہ کے لیے شخصیات کے بجائے کسی ایک دور، علاقے یا کسی عصری یا معاشرتی حوالے سے موضوعات کو لیا جائے تو اس طرح نعت گوئی کا اجتماعی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے اور تقابلی مطالعہ بھی۔

نعت کے حوالے سے ایک اور اہم نام ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی کا ہے جنھوں نے نعت اور نقدِ نعت۔ چند گزارشات کے عنوان سے لکھا ہے۔ اور موجودہ صدی کو نعت کی صدی قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر ریاض مجید، ناصر عباس نیر، مبین مرزا، شمیم احمد، ڈاکٹر محمد اقبال جاوید، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر سمیع اللہ قریشی کے مضامین بھی فکری حوالے سے اردو نعت کے شعبہ میں اہمیت کے حامل ہیں۔



حوالہ جات

۱۔ صبح رحمانی، ص ۱۵

۲۔ فلیپ از ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت مرتبہ صبح رحمانی، کراچی، اکادمی بازیات ۲۰۱۶ء

۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، تاریخ اصناف نظم و نثر، کراچی، رنگ ادب، ۲۰۱۵ء، ص ۲۴

۴۔ رفیع الدین اشفاق، سید، نعت کی تعریف، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۲۴

۵۔ گوہر ملیانی، عصر حاضر کے نعت گو، صادق آباد، گوہر ادب پبلیکیشنز، ۱۹۸۳ء، ص ۳۳-۳۴

۶۔ محمد اقبال نجمی: نعت رسول مقبول اور کلام اقبال، مشمولہ مفیض، نعت تبصرہ نمبر ۲، شمارہ ۸۸، ۲۰۱۲ء، ص ۲۷

۷۔ فلیپ از احمد جاوید مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت

۸۔ یحییٰ نش، ڈاکٹر، اردو نعت گوئی کے موضوعات، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۷۷

۹۔ مجید امجد، صنف نعت، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۳۰۲

۱۰۔ ظہیر غازی پوری، نعتیہ شاعری کے لوازمات، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۱۲۲

۱۱۔ شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر، اردو میں نعت گوئی کا ارتقا، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۱۳۶

۱۲۔ ابوالخیر کشتی، ڈاکٹر، نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۳۸۰، ۳۷۹

۱۳۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، لسانیات اور زبان کی تشکیل، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۵ء، ص ۱۷

۱۴۔ ابوالخیر کشتی، ڈاکٹر، نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۳۸۰

۱۵۔ محمد اشرف کمال، تنقیدی تھیوری اور اصطلاحات، فیصل آباد، مثال پبلشرز، ۲۰۱۶ء، ص ۹۳

۱۶۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحقیق نعت۔ صورت حال اور تقاضے، مشمولہ اردو نعت کی شعری روایت، ص ۵۶۴

”نئی صدی نئی نعت“ خورشید ربانی کا دلاویز نعتیہ انتخاب

ABSTRACT:

Khursheed Rabbani has brought out a valuable Naatia collection 'Nai Sadi Nai Naat' which has been introduced in this article. The Naatia collection contains devotional poetry of prominent and renowned poets of this genre of poetry. Poetry of many contemporary poets has also been included to make the collection comprehensive. The compilation work of Rabbani is really praiseworthy.

ہمارے رواں عہد کے جید شاعر اور ادیب جناب خورشید ربانی نے بڑی محنت طلب تحقیق کے بعد مطالعاتی شوق رکھنے والوں کے لیے عمومی اور نعتیہ ذوق مطالعہ کے حامل افراد کے لیے خصوصی طور پر ایک لا جواب نعتیہ انتخاب پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کو ”نئی صدی نئی نعت“ کے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ اپنے اس مجموعے میں انہوں نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو نعتوں کو ترتیب دیا ہے۔ خورشید ربانی صاحب نے اپنے اس نعتیہ انتخاب میں کافی عرصہ صرف کیا ہے۔ بہت عرق ریزی اور چھان بین کرنے کے بعد وہ اپنے مدونہ انتخاب کو منظر عام پر لائے ہیں۔ انہوں نے حد درجہ کوشش کی کہ اُن کا یہ پیش کردہ نعتیہ انتخاب موسومہ ”اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو نعت“ ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ اور یہ متعینہ دور کے کسی نعت گو شاعر کے تذکرے سے تہی نہ رہ جائے۔ سو، الحمد للہ وہ اس سعی مقدسہ میں مکمل کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

جناب خورشید ربانی اردو نعت گوئی کے سلسلے میں امام احمد رضا خانؒ کی خدمات کو بے بدل قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ انہوں نے جس وارفتگی، محبت و عقیدت اور قلبی وابستگی سے نعت کہی وہ انہی

کا حصہ ہے۔ اُن کی کہی ہوئی کئی ایک نعتیں آج بھی ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ حضور نبی کریم کی شانِ اقدس میں امام احمد رضا خانؒ کے سلام ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ کو تو دنیا بھر میں بے پناہ مقبولیت نصیب ہوئی۔

امام احمد رضا خانؒ نے نعت گوئی میں جو رنگِ سخن متعارف کرایا موجودہ عہد کی نعت میں بھی اُس کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ امام صاحب موصوف کے علاوہ اس دور میں امیر مینائی، ڈاکٹر علامہ محمد اقبال، حالی، مولانا شبلی، اسماعیل میرٹھی، مولانا ظفر علی خاں، حفیظ جالندھری، مفتی غلام سرور لاہوری وغیرہم نے بھی نعت گوئی کی تاریخ بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اور اپنے اپنے حصے کو خوب نبھایا۔

اُن کے اس درخشاں مجموعے میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے وقت متعدد ایسے شاعر موجود تھے جو صرف نعت گو کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ اُن میں ضیاء القادری، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی، اکبر وارثی، احسان دانش، شورش کاشمیری، محشر رسول نگری، وحیدہ نسیم، اور اسد ملتان سمیت دیگر کئی ایک نامور شعرا کے اسماء گرامی کا تذکرہ بھی بڑے اہتمام سے ملتا ہے۔

اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں تخلیقی تسلسل اور فنی ارتقا کے لحاظ سے نعت گوئی کا عمل کسی طرح تشنہ نہیں رہا۔

جناب خورشید ربانی نے اپنے لاجواب انتخاب کو متعینہ دور کے مشہور و معروف نعت گو شعراء سے خوب تر مزین کیا ہے اُن میں عبدالعزیز خالد، ادیب رائے پوری، سرور کیفی، حفیظ تائب، مظفر وارثی، سید ریاض الدین سہروردی، بشیر حسین ناظم، راجا رشید محمود، امین راحت چغتائی، اعجاز رحمانی، ریاض حسین چوہدری، قیصر نجفی، عابد سعید عابد، راغب مراد آبادی، ڈاکٹر ریاض مجید، ماجد خلیل، عاصی کرناٹی، خالد احمد، ڈاکٹر خورشید رضوی، افتخار عارف، پیر سید نصیر الدین نصیر، گستاخ بخاری، صبیح رحمانی، احمد ندیم قاسمی، ابو الخیر کشفی، ریاض ندیم نیازی، نورین طلعت عروبہ اور رفیع الدین راز وغیرہم کے ناموں کو اہم مقام حاصل ہے۔ اور ناموں کی بدولت ایک درخشاں کہکشاں آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

جناب خورشید ربانی کے اس فقید المثال نعتیہ انتخاب بعنوان جلی ”اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو نعت“ میں مندرجہ بالا شعراء گرامی سمیت دیگر جن شعراء حضرات کا ذکر اور اُن کا نعتیہ کلام نمونے کے طور پر شامل کیا گیا ہے اُن میں کوئی بھی نو آموز شاعر نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام شعراء حضرات کی شعری ریاضت میں ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ اس لیے انہیں بلاشبہ ”اسناد کے چوکھٹے“ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

محترم خورشید ربانی کی زیر تبصرہ تخلیق پر نوید میں کسی قسم کا کوئی تعصب نہیں پایا جاتا۔ کیوں کہ اس میں ہر مسلک کے شعرائے گرامی کو شامل کر کے ایک غیر متنازعہ دستاویز کے درجے پر پہنچا دیا گیا ہے۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اس نگارش مقدسہ یعنی نعتیہ انتخاب ”اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو نعت“ کو یونیورسٹی کی سطح پر کم از کم ماسٹر یعنی ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کر کے صاحبانِ اہل حکم ایک اہم دینی خدمت انجام دینے کے ساتھ ساتھ حضور رسولِ مقبولؐ کی بارگاہِ رسالت میں بھی سرخرو ہوں گے۔

خورشید ربانی کا یہ انتہائی اعلیٰ و ارفع نعتیہ انتخاب ”اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں اردو نعت“ ایک عام یعنی سطحی سی کاوشِ قلم نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے اور ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے خواہش مند طلباء اور طالبات کے لیے یہ ذخیرہ علمی ایک انتہائی مؤثر حوالے کے طور پر کام آسکے گا۔ یہ حوالے کی ایک عمدہ ترین کتاب ہے جسے مطالعاتی اشغال کی پذیرائی کی غرض سے مستند تعلیمی اداروں کی لائبریریوں کی زینت بنانا چاہیے۔ اس طرح اس کتاب کی اشاعت کا مقصد حقیقی بار آور ہو سے گا۔



اردو نعت میں تجلیاتِ سیرت..... ایک مطالعہ

ABSTRACT:

Sabih Rehmani has compiled a book containing 8 articles of different writers. All the articles comprise of couplets having fragrance of high and most unmatched good character of human being possessed by Prophet Muhammad (S.A.W). The text contains beauty of poetic expression with light of true reflection of essence of character of Muhammad (S.A.W) and commentaries of authors of articles therein. The article presented here is an introduction of Sabih Rehmani's book.

واہ واہ! سبحان اللہ! عزیزی صبیحِ رحمانی کے ذہن رسا کو دادِ دینی پڑتی ہے کہ موصوف نے نعت کے بحرِ زخار میں بھی تجلیاتِ سیرت کے جزیرے تلاش کر لیے اور پھر بادِ بانِ محبت سجا کر سفینہ ہستی کو موجِ درموج ساحل آشنا کرتے چلے گئے۔

اب تو زمانہ گزر گیا کہ نعت ہی ان کا اوڑھنا اور بچھونا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سالہا سال کی محنت و مشقت کے بعد آنجناب میدانِ نعت میں ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دے چکے ہیں کہ دنیائے شعر و سخن میں انھیں اعتبار حاصل ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نعت جو پہلے کبھی شعرا اپنے دیوان کی ابتداء میں محض تبرکاً شامل کر لیا کرتے تھے اور گا ہے بگا ہے اپنے عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے کچھ نہ کچھ کر لیا کرتے تھے اب انھیں ایک بھرپور ماحول میسر آ گیا ہے چناں چہ پوری شعوری کوششوں کے ساتھ اس صنفِ سخن کو پائیدہ و تابندہ بنا رہے ہیں چناں چہ نعت اب علم و فن سے آگے بڑھ کر ایک تحریک اور عز و قارِ سخن کا باعث بن چکی ہے اور سب کی پسندیدہ بھی۔

عزیز موصوف کی زیرِ نظر کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے تو انھوں نے مجموعہ ہائے نعت میں سے جہانِ سیرت کو تلاش کیا اور اب اسے ”نارتخت“ سے مزین کر رہے ہیں تاکہ عروض و قوافی کے

پیانوں میں اسناد و استناد کا رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہو جائے۔ چنانچہ نعت کے تبلیغی کردار یا اس کے ذریعہ اخلاقی اقدار کا پرچار اور اسوۂ حسنہ کی بہار اپنی جگہ اب ان کے پیش نظر یہ ہے کہ منظوم سیرت نگاری سے الگ بیان سیرت کی ایک نئی جہت پیکر سخن میں آراستہ ہو جائے اور دل و نگاہ کو محبت و مسرت سے سرشار کر دے۔ شاید اسی مقصد سے موجودہ کاوش کے تحت انھوں نے نعت اور سیرت کے تاریخی حوالوں سے بھرپور ایسے آٹھ مضامین کا انتخاب کیا ہے جو نہ صرف یہ کہ معیاری ہیں بلکہ ان میں شامل منتخب اشعار قاری کو تسکین قلب و نظر سے متمتع کر سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے فاضل مرتب نے نعت و سیرت کے مطالعہ کی ایک نئی جہت اور نئی پیشکش کا اہتمام کر کے نعت کے وسیع و عریض میدان میں محبت کی فراوانی کو دوام بخشا ہے اس کے لیے جناب مرتب مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب ہذا کی ترتیب و تدوین بڑے سلیقے سے کی گئی ہے اس کی نمایاں خوبی ایک تو یہ ہے کہ جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے وہ علمی فکری تحقیقی شان لیے ہوئے ہیں۔ زبان و بیان عمدہ، نکتہ شناسی سے آراستہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ انتخاب مضامین میں معنویت پیدا کرنے کے لیے واقعات سیرت کی تاریخی ترتیب برقرار رکھی گئی ہے جس کے سبب ایک قاری صرف لطف کلام سے ہی متمتع نہیں ہوتا بلکہ ایک دلکش پس منظر کے ساتھ ایک مربوط تاریخ سے بھی بہرہ ور ہوتا چلا جاتا ہے بنا بریں ہر نکتہ کی تشریح کے لیے نعت کی نظموں اور غزلوں میں سے بہترین اشعار کا انتخاب احوال و آثار کی تصویر سامنے لے آتا ہے یہاں تک کہ پڑھنے والے کو ذہنی آسودگی ہی میسر نہیں آتی بلکہ کلام اس کے فہم و شعور کو بھی جلا بخشتا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے ”ظہور قدسی کا پس منظر“ بیان کیا گیا ہے تاکہ ابتدا میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود مسعود کی آمد متحقق ہو جائے اور یہ اہمیت بھی واضح ہو جائے کہ آنحضورؐ کی ذات گرامی ہم مسلمانوں پر ہی اللہ رب العالمین کا احسان عظیم نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے باعث ہدایت اور موجب رحمت و برکت ہے اور روئے زمین پر آج تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اجمل، احسن اور اکمل انسان ظہور پذیر ہوا ہے اور نہ آئندہ ہوگا یہ حقائق منتخبہ اشعار میں نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں مثلاً:

ترے آستان سے پہلے کوئی آستان نہیں تھا وہ زمیں تھا میں کہ جس کا کوئی آسمان نہیں تھا
تو جوازِ دو جہاں ہے تو ہی رازِ کن فکاں ہے تو کہاں کہاں نہیں ہے تو کہاں کہاں نہیں تھا
(سلیم گیلانی)

یہ ایک مستقل تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے جزیرۃ العرب

اردو نعت میں تجلیات و سیرت ایک مطالعہ

کی اخلاقی، فکری، سیاسی، سماجی اور مذہبی صورت حال انتہائی دگرگوں تھی اور صرف عرب میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہر اعتبار سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور مکمل تاریکی ایسی رات کی مانند ہو گئی تھی جس کے بعد ایک ”سراج منیر“ کا طلوع اور ایک ”رحمتہ للعالمین“ کی آمد ناگزیر ہو چکی تھی:

عرب کی سرزمین پر خیمہ زن گہرا اندھیرا تھا
غرض دنیا میں چاروں سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا

جہاں تک کام آتی تھی نظر ظلمت کا ڈیرا تھا

نشانِ نور گم تھا اور ظلمت کا بسیرا تھا

(جگن ناتھ آزاد)

گلشن میں روشنی نہ بیاباں میں روشنی

قلبِ حزیں نہ ذہن پریشاں میں روشنی

بزمِ طرب نہ کلبہٗ احزاں میں روشنی

انساں بھٹک رہا تھا اندھیرے حصار میں

(عارف سیماہی)

جملہ مذاہب عالم کی حقیقی تعلیمات مسخ ہو چکی تھیں۔ نظریہ توحید آتش پرستی اور بت پرستی کے نرغہ میں تھا آسمانی ہدایات فراموش، مذہبی فرقوں کی فراوانی، کفر و شرک کے پجاری بہ افراط، بت تراشی اور مجسمہ سازی مستقل فن، زمانہ کا چلن بن چکی تھی۔ لوگ آخرت میں اعمال کی جواب دہی سے بے نیاز تھے۔ آگ، سورج، جن، فرشتے اور چاند، ستارے معبود قرار دیئے جا چکے تھے۔ عبادت گاہیں عیاشوں کے اڈے تھے، معاشرہ اعتدال اور حسن توازن سے محروم ظہر الفساد فی البر والبحر کی مکمل تصویر بن چکی تھی چناں چہ:

انتہا بن کر جو آیا ابتدا بھی تھا وہی

اس کی خاطر روشنی کے دائرے کھینچے گئے

تاکہ دنیا سیکھ جائے احترامِ انتظار

(صہبا اختر)

اپنی مخلوق پر رحم آہی گیا

پرچمِ عدل و احساں اٹھائے ہوئے

عشق کو جن کے دل کی شریعت کہیں

وہ حبیبِ خدا احمدِ مجتبیٰ!

ان پہ پیہم سلام ان پہ دائمِ درود

(صبحِ رحمانی)

نقطہٴ آغاز بھی اور ارتقاء بھی تھا وہی

پیشوائی کو ہزاروں انبیاء بھیجے گئے

اس لیے آخر میں آیا وہ حبیبِ کردگار

ایسے عالم میں رب تعالیٰ کو پھر

تاجِ رحمت کو سر پہ سجائے ہوئے

وہ جو آئے تو عہدِ بہار آگیا

ذکر کو جن کے جاں کی عبادت کہیں

ان پر قرباں ہمارے تمہارے وجود

تاریخی ترتیب کے اعتبار سے پہلا مرحلہ چوں کہ ”ظہور قدسی کا پس منظر“ تھا۔ اس لیے دوسرے مرحلے میں ”ظہور قدسی“ کا بیان گویا منطقی اور لازمی تھا۔ ظہور قدسی کا باب (ص ۳۸ سے ص ۸۸) تک پھیلا ہوا ہے اور اس میں بالترتیب صبح سعادت (ص ۵۸) کی دلاویزی، انقلاب عظیم کا وردِ مسعود اور پھر خلاصہ منصب و تعلیم، نشر توحید آپ کی شخصیت مطہرہ اور آپ کے اخلاق مبارکہ کے اوصاف جمیلہ مثلاً رحمت و رافت (ص ۲۴)، خلق عظیم (ص ۶۹)، عدل و مساوات (ص ۷۳)، فقر و غنا (ص ۷۵)، علم و دانش (ص ۷۸)، شجاعت (ص ۸۲)، جود و سخا (ص ۸۴) اور معجزات (ص ۸۵) وغیرہ کی کہکشاں کی تابانی عطا کر رہی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ انتخاب در انتخاب کی مشکلات کے بعد چند اشعار سے ہو سکتا ہے۔

سید الکونین ہے جس کا لقب رحمت دارین ہے جن کا خطاب
جس کی تعلیمات سے برپا ہوا ایک عالمگیر فکری انقلاب

(ضیاء احمد ضیاء)

کعبہ جاں قبلہ قلب و نظر پیدا ہوئے خواجہ کونین شاہ بحر و بر پیدا ہوئے
عارف ارض و سما میر بساط کائنات خیر سے خیر الامم خیر البشر پیدا ہوئے
(احسان دانش)

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ ذرہ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب
(اقبال)

مہر توحید کی ضو اوج شرف کا مہ نو شمع ایجاد کی لو بزم رسالت کا کنول
(محسن کاکوروی)

مظہر رحمت مصدر رافت مخزن شفقت عین عنایت ہے کیا عالی شان محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(کافی)

حسن کی جان ایمان محبت صلی اللہ علیہ وسلم سر تا پا رحمت ہی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
(ماہر القادری)

ترے خلق کو حق نے عظیم کہا ترے خلق کو حق نے جمیل کہا کوئی تجھ سا ہول ہے نہ ہوگا شہا ترے خالق حسن و ملا کی قسم
(احمد رضا خاں)

قول فیصل ہے یہی خلق ہے تیرا قرآن تیری سنت ہے شب تار جہاں میں مشعل
(علیم ناصری)

اردو نعت میں تجلیات و سیرت ایک مطالعہ

ہر قوم ہے شرمندہ احسانِ محمد

اے مردِ خدا عام ہے فیضانِ محمد

(محشر رسول)

پاکِ تری انکشتِ شہادت کا اشارہ

مہتاب کا سینہ ہوا شقِ ہادیِ برحق

(حفظِ تائب)

خورشیدِ فلک آپ ہیں مہتابِ زمیں آپ

تابندہ نظر آپ ہیں فرخندہ جبیں آپ

معیار ہے دنیا کے لیے اسوۂ حسنہ

سرنامہ توحید کے ہیں نقشِ حسیں آپ

(عبدالکریم شمر)

سرمایہ حیات ہے سیرتِ رسول کی

اسرارِ کائنات ہے سیرتِ رسول کی

(ساغر صدیقی)

تخلیقِ کائنات بھی صدقہ حضور کا

ترتیبِ کائنات بھی سرکار سے ہوئی

(منظف وارثی)

کیا مجھ سے بیاں ہوں ترے اوصاف کہ آقا

تو حیطہ امکان و تخیل سے ورا ہے

میں بندہ کج فکر و فرومایہ عالم

تو زینتِ کونین ہے ممدوحِ خدا ہے

(احمد ادیب)

جو اشکِ ندامت مری پلکوں پہ گرا ہے

اے بحرِ کرم وہ ترے جلووں کی عطا ہے

جاری ہے دو عالم میں ترے فیض کا چشمہ

تو بحرِ کرم بحرِ عطا بحرِ سخا ہے

(طاہر سلطانی)

اس طرح جانِ دو عالم ہے دل و جان کے ساتھ

جیسے قرآن ہو خود صاحبِ قرآن کے ساتھ

(صبیح رحمانی)

کتابِ ہذا کی ایک خاص بات جو میرے نزدیک جنابِ صبیحِ رحمانی کی ندرتِ فکر کے ساتھ

ساتھ سلامتی فکر کو بھی ظاہر کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تمام کدو کاوشِ جامعیتِ کبریٰ کی

حامل ہے۔ یہ جامعیت کئی پہلوؤں سے نمایاں ہے مثلاً: انتخابِ مضامین کے تحت موضوعات کی

جامعیت، نمونہ کلام کے انتخاب میں قدیم عہد سے لے کر دورِ حاضر کے کم و بیش تمام قابلِ ذکر شعرا

سے استفادہ۔ اس سلسلہ میں نہ کسی مسلک یا مکتبِ فکر کی رعایت برتی گئی ہے نہ حفظِ مراتب کے

تکلفات کی۔ تمام صاحبانِ فکر و فن اور استادانِ شعر و سخن کی بھرپور نمائندگی برقرار رکھی گئی ہے یہاں

تک کہ فکر ادب اسلامی کے نامور ادیب و شعرا مثلاً ماہر القادری اور نامور ادیب و شاعر اور سیرت نگار جناب نعیم صدیقی، جو اگرچہ اپنی شہرہ آفاق نعت: حضور میں ایک نعت کہوں سو چتا ہوں کیسے کہوں! کے لیے معروف و مشہور ہیں تاہم اس کتاب میں شامل اُن کے دو شعر مشاعرہ لوٹنے والے ہیں۔ ادب، تہذیب، سلیقہ اظہار، صورت و آہنگ، مضمون کی وسعت، جذب و روانی، قافیہ پیمائی، بندش اور ندرت بیان کو خود ملاحظہ کر لیجیے:

ادب، انکسار، غنا، حیا، غم حشر، صدق و صفا، دعا
جو یہ سات رنگ ہوئے بہم تری شخصیت کی بنی دھنک
ترے سب زماں ترا کل مکاں ترے مہر و مہ تری کہکشاں
تو ادھر سے اٹھ تو ادھر سے آ تو یہاں چمک تو وہاں دمک

(نعیم صدیقی)

جامعیت کی اسی قبیل سے عاصی کرنا لی کی تجنیس، صوتی، نغمگی، روانی، برجستگی سے بھرپور نعت قابل ذکر حیثیت رکھتی ہے:

اب نغمہ نغمہ، نغمہ تارِ حیات ہے	اب نشہ نشہ، نشہ عرفان ذات ہے
اب پردہ پردہ، پردہ سازِ جمال ہے	اب بادہ بادہ، بادہ عرفان حال ہے
اب جرعه جرعه، جرعه جامِ الست ہے	اب ذرہ ذرہ، ذرہ خورشید مست ہے
اب قطرہ قطرہ، قطرہ اشکِ نیاز ہے	اب توبہ توبہ، توبہ سوز و گداز ہے
اب غنچہ غنچہ، غنچہ زلفِ نگار ہے	اب لالہ لالہ، لالہ رخسارِ یار ہے
اب جلوہ جلوہ، جلوہ سروِ سخن ہوا	اب خندہ خندہ، خندہ صبحِ چمن ہوا
اب جذبہ جذبہ، جذبہ عشقِ رسول ہے	اب شیوہ شیوہ، شیوہ عدل و اصول ہے
اب نعرہ نعرہ، نعرہ توحید بن گیا	اب سجدہ سجدہ، سجدہ امید بن گیا

اور سب سے آخر میں بالکل غیر متوقع طور پر رحمن کیانی جیسے بے باک، صاحب سیف و قلم، شاعر رزم و بزم کے کلام سے انتخاب بڑا خوشگوار تاثر مرتب کرتا ہے۔ رحمن کیانی اگرچہ رزمیہ نعت کے بانی، نقیب ملت بیضا کی حیثیت سے بالکل منفرد رنگ و آہنگ رکھتے ہیں اور بقول خود ان کے ”جس کی زباں اور بیاں اور سخن اور“ کے ساتھ ساتھ نبی الملاحم، انا النبی لا کذب، حب رسول اور پیغمبر اسلام جیسے نعتیہ کلام کے خالق ہیں اور جن کا کام بقول جناب حفیظ جالندھری ”ایک سچے مسلمان کا ہے“ اور

اردو نعت میں تجلیات سیرت..... ایک مطالعہ

فاتبعونی بحبیبکم اللہ کے زیر عنوان نعت کا جو اقتباس زیر نظر کتاب کی زینت ہے شاعر کے اخلاص ولہیت اور جذب دروں کا عکاس ہے:

شرط ایماں مصطفیٰ سے والہانہ پیار ہے
ہر قدم اقراء سے اکملت لکم تک راہ میں
پیار لیکن پیروی ہے پیروی دشوار ہے
زہر ہے زنداں ہے مقتل ہے صلیب و دار ہے
جس کو دیکھو ان کا دیوانہ سر بازار ہے
مجزہ سب سے نمایاں سید الابرار کا
آپ کی بے داغ سیرت بے خطا کردار ہے
حسن صورت و سیرت کی حامل اس ضخیم کتاب میں جامعیت کی آخری دلیل کلام شاعرات سے
انتخاب ہے جو قدرے تشنہ معلوم ہوتا ہے۔ جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں ایک جگہ تہنیت النساء بیگم
تہنیت کے دو اشعار نمائندگی کر رہے ہیں:

کوئی خالی ہاتھ اُن کے در سے نہ آیا
کرو تہنیت قصد طیبہ یہ کہہ کر
عجب بخت والے ہیں واں جانے والے
نہیں لوٹ کر اب کے ہم آنے والے

جب کہ ایک دوسرے مقام پر محترمہ ادا جعفری کا محض ایک شعر درج ہے:

ہادی بھی آپ نازِ ہدایت بھی آپ ہیں
صادق بھی اور یقین صداقت بھی آپ ہیں

محترمہ ادا جعفری ایک بزرگ شاعرہ ہیں جنہیں ”اردو شاعری کی خاتون اول“ کہا جاتا ہے۔
[افسوس کہ ابھی حال ہی میں ۹۱ سالہ بھرپور زندگی گزار کر ہمیں داغ مفارقت (۱۳ مارچ ۲۰۱۵ء)
دے گئی ہیں] یہ خاکسار جناب مرتب کی اجازت حاصل کیے بغیر مناسب سمجھتا ہے کہ ذیل میں ان
کے نذرانہ عقیدت کے دو اور نمونے ہدیہ قارئین کر دیے جائیں:

جب نگاہوں میں ہونکھوں کی سی خوتب انھیں سوچنا
دردِ محراب جاں، آنکھ ہو با وضوتب انھیں سوچنا
روشنی کے حوالوں سے لکھنا وہ اسم جمالِ بشر
بارش رنگ ہو پھول ہوں چار سوتب انھیں سوچنا
جن کا مداح ہے خالق دو جہاں، مالک ہر مکاں
حرف سے ماورا ہو سکے گفتگو تب انھیں سوچنا
اب ستارے مژہ پر نہ رک پائیں گے ہے یہ شہر نبی
کھکشاں جب ہو زیر قدم چار سوتب انھیں سوچنا

وہ محیطِ کرم وہ نویدِ عطا مجھ سے دل نے کہا
ڈھونڈنی ہو اگر دشت میں آجوتب انھیں سوچنا

.....

ذکر ان کا ابھی ہو بھی نہ پایا ہے زباں سے
اس دل میں اجالے اتر آئے ہیں کہاں سے
لوں سانس بھی آہستہ کہ یہ جائے ادب ہے
تحریر کروں اسمِ نبی ہدیہ جاں سے
کرنیں ہی چمک جائیں اسی حجرہ دل میں
تم ان کو پکارو تو حضور دل و جاں سے
ہر دور کی امید ہے ہر عہد کا پیغام
پہچان ہے ان کی نہ زمیں سے نہ زماں سے

مختصر یہ کہ ”اردو نعت میں تجلیاتِ حیرت“ سے بھرپور یہ کتاب اب آپ کے سامنے ہے مجھے
پسند ہے اور مجھے امید ہے کہ اس نئی پبلکیشن سے آپ بھی متاثر ہوں گے اور اس وقیع کام پر جناب صبح
رحمائی کو دعائیں دیں گے۔

✽✽

کراچی کا دبستانِ نعت..... ایک مطالعہ

ABSTRACT:

Karachi ka Dabistaan-e-Naat has been introduced in this article. Manzar Aarfi possesses insight that requires for writing anthology besides highlighting distinguished features of Karachi School of Poetic sensibility. This documentary contains biographical sketches of poets with specimens of poetry in genre of Naat. Manzar Aarfi has consulted collections of Poetry of individual poets and other anthologies to present biographical information in an authentic manner. This work is a good blend of literary history, criticism and life sketches of poets who wrote devotional poetry in praise of Prophet Muhammad (S.A.W) under influence of poetic school of Karachi.

میرے پیش نظر کراچی کے ایک فعال شاعر منظر عارفی کے ایک ضخیم تذکرہ بعنوان ”کراچی کا دبستانِ نعت“ (کراچی کے صاحبِ مجموعہ نعت نگار) کا مسودہ ہے۔ اس تذکرے میں 250 صاحبِ مجموعہ نعت نگاروں کی ایک نعت کے علاوہ نعت نگار کے قدرے مفصل سوانحی حالات کے علاوہ اس کا طرزِ بیان، اسلوب اور آرا بھی شامل ہیں اور اس طرح یہ کتاب تذکرے کے ساتھ ساتھ نعت نگاروں کے بارے میں کافی معلومات بھی فراہم کرتی ہے۔ تذکرہ نگاری ایک بہت ہی دقت طلب کام ہے کیونکہ تذکرہ نگار کو تذکرہ کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہیں ہوتی ہے، مرحوم افراد کی مفصل اور مستند معلومات کا ملنا تو ویسے ہی بہت مشکل ہوتا ہے چاہے کہ باحیات افراد کے بارے میں بھی مستند معلومات نہیں ملتی ہے کہ خود لوگ اپنے بارے میں بتانے میں صادق نہیں ہوتے ہیں ایسی صورت میں تذکرہ نگاروں کے کام یا تو غیر مکمل ہیں یا ان میں بہت سی خامی رہ گئی ہیں اس لیے ایک مفصل اور مستند تذکرہ لکھنے میں بے پناہ مشکلات دیکھتے ہوئے اکثر تذکرہ نگار اس کام کو چوم کر چھوڑ دیتے ہیں اور جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں ناکافی معلومات، غیر معیاری تخلیقات اور غلط اندراج

اور غیر مستند حالات ہیں مگر کچھ کے لیے میں یہ کہوں گا کہ اس میں تذکرہ نگاروں کا بھی قصور نہیں ہے، انھوں نے بہت کوششیں کی اور کامیاب نہیں ہوئے۔ البتہ کچھ نے سہل اندازی برتی اور بس چند احباب کا ذکر کرنا تھا سو ایک تذکرہ لکھ دیا، کچھ نے اپنے تذکرے میں ہاشما کو بھر کر اسے غیر معیاری اور غیر مستند بھی بنا دیا حالاں کہ تذکرے لکھنے کے لیے کسی صاحب تذکرہ کا مجموعہ، رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات، کسی رسائل میں ان کا گوشہ یا نمبر یا پھر کسی دوسرے تذکروں میں ان کا ذکر ڈھونڈ کر تذکرہ کسی حد تک مکمل کیا جاسکتا ہے۔ یہ کام حقیقت میں بہت جاں سوزی کا کام ہے، ہاں اگر کسی کے مجموعے میں ہی سوانحی حالات نہ ہوں یا کسی تذکرے میں اس کا ذکر نہ ہو تو مجبوری ہے، اگر صاحب مجموعہ حیات ہیں تو پھر یہ مشکل کافی حد تک آسان ہو جاتی ہے، مرحوم ہونے کی صورت میں یہ کمی رہ جاتی ہے مگر میں نے مذکورہ تذکرہ دیکھا تو مجھے یہ خوشگوار حیرت ہوئی کہ منظر عارفی نے ان تمام ۲۵۰ صاحب مجموعہ نعت نگاروں کا تذکرہ بڑے بھرپور انداز میں کیا ہے اور ان کے تذکرے میں ایک دو نہیں کئی کئی حوالے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کام نہ دنوں کا ہے نہ مہینوں کا بلکہ ایسے تذکرے دو چار برس میں مکمل ہوتے ہیں، منظر عارفی بہت فعال اور بہت متحرک شخص ہیں، ایک تو ان کی فعالیت اور پھر ان کی خوش نصیبی کہ انھوں نے ان تمام مشکلات کی آسانی کے لیے صبح رحمانی کی لائبریری سے بھرپور استفادہ کیا جہاں شعراء کرام کے نعتیہ مجموعے اور نعت کے حوالے سے کئی رسائل، کئی تذکرے اور کئی کتابیں وافر انداز میں مہیا ہیں۔ اس طرح بہت کم وقت میں یہ کام پایہ تکمیل تک پہنچا ہے۔ یہ تذکرہ کراچی کے صاحب مجموعہ نعت نگاروں کا ایک جامع تذکرہ ہے اور اس تذکرہ کی دوسری خوبی یہ بھی ہے کہ اس تذکرے میں جو نعت نگار ہیں وہ نعت کے علاوہ غزلیں، نظمیں اور دیگر اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں اس طرح یہ خالصتاً نعت کہنے والوں کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ان شعراء کرام کا تذکرہ ہے جن کے نعتیہ مجموعے کے ساتھ ساتھ شعری مجموعے بھی منظر عام پر آئے ہیں یوں یہ تذکرہ نعت نگاروں کے حوالے ہی سے نہیں بلکہ سخن وروں کے حوالے سے بھی بہت کارآمد تذکرہ ہے۔

اردو ادب کا دامن بہت وسیع ہے، اس کی کئی اصناف ہیں اور اس میں کئی موضوعات ہیں۔ ہر صنف میں بے شمار اور ہر موضوع پر لاتعداد کتابیں ہیں، رسائل ہیں اور ان سب پر تذکرے بھی ہیں۔ تذکروں میں شعراء کے تذکرے، ادبا کے تذکرے، مرثیہ نگاروں کے تذکرے، نعت نگاروں کے تذکرے، حمد نگاروں کے تذکرے، افسانہ نگاروں کے تذکرے، مزاح نگاروں کے تذکرے غرض کے اردو ادب کی ہر صنف سے تعلق رکھنے والوں کے تذکرے موجود ہیں۔ یہ تذکرے کس حد تک سود

مند ہیں اور اردو ادب میں ان تذکروں کے کیا فوائد ہیں اس پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔
یہ جو تذکرے ہوتے ہیں یہ دراصل سوانح، ادبی تنقید اور تاریخ کی اساس ہوتے ہیں، ان
تذکروں کو کسی حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان تذکروں ہی سے اردو زبان اور ادب کی
ارتقائی منزلوں کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:

”اردو شعرا کے تذکروں کو ادبی تنقید، سوانح اور تاریخ کی اساس خیال کرنا
چاہیے۔ ان تذکروں کو نظر انداز کر کے نہ تو ہم اردو زبان و ادب کی ارتقائی
منزلوں کا سراغ لگا سکتے ہیں اور نہ اس کے ماضی، حال اور مستقبل میں کوئی
رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کلاسیکل شاعری اور ادب دونوں کے متعلق آج
ہم جو کچھ جانتے ہیں انھیں تذکروں کے توسط سے جانتے ہیں اور آئندہ بھی
ادبی تاریخ و تنقید یا تحقیق و سوانح نگاری کا کوئی کام ان قدیم ماخذات سے
یکسر بے نیاز رہ کر نہیں کیا جاسکتا۔ تذکروں کی یہی وہ اہمیت ہے جو کسی
ادیب یا ناقد کو ان کے تفصیلی مطالعہ پر اکساتی بھی ہے اور مجبور بھی کرتی
ہے۔“

یہ تذکرے اسی لیے مرتب کیے جاتے ہیں تاکہ حال کے طالب علم اور آئندہ کے محقق ان
تذکروں کی مدد سے اس دور کے اردو ادب کے ارتقا کا جائزہ بہ آسانی لے سکیں۔ ان تذکروں سے نہ
صرف اردو ادب کی مسلسل رفتار کا پتہ چلتا ہے بلکہ بہت سے ایسے شعراء کرام جو اپنے درویشانہ مزاج
کے مطابق ادب کے منظر نامے میں نظر نہیں آتے مگر ان کے مجموعے کی اشاعت کی وجہ سے اپنے دور
میں زندہ رہ جاتے ہیں، ان تذکروں کی وجہ سے وہ تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

تذکرہ نویسی کی ابتدا کب ہوئی، کس زبان میں ہوئی اور کس موضوع پر ہوئی یہ سب باتیں تو
بہت تفصیل طلب ہیں جو اس مقدمے کے لیے بہت طویل ہو جائے گی۔ ہمیں تو صرف اردو زبان
کے شعرا کے تذکروں پر بات کرنی ہے مگر چونکہ اردو سخن کا منبع فارسی ادبیات سے نکلا ہے اس لیے یہ
بتانے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ فارسی شعرا کا پہلا تذکرہ ”لباب الالباب“ ہے اور پہلا فارسی کا تذکرہ
نگار محمد غوثی ہے۔ تذکرہ لباب الالباب ۶۱۷ھ سے ۶۱۸ھ کے درمیان تکمیل کو پہنچا اور اس کی دو
جلدیں اور بارہ ابواب ہیں۔

یہ معلوم کرنا کہ اردو شعراء کا پہلا تذکرہ کب لکھا گیا اور کس نے لکھا؟ اس کے بارے میں

ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

”اب رہا یہ سوال اردو شعرا کا پہلا تذکرہ کب لکھا گیا اور کس نے لکھا؟ ان سوالوں کا حتمی جواب ذرا مشکل ہے۔ قدیم تذکروں کے مطالعے سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اردو میں تذکرہ نگاری کا رواج میر اور درد کے عہد ہی سے ہو گیا تھا اور بعض معاصرین مثلاً محمد یار خاں خاکسار، رفیع الدین سودا، سراج الدین علی خاں آرزو اور سید امام الدین وغیرہ نے اردو شعرا کے تذکرے بھی مرتب کیے تھے لیکن وہ دست برد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چونکہ یہ تذکرے آج ناپید و نایاب ہیں اس لیے ان کے آغاز و انجام یا نوعیت و کیفیت کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ ہاں قدیم ترین دستیاب تذکروں کو سامنے رکھ کر ان کی تقدیم و تاخیر کا تعین کیا جاسکتا ہے۔ اردو کے قدیم ترین تذکروں میں مندرجہ ذیل کے نام لیے جاسکتے ہیں:

i۔ ”نکات الشعراء“ از: میر تقی میر، مولفہ ۱۱۶۵ھ

ii۔ ”گلشن گفتار“ از: حمید اورنگ آبادی، مولفہ ۱۱۶۵ھ

iii۔ ”تحفۃ الشعراء“ از: افضل بیگ قاقشال، مولفہ ۱۱۶۵ھ

iv۔ ”ریختہ گویاں“ از: فتح علی حسینی گردیزی، مولفہ ۱۱۶۶ھ

v۔ ”مخزن نکات“ از: قیام الدین قائم، مولفہ ۱۱۶۸ھ

مجھے ان تذکروں پر بھی اظہار خیال کرنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بھی بہت تفصیل طلب تذکرہ ہے اور یہاں قدرے غیر ضروری البتہ تذکرہ نگاری کے محرکات پر بات کی جاسکتی ہے۔ مثلاً تذکرہ نگاری کا اولین محرک بھی انسان کا وہی فطری جذبہ ہے جو اپنے بعد اپنی ایسی یادگار چھوڑ جانا چاہتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام تا قیامت دعاؤں کے ساتھ لیا جائے اور وہ زندہ جاوید ہو جائے۔ انتخاب اشعار یا بیاض نگاری کا شوق بھی اس کا دوسرا بڑا محرک ہے۔

تیسرا محرک اس تذکرے کو ترقی دینے کا یہ ہے کہ شعراء کی معاصرانہ چشمک، باہم رقابت، گروہ بندی اور علاقائی تعصب کو ہوا دینا ہے۔

اردو شعرا کی تذکرہ نگاری کے آغاز و ارتقا کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری فرماتے ہیں:

اردو شعرا کی تذکرہ نگاری کا آغاز تقریباً اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے

ہوتا ہے اور ”آب حیات“ مولفہ ۱۸۸۰ء تک برابر قائم رہتا ہے اس کے بعد حقیقتاً تذکرہ نگاری کا دور ختم ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ مغرب کے زیر اثر تنقید، تاریخ اور سوانح نگاری لے لیتی ہے۔ خود آب حیات طرز قدیم کے تذکروں سے بالکل مختلف چیز ہے اس میں اردو زبان کی تاریخ، لسانی مسائل، مختلف ادوار کی خصوصیات اور شعراء کی شخصیت و کلام پر رائے زنی کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے جو تاریخ و سوانح کا خاصا ہونا چاہیے چنانچہ اردو زبان و ادب کے تقریباً سارے ناقدین آب حیات کو اردو ادب کی پہلی تاریخی و تنقیدی کتاب خیال کرتے ہیں۔“ ۳

اس کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری آب حیات کی طرز پر لکھے گئے کئی تذکروں کا ذکر کرتے ہیں جن میں چند یہ ہیں: ”آثار الشعراء ہنود“، ”جلوۂ خضر“، ”یادگار ضیغم“، ”آثار الشعراء“، ”آب بقا“، تذکرے شعراء دکن ”بہار سخن“ وغیرہم۔

تذکروں کے بارے میں جیسا کہ اوپر بیان ہے کہ تنقید، سوانح اور تاریخ کے ساتھ مرتب کیے جاتے ہیں مگر ان تذکروں پر ایک عمومی تبصرہ بھی کیا گیا ہے اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان لکھتے ہیں: ”تذکروں پر عمومی تبصرہ کے طور پر ”دنیاۓ تذکرہ“ کے نام سے افسر امر و ہوی صاحب کا بھی ایک مضمون فاضل زیدی کے توسط سے ہمیں دیکھنے کو ملا ہے۔ اس مضمون میں اردو، فارسی کے شعراء کے تذکروں، گلدستوں، بیاضوں، شعری مجموعوں اور سوانحی و تاریخی کتابوں پر ملا جلا سرسری تبصرہ کیا گیا ہے لیکن اس میں نہ کوئی تاریخی ترتیب یا توقیت ملحوظ رکھی گئی ہے اور نہ تذکرہ نگاری کے ادوار یا عہد متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ابتدا سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کی ایسی متعدد مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کے نام اس میں آ گئے ہیں جو فارسی یا اردو ادب سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتی ہیں بلکہ اس مضمون سے بعض ایسی کتابوں کا سراغ بھی مل جاتا ہے جو مضمون کی اشاعت کے وقت زیر ترتیب یا زیر تکمیل تھیں۔“ ۴

اردو تذکروں میں بھی ایک ہی غرض پر لکھے جانے کے باوجود بڑی رنگارنگی ہے۔ اس بارے میں یہ اقتباس دیکھیے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری بتاتے ہیں:

”اردو تذکروں میں بھی بڑی رنگارنگی ہے۔ بظاہر وہ ایک ہی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی ان کا تنقیدی اسلوب اور تحسینی لب و لہجہ بھی ایک

سا ہے یہ بھی صحیح ہے کہ ان میں بعض ایک دوسرے کے جواب یا تقلید میں لکھے گئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بعض نے دوسرے تذکروں کا مواد بہ ادنیٰ تفسیر اپنا لیا ہے اس کے باوجود ان تذکروں میں اکتا دینے والی یکساںگی و یک رنگی نہیں ہے، مؤلف کے مزاج، تبحر علمی، انداز تحریر، علاقہ، ماحول، عہد اور مقامیت کا انفرادی رنگ ان تذکروں میں کم و بیش نظر آتا ہے۔ اس لیے ان تذکروں میں یکساںگی کے باوجود حد فاصل قائم کرنا کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ ان کی ہیئت و موضوع کو نظر میں رکھ کر ہمارے ناقدین نے انہیں مختلف خانوں میں تقسیم کیا ہے۔

محی الدین زور مرحوم نے مصنفین کی نوعیت کا لحاظ رکھ کر اردو تذکروں کی تین خاص قسمیں کی ہیں:

- i۔ وہ جو کسی بڑے شاعر کے نتیجہ قلم ہیں۔
 - ii۔ وہ جن کے مصنف خود بڑے شاعر نہیں لیکن بڑے شاعر کے گرویدہ شاگرد تھے۔
 - iii۔ وہ جن کے مصنفین کو سخن گو نہیں بلکہ سخن فہم کہنا چاہیے۔
- تذکروں کی تاریخ و تعارف کے بعد تذکروں کی معنوی حیثیت و اہمیت پر بھی ایک نظر ڈال لیں تو بات بہت واضح ہو جائے گی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کہتے ہیں:
- ”اب اگر ہم تذکروں کے قدیم و جدید ناقدین کی رایوں پر بیک وقت نظر ڈالیں اور تذکروں پر کڑی سے کڑی تنقید کو جائز رکھیں تو زیادہ سے زیادہ ان پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں:

- i۔ تذکروں میں حالات زندگی عموماً بہت مختصر اور انتخابات کلام اکثر طویل ہیں۔
- ii۔ سوانح اور شاعر کے انداز سخن گوئی کے سلسلے میں تقریباً سب نے ایک ہی روشن اختیار کی ہے۔
- iii۔ شاعروں کے حالات میں ان کے سال پیدائش و وفات اور عمر و عہد کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔

iv۔ ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر سے یا بعض اشعار کئی کئی شاعروں سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔

v۔ اکثر تذکروں پر ایک دوسرے کی تقلید کا اثر نمایاں ہے اور تازگی و ندرت بہت کم نظر آتی ہے۔

vi۔ شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنائع لفظی و معنوی کو اہمیت دی گئی ہے اور حسب ضرورت ان کو ظاہر کیا گیا ہے۔

vii۔ اکثر طرف داری سے کام لیا گیا ہے اور شعر کی تعریف و تنقیص ذاتی تعلقات کی بنا پر کی گئی ہے۔

viii۔ تنقیدی لب و لہجہ پر جوش اخلاقی غالب ہے اور عموماً سب کو اچھے الفاظ میں یاد کیا گیا ہے۔ زندوں کو دارزی عمر کی دعا دی گئی ہے اور متوفین کو مغفرت کی۔

ix۔ اکثر شعراء کے اسلوب و سلیقہ شعر کے لیے مبہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے شاعر کی حیثیت واضح نہیں ہوتی۔

لیکن ان خامیوں کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔“ ۶

اب ہم بات کرتے ہیں کراچی کے اہل قلم پر مرتب کیے ہوئے تذکروں کی تقسیم ہند سے پہلے کراچی کی حیثیت و اہمیت اس قدر نہیں تھی جتنی آزادی کے بعد ہوئی کیونکہ تقسیم ہند کے بعد جو یہ کہا گیا کہ پورا ہندوستان اجڑا تو کراچی آباد ہوا، اس میں سرمو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ ہندوستان کے قابل ترین اور اجل شخصیات میں سے بہت سوں نے کراچی کا رخ کیا اور پھر ابتدا میں اس کو پاکستان کا دارالحکومت بنانے کے منصوبے نے تو کراچی کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کر دیا۔ یہ الگ بات کہ چند ہی برسوں میں کراچی سے اس کا یہ اعزاز چھین لیا گیا مگر کراچی میں جو صاحبانِ باکمال آ گئے تھے انھوں نے پھر اسی شہر کو اپنا وطن بنا لیا اور اس کے گیسو سنوارنے میں شبانہ روز مصروفِ عمل ہو گئے۔ کراچی میں شعراء و ادبا کی بھی ایک بڑی تعداد ہجرت کر کے آئی تھی اور کراچی تقسیم کے بعد علم و ادب کا ایک بڑا مرکز بن گیا تھا۔ کراچی میں کراچی کے قلمکاروں کا پہلا تذکرہ کس نے اور کب لکھا اس پر تو میں نے تحقیق نہیں کی مگر یہ بتا سکتا ہوں کہ ۱۹۵۲ء میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے بڑے صاحبزادے مظہر صدیقی نے ”شعرستان“ کے نام سے ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جس میں کراچی کے بھی اہل قلم شامل ہیں، دوسرا تذکرہ ۱۹۶۱ء میں بعنوان ”تذکرہ شاعرات پاکستان“ شفیق بریلوی نے لکھا تھا جس میں کراچی کے علاوہ پاکستان کی شاعرات کا بھی تذکرہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے قبل کوئی ایسا تذکرہ لکھا گیا ہو جو صرف کراچی کے اہل قلم کے بارے میں ہو جو میرے علم میں نہ ہو۔ اس تذکرے کے علاوہ دیگر تذکرے یہ ہیں جن میں کراچی کے سخن ور بھی شامل ہیں۔

۱۔ ”تذکرہ شاعرات پاکستان“ از: شفیق بریلوی، ۱۹۶۱ء

ii۔ ”تذکرہ نعت گو شاعرات“ از: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری سن ندارد

iii۔ ”پھول بن“ از: سکندر نامی، ۱۹۸۲ء

iv۔ ”نخن ور“ از: سلطانہ مہر، جلد ۱، ۱۹۸۰ء (نخن ور کے نام سے مزید جلدیں با ترتیب) جلد ۲،

۱۹۹۶ء، جلد ۳، ۱۹۹۸ء، جلد ۴، ۲۰۰۳ء، جلد ۵، ۲۰۰۴ء

v۔ ”محراب معانی“ از: سید آفاق جعفری، ۱۹۸۸ء

vi۔ ”سفیران نخن“ از: شاعر علی شاعر، ۲۰۰۸ء

یہ وہ تذکرے ہیں جن کے لکھنے والے تو کراچی کے باشندے ہیں مگر انھوں نے اپنے تذکروں میں کراچی کے علاوہ پاکستان بھر سے اہل قلم کا تذکرہ کیا ہے۔ صرف کراچی کے اہل قلم پر تذکرہ نگار یہ ہیں:

i۔ ”دبستان کراچی کے ممتاز شعراء“، صبا ضیائی/نعیم الحق، ۱۹۹۰ء

ii۔ ”دبستانوں کا دبستان کراچی“، احمد حسین صدیقی، جلد اول (۲۰۰۳ء)، جلد ۲ (اگست ۲۰۰۵ء)

جلد ۳ (۲۰۱۰ء)، جلد ۴ (۲۰۱۳ء)

iii۔ ”سفیران نخن“ (۱۹ شعراء کراچی) شاعر علی شاعر، ۲۰۰۵ء

ایک دو تذکرے اور بھی ہو سکتے ہیں جو فی الحال میری دسترس میں نہیں ہیں۔

کراچی کے شعراء پر ایک تذکرہ ”دبستان کراچی“ کے نام سے راقم الحروف ۱۹۸۰ء سے مرتب کر رہا تھا جس زمانے میں کراچی میں بزرگ اور نامور شعراء کی کہکشاں آباد تھی۔ ان کی تصویر، ان کے مختصر ترین کوائف، ان کے کلام پر چند سطری رائے اور ایک غزل پر یہ تذکرہ کامل دس برس تک جمع کرتا رہا بعد میں اس کام کو چھوڑ دیا چھوڑنے کی دو وجہ تھی پہلی تو یہ کہ میرا تذکرہ جوان دس برسوں میں خاصا جمع ہو گیا تھا اس کی اشاعت نہیں ہو سکی دوسری وجہ عہد حاضر کے بیشتر شاعرات و شاعر کے نخن ور ہونے کا کوئی مستند و معتبر حوالہ نہیں ہے جس کی وجہ سے اس سلسلے کو بند کر دیا۔

اب تذکرہ ہو جائے منظر عارفی کے پیش نظر تذکرے ”کراچی کا دبستان نعت“ (کراچی کے صاحب مجموعہ نعت نگار) کا۔ اس مضمون میں ابتدا میں تذکرے کی تاریخ، تذکرے کی اہمیت و افادیت، تذکرے کے محرکات اور تذکرے کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر ہوا ہے، ان سب کو پیش نظر رکھ کر میں نے جب اس تذکرے کو دیکھا تو مجھے تو سب سے بڑی خوبی جو نظر آئی وہ یہ ہے کہ اس میں تذکرہ نگار نے بڑی محنت سے صاحب کتاب کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں، ان معلومات

میں نعت نگار کا سوانحی خاکہ بھی بہت حد تک مفصل ہے، نعت نگار کے کلام پر تجزیہ، تبصرہ اور تنقید بھی بھرپور ہے اور نعت بھی خوب دیکھ بھال کر لگائی گئی ہے، تذکرے میں کلام کا انتخاب بہت معنی رکھتا ہے پھر اس کی کتابت میں عموماً کمی بیشی سے کلام کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ ان سب باتوں کے لیے تذکرہ نگار کو ایک دو نہیں بلکہ دس سے پندرہ کتابوں سے رجوع کرنا پڑا ہے۔ ان کتابوں، تذکروں اور بیاضوں سے اس خوبصورتی سے اقتباس اخذ کر کے مضمون تیار کیا ہے کہ یہ خود ایک مختصر سا مقالہ بن گیا ہے جو حواشی سے مزین ہے۔ میرے پاس بہت سے قدیم اور جدید تذکرے ہیں مگر اس طرح کا شعراء کے بارے میں بھرپور تذکرہ کوئی نہیں ہے، سلطانہ مہر نے اپنے تذکرہ منظوم و منثور (”سخن ور“ اور ”گفتنی“) میں شعراء و ادبا کے بھرپور تذکرے دیے ہیں مگر یہ تذکرے دراصل ایک سوال نامے پر مبنی ہیں جو سلطانہ مہر نے سب کو دیے اور انھوں نے جس قدر اور جس طرح لکھ دیا، زیب قرطاس بن گیا۔ یہ طریقہ تذکرہ نویسی کے لیے سب سے اہم ماخذ ہوتا ہے کہ جس کا تذکرہ لکھا جا رہا ہے وہی ساری تفصیلات بہم پہنچا رہا ہے اس لیے اس میں کسی کمی یا خامی کا احتمال نہیں ہے یہ الگ بات ہے کہ اپنے بارے میں یہ اطلاعات بہم پہنچانے والا ہی اگر غلط بیانی کرے یا عدم معلومات کا شکار ہو جائے۔

منظر عارفی نے کسی نعت نگار سے کوئی اطلاع حاصل نہیں کی، ان کے پیش نظر پہلے نعت نگاروں کے مجموعے تھے، اس میں سے ان کے بارے میں جتنی معلومات ملی انھیں جمع کیا پھر ان میں سے بیشتر کا ذکر دوسرے تذکروں میں بھی آیا ہے، وہاں سے حاصل کیا، کچھ نعت نگاروں پر رسائل کے نمبر نکلے ہیں یہ دستاویز بھی بڑے کام کی ہوتی ہے، غرض کہ منظر عارفی نے نعت نگاروں کے تذکرے کے لیے ہر ممکنہ ماخذات کو پیش نظر رکھا اور پھر ان تمام ماخذات سے ایک بھرپور تذکرہ مرتب کیا۔ یہ بہت جاں سوز کام ہے، بہت دقت طلب اور بہت پتہ مارنے کا کام ہے، اس کو وہی کر سکتا ہے جس میں سلیقے سے کام کرنے کی لگن، جستجو اور شوق و ذوق ہو، منظر عارفی نے بہت ہی اچھے انداز میں ہر نعت نگار کا تذکرہ کیا ہے جو اب تک کے تمام تذکروں میں بھرپور ہے۔

اس تذکرے سے نعت نگاروں کے بارے میں اس کی سوانح، اسلوب، زبان و بیان، طرز ادائیگی اور اس کا مقام و مرتبہ سب ہی کچھ آ گیا ہے۔ اس سے آئندہ کے تذکرہ نگاروں کے لیے جس قدر کام سہل ہو گیا ہے اس کا انداز اس تذکرے کو دیکھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس تذکرے کو الفبائی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے اور اب یہ ترتیب ہی سب سے بہتر اور تمام الزامات سے بچنے کے لیے

آسان ہے اگرچہ اسے تخلص کے لحاظ سے مرتب کیا جاتا ہے جس سے تھوڑی سی تکلیف یہ ہوتی ہے کہ نامور بزرگ ترین اور مشاق و بزرگ شاعر اور استاد اپنے تخلص کی وجہ سے نوآموزوں کے بعد جگہ پاتے ہیں مگر ماضی میں ہر طرح کی ترتیب کر کے دیکھ لی کسی میں بھی اتفاق حاصل نہ ہو سکا یہ الفبائی ترتیب ہی کو اکثریت نے منظور کر لیا ہے اس لیے یہی ترتیب افضل ہے۔ رہی بات بزرگ اور نومشتق شعراء کے امتیاز کی تو جو شعروادب میں رہتے ہیں ان کو سب کے مقام و مرتبے کا علم ہے۔

اس تذکرے کا خیال تو صبیح رحمانی کو آیا ہے، صبیح رحمانی نعت کے حوالے سے کئی جہتوں پر تذکرے مرتب کر بھی رہے ہیں اور کرا بھی رہے ہیں، یہ تذکرہ منظر عارفی سے مرتب کرانے میں صبیح رحمانی کا بڑا حصہ ہے۔ میں دونوں کے لیے دعا گو ہوں۔

ۛۛۛ

حواشی

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، تذکروں کا تذکرہ نمبر، ص ۷، نگار پاکستان، سالنامہ مئی جون ۱۹۶۳ء

۲۔ ایضاً، ص ۱۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۲

۴۔ ایضاً، ص ۲۶

۵۔ ایضاً، ص ۲۸

۶۔ ایضاً، ص ۳۱

کس کو معلوم ہے یہ کون بتا سکتا ہے
ذہن خلاق میں تھا کب سے سراپا تیرا

(احسان دانش)

ایوانِ مدحت

سوال یہ کہ ہو تعریفِ مصطفیٰ کیسے
جواب یہ کہ ہو محوِ ثنا خدا جیسے
(اسماعیل انیس)

وَسَلَّمَ
صَلَّى اللہُ

قصیدہ

ابتر تھی فضا تیرگیءِ جہل تھی چھائی
ہر ذہن میں وہ بغض و عداوت کا دھواں تھا
وہ رات کے پردے میں دہلتے ہوئے انجم
دھبے تھے کدر و ت کے ہر آئینہ دل پر
ہر ذہن پہ وہ نشہٴ نخوت تھا مُسلط
دُختر کو دبا آتے تھے زندہ ہی زمیں میں
انسان بکا کرتا تھا انسان کے ہاتھوں
زیبائش محفل تھے کھٹکتے ہوئے ساغر
محفوظ نہ تھی عفت و عصمت کسی صورت
انسان کا انسان لہو چوس رہا تھا
یوں دل میں بے رہتے تھے افعالِ قبیحہ
وہ اپنا مددگار سمجھتے تھے بتوں کو
عزّیٰ تھا خداوند کہیں لات و ہبل تھا
ناواقفِ آدابِ تمدّن تھا ہر اک دل
لایا جو کوئی قافلہ اسبابِ تجارت
وہ جبر کے نعموں سے فضا گونج رہی تھی
اس طرح جکڑ رکھا تھا زنجیرِ ستم نے
دیتے تھے عجب طرح غلاموں کو اذیت
تھا فخرِ رعونت پہ انہیں نازبدی پر
خود اپنی ہی تعریف میں پڑھتے تھے قصیدے

ناواقفِ اسرارِ محبت تھی خدائی
جاری تھی ہمہ وقت قبیلوں میں لڑائی
دشمن نظر آتا تھا جہاں بھائی کا بھائی
دشوار نظر آتی تھی باطن کی صفائی
ہر شخص کو درکار تھی اپنی ہی بڑائی
نادان سمجھتے تھے برائی کو بھلائی
تھی گردنِ مفلس پہ رواں تیغِ طلائی
رقصاں تھا سرِ راہِ طربِ حُسنِ خفائی
تھا جامِ بکفِ بزم میں ہر دستِ حنائی
کہتے ہیں جسے سُود وہ تھی اُن کی کمائی
جیسے کسی تالاب کے پانی پہ ہو کائی
انسانوں کے ذہنوں پہ تھی پتھر کی خدائی
تھے اُن کی نگاہوں میں یہی ان کے روائی
جائز تھی انہیں لوٹ، جوا، سود، گدائی
سب ٹوٹ پڑے اس پہ لٹیروں کی بن آئی
مظلوم کی آواز نہ دیتی تھی سُنائی
مشکل تھی درِ عدل پہ انساں کی رسائی
حق بات کوئی کہہ دے تو مارتا تھا دہن آئی
گبڑی جو کہیں بات تو تلوار اُٹھائی
کرتے تھے بڑے فخر سے خود اپنی بڑائی

گفتار میں تلخی تھی تو لہجے میں تکبر
 اُبھرا افتِ ذہن پہ اک مطلعِ دلکش
 بدلی وہ فضا رحمت حق جوش میں آئی
 منسوب ہوا نامِ محمد سے وہی نور
 چمکا دیا دنیا کو اسی نورِ مبیں نے
 چہروں سے برسنے لگے انوارِ یقیں کے
 بندوں کو خبردار کیا عظمتِ رب سے
 وہ جس نے یتیموں کو کلیجے سے لگایا
 بندوں کو جھکایا درِ معبود پہ جس نے
 انسانوں کو اخلاق کا خوگر کیا جس نے
 وہ جس نے اجڑتی ہوئی دنیا کو سنوارا
 انسان کو آدابِ تمدن کے سکھائے
 اس شان سے پیغامِ اخوت دیا جس نے
 تبدیل کیے ذہنِ برائی کی طرف سے
 وہ ذاتِ گرامی جسے اللہ نوازے
 وہ ہادیِ گلِ ختمِ رسل شافعِ محشر
 وہ صاحبِ الطاف و عطا بانیءِ اکرام
 وہ جس کا ہر اک قول ہے گنجینہٗ حکمت
 وہ دلبرِ حق سرورِ کونین کہ جس کے
 وہ جس کو کہیں سید و محمود و مبشر
 یسّیں بھی ہوٹکے بھی ہو صادق بھی امیں بھی
 کرتا ہوں فدا ختمِ قصیدے کو دعا پر

آخر یہ روشِ اُن کی مشیت کونہ بھائی
 رخشندہ و تابندہ و پُر نور و ضیائی
 ظلمت میں کرن پھوٹی پئے راہنمائی
 تنویرِ ہدایت متشکلِ نظر آئی
 چھائی ہوئی سب تیرگیءِ جہل مٹائی
 ایمان سے ہونے لگی قلوب کی صفائی
 گردنِ ستم و جور سے انساں کی چھڑائی
 دی جس نے غلاموں کو غلامی سے رہائی
 وہ راہنما جس نے رہِ راست دکھائی
 وہ حُسن جو عریاں تھا کیا اس کو ردائی
 وہ جس نے بگڑتی ہوئی تقدیر بنائی
 کس طرح جیا کرتے ہیں یہ بات بتائی
 انصار و مہاجر نظر آنے لگے بھائی
 نفرت رہی باقی نہ عداوت نہ لڑائی
 وہ جس کے لیے محفلِ کونین سجائی
 حاصل جسے تاعرشِ معلیٰ ہے رسائی
 شرمندہٗ احسانِ کرم جس کی خدائی
 وہ جس کی ہر اک بات میں پوشیدہ بھلائی
 جبریل امیں در پہ کریں ناصیہ سائی
 وہ پیکرِ عظمت دے جسے زیب بڑائی
 حیران ہوں کیا اس کی کروں مدح سرائی
 اللہ درِ سرورِ دیں تک ہو رسائی

(فدا خالدي دہلوی)

ﷺ
صلی اللہ

دین و دنیا کی قیادت آپ کو بخشی گئی
جس سے پائیں گی ہدایت تا ابد اقوام دہر
اولیت کا شرف بخشا گیا تخلیق میں
وصف سب پیغمبروں کے آپ میں یکجا ہوئے
مسکراہٹ سے کھل اٹھتے تھے درود یوار بھی
زیست کا ہر شعبہ جس سے نور پائے گا سدا
زندگی کو کر دیا جس نے لطافت آشنا
جو پہنچتی ہی رہے گی سب عوالم تک مدام
آپ کا ہر لفظ ہے معجز نما و دل کشا
ہوتے مرعوب اک مہینے کی مسافت سے عدو
آپ ہی کے فیض سے سدی زمیں ہے سجدہ گاہ
ہر گھڑی ایقان حضرت کا بھرم رکھا گیا
ہو گیا مال غنیمت آپ کی خاطر حلال
شر مساری سے بچا لیتی تھی جو مجرم کو بھی
منحصر عصیل شعلوں کی ہے جس پر مغفرت
اپنی امت کے لیے ہوں گے نہ کیوں وہ فکر مند
بعد محشر بھی نہ آئے گا جسے تا رب زوال

زندگی افروز دعوت آپ کو بخشی گئی
ایسی بے پایاں رسالت آپ کو بخشی گئی
عزت ختم نبوت آپ کو بخشی گئی
سب رسولوں کی امامت آپ کو بخشی گئی
ایسی جاں افروز صورت آپ کو بخشی گئی
وہ سراپا حسن، سیرت آپ کو بخشی گئی
سادگی میں وہ نفاست آپ کو بخشی گئی
ایسی لامحدود رحمت آپ کو بخشی گئی
کچھ عجب روح بلاغت آپ کو بخشی گئی
قدرتی جاہ و جالت آپ کو بخشی گئی
ایسی عالمگیر وسعت آپ کو بخشی گئی
ہر قدم پر فتح و نصرت آپ کو بخشی گئی
فقر میں ہر ایک نعمت آپ کو بخشی گئی
چشم پوشی کی وہ عادت آپ کو بخشی گئی
ایسی توفیق شفاعت آپ کو بخشی گئی
جب خدائی کی محبت آپ کو بخشی گئی
ایسی شان بے نہایت آپ کو بخشی گئی

(حفظ تا رب)

وَعَلَىٰ آلِهِ
صَلَّىٰ اللَّهُ

بختِ سیاہ جب درِ عالی پہ رکھ دیا
سورج اُنہوں نے دستِ سواہی پہ رکھ دیا

آنکھیں بکھیر آیا ہوں روضے کے ہر طرف
لیکن خیالِ روضے کی جالی پہ رکھ دیا

لبریز کر گیا مجھے کون اپنے پیار سے
یہ کس نے ہونٹِ دل کی پیالی پہ رکھ دیا

مانگے تھے میں نے آپ سے رحمت کے چند پھول
سارا چمن دُعاؤں کی ڈالی پہ رکھ دیا

مجھ کو بٹھایا جانبِ ساحل کی ناؤ پر
بارِ گناہ ، ڈوبنے والی پہ رکھ دیا

لکھنے چلا جو نعت تو میرے حضور نے
لفظوں کا ڈھیر ذہن کی تھالی پہ رکھ دیا

آہنگِ نو میں مظفر نہ کیوں کہے
کھلتا شعور خشک خیالی پہ رکھ دیا

(مظفر وارثی)



آپ سے پہلے جہانِ خشک و تر کچھ اور تھا
آپ کے آتے ہی عالم سر بسر کچھ اور تھا

نورِ درِ آغوش یوں تو روز ہوتی تھی سحر
آپ جب آئے تو اندازِ سحر کچھ اور تھا

بدوؤں کو کر گئی جو آشنا تہذیب سے
وہ نظر کچھ اور اسلوبِ نظر کچھ اور تھا

ایک لمحے میں سمٹ آئے مکان و لامکان
سائرِ اسراء کا اندازِ سفر کچھ اور تھا

طورِ سینا پر تجلی کا تھا عالم اور کچھ
ارضِ طیبہ میں تجلی کا اثر کچھ اور تھا

جب تک اُن کے آستانِ پاک پر پہنچا نہ تھا
میری نظروں میں جمالِ سب در کچھ اور تھا

باوضو آنکھیں ہوئیں اور دل ہوا محوِ درود
راہِ طیبہ میں ابھی میرا سفر کچھ اور تھا

دشمنِ جاں نے بھی پائی جس کے سائے میں اماں
رازِ ان کا سائبان در گزر کچھ اور تھا

(رازِ کاشمیری)



میں اپنے شام و سحر تیرے نام کرتا ہوں
کہ وقت کوئی ہو تجھ سے کلام کرتا ہوں!

ترے حروف کی رو رہنمائی کرتی ہے
میں زندگی کا سفر یوں تمام کرتا ہوں!

ترے جلو میں حدیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں
ازل ابد سے ادھر بھی خرام کرتا ہوں!

تری نوا میں ہے فردوسِ گوش کی تفسیر
تری حدیث سے حاصلِ دوام کرتا ہوں!

شرف ملا ہے اسے تیرے پاؤں چھونے کا
میں آسمان کا بھی احترام کرتا ہوں!

وہ لمحہ جو کہ تری یاد سے تہی گزرے
میں اپنے آپ پر اس کو حرام کرتا ہوں!

جری شناخت کا یارا نہیں مجھے پھر بھی
میں تیری رفعتِ جاں کو سلام کرتا ہوں!

(عارف عبدالتین)



میں نے درود پاک کا گھر میں دیا جلا دیا

پہلے تو نور ذات نے دل کا دیا جلا دیا
رستہ در حبیب کا چپکے سے پھر دکھا دیا

رب کریم کا کرم، گلشن آرزو میں ہوں
مانگا تھا جس قدر مجھے، اُس سے کہیں سوا دیا

میں تو سنہری جالیاں چوم رہا تھا خواب میں
دل تھا سرور کیف میں، کس نے مجھے جگا دیا

اب نہ اندھیری رات کا ہو گا کبھی گزر ادھر
میں نے درود پاک کا گھر میں دیا جلا دیا

کتنا کرم حضور کا، عجز بیاں ہے، کیا کہوں
در پہ مجھے بلا لیا، مان مرا بڑھا دیا

اُن کی نگاہ لطف سے قلب و نظر میں روشنی
راحت بے نوا کو بھی جینے کا حوصلہ دیا

(امین راحت چغتائی)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ
صَلَّى اللّٰهُ

اپنے بھاگ جگانے والے کیسے ہوں گے
 اُن سے ہاتھ ملانے والے کیسے ہوں گے
 نقشِ قدم میں چاند ستارے بکھرے ہیں
 جادۂ عرش پہ جانے والے کیسے ہوں گے
 چشمِ لطف سے ذرّے، سورج چاند ہوئے
 راہوں میں بچھ جانے والے کیسے ہوں گے
 اشک کے جگنو کالی شب کو نور کریں
 دل میں دیے جلانے والے کیسے ہوں گے
 بھینی بھینی خوشبو سے گھر مہکا ہے
 شب کو خواب میں آنے والے کیسے ہوں گے
 اک اک سانس میں سو سو بار فدا ہونا
 وہ گھر بار لٹانے والے کیسے ہوں گے
 جن کے ناز اٹھانے پر ہو حق کو ناز
 اُن کے ناز اٹھانے والے کیسے ہوں گے
 سدرہ، رُوح القدس کی بھی حد پرواز
 اُس سے آگے جانے والے کیسے ہوں گے
 دردِ محبت دل میں رکھ کر کیا پھرنا!
 درد میں جاں سے جانے والے کیسے ہوں گے
 نعت وہی ہے مسلم جو مقبول ہوئی
 چادرِ خلعت پانے والے کیسے ہوں گے

(ابوالاتیاز۔ ع۔ س، مسلم)

ﷺ

اُس ایک ذات کی توقیر کیا بیاں کیے
وہی ہے مکہ ایماں اگر گماں کیے

نظر کو خیرہ کرے چاندنی میں اک تارا
جو روبرو کبھی تصویرِ آسماں کیے

اُسی کو دیکھے بزمِ ولا میں صدرِ نشیں
اُسی کے اسمِ مبارک کو حرزِ جاں کیے

اُسی سے کہیے کہ ہے سر پہ دھوپِ محشر کی
اُسی کی ذاتِ گرامی کو سائباں کیے

وہ دل کی سمت جو آئیں تو اپنی آنکھوں کو
زمین کیے ، عقیدت کو آسماں کیے

جو دل میں ہے شررِ آرزو بھڑک اُٹھے
اس ایک لفظِ محبت کو داستاں کیے

(توصیفِ تبسم)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

سبیل ہے اور صراط ہے اور روشنی ہے
اک عبدِ مولیٰ صفات ہے اور روشنی ہے

کتاب و کردار ساتھ ہے اور روشنی ہے
درود جزوِ صلوٰۃ ہے اور روشنی ہے

میانِ معبود و عبدِ میثاقِ نور کے بعد
نظر میں بس ایک رات ہے اور روشنی ہے

حضور غارِ حرا سے بیت الشرف میں آئے
بس اک یقین ساتھ ساتھ ہے اور روشنی ہے

حضور مکے سے جا رہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب گلِ کائنات ہے اور روشنی ہے

حضور مکے میں آ رہے ہیں کتاب کے ساتھ
کتاب ہی میں نجات ہے اور روشنی ہے

رفیقِ اعلیٰ کا حکم ہے اور کتاب دائم
ابد تک اب اُن کی ذات ہے اور روشنی ہے

غلامی افتخارِ عارف پہ مہر خاتم
ثبوتِ فردِ نجات ہے اور روشنی ہے

(افتخارِ عارف)



محمد مصطفیٰ نے کس قدر اعجاز فرمایا
 کھڑے ہانوں کو شاہوں کی طرح مٹا دیا فرمایا

عرب کے رگزاروں میں جواہروں کو چراتے تھے
 انھیں دنیا کی سلطانی سے سرفراز فرمایا

کوئی اُن کی مروت کا کرے انکار تو کیوں کر
 جنہوں نے ہر عداوت کو نظر انداز فرمایا

جب اپنے دشمنوں کو بخش دینا غیر ممکن تھا
 حضور پاک نے اس رسم کا آغاز فرمایا

وہ انساں قتل و غارت میں درندوں سے جو بڑھ کر تھا
 اُسی کو آپ نے انسان کا دماز فرمایا

جو اہل فلسفہ کی عقل کی سرحد سے باہر تھا
 عرب کے ایک اُمی نے عیاں وہ راز فرمایا

اُنہی کے واسطے یہ محفل هستی مَزین ہے
 خدا نے اک بشر کا کس قدر اعزاز فرمایا

کسی انساں کی عظمت اس سے بڑھ کر کیا ہولے بڑی
 خدا نے آپ کے اخلاق پر خود ناز فرمایا

(خالد بزمی)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ
وَالْآلِ
وَالْحَمْدُ
لِلَّهِ

یوں پردہ رازِ گن ہوا چاک
کاؤ امنِ قبل فی ضلالِ
احسان کیا خدا نے ہم پر
مبعوث کیا رسولِ موعود
دنیا کے لیے وہ عفو و رحمت
کھلتا ہے جو بابِ ذکرِ طائفِ
لب پر تھی دعائے خیر و بخشش
قال: خیرا لقرونِ قرنی
وا جس کے لیے درِ سماوی
زنجیر در اور قابِ قوسین
افسانہ و شعر: لغو و مہمل
افکار ہیں زیرِ دامِ وسواس
یہ طالب لا، وہ صیدِ لا
فرمایا: انا مدینۃ العلم
اس قول کی آگہی دے، یارب
اس قول سے روشنی دے، یارب

لولاک لَمَّا خَلَقْتَ الافلاک
اقوام تمام زیرِ افلاک
روشن کی شمعِ رازِ لولاک
من انفسنا، زکی، صفی، پاک
دنیا مگر اس کے حق میں افاک
ہو جاتی ہے آنکھ آنکھ نمناک
تھا سنگ بہ دستِ شہرِ سفاک
کیا عصر کا پھر کسی کو ادراک
وقت اُس کو بھلا ہو کیسے فتراک
بچ ان کے ہوئے ہیں محو افلاک
منطق ہے فضول، کیمیا: خاک
یعنی ہر فلسفہ ہے کا واک
دل ہے معصوم، ذہن: شکاک
اس قول نے سب فسوں کیے چاک
یہ قول گرہ کشائے پیچاک
یہ قول علوم شرکا تریاک

(سلیم شہزاد)



مل گیا راستہ محمد کا
جا بجا ہے خدا محمد کا

جسم کے تنگ و تار جنگل میں
جل رہا ہے دیا محمد کا

خود بخود اب پہنچ ہی جاتا ہے
دل سے دل تک پتا محمد کا

دیکھنے کو خدائے برتر کو
مل گیا آئینہ محمد کا

ہے ازل سے رہے گا اب قائم
تا ابد سلسلہ محمد کا

ایک ذرے سے آسمانوں تک
نقش ہے جا بجا محمد کا

حرف آخر سے کم نہیں لوگو
اس جہاں میں کہا محمد کا

جو منافق نہیں ہیں اے ماجد
ان کو ہے آسرا محمد کا

(ماجد الباقری)

ﷺ
ﷺ

نعتیہ گیت

مورے مدنی بجن، مورے مدنی بجن
 تم سے لاگی لگن، مورے مدنی بجن
 تمری آمد سے ہی یہ کرشمہ ہوا قلبِ انساں پہ تھا جو لگا کفر کا
 چھٹ گیا وہ گہن، مورے مدنی بجن
 تمرے ہی سر کو تاجِ شفاعت ملا تمرے ہی واسطے بابِ سدرہ کھلا
 تم ہی شاہِ زمن، مورے مدنی بجن
 آسمانوں نے چوما ہے تمرا چرن عطر سے بڑھ کے تمرا لعابِ دہن
 تمرا نوری بدن، مورے مدنی بجن
 تمری چوکھٹ سے ہے نوری سا گروں تمرے صدقے لہکتے ہیں دونوں جہاں
 یہ زمیں، وہ گگن، مورے مدنی بجن
 کب تلک ٹھنڈی ٹھنڈی میں آہیں بھریں تمرے روضے کی میں بھی زیارت کروں
 کر دو ایسا جتن، مورے مدنی بجن
 تم دیالو بڑے ہر کسی کے لیے روزِ محشر تمہیں امتی کے لیے
 ذوالکرم، ذوالہمن، مورے مدنی بجن
 کھل اٹھیں گے مروں کے سارے کنل اپنی چشمِ عنایت سے کر دو سہل
 مورا جیون مرن، مورے مدنی بجن
 چوے تمرے نگر کی رو پہلی زمیں روشنی میں نہائے فراغِ حزیں
 پورے کر دو سپن، مورے مدنی بجن

(فراغ رہووی)



مرے آقا مرے رحیم و کریم
آپ بے مثل، آپ در یتیم

حسن میں بے مثل آپ کی ذات
اور کرم میں کمال آپ کی ذات
آپ ہر وصف میں ہیں سب سے عظیم
آپ بے مثل، آپ در یتیم

آپ اُمی پہ علم آپ پہ بس
قلم سہ کر بھی علم، آپ پہ بس
آپ بعد از خدا علیم و حلیم
آپ بے مثل، آپ در یتیم

وہ تبسم کہ کائنات کی جان
وہ تکلم کہ لفظ چوے زبان
وہ محبت کہ سب دلوں میں مقیم
آپ بے مثل، آپ در یتیم

ہر بھلائی کا ہیں حوالہ آپ
اور اندھیرے میں ہیں اُجالا آپ
آپ رحمت ہیں، سب کو ہے حلیم
آپ بے مثل، آپ در یتیم

(خوشیدناظر)

ﷺ
صلی اللہ

نہ جذبِ دل کسی قابل نہ ہی کچھ ایسی قسمت ہے
مدینے کی جو سچ پوچھو تو بس حسرت ہی حسرت ہے
کہاں میں اور کہاں شہر نگاراں کے گلی کوچے
سمجھتی ہوں جو کچھ خورشید سے ذرے کو نسبت ہے

ملا کر خاک میں خود کو غبارِ راہ کی صورت
جو ممکن ہو پہنچ جاؤں مگر کب اس پہ قدرت ہے

سجا لوں چشمِ پرہیز میں تصور کی حسیں محفل
دلِ مضطر کی تسکین کی یہی بس ایک صورت ہے

وہ پیاری سرزمین اللہ کے محبوب کا مسکن
اسے جاں کے عوض بھی دیکھ لینا عینِ راحت ہے

ہوائیں جس کی بوجھل آپ کی خوشبو سے رہتی ہیں
وہ شہرِ آرزو واللہ! مرے خوابوں کی جنت ہے

سکونِ قلب کی دولت جہاں دن رات لگتی ہے
وہ جس کی خاک اپنی جا سراپا نور و برکت ہے

فروزاں دل میں میرے شمع ساں رہتی ہے جو ہر دم
وہ حسرت وہ لگن جس سے حیات اپنی عبارت ہے

وہ جس کو حاصلِ صد آرزو کہتی ہوں میں طلعت!
وہ پیاری آرزو آقا کے روضے کی زیارت ہے

(طلعت سلیم)



کھڑا ہوں مُنْغَلَبِ آئینۂ احساس کے آگے
اُلجھتے جا رہے ہیں دم بدم جذبات کے دھاگے

چراغِ علم ہاتھوں میں ، قدم راہِ جہالت پر
نہ کیوں اہل نظر ہوں خندہ زن پھر میری حالت پر

جمالِ اسوۂ خیر البشر زیبِ نظر بھی ہے
مگر یہ دل تقاضائے نظر سے بے خبر بھی ہے

ہوائے نفس کے ہاتھوں میں ہے میری عنایاں یارب
کہاں جانا تھا مجھ کو، اور پہنچا ہوں کہاں یارب

عجب خوابوں کے پیچھے شت شب میں بھاگتا ہوں میں
سحر خیزی کے لطف و کیف سے نا آشنا ہوں میں

پلٹ کر دیکھتا ہوں جب گزر گاؤ حیات اپنی
سیہ دھبہ نظر آتی ہے ساری کائنات اپنی

پس زندانِ کرب و یاس ہوں، مجھ کو رہائی دے
ظلامِ ظلم و غفلت میں کہیں، رستہ سجھائی دے

عطا کر مجھ کو ذوقِ بندگی، شوقِ اطاعت دے
متاعِ اتباعِ اسوۂ ذاتِ رسالت دے

جو میرے حق میں بہتر ہے وہ سب مجھ کو عطا کر دے
مرے داتا، مراد امنِ متاعِ خیر سے بھر دے

(حفظ الرحمن احسن)

ﷺ
صلی اللہ

ثنائے ربِ جلیل ہے اور روشنی ہے
نبی کا ذکرِ جمیل ہے اور روشنی ہے
جہاں جہاں بھی حضور اکرم نے پاؤں رکھا
قدم قدم اک دلیل ہے اور روشنی ہے
چہار سو ہے کبوتروں کا حصارِ بیض
سفید سی اک فصیل ہے اور روشنی ہے
حیات کی یاممات کی آزمائشیں ہوں
وہی کفیل و وکیل ہے اور روشنی ہے
وہیں پہنچ کر خدا سے ہوں گے قریب تر ہم
جہاں خدا کا خلیل ہے اور روشنی ہے
میں تشنگی اور تیرگی کا ڈسا ہوا ہوں
وہ میٹھے پانی کی جھیل ہے اور روشنی ہے
حیاتِ احمد کا لمحہ لمحہ ، مرے سفر میں
نفس نفس سنگِ میل ہے اور روشنی ہے
میں ایک کشلول بن کے خیرات کا ہوں طالب
ادھر عطا کی سبیل ہے اور روشنی ہے
اُڑل سے جو موجزن ہے آبِ رواں کی صورت
دروود کا رودِ نیل ہے اور روشنی ہے
نسیم لب پر جو ان کی مدحت کے گل کھلے ہیں
خن کی اک سلسیل ہے اور روشنی ہے

(نسیم سحر)



ازل سے تاقیامت آپ ہی کا سلسلہ ہوگا
 کوئی رُت ہو، صداقت کا یہی اک راستہ ہوگا
 مدینے میں نبی کے دور میں بھی مٹھلیں ہوں گی
 درودوں سے ہمیشہ ہی مدینہ کو بجتا ہوگا
 بڑا ہی دیدنی ہوگا وہ منظر شہر یشرب کا
 کہ جب آقا کی آمد کا اشارہ مل گیا ہوگا
 صدائیں گونجتی ہوں گی دفنوں پر ننھے ہاتھوں کی
 ازل سے بند آنکھوں میں اجالا کھل اٹھا ہوگا
 سنبھالی کس طرح ہوگی خوشی اہل مدینہ نے
 نظر کے سامنے جب روئے پاک مصطفیٰ ہوگا
 نہ جانے کس کے گھرا ترے سواری جانِ رحمت کی
 کہیں آنکھیں پچھی ہوں گی، کہیں پردل بچھا ہوگا
 بتائی جب گئی ہوگی نبی کے نام کی مسجد
 تو طیبہ کی فضاؤں میں عجب اک کیف سا ہوگا
 پھر اپنے نور ہاتھوں سے مرے شاو دو عالم نے
 کہیں مٹی بھری ہوگی، کہیں پتھر پختا ہوگا
 نبی کے نام لیاؤں نے اس مسجد کے آگن میں
 نبی سے ہی سنا ہوگا، نبی نے جو کہا ہوگا

(زاہد فخری)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صَلَّى اللَّهُ

تری طلب کے منیر جذبے نظر نظر میں مچل رہے ہیں
دلوں میں شوقِ وصال کے سیپ کتنی صدیوں سے پل رہے ہیں

افق سے آفاق تک رقم کر کے مغفرت کے کئی صحیفے
ترے کرم ہیں جو میرے عاصی دلوں کی قسمت بدل رہے ہیں

جبینِ شب پر جو کہکشاں لفظ تو نے لکھے، کئی رُتوں میں
ہماری بے نُو ر ساعتوں میں چراغ بن کر وہ جل رہے ہیں

پھر اپنی ہم عصر یاد کوئی مرے زمانے کو بخش آ کر
کہ خود فراموشیوں کے جنگل سروں سے اُونچے نکل رہے ہیں

بصارتوں کو بصیرتوں کی کمک عطا کر، کہ میرے آقا!
ہم ایک اندھے کنوئیں کی جانب بڑی ہی تیزی سے چل رہے ہیں

ہمیں بھی کوئی کرم کالمحہ صبا کی صورت ملے، کہ اب تو
دلوں کے موسم اجازت خواہوں کے زرد سانچوں میں ڈھل رہے ہیں

میں کبھی تیرے شہر گل سے بشارتیں جاوداں رُتوں کی
کہ ہاتھ صرصر کے صحنِ گلشن میں پھول کلیاں مسل رہے ہیں

(محمد فیروز شاہ)

ﷺ

سلام

سلام اے گیسوؤں والے!
تمہارے پاؤں کی ٹھنڈک سے
تپتے ریکڈاروں کے جہنم میں
نشاط و نور کے چشمے ابلتے ہیں
تمہارے پاؤں کی آہٹ سے شب کی تیرگی میں
روشنی کے پھول کھلتے ہیں

سلام اسی لقب والے!
بصیرت پر تمہاری عقل دنیا دنگ ہے اب بھی
تمہارے لفظ و معنی نور کی برسات کرتے ہیں
خدا سے بات کرتے ہیں
کہ اک ٹوٹی چٹائی سے
درو حکمت کے وہ ابواب تم نے کھولے ہیں جس کا
ابد تک ہے کہاں ثانی
سکھائی ساری دنیا کو جہاں بانی

سلام اے شافع محشر
ہماری گردنیں جب بار عصیاں سے جھکی ہوں گی
ہماری آنکھ میں شرمندگی ہوگی
نظر کے سامنے منظر مہیب انداز جب ہوگا
کہ ہر جا عالم نفسی میں جب ہر شخص تھراتا ہوا ہوگا
مگر اک تم

کہ ہونٹوں پر تمہارے
امتی ہی امتی کی اک صدائے شافعی ہوگی
تمہارے لب کی جنبش سے ہماری بخششیں ہوں گی

سلام اے آل پیغمبر
تمہارے بزرگِ اول کا یہ ارفع کرشمہ تھا
جو انگلی کے اشارے چاند دو ٹکڑے ہوا
مگر یہ انتہا تھی
ہماری عورتوں کے دامنِ عفت

جو صدیوں سے ہوا میں ریزہ ریزہ اڑ رہے تھے
ان کے جسموں پر سمٹ آئے،
نئے منظر نکل آئے

غلاموں کو بجز انسان
اپنے رب کے آگے سر جھکانے کی سعادت ہے
در شاہِ نبی کی یہ تو اک زندہ کرامت ہے

سلام اے گیسوؤں والے
سلام امی لقب والے
سلام اے شافعِ محشر
زبانِ نطق عاجز ہے تمہاری مدح میں آقا
زباں کو لفظ، لفظوں کو معانی دو
اطاعت میں تمہاری جو گزر جائے
وہی اب زندگانی دو
سلام اے گیسوؤں والے
سلام اے گیسوؤں والے

(کلیم حازق)



غروب تیرہ شی اور طلوع صبح جمال
تری نظر کا کرشمہ تری جبین کا کمال

فروغ قلب و نظر تیری ایک جھلک لب
بہار قریہ جاں تیری محفلوں کا خیال

فضائے ہمدردیہ متاع ہفت اقلیم
کبھی تھی نہیں لوٹا یہاں سے دس سوال

نظیر لائے کہاں تیری ساعت موجود
نہ لائے ہیں رسولان عہد رفتہ مثال

تمام رفعتیں اُس خاکِ زبرِ پاہِ ثار
تمام عظمتیں وہم و گمان، خواب و خیال

بس رہا ہے تری رحمتوں کا لہِ رواں
گھر رہے ہیں جہاں بھر کے روز و شب مہِ سال

(احسن زیدی)

ﷺ

شفیع محشر، قسیم کوثر درود تم پر سلام تم پر
ہمارے ہادی ہمارے سرور، درود تم پر سلام تم پر

کمالِ انساں، جمالِ قرآن، کتابِ ناطق، رسولِ صادق
نبیِ خاتم، حبیبِ داور درود تم پر سلام تم پر

تمام رحمت تمام رافت ہمہ صداقت ہمہ امانت
ظہیرِ اظہر، منورِ انور درود تم پر سلام تم پر

کرم کی یہ شان یہ نوازش جنھوں نے کی پتھروں کی بارش
دیئے انھیں کو یقیں کے گوہر درود تم پر سلام تم پر

پیامِ امن و سلام لائے مکمل اکمل نظام لائے
حیات کا جاگ اٹھا مقدّر درود تم پر سلام تم پر

دلائے سارے حقوقِ نسواں لیا یتیموں کو زیرِ داماں
الم نصیبوں کے یارو یاور درود تم پر سلام تم پر

چراغِ عشق و یقیں جلانے دلوں کی تاریک بستیوں میں
کیا جنوں کو خرد کا رہبر درود تم پر سلام تم پر

سبق مساوات کا پڑھا کر غرور نسل و وطن مٹا کر
بدل دیئے زندگی کے تیور درود تم پر سلام تم پر

صدیقِ محسن، رفیقِ دانا، کریمِ بھائی، رحیمِ نانا
شفیقِ والد، خلیقِ شوہر درود تم پر سلام تم پر

عمرِ ابوبکرؓ اور عثمانؓ علیؓ و طلحہؓ بلالؓ و سلمانؓ
تمہارے پر تو سے سب منور درود تم پر سلام تم پر

نہ عشرت و عیش کی تمنا نہ عز و جاہ جہاں کا سودا
تمہارے غم پر یہ سب نچھاور درود تم پر سلام تم پر

محمد احمد، حمید حامد، شہید شاہد سعید زاہد
نذیر منذر، مظہر اطہر درود تم پر سلام تم پر

(ابوالمجاہد زاہد)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ
وَالْحَمْدُ لِلَّهِ

(فارسی نعت کا اردو ترجمہ)

درود اس نور پر جس سے ورود انوار نے پایا
تخیر اور محبت سے زمیں ساکت فلک شیدا
نگہ اس فخر نرگس آنکھ والی ماطنی والی
وہ رنگ اس زلف مشکیں کا کہ والیل اذا ینشی
ہر اک سینے میں شوق ان سے دلوں میں زندہ ذوق ان سے
زباں کوئی ہو ذکر اُن کا، کوئی سر ہو وہی سودا
وہی فردوس کی خوشبو معطر اُن سے چاروں سو
کہاں شب رنگ زلف ایسی یوں ہندی تل کہاں مہکا
بیمہ موصوف ذات ایسی کہ خود خالق نے مدحت کی
وہ ہیں تو ہیں سبھی موجود انہی سے نور آنکھوں کا
وہ شان و شوکت یوسف وہی ایوب کی صحت
انہی کا دم مسیحا، عمل ایک اک ید بیضا
صفت ان کہیں طہ اور یسین اور مرمل
وہ عالی شان خود قرآن جنہیں کہتا ہے فضلنا
اسی نام گرامی کے وسیلے کے تصدق میں
ملی آدم کو بخشش اور کنارا نوح نے پایا
وہ راز اس سینے میں جامی پکار انھیں الم تشرح
وہ معراج ان کا تاج احسان سبحان الذی اسری

(احسان اکبر)



صحرا میں اک مہول کھلا تھا ، دیکھا تھا؟
کونہ کونہ گھر مہکا تھا ، دیکھا تھا

دیکھا تھا پیڑوں کو رقص کے عالم میں
پتا پتا جھوم اٹھا تھا ، دیکھا تھا؟

قریب قریب بادل اُمنڈے آئے تھے
آگن آگن مینہ برسا تھا ، دیکھا تھا؟

ٹھنڈا کر ڈالا صدیوں کی آتش کو
بادل سے کوندا اُترا تھا ، دیکھا تھا؟

کس نے زخموں پر شبنم سے ہاتھ رکھے
کون ہمارے بچ آیا تھا ، دیکھا تھا؟

کون تھا جو اپنے لوگوں کی حالت پر
راتوں کو اُٹھ کر روتا تھا ، دیکھا تھا؟

کس نے رستے کی ہر مشکل چن لی تھی
کون اُس بستر پر سویا تھا ، دیکھا تھا؟

نیند فرشتے جب آنکھوں میں اُترے تھے
ایک زمانہ جاگ چکا تھا ، دیکھا تھا؟

(منیر سیفی)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صَلَّى اللَّهُ

میں اپنی ہی تاریکی میں رستہ بُھول گیا
تُو نے تو اُن کو دیکھا تھا اے سورج تُو ہی بتا

کیسے تھے وہ ہونٹ ، وہ سچائی کا سرچشمہ
کیسی تھیں وہ آنکھیں جن میں کوئی غیر نہ تھا

کیسی تھیں وہ زلفیں جن پر آیتیں اُتری تھیں
اپنوں بیگانوں پر جن کا یکساں تھا سایا

ذہن سے ذہن ملائے اُس نے دل سے جوڑے دل
کب دیوار اُٹھائی اس نے ، کب بانٹے دریا

برف پگھلنا بُھول چکی تھی ، ہم غفلت میں تھے
اور پھر ہوتے ہوتے آگ نے جلنا چھوڑ دیا

آنکھیں ریگستان ہوئیں ، مرجھانے لگے ضمیر
جن گلیوں سے روٹھ گئی طیبہ کی آب و ہوا

(غلام محمد قاصر)



جہاں توحید سے نا آشنا تھا آپ سے پہلے
خدا ہر ایک انساں کا جدا تھا آپ سے پہلے

نہ تھا نام و نشان انسان میں اُنس و محبت کا
سراپا شر تھا، انساں اور کیا تھا آپ سے پہلے

حیا مفقود، غیرت سرنگوں، خوف خدا غائب
بہر سو ایک طوفانِ بلا تھا آپ سے پہلے

سمومِ گمراہی عالم پہ اس درجہ مسلط تھی
ہدایت کا دیا گل ہو چکا تھا آپ سے پہلے

نظر آتا تھا ہر جانب جہنم زار کا نقشہ
تصورِ خلد کا اک واہمہ تھا آپ سے پہلے

نکالا آپ نے انسان کو قعر مذلت سے
زمانہ مختلر تھا آپ ہی کا آپ سے پہلے

رو عرقاں دکھائی آپ نے پرواز بندوں کو
بشر جس راستے سے ماورا تھا آپ سے پہلے

(محمد یعقوب پرواز)

وَسَلَّمَ
صَلَّى اللہُ

خُلُقِ کامل

جد امجد کی سنت ہوئی یوں ادا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے
ہو گیا سرد فارس کا آتشکدہ آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

کار فرمائی صحرا میں صرصر کی تھی جیسے بھڑکی ہوئی آگ ہو ہر طرف
اب رحمت کا بس ایک چھینٹا پڑا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

اپنے سینے میں نفرت کی آتش لیے دشمن جاں کی صورت ملا ہر کوئی
آپ کے خُلُقِ کامل کا تھا معجزہ آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

دو پہر تھی ستم کی تمازت بھری ظلم کی اڑتی پھرتی تھیں چنگاریاں
ہو گیا آپ کو حوضِ کوثر عطا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

اک لاواحد کا بھی میدان تھا جس میں بکھرے تھے زخموں سے جلتے بدن
آپ نے اپنی کملی کا سایہ کیا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

فتحِ مکہ کے دن فاتحوں کے لیے آپ نے اک نئی طرزِ ایجاد کی
مکہ والوں کی بخشی گئی ہر خطا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

نوعِ انساں کی فطرت میں شر کے شر کو بچھایا محبت کی برسات سے
ایسا منشورِ انسانیت کو دیا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

جسمِ وجل تیرے منصور تھے کیا بھلا آتشِ ہجر کی زد میں تھی روح تک
سوئے طیبہ جواذنِ سفر مل گیا آگ بجھتی گئی پھول کھلتے گئے

(عارف منصور)

وَسَلَّمَ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
صَلَّى اللَّهُ

مدحت محبوب صمد

کے تحریر کروں مدحت محبوب صمد
تیرے اوصاف کا ہوتا ہے وہاں سے آغاز
تیرا دستور ہے ہر ایک زمانے کے لیے
ہو فضیلت عربی کو عجبی پر کیوں کر
دھر میں تُو نے محبت کا علم لہرایا
آتشیں ریت بھی ایماں پہ نہ غالب آئی
منہ کے بل گر گئے اصنام، صنم خانوں میں
درسِ توحید نے ابلیس کو مایوس کیا
ہو گیا عام زمانے میں چلن نیکی کا
ہوئی آرائش گیسوئے عروس ہستی
ہمنوا طیبہ و بطحا سے ہوئے تیرے سبب
تُو نے ایمان و مساوات کی دولت بانٹی
تُو نے الٹی ہے بساطِ ستم و کذب و ریا
تیرے انصاف کی دیتا ہے گواہی اب تک
خاکِ یثرب کو دیا تُو نے فروغِ انجم
جلوۂ گنبد خضرا ہے نگاہوں کا سرور
تیرے دم سے ہے معطر چمنستانِ خیال
کیا کہے گی مجھے خورشیدِ قیامت کی تپش
آخرت میں مجھے ہمسائیگی مل جائے تری
بارگاہِ صمدی میں یہ دعا ہے میری
تیری مدحت کا شرف مجھ کو ہوا ہے حاصل

نطق عاجز ہے تو قاصر ہیں مرے فہم و خرد
ختم ہوتی ہے جہاں فکر و نظر کی سرحد
تیری نسبت سے ہوئے ایک ازل اور ابد
ہیں برابر ترے منشور میں ابیض، اسود
مٹ گیا سینہ انساں سے ہر اک کینہ و کد
تیرے عاشق کے لبوں پر تھا ہُو اللہ اُحد
عالم شرک پہ اک ضرب تھی تیری آمد
ہوئے ویران سبھی، لات و ہبل کے معبد
اور ناپید ہوئے مکرو دغا، بغض و حسد
چہرہ زیت کے رخشندہ ہوئے خال اور خد
مصر و لاہور و بخارا و دمشق و مشہد
تیرے اخلاق و مروّت نے کیا کفر کا رد
ارضِ ہستی پہ محبت کی بچھائی مسند
خانہ خالق کونین میں سنگِ اسود
رشکِ صد گلشن فردوس ہے تیرا مولد
کیف پرور ہے جہاں کے لیے تیرا مرقد
تجھ سے حاصل ہے مرے دل کو سرور و سرمد
جب بنا میری پنہ گاہ ترا سایہ قد
تیری توصیف بنے میری شفاعت کی سند
مشعلِ نعت سے روشن ہو مرا گنجِ لحد
ہو نہ کیوں کر مرے ہر شعر و سخن میں آمد

(خالد علیم)

ﷺ

کاف کن کا نقطہ آغاز بھی
تا ابد باقی تری آواز بھی
رحمۃ للعالمین تیرا وجود
قادر مطلق کی وجہ ناز بھی
روزِ روشن کی طرح تیری حیات
تو جہاں کا سب سے گہرا راز بھی
ہر دل بیمار کا تو چارہ گر
آدمی کی روح کا نباض بھی
تیرے نغموں نے کیا انسان کو
قدسیانِ عرش کا دمساز بھی
احسنِ تقویم کی برہان تو
آدمیت کے لیے اعزاز بھی
ایک اُمّی رہنما کونین کا
اور قرآنِ سرمدی اعجاز بھی
حق نے جن جن کو کوئی بخشا کمال
ان میں شامل ، ان سے تو ممتاز بھی
نعت میں شرکت کی لے کر آرزو
دست بستہ ہیں کھڑے الفاظ بھی
مستقل اپنا بنا عارف کو تو
نعت گو اور زمزمہ پرداز بھی

(خواجہ محمد عارف)



اُن کی نسبت سے مجھے سارا جہاں جانتا ہے
ورنہ میں کیا ہوں مجھے کوئی کہاں جانتا ہے

آپ کے ذکر نے کس طور نوازا ہے مجھے
یہ تو سرکار مراقب تپاں جانتا ہے

شوق دیدار میں ہوتی ہیں جو سطرین تخلیق
سننے والا انہیں اعجاز بیاں جانتا ہے

ہو عطا اب تو مجھے لطف و کرم کی دولت
آپ کی یاد کو دل راحت جاں جانتا ہے

چار دن جس کو زیارت کے میٹر آجائیں
بزرگنہد کا ، وہ پُر کیف سماں جانتا ہے

دُور طیبہ سے مہ و سال چکانے والا
سر بسر عمر کو اک عہد زیاں جانتا ہے

میری کیفیتیں پنہاں تو نہیں اُس سے رضا
میرا آقا مری ہر آہ و فغاں جانتا ہے

(علی رضا)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی ایک سطر نہ باب ہے
ترے نام پوری کتاب ہے

ترے در پہ جانا طلب مری
تجھے دیکھنا مرا خواب ہے

ہمہ کائنات سوال تھی
ترا انتخاب جواب ہے

(ق)

مرا مدعا ، مرا منتہا
فقط آپ ہی کی جناب ہے

مری تشنگی کے لیے ندی
کوئی اور ہے ، تو سراب ہے

تری مدح پاک کے بحر میں
مری سعی فکر حباب میں

(اقبال کوثر)



کیا ماضی، کیا حال، آئندہ، سب منظر گھل جائیں
ایک نظر سے آپ کی، مجھ پر ساتوں درگھل جائیں

آپ وہ مہر کہ جس کے نور سے ہر ظلمت مٹ جائے
آپ وہ اسم کہ جس کی برکت سے پھر گھل جائیں

اب تو میں بھی اڑ کر پہنچوں آپ کے دروازے پر
مولا! اب تو مجھ پر بستہ کے بھی پر گھل جائیں

پہلے جس کی باتیں سن کر دل کھلتے، ملتے تھے
اب تو اُس واعظ کے وعظ پہ، سینے، سر گھل جائیں

اب تو دن کے نام پہ سائیں! اینوں کی، اینوں پر
بندوقوں کی باڑھ جو رکتی ہے، مخبر گھل جائیں

آپ کرم فرمائیں تو ریت میں ڈھلتے اس رزمی پر
مگر سے سبز زیتوں کے مہکے شام و سحر گھل جائیں

(خادم رزمی)

وَسَلَّمَ
صَلَّى اللّٰهُ

ہم نے یوں احوالِ جاں، پیشِ شہِ اکرم کہا
آنسوؤں سے نعت لکھی، سسکیوں سے غم کہا

تمنائے رُخ پہ اشکوں کی لکیریں نقش تھیں
ہم نے شعلے کی زبانی قصہٴ شبنم کہا

عقل کہتی ہے کہ تم نے ان سے باتیں کیں بہت
عشق کہتا ہے کہ ”جو کچھ بھی کہا، وہ کم کہا“

کس بلیغ انداز میں ساری دعائیں مانگ لیں
دل نے بس اک بار رو کر ”رحمتِ عالم“ کہا

آنکھ کی تختی پہ وہ تو یاد کی تحریر تھی
دیکھنے والوں نے جس کو آنسوؤں کا غم کہا

سارا پتھر پن سفر کا نرمیوں میں ڈھل گیا
ان کی باتوں کو دہانِ زخم نے مرہم کہا

(سید قمر حیدر قمر)



ایمان کا ادراک ، صداقت کا شعور آپ
 ایوانِ شب و روز میں توحید کا نور آپ
 ذات آپ کی دنیا کے لیے باعثِ رحمت
 کونین میں ہیں آئینہٴ شانِ غفور آپ
 تسکین کا پیغام ہیں افسردہ دلوں کو
 کرتے ہیں ہر اک شخص کی تکلیف کو دور آپ
 معراج ہے یہ آپ کے احسان و کرم کی
 کرتے ہیں معاف اپنے عدو کے بھی قصور آپ
 محتاج کو دنیا میں اماں آپ نے دی ہے
 آتے ہیں یتیموں کی مدد کو بھی ضرور آپ
 سکھائے سدا نرمی گفتار کے انداز
 دیتے نہیں دنیا کو کبھی درسِ غرور آپ
 ہو جاتا ہے ہر قلب کو عرفانِ حقیقت
 اس طور سے دیتے ہیں مئے جامِ طہور آپ
 صرف آپ ملے خالقِ ہستی سے سرِ عرش
 ہیں اہلِ نظر کے لیے جلوہ گہرِ طور آپ
 نعت آپ کی پیغامِ سکون ہے دل و جاں کو
 ساقی کو عطا کرتے ہیں سامانِ سرور آپ

(رشید ساقی)

ﷺ

چراغ آگہی جسم نبی ، اسم محمد ہے
نی آشفگی ، خود رنگی ، اسم محمد ہے

یہ عظمت آج کے دن کو ملی ہے عرشِ اعظم سے
کہ وجہ زندگی ، رمز آشتی ، اسم محمد ہے

نشاطِ رنگ و بو میں شادماں ہیں ریت کے ذرے
کہ فرطِ روز و شب رخسندگی اسم محمد ہے

جہیل انسان کی آمد طلوعِ بدر کا عالم
افق پر پھر ظہورِ آدمی اسم محمد ہے

مشیت کا یہ اک اعجاز ہے کونینِ امکاں پر
جو بچ پوچھو تو خود معراج ہی اسم محمد ہے

زمین پر مردِ کامل ، آسماں پر مصحفِ عالم
یہ نازِ بندگی ، یہ زندگی ، اسم محمد ہے

(رشید نثار)



دربدر ہو نہ کہیں مجھ سے کہنگار کی خاک
اے خدا کر دے مجھے کوچہ سرکار کی خاک

خاکروبِ درِ سرکار دو عالم ہوں میں
ڈھونڈ لاؤ تو کہیں سے مرے معیار کی خاک

جشنِ میلادِ نبی میں ہو چراغاں ہر سو
اور ہو جاؤں میں سرکار کے تہوار کی خاک

لگ کے یوں روضہ سرکار سے بٹھار ہوں میں
مجھ پہ ہو سایہ دیوار کہ دیوار کی خاک

ماہ و خورشید تری عرشِ نور دی کے نشاں
کہکشاں تیرے گزرتے ہوئیر ہوار کی خاک

حلقہ سورہ رحمان ہے میرے اطراف
مجھ تک آتی نہیں اڑ کر کسی پندار کی خاک

نو بہ نو مدحتِ سرکار دو عالم کے طفیل
مہک اٹھی ہے رشتی میرے سخن زار کی خاک

(مفرد صدیق رضی)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

رو برو چاروں طرف آپ کا جلوہ ہوتا
میں بھی اے کاش اُسی دور میں پیدا ہوتا

میں بھی ہوتا کہ انھیں دیکھتا رہتا ہر دم
عکس جلوہ مری بینائی میں اترا ہوتا

آپ کے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑا گرد و غبار
وائے حسرت کہ مرے چہرے سے لپٹا ہوتا

پیاس دریاؤں کی لہروں کو بھی شرماتی ہے
کاش اک بار انھیں آنکھ نے دیکھا ہوتا

آپ سے مل کے مجھے دونوں جہاں مل جاتے
آسماں بھی، یہ حسیں چاند بھی میرا ہوتا

(ڈاکٹر محمد اشرف کمال)



فخر پاک و نازش ہندوستان ہے نعت رنگ
 بالیقین اردو زبان کا ترجمان ہے نعت رنگ
 اس سے پہلے آگئی چوبیس پرچوں کی بہار
 خیر سے اس مرتبہ پچیسواں ہے نعت رنگ
 ہو مبارک یہ سعادت اے صبح الدین صبح
 آپ ہی کے عزم و ہمت کا نشان ہے نعت رنگ
 جو رسالے نعت کی ترویج میں مصروف ہیں
 ان رسالوں کا امیر کارواں ہے نعت رنگ
 حضرت حسان بن ثابت سے لے کر آج تک
 نعت گوئی کی مکمل داستان ہے نعت رنگ
 اس کو سینے سے لگاتے ہیں سبھی اہل ادب
 اہل دل کے واسطے اک ارمغان ہے نعت رنگ
 راہ میں حائل ہزاروں مشکلوں کے باوجود
 منزل مقصود کی جانب رواں ہے نعت رنگ
 نامکمل ہی کہا جائے گا وہ اس کے بغیر
 ہے مکمل وہ کتب خانہ جہاں نعت رنگ
 حمد، نعتیں، تبصرے، اعلیٰ مضامین اور خطوط
 اک بجلی خوبصورت کہکشاں ہے نعت رنگ
 سچ جو پوچھو لائق تحسین عزیز احسن بھی ہیں
 جن کی ہمت سے ہمارے درمیاں ہے نعت رنگ
 خیر سے صفحات ہیں اس مرتبہ نو سو پچاس
 کون کہہ سکتا ہے حافظ ناتواں ہے نعت رنگ

(حافظ عبدالغفار حافظ)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

خوشبو کی احتیاط ہے رنگوں کی احتیاط
باغ نبی میں اور ہے پھولوں کی احتیاط

دیکھی ہے میں نے شہر مدینہ میں جس قدر
دیکھی نہیں کہیں بھی وہ سانسوں کی احتیاط

صبحِ ازل سے شامِ ابد دیکھتی رہی
دربارِ مصطفیٰ میں زمانوں کی احتیاط

نعتِ رسولِ پاک لکھا چاہیے مگر
معنی کی احتیاط ہو لفظوں کی احتیاط

(خورشیدِ ربانی)



اُسی کے ذکر نے دل کا مکاں آباد رکھا
یہ کیا کم ہے کہ مجھ سا بے نشاں آباد رکھا

یہ ہم افتادگانِ خاک پر اُس کا کرم تھا
جہاں برباد ہوتا تھا ، وہاں آباد رکھا

بہت بے اعتباری کا سفر تھا، پھر بھی اُس نے
سردشتِ طلبِ اک آستان آباد رکھا

وہ معراج ساتوں آسمان تھے نور افشاں
زمین پر بھی جلوںِ اخترِ آباد رکھا

اُسی کے فیض سے اب تک ستادہ ہیں زمیں پر
کہ جس نے سر پہ نیلا آسمان آباد رکھا

(حسن عباس رضا)

وَسَلَامٌ
عَلَيْهِ

بُجھے دلوں میں یقینِ سحرِ سلامت ہے
کہ اسمِ پاک ترا صبح کی علامت ہے

کجی سے دُور رہی تیرے گلستاں کی بہار
کہ تیرے باغ کا ہر نخل سروِ قامت ہے

وہ اب ہوں کوچہ طائف کہ شام کے بازار
ترے لہو کا تقاضا ہی استقامت ہے

تو وہ چراغ جو نورِ ازل سے روشن ہے
تو وہ حدوث کہ جس کی بنا قدامت ہے

حساب مجھ سے نہ لے پیشِ مصطفیٰ، یارب!
کہ میری فروِ عملِ دفترِ ملامت ہے

وہ اور ہیں جو متاعِ عمل پہ نازاں ہیں
ہمارے پاس تو آنسو ہیں اور ندامت ہے

(حسن اختر جلیل)



باغِ حسان کے پھولوں کی مہک شعروں میں
خود بخود آئے گی اک روز چمک شعروں میں

نعت لکھتے ہی رہو بیٹھ کے کعبے کے قریب
جب تک آئے نہ طیبہ کی جھلک شعروں میں

طارِ فکر مبارک ہو صدا آتی ہے
بلبلِ باغِ مدینہ کی چمک شعروں میں

کیسے تحریر کروں کیسے دکھاؤں سب کو
ہمیر طیبہ سے جدائی کی کک شعروں میں

نیند آتی ہی نہیں شوقِ ثنا میں شب بھر
جاگ اٹھتی ہے عبادت کی للک شعروں میں

خش و خاشاک زمینوں میں کہاں سے آئے
گلشنِ نور کے غنچوں کی چمک شعروں میں

میرے آقا کو یقین تھا کہ ضرور آئے گی
حضرت کعب کے ایمان کی لپک شعروں میں

مدحتِ شاہِ مدینہ کی بدولت اطہر
مجھ کو حاصل ہے بہت نان و نمک شعروں میں

(حسن رضا اطہر)



اُس رنگِ محبت کے اثر میں ہوں ابھی تک
گھر لوٹ بھی آیا ہوں، سفر میں ہوں ابھی تک

دُوری میں حضوری کے نئے باب کھلے ہیں!!
سرکارِ دو عالم کی نظر میں ہوں ابھی تک

یہ گوزہ گری نعت کی آسان نہیں تھی
صد شکر کہ اُس دستِ ہنر میں ہوں ابھی تک

آقا! مرے آقا! مری حالت پہ نظر ہو
منزل نہیں ملتی ہے سفر میں ہوں ابھی تک

رستہ ترا آنکھوں کے دریچوں پہ رقم تھا
پھر بھی میں اگر اور مگر میں ہوں ابھی تک

وہ ساعتِ نایاب جو گزری تھی حرم میں
اُس شام میں زندہ ہوں سحر میں ہوں ابھی تک

کاشف ابھی آلودہ ہے خواہش سے مراد دل
پتھر ہوں مگر کانِ گہر میں ہوں ابھی تک

(کاشف عرفان)



اک نعت کا ہدیہ لیے در پر مرے آقا
لب بستہ کھڑا ہے یہ سخنور مرے آقا

چمکے مری سوئی ہوئی قسمت کا ستارہ
مدت سے اندھیرے ہیں مقدر مرے آقا

در پیش ہوئے کب اسے دنیا کے مسائل
ہو جائے کرم آپ کا جس پر مرے آقا

ہو اب تو عطا جرات اظہار مجھے بھی
آیا ہوں بڑی دور سے چل کر مرے آقا

جو کچھ بھی ہے یہ آپ کا فیضان ہے ورنہ
میں ریت کا ذرہ تو سمندر ہے آقا

(فیضان عارف)

ﷺ
صلی اللہ

آپ سے اذن عطا ہوتا ہے، بات سمجھائی جاتی ہے
نعت کہاں لکھی جاتی ہے، یہ لکھوائی جاتی ہے

یہ وہ صنف ہے جس کو فرشتے ہاتھوں ہاتھ سمیٹتے ہیں
یہ وہ چیز ہے جو سرکار کو جا کے دکھائی جاتی ہے

یہ وہ کام ہے جو کروایا جاتا ہے دل والوں سے
یہ خوشبو شاداب علاقوں میں مہکائی جاتی ہے

یہ وہ کرم ہے مالک کا جو کسی کسی پر ہوتا ہے
یہ دستار محبت والوں کو پہنائی جاتی ہے

یہ احسان شعیب ہے مجھ پر کالی کملی والے کا
یہ سوغات مدینے سے مجھ کو بھجوائی جاتی ہے

(ڈاکٹر شعیب احمد)



کوئی منظر ہو ، تو ہی جلوہ نما لگتا ہے
آسماں بھی ترا پیوند قبا لگتا ہے

جب سے آنکھوں میں بسا گنبد خضریٰ کا جمال
زرد پتے کو بھی دیکھوں تو ہرا لگتا ہے

جملہ جاں تری خوشبو سے مہک اٹھتا ہے
گوشہ دل میں نہاں غار حرا لگتا ہے

تو مری ذات کی پہنائی میں ہے محو خرام
لوح جاں پر ترا نقش کف پا لگتا ہے

شدت یاس میں پڑھتا ہوں میں جب حرفِ درود
کاسہ سرترے قدموں میں دھرا لگتا ہے

ایک احساسِ لطافت سے ہے تنِ آسودہ
دل کے زخموں پہ ترا دستِ شفا لگتا ہے

صرف تو ہی تو نہیں اس سے معطر سالک
سارا عالم اسی خوشبو میں بسا لگتا ہے

(سید ابرار سالک)

وَسَلَّمَ
صَلَّى اللّٰهُ

وہ تُو کہ جس نے ذہن کو فکرِ رسا دیا
وہ تو کہ جس نے دل کا حرم جگمگا دیا

وہ تو کہ جس نے ہر دہن بے زبان کو
لہجہ دیا ، بیان دیا ، ذائقہ دیا

وہ تُو کہ جس کے لمسِ کفِ پائے پاک نے
ذروں کو آفتاب کا ہمسر بنا دیا

وہ تُو کہ جس کے قلزمِ رحمت کی موج نے
ہر ڈوبتا سفینہ کنارے لگا دیا

وہ تُو کہ جس کے نکبت و رنگ و جمال نے
صحرائے کائنات کو گلشن بنا دیا

وہ تُو کہ جس کے نعرۂ وحدت کی گونج نے
نقشِ دُویٰ کو لوحِ جہاں سے مٹا دیا

وہ تُو کہ جس کی شانِ سجود و قیام نے
بندے کو بندگی کا سلیقہ سکھا دیا

وہ تُو کہ جس کے جلوۂ نورِ ظہور نے!
رُویئے حیات و موت سے پردہ اٹھا دیا

(سرفراز قریشی)



☆ میں کیسے کہہ دوں مدینہ مقام ہو جائے
حضور! چشم تصور میں کام ہو جائے

جو خاک پا ہی عطا ہو، نصیب چمکے گا
نظر اٹھے تو زمانہ غلام ہو جائے

حضور! لطف و کرم کی ہمیشہ بارش ہو
میں چاہتا ہوں کہ یہ التزام ہو جائے

نبی کی نعت کہوں پھر خوشی سے مر جاؤں
خدا کرے یونہی قصہ تمام ہو جائے

سیاہ کار ہوں، نادم ہوں، پھر بھی یہ چاہوں
سمیل مدحت خیر الانام ہو جائے

(سمیل احمد صدیقی)

☆ مصرع طرح: حضور ایسا کوئی انتظام ہو جائے (مسیح رحمانی)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

فارسی نعت

وصل اللہ علی نورِ کزوشد نورها پیدا
زمین از حبّ اؤساکن فلک در عشق اؤشیدا
دو چشم ز کینش را کہ مازاغ البصر خوانند
دو زلف عنبرینش را کہ واللّیل اذا یغشی
ازو در ہر تنے ذوقے وزو در ہر دلے شوقے
ازو بر ہر زباں ذکرے وزو در ہر دلے سودا
منور عالم از رولیش معطر خلد ازویش
مغمر حال ہندویش دوزلف او شب یلدا
محمد احمد و محمود وے را غالقش بستود
ازوشد بودہر موجودا زوشد دیدہ ہائینا
نہ ایوب از بلا راحت نہ یوسف حشمت و شوکت
نہ عیسیٰ آل میجا دم نہ موسیٰ آل ید بیضا
بوصفش سورہ طہ ، منزل ہمدگر یسین
بہ موجوداتِ عالی ذات تلک الرسل فقلنا
اگر نام محمد را نیا وردے شفیع آدم
نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نچینا

(مولانا عبدالرحمن جامی)



دیدار کیا کرتا ہر آن محمد کا
اے کاش کے میں ہوتا دربان محمد کا

دنیا کے اندھیروں سے آقا نے نکالا ہے!
میں بھول نہیں سکتا احسان محمد کا!

اُس شمع ہدایت سے ملتی ہے ضیا سب کو
جاری ہے مدینے میں فیضان محمد کا

ناز اپنے مقدر پہ دن رات وہ کرتا ہے
بن جاتا ہے جب کوئی مہمان محمد کا

ادراک سے اونچی ہے عظمت مرے آقا کی
پوچھو نہ کبھی مجھ سے ایمان محمد کا

ہر بات شفیق اُن کی پہنچاؤں گا میں سب تک
پیارا ہے مجھے جاں سے فرمان محمد کا

(محمد شفیق اعوان)

ﷺ
صلی اللہ علیہ وسلم

ذکرِ احمد سے منور میرا سینہ کر دے
مرے مولا، میرے یثرب کو مدینہ کر دے

دل صنم خانہ دنیا میں ہوا، سنگ خصال
اپنا ہم رنگ بنا، اور نگینہ کر دے

اب کہیں اور گوارہ ہی نہیں، جائے قرار
اپنے رستے میں مقرر، مرا جینا کر دے

مجھ پہ یوں ٹوٹ کے برسے تری رحمت کا سحاب
آبِ اغیار سے خالی، مرا مینا کر دے

دل دیا ہے تو اسے درد شناسی ہو عطا
آنکھ بخشی ہے جو تونے، اسے پینا کر دے

جا کے نکلے وہ سرِ حشر کنارِ کوثر
چشمِ گریاں میں رواں میرا سفینہ کر دے

(آصف مرزا)

ﷺ

بارہا منزل طیبہ کا مسافر ہوتا
ہو مقدر ترے دربار میں حاضر ہوتا

انبیا تیری زیارت کی دعا کرتے ہیں
شرف ایسا ہے ترے نور کا ناظر ہوتا

اول الخلق ہے تو ، ختم نبوت تجھ پر
سب پہ ظاہر ہے تر اول و آخر ہوتا

دل کی خواہش ہے حرا غار میں نعتیں کہنا
تیری خلوت ، ترے ماحول کا زائر ہوتا

نعت لکھوں تو مدینے سے پیام آجائے
سونہ دل یوں مرے اشعار میں ظاہر ہوتا

نعت کہتا ہوں تو حالات بدل جاتے ہیں
مشکل اوقات میں کام آتا ہے شاعر ہوتا

(محمد مسعود اختر)

لکھیے نعت سرور لکھیے
اُن کو ہادی و رہبر لکھیے
لکھیے اُن کو رہبر لیکن
اُن کی راہ پہ چل کر لکھیے

(نیاز بدایونی)



یاونگاری

مری حیات کا گر تجھ سے انتساب نہیں
تو پھر حیات سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں

(احمد ندیم قاسمی)

خالد شفیق کی یاد میں (۱۹۳۲ء-۲۰۱۵ء)

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی آ گیا

ABSTRACT:

The article hereunder is comprised of memoirs in respect of Khalid Shafiq who was a poet and Editor of monthly literary journal SHAM-O-SAHAR, Lahore, along with delineating details of his services towards promoting Devotional literature. Some light has also been shed on the commendable work done by Late Khalid Shafiq to present 6(six) issues of SHAM-O-SAHAR on the subject of Naatia literature. Creative work (written word of Naat) of him in Urdu and Punjabi languages has also been evaluated in critical terms with praiseful manner. Quotable sentences from praiseful writings of some litterateurs have also been reproduced to show grandeur of literary work and poetry of Khalid Shafiq. Some Naatia couplets have also been presented in the end of the article.

زندگی کے خالق ہی نے موت کو تخلیق کیا ہے، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ زندہ کس رخ سے زندگی گزارتا ہے، بے مقصد یا بامقصد زندگی ایک ایجابی حقیقت کا نام ہے، اسی طرح موت بھی صرف عناصر کا پریشان ہونا نہیں بلکہ ایک مثبت شے ہے جو خدا کے قبضہ قدرت میں ہے اور ان دونوں حقیقتوں پر عالم کون و فساد کی بنیادیں استوار ہیں، نظام حیات و ممات کی غرض و غایت یہ ہے کہ زندگی، موت پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اور انسان اپنے حسن عمل سے خود کو اللہ کا نائب ثابت کرے۔ بے مقصد زندگی ہر لمحہ موت سے لرزاں و ترساں، بامقصد زندگی موت سے بے نیاز، حصول مقصد کے لیے رواں دواں۔ موت کے سائے میں زندگی کے ولولے، منزل کے لیے پیہم تگ و دو، قرب محبوب کے لیے شدید بے قراری، حوصلے کی رفعتوں کے لیے سماوی بلندیاں بھی بے چین و منتظر۔ جب کہ

حوصلے کی پستیاں شکوک و شبہات میں گرفتار زندہ، زندہ رہتے ہوئے بھی مردوں سے بدتر اور باحوصلہ زندگی کے لیے شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی مع

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مرنہ سکے

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جناب خالد شفیق نے بامقصد اور باحوصلہ زندگی گزاری اُن کے سوانحی کوائف مختصر ادرج ذیل ہیں:

خالد شفیق بٹ کے والد گرامی قدر کا نام محمد شفیق بٹ۔ تاریخ پیدائش ۲۱ جولائی ۱۹۳۲ء مقام پیدائش، بٹالہ ضلع گورداسپور۔ والد راوِل پنڈی ڈویژن میں ریلوے کے محکمہ میں ملازم تھے اس لیے خالد شفیق کی تعلیم ایک جگہ نہ ہو سکی۔ انھوں نے میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول اکوڑہ خٹک ضلع پشاور سے کیا۔ شروع میں افسانہ نگاری کا شوق تھا، طبع موزوں تھی، شعر وارد ہونے شروع ہو گئے۔ پہلی غزل لاہور کے ہفت روزہ ”اجالا“ میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۰ء کے بعد غزل، باوضو ہو کر نعت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ مختلف اداروں میں گھومنے کے بعد، لاہور میونسپل کارپوریشن میں بہ طور کلرک بھرتی ہوئے اور میونسپل ریڈنگ روم موری دروازہ لاہور میں بہ طور انچارج کام کرتے رہے۔ وہاں لاہور کے معروف ادباء و شعراء کا آنا جانا رہتا تھا، یوں ان کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا، بعد میں انھوں نے ”مجلسِ اردو“ کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی، وہ اس انجمن کے جنرل سیکرٹری تھے، اس انجمن کے تحت ماہانہ مشاعرے منعقد ہوتے رہے اور خالد شفیق، علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود ان میں شامل ہوتے رہے۔

وہ میونسپل کارپوریشن کے شعبہ تعلقات عامہ میں مقالہ نگار بھی رہے۔ ماہنامہ شام و سحر لاہور، کے مدیر بھی رہے، بعد میں مجلہ ”حمایتِ اسلام“ بھی اُن کی ادارت میں شائع ہوتا رہا ہے۔

انھوں نے عام شماروں کے علاوہ شام و سحر، کے چھ ضخیم نعت نمبر اور ایک سیرت نمبر شائع کیا۔ تب نعت کو محض دینی حیثیت حاصل تھی، ادبی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج نعت کو ایک پاکیزہ صنفِ ادب تسلیم کیا جا چکا ہے اور تنقیدی اعتبار سے تحقیقی کام بھی تیزی سے ہو رہا ہے۔ آج اہل قلم کا رجحان اس صنفِ سخن کی طرف یوں ہو چکا ہے کہ ہر قلم نعت کہنے کی آرزو کر رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالد شفیق اس رجحان کو پروان چڑھانے والی اولین شخصیات میں سے ہیں۔ اُن کے مرتبہ نعت نمبر معنوی اعتبار سے اس قدر واقع و رفیع ہیں کہ انھیں نہ اہل نظر، نظر انداز کر سکتے ہیں نہ تماشا شائی۔

نبی کریم کی محبت کے لیے فکر و نظر کی بہترین صلاحیتوں کو وقف کر دینا زندگی کا ایک عظیم ترین

اور حسین ترین مقصد ہے۔ خالد شفیق خوش نصیب تھے کہ انھیں اُس ذات والا صفات سے محبت تھی، جس سے خود، خدا محبت کرتا ہے اور یہی محبت، دلیل ایمان ہے۔

اُس دل کی آرزوئے محبت کو کیا کہوں جس دل کو آرزوئے محبت ہے آپ سے

اور

محبت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے ذرا سے بیج سے پیدا ریاض طور ہوتا ہے
خالد شفیق کی کاوشوں کی ایک جھلک دیکھیے:

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۱ء، ضخامت ۴۰۰ صفحات، مضامین ۱۵، منظومات ۱۲۶

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۲ء، ضخامت ۴۱۵ صفحات مضامین ۴۲، منظومات ۱۸۴

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۳ء، ضخامت ۳۶۰ صفحات مضامین ۱۲، منظومات ۲۳۸

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۵ء، ضخامت ۳۹۰ صفحات مضامین ۱۵، منظومات ۲۰۶

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۶ء، ضخامت ۴۹۵ صفحات مضامین ۱۵، منظومات ۲۱۷

شام و سحر، نعت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۷ء، ضخامت ۲۶۸ صفحات مضامین ۲۰، منظومات ۲۹۱

شام و سحر، سیرت نمبر/ جنوری فروری ۱۹۸۴ء، ضخامت ۲۳۴ صفحات مضامین ۱۸، منظومات ۴۶

نعتیہ دیوان/ عالم افروز، ۱۹۹۶ء منظومات ۹۴، تعارف: علیم ناصری، انور سدید، منظور وزیر آبادی

نعتیہ دیوان/ نعت سوغات، ۲۰۰۸ء، منظومات ۵۵، تعارف: محمد اقبال جاوید، محمد اکرم رضا

شام و سحر کے نعت نمبروں کے بارے میں جناب پروفیسر شفقت رضوی کا ایک تفصیلی مضمون
”نعت رنگ“ میں شائع ہو چکا ہے۔

جہاں تک باحوصلہ زندگی کا تعلق ہے، میں انتہائی قریب سے جانتا ہوں کہ انھوں نے ایک ایسی زندگی گزاری جس کی تفصیل صبر و استقامت اور زہد و اتقاء کی ایک قابل تحسین داستان ہے۔ حق یہ ہے کہ مالک حقیقی اپنے بعض صالحین کو جس مقام رفیع تک لے جانا چاہتے ہیں، وہ اپنی بشری لغزشوں کی وجہ سے، اس مقام تک جانے کے قابل نہیں ہوتے، چوں کہ اللہ تعالیٰ عادل بھی ہیں اس لیے وہ اُن کو بعض دنیاوی تکالیف و مشکلات میں مبتلا کر کے، اُن شداکد کو اُن کی لغزشوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں اور پھر انہیں نصرتِ جاوداں سے یوں نواز دیتے ہیں کہ عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ جاتا ہے، ایسا قرار کہ اس کی کیفیت کا احاطہ انسانی عقل کر ہی نہیں سکتی۔

خالد شفیق کو کئی بار دیارِ نیاز و ناز میں حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ ۱۹۹۲ء کے حج کے بعد ۱۹۹۴ء میں

اُن کی اہلیہ وفات پا گئیں، اولاد پہلے ہی داغِ مفارقت دے چکی تھی۔ یوں وہ بالکل تنہا رہ گئے۔ لاہور کی ایک عام سی آبادی میں ایک انتہائی مختصر سے مکان میں مقیم ہو گئے اور وصیت کردی کہ اُن کی وفات کے بعد مکان قریبی مسجد کو دے دیا جائے۔ ان کا وجود اسی علاقے کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ محلّے کی کتنی ہی بے آسرا بچیاں تھیں، جن کی شادیوں میں اُن کی اعانت آسرا بنی رہی، کتنے ہی غریب تھے جن کو اُن کی موجودگی نے پسماندگی کا احساس نہیں ہونے دیا، شرفِ انسانی کی ایک پہچان یہ بھی ہے۔

جہاں سے کیا لیا تم نے

جہاں کو کیا دیا تم نے

اور خاصانِ خدا کی ایک پرکھ یہ بھی ہے کہ:

خوش ہو کر خدا اُن کو گرفتارِ بلا کر دے

وہ شدید تنہائی کے ساتھ ساتھ شدید بیماریوں کا شکار بھی رہے، بصارت جاتی رہی، رحمِ دل ہمسائے اُن کے خورد و نوش، رہنے سہنے اور دیگر ضروریات کا انصرام کرتے رہے، وہی انھیں شدید علالت کی حالت میں قریبی ہسپتال لے گئے۔ چوں کہ وہ مالی اعتبار سے پسماندہ تھے، اس لیے انھوں نے نہ معلوم کیسے ہسپتال کے واجبات ادا کیے، وہیں، خالد شفیق، وہاں چلے گئے، جہاں دیر یا سویر سب کو جانا ہے اور جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

ہر ایک نفس کو چکھنا ہے موت کی لذت

بقا اگر ہے تو اک ذاتِ کبریا کے لیے

۱۵ مئی ۲۰۱۵ء کو خالد شفیق، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور میں واقع کریم بلاک کے قبرستان میں مٹی کی چادر اوڑھ کر سکون و راحت کی نیند سوئے۔ موت کا وقت، جگہ اور کیفیت تینوں اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں۔ اور تقدیر میں ازل سے لکھی ہوئی ہیں مگر خود انسان کو ان میں سے کسی ایک کا بھی علم نہیں ہے۔ امام غزالیؒ کے مطابق اسی بے خبری پر دنیا کی ساری رونقیں قائم ہیں ورنہ انسان کو مرنے سے پہلے بار بار مرنے کے مراحل سے گزرنا پڑے۔

اب ان کی یاد ہی باقی رہ گئی ہے جو میری تنہائیوں کو ترپاتی بھی ہے اور بہلاتی بھی کہ زندگی بھر ان کی محبت میرے لیے وقف رہی۔ وہ علالت کی شدتوں میں بھی مجھے ہر اتوار فون کرتے رہے اور دعاؤں سے نوازتے رہے۔ جنابِ صبیحِ رحمانی بھی اُن کی یادوں میں شامل تھے وہ انھیں ملنے کے لیے کراچی سے لاہور آئے تو خالد شفیق نے اپنا کتب خانہ اُن کے سپرد کر دیا کہ وہ راہِ عدم کے لیے تیار

بہت تھے۔

میں اُن کی صحت کے لیے پیہم دعا گو تھا اور وہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے، اُن کی وفات کی خبر، مجھے بہت بعد میں ملی، نتیجہ معلوم کہ صحت و سلامتی کے لیے کی جانے والی التجائیں یکا یک مغفرت کی دعاؤں میں بدل گئیں۔ آخر میں کچھ اپنے بارے میں نطقِ شاعر مستعار لیتے ہوئے:

مجھے سوچا گیا اس دور میں احباب کا ماتم! کسے غم خوار ٹھہراؤں، کسے درد آشنا لکھوں
صبا مغموم، طائر مضطرب، شاخیں خزاں دیدہ سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس حالت میں کیا لکھوں
خود اپنی زندگی بھی مختصر محسوس ہوتی ہے کہاں تک جانے والے کی وفا کا تذکرہ لکھوں

﴿ اردو نعت گوئی ﴾

پروفیسر رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری کے بارے میں اپنے ایک تاثراتی مضمون میں لکھتے ہیں کہ ”وہ اپنی نجی تحریروں میں کبھی کبھی اپنے سے بھی زیادہ دلکش معلوم ہونے لگتے تھے، یہ فن اور شخصیت دونوں کا اعجاز ہے۔“ فن اور شخصیت کی ہم آہنگی فطرت کی دین ہے ورنہ اکثر مشاہیر کی تحریریں پڑھ کر اُن سے ملنے، اُن کے حضور میں دوزانو بیٹھنے، اُن کا قلم چومنے اور اُن سے آئوگراف لینے کو دل مچلتا ہے مگر جب کبھی اُن کا قرب نصیب ہو جائے یا باہم کوئی معاملہ پیش آجائے تو طبیعت کچھ یوں مکدر ہو جاتی ہے کہ اُن سے مصافحہ کرنے سے بھی ابا کرتی ہے۔ کیوں کہ جہاں بھی لوگوں کا رنگ دیکھتے ہی دیکھتے بدل جاتا ہو، جہاں ایک چہرے پر کئی چہرے سجے ہوں، جہاں ملنے والے، قدم قدم نئے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہوں اور جہاں بھی زبان، دل کی رفیق نہ ہو وہاں لفظی خوش نمائی تو ہوگی مگر عمل کی سیہ دلی اس خوش نمائی سے دل ربائی کا کیف چھین لے گی اور بے ساختہ زبان پکار اٹھے گی کہ:

ہائے! ہم کس خیال میں گم تھے

دوستی کے لباس میں تم تھے!

دورِ حاضر میں بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ تحریروں ہی کے قریب رہا جائے اور صاحبِ قلم کے تصوراتی ہیولی کو قائم رکھا جائے کہ تصور بہرِ نوع حسین ہوتا ہے اور تصور کا یہ حسن، خیال کو رعنائی دیتا رہتا ہے مگر کیا کیجیے کہ حکمِ الہیہ اکثریت پر لگتا ہے اور صورتِ حال کچھ یوں ہے:

معنی ہیں معدوم، تحریریں بہت ہے عمل مفقود، تقریریں بہت
بغضِ دل میں، منہ پہ تعریفیں بہت کفرِ دل میں، لب پہ تکبیریں بہت

ایک اہل درد ہی ملتا نہیں ورنہ دردِ دل کی تدبیریں بہت
ایسے میں اگر کوئی شخصیت ایسی ہو جس کے دل کی دھڑکنیں نگاہوں کی تمنائیں اور روح کی
لرزشیں، قلم قلم، حرف حرف اور لفظ لفظ، لودے رہی ہوں، جسے پڑھ کر اُسے ملنے اور مل کر اُسے پڑھنے
کو طبیعت بے چین رہتی ہو، جس کی سوچ کا رخ سچ کی طرف راغب ہو اور جو صداقتوں کے لیے
صادق علی اللہ علیہ السلام کے نقوشِ پا کی چاندنی کے لیے ہر لمحہ بے قرار ہو، اللہ تعالیٰ نے جس کے فکر کے
مجازی رنگ کو حقیقی آہنگ دے دیا ہو، جو ہر دنیاوی شہرت سے بے نیاز اور ہر شخصی تعریف سے بے
پروا ہو جو اپنے گلے میں اپنا ہی ڈھول ڈال کر بجانے کے بجائے گوشہ تنہائی میں اپنے گلے میں اپنی ہی
بانہوں کو ڈالے ہوئے ہو اور صرف اس امر کا آرزو مند ہو کہ اس کے قلم کا کوئی ایک حرف، اس کے
دل کی کوئی ایک دھڑکن اور اس کی پلکوں پر لرزنے والا کوئی ایک آنسو، بارگاہِ ناز میں بار پا جائے اور
جس کے لیے یہ باریابی کائنات کی ہر نعمت سے برتر ہو... جس شخصیت سے مل کر، کرم کے فیصلوں اور
نصیب کی باتوں پر یقین سا آنے لگ جائے، جس کے لیے دیدہ و نادیدہ دوستوں کی سحر خیزیاں دعا گو
رہتی ہوں اور مبداءِ فیض نے جس کی کلکِ شنا کو نور کی موجوں میں رکھ دیا ہو، اس شخصیت کا ذکر فردوسِ
گوش اور اُس کی یاد نشاطِ روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ تمہید اس لیے بے ساختہ قلم کی نوک پر آگئی کہ جناب صبیح رحمائی نے فون پر بتایا کہ وہ ”نعت
رنگ“ میں ماہنامہ ”شام و سحر“ (مدیر جناب خالد شفیق) کے ضخیم نعت نمبروں کے تذکرے کے لیے
ایک گوشہ وقت کر رہے ہیں اور ایک تعارفی، تحقیقی اور ادبی جائزہ مرتب بھی ہو چکا ہے، میں نے عرض
کیا کہ یہ سعادت تو میں لینے کا آرزو مند تھا کہ خالد شفیق نعت کے اولین خدمت گزاروں میں سے
ہیں اور ”شام و سحر“ نے نعت نمبروں کی اشاعت کا آغاز تب کیا تھا جب وقت کی ترقی پسندیاں، نعت
گوئی کو رجعت پسندی قرار دیتی تھیں اور بطورِ صنفِ سخن نعت کو کوئی مقام حاصل نہ تھا، آج بفضلِ ہر
مدیر اپنے رسالے کو نعت کا رنگ دینے کے لیے بے قرار اور ہر قلم، نعت کہنے کے لیے بے چین ہے۔
بہر کیف صبیح رحمائی مستحقِ تبریک ہیں کہ انھیں خالد شفیق ایسے گوشہ نشین کی نعت شناسی کا اعتراف کرنے
کی توفیق ملی ہے۔ گو یہ اعتراف انتہائی تعویق سے ہوا ہے مگر یہ اعتراف، خود معترف کی فکری صالحیت
اور نگہی سلامتی کی دلیل ہے کہ سورج کو سورج کہنا، سورج پر کوئی احسان نہیں ہوا کرتا، بلکہ ع

مادرج خورشید، مداح خود است

سچی بات یہ ہے کہ کام کی نوعیت دیر یا سویر خود کو منوالیتی ہے بشرطے کہ اس کے مزاج میں

خلوص کا امتزاج ہو:

یہ صداقت کی روایت ہے ازل سے تا ابد گلشنِ فن میں کبھی بادِ فنا آتی نہیں
پھول اگر مرجھا بھی جائے، ٹوٹ بھی جائے اگر نام کی اور کام کی خوشبو کبھی جاتی نہیں
میں یہ چند سطور لکھ کر، خود کو اس عظیم شاخوانِ رسول کے شاخوانوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں،
اس یقین کے ساتھ کہ یہ شمولیت میرے لیے اُخروی سرخ روئی کا سبب بنے گی اور روزِ حشر، احقر کی
دنیاوی بے کیفیاں، خوش بوؤں کے دائروں کا عکس لے کر (ان شاء اللہ) رنگوں کے ساحل پر کھڑی
ہوں گی، جس طرح اہل دل کے نزدیک حضور کے غلاموں کی غلامی وجہِ فخر و ناز رہی ہے، اسی طرح
میرے لیے شاخوانِ رسالت کی شاخوانی وجہِ مباہات ہے۔ بسا اوقات مجھے نعت گو احباب کی قسمت کی
برنائیوں، فکر کی رعنائیوں اور قلم کی زیبائیوں پر رشک سا آتا ہے، میں نے ”محزنِ نعت“ (میں نے یہ
انتخاب نعت جناب شفیق بریلوی (ارمغانِ نعت)، جناب فرمان فتح پوری (اردو کی نعتیہ شاعری) اور
جناب ممتاز حسن (خیر البشر کے حضور میں) کے فوراً بعد ترتیب دیا تھا اور درج بالا تینوں تالیفات سے
مختلف نعتیں یک جا کرنے کی سعی کی تھی! نیز قدیم و جدید شعرا کے گل ہائے نعت کو قرآنی، علمی اور
تاریخی اشارات سے مربوط بھی کیا تھا اور انہی تعلیقات کی بنا پر رائٹرز گلڈ نے اسے ایک تخلیقی کاوش
قرار دیتے ہوئے انعام کا مستحق قرار دیا تھا) کی ابتدا بھی اسی رشک سے کی تھی کہ:

اگر میں شاعر ہوتا تو نعت کہتا مگر یہ وہ عطیہ ربانی ہے جو عطا ہوتا ہے، لیا نہیں جاتا، پھر سوچا کہ
اگر میں نعت کہہ نہیں سکتا تو کم از کم وہ قلم تو چوم سکتا ہوں جنہیں فطرت نے نعت گوئی کی توفیق بخشی ہے
کہ شاید عقیدت کے یہی بو سے میرے لیے توشہ آخرت ہو جائیں:

سجا کر لختِ دل سے کشتیِ چشمِ تمنا کو

چلا ہوں بارگاہِ حسن میں لے کر یہ نذرانہ

جناب خالد شفیق کے نعتیہ رجحانات پر، دورِ حاضر کے رجحان ساز، جہت نما اور منزلِ نشان،
نعت گو یوں تبصرہ کرتے ہیں:

خالد شفیق نعت کی تخلیق میں گزشتہ پندرہ سال سے مستعد ہیں۔ ان کی نعت

وابستگی کی عمدہ مثال ہے جو قال تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کے حال میں

ڈھل گئی ہے۔ (حفیظ تائب)

محبوب سے جب محبت کی جاتی ہے تو اس کی اداؤں، اس کی زندگی کے اصولوں کو مد نظر رکھا جاتا ہے، ہر لمحے اس کی رضا کے حصول کے لیے انسان کوشاں رہتا ہے۔ برادرِ محترم خالد شفیق نے جناب رسالت مآب کی سیرتِ مطہرہ کو شعر ہی میں بیان نہیں کیا بلکہ اپنی زندگی کو اس معیار پر ڈھالنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں اخلاصِ باطن، سچائی کا عنصر زیادہ نظر آتا ہے اور یہ سعادتِ عظمیٰ کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ (حافظ لدھیانوی)

راقم الحروف کی دانست میں رسالے کا ضخیم نعت نمبر نکالنے کی طرح جناب خالد شفیق نے ڈالی تھی... انھوں نے ”شام و سحر“ کے مسلسل چھ نعت نمبر شائع کیے، جن پر مستزاد ایک سیرت نمبر بھی تھا۔ یہ سلسلہ ذہب ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۷ء تک کم و بیش تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ نعت کے فروغ کے لیے جناب خالد شفیق کی یہ ایک عظیم خدمت تھی جس میں انھوں نے مسلسل سات سال تک اپنی تمام ذہنی صلاحیتیں صرف کیں، اس گراں بہا خدمت سے اُن کی نعت سے دل بستگی اور رسول اللہ کے ساتھ والہانہ خود سپردگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، ان مبارک سات برسوں کے ”شام و سحر“ خالد شفیق کے سحر و شام کی عبادتوں کا نورانی دور ہے، جس کی جزا کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ (علیم ناصری)

... خالد شفیق کے ہاں آخرِ شب کے آنسوؤں کی نمی لفظوں میں ڈھل کر ان کے لیے توشہِ آخرت بن گئی ہے، ان کی نعت کا ہر لفظ انھی آنسوؤں سے وضو کر کے نوکِ قلم پر سجدہ شکر بجالاتا ہے۔ (ریاض حسین چودھری)

احقر نے اپنی تالیف ”بیسویں صدی کے رسول نمبر“ میں ”شام و سحر“ کے نعت نمبروں کو یوں خراجِ محبت پیش کیا تھا:

”شام و سحر“ لاہور کے چھ ضخیم نعت نمبروں کو جناب خالد شفیق نے انتہائی

عقیدت اور محنت کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ خالد شفیق کو اللہ تعالیٰ نے علمی رسوخ اور نعت گوئی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر کی جو پاکیزگی عطا کر رکھی ہے وہ ہر صاحبِ قلم کا سرمایہ حیات نہیں ہوا کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں توفیق عطا کی اور انھوں نے سیرت رسول اور نعت رسول کے موضوع پر ”شام و سحر“ سے وہ کام لیا ہے جس کی تابندگی، سنگینی گردشِ ایام پر خندہ زن رہے گی۔“

وطنِ عزیز میں ”نعت نمبروں“ کی روایت قائم کرنے اور اس روایت کو ایک جذبہ اور تحریک بنانے میں خالد شفیق کے مقام کو نہ اہل نظر، نظر انداز کر سکتے ہیں نہ تماشا شائی۔ ”شام و سحر“ نے جہاں ثقہ قلم کاروں کو فنِ نعت گوئی پر لکھنے پر آمادہ کیا، وہاں بہت سے نئے ادیبوں اور شاعروں کی یوں حوصلہ افزائی کی کہ آج نعت کے سلسلے میں وہ خود ایک معتبر حوالہ بن گئے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خالد شفیق میں کسی قسم کی کوئی ”مدیرانہ رعوت“ نہیں ہے۔ وہ تب بھی اور اب بھی عجز و انکسار ہی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے ”شام و سحر“ (اب حملتِ اسلام) کو ذاتی تشہیر اور شخصی نمائش کا ذریعہ کبھی نہیں بنایا، جب کہ ”شام و سحر“ ایسے وسیع رسالے کا مدیر ہونا، اُس کے بہت سے سیرت نمبر اور نعت نمبر مرتب کر دینا اور اُن شماروں کا معیار کے اعتبار سے اعتباری، ضخامت کے لحاظ سے منفرد اور زمانی نقطہ نظر سے اولیت کا حامل ہونا، کچھ کم اعزاز نہیں ہے۔ اس کے باوجود جلوت کی ہوس سے دور رہنا اور خود کو اجاگر کرنے کی کوئی سی کوشش بھی نہ کرنا، اُن کی فطری سعادتوں اور نسبی نجاتوں کی دلیل ہے۔ اُن کے عاجزانہ اسلوبِ حیات ہی نے انھیں اہل دل کی نگاہوں میں بلند و بالا کر رکھا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کبریائی اور بڑائی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو زیب دیتی ہے۔ انسان کے لیے فخر کا ہر دعویٰ، غرور کا ہر زاویہ اور تکبر کا ہر رخ دلیل رسوائی اور انکسار کا ہر انداز وجہ رعنائی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ہر صلاحیت، عطا ہے اور اس کو منوانے کی ہر کوشش خطا ہے۔ انھی کے حمدیہ اشعار ہیں:

زمانے بھر کے سب علم و ہنر تیرے عطا کردہ	مرا حسنِ نظر، ذوقِ نظر، تیرے عطا کردہ
مرے جذبوں کو ساری وسعتیں تو نے عطا کی ہیں	مرے احساس کے شام و سحر، تیرے عطا کردہ
ہمیں دیتا ہے تو ہی حوصلہ منزل کو پانے کا	طلب منزل کی اور عزمِ سفر تیرے عطا کردہ
مرے دامن میں تمہیں محرومیاں یکسر، مگر اب ہیں	متاعِ نعت کے لعل و گہر تیرے عطا کردہ
مدینے کی طرف اڑتا چلا جاتا ہوں ہر لحظہ	مرا ذوقِ سفر، زادِ سفر، تیرے عطا کردہ

یہ لفظوں کے گہر، یہ آرزوؤں کے حسیں خاکے دعاؤں میں جو آتے ہیں نظر، تیرے عطا کردہ وہ ذات بلند و برتر جس کا کام ہی عطا کرنا ہے، وہ کسی کو محروم نہیں رکھتی۔ ہر جمال اپنا اظہار اور ہر کمال اپنی نمود چاہتا ہے۔ نہ پھول کی خوش بو اس میں مقید رہ سکتی ہے، نہ آفتاب کے انوار اور نہ معطر کی عنایات۔ دنیا کے مخیر لوگوں سے بار بار مانگا جائے تو وہ اکتا جاتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسے رحیم و کریم ہیں کہ ان سے نہ مانگا جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اُن کے خزانے بھی لامحدود ہیں اور ظرف بھی، بس مانگنے کا ڈھب آنا چاہیے:

منگتے کا ہاتھ اٹھتے ہی داتا کی دین ہے

دُوری قبول و عرض میں بس ہاتھ بھر کی ہے

وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ وہ اس بارگاہ اور اس کے آداب خوب جانتے ہیں جہاں جبریل بھی ادب کے سانچے میں ڈھل کر اترتے تھے اور جہاں جنید و بایزید بھی ”نفس گم کردہ“ حاضر ہوتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ تحریک بھی چلائی کہ نعت کہتے ہوئے ”تو، تم اور تیرا“ ایسے الفاظ استعمال نہ کیے جائیں اس پر اب تک بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے۔ بعض اس نقطہ نظر کے ہم نوا ہیں اور بعض اس پابندی کے خلاف کہ جہاں بھی کسی ذات کی انفرادیت یا عظمت کی فردیت کا اظہار ہوگا اور یہ ثابت کرنا مقصود ہوگا کہ اس ذات کے مقابل کوئی اور نہ تھا، نہ ہے، نہ ہوگا، تب یہی ضمیریں حق ادا کریں گی اور انھی سے شعری حسن بھی نکھرے گا اور فکری گداز بھی۔

جناب خالد شفیق کا مجموعہ نعت ”عالم افروز“ کے نام سے ۱۹۹۶ء میں مجلس اردو کے طباعتی اہتمام سے منظر عام پر آیا۔ اُن کی غزل بھی متین و حسین خیالات کا عکس تھی اور نعتوں میں بھی اُن کی گفتار کا دھیماپن اور ان کے مزاج کی لطافت نمایاں ہے۔ عجز و انکسار اُن کے ذوقِ نعت کا افتخار ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُن کی گوشہ گیری اور کم آمیزی نے اُن میں تصوف کی خوبو پیدا کر دی ہے:

عجب انداز از خود رنگی ہے

بھری محفل میں سب کے درمیاں گم

اور یہی صوفیانہ گھلاوٹ، اُن کی نعتوں میں بھی جلوہ گر ہے۔ جس طرح نعت کہہ کر ان کی قلبی بے قرار یوں کو ایک آسودگی نصیب ہوتی ہے بعینہ قارئین کو بھی ایک نوع کی روحانی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں نہ بھاری بھر کم الفاظ ہیں، نہ پر شکوہ تراکیب کی مشکل پسندیاں۔ تصنع اور

بناوٹ کا کوئی سا شائبہ بھی نظر نہیں آتا، بلیغانہ سلاست کا ایک رواں دواں پیرایہ ہے۔ اور یوں لگتا ہے کہ دل کی چاہتیں اور ذہن کی سوچیں بے ساختہ شعر کے خوب صورت پیکر میں ڈھلی چلی جا رہی ہوں۔ اُن کی نعت میں آورد نہیں بلکہ آمد کی ایک بے پناہ کیفیت ہے۔ ذہنی کاوش اور فکری عمل کا کوئی خاص دخل نظر نہیں آتا۔ صرف جذبے کا حسن جا بہ جا اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اور ردیف و قوافی کی پابندیاں، جذبے کی طغیانوں میں بہتی دکھائی دیتی ہیں۔

خالد شفیق کی شاعرانہ اُٹھان، بطور غزل گو شاعر کے تھی۔ غزل ایک جانب دار صنفِ سخن ہے، ایمائیت اس کی خصوصیت ہے۔ یہ حیات و کائنات کو نوکِ مژدہ پر تو لے اور سمندر کو قطرے میں سمیٹنے کا عمل ہے۔ تغزل، شعر کے اُس تاثراتی انداز کو کہتے ہیں جو قاری کے ذہن کو قائل اور دل کو گھائل کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی سے بات تیرنیم کش بنتی ہے۔ یہ دل اور دماغ دونوں کی ایک ہی ادا میں رضامند کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ نثر ہو یا نظم، غزل ہو یا قصیدہ، تغزل ہی اُسے ادا کا بانگین اور اسلوب کی کاٹ عطا کرتا ہے۔

فنی اعتبار سے ایک اچھا غزل گو ہی ایک اچھا نعت گو ہوا کرتا ہے۔ کیوں کہ نعت، اُس وجود ذی وجود علیٰ علیہ السلام کی توصیف کا نام ہے جو کائناتِ حسن بھی ہے اور حسنِ کائنات بھی، جس کے طفیل نبضِ ہستی تپش آمادہ اور خیمہٴ افلاک ایستادہ ہے۔ جو بہر نوع اعتبارِ کائنات بھی ہے اور افتخارِ کائنات بھی جو رُخِ جمالِ الہی کا آئینہ ہے جس کی ہر سوچ الہام اور جس کا ہر بول وحی ہے، جس کی نگاہوں سے سورج ضیا پاتا اور جس کے نطق سے غنچے پھول بنتے ہیں۔ جو ذات کے اعتبار سے اکمل، بات کے لحاظ سے احسن اور کردار کے اعتبار سے اجمل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اُس ذاتِ اقدس کی تعریف کے لیے وہ اسلوب اختیار کرنے کی امکانی سعی کی جائے جو بہر طور ارفع اور دل آویز ہو۔ چوں کہ فنی لحاظ سے شعر کی ہیئت کو رنگ و نور کی کہکشاں غزل ہی عطا کرتی ہے۔ اسی لیے آج نعتیں غزل ہی کے فارم میں لکھی جا رہی ہیں کہ:

غزل سوزِ دروں کی آنچ سے لفظوں میں ڈھلتی ہے

فقط رنگینیِ حسنِ بیاں سے کچھ نہیں ہوتا

گویا جو سوزِ دل کو سازِ رگِ جاں نہیں بنا سکتا وہ مغنیِ نامِ تمام ہے اور اس کا نغمہ خام... اور خالد شفیق، غزل کی اس نشتریت سے بخوبی آشنا ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ نعت کا جو شعر بھی کہا جائے وہ معنوی اور صوری لحاظ سے، ممدوحِ عظیم و جلیل کی شان کے شایاں ہو، گو حق تو ادا نہیں ہو سکتا

مگر آرزو کا خلوص ضروری ہے اور تائید روح القدس کی طلب بھی لازم، خالد شفیق یوں دست بہ دعا ہیں:

رَبِّ عَلِیم، کر مجھے پابندِ اعتدال
مجھ کو شعورِ معنیٰ بین السطور دے
ہوں میرے لفظ دینِ محمد کے پاسباں
فن کو مرے حفاظتِ حق کا شعور دے
محترم انور سدید نے اُن کے مجموعہ نعت کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

پچھلے دنوں خالد شفیق سے ملاقات ہوئی تو میں نے ازراہ شوق ان سے دریافت کیا، ”آپ نیا سفرِ حج کب اختیار کر رہے ہیں۔“ ایک توقف کے بعد بولے: ”انور سدید! آپ کو یہ سوال کس طرح سوچھا؟“ میں نے بلا توقف جواب دیا، ”آپ کی نعت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ سعادت کئی مرتبہ نصیب ہو چکی ہے۔ تاہم تمنائے بے تاب اور آرزو باقی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ان کے چند اشعار پڑھے، ان اشعار میں نہ صرف تشنگی آرزو کے عناصر موجود ہیں بلکہ سیرابی کی کیفیت بھی محسوس ہوتی ہے۔ سیرابی ان کی نعت کے آخری شعر پر محسوس ہوتی ہے، تشنگی کا احساس ان کی نعت کے آغاز پر پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر یوں لگتا ہے کہ پہاڑ سے چشمہ عقیدت پھوٹا ہے اور ہزاروں میل کا سفر کر کے سمندر میں مل گیا ہے۔

یہ جناب خالد شفیق کی چاہت کا خلوص ہے کہ مولا کریم انھیں دیارِ ناز میں بار بار بلا تے اور نواز تے ہیں، ظاہر ہے کہ جب تک بلاوانہ آئے لبوں سے ”لبیک“ کا لفظ نکل ہی نہیں سکتا... یہ سفر بھی عجب دھج کا ہوتا ہے کہ یہاں سیرابی اور تشنگی کی کیفیات ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ گویا حصولِ تشنہ لبی ہے، شدید تشنہ لبی۔ انسان کچھڑ کر بھی یادوں کی رہ گزر میں رہتا اور سفر کے بعد بھی حالتِ سفر میں زندگی گزارتا ہے۔

فطرتِ ہستی، شہید آرزو ہے اور انسان قلیل آرزو، یوں محسوس ہوتا ہے کہ خالد شفیق کے شام و سحر آرزو اور انتظار ہی کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اُن کی حیاتِ مستعار میں انتظارِ ساغر بھی ہے اور شربِ مدام کا کیف بھی، گدازِ دل بھی ہے اور حسنِ ادا بھی۔ وہ شعلہ بجاں بھی ہیں اور نغمہ بہ لب بھی۔ ان کی ملتس نگاہیں، اُسی بارگاہِ بندہ نواز کا طواف کرتی رہتی ہیں جہاں تمناؤں کی بے قرار یوں کو آسودگی نصیب ہوتی ہے، تمنا کی بے قراری ہی کا دوسرا نام انتظار ہے اور انتظار میں جوشِ آرزو تیز تر ہوتا رہتا ہے گویا تمنا کے محور اور انتظار کی قوس کے بغیر چاہت کا کوئی دائرہ بھی مکمل نہیں ہو پاتا، غالب نے کہا تھا:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا!
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

میں بنیادی طور پر تمنا اور انتظار ہی کو خالد شفیق کی نعت گوئی کا حسن سمجھتا ہوں اور اب تیر کا ان کے چند وہ نعتیہ اشعار، جن میں انتظار کا کیف اور آرزو کا سوز، جذب و جنوں کی رفعتوں کو چھو رہا ہے گو وہ اشعار بھی کم نہیں جن میں جنوں، شعور سے راہنمائی لیتا، جوش، ہوش کا دامن تھام کر چلتا اور عقیدت، عقیدے کی آنکھوں سے دیکھتی ہے... جہاں ہر لحظہ نیا طور اور نئی برق تجلی ہو، وہاں شوق کے مرحلے کبھی طے نہیں ہوا کرتے...

پھر ارضِ مقدس سے سندیس ہمیں آئے	پھر ہم کو بلائیں وہ، ہم بارِ دگر چاہیں
پھر روضے کے جلوں سے سیراب ہو گیا سکھیں	جانا ہو مدینے کو یہ شام و سحر چاہیں
اب زیست کا ہر لمحہ حرمین میں ہی گزرے	ہم لوگ دعاؤں میں اب ایسا اثر چاہیں
حاصل ہو شرف پھر سے دیدارِ مدینہ کا	ہم دل کے تڑپنے کا بس اتنا شمر چاہیں

☆☆

یوں مدینے کے چکر لگاتا رہوں	جس طرح چاند کے ساتھ ہالہ رہے
سبز گنبد تصور میں ہو ضوفشاں	اور پلکوں میں اشکوں کی مالا رہے

☆☆

ہماری راہِ منزل پر ستارے بن کے چمکیں گے
وہ دل میں نقش جو ہم نے ابھارے اُن کی چاہت کے
اُجالے زندگی میں ہر طرف پھیلیں گے اب خالد
لیے پھرتا ہوں پلکوں پر ستارے اُن کی چاہت کے

☆☆

سب مدینے کا رختِ سفر باندھ لو	گلشنِ جاں میں گر تازگی چاہیے
حاضری کا سندیسہ ملے گا، مگر	عرض اُن سے بھد عاجزی چاہیے
جا کے طیبہ میں رورو پکاروں گا میں	روشنی، روشنی، روشنی چاہیے

☆☆

ہوک سی دل سے اُنھی اور میں تڑپ کر رہ گیا
جب کوئی ساتھی چلا شہرِ مدینہ کی طرف

☆☆

اس شہرِ بے مثال کی یادیں ہیں باکمال
سوچوں میں جب بھی ڈوبا، مدینے پہنچ گیا

☆☆

جب اُن کے تصور کو بساتا ہوں نظر میں
ہو جاتا ہے کچھ اور اُجالا مرے گھر میں

☆☆

ہر اک لمحہ، ہر اک لحظہ ٹٹولا میں نے اپنا دل
مجھے تو دامنِ دل میں ملیں، یادیں مدینے کی

☆☆

اس راہ پہ اشکوں کے حسیں پھول بکھیروں
جس راہ سے رہوار مدینے کی طرف جائے

☆☆

اے کاش مقدر ہو سفرِ جانبِ طیبہ
نکلتا ہوں میں اب شام و سحرِ جانبِ طیبہ
خوابوں میں نکلتا ہوں، میں جس وقت بھی گھر سے
ہو جاتا ہوں مائل بہ سفرِ جانبِ طیبہ

☆☆

وہ چاہیں تو بے زادِ سفر مجھ کو بلا لیں
تکتے رہیں سب زادِ سفر دیکھنے والے
اک بار کے دیدار سے کیا ہوگی تشفی
منظر تو ہیں وہ بارِ دگر دیکھنے والے

☆☆

سوتا ہوں رات، دل میں تمنا لیے ہوئے
یارب! کبھی حضور کا مکھڑا دکھائی دے

☆☆

جس بات کے کہنے کا لفظوں کو نہ تھا یارا
وہ بات کہی ہم نے اشکوں کے وسیلے میں
کب میرے مقدر کی سیہ رات کٹے گی
کب ہوگا مرے گھر میں اُجالا شہ والا

☆☆

رنگ لائے گا مرا عشقِ مدینہ دیکھنا خود پہنچ جائے گا ساحل پر سفینہ دیکھنا
 کاش ہو میرے مقدر میں درِ خیر البشر کاش ہو میرے مقدر میں مدینہ دیکھنا
 ان کی یادوں کی گھٹاؤں کو اُمڈ آنے تو دو پھر مری آنکھوں میں ساون کا مہینہ دیکھنا
 آخر میں جناب خالد شفیق کا اپنے بارے میں ایک نثری اقتباس:

”عشقِ مجازی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے اس راہ پر ڈال دیا جس پر گھٹا ٹوپ
 اندھیروں کا راج تھا، اندھیرے ہی اندھیرے... ظلمتیں ہی ظلمتیں... میں
 ایک مدت تک اس ایک راہ پر بھٹکتا رہا... آنکھوں کو کچھ بھائی نہیں دیتا تھا...
 میں ٹھوکریں کھاتا، آگے ہی آگے بڑھتا رہا، دُور تک روشنی تھی نہ کوئی منزل...
 ایسے میں اچانک کسی نے جیسے میرا ہاتھ تھام لیا ہو، میں ایک سحرزدہ انسان کی
 طرح اس کے ساتھ تھوڑی دُور چلا... پھر یکا یک اندھیرے دھندلکوں میں
 تبدیل ہونے لگے اور میں ایک بند دروازے کے سامنے تھا... کسی نے
 میرے کان میں اس در پر دستک دینے کو کہا... میں جھجکا... اور پھر لرزتے
 ہاتھوں سے اس بند دروازے پر دستک دی... ایک بھینی بھینی خوش بو (جس
 نے میرا مشامِ جاں معطر کر دیا) کے ساتھ روشنی کا سیلاب سا اُمڈ آیا، تمام
 ماحول روشنی میں نہا گیا، میری روح اور میرے قلب و نظر میں روشنی ہی روشنی
 پھیل گئی، اب میرے سامنے ایک خوب صورت اور روح پرور فضا اور دل
 آویز روشنی میں نہائی ہوئی ایک کشادہ راہ تھی، جس پر چھتار درخت مستی کے
 عالم میں جھکے ہوئے تھے اور دُور ایک سبز گنبد روح پرور اور عالم افروز کریمیں
 بکھیر رہا تھا۔“ (نعت رنگ، شمارہ ۱۵، مئی ۲۰۰۳ء)

﴿پنجابی نعت نگاری﴾

لاہور کے ایک گمنام کوچے میں، جناب خالد شفیق، پیرانہ سالی، بیماری اور تنہائی کے عالم میں
 زیست کے دن پورے کرنے کی امکانی سعی کر رہے ہیں۔ ایک انتہائی مختصر مکان جسے وہ وصیتاً قریبی
 مسجد کو دے چکے ہیں، ماضی کی کتنی ہی یادوں سے آباد ہے۔ یہ یادیں نعمت بھی ہیں اور زحمت بھی کہ
 تنہائی کو بھلاتی کم اور تڑپاتی زیادہ ہیں!

کم نہیں رات کے صحرا سے مرے دل کی فضا
اور آکاش کے تاروں سے فزوں تریادیں

خالد شفیق لاہور کی بھرپور محفلوں اور لاہور کے زندہ دل ادیبوں سے شکوہ سنج ہیں کہ انھوں نے انھیں ان کی زندگی میں ہی بھلا دیا ہے کبھی اسی خالد شفیق کے دم قدم سے لاہور کی ادبی محفلیں آباد تھیں۔ اسی خالد شفیق نے اس زمانے میں رسالہ ”شام و سحر“ کے بہت سے ضخیم نعت نمبر اور سیرت نمبر ترتیب دیئے جب نعت گوئی کو رجعت پسندی سمجھا جاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ جناب صبیح رحمانی کو جزائے خیر عطا کرے کہ انھوں نے گزشتہ دنوں نعت رنگ میں خالد شفیق کے لیے ایک گوشہ مختص کیا۔ خالد شفیق کی تنہائیوں کو ہم لوگوں سے کوئی گلہ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم خود سپاسی کے آشوب میں مبتلا ہیں اور ع آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز

ہمیں ”میں“ سے فرصت ہی نہیں مل رہی کہ کسی اور کی طرف دیکھیں، نمائش ذات اور تحسین ذات کے آسیب نے ہمارے حواس مختل کر رکھے ہیں۔ ایسے میں جناب خالد شفیق صاحب! اپنے گلے میں اپنی ہی بانہوں کو ڈالے

جینے کا اب تو ایک یہی ڈھنگ رہ گیا

یہ چند سطور قلم سے بے ساختہ اس لیے نکل گئی ہیں کہ خالد شفیق کی پنجابی نعتوں کے کچھ غیر مرتب سے اوراق پیش نظر ہیں۔ قبل ازیں اردو میں ان کا نعتیہ دیوان ”عالم افروز“ کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اہل دل اس کی فکری عظمتوں اور اہل قلم اس کی ادبی حیثیتوں کا اعتراف کر چکے ہیں۔ خالد شفیق غزل گو بھی رہے اور انھیں کما حقہ علم ہے کہ تغزل، تصور کا وہ بانگین ہے جو شعورِ فن کی رفعتوں تک لے جاتا ہے۔ نثر ہو یا شعر، تغزل ہی اسے ادا کا وہ حسن عطا کرتا ہے جو جنت نگاہ بھی ہوتا ہے اور نشاط روح بھی۔ تغزل، غزل کا نہیں بلکہ اس کیفیت کا نام ہے جو کسی تحریر میں فکری گداز بن کر لو دیتی، رمز و ایماء سے بال و پر لیتی اور لطف و لطافت کے سانچے میں ڈھل کر ذہن کو قائل اور دل کو گھائل کرتی چلی جاتی ہے۔ نعت گوئی قلبی محبتوں کا قلمی اظہار ہے مگر اس اظہار کو رعنائی، تغزل عطا کرتا ہے۔

بات کرنے کی ادا ہوتی ہے

نکبت گل بھی صدا ہوتی ہے

نعت رسول پاک ثناء و توصیف کی ایک ایسی پاکیزہ، نازک اور ارفع شعری شکل ہے جس میں لفظ لفظ اور قلم قلم احتیاط کی ضرورت ہے۔ عام مدحت سے، یہ کہیں عظیم و رفیع ہے۔ ”مدح“ ممدوح

کے محاسن کی ایک ایسی سچی تصویر ہے جو خوبصورت الفاظ میں ہو اور جس سے ممدوح کی شخصیت اور اس کے ذاتی خصائص کی یوں وضاحت ہو کہ ابہام والجناس کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ اس لیے لازم ہے کہ نعت گو شعر و سخن کی نزاکتوں کا کماحقہ احساس بھی ہو اس کے دل میں ممدوح عظیم و جلیل کے لیے احترام، عقیدت اور خلوص کے جذبات بھی ہوں اس سے کہیں بڑھ کر اس کی عملی زندگی اور ظاہری ہیئت امکانی حد تک نبی کریم کی ہدایات کے مطابق ہو۔ اگر یہ نہیں تو اسے تلواری کی دھار پر چلنے سے بچنا چاہیے اور بیدل کے الفاظ میں:

ز فکرِ حمد و نعتِ اولیٰ ست برخاکِ ادبِ خشن
بجودے می تو اں کردن، درودے می تو اں گفتن

نعت گوئی مجاز کی بے نام وادیوں میں بہکنے اور بھٹکنے والے شاعروں کو سکون منزل عطا کرتی ہے اور ایک ایسا درد دیتی ہے، جس کے بعد کسی اور چوکھٹ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ ایک ایسی دیوار مہیا کرتی ہے جس سے ہر دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے اور ایک ایسی یاد بخشی ہے جو دل کو ہر نقشِ ماسوا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

رنگِ جذبِ شوق جو بن پر ہو تب ہوتی ہے نعت
دل کا ویرانہ مہک اٹھتا ہے، جب ہوتی ہے نعت
طاقِ فکرِ نارسا میں، ان کی یادوں کے چراغ
گرنہ ہوں صبح و مساروشن، تو کب ہوتی ہے نعت

گویا دنیا نے نعت میں قلبِ سلیم کے ساتھ ساتھ قلم کے اس خرام ناز کی بھی ضرورت ہے جو لفظ لفظ کو پھول بناتا چلا جائے اور یہ بھی حق ہے کہ رسول پاک سے جتنا قلبی لگاؤ ہوگا، یہ لفظ پھول اتنی ہی زیادہ مہک بکھیرتے اور بانٹتے چلے جائیں گے۔

یہ کس نے دے کے دل اپنی محبت ڈال دی اس میں
ذرا سادل دیا، دل میں متاعِ دو جہاں رکھی دی

اللہ تعالیٰ نے خالد شفیق کے دل کو حب رسول کی نعمت بھی عطا کی ہے اور ان کے قلم کو اداءِ اظہار کی ثروت بھی۔ وہ اس عطا پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں کہ:

کلکِ ثناء کو نور کی موجوں میں رکھ دیا
یعنی گدازِ عشق کو ہونٹوں میں رکھ دیا

کتنا کرم کیا ہے خدائے رحیم نے
ان کی ثناء کو ڈوبتی سانسوں میں رکھ دیا

ان کے زیر نظر مجموعہ نعت میں سکون و عافیت سے لبریز ایک طمانیت کا احساس ملتا ہے، یوں لگتا ہے کہ کوئی جلوہ ہے کہ فردوس نظر بن کر انہیں ہر نظارے سے بے نیاز کر گیا ہے، کوئی حقیقت ہے کہ بصارت کو بصیرت کے انوار بخش گئی ہے۔ سماعت ہے کہ ایک نوائے شوق کے سوا ہر آواز پر بند ہو چکی ہے۔ زبان ہے کہ اسی کی توصیف میں ”رطب اللسان“ ہے جس کی تعریف میں وہ ذات بلند و برتر بھی مصروف ہے جس کے لیے ہر تعریف وقف ہے۔ اب اس لطف و التفات کی ایک جھلک دیکھیے:

میری لکھتاں اندر بجیا، سوہنا نام محمد دا
سوچاں داسرما یہ بنیا، سوہنا نام محمد دا

دکھ دی کالی رات وی مینوں سکھ سنیہڑے دیوے
یاد نبی دے دل اندر رہندے نت اجالے
جے لفظ ساتھ نہ چھڈن سدا ثناء لکھاں
قلم پھڑاں تے میں بس نعت مصطفیٰ لکھاں
حضور نوں میں نگہواں دی روشنی سمجھاں
حضور نوں میں محبت دی انتہا لکھاں

اوہدی گل کرے تے راحت ملدی اے
اوہدی راہ چلے تے پینڈے مکدے نیں

دل دے اندر چارے پاسے اوہناں دیاں تصویراں نیں
جہاں ہتھ جنت دی کنجی، امت دیاں تقدیراں نیں
اوہناں کول شفاعت، رحمت، شفقت بھرے خزانے نیں
ساڈے اندر، ساڈے باہر، ہر پاسے تقصیراں نیں

خواباں وچ جے آوے سوہنا، پیاس بجھے ایس دل دی
نعتاں دے میں گجرے ودھ کے سوہنے دے گل پاواں

دل دے اندر یاد نبی دی پھلاں وانگوں مہکے
دل دے باہر چمکاں مارے، پیارا شہر مدینہ

رب سوہنے دے درتے خالد سیس نواواں ہر دم
میرے دل بوہے تے جس نے لکھیا اوہ اناں

ان اوراق میں بہت سی نعتیں ایسی ہیں جو گنبد خضرا کی رعنائیوں کے گرد گھومتی ہیں، یاد رہے کہ شروع میں حجرہ انور پر گنبد انور نہیں تھا۔ ۱۲۷۹ء میں پہلی مرتبہ گنبد تعمیر کیا گیا۔ جو چھت کے نیچے مربع شکل اور اوپر ہشت پہلو تھا۔ ۱۳۸۳ء میں حاکم مصر کے حکم سے امیر مدینہ نے گنبد کی تجدید کرائی، انہوں نے کالے پتھر سے تعمیر کرا کے اس پر سفید رنگ کرایا۔ ۱۸۱۸ء میں سلطان محمود بن سلطان عبدالحمید ثانی نے نیا گنبد بنوایا اور اس پر سبز رنگ کرنے کا حکم دیا جس کی وجہ سے گنبد خضرا کے نام سے شہرت پذیر ہوا۔ جواب تک درخشندہ و تابندہ اور مرجع خلایق بنا ہوا ہے۔ یہی سبز گنبد ان اوراق میں جا بجا لودے رہا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

سارے جگ لئی خیراں منگے، سوہنا ساوا گنبد
جگ نوں نوری کرناں ونڈے، سوہنا ساوا گنبد
گمراہی توں بچنا جے تے میرے پٹھاں آؤ
ایہہ گل سارے جگ نوں آکھے، سوہنا ساوا گنبد

دنیا دے بھغم مک جانڈے، ساوے گنبد تھلے
غم دے مارے جد لک جانڈے، ساوے گنبد تھلے

ساڈے پاک نبی دے ویہڑے خشبواں دا پہرہ
ساوے گنبد آل دوالے خشبواں دا پہرہ

اوس گنبدی شان نرالی عظمت اوہدی عالی
جس سوہنے دے اندر باہر چمکن چن ستارے

.....

ہر ویلے اوہ ساوا گنبد نظراں اگے پھر دا
جتھے اج وی خیراں ونڈے امت داسرناواں

الغرض خالد شفیق کی نعتیہ شاعری میں محبت کا خلوص جلوہ گر ہے۔ فن اور جذبے کا ایک دل آویز امتزاج دکھائی دیتا ہے، ان کے ہاں نکتہ رسی بھی ہے اور معنی آفرینی بھی۔ لطف زباں بھی ہے اور ندرت اظہار بھی۔ عرفان و آگاہی کے ساتھ ساتھ اسلوب و ادا کے سلیقے سے ہم آہنگ عقیدت، عقیدے کی انگلی تھام کر رواں دواں ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری کو رنگ، سوز دروں کی آنچ نے اور آہنگ غزل کی ایمائیت نے عطا کیا ہے آخر میں ان کی ایک نعت کے چند شعر ایک خوبصورت تسلسل کے ساتھ:

جذبیان وچ ڈبو کے خالد
پلکاں پیٹھ لکو کے خالد
نعت دیاں خوشبوواں ونڈاں
ہنجوہار پرو کے خالد
اوہدا ناں ہونٹاں تے لیاواں
مونہہ خشبوئال دھوکے خالد
کملی والا آپ بلاسی
کیوں بھرناں ایں ہوکے خالد
جنت دے دل جانڈے رستے
طیبہ وچوں ہو کے خالد

جیسا کہ ابتداء میں ذکر ہوا ہے کہ خالد شفیق، کبھی لاہور کی روح و رواں تھے، آج وہی خالد شفیق اپنے ہی مزار کا چراغ بنے ہوئے ہیں، میری دعا ہے کہ یہ چراغ روشن رہے۔ ان کے لڑکھڑاتے، روز و شب کو صحت سکون اور عافیت نصیب ہو اور ان کی یہ نعتیں ان کی دنیاوی زندگی کو رعنائی عطا کریں۔
(دیباچہ، ”نعت سوغات“ ۲۰۰۸ء)

﴿اہل نظر کی نظر میں﴾

”شام و سحر“ کے خصوصی شماروں میں اردو کے تابندہ نقوش ہی نہیں ہیں، پاکستان کی دیگر زندہ رہنے والی زبانوں نے نعت کے حوالے سے جو نقش چھوڑے ہیں ان کے آثار بھی موجود ہیں اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شمارے نعت گوئی کی قاموس یا انسائیکلو پیڈیا ہیں۔ (پروفیسر شفقت رضوی)

محمد طفیل کے مجلہ ”نقوش“ کے رسول نمبروں کی اشاعتِ دل پذیر کے بعد خالد شفیق نے بھی ”شام و سحر“ کے عظیم الشان نعت نمبر تواتر کے ساتھ شائع کر کے دوسرا بڑا تجدیدی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ (ریاض حسین چودھری)

خالد شفیق نے جذبے کی تحریک بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ (حفیظ تائب)

میں تو نعت کو دربارِ اقدس کی خیرات تصور کرتا ہوں، جتنا وہ دامنِ طلب میں ڈال دیتے ہیں، اس کا ظہور نعتیہ اشعار میں ہوتا ہے۔ بحمد اللہ برادرِ مکرم خالد شفیق کو اس خیرات سے وافر حصہ ملا ہے۔ (حافظ لدھیانوی)

خالد شفیق کے نعتیہ کلام سے آن حضور سے محبت اور والہیتِ قلب و جگر کی جن گہرائیوں سے ابھرتی ہے، وہ خاصے کی چیز ہے۔ (علیم ناصری)

نعت نگاری ہی نے خالد شفیق کو ”شام و سحر“ کا نعت نمبر چھاپنے پر مائل کیا، یہ کام انھوں نے کر دکھایا اور انھیں اتنا بھایا کہ انھوں نے کئی نعت نمبر چھاپ ڈالے اور اب وہ فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے سب سے زیادہ تعداد میں ضخیم نعت نمبر پیش کیے ہیں اور تعداد و مقدار کے ساتھ پیشکش کا معیار بھی بلند کیا ہے۔ (انور سدید)

خالد شفیق انتہائی خوش قسمت ہے کہ اس نے اپنا تن، من، دھن ثنائے خدائے برتر اور ثنائے محسن عالم کے لیے وقف کر رکھا ہے اس کے 'شام و سحر' کے مرتب کردہ ضخیم نعت نمبر اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ (منظور وزیر آبادی)

.....

خالد شفیق کا کلام کلاسیکی روایت سے ان کی وابستگی کا عکاس ہے۔ بیان میں جذبے کا والہانہ پن، موضوع سے ان کی شیفتگی کا آئینہ دار اور ان کے نعتیہ کلام "عالم افروز" کا پیش لفظ بہ عنوان "مجاز سے حقیقت تک" ان کے دینی خلوص دامان مصطفیٰ تھامنے کی تڑپ اور اتباع سید الکونین میں ریاضت اور اس کا بے ریا اظہار ہے۔ یہ تمام نشانیاں نعت نگاران عصر حاضر میں انھیں ایک ممتاز مقام دلانے کے لیے کافی ہیں۔ (عزیز احسن)

.....

'شام و سحر' کے مرتب نے پاکستان کی کم و بیش تمام علاقائی زبانوں کے نعتیہ ادب کا جائزہ شامل مجلہ کیا ہے، یہ زبانیں ہیں، بلوچی، براہوی، کشمیری، گوجری، پشتو، پنجابی۔ نعت کا تجزیہ بذات خود ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ (میرزا ادیب)

.....

زیر نظر نعت نمبر میں سیرت طیبہ سے متعلق نظم و نثر میں بہت سے بیش بہا مضامین کے علاوہ کئی اساتذہ کے لکھے ہوئے سراپائے خیر الامام، نعتیہ قصائد، اور بلوچی، براہوی، کشمیری اور گوجری نعت گوئی کے عمدہ نمونے درج ہیں۔ نیز کئی مشہور نعت گو شعراء کی نعتوں پر تبصرے بھی ہیں۔ (ماہنامہ ضیائے حرم اپریل ۱۹۸۲ء)

.....

ہمارے ادب کا یہ عہد، نعت کا عہد ہے اور نعت ہی کے مقدس وسیلے سے ہم شخصی اور اجتماعی ہر دو سطح پر اپنی بازیافت کے اس عظیم عمل سے گزر رہے ہیں جو ہماری بقا کا واحد ضامن ہے۔ حق یہ ہے کہ 'شام و سحر' کا موجودہ نعت نمبر

اردو ادب کا ایک جہت ساز شمارہ ہے۔ (عارف عبد المتین)

چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے اس خزانہ جواہر میں سے کس کس کو لولا کا نمونہ پیش کیا جائے کہ ہر صفحہ اور ہر صفحے کا ہر شعر دامن دل اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور اس محفلِ نیاز میں شریک ہر مقالہ نگار اور شاعر کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ (ماہنامہ محفل لاہور، اپریل ۱۹۸۱ء)

نعتوں کے انتخاب اور فنی محاسن پر تو قلم اٹھانا یہاں ممکن نہیں، تاہم کہا جاسکتا ہے کہ 'شام و سحر' اردو اور پنجابی کے رنگارنگ پہلو اور طرزِ بیان کی حامل نعتوں کا ایک خوب صورت اضافہ ہے، اس کا مکمل استحسان تو اہل نظر ہی کر سکیں گے اور اسی لیے انھیں اس نعت نمبر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ (سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ جون ۱۹۸۱ء)

ہماری شاعری میں نعت ایک ایسا وسیع اور سدا بہار موضوع ہے کہ اس پر برسوں کام کرنے کے باوجود حق ادا نہیں ہوتا، تاہم 'شام و سحر' کا نعت نمبر اس لحاظ سے قابلِ تعریف ہے کہ اس میں ہر مکتب فکر کے نمائندہ شعراء کی اچھی نعتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ نعتوں کے علاوہ، نعت کے موضوع اور معروف نعت گو شعراء کے فن اور شخصیتوں پر کئی مقالات شامل ہیں۔ (اردو ڈائجسٹ لاہور۔ جولائی ۱۹۸۱ء)

حقیقت یہ ہے کہ جس حسنِ احتیاط، خلوص، عقیدت اور محبت سے، یہ نعت نمبر مرتب کیا گیا ہے۔ وہ داد و تحسین سے قطعی بے نیاز ہے، یقین ہے کہ یہ ہدیہ عقیدت و محبت بارگاہِ رسالت مآب میں شرفِ قبولیت پائے گا۔ (روزنامہ امروز لاہور۔ ۳۰ جنوری ۱۹۸۱ء)

’شام و سحر‘ کا یہ خصوصی نمبر، نعت گوئی اور نعت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں ایک حصہ ”ہدیہ نعت“ کے عنوان سے ہے، جس میں مختلف شعراء نے حضرت امام الانبیاء کے حضور نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن اس کا اہم حصہ وہ ہے جو مضامین پر مشتمل ہے اور اس میں مختلف نعت گو شاعروں کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ اور لکھنے والوں نے بڑی تفصیل سے اپنے موضوع کو سمیٹا ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ ۲۴ اپریل ۱۹۸۱ء)

کچھ نعتیہ اشعار

ہم نے تو زندگی میں اجالوں کے واسطے
دل سے لگا لی چاندنی، بٹھا کے چاند کی
☆☆

وہ مرحلے کہ جان کے درپے تھے رات دن
وہ مرحلے بھی طے ہوئے صدقے درود کے
☆☆

جو عظمتِ رسول کی شاہد ہیں آج بھی
پہاں وہ ساعتیں ہیں دیارِ رسول میں
☆☆

نازشِ علم و فن، ذکرِ شاہِ ام
ردِ رنج و محسن، ذکرِ شاہِ ام
☆☆

تھے جذبے طل میں جتنے بھی ہلے ان کی چاہت کے
وہ ڈھلکے آنکھ سے بن کر ستارے ان کی چاہت کے
☆☆

ساری کلیاں ثنا کی خدا کے لیے
اور درودوں کے گلِ مصطفیٰ کے لیے

☆☆

ان کے اسوہ سے خیرات کروں کی لو
زندگی میں اگر روشنی چاہیے

☆☆

بخشش کا خزینہ ہے، فردوس کا زینہ ہے
امول خزینہ ہے، تفسیر مدینے کی

☆☆

سمائے اس طرح حرمین کے جلوے تصور میں
مدینہ میرے دل میں ہے تو کعبہ میری آنکھوں میں

☆☆

آسماں سے قافلہ در قافلہ دیکھا رواں
نور کا اک سلسلہ شہر مدینہ کی طرف

☆☆

اجالوں کی طرح اجلے گلی کوچے مدینے کے
فراز عرش کے تارے گلی کوچے مدینے کے

☆☆

راو طلب میں نکلا، مدینے پہنچ گیا
بھٹکا ہوا جو سنبھلا، مدینے پہنچ گیا

☆☆

قلعت کاہراک نقش مٹانے کے لیے تھا
وہ چاند جو قدرت نے اچھا لاسر قاراں

☆☆

اس ماو جہاں تاب کی آمد سے ہوئے ختم
نئے نئے جہاں میں وہ دبجور کے چہرے

☆☆

انہیں ماحول کی کوئی گھٹن اچھی نہ لگتی تھی
جہاں جس میں تازہ ہوائیں بانٹتے آقا

☆☆

جب اُن کے تصور کو بساتا ہوں نظر میں
ہو جاتا ہے کچھ اور اجالا مرے گھر میں

☆☆

ہراک لمحہ، ہراک لحظہ ٹٹولا میں نے اپنا دل
مجھے تو دامنِ دل میں ملیں، یادیں مدینے کی

☆☆

وہ خطہ جنت ارضی، وہ مرکز ہے بہاروں کا
مدینے کا تصور جب بھی آئے، پھول کھلتے ہیں

❦❦

پروفیسر محمد اکرم رضا.....چند یادیں

ABSTRACT:

Memoirs of the period, Late Professor Akram Raza was a colleague of writer have been penned down for the sake of remembrance. Professor Akram Raza has left behind his various valuable writings. He continuously contributed towards Poetry, Prose and Critical treasure of Natia Literature. His articles have had been published in various journals of genre of Naat. College Magazines, particularly "GUJRANWALA NUMBER OF MAHAK" were also brought out with his help by the writer of this article.

مقصود تحریر پروفیسر محمد اکرام رضا مرحوم کے ادیبانہ رنگ، خطیبانہ ڈھنگ اور نعتیہ آہنگ کا احاطہ نہیں ہے بلکہ کچھ بکھری یادوں کو یکجا کرنے کی ایک امکانی سعی ہے کہ انسان مرحوم ہو جاتے ہیں مگر یادیں مرحوم نہیں ہوتیں وہ پسماندگان کو تڑپاتی بھی رہتی ہیں اور بہلاتی بھی۔

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا مُرد کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانِ راحت الاذعان ہے کہ جانے والے کے محاسن کا تذکرہ کیا کرو اور حق یہ ہے کہ یاد کا حسن جانے والے کے لیے خود بخود دعا کے سانچے ہوئے ڈھل جایا کرتا ہے۔ یادوں کے اس سلسلے میں ایک زمانی ترتیب تو ہوگی مگر سال و ماہ کی تعیین نہیں کہ مجھ پر نسیان غالب ہو رہا ہے اور بڑھاپا مسلط ہے۔

از بر تھے کبھی مہر و کواکب کے بھی شجرے اب تو میں خود اپنا بھی پتا بھول گیا ہوں عرصہ ہوتا ہے کہ جناب ارشد میر مرحوم نے ”چونبڑاں“ کے نام سے اپنے مزاحیہ مضامین کو یکجا کیا تھا اس کی تعارفی تقریب تھی صدارت غالباً چودھری فضل حسین یا انور مسعود کی تھی وہاں کے شکر گڑھ سے آنے والے حسن و شباب کے ایک پیکر نے مختصر سی تقریر کی الفاظ و تراکیب کے شکوہ نے

مجھے بے حد متاثر کیا اور یہ تھے پروفیسر محمد اکرم رضا۔ تقریر اور تقریب کے بعد ذاتی ملاقات کا موقع نہ ملا اور بات آئی گئی ہوگی۔

۱۹۷۶ء میں، میں نے ”محزن نعت“ کے نام سے ایک نعتیہ انتخاب مرتب کیا۔ قبل ازیں اس ضمن میں شفیق بریلوی، ممتاز بریلوی اور فرمان فتح پوری کی کاوشیں شائع ہو چکی تھیں بات ہے تب کی جب معیاری نعت ڈھونڈنا پرتی تھی اور نعت کو بطور صفِ سخن تسلیم ہی نہیں کیا جاتا تھا میں نے ان تینوں کتابوں میں شامل نعتوں سے مختلف نعتوں کو جمع کرنے کی سعی کی اور ہر نعت پر قرآنی، علمی اور تاریخی اشارات بھی دیئے۔ رائٹرز گلڈ نے اس انتخاب نعت کو تصنیف قرار دیتے ہوئے خصوصی اعزاز سے نوازا تھا۔ نعتیہ جستجو کے دوران میں نوائے وقت میں محترم محمد اکرم رضا کی ایک نعت نظر سے گزری میں نے اُسے ”محزن نعت“ میں شامل کیا۔ ذاتی شناسائی تب بھی نہیں تھی نعت کا حق تھا جو اُسے ملا اس نعت کے دو شعر دیکھیے:

معدنِ جود و سخا، کانِ حیا، شمعِ ہدا مرجبا، شوکتِ کردار، رسولِ عربی

تو نے ذروں کو بھی افلاک کی رفعت بخشی روحِ انسانی کے معیار، رسولِ عربی

پھر پروفیسر موصوف سیالکوٹ سے گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے شعبہ اردو میں تشریف لے آئے، یوں ذاتی شناسائی کا آغاز ہوا۔ جناب سید علی عباس جلال پوری کے بعد میں صدر شعبہ اردو تھا او کالج کے ایک ادبی مجلہ ”مہک“ کا مدیر میری ادارت میں ”مہک“ کے عام شماروں کے علاوہ سیرت نمبر، اقبال نمبر دو جلدوں میں اور قائد اعظم نمبر شائع ہوئے جنہیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اندرون ملک اور بیرون ملک پذیرائی نصیب ہوئی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال نمبر کو اقبال پر ایک انسائیکلو پیڈیا قرار دیا۔ سیرت نمبر کے بارے میں واصف علی واصف مرحوم نے منظوم خراج تحسین عطا کیا اور اپنی کتاب ”کرن کرن سورج“ عنایت فرمائی۔ اخبارات میں تبصرے بھی ہوئے۔ ۱۹۸۲ء میں گورنمنٹ کالج کا جشن سیمیں منایا گیا میں نے سوچا کہ اس موقع پر ”مہک“ کا گوجرانوالہ نمبر شائع کیا جائے اس نمبر کا مقصود گوجرانوالہ کی تاریخ و ثقافت اور شخصیات و نوادرات کا احاطہ تھا اور یہ بھی کہ اس میں کالج کے بارے میں ایک خصوصی گوشہ بھی ہو۔ کام خاصا وسیع اور محنت طلب تھا میں نے پروفیسر محمد اکرم رضا سے اس سلسلے میں اعانت چاہی وہ بخوشی رضامند ہو گئے میں نے اور اکرم رضا مرحوم نے مقدور بھر کوشش کی بلکہ ایک جنوں تھا جو ہمیں اڑائے پھر رہا تھا ایک موقع پر میں نے چاہا کہ گوجرانوالہ کی مرحوم شخصیات کے دستخط حاصل کیے

جائیں۔ اے۔ ڈی، ماڈل ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور معروف شاعر ملک منظور حسین منظور کے دستخط حاصل کرنے کے لیے میں اور پروفیسر موصوف تپتی دوپہر میں سائیکلوں پر اے۔ ڈی، ماڈل ہائی اسکول پہنچے اس وقت کے ہیڈ ماسٹر انتہائی بے رخی سے پیش آئے کسی نے رہنمائی کی وہاں سے حافظ آباد روڈ پر ایک دور افتادہ محلے میں اسکول کے سابق کلرک کے گاؤں پہنچے۔ انھیں قیلو لے سے بیدار کیا انھوں نے بڑی تلاش کے بعد ملک صاحب کا ایک مکتوب دیا جس سے ہم نے اُن کے دستخط حاصل کیے یہ صرف ایک واقعہ ہے ہماری سعی بلیغ کا۔ میں نے ”مہک گوجرانوالہ نمبر“ کے ادارے کے آخر میں لکھا تھا:

”یہ محض خراج عقیدت ہے آنسوؤں کا ایک حقیر نذرانہ ہے اعماقِ قلب سے

ابھرتی ہوئی دھڑکنوں کا ایک ارمغاں ہے اور بعد میں آنے والوں کے لیے

ایک نشانِ راہ ہے۔“

وحشت ہماری بعد فنا پھیل جائے گی اب تم پھرو گے، چاک گریباں کیے ہوئے

اور اُسی ابتداء کی ابتدا کے چند جملے:

”مہک کا یہ شمارہ ایک تذکرہ ہے:

☆ ان شخصیات کا جن کے انفاس کی مہک سے یہ سرزمین آج بھی مشکبار ہے۔

☆ ان شہیدوں کا جن کے لہو کی تجلیوں نے ہمیں یقین و ایمان کا سرمایہ عطا کیا۔

☆ ان اربابِ شعر و ادب کا جن کا تخیل موتی بکھیرتا اور ستارے ابھارتا رہا۔

☆ ان شہسواروں کا جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے۔

☆ ان پہلوانوں کا جن سے ایک دور لڑتا رہا۔

☆ ان جنوں والوں کا جن کے دامن کے تار، بہار کا نشان بنتے رہے۔

☆ ان بابغہ روزگار افراد کا جنہوں نے ملی زندگی میں حیات معنوی کی بنیاد رکھی۔

☆ ان اساتذہ کا جن کے قلم کی نوک پر چاند کی طباشیری کرنیں مچلتی رہیں۔

☆ ان دلوں کے پیچ و تاب کا جنہوں نے ایک نسل کو سوز دروں کی دولت بخشی۔

☆ ان عظمتوں کا جن کا اعتراف آسمان بھی جھک کر کرتا رہا۔

☆ ان اداروں کا جنہوں نے خونِ جگر سے علم و عرفان کے چراغوں کو روشنی دی۔

☆ اس بیاباں کا جس نے گریبانوں کے چاک سے سورج ابھرتے اور انوار بکھرتے دیکھے۔

☆ اس دور کا جس نے پھرائی ہوئی آنکھوں سے آمریت کے استبداد اور اہل یقین کے صبر و استقامت کا نظارہ کیا۔

گویا: اس میں وقت کی سنگینیاں بھی ہیں اور ماضی کی رنگینیاں بھی، ادب کا جلال بھی ہے اور شاعری کا جمال بھی۔ نہفتہ حکایتیں بھی ہیں اور شگفتہ روایتیں بھی، کانٹوں کی نیش زنی بھی ہے اور صحرانوردی کی آبلہ پائی بھی، حدیث دیر و حرم بھی ہے اور میکدے کا سوز و ساز بھی۔ سلاسل کی دلکش جھنکار بھی ہے اور قفس کی دلکش فضا بھی۔“

جناب پروفیسر محمد اکرم رضا کے مخلصانہ تعاون کے پیش نظر میں نے رسالے کی ترتیب و تدوین میں انھیں اپنے ساتھ برابر کا مقام دیا یہ کوئی احسان نہ تھا بلکہ ان کا حق تھا۔ رسالے کے آخر میں صفحہ ۱۱۲۲ پر اعانت کے عنوان سے یہ وضاحت بھی درج ہے:

”ضلع گوجرانوالہ کی تاریخ کے جملہ پہلوؤں کو سمیٹنے کی کوشش ایک جانکاہ کام ہے۔ یہ کام کلیتاً تحقیقی انداز کا ہے اس میں مختلف شخصیات سے روابط، بھاگ دوڑ اور ملک بھر کے کتب خانوں کی چھان بین شامل ہے، ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے دنوں کی اس تپش اور شبوں کے اس گداز میں، ہمارے ادارے کے بہت سے طلبہ ہمارے ساتھ رہے۔ ہم نے ایک ٹیم ترتیب دی۔ انھیں مختلف نوعیت کے کام سپرد کیے بعض کو مخطوطات جمع کرنے کے لیے مخصوص کیا بعض لائبریریوں سے متعلقہ مواد لاتے رہے بعض کتابت شدہ مواد کی درستی میں ادارے کے ساتھ منسلک رہے۔ تحقیق و تجسس کے اس کام میں طلبہ نے جس بھرپور انداز سے ادارے کا ہاتھ بٹایا اس سے نہ صرف ہمارا حوصلہ بڑھا بلکہ طلبہ میں بھی تاریخی جستجو کا شوق ابھرا اور ان کے ادبی ذوق میں نکھار پیدا ہوا اور اس سے زیادہ طلبہ سے توقع بھی نہیں کی جاسکتی اور کالج کے ادبی مجلہ کا مقصود بھی یہی ہے کہ وہ طلبہ کے علمی شوق کو تحقیق کا راستہ بھائے اور قلم کے اس تاریخی سفر اور تحقیقی سفر میں ہم نے اس ڈھب پر طلبہ کی تربیت کرنے کی بساط بھر کوشش کی جن طلبہ کا تعاون ہمارے ساتھ رہا ان کے نام درج ذیل ہیں (۳۴ طلبہ کے نام) ان طلبہ کے علاوہ ترسٹھ سابق اور موجودہ طلبہ کی قلمی نگارشات بھی شریک ہیں۔ دو معاون مدیران کے علاوہ ہیں۔“

چوں کہ یہ ایک مشترکہ کاوش تھی۔ اس لیے چند مضامین کے سوا کسی مضمون پر کسی کا انفرادی نام نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ میں نے اور پروفیسر محمد اکرم رضا مرحوم نے مہک گوجرانوالہ نمبر مرتب کر کے محض اپنا فرض منصبی ادا کیا تھا اور ہم نے اس رسالے پر ”جملہ حقوق مع حق ترتیب و تدوین اور اشاعت کلی و جزئی محفوظ ہیں۔“ لکھ کر یہ حقوق گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کے نام محفوظ کر دیئے تھے تاکہ بعد میں کوئی اس پر شب خون نہ مار سکے اور گھر کی چیز گھر میں رہے۔ حقوق اشاعت کلی و جزئی محفوظ رہیں گویا اس رسالے کا ایک ایک لفظ کالج کی ملکیت ہے۔

نویسنده رانست فردا امید

نوشته بماندیه برسفید

اس رسالے کی تقریب رونمائی کی صدارت روزنامہ جنگ کے بانی جناب میر ظلیل الرحمن نے کی تھی کہ اُن کا تعلق بھی اسی دیار ناز سے تھا مجھے یاد ہے کہ اس تقریب رونمائی میں جناب پروفیسر وارث میر نے اپنے دبنگ لہجے میں فرمایا تھا کہ:

”میرے بس میں ہو تو رسالے کے مرتبین کو حسن کارگردگی کا صدارتی تمغا عطا کروں۔“

۱۱۳۲ صفحات پر پھیلے ہوئے اس رسالے کا تذکرہ اس لیے طویل ہو گیا کہ کل کے مورخ اور ناقد صورت حال سے آگاہ رہیں۔ بہر کیف یہ ایک نذرانہ ہے اُس ادارے کے لیے جس نے ہم دونوں کو وقار و اعتبار کی لازوال ثروت عطا کی یہ الگ بات کہ

اب وہ دیار بھی ہمیں پہچانتا نہیں اک عمر جس میں نالہ سرا در بدر رہے

اس کے بعد میں نے ”مہک“ کی ادارت کلیتاً پروفیسر محمد اکرم رضا مرحوم کے سپرد کردی اور خود بطور نگران کام کرتا رہا۔ اس زمانے میں ہم لوگ بے ریش و برت اور سوئڈ بوئڈ ہوا کرتے تھے اور ڈاڑھی رکھنا ”جہاد“ سے کم نہ تھا۔ پروفیسر عطاء الرحمن عتیق اسی ہیئت کدائی کے ساتھ ایک مسجد میں خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ وہ بہترین علمی اور دینی خوبیوں سے متصف ہیں اور اسی نوع سے پروفیسر محمد اکرم رضا نعتیہ محافل میں شامل ہوا کرتے تھے جناب پروفیسر غلام رسول عدیم نے مدرسہ نصرت العلوم میں داخلہ لیا۔ حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر کی توجہات کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے ڈاڑھی رکھ لی اُن کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت اور توفیق بخشی۔ مرحوم میاں محمد اکرم پرنسپل گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ کی قلبی صلاحیت نے بھی اُن کے چہرے کو سنت رسول سے مزین کر دیا۔ میں عتیق صاحب اور رضا صاحب دونوں کو ترغیب دیا کرتا تھا اور یہ ترغیب گاہے گاہے سخت لہجہ بھی اختیار کر لیا

کرتی تھی۔ بالآخر دونوں کو توفیق نصیب ہوئی اور وہ علم و نظر کی فضیلتوں کے اعتبار سے ترغیب دینے والے کو غبار کارواں کی طرح پیچھے چھوڑ گیا۔

میں کارواں کی راہ سمجھتا رہا جسے صحرا کی ریت پر وہ ہوا کی لکیر تھی آج نئی پود کی اکثریت ڈاڑھی بطور فیشن رکھ رہی ہے کاش وہ سنت پاک رسول کا اتباع کرتے ہوئے اپنے عمل کو نیت کا حسن عطا کرے کہ سوچ کا رخ اور نظر کا زاویہ بدل جائے تو منظور خود بخود بدل جایا کرتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے محمد اکرم رضا کو نیشنل سائنس کالج میں اپنے ساتھ رکھا اور ہم ایک عرصہ اکٹھے رہے شام و سحر لاہور، نعت لاہور، نعت رنگ کراچی اور مفیض گوجرانوالہ میں بفضلہ فن نعت کے سلسلے میں ہم دونوں کے مضامین شائع ہوتے رہے انھوں نے بہت کچھ لکھا وہ خوش نویس بھی تھے اور زود نویس بھی۔ انھوں نے ۲۰۰۲ء میں کم و بیش ۲۰۰ اشعار پر مشتمل نبی پاک کے حضور میں سلام لکھا اور چاہا کہ میں اس کا پیش لفظ لکھوں۔ میں نے ”تحسین حسن“ کے عنوان سے ایک مبسوط تعارفی تحریر لکھی جو اس کتاب کے ساتھ طبع ہوئی ایک اقتباس دیکھیے اس میں اُن کی فکری صلاحیتوں اور قلبی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔

”پروفیسر محمد اکرم رضا کو اللہ تعالیٰ نے سوز دل کے ساتھ سازنوا بھی عطا کیا ان کی تحریر و تقریر میں مفہوم کی وسعت کے پہلو بہ پہلو الفاظ کی شوکت بھی نمایاں ہوتی ہے ترصیع کی نادرہ کاریاں اور بدیع کی فسوں سازیاں ان کے قلم کا سرمایہ افتخار ہیں مگر ان کا یہ سلام پڑھ کر مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی ہے کہ اس میں نہ تراکیب و تشبیہات کی مشکل پسند پیچیدگیاں ہیں اور نہ تلمیحات و استعارات کی مجاز آفرینیاں بلکہ درد دل کا وہ بے ساختہ اظہار ہے جو پلکوں پر لرزنے والے آنسوؤں میں ہوتا ہے لفظی صنائی للکار کی شان ہے پکار کی نہیں یہ سلام جمال رسالت اور کمال سیرت کا ایک ایسا مترنم اظہار ہے کہ روانی سلاست اور سادگی اس کا حسن ہے میں اظہار کی اسی بے ساختگی کو اس کی اہم خصوصیت سمجھتا ہوں یوں لگتا ہے کہ سلام کہتے کہتے اکرم رضا خود کو بھول گئے ہیں اور الفاظ و تراکیب کے زرتا و آویزے اپنی حیثیت کھو بیٹھے ہیں کہیں ان کا تصور حسن روئے رسول سے مہکتا ہے کہ وہ حسن رخ جمال

الہی کا آئینہ ہے کہیں ان کا خیال سیرت سے تابانی لیتا ہے کہ وہ سیرت زندگی کی ہر ظلمت کے لیے اجالا ہے کہیں وہ سراپا آرزو ہیں کہ وہ ذات اقدس رحمت باری کے کمال کی انتہا ہے پروفیسر محمد اکرم رضا کی یہی وہ خود فراموشی ہے جس پر شعور و آگہی بجا طور پر ناز کر سکتی ہے۔“

تیرا خیال ہے تیرا جمال ہے تو ہے مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں جناب پروفیسر محمد اکرم رضا مرحوم بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ فی الواقع ایک قلمی سرمایہ ہے جو وہ اپنے پسماندگان کے لیے بطور ورثہ چھوڑ گئے ہیں۔ جملہ ناشرین کا اخلاقی اور شرعی فرض بنتا ہے کہ وہ بکنے والی کتابوں کی رائیٹی اُن کے ورثا کو باقاعدہ ادا کرتے رہیں کہ ہر بکنے والی کتاب میں ناشر کا بھی حق ہے اور مصنف کا بھی۔ رضا مرحوم کی جملہ کتابیں اب اُن کے ورثا کی ملکیت ہیں نہ وہ کسی ناشر کی ملکیت ہیں اور نہ ناشر کے ورثا کی، بات حقوق العباد کی ہے جس کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بھی نہیں رکھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کل ناشرین کی نیکیاں مصنف مرحوم کے کھاتے میں اور مرحوم کی بشری لغزشیں ناشرین کی کھاتوں میں منتقل ہو جائیں۔ حقوق العباد کے سلسلے میں ہم سب کو انتہائی محتاط رہنا چاہیے غالب کہاں یاد آ گیا بہ تصرف ادنیٰ:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خونِ جگر ودیعتِ مرگانِ ناز تھا

حضرت مولانا قاضی حمید اللہ خاں کے الفاظ میں:

”جو انسان دنیاوی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے، حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لیتا، جس کی نظر میں زیادہ محبوب ہو جائے، قہقہہ لگانے کے بجائے زیادہ تسکین جس کے دل کو اُس وقت ملے جب وہ اللہ کے حضور میں آنسو بہائے، انتقام سے زیادہ تسکین جس کو معافی دینے میں ملے اور کسی کا حق غضب کرنے سے زیادہ راحت حقوق ادا کرنے میں محسوس ہوا ایسے آدمی کے لیے دنیا بھی جنت بن جاتی ہے۔“

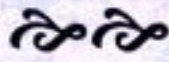
محترم سید صبیح رحمانی نے اُن کی کتاب ”نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش“ اور میری کتاب ”مرقع چہل حدیث“ انہی دنوں کراچی سے شائع کیں۔ یہ کتابیں کارگو کے ذریعے ہمیں بھیجی گئیں ایک ہی دن ہمیں وصول ہوئیں افسوس کہ انھیں مہلت نہ ملی اور مجھے توفیق نصیب نہ ہوئی کہ ہم ایک دوسرے کو کتاب پیش کر سکتے اور وہ وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا اور جہاں سے ہر ایک کو جانا

ہے فاصلہ ہی کتنا ہے؟

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چمن شاہ قبرستان کی جنازہ گاہ میں، میں نے اُن کی پیشانی کو محبت سے چھوا میرے ہاتھ نے جو
ٹھنڈک محسوس کی اس کا کیف اب بھی قائم ہے اور قائم رہے گا کہ وہ میرے والدین اور میری بیٹی کی
قبروں کے قریب میں مدفون ہیں۔ میں دن میں دوبار اُن کی مغفرت کی دعا کیا کرتا ہوں اور اب اکرم
رضا بھی اُس دعائے مغفرت میں شامل ہو گئے ہیں۔ آخر میں نطق شاعر مستعار لیتے ہوئے چند شعر:

قلم قاصر ہے کیسے داستانِ غم فزا لکھوں	اللہ العالمیں، نوحہ کروں یا مرثیہ لکھوں
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس حالت میں کیا لکھوں	صبا مغموم، طائر مضطرب، شاخیں خزاں دیدہ
کسے غم خوار ٹھہراؤں کسے درد آشنا لکھوں	مجھے سو نپا گیا اس دور میں احباب کا ماتم
کہاں تک جانے والوں کی وفا کا تذکرہ لکھوں	خود اپنی زندگی بھی مختصر محسوس ہوتی ہے



ماجد خلیل..... ایک منفرد لہجے کا نعت گو! (خراج تحسین..... یادوں کے جھر مٹ میں)

ABSTRACT:

Late Majid Khalil was known as generous and devoted person in literary circle. He expired after long ailment and his death news become shocking one for his friends. The article presented hereunder contains some memories shedding light on nice behavior and devoted approach towards extending co-operation for solving problems of his friends. His poetry was applauded by various critics in his life time. His particular attention was fixed on creation of Naat for which his diction was uniquely known and recognized.

بدھ: ۱۶/ربیع الاول ۱۴۳۷ھ، مطابق: ۲۷/جنوری ۲۰۱۶ء کو میں اپنی اہلیہ کے ہمراہ میڈیل سینٹر جارہا تھا۔ راستے میں بھائی آفتاب مضطر کا فون آیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے فون سننا میرے لیے مشکل ہوتا ہے۔ میں نے بیگم سے کہا فون سنئے۔ فون پر بات کرنے کے بعد انھوں نے خبر سنائی کہ ماجد خلیل صاحب کا انتقال ہو گیا۔..... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

میرے لیے گاڑی چلانا دشوار ہو گیا۔ یادوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ غالباً نوے کی دہائی تھی۔ سہیل غازی پوری کے ہاں نعتیہ مشاعرہ تھا۔ میں نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ایک صاحب جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ انھیں میں نے ان کے مقام سے پہلے دعوت کلام دی تو، سہیل صاحب نے مجھے ٹوکا۔ میں نے کسی دوسرے شاعر کو بلا لیا۔ لیکن جب ان صاحب کی باری آئی تو ان کے شعری لہجے اور نفاستِ بیاں نے دل موہ لیے۔ ماجد صاحب کو دیکھنے اور سننے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ پھر تو جب اور جہاں ان سے ملاقات ہوئی، دل ان کی محبتوں کی کششِ ثقل کے دائرے سے نکلا ہی نہیں۔

سرکاری نوکریوں میں رہنے والے جانتے ہیں کہ پاکستان میں ہر جگہ آبادی کے بڑے حصے سے تعلق رکھنے والوں کو، کسی نہ کسی طرح نوازا جاتا ہے۔ اقلیت کو ہر جگہ کچلنے کی کوشش ہی کی جاتی

ہے۔ Merit کا نعرہ لگا کر خود Merit ہی کا خون کیا جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا کہ ۲۸ سال سے زیادہ بے داغ ملازمت کرنے کے باوجود مجھے اپنے ادارے میں ۱۴ سال ایک ہی گریڈ (۱۹ گریڈ) میں رکھ کر رٹائرمنٹ کی عمر تک پہنچا دیا گیا۔ اس بات کا ذکر اس لیے نکلا کہ ۲۰۰۹ء کے اوائل میں اچانک مجھے ماجد بھائی کا فون آیا۔ فرمانے لگے، بھائی! آپ کے نئے MD ہمارے بہت اچھے دوست ہیں۔ اگر کوئی کام ہو تو کہیں۔ میں نے عرض کیا اب تو میں کچھ دن بعد رٹائر ہونے والا ہوں، میرا کیا کام ہو سکتا ہے۔ بہر حال اگر کوئی ضرورت پڑی تو عرض کروں گا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ایک صاحب، جو دفتر میں میرے ماتحت رہ چکے تھے ان کی ترقی کے لیے ڈپارٹمنٹ سے تو فائل نکل گئی لیکن MD تک نہیں پہنچائی گئی اور وہ مجھ سے کچھ دن پہلے رٹائر ہو کے کراچی آ گئے۔ چناں چہ میں نے ان صاحب کو فون کر کے ماجد بھائی کے پاس بھجوادیا۔ انھوں نے اپنا مدعا بیان کیا تو ماجد بھائی کے کہنے پر MD نے خود فائل منگوا کر دستخط کر دیئے اور یوں تقریباً آٹھ ملازمین کی ترقی کا پروانہ نکل سکا جن میں وہ صاحب بھی شامل تھے..... اتنی بے لوث محبت اور شفقت، اب کہاں دیکھی جاسکتی ہے؟

میں نے ماجد بھائی کے کلام پر کبھی جم کر کوئی مضمون نہیں لکھا البتہ دو ایک مرتبہ ان کے اعزاز میں ہونے والی محفلوں میں کچھ گفتگو ضرور کی جسے سامعین اور خود ماجد بھائی نے بڑی پذیرائی بخشی۔ ہاں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں میں نے ان کی کتاب ”روشنی ہی روشنی“ پر پروفیسر کلیم عاجز کی رائے نقل کر کے کچھ جملے اپنی طرف سے بھی لکھ دیئے تھے۔ میں نے لکھا تھا:

”کلیم احمد عاجز ایک معروف شاعر ہیں۔ ساتھ ہی شعری نزاکتوں سے آگاہی اور اس کے اظہار نے انہیں تنقید کا سلیقہ بھی عطا کر دیا ہے اس لیے ان کی تنقیدی رائے بھی ان کے شعر کی طرح ان کے احساسات کا فطری اظہار معلوم ہوتی ہے۔ ماجد خلیل کے شعری مجموعے ”روشنی ہی روشنی“ پر ”ایک معتبر شاعر“ کے زیر عنوان دیباچہ، تقریظ یا مقدمہ [جو نام بھی دیا جاسکے] لکھتے ہوئے کلیم عاجز نے بڑے پتے کی بات کی ہے، وہ کہتے ہیں:

”بقول انگریزی نقاد، ’کولرج‘ کہ ’شاعری یہ نہیں کہ کیا کہا گیا ہے، شاعری یہ ہے کہ کیسے کہا گیا ہے۔ میں نے اس قول کو بہت فراخ دلی سے جانچا پر کھا اور تجربے نے یہی کہا کہ بات سچ ہے۔ اگر صرف اونچی بات ہی شاعری کہلاتی تو اونچی باتیں تو تھوڑی ہی ہیں۔ زندگی کی حقیقتیں اور سچائیاں تو شمار میں آسکتی ہیں لیکن اچھی شاعری کا شمار مشکل ہے۔ تو اچھی شاعری جو کہ کی

گئی ہے وہ دراصل یہی ہے کہ کسی کہنے والے نے کسی انوکھے ڈھنگ سے کہہ دی تو کہی ہوئی بات بھی نئی ہو گئی۔ ماجد صاحب کے کہنے کا ڈھنگ یہی ہے۔ ڈھنگ اگر نقل ہو تو بات اور فرسودہ ہو جاتی ہے۔ ڈھنگ اگر تازہ ہو تو پرانی بات بھی نئی ہو جاتی ہے۔ شاعری کی اس حقیقت کو فراموش کر دیجیے تو معیاری باتیں چند ہی رہ جائیں گی۔ لیکن ہماری اردو شاعری اور فارسی شاعری میں معیاری باتیں بہت ہیں اور ان کا معیاری ہونا باتوں کی نوعیت پر نہیں بلکہ لکھنے کی انفرادی نوعیت پر ہے۔ یہ باتیں تسلیم شدہ ہیں اس لیے ان کی وضاحت اور دلائل کی ضرورت نہیں۔ ماجد صاحب کے یہاں بھی کہنے کا انفرادی ڈھنگ و آہنگ ہے۔ جس نے ان کی شاعری کو پسندیدہ، دلکش اور دل پسند بنادیا ہے۔“

کلیم عاجز نے ماجد خلیل کا کوئی شعر نقل نہیں کیا، لیکن ان کے بیان کی روشنی میں ماجد خلیل کے کلام کو دیکھیے تو کلیم عاجز کی نکتہ رسی کی داد دینی پڑتی ہے۔ واقعی ماجد خلیل نے بہت سے پرانے مضامین کو بیان کی تازگی سے نیا بنادیا ہے۔ مثلاً:

ایک وہ شب تھی کہ ہونا پڑا دہلیز بدر	ایک یہ دن ہے کہ دنیا تری دہلیز پہ ہے
لفظ ہے کا ہے سزوار یقیناً جب تک	کرۂ ارض کا ماتھا تری دہلیز پہ ہے
جب بھی تڑپا ہے حضوی کی طلب میں ماجد	دیکھنے والوں نے دیکھا تری دہلیز پہ ہے
سبز گنبد سنہری جالی کو	اور ترسیں کے چشم و لب کب تک
عقل، دل، روح جسم و فکر و نظر	دیکھو ہوتے ہیں ان کے سب کب تک

درج بالا اشعار میں بیان کی ندرت نے نعتیہ شاعری کے مروجہ مضامین کو نیا بنادیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم عاجز کی تنقیدی رائے سے نہ صرف اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے بلکہ ان کی نکتہ رسی کی داد بھی دینی پڑتی ہے۔ (اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ، ص ۱۹۳)

ماجد بھائی نے میرا مقالہ پڑھا تو ایک محفل میں مجھ سے فرمانے لگے:

”کلیم عاجز کے تنقیدی نکتے کو، برسوں بعد صرف آپ نے سمجھا ہے..... میں نے کلیم عاجز سے

کہا تھا کہ اپنی بات کی کچھ وضاحت کریں..... تو انھوں نے کہا ”کیا میں ہی سب کچھ لکھ دوں“..... بعد والوں کو بھی کچھ لکھنا ہوگا“

ماجد بھائی کی باتوں سے مجھے خوشی ہوئی کہ اتنا کم لکھنے کے باوجود وہ اس نکتے کی تہہ تک پہنچ گئے جسے کلیم عاجز سے استشہاد کرتے ہوئے میں نے اجاگر کرنے کی سعی کی تھی۔

ملازمت کا طویل عرصہ اسلام آباد میں گزارنے کے بعد رٹائر ہو کر میں کراچی آیا تو مجھے اپنے غریب خانے پر نعتیہ نشست رکھنے کا خیال آیا۔ دبستان وارثیہ کے روح و رواں قمر وارثی صاحب کو فون کر کے شعراء کی شرکت کا ذمہ انھیں دیدیا۔ انھوں نے آٹھ دس شعراء سے کہہ دیا۔ صدارت ماجد خلیل صاحب کی ہوئی۔ پھر تو جب جب میرے ہاں مشاعرے ہوئے، بیشتر مشاعروں کی صدارت انھوں نے ہی کی۔ دبستان وارثیہ کی جانب سے ہر ماہ نعتیہ مشاعرہ ہوتا ہے اور ہر ماہ دبستان کی طرف سے دی ہوئی ردیف پر شعراء طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ماجد بھائی ان مشاعروں میں اکثر شریک رہے ہیں اور بیشتر مشاعروں کی صدارت بھی کی ہے۔ بلاشبہ ان ردیفی مشاعروں میں شعری ضرورتوں اور موضوع کی عظمتوں کے خیال سے طبع آزمائی کرنے والے شعراء میں ماجد بھائی ہمیشہ نمایاں رہے۔ اس بات کی تصدیق ان کتب سے ہوتی ہے جو ہر سال کے اختتام پر دبستان کی جانب سے شائع کی جاتی ہیں۔ ماجد صاحب ردیف نباہنے کے تقاضوں سے آشنا تھے اور قوافی کے استعمال میں انتہائی محتاط۔

آج طبیعت اداس ہے۔ کلام پر بھی گفتگو کرنی ہے اور کلیم پر بھی۔ اس لیے یہ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کونسی بات کس مقام پر کہی جائے۔ یادیں ہیں کہ امدی چلی آرہی ہیں۔ ایک مرتبہ ماجد بھائی نے فون کیا اور مجھے کہا ”آپ کا ایم فل [اقبالیات] کا مقالہ، اقبال اکادمی پاکستان سے شائع کیا جاسکتا ہے۔

اس وقت انیق احمد، سہیل عمر صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ آپ ان سے رابطہ کر کے ان کے مشورے سے اپنا مسودہ انھیں ارسال فرمادیں“..... میں حیرت زدہ رہ گیا!!!!..... بھلا ماجد بھائی کو میرے ایم فل کے مقالے (مثنوی رموزِ بنخودی کا فنی و فکری جائزہ) کا کیسے خیال رہا۔ جبکہ میں نے انھیں شاید ایک بار ہی اپنے مقالے کے بارے میں، بغیر خواہش اشاعت، بتایا ہوگا! لیکن اپنے چھوٹوں پر شفقت فرمانے والے ماجد بھائی نے میری بات کو نہیں بھلایا۔ بہر حال انیق احمد صاحب کے کہنے پر میں نے وہ مقالہ اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، بھجوا دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ ایک سال بعد وہ مسودہ مجھے اٹھارویں آئینی ترمیم کے نتیجے میں ہونے والی اکھاڑ بچھاڑ کا حوالہ دے کر واپس کر دیا گیا اور پھر نعت ریسرچ سینٹر، کراچی کے زیر اہتمام وہ شائع کیا گیا۔

ایک دن سہ پہر میں ماجد بھائی کا فون آیا۔ فرمانے لگے میں آپ کے محلے میں آیا ہوا ہوں۔ آپ کو ایک نفیس انسان (ڈی ایس پی بشیر الدین صاحب) سے ملوانا چاہتا ہوں۔ بشیر الدین صاحب

گلستانِ جوہر میں نئے نئے آباد ہوئے تھے۔ میں وہاں پہنچا۔ بشیر صاحب کی طبیعت ناساز تھی۔ ان سے مل کر انسیت کی خوشبو محسوس کی تو میں ان کی سادگی اور پیار بھری شخصیت کے حصار میں آ گیا۔ بعد میں بشیر صاحب نے ترقی پائی اور SP ہو گئے۔ لیکن پولیس کی نوکری سے جلدی جان چھڑالی۔ یعنی قبل از وقت رٹائرمنٹ لے لی۔

ماجد بھائی بہت اچھا شعر کہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مصرع بحر سے خارج بھی ہو جاتا تھا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ، ادبا ان سے کچھ کہتے ہوئے جھجکتے تھے۔ سچی بات ہے، میں بھی ان کے ایسے مصرعوں پر صرف خاموشی اختیار کر لیتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے میرے گھر پر ایک بہت اچھا شعر پڑھا لیکن اس میں عروضی سقم بھی تھا۔ سب نے شعر کی داد دی، جن میں میں بھی شامل رہا۔ لیکن جب نعت رنگ کے شمارہ ۲۱ میں احمد صغیر صدیقی صاحب نے ماجد بھائی کے اس شعر کی تعریف کی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے ان کے گھر میں بیٹھ کر انھیں اس شعر کا سقم سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ نہیں مانے تو میں نے وہاں موجود عباس رضوی صاحب کو حکم بنایا۔ انھوں نے کہا عزیز احسن ٹھیک کہتے ہیں شعر میں ایک لفظ ہے ”لفظ“ جس میں ”ظ“ کی گردن بالکل جدا ہو رہی ہے۔ غرض یہ کہ احمد صغیر صدیقی صاحب نے نعت رنگ شمارہ ۲۲ میں لکھا:

”راقم الحروف نے ماجد خلیل صاحب کے ایک شعر کو تحسینی کلمات کے ساتھ کوٹ کیا تھا:

اک لفظ سے بنے ہوئے جہاں میں

اک نام سے روشنی ہوئی ہے

حقیقتاً یہ شعر سقیم ہے۔ اس کا پہلا مصرع بحر سے خارج ہے۔ ایک رکن اس

میں بڑھ گیا ہے۔ راقم الحروف کی اس غلطی کی سمت توجہ عزیزی عزیز احسن

نے دلائی تھی میں ان کا ممنون ہوں۔“ (نعت رنگ ۲۲، ص ۵۵۶)

نعت رنگ کا شمارہ ماجد بھائی کو بھی بھیجا گیا تھا۔ انھوں نے اسے ملاحظہ فرمایا لیکن کبھی مجھ سے نہ تو شکایت کی اور نہ ہی اپنے رویے سے بے رخی کا ظہار فرمایا۔ پھر یہ کہ جو لفظ میں نے کسی کے سامنے تجویز کیا تھا (ظاہر ہے خود ماجد بھائی سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی) وہی لفظ انھوں نے اپنے شعر میں رکھ کر دوسری شعری نشست میں پڑھا بھی:

اک کن سے بنے ہوئے جہاں میں

بعد میں نعت رنگ شمارہ ۲۴ میں نیویارک [امریکہ] سے جناب تنویر پھول نے بھی یہی تجویز پیش کی کہ ماجد صاحب کے شعر میں لفظ ”کن“ رکھا جاسکتا ہے۔ (نعت رنگ ۲۴، ص ۵۵۹)

نعت رنگ کا وہ شمارہ دیکھ کر ماجد بھائی نے صبیح رحمانی کو خط لکھا تھا جس کی چند سطور درج کر رہا ہوں:

”محترم صبیح رحمانی صاحب السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ!

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ خاکسار کے حضرت دل ان دنوں دھڑکنے کے علاوہ دوسری اٹھکھیلیاں بھی کر رہے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ موصوف راہ راست پر آجائیں۔ نعت رنگ کا شمارہ ۲۴ بدست قمر وارثی موصول ہوا۔ ہمیشہ کی طرح جملہ صفات سے مزین اور معلومات میں اضافوں کا ذریعہ۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ تمام مشمولات نشر و نظم بہترین بالخصوص ”ابتدائیہ۔“

خطوط کے حصے میں چوں کہ میرے ایک شعر کے حوالے سے گفتگو کا تسلسل ہے اس لیے محترم تنویر پھول صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض گزار ہوں کہ میں نے اپنے شعر میں شائع ہو جانے والے سقم کو اصل مسودہ کی مدد سے بہت پہلے ہی درست کر لیا تھا اور اس طرح شعر کچھ یوں ہو گیا ہے:

اک کن سے بنے ہوئے جہاں میں

اک نام سے روشنی ہوئی ہے

بہر حال جن احباب نے اس شعر کے حوالے سے توجہ فرمائی ان سب کا شکر گزار ہوں۔

جنوری ۲۰۱۵ء میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند، کینیڈا سے کراچی آئے تو ان کی نعت گوئی کے ذوق کے پیش نظر میں نے انھیں یکم فروری کو اپنے غریب خانے پر نعتیہ مشاعرے میں مہمان اعزازی کے طور پر بلایا۔ ماجد بھائی کو صدارت کے لیے کہا۔ ان دنوں ان کی طبیعت ناساز تھی۔ لیکن انھوں نے میری دعوت فوراً قبول فرمائی۔ بلکہ یہ بھی ذمہ لیا کہ دو چار شعراء کو وہ خود کہہ دیں گے۔ چناں چہ وہ یادگار مشاعرہ بھی انھی کی صدارت میں ہوا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ماجد بھائی نے میرے غریب خانے پر ہفتہ، ۲۵/ شعبان ۱۴۳۶ھ مطابق، ۱۳/ جون ۲۰۱۵ء کو آخری نعتیہ نشست کی صدارت کی تھی۔ اسی سلطانی صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیے تو مجھے نعتیہ ادب کے حوالے سے کچھ معروضات پیش کرنے کی دعوت بھی دی۔ میں نے نعتیہ ادب کی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی جہتوں پر کچھ باتیں کیں۔ جب میں نے اپنی بات مختصر کرتے ہوئے رخصت ہونا چاہا تو ماجد بھائی نے فرمایا: ”ذرا تسلیج کے بارے میں بھی کچھ بتا دیجے!“

..... میں نے چند کلمات تلمیحات اور نعتیہ ادب میں ان کی اہمیت پر کہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماجد بھائی کو نعتیہ ادب سے کتنی دلچسپی تھی اور تخلیقی لمحات میں شاعر کے ذہن میں موجود علمی مواد کی درستی کا کتنا خیال تھا!!!

پچھلے دنوں احمد جاوید صاحب لاہور سے کراچی تشریف لائے تو ایک محفل میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انیق احمد صاحب بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ماجد بھائی کا ذکر نکلا۔ ان دنوں وہ بہت زیادہ علیل تھے۔ انیق صاحب نے ان کے حوالے سے بتایا..... ”ایک زمانہ تھا کہ ماجد بھائی سعودی ایئر لائن میں ایڈمنسٹریٹر تھے اور پاکستان سے جانے والے احباب کی بڑی خاطر مدارات فرماتے تھے۔ ان دنوں ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب بھی نعت کہتے فوراً مدینہ منورہ حاضر ہو کر دربارِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں نعت پیش کرتے تھے۔ پھر وہ رٹائر ہو کر کراچی آ گئے۔ یہاں سے بھی اکثر ان کا آنا جانا رہا۔ جب ان کے دل کا آپریشن ہوا تو خون کی ضرورت پڑی۔ ماجد بھائی نے کہا ہم بازاری خون نہیں لیں گے۔ کیا معلوم جس آدمی کا خون ہمیں دیا جائے اس نے حلال کا لقمہ کھایا ہو یا حرام کا؟“..... یہ بات بتاتے ہوئے انیق احمد صاحب پر رقت طاری ہو گئی..... واقعی آج کل اس قدر احتیاط برتنے کا خیال بھی کسی کو نہیں ہو سکتا ہے۔ اس سے ماجد بھائی کی نیک نفسی، حرام حلال کی تمیز اور آخرت کی جوابدہی کا احساس مترشح ہے۔ اب ایسی مثالیں کہاں ملیں گی؟

ماجد بھائی سے آخری ملاقات ان کے صاحبزادے کی طرف سے دی گئی دعوتِ ولیمہ میں ہوئی۔ اتوار ۸/ربیع الاول ۱۴۳۷ھ مطابق ۲۰/دسمبر ۲۰۱۵ء کو وہاں جاتے ہوئے میں نے چار شعر کہہ لیے کہ اگر ماجد بھائی سے ملاقات ہوئی تو انھیں سنا دوں گا تاکہ ان کی طبیعت بہل جائے۔

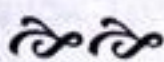
میں اس دعوت میں پہنچا تو انٹرنیشنل سامع جہانگیر خان صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ پھر کئی احباب آ گئے۔ قمر وارثی صاحب تو زیادہ تر ماجد بھائی کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ وہ بھی آ گئے۔ کچھ دیر بعد ماجد بھائی بھی پہیوں والی کرسی پر بیٹھے ہوئے وہاں پہنچائے گئے۔ میں نے ان کا چہرہ دیکھا تو بڑا دکھ ہوا۔ ماجد صاحب کا گلاب سا چہرہ کھلا چکا تھا۔ حلقوم میں ایک نلکی لگی ہوئی تھی جس کی مدد سے وہ بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ مجھے محسن بھوپالی مرحوم یاد آ گئے۔ ان کے گلے میں بھی اسی طرح کی نلکی لگ گئی تھی جو آخری دم تک ان کے گلے میں انکی رہی۔ سردی بھی تھی، لیکن ماجد بھائی احباب کی خاطر خاصی دیر تک وہاں موجود رہے۔ میں نے انھیں چار شعر سنائے:

حماد کو مبارک، شادی کی یہ مسرت اللہ! بخشے ان کے والد کو جلد صحت

ماجد خلیل صاحب، پائیں خوشی کے لمحے بن جائے ان کا گھر اب فی الاصل رشکِ جنت
 نکلی ہیں ارتجالاً دل سے جواب دعائیں کر لے قبول سب ہی، اے کاش ربِ اعزت!
 میں بھی عزیز احسن، شامل ہوں اس خوشی میں بن جائیں اب یہ لمحے، دلوں جہاں کی بہجت
 اشعار سن کر ماجد بھائی نے مسرت کا اظہار فرمایا۔ ذکر ہو رہا تھا آفتاب صاحب کے فون کا
 جس کے ذریعے ہمیں ماجد بھائی کی رحلت کی خبر ملی تھی۔ میڈیل سینٹر سے لوٹتے لوٹتے ساڑھے تین
 بج گئے۔ میں نے جلدی جلدی ظہر کی فرض نماز ادا کی۔ کھانا زہر مار کیا..... اور بشیر الدین صاحب
 کے ہمراہ منورہ مسجد پہنچا۔ مسجد تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا۔ جماعت نکل چکی تھی۔ تاہم ہم دونوں
 نے فوراً عصر کی نماز ادا کی اور نمازِ جنازہ میں شریک ہو گئے۔ وہاں سے سخی حسن قبرستان گئے۔ آفتاب
 مضطر، قمر وارثی، عابد صاحب، پی ٹی وی کے شجاعت اللہ، صفدر علی خان، جمال احمد جمال اور جہانگیر
 خان وغیرہم سے ملاقات ہوئی۔ سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ ہر آدمی اپنا غم چھپائے ہوئے اور
 آنسوؤں کو پلکوں سے تھامے ہوئے نظر آیا۔ عصر کی نماز کے بعد غروبِ آفتاب سے کچھ دیر قبل ہم نے
 دنیائے شعروادب کے آفتاب کو قبر کی گہرائی میں غروب ہوتے دیکھا۔ فاتحہ پڑھی اور اپنے اپنے
 گھروں کو لوٹ گئے۔

ماجد بھائی کے حوالے سے راستے میں بشیر بھائی سے باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا وہ میرے
 ساتھ بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ کہنے لگے، ہر شخص کا یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ میرے ساتھ
 بہت اچھے ہیں۔ لیکن یہی تو ماجد بھائی کی خوبی تھی کہ سب سے یکساں محبت فرماتے تھے!!!
 سرور بارہ بنکوی نے کہا تھا:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
 آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں
 لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ مجھے اپنا ہی ایک شعر یاد آ رہا ہے:
 یہ کیا ہوا کہ فقط تذکروں میں ملتے ہیں
 نگاہ ڈھونڈتی پھرتی ہے باکمالوں کو
 ظاہر ہے ماجد بھائی بھی اب تذکروں ہی میں ملیں گے ناں؟



حمد و نعت کی کہکشاں کا درخشندہ سیارہ..... عارف منصور!

ABSTRACT:

Late Majid Khalil was known as generous and devoted person in literary circle. He expired after long ailment and his death news become shocking one for his friends. The article presented hereunder contains some memories shedding light on nice behavior and devoted approach towards extending co-operation for solving problems of his friends. His poetry was applauded by various critics in his life time. His particular attention was fixed.

بدھ ۱۶/ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ مطابق، ۲۷/جنوری ۲۰۱۶ء کو ہم نے ماجد خلیل کی صورت میں علم و ادب اور حمدیہ و نعتیہ شاعری کا ایک روشن سیارہ عدم کی کہکشاؤں میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اتوار ۲۷/ربیع الثانی مطابق، ۷/فروری کو اطلاع ملی کہ شعر و ادب اور حمد و نعت کی کہکشاں کا ایک اور سیارہ ”عارف منصور“ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

قمر وارثی صاحب نے فون پر خبر دی کہ لاہور میں عارف منصور انتقال کر گئے..... تو میرا ذہن شعور کی رو (Stream of Consiousness) کے تابع ہو گیا۔ یادیں خیالات کے سیلاب کی صورت اُمڈ آئیں۔

سنہ ۱۹۹۲ء میں اسلام آباد سے کراچی تبادلہ ہوا تو میں نے اپنے غریب خانے پر نعتیہ مشاعرہ رکھا۔ میرے استاد بھائی، معراج جامی آئے تو ان کے ساتھ ایک صاحب تھے جن کا تعارف ”منصور ملتانی“ کے نام سے کروایا گیا۔ انھوں نے اپنی نعت پیش کی تو اس میں شاعرانہ ہنرمندی اور کلام میں پختگی محسوس کی گئی۔ بعد میں ان صاحب نے کراچی کی بیشتر محافل میں شرکت کی اور اپنے محبت آمیز رویے اور شعری شگفتہ بیانی کے باعث لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ میں تو شعری نشستوں میں بہت کم جاتا ہوں لیکن منصور ملتانی جو بعد میں عارف منصور ہو گئے تھے، اکثر شعری نشستوں میں شرکت

کرتے تھے۔ وہ بڑے زود گو تھے۔ ذوقِ مشاعرہ بازی نے انھیں پی ایچ ڈی بھی نہیں کرنے دیا۔ جامعہ کراچی میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے رجسٹریشن کروایا تو سات سال تک اپنا مقالہ جمع نہیں کروا سکے۔ کچھ تو بیماری کے باعث اور کچھ مشاعروں میں لازمی شرکت کی وجہ سے۔ بہر حال جامعہ سے انھیں مقالہ جمع کروانے کی مزید مہلت نہیں ملی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے اعزاز کا خواب آنکھوں میں سجائے جانبِ خلد سدھارے۔

عارف منصور جب اور جہاں ملتے ان کا مسکراتا ہوا چہرہ دوستوں کا استقبال کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ دبستانِ وارثیہ کی ماہانہ شعری نشستوں میں ان کی شرکت زیادہ ہوتی تھی۔ قمر وارثی صاحب کی طرف سے دی گئی ردیفوں پر انھوں نے بہت ساری حمدیں اور نعتیں کہیں۔ شعر گوئی کے سلیقے، ردیف بنانے کے ڈھنگ اور قافیہ پیمائی کے جمالیاتی اسلوب کے باعث ان کی تخلیقات، داد و تحسین کے قابل ٹھہرتی تھیں۔ کراچی ایئر پورٹ پر سکیوریٹی کے انچارج تھے۔ ایئر پورٹ کے نزدیک انھیں بہت بڑے رقبے پر بنے ہوئے لان کا گھر ملا ہوا تھا۔ اس میں اکثر مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ دو تین مشاعروں میں، میں نے بھی شرکت کی ہے۔ ان کی محبت کے باعث بڑی تعداد میں شعرا ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔

میں جب اسلام آباد میں تھا تو عارف منصور جب بھی کراچی سے وہاں جاتے، مجھ سے ضرور ملتے۔ اگر ان کی موجودگی میں کسی مشاعرے کا اہتمام کیا جاسکتا تو وہ اس میں شریک ہو کر مشاعرہ لوٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔

ایک مرتبہ میری پھوپھی جے پور (بھارت) سے کراچی آئیں۔ میں اسلام آباد سے ان سے ملنے یہاں پہنچا اور جب وہ جانے لگیں تو میں نے عارف منصور سے کہا کہ مجھے اپنی پھوپھی کے ہمراہ ہوائی جہاز تک جانے کا پاس دلوادیں۔ انھوں نے فوراً بندوبست کر دیا اور یوں میں بڑے اطمینان سے پھوپھی صاحبہ کو ہوائی جہاز میں سوار کروا کے آیا۔ یہ ان کی محبت اور خلوص کے ساتھ دوستوں کی خدمت کرنے کا عملی ثبوت تھا۔

مرحوم نے نعت رنگ میں کچھ مضامین بھی لکھے اور کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ ان کے ایک تبصرے پر صاحب کتاب کے دوستوں نے بڑا دواویلا مچایا۔ خورشید ناظر کی کتاب ”بلغ العلیٰ بکمالہ“ پر نعت رنگ ۲۱ میں تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

”شعری اعتبار سے انھوں (خورشید ناظر) نے ’نہ‘ اور ’کہ‘ کو دو حرفی یعنی

بروزن 'منع' [فع] نظم کر کے نمایاں عیب پیدا کیا ہے۔ کیوں کہ اردو شاعری میں آتش کے زمانے سے ہی 'نہ' اور 'کہ' یک حرفی صوت کے طور پر نظم ہوتے آرہے ہیں۔ اس طرح انھوں نے بلا مبالغہ اپنے اس 'شاہ کار' کے سیکڑوں مصرعے بے وزن رنما موزوں کر دیئے ہیں۔“ (نعت رنگ ۲۱-ص ۶۰۴)

عارف منصور نے کتاب ہذا میں اور بھی اغلاط کی نشاندہی کی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ پروفیسر عمران نے لاہور سے اور پروفیسر ڈاکٹر منور غازی نے سعودی عرب سے خطوط لکھ کر اپنے دوست مصنف کی اغلاط ماننے ہی سے انکار کر دیا اور 'نہ' اور 'کہ' جیسے الفاظ کو اپنی دانست میں دو حرفی ثابت کرنے کے لیے عروض سے ناواقفیت کے باعث الٹی سیدھی تقطیع بھی کر دی۔ عجیب بات کہ جن مصرعوں میں اساتذہ سخن نے یہ الفاظ یک صوتی حرف کے طور پر باندھے تھے، انھیں بھی کھینچ تان کر دو حرفی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً

لے پھر میں کہاں کہاں دل کو نہ لگائے گیا جہاں دل کو

(میر سوز)

نہ ملا رہ نفاق کے مارے کیا کریں ہم وفاق کے مارے
ہو چکا حشر بھی حسن لیکن نہ جیے ہم فراق کے مارے

(میر حسن)

(پروفیسر عمران، لاہور، نعت رنگ ۲۲، ص ۵۲۰)

خدائے سخن میر تقی میر کا صرف ایک شعر تقطیع کے ساتھ پیش خدمت ہے:

تشنہ لب مر گئے ترے عاشق
نہ ملی ایک بوند پانی کی

پروفیسر ڈاکٹر منور غازی نے اس شعر کی تقطیع ”فاعِلن فاعِلن مفاعِلن“ کے پیمانے سے

کر ڈالی۔ (پروفیسر ڈاکٹر منور غازی، سعودی عرب، نعت رنگ ۲۲، ص ۵۲۳)

ایک اور صاحب کامران جاوید عرفانی نے بھی اپنے خط میں عارف منصور کے موقف کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی عروض دانی کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ لیکن ان کا تجربہ بھی عروضی کسوٹی پر ناکام ٹھہرتا ہوا نظر آیا۔ بہر حال ان خطوط میں عارف منصور کو بہت زیادہ طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ چنانچہ نعت رنگ کے شمارہ ۲۳ میں کچھ خطوط آئے۔ مجید فکری نے کرچی سے 'عروضی شد بد نہ ہونے'

کے باوجود پروفیسر عمران، ڈاکٹر منور غازی اور کامران جاوید عرفانی کی حمایت کر ڈالی (نعت رنگ ۲۳، ص ۶۲۱) لیکن بھارت سے پروفیسر طلحہ رضوی برق (ایضاً ص ۵۵۹) اور کراچی سے حافظ عبدالغفار (ایضاً ص ۶۰۴) نے عروضی اوزان و بحر اور تقطیع کے اصولوں کا سہارا لے کر ان تینوں حضرات کو آڑے ہاتھوں لیا۔

ایسی صورت میں نعت ریسرچ سینٹر کے لیے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ معاملہ بالکل علمی اور منطقی انداز سے فیصل ہو۔ لہذا میرے استاد بھائی آفتاب مضطر، جو جامعہ کراچی سے پی۔ ایچ ڈی کی سند کے لیے منظور شدہ موضوع ”اردو کا عروضی نظام اور عصری تقاضے“ پر مقالہ لکھنے میں مصروف تھے (الحمد للہ! اب انھیں ڈکٹریٹ کی سند مل چکی ہے)، ان سے درخواست کی گئی کہ کچھ لکھیں۔ انھوں نے دلائل اور باقاعدہ درست بحروں کی روشنی میں تقطیع کر کے ثابت کیا کہ ’نہ‘ اور ’کہ‘ دو حرفی نہیں بلکہ یک حرفی محسوب ہوتے ہیں۔ (نعت رنگ ۲۳، ص ۳۷۹)

عارف منصور کو جب وہ شمارہ ملا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس شمارے میں تمہارا ذکر اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ پورا شمارہ ”عارف منصور نمبر“ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے اس شمارے کے تمام اخراجات تمہارے ذمے ہونے چاہئیں۔ اس پر انھوں نے ایک بھر پور قہقہہ لگایا۔ غرض یہ کہ ان کا موقف درست ثابت کرنے کے لیے جو کاوشیں کی گئی تھیں انھیں دیکھ کر وہ باغ باغ ہو گئے۔ اس کے بعد ان پر اعتراض کرنے والے بھی خاموش ہو گئے۔

عارف منصور، دبستان وارثیہ کے مشاعروں میں اکثر حمد اور نعت پیش کرتے تھے۔ جبکہ بیشتر شعراء صرف نعت ہی سناتے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ردیف نباہنے کی کوشش میں ہر سطح پر ہر شاعر کامیاب نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے کہ یا تو ردیف کی روشنی میں شعر کہتے ہوئے موضوع..... ”نعت“ کا دامن چھوٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے یا ردیف بے کار پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن چند شعراء ہمیشہ ہر ردیف کو سلیقے سے استعمال کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک آدھ شعر تو تقریباً ہر شاعر ہی ایسا کہہ لیتا ہے کہ اس پر اسے داد دی جاسکے۔ بہر حال قمر وارثی، ماجد خلیل اور عارف منصور امین بناری، تنویر پھول، آفتاب مضطر اور چند دیگر شعراء کی ردیف نباہنے کی کاوشیں اکثر و بیشتر کامیاب قرار دی جاتی رہی ہیں۔

پچھلے پانچ برسوں میں ردیفوں کی بنیاد پر کی جانے والی حمدیہ شاعری کی کتاب ”عرفانِ ربّ کائنات“ مرتبہ: قمر وارثی، میں راقم الحروف نے مقدمہ لکھا تھا۔ اس مقدمے میں، میں نے پہلی بار

ایسے اشعار کا انتخاب کیا جن میں ردیف اپنی جگہ ”ٹھکی ہوئی“ تھی اور اشعار کا نفس مضمون بھی ”حمد صفتی“ کا آئینہ دار تھا۔ اس انتخاب میں عارف منصور کے اشعار بھی آئے۔ عارف منصور کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے میرے قائم کردہ معیار کی کسی حد تک تصدیق ہوتی ہے:

جب سے دھڑکن بنایا ترے ذکر کو	قلب ہے پا کے پچی خوشی مطمئن
عاجزی میں خاک ہو کر جس نے پہچانا تجھے	ایسے سالک کو عطا کرتا ہے ہر عظمت خلوص
جس میں تجھ سے تعلق کی تجدید ہو	قلب کو بخشتا ہے وہ مہلت سکوں
سب انسانوں کے حق میں خیر ہے از حکم رب صدقہ	بلائیں ٹال دینے کا نہ کیوں ٹھہرے سب صدقہ
جب دل کی دھڑکنوں میں ترا ذکر آجے	آتی ہے پھر سکوں سے بھری زندگی قریب
میں تجھ سے دور اتنا کہ کوئی نہیں حساب	تو اس قدر قریب کہ شہ رگ سے بھی قریب
اس کے در پر جھکو تو پاؤ گے	دہر میں عزو افتخار ضرور
ذکر اس کا کرو تو آتا ہے	گلشنِ زیست پر نکھار ضرور
تو نہ چاہے تو نہیں کھلتا کبھی بابِ قبول	تیری رحمت ہو تو پھر دل کی دعا لائے اثر
شعلہء عشق عطا کر دیا ورنہ انساں	مشت بھر خاک تھا اس سوزِ نہاں سے پہلے
تو جو چاہے آرزوؤں کا چمن پھولے پھلے	باغِ وحدت کی فضا میں فکر و فن پھولے پھلے
سجدہ ریزی کر رہا ہے اب قلم، قرطاس پر	حمد کے پاؤں شمر، نخلِ سخن پھولے پھلے
جب گواہی ہو ترے محبوب کی سچائی کی	بے زباں ہو کر بھی دے دیتا ہے ہر پتھر صدا
اسے چراغِ جلانا سکھا دیا تو نے	ہوا ہے راہبرِ بزمِ آب و گل ادراک
نوح سے عیسیٰ تلک بھیجا بہ ہر عنوانِ کلام	تو نے کامل کر دیا پھر صورتِ قرآنِ کلام

ان تمام اشعار میں دوسرے مصرعے کا آخری لفظ یا مرکب الفاظ (خلوص، سکوں، صدقہ، قریب، ضرور، اثر، سے پہلے، پھولے پھلے، صدا، ادراک، کلام) ”ردیف“ کے طور پر تجویز کیے گئے تھے۔ بحر و قافیہ شعراء نے اپنی مرضی سے منتخب کیے تھے۔ عارف منصور کے تمام اشعار میں ردیف کی بنت مناسب ہے اور اشعار کا مافیہ (content) بھی ”حمد صفتی“ کا عکاس ہے۔ حمد کے متون بھی کہیں براہِ راست حمد یہ آہنگ لیے ہوئے ہیں اور کہیں بالواسطہ حمد یہ مضمون پیدا ہو گیا ہے۔

”عرفانِ ربِّ کائنات“ کے مقدمے میں میں نے کئی شعراء کے اشعار نقل کر کے تنقیدی منہاج ”تقابل و موازنہ“ (Comparison) کی بنیاد پر درجہ بندی اور بین الممتنی (Intertextuality) اظہار

ات نمایاں کیے تھے۔ عارف منصور نے جب یہ مقدمہ پڑھا تو پھولے نہیں سمائے اور کتاب کا نسخہ لا کر مجھے دیا جس پر انھوں نے اپنے قلم سے لکھا:

”عزیز بھائی ڈاکٹر عزیز احسن کی نذر اس دعا کے ساتھ کہ ان کا قلم اور زیادہ
روانی سے ہم عصر شعراء کو مسرت فراہم، کرتا رہے.....“

عارف منصور..... ۱۲ جولائی ۲۰۱۳ء“

نعتیہ ادب کی تخلیقی، تحقیقی یا تنقیدی سرگرمیوں میں حصہ لینے والوں کو اتانیت سے گریز کرنا چاہیے۔ کوئی شخص بھی اپنی ہر تحریر کو نہ تو خامیوں سے پاک قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی شعری تخلیق کے ہنگام، اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح الفاظ کا جامہ پہنا دینے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ میں اگر دوسروں پر تنقید کرتا ہوں تو اپنی غلطیوں کو تسلیم کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہوں اور اگر کوئی خلوص نیت کے ساتھ شرعی، منطقی، لسانیاتی اور ادبی جمالیات کی رشتی میں کوئی صائب مشورہ دیتا ہے تو مجھے اس کا مشورہ قبول کرنے میں کوئی عار نہیں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک تحریر میں لکھا تھا:

”میں نے ۱۹۷۷ء میں ایک نعت کہی تھی جس کا مقطع تھا:

نعت کہنا ہی مرا مشغلہ بن جائے عزیز

جب لکھوں لذت دیدار چشیدہ لکھوں

ایک مرتبہ ندیم نیازی عیسیٰ خیلوی صاحب کی فرمائش پر یہی نعت انھیں لکھ بھیجی۔ انھوں نے خط میں لکھا کہ نعت اچھی ہے لیکن مقطع محتاج اصلاح ہے۔ ”مشغلہ“ نعت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ لیکن اس عہد میں مجھے اپنے جہل کا ادراک نہیں تھا بلکہ معاملہ کچھ یوں تھا:

اک عمر سے ہے جہل پہ اپنے گمانِ علم (حمایت علی شاعر)

چنانچہ میں نے ندیم صاحب کی رائے پر توجہ نہیں دی۔ کئی سال بعد ایک محفل میں بھائی منصور ملتانی (حال عارف منصور) نے اسی لفظ (مشغلہ) کی طرف توجہ دلائی۔ اللہ کا کرنا کہ اسی لمحے اس لفظ کا نعم البدل (appropriate alternate) سوچھ گیا اور میں نے لفظ بدل کر مقطع پڑھ دیا جو پسند بھی کیا گیا اور میں بھی مطمئن ہو گیا۔

نعت لکھنا ہی وظیفہ مرا بن جائے عزیز

(افصح العربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں..... مشمولہ ”ہنرنازک ہے“، ص ۳۵)

الحمد للہ! جس طرح میں نے اپنی کسی تحریر کو ہر زاویے سے حسین جاننے اور منوانے کی کوشش

نہیں کی اور دوستوں کے مشورے کو بیشتر سر آنکھوں پہ رکھا..... اسی طرح میرے دوستوں میں عارف منصور تھے کہ شعر کہنے کی اچھی صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنی کسی تحریر پر مشورہ لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اسلام آباد کے قیام کے دوران میں مجھے عارف منصور کا ایک خط ملا جس کے ہمراہ ایک مسودہ بھی تھا۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے مکی اور مدنی ادوار کو سانیٹ کی صورت میں منظوم کیا گیا تھا۔ اب چوں کہ یہ تحریر پوری کی پوری محفوظ ہو جانی چاہیے اس لیے میں خط کا متن درج ذیل کر رہا ہوں:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم ○

عزیز بھائی! سلام مسنون!

یہ مسودہ ارسال خدمت ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ میری زندگی کی سب سے اہم کوشش ہے۔ اس کے لیے جتنی بھی اردو میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کتابیں موجود ہیں تقریباً سبھی سے استفادہ کیا ہے۔ اس لیے کوئی نام مقام یا زمانی ترتیب انشاء اللہ قابل اعتراض نہ ہوگی۔ باقی شعری کاوش کے طور پر اس کا مکمل اور باریک بینی سے جائزہ ضروری ہے۔ جو درستی آپ تجویز فرمائیں گے، بسر و چشم قبول۔ آخر میں مقدمہ لکھنے کی درخواست ہے۔ اب آپ بسم اللہ کیجیے اور مجھے اجازت۔ آپ کی طرف سے خصوصی توجہ کا منتظر.....

عارف منصور / ۱۷ مارچ ۲۰۰۹ء

D-S- CAA COLONY

AIRPORT KARACHI

سانیٹ کا مسودہ دیکھنے کے کچھ دن بعد میں نے چند مشوروں کے ساتھ واپس کر دیا تھا لیکن مقدمہ لکھنے کے لیے مسودے کی تکمیلی ہیئت (Final Copy) کا مطالبہ کیا تھا۔ کراچی میں آنے کے بعد میں نے عارف منصور سے ملنے والا مسودہ پھر دیکھا اور ایک مقدمہ یا دیباچہ لکھ دیا۔ غالباً یہ بات بھی 2010ء کی ہے۔ اپنی تقریظ کے ابتدائے میں، میں نے لکھا تھا:

”ابتدائی سانیٹ میں عارف منصور نے سیرت خیر الوریٰ لکھنے کے لیے،

لطافت فن کے حصول کے لیے دعا کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

لطافت فن کی ہو جائے اگر مجھ کو عطا، لکھوں

الہی! حوصلہ دے سیرت خیر الوریٰ لکھوں!

الحمد للہ! ان کی یہ دعا اس طرح پوری ہوتی ہوئی نظر آئی کہ پوری کتاب میں واقعاتی سطح پر سانیٹ اس طرح پیش کیے گئے ہیں کہ فنی جمال بھی ابھر کر سامنے آ گیا اور تاریخی تسلسل بھی تمثیل کی صورت میں ظہور پذیر ہو گیا۔ تاریخ میں واقعات کا بیان یہ ہوتا ہے۔ لیکن منظوم تاریخ میں بیانیہ کو ادبی لب و لہجہ دینا ناگزیر ہوتا ہے ورنہ اس میں خواندگی کے لیے کشش نہیں رہتی۔ عارف منصور نے تاریخی واقعات کو منظوم کرتے ہوئے اس نکتے کو خاص طور سے پیش نظر رکھا ہے۔“

اور پھر وہی ہوا جو ہمارے معاشرے کے کم وسیلہ لکھاریوں کے ساتھ ہوتا ہے کہ سانیٹ کی شکل میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی منظوم سیرت شائع نہ ہو سکی۔ قمر وارثی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے اس نادر تصنیف کی کمپوزنگ بھی کروادی تھی لیکن عارف منصور اپنے حین حیات اس کی کتابی صورت نہ دیکھ سکے۔ دیکھیے اب کب وہ کتاب منظر عام پر آتی ہے؟

قمر وارثی صاحب نے بتایا کہ دبستان وارثیہ کی جانب سے عمرہ ادا کرنے کی سعادت پانے والوں میں عارف منصور بھی تھے جن کو ان کی لگن، مدینہ منورہ سے پیار اور حمد و نعت لکھنے کی مسلسل ریاضت کے صلے میں عمرے کی دولت عطا ہوئی اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف ملا۔

پیر ۲۷/ربیع الثانی ۱۴۳۷ھ، مطابق ۸/فروری ۲۰۱۶ء..... عارف منصور کو کراچی میں آسودہ خاک کیا گیا۔ عجیب بات..... اتوار کا سارا دن اس انتظار میں گزرا تھا کہ میں اپنے دوست کی نماز جنازہ میں شریک ہو جاؤں گا۔ لیکن اللہ کی مشیت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ صبح صبح فون آیا کہ میری خواہر نسبتی کی تین ماہ کی بیٹی (فروہ) جو کئی روز سے زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی اسے قید حیات سے رہائی مل گئی ہے۔ فوراً وہاں پہنچا۔ بچی کی میت ہسپتال میں تھی وہاں سے گھر اور پھر قبرستان..... بس اسی گردش نے مجھے عارف منصور کا آخری دیدار کرنے اور اس کی نماز جنازہ پڑھنے کی سعادت سے محروم رکھا۔ آفتاب مضطر اور معراج جامی نے فون کیا تو انھیں میں نے اپنی بے بسی سے آگاہ کر دیا۔

باتیں بہت ہیں۔ کہاں تک لکھوں؟..... عارف منصور! تم جب بھی ملتے تھے اپنے تازہ اشعار ضرور سناتے تھے۔ تمہارا انداز داد طلب بھی ہوتا تھا اور تمہارے اشعار واقعی لائق تحسین بھی ہوتے تھے۔ میں تمہیں دل کھول کر داد دیا کرتا تھا..... لیکن آج میں تمہیں اپنا کوئی شعر نہیں سناؤں

گا۔ کیوں کہ مجھے غالب یاد آ رہا ہے۔ شعر سنو! کتنا حسب حال ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور؟

کیوں ہے ناں..... حسب حال؟؟؟..... داد نہیں دو گے؟

مطبوعہ: جسارت سنڈے میگزین، ۲۸ فروری ۲۰۱۶ء

۶۱۳

Dr. Rauf Parekh-Karachi

Naat as a Literary Genre of Urdu: Some Questions

Sabeeh Rahmani seemed a bit disappointed and perturbed at the Karachi Arts Council's recently held International Urdu Conference and he had reasons to be so.

He was speaking during the session on naat and expressed his displeasure in overt terms that when naat poets and other scholars working on naat had such luminaries as Intizar Hussain, Kishwer Naheed and some others from India and Pakistan as audience, it was a wonderful opportunity for them to discuss naat as a literary genre purely on a scholarly basis and convince them of their point of view but they engaged themselves in expressing emotions and excessive religiosity.

As a poet and editor, Sabeeh knows that the authors and even the scholars of Urdu are very fond of using adjectives and their superlative degrees. Repetitive and cliched verbosity is yet another peculiarity that ails many writers of Urdu and it was on its height on that day. So his disturbance was justified, but he very sensibly ended it on a positive note and expressed the hope that next year it would be better.

It was the second year in row when naat took the centre stage at the Arts Council's literary conference. It shows that the contribution of naat poets___ and researchers and critics working on naat as a literary genre_____ is finally getting acceptance and recognition.

"About a quarter of a century ago, naat was considered just a religious phenomenon and its literary or aesthetic value was generally not given much importance," writes Mubeen Mirza, the guest editor of the 25th issue of Naat rang, the Karachi based literary magazine specialising on naat and edited by Sabeeh Rahmani.

In his editorial titled 'Naat aur Urdu ki she'ari tehzeeb' Mirza sahib stresses that "in the past, in literary and critical discussions thorough naat

did come under review, the trend was barely noticeable. Today, different literary, social, religious and cultural aspects of naat are talked about and naat is considered a literary genre. This owes much to Sabeeh Rahmani.

Sabeeh Rahmani is a well-known naat poet of Urdu and his naat recitation, too, is appreciated. Some two decades ago, he made it a mission of his life to promote naat, not only as a religious text but also as a literary genre with all its critical aspects. He established a Naat Research Centre and thus began a journey of a lone traveller that has now become a huge caravan. With its invaluable library a journal regularly published and over 40 publications, the centre has become a source of information and inspiration for those working on naat.

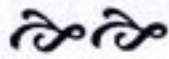
Sabeeh Rahmani launched Naat Rang, the centre's journal, with a view to provide the lovers of literature and naat poetry with a platform to share their views, discuss the related and keep every one informed about the arrival of new works on naat. The first issue came out in April 1995 and it is still going strong. Naat Rang's 25th issue has been published and it coincides with the Rabi-ul-Awwal celebrations.

The 25th issue of different sections which, in addition to naats and book reviews, include research and critical papers on the genre of naat. But Dr. Moinuddin Aqeel's Paper titled 'Teheeqi-naat: soorat-i-haal aur taqaaaz' (the research on naat: present situation and exigencies) deserves some serious attention as it offers some insights and invites the lovers of naat poetry to some introspection. He has raised some serious questions about general research on naat and the research work so far carried out on naat as genre of Urdu poetry. He says for example, "a few dissertations written on naat for obtaining a Ph.D are truly thought provoking informative and comprehensive", Dr Aqeel adds that "at least theses have been written on Maulana Ahmed Raza Khan Bareilvi's naat poetry. We must ask: was the topic so vast and deep that eight different scholars had to research it? And if yes, what was the outcome and what new aspects were discovered each time"?

Similarly, according to Dr. Aqeel many topics related to naat on which Ph.D's were awarded were not worth it, either the topics were too narrow or the dissertations were not up to the mark. What he has emphasised is the relevance, importance and utility of research topics and an avoidance of emotionality.

Other scholarly pieces included in Naat rang are by Dr. Riaz Majeed, Dr. Aziz Ahsan and Dr. Afzal Ahmed Anwer. So Sabeeh Rahmani's ire on scholars' failure to come up with relevant, unemotional and scholarly papers is understandable. He has practically shown in the shape of Naat rang's new issue what he was looking for: some serious, sterling and scholarly pieces on the great poetry known as Urdu naat.

(Dawn News Paper : December 21, 2015)





بلند جب سے ہے طیبہ میں گنبدِ خضرا
زمیں پہ جھکنا عبادت ہے آسماں کے لیے

(افسرمہ پوری)

”نعت رنگ“ کا سلور جوبلی نمبر اس وقت میرے ہاتھوں میں ہے۔ سب سے پہلے تو اس قدر ضخیم اور منفرد شمارہ ترتیب دینے پر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔ ”نعت رنگ“ کا کوئی تازہ شمارہ جب بھی نظر نواز ہوتا ہے تو مجھے بھائی حنیف اسعدی مرحوم کی قیام گاہ پر ہونے والی وہ ابتدائی صحبتیں یاد آ جاتی ہیں جن میں اس مجلے یا کتابی سلسلے کی اشاعت کے مختلف پہلوؤں پر غور و خوض کیا جاتا تھا۔ میں آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ چند نکات پیش کرنا چاہوں گا:

۱۔ موجودہ زمانے میں عام موضوعات کا جریدہ یا کتابی سلسلہ شائع کرنا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ چہ جائے کہ خاص موضوعاتی رسالہ اور وہ بھی نعت کے موضوع پر اس اہتمام اور پابندی سے شائع کیا جائے۔

۲۔ آپ نے اردو کی نئی بستیوں میں جو ٹوکیو سے لاس اینجلس تک پھیلی ہوئی ہیں، اپنے ہم نوا پیدا کر لیے ہیں۔ یعنی معتبر لکھنے والوں کا ایک نیا حلقہ ”نعت رنگ“ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ یہ کارنامہ اس سے قبل اپنے اپنے زمانے میں سر سید احمد خاں (تہذیب الاخلاق)، نیاز فتح پوری (نگار)، شاہد احمد دہلوی (ساقی)، صلاح الدین احمد (ادبی دنیا)، صہبا لکھنوی (افکار)، ڈاکٹر جمیل جالبی (نیا دور)، احمد ندیم قاسمی (فنون) اور ڈاکٹر وزیر آغا (اوراق) وغیرہ سرانجام دے چکے ہیں۔ اس صف میں شمولیت کوئی کم اہم پیش رفت نہیں ہے۔ مقام مسرت ہے کہ آپ ان بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

۳۔ نعت گوئی کے معیار اور اس سے متعلق تحقیق و تنقید کا ایک باب آپ نے ”نعت رنگ“ کے ذریعے وا کر دیا ہے۔ اس سے قبل کسی رسالے میں اس معیار اور تازہ تر عنوانات کے حامل مضامین کم ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔

۴۔ آپ نے نعت گوئی کے آداب، شائستگی، حفظ مراتب اور روایات کی صداقت اور لفظیات کے ضمن میں جن مباحث کو ”نعت رنگ“ میں جگہ دی ہے، ان سے مبتدی اور منتہی دونوں روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔

۵۔ آپ ”نعت رنگ“ میں روایتی انداز کی نعتوں اور روایتی معلومات کے سرسری مضامین کی اشاعت سے گریز کرتے ہیں، اس طرح نعت رنگ کی ادبی، علمی اور تحقیقی اہمیت میں روز افزوں اضافہ ہوا ہے۔

۶۔ دور حاضر کے معروف ادیبوں اور نقادوں میں پروفیسر فتح محمد ملک، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر معین

الدین عقیل، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر یحییٰ نسیط، ڈاکٹر تقی عابدی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر انوار احمد زئی کے نام بہ طور امثال امر پیش کر رہا ہوں کہ یہ تو عرصہ دراز سے لکھ رہے ہیں اور دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ”نعت رنگ“ کے لیے خصوصی مقالے بھی تحریر فرماتے ہیں۔

۷۔ میں اب بہ طور خاص مبین مرزا، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق، ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر داؤد عثمانی کے نام پیش کرتا ہوں جنہوں نے نعت گوئی کے ضمن میں تازہ نگاری کا ثبوت دیا ہے اور انہیں میں ”نعت رنگ“ کے خصوصی مقالہ نگاروں میں شامل کرتا ہوں۔

”نعت رنگ“ کے ۲۵ ویں شمارے کو ایک ادبی دستاویز کہنا چاہیے۔ اس کے مضامین نثر و نظم میں وہ ادبی، تحقیقی اور علمی معیار نظر آتا ہے جو موجودہ ادبی کساد بازاری کے دور میں ایک کرشمے سے کم نہیں۔

مجھے ہمارے اور آپ کے عزیز دوست مبین مرزا کا ابتدائی خصوصیت کے ساتھ بہت اہم محسوس ہوا۔ مبین مرزا ہمہ صفت موصوف ہیں، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، مبصر اور مدیر اور شاید:

بسیار شیوہ ہائے بتاں را کہ نام نیست

والا معاملہ بھی ہے۔ میں نے مختلف ادبی موضوعات پر ان کی تحریریں پڑھی اور پسند کی ہیں لیکن یہ خصوصی مقالہ جسے آپ نے ادارے کے طور پر شائع کیا ہے نعت شناسی کے ضمن میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مبین مرزا نے غیر روایتی انداز میں اردو کی شعری تہذیب کا سیر حاصل جائزہ لیا ہے اور پھر نعت گوئی کے مختلف ادوار سے مسلم اور غیر مسلم نعت گو یوں کی عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ اندازِ تحریر شگفتہ اور مدلل ہے جو عموماً ایسے موضوعات میں کم ہی نظر آتا ہے۔ اگر مبین مرزا مزید مثالیں اور ادوار کو شامل کر سکیں تو یہ مقالہ بجائے خود ایک کتاب بن سکتا ہے جسے اپنے موضوع اور اسلوب کی بنا پر یقیناً مزید قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

مبین مرزا کے اس مقالے کی متعدد خوبیوں کے علاوہ بنیادی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ابتدا سے آخر تک وہ ممکنہ سوالات خود قائم کیے ہیں جو ہند اسلامی تہذیب اور اردو کی شعری تہذیب کے سلسلے میں مبتدی و منتہی کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں اور پھر مثالوں اور دلیلوں کے ساتھ ان سب کا جواب دیتے ہوئے اپنے بنیادی مقدمے (Basic Thesis) کو ثابت کرتے چلے گئے ہیں۔ اس طرح ان کا یہ مقالہ صرف اسلامی عقائد کے حامل افراد کے لیے نہیں، بلکہ اُن کے لیے بھی چشم کشا ہوگا جو سیکولر انداز میں شعر و ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض مجید کو نعت شناسی اور نعت گوئی سے گہرا شغف ہے۔ اس کے علاوہ بھی دیگر اصنافِ سخن میں اُن کی زود گوئی کی مثالیں موجود ہیں۔ پاکستان کے علاوہ جب ہم لوگ چین کے ادبی دورے پر گئے تھے تو ڈاکٹر ریاض مجید کے شخصی اور تخلیقی اوصاف کا زیادہ قریب سے اندازہ ہوا۔ انھوں نے ”نعت رنگ“ کے لیے جو قصیدہ دعائیہ لکھا ہے وہ ان کے خلوص اور قادر الکلامی پر دال ہے۔ قآنی کے مشہور قصیدے ”بہار بہار ہا“ کا ترنم اور بحر کی موسیقیت اس قصیدے کو پڑھ کر ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔ آپ کے لیے ان کا یہ منظوم قول حقیقت پر مبنی ہے:

جہان بھر سے نعت و نقدِ نعت کی فراہمی

جو کام ہم نہ مل کے کر سکے اُس ایک نے کیے

اس میں انھوں نے ہم سب کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کر دی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کا یہ دعائیہ قصیدہ ایک تنقیدی، تخلیقی اور ادبی منظوم مقالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قصیدے کے قافیے بجائے خود قابلِ داد ہیں۔ اس میں ”نعت رنگ“ کے معیارات کے ساتھ ساتھ آپ کی مساعی جلیلہ و منفردہ کو بجا طور پر سراہا گیا ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل دیگر موضوعات کے علاوہ تحقیق کے مزاج و منہاج کے بارے میں تسلسل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں۔ ”تحقیقِ نعت“ کے ضمن میں ان کے خیالات سے یقیناً استفادہ کرنا چاہیے۔ ان کا یہ کہنا ہر طرح مناسب ہے کہ ایک تو نعت گوئی پر تحقیق و مطالعہ کو شخصیات پر منحصر و مخصوص نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے مطالعہ افادی مقصد سے ہونا چاہیے کہ یہ محض حصولِ سند یا مقام و منصب یا شہرت کی خاطر نہ ہو۔

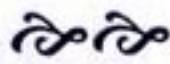
انور شعور، جلیل عالی، اور سید ضیاء الدین نعیم کے خصوصی گوشوں سے ان کا اندازِ نعت گوئی اُجاگر ہو جاتا ہے۔ فتح محمد ملک کا مقالہ ”اقبال حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں“ خاصے کی چیز ہے۔ محسن کا کوروی کے لامیہ قصیدے پر تمام اہم آرا کی روشنی میں جائزہ تحریر کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ محسن کا یہ قصیدہ جامعات کے نصابِ اردو میں شامل ہے اور دورِ حاضر کے ناقدین کی رائے بھی طلبہ تک پہنچنی چاہیے۔

مرزا دبیر اور انشاء اللہ خاں انشا کی نعتیہ شاعری پر شفقت رضوی اور ڈاکٹر تقی عابدی کے مضامین تحقیقی رُخ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق انجم کا مقالہ ”نعت میں منفی عناصر“ پسند آیا۔ ایسے مقالات کی یقیناً بہت ضرورت ہے تاکہ افراط و تفریط کی فضا کو ختم کیا جاسکے۔ ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی نے ”المدح النبوی“ کا تفصیلی تعارف عربی اشعار کے ترجموں کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اس کا مطالعہ یقیناً

اردو کے نعت گو شعرا کے لیے مفید ہوگا۔ کتابوں پر تبصرے اور مختلف شعرا کی نعتوں کے انتخاب میں ”نعت رنگ“ کی روایت کو قائم رکھا گیا ہے۔ سرائیکی شعر و ادب پر عموماً ہمارے یہاں کم توجہ دی جاتی ہے۔ پھر نعت گوئی تو خود ایک خصوصی حصہ ہے جس سے عام قارئین واقف ہی نہیں ہوتے۔ خورشید ربانی نے بہت محنت اور توجہ سے سرائیکی شاعروں میں نعت گوئی کا جائزہ تحریر کیا ہے۔ پاکستان کی دیگر زبانوں کے محققین کو بھی اس قسم کے موضوعات کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

بہ ہر حال، عزیز من! یہ تاثرات تھے جو قلم بند کر دیے۔ احساس پھر بھی یہی ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ سلامت رہیے، شاد و آباد رہیے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمیں باد



ریاض حسین چودھری۔ سیالکوٹ

۳/ دسمبر ۲۰۱۵

نعت رنگ ۲۵ موصول ہو۔ بے ساختہ سینے سے لگایا، کتاب جاں کے اوراق منتظر پر چاندنی پھیل گئی تخلیق، تحقیق اور تنقید کا ایک دلاویز مرقع، ایک تاریخی دستاویز جو اپنی مثال آپ ہے خدائے مصطفیٰ آپ اور آپ کے رفقاء کار کو مزید توفیقات عطا فرمائے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے قصیدہ دعائیہ لکھ کر ہم سب کی ترجمانی کی ہے اور خوب کی ہے۔

ابتدائیہ ایک فکر انگیز فن پارہ ہے۔ اردو کی شعری تہذیب میں عشق رسول کے موتیوں کی تلاش اور اس ضمن میں غزل کا بھرپور حوالہ بذات خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ جستجو اور تجسس کے نئے دروازوں پر دستک دینا بھی محقق کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ مبین مرزا مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے فکر و نظر کی پگڈنڈیوں پر آئے بکھیر کر ثقافت کے ان گنت رنگوں کو ایک تہذیبی اکائی میں جمع کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے اردو زبان کا خمیر بھی خاکِ مدینہ و نجف سے اٹھایا گیا ہے۔ اس کا پیش منظر ہی نہیں پس منظر بھی نور اسلام سے جگمگا رہا ہے۔ کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے کہ حصول پاکستان کی جنگ اسی اردو زبان میں لڑی گئی تھی۔ اردو زبان قصرِ اخوت کا بنیادی پتھر ہے۔ تراجم قرآن، تفاسیر سیرت النبی کی کتب، میلاد نامے تمام تر اسلامی ادب حتیٰ کہ ممتاز علما و مشائخ کی تقاریر اردو زبان کا گرانقدر سرمایہ ہیں۔

معیار اور مقدار کے حوالے سے بھی حمد و نعت کے لیے اردو زبان ہی کو اظہار کا وسیلہ بنایا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے یہ امر باعثِ صداقت ہے کہ آج بھی زیادہ تر نعت غزل کی ہیئت میں کہی جا رہی ہے۔ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی نعت کائنات

میں غزل کی ہیئت بھی مقبول ترین ہیئت ہوگی۔ (اگرچہ نئی نئی اصنافِ سخن میں بھی مدحت نگاری کا عمل دلپذیر جاری رہے گا)

قصیدے سے غزل تک گنبدِ خضرا کی ہریالی

ایک کائناتی سچائی اعتبار و اعتماد کی آخری سرحد بھی عبور کر جائے گی۔ کشورِ دیدہ و دل میں چراغِ جلانے کا عمل بھی پوری آب و تاب سے جاری و ساری رہے گا۔ غزل اپنے بختِ ہمایوں پر جتنا بھی تاز کرے کم ہے۔ غزل درِ حضور پر کاسہ بکفِ خیرات کی طلب گار ہے اور رہے گی۔ مبین مرزا کے جمالیاتی شعور کی تحسین ضروری ہے فرماتے ہیں:

”غزل نے ہمارے دل کی دھڑکنوں کو گناہے تو نعت نے روح کے وجد آفریں نغمے سے انہیں ہم آہنگ کیا ہے اس لیے کہ عشقِ رسول ہمارے دل کی آواز اور ہماری اوج کی پکار ہے اس صدا کا اجالا ہماری تہذیب، زبان، ادب، سماج، فکر اور دل کے سارے گوشوں کو متور کرتا ہے۔“

زبانیں کبھی بھی جمود کا شکار نہیں ہوتیں۔ شعوری اور لاشعوری دونوں سطحوں پر ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ زبان و ادب میں تغیر و تبدل کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ ہر زمانے کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اپنا ایک مزاج ہوتا ہے، اپنے مسائل ہوتے ہیں، ادب میں نئے نئے اسلوب وجود میں آتے ہیں، نئی نئی اصنافِ سخن اور نئے نئے پیرایہ اظہار متعارف ہوتے ہیں، نقطہ و نظر کے معیارات بھی نئے موسموں کی خشک ہواؤں میں سانس لینے لگتے ہیں۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر ریاض مجید نے لفظیاتِ نعت کے حوالے سے جو فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ وہ خوشگوار حیرت کا باعث بنی ہیں اربابِ علم و دانش کو کھلی دعوتِ فکر ہے لکیر پٹنے کی فرسودہ رسم کو اپنے ہی لمبے تلے دفن ہو جانا چاہیے، اجتہادی بصیرت یقیناً روشنیاں بکھیرے گی۔

ڈاکٹر اشفاق انجم نے اپنے احتجاجی مضمون ”نعت میں منفی عناصر“ میں جو اعتراضات اٹھائے ہیں اگر انہیں سو فی صد درست بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ آج کی نعت کے بہت بڑے ذخیرے کو اور شعرا کی ایک بڑی تعداد کو دریا برد کر دیا جائے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون جو اشعار درج کئے ہیں ان میں سے اکثر قابلِ مذمت ہیں نہیں قابلِ گرفت بھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سرے سے نعت کے اشعار ہی نہیں۔ انہیں ضرور دریا برد کیجئے کوئی صاحبِ ایمان آپ کی مخالفت نہیں کرے گی خدا خالق ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی مخلوق، افضل ترین مخلوق، بے مثل بشر:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

بارگاہ خداوندی میں نعت طلبی واقعی ایک سرگوشی ہے جس پر نطق، بیان کی ساری رعنائیوں قربان کی جاسکتی ہیں ”جگمگ نور نہایا رستہ“ کے بارے میں امین راحت چغتائی بجا طور پر فرماتے ہیں: ”یہ بڑی دلاویز نعت ہے جو مناجات کے پردے میں کہی گئی ہے“ حمد میں نعت کے اشعار اور نعت میں حمد یہ اشعار جدید اردو نعت کو امتیاز شان عطا کرتے ہیں، ”حمد و نعت“ کے عنوان سے خوبصورت فن پارے تخلیق ہو رہے ہیں۔ ”جگمگ نور نہایا رستہ“ جلیل عالی کا ہی نہیں اس پورے عہد کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ پرویز ساحر نے اس حمد یہ، نعتیہ نظم کے باطن میں اترنے کی سعی کی ہے انہوں نے جلیل عالی کی لفظیات اور آسان پیرایہ اظہار کے حوالے سے اس شاندار نظم کی خوبصورتیوں کا اجاگر کیا ہے انہوں نے سچ لکھا ہے کہ:

”توفیقی لمحات میں تخلیق ہونے والی یہ نعت مسلسل اردو نعت کی تاریخ میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور کامیاب تجربہ ہے۔ یقیناً جلیل عالی کی یہ کاوش ادب عالیہ میں شمار ہوگی۔“

اس خوبصورت تخلیق کو جتنی بار بھی پڑھا جائے معانی کی ایک نئی کہکشاں فکر و نظر کے آسمانوں پر جلوہ گرد کھائی دیتی ہے۔ رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کے کاسہ فن میں ایسی مزید نعتیں عطا کرے اور تمام راستے روشنیوں کی رم جھم میں بھیگ بھیگ جائیں۔ ڈاکٹر عزیز احسن نے سید ضیاء الدین نعیم کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لے کر تعارفی کلمات تحریر کئے ہیں اور ان کے لہجے کی سادگی اور شعر کی مقصدیت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ بساط ادب پر نئے شگفتہ پھولوں کی چادر بچھانے والوں کو خوش آمدید کہنا ضروری ہے۔ چراغ سے چراغ جلتے ہیں اور خوب سے خوب تر کی تلاش کا سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے نعت رنگ کے پلیٹ فارم پر ممتاز اہل قلم کو جمع کر لیا ہے جو ہر شعبہ زندگی کی نمائندگی کرتے ہوئے نعت رنگ کے قیمتی صفحات کو مزید ثروت مند بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر فتح ملک، ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر افضال احمد انور، پروفیسر محمد اقبال جاوید، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر اشفاق احمد انجم، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، پروفیسر انوار احمد زئی، ڈاکٹر داؤد عثمانی، پروفیسر شفقت رضوی، گوہر ملیانی، منظر عارفی، سعید بدر، تنویر پھول، مبین مرزا، کس کس نام لوں فکر و نظر کی ایک کہکشاں جو محبت رسول کے ان گنت درجوں پر مشتمل ہے دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ اللہ کرے انفرادی اور اجتماعی شعور کی یہ دلاویزیاں تا ابد سلامت رہیں۔

آپ کے ادارہ یہ پڑھ کر کہ منہاج القرآن یونیورسٹی لاہور میں نعت چمیر قائم کی جا رہی ہے شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے بجا فرمایا ہے کہ منہاج القرآن یونیورسٹی میں اگر نعت چمیر

قائم نہ ہو سکی تو اس ادارے کے وجود کا جواز نہ رہے گا تحریک منہاج القرآن فروغ اسم محمد کی تحریک ہے۔ منیر نیازی کا ایک خوبصورت شعر:

فروغ اسم محمد ہو بستیوں میں منیر

قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا؟

مغرب کے فکری مغالطوں اور اپنوں کی بے حسی کے باوجود قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو رہی ہے ہر ہرافق پر نعت مصطفیٰ کے چراغ جل رہے ہیں میرے شہر کے مرد قلندر نے کہا تھا:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

ہوائیں دروازوں پر دستک دے رہی ہیں ہم گہری نیند کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

۞۞

ریاض حسین چودھری۔ سیالکوٹ

۳/ جون ۲۰۱۶ء

آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرا بارہواں نعتیہ مجموعہ ”تحدیثِ نعمت“ شائع ہو گیا ہے۔ آپ اور احباب کے لیے کتاب کے دس نسخے آپ کی خدمت میں بھجوا رہا ہوں متعلقہ احباب تک پہنچانے کی زحمت گوارا فرمائیجئے۔ چند اضافی نسخے بھی ہیں۔ آپ کی صوابدید پر..... دبستانِ نو، لامحدود اور شام درود کی کتابت مکمل ہو چکی ہے۔

میرا موبائل مسلسل بسترِ علالت پر ہے۔ کیا حسن اتفاق ہے بلکہ میں تو اسے آپ کی کرامات میں شمار کرتا ہوں کہ کوئی نمبر بھی ڈائل کر کے آن کاٹن دباتا ہوں تو اسکرین پر آپ کا اسم گرامی ابھر آتا ہے اور ساتھ ہی ٹیپ کی آواز فضا میں بیٹھ میں بکھر جاتی ہے آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ کچھ دیر بعد کوشش کیجئے گا۔

خضر حیات صاحب اور دیگر احباب کی طرف سے سلام قبول فرمائیے گا۔

۞۞

ریاض حسین چودھری۔ سیالکوٹ

۲۱/ اگست ۲۰۱۶ء

آپ کا ای۔ میل موصول ہوا۔ بسترِ علالت پر ہوں۔ شوگر کی وجہ سے پاؤں زخموں کے پیر ہن

میں ہے دواؤں کے ساتھ دعاؤں کو بھی اشد ضرورت ہے۔ کراچی کے احباب کی دعاؤں کی التماس ہے۔ تحدیثِ نعت کے دس نسخے آپ اور آپ کے احباب کے لیے بذریعہ TCS بھجوائے تھے یقیناً مل گئے ہوں گے اور متعلقہ احباب میں تقسیم بھی ہو چکے ہوں گے۔

”اسباب“ امجد اسلام امجد کے حمد و نعت کا مجموعہ ہے اس پر اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں آپ کے حکم کی تعمیل بھی ہو گئی ہے۔ جواب کا منتظر رہوں گا۔

صحیح

ڈاکٹر اشفاق انجم۔ بھارت

۲/ اکتوبر ۲۰۱۶

سید صاحب! اس مرتبہ کمپوزنگ کی بے شمار خامیاں در آئی ہیں جو سلور جہلی نمبر کو داغ دار کر رہی ہیں، خود میرے مضمون میں (جو میں نے DTP شدہ ارسال کیا تھا) Re-setting کے وقت آپ کے کمپوزر نے جانے کیا کیا کہ اشعار کی شکلیں ہی بدل گئی ہیں، مجھے یقین ہے اب تک قارئینِ نعت رنگ کے کئی خطوط اس تعلق سے موصول ہو چکے ہوں گے۔ اب اس کی تصحیح کس طرح ہو یہ آپ جانیں!! ابتدائیہ ہمیشہ کی طرح بے حد جاندار ہے۔ محترم مبین مرزا صاحب نے بڑی جگر کاوی سے کام لیا ہے مقالہ نہایت فکر انگیز ہے۔ ان کی تمام باتوں سے متفق ہوں سوائے غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی کے! یہ بھی سچ ہے کہ ان میں سے بعض نے بڑی عمدہ شاعری کی ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و محبت اپنی جگہ اور آپ کی رسالت پر ایمان لانا اپنی جگہ!! جب تک رسالت پر ایمان نہ لایا جائے گا یہ صرف ”شاعری“ ہی کہلائے گی۔ (علامہ اقبال کی نظمیں رام، کرشن، نانک بھی اسی ذیل میں آتی ہیں۔) غیر مسلم خصوصاً ہنود ”کلکی اوتار“ کے آج بھی منتظر ہیں جس کا ذکر ان کی مقدس کتابوں میں موجود ہے، ان میں سے بیشتر تو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ ”کلکی اوتار“ کوئی اور نہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اس لئے ہنود کی اکثریت آپ کو ”آخری رسول“ نہیں ”آخری اوتار“ کی حیثیت سے جانتی اور عقیدت و محبت رکھتی ہے۔ فاروق ارگلی صاحب کا مضمون ”اردو کے سکھ نعت گو شعراء“ بھی اسی قبیل سے ہے۔ سکھوں کے یہاں وحدانیت تو ہے لیکن ”اقرار رسالت“ نہیں ہے اس لئے ان کی نعت گوئی ہنود سے بہتر ”تقدیسی شاعری“ کے زمرے میں آتی ہے۔

محترم مبین مرزا صاحب کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ”تیری معراج“ والا شعر پنڈت نور بہار لکھنوی کا نہیں ”کرشن بہاری نور لکھنوی“ کا ہے اور نور صاحب ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جن میں آج تک کوئی پنڈت نہیں ہوا اور نہ آگے اس کا کوئی امکان ہی ہے۔

مرزا صاحب نے غالب کے دو اشعار ”ورق تمام ہوا۔۔۔ بو سے مری زباں کیلئے“ کو نعتیہ اشعار کے طور پر درج کیا ہے جب کہ یہ نواب تجل حسین خاں کی شان میں لکھے گئے قصیدے کے اشعار ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

”ابوالخیر کشفی نے بالکل ٹھیک کہا ہے ان شعروں کی بابت کہ بے چارے تجل حسین خاں ان کا مصداق کب ہو سکتے تھے۔ اسی لئے ہمارا اجتماعی ذوق شعری ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آیا۔“ (ص ۲۴)

یہاں سوال یہ اٹھتا ہے کہ غالب اور دیگر عربی، فارسی اور اردو کے قصیدہ گو یوں نے اپنے اپنے ممدوحین (بادشاہ و امراء) کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے کیا وہ واقعی ان کے مصداق ہیں؟ دور کہاں جائے غالب اور ذوق نے ”بہادر شاہ ظفر“ کی شان میں جو کچھ کہا ہے کیا ظفر اس کے مصداق تھے؟ غالب نے جتنے بھی قصیدے لکھے (سوائے حضرت علیؑ کے) تمام کا مقصد صرف حصولِ زرتھا اور کچھ بھی نہیں۔ غالب کی نظر میں اپنی مطلب برآری کے سوا کسی چیز کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ انھوں نے گدھے کو گھوڑا کہنے میں بھی عار محسوس نہیں کیا بلکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھے گئے قصیدے پر جب انھیں کوئی ”دکھنا“ نہیں ملی تو وہی قصیدہ معمولی رد و بدل سے نواب واجد علی کے نام منسوب کر کے لکھنؤ بھیج دیا اور مبلغ دو سو روپے پائے!!

اس لئے ناچیز ”زباں پہ بارِ خدایا“ والے شعر کو نعت کا شعر تسلیم نہیں کرتا، قارئین سے بھی التماس ہے کہ شاعر اپنے شعر کو جس عنوان سے پیش کرتا ہے اسے اسی کے تحت دیکھنا چاہئے۔ ساحر لدھیانوی کا مشہور نغمہ ہے ”لاگا چڑی میں داگ چھپاؤں کیسے“ کون کر اگر کوئی ساحر کو صوفی جان کر حضرت امیر خسروؒ کی صف میں لا بٹھائے تو اسے کیا کہیں گے!؟

اس جگہ راقم الحروف نعت رنگ کے مقالہ نگاروں سے خاص طور پر درخواست کرتا ہے کہ:

”آپ اپنے مقالات و مضامین میں جو اشعار (کسی بھی حیثیت سے) پیش

کرتے ہیں تو اس کے حسن و قبح پر بھی نظر ڈال لیا کریں تو بہتر ہوگا کیوں کہ

مقالات میں عیب دار اشعار بڑے کریہہ المنظر نظر آتے ہیں۔“

مرزا صاحب کے پیش کردہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ کون سوچ پہن کر گیا ہے سوئے فلک کہ جس کا چاند پہ نقش قدم سا لگتا ہے

(ص ۲۴)

یہ ”سوچ“ کیسا اور کس قسم کا لباس ہے میرے تو پلے نہیں پڑا؟ نیز سوچ پہن کر جانے

سے ”چاند پر نقش قدم سا لگنے“ میں کیا علاقہ ہے؟

کاش یہ میری جبیں اور نقش پائے مصطفیٰ صرف روزِ حشر تک ہو جائیں ساکن ساتھ ساتھ

(ص ۲۷)

مطلب نقش پائے مصطفیٰ پر سجدہ!! وہ بھی صرف روزِ حشر تک، اس کے بعد؟ ”صرف“ حشو بھی ہے۔

ہم بھی آپ کی امت ہیں، ہم بھی آپ سے بیعت ہیں اس خوش اقبالی پر اتنا کم ہے جتنا ناز کریں

(ص ۳۸)

امت ہیں؟ یا امت میں ہیں یا امتی ہیں؟ پاکستان میں تو تصوف کی روایت بڑی مضبوط ہے۔ شاعر کو کسی سالک یا پیر طریقت سے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ ”بیعت“ کس سے اور کس طرح کی جاتی ہے! میرے علم کے مطابق بیعت صرف با حیات مرشدین سے ہی کی جاسکتی ہے۔

نعت محبوبِ خدا لب پہ مرے آئی ہے میں نے لکھی نہیں سرکار نے لکھوائی ہے

(ص ۳۹)

کیا یہ واقعہ ہے؟ اول تو لب پہ آنے کو لکھنا نہیں کہتے، دویم کیا سرکار علیہ السلام نے بہ نفس نفیس تشریف لا کر شاعر صاحب سے نعت لکھنے کی درخواست کی تھی؟

نخل صحرا کی طرح خشک ہوں، وہ ابر کرم مجھ پہ برسے تو مجھے برگ و ثمر جائے

(ص ۳۹)

کیا صحرا میں ”نخل خشک“ اگتے ہیں؟ شعر میں ”صحرا کی طرح“ حشو ہے اس کے بغیر بھی معنی مکمل ہیں۔ ”نخل خشک ہوں وہ ابر کرم“ نیز اس میں واحد جمع کا نقص بھی ہے ”برگ و ثمر مل جائیں“ کہیں گے۔

سید صاحب! ”اپنی بات“ کے عنوان سے آپ نے بڑی عمدہ باتیں کہی ہیں لیکن آپ نے بھی چند شعرا یسے پیش کئے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی نقص موجود ہے مثلاً ذوق کا یہ مصرع،

”یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے“

اس میں شکست ناروا کا ایسا عیب موجود ہے جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہے ”لوٹنے“ کی تقطیع

کی جائے تو ”ٹ“ متحرک (مفتوح) ہو جاتا ہے۔

جلوہ روئے محمد کا ہے واصف طارق اس کی تربت میں اُجلے ہی اُجلے ہوں گے

(ص ۶۰)

اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ ”جلوۂ روئے محمد“ کے وصف سے قبر میں اُجالا ہوگا یا نہیں! شعر میں ”اُجالے ہی اُجالے ہوں گے“ غیر فصیح ہے۔ فصحائے زبان نے ہمیشہ ایسے مواقع پر ”اُجالا ہی اُجالا ہوگا“ استعمال کیا ہے۔

جو تجلی منور مرے دل میں تھی وہ پس مرگ شمع لحد ہو گئی

(ص ۶۲)

غزل میں تو قبر اور مرنے کے بعد حشر کے حالات کا بیان کسی طرح قابل اعتراض نہیں ہے لیکن نعت میں مرنے کے بعد قبر کے حالات اور حشر میں شفاعت و کامیابی جیسی باتیں قطعی نامناسب ہیں۔ شاعر کے دل میں کون سی یا کیسی تجلی تھی جو پس مرگ شمع لحد ہو گئی؟ ”شمع لحد یا چراغ مزار“ تو تعویذ قبر کے ساتھ بنے ہوئے طاقے میں روشن کرتے ہیں جس کی روشنی قبر میں جانا تو ممکن نہیں ہے!! شعر سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ ”شمع لحد“ اوپر روشن ہوئی ہے یا قبر کے اندر؟! صفحہ ۷۸ پر صرف ایک شعر درج ہے:

جادۂ حق نہ ملے، اس کے وسیلے کے بغیر جو ملاتی ہے احد سے، ہے وہ سرحد، احمد

معاف کیجئے گا، ”سرحد“ ملاتی نہیں ”جدا“ کرتی ہے۔ دو ملکوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی درمیانی لکیر (علامت) یا حد یا حد فاصل، کو سرحد کہتے ہیں۔

ڈاکٹر معین الدین صاحب کا مقالہ ان کے سابقہ مقالات کی طرح نہایت عمدہ اور فکر انگیز ہے۔ پی ایچ ڈی کے لئے تحریر کئے گئے مقالات کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب نے جس تشویش کا اظہار کیا ہے ناچیز بھی ان کی تائید کرتا ہے۔ کالجوں میں (ہمارے یہاں) پرنسپل شپ کے لئے Ph.D. اور لکچرر شپ کے لئے NET (نیشنل ایلی جلیٹی ٹیسٹ) لازمی ہونے اور تنخواہ کے اسکیل میں زبردست اضافے کے سبب کالج اساتذہ کسی نہ کسی صورت ڈگری حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو بعض اہل قلم ایسے بھی ہیں جو بیگاری پر یہ کام کرتے ہیں یعنی Ph.D. کے مقالات لکھ کر روزی کما رہے ہیں، بعض گائیڈ ایسے ہیں جن کے پاس تیار مقالات موجود ہیں بس اسکا لراپنا رجسٹریشن ان کے انڈر کروالے اور معاوضے کی رقم پیشگی ادا کر دے بقیہ کام وہ خود سنبھال لیں گے یہاں تک کہ Viva بھی فکس ہو جاتا ہے۔

شخصی مقالات میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ وہ حیات ہوں تو صاحب موضوع خود شاندار مقالہ تحریر فرما کر اسکا لری مشکل آسان کر دیتا ہے۔

(راقم جب پونہ یونیورسٹی، اب ساوتری بائی پھلے پونے یونیورسٹی میں اردو، فارسی اور عربی

بورڈ آف اسٹڈیز کا چیئرمین تھا تب یہ تجویز پاس کی تھی کہ ”زندہ شخصیات“ پر Ph.D. کا رجسٹریشن نہیں کیا جائے گا اور اب تک یہ قانون جاری ہے۔)

ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کا مقالہ ”برسبیل نعت۔ الفاظ و تراکیب“ نعت گو یوں کے لئے دعوتِ عمل تو ہے لیکن جب شاعر الفاظ و تراکیب کو اشعار میں ”فٹ“ کرنے لگتا ہے تو جذبہ و تاثیر کہیں گم سے ہو جاتے ہیں اور شعر الفاظ و تراکیب کا گورکھ دھندہ بن کر رہ جاتے ہیں ”آمد“ کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور آورد ہی آورد رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نظریے کی تائید میں جتنے بھی اشعار پیش کئے ہیں سب کے سب بے کیف ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن کا مقالہ ”نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے تلازمات“ بہت ہی عمدہ ہے۔ انھوں نے جس طرح تلفظ، معنی، عروض اور اسلوب پر شعراء کی گرفت کی ہے اسی طرح نعت رنگ میں اشاعت کے لئے موصول ہونے والی شعری تخلیقات پر بھی نگاہ ڈالتے رہیں تو بہت سارے خار و خس پہلے ہی صاف ہو جایا کریں۔ مجھے ان کے ان جملوں سے بڑا مزہ آیا:

(i) یہ عیب اصوات کے ادغام کی وجہ سے بہت سنگین ہو گیا ہے۔

(ii) صل علیٰ محمد کہنے سے بات بنتی ہے لیکن بعض شعراء یہ جانے بغیر ایک مجہول فقرہ صل علیٰ ہی لکھتے ہیں۔ ستم تو یہ ہے کہ بعض شعراء اسی مجہول فقرے کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سمجھتے ہیں۔ (iii) شعر انتہائی رکیک اور متبذل ہے۔

(iv) قمر جلالوی کے شعر پر ہلال جعفری نے جو تین مصرعے لگائے ہیں وہ معراجیہ ادب میں انتہائی رکیک شعر ہے۔ حیرت ہے کہ تضمین نگار نے اس متبذل شعر کی تضمین کر دی۔

غلط اشعار خصوصاً نعتیہ اشعار پر اسی طرح سختی سے گرفت کرنی چاہئے، تاکہ شعراء غزل کی طرح نعت میں بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔ اور انھیں یہ خوف رہے کہ کچھ لوگ آج بھی قلم کو نثر کی طرح استعمال کرنا جانتے ہیں۔

کاشف عرفان صاحب کے مقالے ”اردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات“ میں اپنا ایک شعر دیکھ کر ایک خوشگوار جھٹکا سا لگا کیوں کہ میں آج بھی ”مابعد جدیدیت کا فلسفہ“ سمجھنے سے قاصر ہوں، بہر حال کاشف صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے میرے یہاں بھی مابعد جدیدیت کی نشاندہی فرمائی۔ کاشف صاحب نے بھی اپنے مقالے میں کئی عیب دار اشعار نقل کئے ہیں۔

اورنگ سلیمان کیلئے رشک کا باعث اے سید کونین ترے در کی چٹائی

”اورنگ سلیمان“ کوئی جاندار شے نہیں ہے کہ اس میں رشک و حسد کا جذبہ کارفرما ہو!! دیگر ”چٹائی“ گھر کے اندر بچھائی جاتی ہے، در پر پاتختہ (پاندان) بچھاتے ہیں۔

ملی ہے اس لئے خلعت کہ میں نے زیر عبا چلا تھا گھر سے تو شمشیر بھی پہن لی تھی

(ص ۱۵۶)

شمشیر اگر کسی قسم کا لباس ہے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ تو کمر سے باندھی جاتی ہے۔ ستم تو یہ ہے کہ شاعر نے شمشیر ”زیر عبا پہن لی تھی! شاید زیر جامے کی طرح!! ایک بات اور کیا صرف شمشیر پہن لینے سے خلعت مل جاتی ہے؟ درج ذیل اشعار کی واقعیت، حقیقت اور تعلیٰ پر کیا کہا جاسکتا ہے:

لیل و نہار آپ کے در کے طواف میں لوح و قلم ہے آپ کی مدحت کا آئینہ

(ص ۱۵۶)

”ہے“ اگر کتابت کی خامی نہیں ہے تو اسے ”ہیں“ ہونا چاہئے۔

میں اسی روز سے منسوب تری ذات سے ہوں جب کہ جبریل امیں بھی ترا دربان نہ تھا

(ص ۱۵۶)

اس شعر پر میں اتنا کہوں گا کہ کاشف صاحب ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کا مضمون ”نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے تلازمے“ (نعت رنگ ۲۵) کا بغور مطالعہ فرمائیں تو ایسے اشعار نقل کرنے سے بچ جائیں گے۔ کاشف صاحب نے غالب کے اس شعر:

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تو اس قد دلکش سے جو بازار میں آوے

سے متعلق اپنے استاد محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر صاحب کی گفتگو کا درج ذیل اقتباس

درج کیا ہے:

”انھوں نے (ساحر صاحب نے) فرمایا کہ غزل کے اس شعر میں دنیاوی

محبوب کا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ محبوب، محبوب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

ذات اقدس ہے۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی طویل

قامتی کے باعث سرو کی علامت ان سے منسوب ہے جب کہ صنوبر مناسب

قامت کے باعث حضرت علیؓ کی شخصیت کی علامت ہے اور شعر کی تشریح

ایک منظر پر مبنی ہے جب نبی اکرم اپنے ظاہری جمال کے ساتھ بازارِ مدینہ

میں تشریف لاتے تو حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ ان کے ساتھ

چلا کرتے تھے۔“ (ص ۱۵۰)

محترم ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (ہیڈ آف اردو ڈپارٹمنٹ AIU) سے ایسی غلطی کی امید کم ہی ہے ممکن ہے کہ کاشف صاحب ہی کچھ بھول رہے ہوں، ان کے بیان کردہ اقتباس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ کہیں ایسی کوئی روایت ہی ملتی ہے اور سب سے اہم بات تو یہ کہ غالب نے اپنے شعر میں ”بازار“ نہیں ”گلزار“ استعمال کیا ہے۔ اس صورت میں سارا اقتباس ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد قادری اور ڈاکٹر اصغر علی بلوچ نے بہترین مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے بیک وقت پچاسوں کتابیں پڑھ لی ہیں۔ بہت بہت مبارکباد!

گوہر ملیانی صاحب نے اپنے مضمون ”نعت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تقاضے“ میں جہاں اور اشعار درج کئے ہیں وہیں یہ شعر بھی ہے۔

پیشانی ہے جزو مصحف رو دس پارے کے دو رکوع ابرو

(ص ۲۹۴)

ایک عرصے سے میرے دل و دماغ میں ایک بات شدت سے کھٹک رہی تھی کہ ”قرآن کو سپارہ کیوں کہتے ہیں؟ سی پارہ یعنی تیس ٹکڑے! اور اسی مناسبت سے ”جزدان“ بھی وجود میں آیا یعنی ”جزو“ رکھنے کی تھیلی!! اسے ”کتاب دان یا قرآن دان“ کیوں نہیں کہتے؟! کھٹکنے والی بات یہ ہے کہ جب قرآن کریم ”مکمل کتاب“ ہے تو اسے سی پارہ (تیس ٹکڑے یا جزو) کیوں کہتے ہیں؟ اس سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ قرآن حکیم میں پاروں پر مشتمل ہے، مکمل کتاب نہیں!! ”جزدان“ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ اس تعلق سے میں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ:

(i) قرآن حکیم کی سورتوں کی ترتیب توفیقی یعنی منجانب اللہ ہے۔

(ii) پاروں کی تقسیم غیر توفیقی یعنی اجتہادی ہے جو بعد کے ادوار میں علماء نے کی۔ (کن علماء نے کی اس کی وضاحت نہیں ملتی)

(iii) ۱۲ھ میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ نے زید بن ثابتؓ کو اس کام پر مامور کیا کہ مختلف لوگوں کے پاس قرآن کی لکھی ہوئی تمام سورتوں کو جمع کریں، انہوں نے ایسا ہی کیا، ہر آیت کی تصدیق و تصحیح دو حفاظ کے ذریعے کی اور تمام سورتوں کو ایک مخصوص سائز کے چمڑے کے اوراق پر لکھا پھر ایک ہی جلد میں ایک ڈوری سے اس کی شیرازہ بندی کر دی گئی۔

عہد عثمانی میں اس قرآنی نسخے کی سات نقلیں حضرت زید بن ثابتؓ ہی کی نگرانی میں تیار کرائی گئیں اور مملکت اسلامیہ کے سات مراکز میں بھیج دی گئیں۔ اس مصحف عثمانی کے دو نسخے آج بھی ترکی اور تاشقند کے میوزیم میں موجود ہیں۔

چونکہ شیعہ حضرات کے نزدیک موجودہ قرآن مکمل نہیں ہے اس کے دس پارے امام غائب سامرہ کے غار میں لے کر چلے گئے ہیں اور جب وہ مہدیؑ معبود کے روپ میں ظاہر ہوں گے تو وہ دس پارے بھی لے کر آئیں گے اس وقت قرآن مکمل ہوگا۔ اسی لئے موجودہ قرآن کو ”پاروں“ میں تقسیم کیا گیا ہے اور لفظ ”پارہ“ فارسی ہے۔ اسی عقیدے کو ظاہر کرنے کے لئے ”جزدان“ کی اختراع ہوئی اور غیر شعوری طور پر یہ اصطلاح اہل سنت میں بھی جاری ہو گئی۔

علمائے اہل سنت اور مفتیانِ کرام سے میری درخواست ہے کہ اس تعلق سے ایک مجلس کا قیام عمل میں لائیں اور ایک اجتماعی واجتہادی فیصلہ فرمائیں کہ:

”قرآن کریم کو تیس پاروں میں تقسیم نہ کرتے ہوئے اسے ”تیس ابواب“

میں تقسیم کیا جائے۔ اس صورت میں ”تیس ابواب“ کے ساتھ قرآن کریم

”مکمل کتاب“ کی شکل میں ہمارے سامنے ہوگا۔“

فاروق ارگلی (انڈیا) کا مضمون ”اردو کے سکھ نعت گو شعراء“ بہت خوب ہے۔ انھوں نے واقعی بڑی محنت سے مضمون لکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سکھوں کی نعت شعری، فنی اور جذباتی لحاظ سے نہایت قابل قدر ہے لیکن ہے تو شاعری ہی کیوں کہ جب تک ”اقرار رسالت“ نہ ہو ان میں وہ خوبیاں اور تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی جو اہل ایمان کے کلام کا حصہ ہے اور جہاں تک کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے اس شعر کا تعلق ہے۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

اس شعر کو فاروق صاحب نے اپنے مقالے کا سرنامہ بنایا ہے۔ علماء اور عام مسلمانوں اور ناقدین نعت تک اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ”رحمت اللعالمین“ کہا ہے یعنی سارے عالم اور ساری مخلوقات کے لئے رحمت!! نیز مسلمانوں کے کسی بھی طبقے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی ”اجارہ داری“ کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو اس صورت میں اس شعر کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟

ڈاکٹر شہزاد احمد کا مضمون ”نعتیہ کلیات کی روایت، ایک مطالعاتی جائزہ“ معلومات افزاء مضمون ہے لیکن ان کے انتخاب کردہ اشعار میں سے بعض میں فنی نقائص موجود ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اٹھا کے آنکھ کو میں نے جہاں جدھر دیکھا تو جلوہ تیرا ہی رب العلا ادھر دیکھا

(ص ۳۴۵)

”کو“ حشو ہے۔ آنکھ کو اٹھا کر دیکھنا غیر فصیح ہے۔ جدھر، ادھر غلط قوافی ہیں اور اگر کچھ

رجحان کی جائے تو ”ایطاء“ ہے۔

کفش بردارِ نبی میں ہوں اے شائق مشہور رتبہ شاہوں سے بھی ہے افضل و برتر اپنا

(ص ۳۴۵)

کیا شاعر کے پاس کفش نبی ہے؟ اس کے علاوہ ”میں“ اور ”اپنا“ میں شترگر بہ ہے۔

شا خواں سب زمانہ ہے شا خوانِ محمد کا بشر تو کیا خدا خواہاں ہے خواہاںِ محمد کا

(ص ۳۴۹)

اب تک تو شعراء ”خدا“ کو حضور کے دیدار کا خواہاں و آرزو مند بتاتے تھے، یہاں شاعر

دو قدم آگے بڑھ گیا ہے یعنی اب خدا ”خواہاںِ محمد“ کا بھی خواہاں و طلب گار ہو گیا ہے!!

مختارِ دو عالم کے ہو تم ظلِ الہ پس خوبیاں ہم سے ہوں بھلا کیا محسوب

(ص ۳۵۳)

”مختارِ دو عالم“ یعنی اللہ تعالیٰ کے تم ظلِ الہ ہو کیا مطلب؟ کیا مختارِ دو عالم اور الہ دو الگ

الگ وجود ہیں؟

جو دنیا میں تراکھا کرتے شکوے کریں یارب تعجب ہے کہ ان پر بھی رہے لطف و کرم تیرا

(ص ۳۵۵)

”ترے شکوے“ یہاں غیر فصیح ہے ایسے مواقع پر فصحا ”تراشکوہ“ کہتے ہیں۔ لفظ ”تعجب“

نے شاعر کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کسی فعل پر تعجب کا اظہار کرنا اس کی

قدرت کاملہ پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ شعر میں اللہ کی شانِ ربوبیت پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے

کہ وہ اس کا کھا کر بھی اس کا شکوہ کرنے والوں پر لطف و کرم فرماتا ہے۔ شاعر نے یہ نہیں سوچا کہ وہ

کفار و مشرکین تک کو رزق دیتا ہے!!

دو جہاں میں ہے رواں سکہ رسول اللہ کا دونوں عالم پڑھتے ہیں کلمہ رسول اللہ کا

(ص ۳۵۸)

اصل لفظ ”کلمۃ“ ہے، ”کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی“

ہے مثال ایسی کوئی وقت کے دامن میں تولد ایک انگلی سے کہیں چاند بھی شق ہوتا ہے

(ص ۳۶۳)

”ایک انگلی سے“ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حضور نے چھری کی طرح انگلی چاند پر پھیری اور وہ

سالگرہ کے کیک کی طرح شق ہو گیا!! ایک انگلی کی بجائے ”اک اشارے“ کا محل ہے نیز ”بھی“ حشو ہے۔

نعت محبوب داور سند ہو گئی فرد عصیاں مری مسترد ہو گئی (ص ۳۶۷)

آج کل شعراء میں یہ عجیب سی غلط فہمی بلکہ کج فہمی پرورش پا رہی ہے کہ ”نعت“ ہی بخشش کا ذریعہ ہے بقیہ تمام عبادات بے معنی ہیں یہاں تک کہ شاعر اپنے انجام کا خود فیصلہ کرنے لگا ہے، اپنی فرد عصیاں کو خود ہی مسترد کر رہا ہے جب کہ نص صریح ہے کہ انبیاء کے سوا ہر شخص کا حساب کتاب لازماً ہوگا کسی کو اس سے مفر نہیں۔ ”بخشش“ کے اس ”معیار“ پر قدغن لگنی ضروری ہے۔

مجھ سا عاصی بھی آغوشِ رحمت میں ہے یہ بھی بندہ نوازی کی حد ہو گئی

(ص ۳۶۷)

”بھی“ کی بجائے ”تو“ چاہئے۔ اس کے علاوہ شاعر کو معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ کی قدرت و رحمت کی کوئی حد ہی نہیں ہے آپ نے ”حد ہو گئی“ کہہ کر اس کی رحمت و بندہ نوازی کو محدود کر دیا ہے۔
حمد تیری ہے یہاں اور شکریہ تیرا ادا ہے تو ہی معبود برحق جان تجھ پر ہے فدا

(ص ۳۶۸)

اللہ کا شکر ادا کیا جاتا ہے شکریہ نہیں! شکر کے معنی ہیں سپاس، تعریف!! شکریہ انسانوں کا ادا کیا جاتا ہے۔ ”زبان“ سے تو یہ کسی مبتدی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

آؤ اللہ کے دل دار کی کچھ بات کریں ہاں اسی حسنِ طرح دار کی کچھ بات کریں

(ص ۳۶۸)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا دلدار کہنا قطعی نامناسب ہے اور آپ کے حسن کو ”حسنِ طرح دار“ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ یہ غزل یا پھر عورتوں کے حسن کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے حبیب ہیں دلدار نہیں!!

ظہور کرتی ہے جس دم سحر مدینے میں اذانیں دیتے ہیں دیوار و درمدینے میں

(ص ۳۷۳)

خلاف واقعہ شعر ہے ”اذانیں“ دینے کی بجائے ”چمک سے اٹھتے“ جیسا کوئی نکلڑا چاہئے تھا۔ ویسے بھی یہ نعت کا شعر نہیں ہے۔

ہوا کے جھونکوں میں خوشبو بسی ہوئی ہے وہاں درود پڑھتا ہے اک اک شجر مدینے میں

شجر، حجر، طیور و وحوش کے تسبیح و تہلیل سے متعلق روایتیں موجود ہیں لیکن ان کے درود پڑھنے کی روایت کہیں نظر نہیں آئی!! مدینے کے شجر ہیں تو درود پڑھیں گے اور مکہ شریف کے شجر ذکر کریں گے!؟

روح کو نین کا ترجمان چاہئے مدح احمد کو وہ زباں چاہئے (ص ۳۶۸)

اگر کمپوزنگ کی خامی نہیں ہے تو ثانی مصرع بحر سے خارج ہے۔ ”وہ“ کی بجائے ”ایسی“ چاہئے۔ نیز زبان کی مناسبت سے ”کا ترجمان“ کی بجائے ”کی ترجمان“ چاہئے۔

یہ آرزو نہیں کہ دعائیں ہزار دو پڑھ کے نبی کی نعت لحد میں اتار دو

(ص ۳۹۰)

ایسے وقت دعا کی آرزو نہ کرنا بد نصیبی کی بات ہے۔ لحد میں اتارنے کی دعا سنت ہے اس کے بجائے نعت پڑھنا خلاف سنت عمل ہے۔

مرتبہ سارے مراتب سے ہے اونچا تیرا کون لکھ سکتا ہے قرآن سا قصیدہ تیرا

(ص ۳۹۲)

قصیدہ نظم کی وہ قسم ہے جس میں کسی کی تعریف یا ہجو ہو، اس کے علاوہ قصیدے کا خاص عنصر غلو اور مبالغہ ہوتا ہے اس لئے میری دانست میں قرآن کو حضور کا قصیدہ کہنا مناسب نہیں ہے جب کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات ہے شریعت ہے۔

منظر عارفی کا مضمون ”اردو کے نعتیہ اشعار میں چٹائی، غار حرا جو کے تذکار“ بہت عمدہ مضمون ہے۔ اس سے کم از کم ان شعراء کی اصلاح ضرور ہوگی جو حضور کو نعوذ باللہ ”ایک انتہائی نادار شخصیت“ کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

”نعت نامے اور نقد نعت“ ڈاکٹر داؤد عثمانی کے عمیق مطالعے کا گواہ ہے۔ ان کی یہ کاوش بتاتی ہے کہ وہ ہر تحریر اور خصوصیت سے ”نعت رنگ“ کے ایک ایک لفظ کو نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ ان کے معنی و مفاہیم کا ادراک بھی رکھتے ہیں۔ ان نعت ناموں سے نعت رنگ کے مزاج کی شناخت بھی آسان ہوگئی ہے۔

سرائیکی شاعری اور زبان سے متعلق سرسری کہیں پڑھا تھا لیکن کچھ پلے نہیں پڑا۔ خورشید ربانی صاحب کا شکریہ کہ انھوں نے نہ صرف سرائیکی بلکہ سرائیکی شاعری میں نعت سے متعارف کروایا۔ اللہ نے ہر زبان میں وہ خوبی رکھی ہے کہ اس کے حبیب کی مدح سرائی میں معذور نہیں ہے۔ ہم احتیاط سے رکھتے ہیں اس زمین پہ قدم زمین نعت ہماری کلام ان کا ہے

(ص ۵۲۳)

سید صاحب! ”زمین نعت پہ میں تو کبھی نہ پاؤں رکھوں!!“

انور شعور کی نعتیں ”میرے مولا بلا لومدینے مجھے“ یہ مصرع داوین میں ہونا چاہئے کیوں کہ

یہ شعور صاحب کا نہیں ہے۔ (ص ۵۲۸)

شاہِ عرب کے پیٹ پہ پتھر بندھے ہوئے دیکھے تو کوئی طرزِ معیشت حضور کی

(ص ۵۴۹)

پیٹ پر پتھر بندھے ہونے سے کون سا طرزِ معیشت ظاہر ہوتا ہے؟ اور کیا حضور ہمیشہ پیٹ پر پتھر باندھے رہا کرتے تھے!! یہ تو صرف ایک بار ”خندق“ کے موقع پر ہوا تھا اور بس!! طرزِ مونث نہیں ”مذکر“ لفظ ہے۔

ہوں گے ضرور حاضر دربار ہم شعور ہر امتی کا حق ہے زیارت حضور کی ہر امتی کا ”حق“ نہیں ”خواہش، آرزو، تمنا“ ہے اور اگر حق ہے تو بے چارے جو بغیر زیارت دنیا سے رخصت ہو گئے وہ اپنی اس محرومی کا کس پر دعویٰ کریں گے؟

رہتا ہے شوقِ شربت دیدار آپ کا یہ رند آپ کا ، یہ گنہگار آپ کا

(ص ۵۵۰)

شعر میں ”رند“ حشو قبیح ہے۔ رند، شراب کے ساتھ استعمال ہوتا ہے ”شربت“ کے ساتھ نہیں۔ یہاں رند کی بجائے ”تشنہ“ کر دیں تو یہ نقص دور ہو جاتا ہے۔

رہتا ہے انتظار میں مشغول رات دن بے روزگار آپ کا بیکار آپ کا یہ تو خلافِ واقعہ، غلو یا کذب بیانی ہے شاعر کے لیے رات دن کی ایسی مشغولی تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ”بیکار آپ کا“ میں تعقید معنوی بھی ہے بلکہ اس میں ایک طرحِ ذم کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ نہ کوئی آپ سے ذی مرتبت زمانے میں نہ کوئی آپ سے ذی جاہ یا رسول اللہ دونوں مصرعوں میں ”سے“ کی بجائے ”سا“ چاہئے۔ شاید کمپوزنگ۔۔۔۔۔؟ اگر نہیں تو ”آپ سے زیادہ/ بڑھ کر“ کہنا چاہئے تھا۔

ہمارے قلب میں فاران سے ہوئی روشن کلیم لائے تھے جو آگ طور سے اپنے کیا شاعر فاران پر موجود تھا؟؟ یا پھر اب بھی فاران پر وہ آگ موجود ہے؟؟ حضور نے ”دلوں کو نور“ عطا کیا تھا یا آگ!!؟ ردیف ”اپنے“ بھی ضائع ہو گئی یعنی اس کے بغیر بھی شعر مکمل ہے۔

ہبِ سیاہ میں جب کچھ نظر نہیں آتا وہ کوئی راہ دکھاتے ہیں نور سے اپنے اگر نعت کے عنوان سے یہ شعر درج نہ ہوتا تو کسی صورت اسے نعت کا شعر نہیں کہا جا سکتا۔ ”کوئی“ حشو ہے یہاں ”وہ کوئی“ کی بجائے ”حضور“ کر دیں تو؟ شعور صاحب کی نظم کا شعر ہے رواں تو وقت کی نہر فرات رہتی ہے سحر ہو شام ہو دن ہو کہ رات رہتی ہے

”فرات“ حشو ہے۔ وقت کی نہر رواں رہتی ہے کافی تھا۔ وقت کے ساتھ فرات، راوی، گنگا، جمنا کہنا غیر ضروری ہے۔

کہاں شعور سا کج مچ بیاں و ہیچ مداں کہاں حبیب خدا کی فضیلتوں کا بیاں
ہوئے ہیں نعت میں اعجاز شعری و ادبی۔۔۔۔۔ محمد عربی
محمد عربی اے محمد عربی

جب مخاطب محمد عربی سے ہے تو پھر یہاں ”حبیب خدا“ کہنا درست نہیں ہے کیوں کہ اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حبیب خدا اور محمد عربی دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ شاعر کے ”دعویٰ اعجاز شعری و ادبی“ پر کیا کہا جائے؟

ہو کر بتوں سے خالی وہ بن گئے مثالی ممنون ہیں نہایت بت خانے، مصطفیٰ کے
منادر ”بتوں“ سے خالی ہو گئے تو پھر وہ بت خانے کہاں رہ گئے؟ اور اگر بت خانے ہیں تو ان میں بت بھی لازماً ہوں گے!! اور اگر قاری روانی میں بت خانے اور مصطفیٰ میں وقفہ نہ دے سکا تو کیا مطلب ہوگا؟

امید و بیم میں رکھتا ہے شوق دید ہمیں کبھی قرار کبھی اضطراب آتا ہے
”بیم“ (خوف) کا استعمال بے محل ہے۔ اضطراب ”آتا“ نہیں، ہوتا ہے۔
محو طواف کون و مکاں آپ کے لئے پیدا کیا گیا ہے جہاں آپ کے لئے
اولیٰ مصرع میں ”لئے“ حشو قبیح ہے۔ ”محو طواف کون و مکاں آپ کے“ پر بات مکمل ہو جاتی ہے اور اگر ”لئے“ کو شامل کریں تو سوال اٹھتا ہے کہ:

”کون و مکاں آپ کے لئے کس کے طواف میں محو ہیں؟“
ثانی مصرعے میں ”جہاں“ بھی حشو قبیح ہے کیوں کہ ”کون و مکاں“ میں یہ بھی شامل ہے۔
اس امر پر کہ سب سے عظیم آدمی ہے کون ہے اتفاق دیدہ و راں آپ کے لئے
شعر کی ردیف ضائع ہو گئی۔ اتفاق کے ساتھ ”کیلئے“ نہیں ”پر“ کی ضرورت ہے۔ یعنی
”دیدہ و راں کا آپ پر اتفاق ہے۔“

ہے زیارت کدہ روضہ محبوب خدا طیبہ اچھا نہ لگے باغ جناں سے کیسے
شعر میں زبردست تعقید لفظی و معنوی ہے یعنی شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ”روضہ زیارت کدہ ہے“ لیکن شعر کی بندش سے ظاہر ہوتا ہے کہ،

”طیبہ محبوب خدا کا زیارت کدہ ہے! یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے روضے کی

زیارت فرما رہے ہیں۔“

”جگمگ نور نہایا رستہ“ (امین راحت چغتائی۔ پرویز ساحر)

جلیل عالی کی نظم کا راحت اور پرویز صاحبان نے نہایت عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ صرف ایک چیز مجھے کھٹک رہی ہے جس کے لیے میں ماہر فن عروض سے رجوع ہونا چاہتا ہوں کہ نظم کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

اللہ! اللہ! آقا! آقا!!

کیسی منزل کیسا رستہ

قدم قدم قرباں دل اس پر

جس کے وسیلے پایا رستہ

(ص ۵۶۹)

پہلے شعر کی تقطیع رکن ”فعلن“ مثنیٰ سالم پر یوگی جب کہ دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ اس وزن پر نہیں ہے تو کیا ماہرین عروض نے اسے جائز قرار دیا ہے؟ ”سید ضیاء الدین نعیم“

تہجد میں کھڑے ہوتے تھے جب رب کی عبادت کو تو اک سیل رواں اشکوں کا آنکھوں سے برستا تھا
(ص ۵۷۷)

”سیل رواں“ کا مطلب ہے ”بہتا ہوا سیلاب“ اور سیل برستا نہیں، بادل برستا ہے!!

ساری بد زبیاں ماحول کی زیبا کر دیں حسن نیت نے پیمبر کے بجائے شب و روز

اگر کوئی شے ”زیبا“ ہے تو وہ ”بد“ کیسے ہوگی؟ یہاں ”بد رنگیاں“ بھی آسکتا تھا۔ ثانی

مصرعے کے ٹکڑے ”پیمبر کے“ میں تقصید ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ”حسن نیت نے پیمبر کے شب و روز بجائے!“ ”کے“ کی بجائے ”کی“ چاہئے تھا۔

خیر اندیش آپ اپنے دشمنوں کے بھی رہے بغض رکھا ہی نہیں دل میں کسی کے واسطے

رحمۃ اللعالمین کا امتی ہے تو نعیم دمیں ہرگز بغض مت رکھنا کسی کے واسطے

دونوں شعروں میں ردیف ”کے واسطے“ ضائع ہو گئی، اس کی بجائے صرف ”سے“ چاہئے۔

بھولا ہوا تھا اپنی حقیقت کو آدمی آئینہ آدمی کو دکھایا حضور نے

”آئینہ دکھانا“ محاورہ ہے جس کا مطلب ہے ”کسی کو اس کی اصلیت، اوقات یا عیب

دکھانا!“ اس صورت میں میرے خیال میں یہاں آئینہ دکھانا کا استعمال صحیح نہیں ہوا ہے۔

چلنا خدا کے حکم پہ انساں کے بس میں ہے اپنے عمل عمل سے بتایا حضور نے

یہاں پہلے ”عمل“ کو ”ہر اک“ کر دیں تو!! وہ عنوان کا وہ ان کی شفقت وہ فتح کے دن بھی یہ عنایت کہ جائے ہر شخص امان پائے صلوٰۃ ان پر سلام ان پر

یہاں ”کہ جائے ہر شخص امان پائے“ محل نظر ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ”جاؤ ہر شخص کو امان دی گئی“ اس معنی کے مطابق یہ بیان غیر فصیح ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ ”جائے امان پائے“ تو جائے اور امان کے بیچ ”ہر شخص“ کی موجودگی غلط ہے جب کہ ”جائے، ہر شخص کو امان دی گئی“ یا ”ہر شخص کو امان دی گئی!!“

نعیم ان کی محبت تھی رب سے بے پایاں رضا پہ رکھتے تھے اس کی نظر خدا کے رسول مصرعہ اولیٰ میں ”کی“ کی بجائے ”کو“ چاہئے اور جملے کی ترکیب یوں درست ہوگی ”اس کی رضا پہ نظر رکھتے تھے خدا کے رسول“

انہوں نے تزکیہ فرمایا اہل ایماں کا نکال لے گئے ظلمت سے روشنی کی طرف عجیب سا شعر ہے ”انہوں نے اہل ایماں کا تزکیہ فرمایا اور انہیں ظلمت سے روشنی کی طرف نکال لے گئے!“ کیا اہل ایمان ظلمت میں تھے؟ یہاں ”اہل ایماں“ کی بجائے ”اہل عصیاں“ ہونا چاہئے!! پروفیسر فتح محمد ملک کا مضمون ”اقبال، حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں“ عمدہ کاوش ہے۔ ڈاکٹر حبیب الرحمن رحیمی نے اپنے مضمون، محسن کا کوروی کے قصیدہ لامیہ پر ایک نظر میں“ جو اتفاق و اختلاف کی بحث چھیڑی ہے وہ برسوں پہلے سرد ہو چکی ہے اب اس کے احیاء کا کوئی موقع ہے نہ مطلب!! ان کا یہ کہنا:

”جہاں تک اس کی تشبیب میں ہندوانہ ماحول و فضا یا ہندو صنمیات کی تلمیحات کے استعمال کی بات ہے تو ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یہ قصیدہ اس وقت کہا گیا ہے جب برصغیر متحد تھا، اس کی تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت اس متحد ملک میں ہندو اور مسلمان سب ایک ساتھ رہتے تھے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دونوں مذاہب ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہیں اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں کی مذہبی شخصیات اور مقامات سے بخوبی واقف تھے اور ہندو بھی مسلم معاشرے میں گھل مل گئے تھے یہی وجہ ہے کہ متعدد غیر مسلم شعراء نے بھی نعت گوئی کا شرف حاصل کیا، اس ماحول و معاشرے میں محسن نے یہ قصیدہ کہا۔“ (ص ۶۵)

نہایت بھونڈا جواز اور نہایت بودی دلیل ہے۔ ماحول و معاشرے کے اثرات اپنی جگہ

مسلم لیکن مذاہب کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا قطعی ناقابل قبول ہے۔ محسن نے کبھی مندر میں ماتھا ٹیکا اور نہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور کرشن بہاری نور نے مسجد میں نماز پڑھی!! اب محسن کے اس قصیدے پر بحث لا حاصل ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید کا مضمون ”ڈاکٹر محمود غازی“ بہت خوب ہے، مضمون میں یہ دو شعر ہیروں کی طرح جگمگا رہے ہیں:

لہو جلا کے کیا لفظ کا دیا روشن زمیں اٹھائی، اسے آسماں کیا ہم نے
کسی کے روبرو بیٹھا رہا میں بے زباں ہو کر مری آنکھوں سے حسرت پھوٹ نکلی ہاتل ہو کر
سرشار صدیقی کے درج ذیل اشعار نے ذہن کے درتے کچھ کھول دیئے
مدینے والے کو سب کچھ بتا دیا میں نے بہت سکول ہے گناہوں کے اعتراف کے بعد
اس میں اگرچہ ”مدینے والے“ حس سمع و بصر پر گراں گزرتا ہے اس کی بجائے ”مدینے جا
کے کبھی کچھ بتا دیا میں نے“ جیسا مصرع ہوتا تو لطف اور بھی دو بالا ہو جاتا۔

درِ کعبہ ہو کبھی ہو مرے سرکار کا در کاش یوں در بدری میرا مقدر ہو جائے
محترم پروفیسر انوار احمد زئی کا مضمون ”پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر۔ ایک مطالعہ“
ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کے تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جو ہم جیسوں کے جذبہ شوق کو ہمیز کرتا ہے کہ
اس سے سیراب ہوا جائے! کیا یہ ممکن نہیں کہ کتاب کی ایک جلد ہمیں بھی مہیا کی جائے!
حاصل مطالعہ

اس عنوان کے تحت ڈاکٹر عزیز احسن صاحب نے بڑے نپے تلے انداز میں تبصرے کئے
ہیں۔ شعراء کے عمدہ اشعار بھی منتخب کئے ہیں لیکن ایک جگہ چوک گئے ہیں:

کبھی غلاموں کو دے رہے ہیں وہ باغِ جنت کی راہ داری

کبھی فقیروں کو دستِ رحمت سے جامِ کوثر پلا رہے ہیں

شعر میں دو نقائص ہیں: (۱) راہ داری دینا غلط ہے ”پروانہ راہ داری“ دیا جاتا ہے۔

(۲) ”جامِ کوثر“ پلا رہے ہیں؟ یہ تو روزِ محشر کا معاملہ ہے!! خود ڈاکٹر عزیز احسن لکھتے ہیں:

”حشر و نشر کے تخیلاتی بیان کو واقعاتی سطح پر بیان کرنے سے گریز لازم ہے۔

ورنہ شاعر خواہ مخواہ دروغ گو قرار پائے گا۔“ (نعت رنگ نمبر ۲۵، ص ۱۲۲)

ایوانِ مدحت

حنیف اسعدی مرحوم کی نعت کی ردیف ”نہیں ان کے بعد کوئی نہیں“ سے تعقید پیدا ہو

رہی ہے، تین شعر ملاحظہ ہوں:

کوئی ایسی ذات ہمہ صفت، کوئی ایسا نور ہمہ جہت
یہ سوال تھا کوئی اور بھی ہے گناہگاروں کا آسرا
وہ قدم اٹھے تو بیک قدم ہمہ کائنات تھی زیر پا
کوئی مصطفیٰ، کوئی مجتبیٰ، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
تو رواں رواں یہ پکار اٹھا نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
یہ بلندیاں کوئی چھو سکا، نہیں ان کے بعد کوئی نہیں
(ص ۸۱۳)

ردیف ”نہیں ان کے بعد کوئی نہیں“ سے تعقید یہ پیدا ہو رہی ہے کہ،

”ان سے پہلے یہ سب تھا!! بعد میں کوئی نہیں ہوا؟“

اورنگ نبوت پہ وہی صدر نشین ہیں جو لمحے سر عرش گزارے ہیں ہزاروں

(ص ۸۱۴)

”اورنگ“ کے معنی ہیں ”تخت شاہی“ جس پر سوائے بادشاہ کے کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا اس لئے اورنگ نبوت پر صدر نشین، کہنا غلط ہے کیوں کہ اس صورت میں کچھ اور لوگوں کو بھی اورنگ پر بٹھانا ہوگا تب ”صدر نشینی“ کی نوبت آئے گی!! ثانی مصرع بھی تعقید کا شکار ہو گیا ہے یعنی شعر سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ:

”جو ہزاروں لمحے سر عرش گزارے ہیں، وہی لمحے صدر نشین ہیں!“

کیا میسر ہے، میسر جس کو یہ جگنو نہیں نعت کیا لکھے گا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں

(ص ۸۲۱)

کیا جس کی آنکھ میں آنسو نہیں وہ نعت نہیں لکھ سکتا؟ نعت لکھنے کے لئے تو ”حب سلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ کی ضرورت ہے آنسو کی نہیں!!

خواب میں کاش کبھی ایسی بھی ساعت پاؤں آپ کو نعت سنانے کی سعادت پاؤں

(ص ۸۲۲)

”خواب میں“ حشو ہے اس کے بغیر بھی مصرع مکمل معنی دیتا ہے۔ یہ مصرع یوں بھی ہو

سکتا تھا:

خواب ہی میں سہی ایسی کبھی ساعت پاؤں

مدینے کے جزیرے پر مری کشتی ہے آپہنچی خزانہ سامنے ہو تو بھلا نقشہ میں کیا مانگوں

(ص ۸۲۳)

مدینہ، ”جزیرہ“ تو نہیں ہے!!

ریاض خوشنوا کو بھی رعایا میں رکھیں شامل محمد کی غلامی کی خدا سے انتہا مانگوں
 پہلا مسئلہ تو ”غلامی کی انتہا“ ہے، یہ کیسی ہوتی ہے؟ دوسرے ردیف ”مانگوں“ غلط ہے یعنی
 ریاض اور مانگنے والا یہاں دو الگ الگ شخصیتیں ہو جاتی ہیں مطلب مانگنے والا ”ریاض خوشنوا“ کیلئے
 مانگ رہا ہے جب کہ ریاض خود اپنے لئے مانگ رہا ہے۔ اس صورت میں ردیف ”مانگے“ ہونی چاہئے۔
 نیز ”جب خدا سے مانگا جا رہا ہے تو ”رکھیں“ صیغہ جمع قطعی غلط ہے اسے ”رکھے“ ہونا چاہئے تھا۔“
 ستیہ پال آنند کی نظم ”استغاثہ“ بہترین نظم ہے اور میرے مسلک کی تائید کرتی ہے یعنی
 حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ”تو، تیرا“ سے خطاب کرنا بے ادبی ہے۔ (اس تعلق سے میرا مضمون ”اردو نعت
 میں ضمائر کا استعمال“ ملاحظہ ہو۔ نعت رنگ نمبر ۲۲)

اُجالا آپ ہی کی ذات سے ہوا ورنہ شعاع نور نہ تھی روشنی کے دامن میں

(ص ۸۲۶)

عجیب سا شعر ہے، اجالا اللہ کی قدرت سے ہوا یا آپ کی ذات اقدس سے؟ نیز کیا حضور
 سے پہلے روشنی کے مظاہر چاند، سورج، ستارے نہیں تھے؟! پھر ”شعاع نور“ اور ”روشنی“ میں کیا فرق ہے؟
 جز ایک اشکِ ندامت، جز ایک حرفِ دعا نہیں ہے کچھ مری تردامنی کے دامن میں
 ”تردامنی کے دامن میں“ سمجھ میں نہیں آیا!! ”کچھ“ کے بعد ”بھی“ کی ضرورت ہے۔
 جہان کن سے ادھر کیا تھا کون جانتا ہے مگر وہ نور کہ جس سے یہ زندگی ہوئی ہے
 (ص ۸۲۸)

”جہان کن“ یہ کون سا جہان ہے؟ ”یہ“ حشو ہے۔ تقابل ردیفین کا نقص بھی ہے۔
 ہزار شکر غلامانِ شاہ بطحا میں شروع دن سے مری حاضری لگی ہوئی ہے
 ”غلامانِ شبہ بطحا میں حاضری“ یہ کون حضرات ہیں کہ جن کے یہاں حاضری پر شاعر ہزار
 شکر ادا کر رہا ہے؟ ”شروع دن“ سے کیا مراد ہے؟ روزِ ازل یا شاعر کی ولادت؟! اولیٰ مصرع یوں
 بھی ہو سکتا تھا: ”ہزار شکر کہ دربارِ شاہ بطحا میں“

بہم تھے دامنِ رحمت سے جب تو چین سے تھے جدا ہوئے ہیں تو اب جان پر بنی ہوئی ہے
 ”دامن سے بہم ہوتا“ یہ تو زبان نہیں ہے۔ بہم ہونا کا مطلب ”ساتھ، باہم، یکجا“ کے
 ہیں۔ ایسے مواقع پر ”دامن سے جڑنا، وابستہ ہونا“ کہا جاتا ہے۔

چاہئے خیر کے ایوان کی تعمیر اگر کام اس کام میں دیتا ہے سراپا تیرا

(ص ۸۳۳)

”سراپا“ ایوانِ خیر کی تعمیر میں کس طرح کام آئے گا؟ یہاں ”اسوہ“ کی ضرورت تھی۔
 ”کام اس کام میں آتا ہے بس اسوہ تیرا“

شب دنیا میں ضیا تیری ہے اے ماہِ عرب فرش سے عرشِ تلک طاری ہے ہالہ تیرا
 ”شب دنیا“ سے ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں صرف رات ہی رات ہے اے ”ظلمتِ دہر“
 ہوتا چاہئے تھا۔ حضور کیلئے ”اے“ کا اس طرح استعمال میرے نزدیک نامناسب ہے کیوں کہ یہ
 ہماری غیر منقسم ہندوستانی تہذیب کی نشانی ہے جو ”اپنوں سے چھوٹے یا کمتر شخص“ کیلئے مستعمل ہے۔
 نیز ”ہالہ“ طاری نہیں ہوتا ”گھیرتا“ ہے۔

اس میں شامل ہے رضا و کرم عز و جل ہر عبادت سے درود آپ کا اعلیٰ افضل

(ص ۸۳۵)

نعوذ باللہ! ”نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ“ سب بیکار!! صرف درود پڑھو اور سیدھے جنت میں
 چلے جاؤ!!

سامنے ہیں سرورِ کون و مکاں آہستہ بول اے لبِ لرزاں! دلِ گریہ کناں آہستہ بول

(ص ۸۳۷)

”لبِ لرزاں! دلِ گریہ کناں“ دو چیزیں ہیں اس لئے ردیف ”بول“ کی بجائے ”بولو“
 ہونی چاہئے۔ یہی حال اس مصرعے کا ہے:

اے دفورِ شوق! اے جذبِ رواں آہستہ بول

”جذبِ رواں“ کا مطلب بھی میری سمجھ میں نہیں آیا؟

بولنا واجب نہیں سرکار کے دربار میں آپ سن لیتے ہیں اشکوں کی زباں آہستہ بول
 جب ”بولنا واجب نہیں“ کہہ دیا تو پھر ردیف ”آہستہ بول“ بے معنی ہو گئی نیز اشکوں کی
 زباں سننا بھی محلِ نظر ہے، ”بات اور بیان“ سنا جاتا ہے، ”زبان“ نہیں!!

وہی ہے عشقِ نبی میں کامل ہے، وہی ہے حبِ نبی کا وارث

رہ محبت میں چلتے چلتے، فتا جو انسان ہو گیا ہے (ص ۸۳۸)

کیا ”حبِ نبی“ وراثت میں ملتی ہے؟ ”چلتے چلتے“ حشو ہے اس کے بغیر بھی معنی مکمل ہیں۔
 ”چلتے چلتے، ہنتے ہنتے، آتے جاتے“ جیسا کوئی بھی نکلزار کہیں یہ صرف بحرِ پوری کرنے کے لئے ہوگا۔

ملیں قبائیں مجھے ہنر کی، وقارِ صوت و صدا بھی نکھرا

رسولِ اکرم کا ذکرِ انور، اسی کی پہچان ہو گیا ہے

”وقار“ نکھرتا نہیں ”گھٹتا، بڑھتا“ ہے۔

دن میں کتنی بار ادب سے ان کا انجم
جی بھر کر میں نام نہ لوں تو رو پڑتا ہوں
(ص ۸۴۰)

”کتنی“ غلط زبان ہے، ”کئی کئی“ کا محل ہے، ویسے کیا انجم صاحب واقعی اس طرح روتے
ہیں یا پھر یہ نری شاعری ہی ہے؟!

میرے محبوب! کہا رب نے یہ معراج کی رات
آمرے پاس تجھے زینہ بہ زینہ دیکھوں
(ص ۸۴۲)

کیا خالد صاحب نے رب کو ایسا کہتے ہوئے خود سنا ہے؟ نبی کریم ”زینے چڑھ“ کر
آسمان پر تشریف لے گئے تھے یا براق پر سوار ہو کر؟

اے شافع امم ہے تمنائے عاصیاں
نوبت کبھی نہ آئے سوال و جواب کی
(ص ۸۴۳)

قبر اور عرصہ محشر کے سوال و جواب تو لازمی و ناگزیر ہیں ان سے کسی حال مفر نہیں پھر
”عاصیوں کی تمنا“ کی اوقات ہی کیا ہے! عباد و زہاد تک اس مرحلے کو یاد کر کے لرز اٹھتے ہیں حضرت
عثمان غنیؓ کے تعلق سے مشہور ہے کہ جب آپ کسی قبر سے گزرتے تو زار و قطار گریہ کرتے تھے۔
دریافت کرنے پر بتایا کہ:

”موت کے بعد پہلی کٹھن منزل قبر ہے، یہاں سے بچ نکلے تو آگے خیر ہی
خیر ہے ورنہ۔۔۔۔!!“

”شافع امم“ پر بحث کی گنجائش ہے۔ کچھ حضرات اسے ”رحمۃ اللعالمین“ کی طرح درست
مانتے ہیں لیکن میری نگاہ میں ”شافع امم“ درست نہیں ہے کیوں کہ امم، امت کی جمع ہے اس میں
یہودی، نصرانی، سکھ، ہنود سبھی شامل ہو جائیں گے۔ ان کی شفاعت کے لئے سرکار کس طرح اور کیوں
سفارش فرمائیں گے؟ شفاعت کی اولین شرط تو اقرار ”لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ ہے جو امت مسلمہ
کے سوا کسی کی زبان پر نہیں ہے۔ پھر۔۔۔۔!!

کھلا یہ منزل ہستی کا مجھ پہ رازِ نہاں
نجات کا کوئی رستہ نہیں سوائے درود
(ص ۸۴۵)

سلیم کوثر جیسا شاعر بھی اگر درود کو عبادات پر ترجیح دے تو جائے ماتم ہے۔

حضور میں بھی تو سوکھے شجر کی صورت ہوں
مجھے بھی خوف ہے لوگوں سے پائمالی کا
(ص ۸۴۶)

”شجر کاٹا جاتا ہے“ پائمال نہیں کیا جاتا، گھاس پھوس پودے وغیرہ پائمال کئے جاتے ہیں۔
توڑ کر جس نے دوبارہ مہ کامل باندھا میں نے اس ہاتھ سے یہ ٹوٹا ہوا دل باندھا

(ص ۸۳۸)

شعر میں زبردست تعقید ہے، ”جس ہاتھ سے میں نے مہ کامل توڑ کر دوبارہ باندھا اسی ہاتھ سے یہ ٹوٹا ہوا دل باندھا!!؟“

اور اگر معجزہ شق القمر کا ذکر ہے تو حضور نے مہ کامل کو توڑا نہیں تھا اور نہ ہی باندھا تھا!!
ٹوٹنے اور شق ہونے کے عمل سے شاید عاصم صاحب آگاہ نہیں ہیں اور ٹوٹی ہوئی چیز جوڑی جاتی ہے،
باندھی نہیں جاتی۔

سایہ سرکار پر دنیا کا ہر سایہ نثار قامت اطہر پہ ہر سرو سمن صدقے کروں
بے شمار روایتیں ہیں کہ ”سرکارِ دو عالم“ کا سایہ نہیں تھا پھر عاصم صاحب کس سائے پر دنیا
کا ہر سایہ نثار کر رہے ہیں؟ اس کے علاوہ ”سرو سمن“ سمجھ میں نہیں آیا کہیں یہ کمپوزنگ کی نذر نہ ہو گیا
ہو یعنی ”سرو چمن!“

خواہش دید نبی کس کو نہیں ہے لیکن رب اکبر سا طلب گار کوئی اور نہیں

(ص ۸۵۸)

”دید“ کے معنی ہیں ”نگاہ، نظر، دیکھا ہوا“ اور یہ مرکبات میں استعمال ہوتا ہے جیسے ”چشم دید“! یہاں ”خواہش دیدار“ کہنا چاہئے تھا۔ ”رب اکبر سا طلب گار“ کے لئے قمر وارثی صاحب عزیز
احسن صاحب کا مضمون ”نعتیہ ادب کی تحقیق“۔۔۔ ص ۱۰۳-۱۲۸ نعت رنگ نمبر ۲۵ پڑھ لیں تو ان کے
لئے بڑا نافع ہوگا۔

آپ احمد بھی محمد بھی ہیں محمود بھی ہیں ان چراغوں سے ضیا بار کوئی اور نہیں
”سے“ کی بجائے ”سے زیادہ“ یا پھر ”سا“ کہنا تھا۔

دل کو دنیا کے جھمیلوں میں الجھنے نہ دیا اس کو بس جستجوئے باغ ارم میں رکھا

(ص ۸۵۹)

محترمہ نورین صاحبہ سے التماس ہے کہ ”ارم“ کا استعمال نہ کیا کریں کہ یہ ”شداذ“ کی
جنت تھی۔

نعت لکھنے کو جو کاغذ پہ لکھا بسم اللہ آئی جبریل کی فوراً ہی صدا بسم اللہ

(ص ۸۶۰)

اگر واقعی جبریل علیہ السلام نے بسم اللہ کہا تو مبارک ہو۔۔۔! ورنہ یہ دروغ گوئی ہے، یہی حال اس شعر کا بھی ہے:

میں نے اک نعت سنانے کی اجازت چاہی اور نکیرین نے خوش ہو کے کہا بسم اللہ
دلچسپ شعر ہے، شاعر نے قبر میں مشاعرہ برپا کر دیا اور نکیرین سوال و جواب بھول کر داد
خن دینے لگے!!

خدا کی بزمِ جہاں پر ہے یہ عنایت خاص کہ دے کے آپ کو بھیجا گیا ہدایت خاص
(ص ۸۶۲)

”ہدایت“ کی مناسبت سے ”بھیجی گئی“ کا محل ہے۔

ہم اُمّتی ہیں رعایت یہ خاص ہے ہم سے خوشا کہ حشر کے دن بھی ہے یہ رعایت خاص
”کون سی رعایت خاص؟“ اس کی کچھ تو وضاحت ہونی تھی۔ ”حشر کے دن بھی“ ہے
نہیں ”ہوگی!!“

قلم نے حرفِ ثنا جیسے ہی شروع کیا فلک نے وجد میں قرطاس پہ رکوع کیا
(ص ۸۶۶)

قرطاس پر قلم کا سجدہ تو ہو سکتا ہے لیکن رکوعِ فلک کس طرح ہوگا؟
ہوئی جو فکر لکھوں نعت شان کے شایاں حسین شعر نے مطلع معاً طلوع کیا
”حسین شعر“ یہ کون صاحب ہیں جنہوں نے مطلع طلوع کیا!
اسی کو شان بڑھانی تھی آسمانوں پر تو اس نے آمد سرکار سے رجوع کیا
آفتاب صاحب کو لاکھوں بار استغفار کرنا چاہئے، شعر کا مطلب تو یہ نکلتا ہے،
”اللہ کو آسمانوں پر خود اپنی شان بڑھانی تھی، اس لئے اس نے آمد سرکار سے
رجوع کیا!“

یعنی اللہ تعالیٰ اپنی شان بڑھانے کے لئے سرکار کا محتاج ہے! نعوذ باللہ!!

اک مٹھی ستو ہوں، روٹی خشک ادھوری ہو مولا! مجھ سے آپ کی سنت کیسے پوری ہو
(ص ۸۶۷)

روٹی، تازہ، خشک، کچی، جلی، آدھی، پاؤ تو ہوتی ہے لیکن ”ادھوری روٹی“ تو آج تک نہ
دیکھی نہ سنی!! اور پھر ستو اور خشک روٹی کھانا ہی حضور کی سنت ہے؟ ارے بھائی اس تعلق سے فکر مند نہ
ہوں اگر یہ سنت ادا نہ ہو سکی تو کوئی قابلِ گرفت بات نہیں ہے بس نماز، روزہ، تلاوت اور اسوۂ حسنہ

پر عمل کرتے رہئے انشاء اللہ بیڑہ پار ہو جائے گا۔

سمیعہ ناز صاحبہ کے درج ذیل اشعار میں تقابل ردیفین کا نقص موجود ہے:

عطا حسن ارادت ہو، بصیرت بھی ملے مجھ کو سبق سیرت کا جواز برکرائے ایسی مدحت ہو
وہ مدحت ہو کہ جس میں حرمت سرور مجسم ہو جو میری فکر کو اعلیٰ بنائے ایسی مدحت ہو
ثنائے شاہ طیبہ کا قرینہ بھی میسر ہو گہر افکار کے ہر سولنائے ایسی مدحت ہو

(ص ۸۶۹)

تینوں ادلیٰ مصرعے اس طرح تبدیل کرنے سے یہ نقص دور ہو جائے گا (۱) عطا حسن ارادت ہو، ملے مجھ کو بصیرت بھی، (۲) وہ مدحت ہو کہ جس میں ہو مجسم حرمت سرور، (۳) ثنائے شاہ طیبہ کا میسر ہو قرینہ بھی۔

نعت نامے

”نعت رنگ“ کے نعت نامے اپنی ایک الگ ہی اہمیت رکھتے ہیں ان میں رسالے کی مشمولات پر جو علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی مذاکرے و بحثیں ہوتی ہیں وہ نہ صرف قارئین بلکہ شعراء و ادباء کے لئے بھی نہایت مفید ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالکریم صاحب نے نعیم بازید پوری کے مضمون ”شاتم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درخواست بریت“ پر بہت اچھا لکھا ہے، اس مقام پر ایک نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ”شاتم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم“ لکھنے پر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت کا گمان ”شاتم“ سے ہوتا ہے اس لئے میرے خیال میں ”شاتم“ کے ساتھ صرف ”رسول“ لکھا جائے یعنی ”شاتم رسول“ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں۔

ریاض حسین چودھری صاحب کا خط پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ انھیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے، آمین! اعزازات کی دستیابی پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں ساتھ ہی آپ کے ایک شعر پر کچھ کہنا بھی چاہوں گا۔

چراغِ نعت جلتے ہیں مرے چھوٹے سے کمرے میں

مرے آنگن کی چڑیاں بھی درودِ پاک پڑھتی ہیں

چھوٹے سے کمرے میں صرف ایک ہی چراغ کافی ہے، ”جلتے“ کی بجائے ”جلتا“ بہتر ہوتا اس کے علاوہ شجر و حجر، طیور و وحوش کے تعلق سے تو روایات صحیحہ موجود ہیں کہ یہ سب تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں لیکن یہ روایت کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آئی کہ چڑیاں درود شریف پڑھتی ہیں!! اور اگر ”چڑیاں“ سے مراد ”گھر کی بچیاں“ ہیں تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ گھر کی بچیاں آنگن میں کیوں

پڑھتی ہیں؟ نیز چراغِ نعت صرف آپ کے کمرے میں جلتا ہے؟

تنویر پھول صاحب نے میری حمد (نعت رنگ نمبر ۲۴، ص ۳۷) کے چھٹے شعر کے تعلق سے لکھا ہے:

”چھٹے شعر کا دوسرا مصرع ”وہی کہ اخلاص و نشرح والا وہی کہ رعد و دخان والا“ شاعر کی نظر ثانی کا طلب گار ہے۔ ”نشرح“ کی جگہ ”فتح“ (سورۃ فتح) یا ”ناس“ (سورۃ ناس) یا اسی کا ہم وزن کوئی لفظ استعمال ہو سکتا ہے۔“

تنویر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ ”اخلاص و نشرح اور رعد و دخان“ میں کیا خرابی ہے اور ”فتح و ناس“ کیوں استعمال کرنا چاہئے تھا! تنویر پھول صاحب سے میری مودبانہ درخواست ہے کہ نقد و اغراض کریں تو اس کی توجیہات و جواز بھی پیش کریں ورنہ یہ صرف اعتراض برائے اعتراض کہلائے گا۔ میں نے اپنے مضمون میں ”ارم“ کے استعمال پر اعتراض کیا تھا (غالباً) اسی کے جواب میں تنویر صاحب رقمطراز ہیں:

”غالب جیسا بڑا شاعر بھی لفظ ”ارم“ کو اسی مفہوم (جنت) میں استعمال کرتا ہے۔“

تنویر صاحب! غالب نے جو کچھ کہا تو کیا وہ سند اور حرفِ آخر ہو گیا؟ کیا غالب کے کہنے پر شہاد کی ارم کو جنت میں شامل کر لیا جائے؟ اور جو غالب کہتا ہے:

”دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو“

تو کیا آپ ”بہشت کو دوزخ میں ڈال دیں گے؟!“

محمد ثاقب رضا قادری صاحب کا خط پسند آیا کہ انھوں نے اپنی فروگزاشت (وہ بھی عدم معلومات کی بنا پر) کا اقرار کر لیا کہ ”فقیر نے رسائلِ حسن کے مقدمے میں درج ذیل تحریر لکھ دی:

”مولانا غلام احمد اگلر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے ہندوستان کی

تاریخ کا سب سے پہلا نعتیہ رسالہ بنام ”گلستانِ رحمت“ جاری کیا جس کا

پہلا پرچہ رمضان المبارک ۱۳۲۵ھ (۴ نومبر ۱۹۰۷ء) کو نکلا۔“

جناب امداد صابری صاحب کی کتاب ”تاریخ صحافت اردو“ کی ورق گردانی کرتے

ہوئے فقیر کی نظر ایک رسالہ پر ٹھہر گئی جو کہ نعتیہ ادب کے فروغ ۱۸۹۰ء میں جاری ہوا تھا چوں کہ اس

دریافت سے فقیر کی گذشتہ تحریر یعنی ”گلستانِ رحمت“ کو پہلا نعتیہ رسالہ قرار دینے کی تردید ہوتی

ہے۔ امداد صابری لکھتے ہیں:

”مداح النبی“ یہ نعتیہ کلام کا ماہنامہ گلدستہ جھجر ضلع ریتک سے ۱۸۹۰ء کو شائع ہوا۔“

محمد ثاقب رضا قادری صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ:
 ”مداح النبی“ سے قبل بھی ایک نعتیہ گلدستہ ”منشور شفاعت“ بمبئی سے فقیر
 محمد فدا چشتی کی ادارت میں ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۹ھ میں جاری ہوا تھا اس
 کے علاوہ ایک اور نعتیہ گلدستہ بمبئی ہی سے بلقیس جہاں بیگم (مالک) اور
 فاطمہ بیگم کی ادارت میں ”چراغِ کعبہ“ کے نام سے ۱۸۸۵ء مطابق ۱۳۰۳ھ
 میں جاری ہوا تھا۔“ (تفصیلات کے لئے دیکھئے، ”بمبئی میں اردو“ میمونہ
 دلو، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۳۲۵-۳۲۷)

نعت رنگ سلور جبلی نمبر میں کئی عمدہ نعتیں اور بہت سارے عمدہ اشعار بھی موجود ہیں جن کا
 ذکر نہ کرنا ادبی خیانت کے مترادف ہوگا۔

آپ ان کے لئے بھی رحمت ہیں جو زمانے ابھی نہیں آئے
 (حنیف اسعدی)

پڑھوں درود تو ہوتا ہے یہ خیال کہ اب حجابِ فاصلہ وقت اٹھنے والا ہے
 (امید فاضلی)

خاکِ صحرا بنی کہکشاں آپ سے یہ زمیں ہو گئی آسماں آپ سے
 (عنبریں حبیب عنبر)

کتنی صبحیں ظہور کرتا ہے جاگنا رات بھر مدینے میں
 (عطاء الحق قاسمی)

کام تو کوئی اس طرح کا ظفر نام تو لے لیا محمد کا
 (ظفر اقبال)

حضور آپ جو سن لیں تو بات بن جائے حضور آپ جو کہدیں تو کام ہو جائے
 (صبح رحمانی)

شکر صد شکر کہ موت آئی درِ آقا پر اب مدینے سے کہیں جانے کا امکان گیا
 (شفیق احمد فاروقی)

اپنے ہر جرم پہ احساس ہوا آپ نے دیکھ لیا ہو جیسے
 (حنیف اسعدی)

مدینے والے کو سب کچھ بتا دیا میں نے بہت سکھیں ہے گناہوں کے اعتراف کے بعد
 (سرشار صدیقی)

در کعبہ ہو، کبھی ہو مرے سرکار کا در کاش یوں در بدری میرا مقدر ہو جائے
(سرشار صدیقی)
نہ دل پہ بوجھ رہے گا نہ امتحان میں جان سو پڑھتے رہو جب تلک ہے جن میں جان
(منیر سیفی)
نکل آئیں گے حل سب مسئلوں کے چند لمحوں میں حیاتِ مصطفیٰ کو سوچنا اول سے آخر تک
(صبحِ رحمانی)



ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی۔ بھارت

۲۵/ستمبر ۲۰۱۶

خدا کرے آپ سب ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔ آپ کی ارسال کردہ دونوں کتابیں میرے وطن عزیز گیا کے پتے پر موصول ہوئی تھیں۔ جب عید الفصحیٰ کے موقع پر میرا گیا جانا ہوا تو ضخیم مجموعہ مضامین ”اردو نعت کی شعری روایت“ اور رسالہ ”نعت رنگ“ کی سلور جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والا کتابچہ دونوں دیکھنے کو ملے۔ ان قیمتی تحائف کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔
واقعہ یہ ہے کہ مجلہ ”نعت رنگ“ کے ذریعہ خاص طور سے اردو نعت کی تحقیق و تنقید کے باب میں آپ نے معرکہ آرا خدمات انجام دی ہیں جو ناقابل فراموش ہیں اور جس پر بجا طور سے آپ کو ایک نہیں دو، دو صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارک باد قبول فرمائیے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج نعت رنگ محض ایک مجلہ نہیں بلکہ فروغ نعت، ترقی نعت اور استحکام نعت کی ایک عالمگیر ادبی تحریک ہے اور مجھے فخر ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے اس عظیم ادبی تحریک کا میں بھی ایک ادنیٰ رکن ہوں۔

آپ کی مرتبہ کتاب ”اردو نعت کی شعری روایت“ میں مبسوط و معتبر اور بصیرت افروز مضامین شامل ہیں۔ جنہیں بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے آپ کے ترتیب دیا ہے۔ آئندہ اردو نعت کی تعریف، تاریخ اور عصری تقاضوں پر کوئی گفتگو اس کتاب کے حوالہ کے بغیر مکمل نہ ہو سکے گی۔ یقیناً یہ اپنے موضوع پر ایک دستاویز ہے۔

میں شکر گزار ہوں کہ اس کتاب میں آپ نے میرا بھی اردو نعت کے ارتقاء پر ایک مضمون شامل کیا ہے۔ ادھر نعت پر میرے چند مضامین ادبی رسائل میں شائع ہوئے ہیں جن کی نقل منسلک ہے۔ کار لائقہ سے یاد فرماتے رہیں پرسان حال کو سلام کہہ دیں۔ ادارہ نعت رنگ کے اراکین ڈاکٹر

شہزاد احمد اور ڈاکٹر عزیز احسن صاحبان کی خدمت میں موذبانہ سلام عرض ہے۔

۞۞

ڈاکٹر صابر سنبھلی۔ بھارت

۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۵ء

امید ہے مع اہل و عیال بخیر و عافیت ہوں گے۔ آج سے ٹھیک ایک سال پہلے آپ کے مجلے ”نعت رنگ“ کے لیے آپ کی فرمائش پر تین مضمون برائے اشاعت ارسال کیے تھے۔ اُس دن ۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۴ء تھی۔ مضامین کی رسید ایس۔ ایم۔ ایس سے مل گئی تھی۔ اشاعت کی اطلاع ابھی تک نہیں ملی ہے۔ مضامین بھیجنے کی برسی پر آپ سے تحریری طور پر مخاطب ہوں۔

تاریخ اور مہینہ تو یاد نہیں سردیوں میں میرے پڑوس Voda Fone کا ٹاور خراب ہو گیا۔ ایک ماہ سے زیادہ پریشان رہا۔ اُس وقت کمپنی بدلنے کا خیال تھا۔ سم میں اچھی خاصی رقم تھی۔ کمپنی بدلنے پر وہ ضائع ہو جاتی اس لیے بے وجہ اور بے سبب بھی دور دور فون کیے۔ ٹاور کے زیر سایہ کھڑے ہو کر کچھ بات چیت ہو جاتی تھی آپ سے بھی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی مگر رابطہ قائم نہیں ہوا۔ معلوم ہوا کہ اُس وقت آپ یورپ کے کسی ملک میں تھے۔ واضح ہو کہ بھارت میں قاعدہ یہ ہے کہ کمپنی بدلنے پر نمبر پہلا ہی رہتا ہے گویا میرا نمبر اب بھی 9719268584 ہی ہے لیکن یہ سم اب دو ڈافون کا نہیں ہے بلکہ اڑٹیل کا ہے۔

ہاں تو عرض کرنے مقصد یہ ہے کہ ایک سال کی مدت کم نہیں ہوتی جب اس مدت میں کسی طرح کی کوئی اطلاع نہیں ملی تو سوچتا ہوں کہ تینوں مضامین بھارت میں بھی اشاعت کے لیے بھیج دوں دونوں ملکوں کے قارئین الگ الگ ہیں محنت ضائع نہ ہو تو اچھا ہی ہے ایک نعت بھی بھیج رہا ہوں اگر پسند آئے تو کسی اشاعت میں شامل کر لیجیے گا۔

ایروگرام کو موڑ کر لکھ رہا تھا۔ جب پشت کے صفحے پر پانچ سطریں آ گئیں تو احساس ہوا اور ان کو قلم زد کر کے اسی مضمون کو دوبارہ لکھا ہے۔ ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ میں میری تاریخ ولادت ۱۵/ جولائی ۱۹۴۱ء درج ہے۔ یادداشت کی حالت ٹھیک نہیں۔ پوتوں کے نام بھی بھول جاتا ہوں۔ بیٹھنے میں بھی پریشانی ہونے لگی ہے اتنی خراب حالت اس لیے کہ عمر بھر بلڈ پریشر Low رہا۔ احباب و متعلقین کو سلام و دعائیں۔ دعا کی ضرورت ہے۔

۞۞

ڈاکٹر محمد افتخار شفیع۔ ساہیوال

۲۳/ اگست ۲۰۱۶

آپ کی فرستادہ کتابیں نظر نواز ہوئیں۔ یقین کیجئے یوں محسوس ہوا جیسے جناب سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو اس سعادت کے لیے چن لیا ہے۔ کتابوں کو چوما اور سر پر رکھا اصل کام تو یہ ہے جو آپ لوگ کر رہے ہیں۔ ایک ایک سطر نور و نکہت اور صدق رس جذبوں میں رچی ہوئی ہے۔ آپ اور آپ کا صنفِ نعت کے حوالے سے ہونے والا کام پہلے بھی میرے لیے تعارف کا محتاج نہ تھا اب دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ سعادت روزِ بازو کی محتاج نہیں بلکہ اس میں رضائے الہی کا حصول اولیت رکھتا ہے۔ ان کتب و رسائل کے مندرجات کو ابھی ایک نظر دیکھا ہے آپ نے بہت سے نئے موضوعات پر کام کروایا ہے۔ یہ اس بابرکت صنف کے نئے امکانات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اس کا مستقبل اور بھی روشن ہے کیونکہ یہ ”ورفعنا لک ذکرک“ کی عملی تعبیر کی کوشش میں اپنا حصہ ڈالنے کی ادنیٰ سے کوشش ہے۔ اس طرح نعت کے نئے خدوخال واضح ہوتے دکھائی دے رہے ہیں امید ہے کہ آنے والے دور میں اردو نعت اسی کو بنیاد بنائے گی۔ میں بہت جلد آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا میری مثال بھی سوت کی اٹی والی بڑھیا کی ہے جو عشاق میں نام درج کروانا چاہتی تھی ورنہ تو مجھے اپنے اعمال کے سبب آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے حجاب آتا ہے۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔

۞ ۞

احمد جاوید۔ بھارت

۲۷/ دسمبر ۲۰۱۲

ویسے تو آپ ان ہی دنوں سے ہماری ادبی مجلسوں کا حصہ ہیں جب ’نعت رنگ‘ کا پہلا شمارہ آیا تھا اور اپنے معیار و مشمولات کے لیے مخصوص علمی و ادبی حلقوں میں موضوع گفتگو بن گیا تھا۔ پھر ٹی وی پر آپ کے پروگراموں اور خود آپ کے نعوماتِ سرمدی نے آپ کو گھر اور خاندان کا حصہ بھی بنادیا۔

رہی سہی دوری بھی عزیز گرامی قدر مولانا خوشتر نورانی اور صاحبزادہ علامہ اسید الحق عاصم قادری عثمانی بدایونی (زاد اللہ عمر ہما و اقبال ہما) کے دم قدم نے دور کردی لیکن یہ میری کوتاہ دستی ہے کہ آپ تقاضے کے باوجود کبھی ’نعت رنگ‘ کی محفل میں باریاب نہ ہو سکا۔ ادھر چند ماہ سے لکھنؤ میں مقیم ہوں اور میں چاہوں گا کہ اب آپ جب بھی دہلی اور اجیر معلیٰ آئیں، اپنے سفر میں لکھنؤ کو بھی ضرور شامل کریں۔ کاش! مستقبل قریب میں ملاقات کی کوئی سبیل نکل سکتی۔

پیش خدمت مضمون (وسیم بریلوی: نئی نعت کا پیشرو شاعر) میرے کرم فرما شاعر و ادیب قمر گوٹوی صاحب کے تقاضوں کا نتیجہ ہے جن کی کتاب 'وسیم بریلوی شخص و شاعر' زیر طبع ہے۔ موصوف بڑے جواں حوصلہ بزرگ ہیں ورنہ ستر اسی سال کی عمر میں ایک ایسے شخص کا اس شاعر کی شخصیت اور شاعری پر قلم اٹھانا جو ان کو چچا کہہ کر مخاطب کرتا ہے، چہ معنی دارد؟ قمر صاحب اگلے وقتوں کی نشانی ہیں۔ حضرت جگر مراد آبادی کے خادم خاص رہے ہیں۔ جگر، حیرت اور مجروح کی یادوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں۔ مجروح سلطانپوری پر ان کی کتاب یوپی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی تھی اور اس حوالہ سے کہ مجروح غزل کے بڑے شاعر ہیں یا فیض، بہت دنوں تک بحث میں رہی تھی۔ وسیم جن کو اردو کے عام نقاد مشاعرے کا شاعر باور کر کے زحمت توجہ نہیں اٹھاتے، ان کے تعلق سے موصوف کی رائے ہے کہ وہ کسی ادبی آستانہ کے در یوزہ گر یا کسی گروہ کا حصہ ہوتے تو یہ بے اعتنائی ہرگز روانہ رکھی جاتی۔ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان سے صد فیصد متفق ہوں لیکن اس میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔

جہاں تک میری معروضات کا تعلق ہے، میں اس لیے بھی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ اس عہد کے سب سے کامیاب اور منفرد شاعر بھی ہیں اور نعتیہ شاعری کے اسکا لربھی۔ قابل اشاعت ہو تو شامل کر لیں ورنہ خیال نہ فرمائیں، مجھے صرف آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ میری آراء کسی محقق یا نقاد کی نہیں، شعرو ادب کے ایک عام قاری و سامع کی ہیں۔ مضمون کے اس حصہ میں جہاں اردو کی نعتیہ شاعری کا پس منظر و پیش منظر آیا ہے ضروری سمجھیں تو ان شعراء کا نام جوڑ دیں جن کا نام رہ گیا ہو۔ خاص طور پر پاکستانی شعراء کا۔ کیونکہ ہمارے درمیان سرحدوں کے آر پار کی دوری اور اطلاعیاتی فاصلہ بھی حایل ہے اور میری یادداشت کا قصور بھی ان کے چھوٹ جانے کے لیے ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اسی طرح 'نعت رنگ' کے حوالے سے جہاں پر نعتیہ ادب کے محققین و نقاد کا نام آیا ہے، آپ اس پر ضرور نظر ثانی فرمائیں تاکہ کوئی اہم نام چھوٹ نہ جائے۔

گفتگو طویل ہو گئی، بار خاطر نہ ہو تو روجی جاوید بھی سلام عرض کر رہی ہیں اور طارق، خالد، راشد، صادق، صبا اور ندا بھی آپ کو سلام لکھوا رہے ہیں، آپ ان کے محبوب شاعر و ثنا خوان رسول جو ٹھہرے۔ اب دہلی آئیں تو آپ انہیں شرف ملاقات ضرور بخشیں۔

ۛۛۛ

احسان اکبر۔ اسلام آباد

یکم/مئی ۲۰۱۶

بہت عرصے سے مجھے خط لکھنا نصیب نہیں ہوا۔ کوئی چیز بھی چھپنے کو نہ بھیجی سارا عرصہ آپ

کی طرف سے بھی کوئی سلسلہ جنبانی نہ ہوئی۔ خدا کرے سب خیر ہو حضرت مولانا جامیؒ کی مشہور و معروف نعت ”وصل اللہ علیٰ نور کز وشد نورھا پیدا“ کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا۔ آپ کو بھجوانے میں تامل کیا کہ بعض مسائل ان کی یادگار نعت کے ترجمے میں بڑی بڑی رکاوٹوں کی شکل بن گئے تھے مثلاً پہلے ہی شعر (مطلع) کے دوسرے مصرعے میں جب وہ زمیں کو ساکن کہتے ہیں تو اکیسویں صدی میں بیٹھا ہوا آدمی کیسے ترجمہ میں زمیں کو ساکن باندھ دے پھر ایسا نہ کرے تو نہ ترجمہ ہو نہ ترجمانی۔

یونہی چوتھے شعر کے دوسرے مصرعہ میں مولانا نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خال کو خال ہندی سے تشبیہ دیتے ہیں تو میں ہندی خال کو مشبہ بہ کا درجہ دیتے ہوئے لرز گیا اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زلف مبارک کا مشبہ بہ (یا مسقار رمنہ) شب تاریک کو نہیں بنا سکا۔ تیسرا الجھن کا مقام یہ بنا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لقب مزل قرآن پاک میں بیان ہوا مگر وزن کی ضرورت کے تحت حضرت مولانا نے اسے مزل ہی باندھ دیا تھا میں نے اسے بھی قرآنی تشدید مکرر کے ساتھ باندھا۔

اس ترجمے نے میرا بہت وقت لیا بارگاہ رسالت میں اگر قبول و منظور ہو جائے تو سمجھوں گا کہ حق ترجمہ ادا کرنے میں غفلت نہیں ہوئی اس عریضہ کو بھی نعت کے متن اور ترجمہ کے ہمراہ طبع کر دیا جائے تو محبان رسول کیا جانب کچھ دعائیں مل جائیں گی۔

صحیح

ڈاکٹر مجید اللہ قادری۔ کراچی

۲۵/ اپریل ۲۰۱۶

کچھ نعت کے طبقے کا عالم ہی نرالا ہے

سکتہ میں پڑی ہے عقل چکر میں گماں آیا

(حسان الہند امام احمد رضا)

اللہ عزوجل نے اپنی آخری کتاب میں اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح سرائی کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: **ورفعنا لك ذكرك** ”اور ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کر دیا ہے۔“ اور نام چونکہ محمد رسول اللہ رکھا جس کی تعریف مکمل ہی نہیں ہو سکتی اس لیے ہر زمانے میں اہل محبت میں اہل محبت آپ کی نعت کہہ کر اپنے رنگ کا حصہ آپ کے حضور پیش کر کے اللہ عزوجل کی رضا حاصل کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ:

اے رضا خود صاحب قرآن ہے مداح حضور

تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی

(حسان الہند امام احمد رضا)

دور حاضر میں پچھلے ۲۵ سالوں سے مسلسل نعت کی رنگت بکھیرنے والے اسی صاحب نعت

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کا حصہ پانے والے! واجب التعظیم محترم سید صبیح الدین رحمانی اپنے آقا و مولا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہزاروں اہل محبت کی طرف سے پیش کئے گئے رنگوں کو جمع کر رہے ہیں اور چند ماہ قبل ہی اس فقیر کو ”نعت رنگ کا ۲۵ واں گلدستہ پیش کیا اور حکم دیا کہ اس گلدستے کی جو خوشبو آپ کو محسوس ہو اس کا بھی اظہار بھی فرمائیے۔

راقم نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے کی تعمیل کرتے ہوئے نہ صرف اس گلدستے کی مہک کو سونگھا بلکہ راقم کے پاس کئی پچھلے گلدستے تھے ان کو بھی سامنے رکھا اور ان کی خوشبوؤں سے اپنی روح کو معطر کرتا رہا اور پھر آہستہ آہستہ ان خوشبوؤں کی لہروں کو الفاظوں کی صورت میں منتقل کرنا شروع کیا اور اب پیش خدمت ہے رنگ مجید۔

راقم اردو ادب سے بالکل کورا ہے اور ساری زندگی کی علم تجربات پڑھانے میں گزار دی البتہ اس علم حجریات کے ذریعہ نعت ضرور سمجھ میں آئی۔

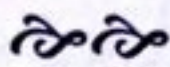
اے مدعیو! خاک کو تم خاک نہ سمجھے اس خاک میں مدفون شہہ بطحا ہے ہمارا اسی شہہ بطحا سے محبت اور عقیدت کرنے والے سینکڑوں نہیں بلکہ عشاق رسول کے منظور و منشور کلام کو حضرت سید صبیح الدین رحمانی اپنے سالانہ نعت رنگ کے گلدستے میں سجاتے ہیں آپ یہ کام تسلسل کے ساتھ پچھلے ۲۵ سالوں سے انجام دے رہے ہیں اس استقامت پر لاکھوں سلام کہ اس دور نفسہ نفسی میں بھی نور مجسم حضرت محمد مصطفیٰ کے چشم و چراغ اس سلسلے کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک ان کو اور ان کے ادارہ نعت ریسرچ سینٹر کے تمام ہی احباب کو نظر بد سے بچائے اور تادم حیات اس کام کو یعنی اس گلدستہ کو ہر سال اسی طرح سجانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت صبیح الدین دور حاضر میں اس کام کو جس طرح آگے بڑھایا ہے قابل تحسین ہے۔ برصغیر میں درجنوں ادارہ اردو ادب کے حوالے سے کام کر رہے ہیں مگر اردو ادب کے اس شعبہ ”نعت“ میں حضرت والا نے ۲۵ سال میں اتنا تحقیقی و علمی کام جمع کر لیا ہے کہ اگر ادارے کے افراد ”اردو نعت انسائیکلو پیڈیا“ تیار کرنا چاہیں تا بآسانی یہ کام چند ضخیم جلدوں میں مکمل کر سکتے ہیں ساتھ ہی ساتھ برصغیر کی ان تمام جامعات میں جہاں شعبہ اردو قائم ہے وہاں گوشہ نعت قائم کر کے M.A کی سطح پر اردو ادب میں نعت گوئی پر Specialization بھی کرا سکتے ہیں۔

اس ”گوشہ نعت“ کے لیے ادارہ نعت ریسرچ سینٹر کے ۲۵ گلدستے اور اس سے متعلق متعدد کتب Specialization کے Course Content کی ٹیکسٹ بکس کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر سہیل شفیق جو جامعہ کراچی میں شعبہ اسلامی تاریخ کے ایک سینئر استاد ہیں اور

نعت رنگ کے ابتدائی ۲۰ گلدستوں کے اشاریہ کے مرتب نگار ہیں کارہا نمایاں انجام دے سکتے ہیں۔
ادارے کے ایک ایک فرد جن میں ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر شہزاد احمد، ڈاکٹر محمد طاہر قریشی اور ڈاکٹر داؤد
عثمانی شامل ہیں اس نعت رنگ کے گلدستے کا مہکتا پھول ہیں نعت کے Specialization کا
Syllabus باسانی تیار کر سکتے ہیں۔ آخر میں اس گلدستہ نعت رنگ کے روح رواں کو ہدیہ تبریک پیش
کرتا ہوں جو نہ صرف اپنے گلدستے کو ہری بھری ڈالیوں اور تازہ مہکتے پھولوں سے سجا رہے ہیں بلکہ
اس میں جگہ جگہ وہ خشک شاخیں بھی پرور رہے ہیں جو آہستہ آہستہ ہری بھری ہوتی جا رہی ہیں:

مکبند خضرا کے فیض عام سے ہر جگہ جلوہ نما ہے نعت رنگ
اور بھی ارضِ وطن میں ہیں ولے سب شماروں سے جدا ہے نعت رنگ



تنویر پھول۔ امریکہ

۱۵/ اکتوبر ۲۰۱۶

”نعت رنگ“ کا شمارہ نمبر ۲۵ (سلور جوبلی نمبر) برادر م شبیر احمد انصاری صاحب اور
برادر م امتیاز الملک آسی سلطانی صاحب کی وساطت سے موصول ہوا جسے دیکھ کر مسرت ہوئی۔
مضامین نثر و نظم کا انتخاب خوب ہے جس کے لئے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ کمپوزر صاحب کی
توجہ کے لئے عرض ہے کہ صفحہ نمبر ۳۱ پر دوسری سطر میں سورۃ الانبیاء کی آیت درست تحریر نہیں کی گئی۔
ڈاکٹر طاہر القادری صاحب سے آپ کی ملاقات اور اُن کی طرف سے منہاج یونیورسٹی میں نعت چیر
قائم کرنے کا ارادہ نہایت خوش آئند ہے۔ اس شمارے میں ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کا پُر مغز مقالہ
پسند آیا، اس مقالے میں بھی کمپوزنگ کی غلطی ہے، صفحہ نمبر ۱۰۸ پر ”الفقر فخری“ والی روایت تحریر کرتے
ہوئے دونوں الفاظ کے درمیان حرف ”واو“ لگانا درست نہیں ہے۔ یاد رہے کہ فقر کا لفظ محتاجی کے
علاوہ درویشی کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے (بحوالہ فیروز اللغات)۔ عام طور پر ”فقیر“ کا لفظ ”غنی“
کے مقابلے میں آتا ہے، علامہ اقبال نے کہا:

تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر

مولانا طاہر القادری کے سلام کے یہ اشعار اسی حوالے سے ہیں:

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دہلیگری کی	سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اُس پر کہ تھا ”الفقر فخری“ جس کا سرمایہ	سلام اُس پر کہ جس کے جسم اطہر کا نہ تھا سایہ
سلام اُس پر جو امت کے لئے راتوں کو روتا تھا	سلام اُس پر جو فرشِ خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا

صفحہ نمبر ۱۱ پر استاد قمر جلالوی کے جس شعر کا حوالہ ہے اُس میں چُپ بیٹھنے اور اپنے گھر میں شرمانے کا ذکر نعتیہ ہرگز نہیں بلکہ غزلیہ ہے۔ اسی طرح کا ایک شعر اعجاز رحمانی کے مجموعہ 'نعت "آسمانِ رحمت" کے صفحہ نمبر ۷۴ پر بھی ہے:

ہر اک موسم ہے اُن کے گیسو و رخسار کا موسم نہ کوئی شب ہماری ہے، نہ کوئی دن ہمارا ہے یہ حقیقت ہے کہ غلطیاں بھی سے ہوتی ہیں کیونکہ سب انسان ہیں۔ استاد قمر جلالوی کی غزل کا یہ مشہور مصرعہ بھی معیاری نہیں لگتا: غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے ہیں اس مصرعے میں "آوازوں میں" کا استعمال کھٹکتا ہے، اس کی جگہ شاید یہ مناسب ہوتا: خاموش زباں سے غنچے بھی بجلی کو پکارا کرتے ہیں۔

صفحہ نمبر ۱۳۲ پر تحریر ہے "کبریا کا لفظ ہمارے ہاں بڑے بڑوں نے اللہ کے صفاتی نام کے طور پر استعمال کیا ہے"۔ یہ حقیقت ہے کہ اُردو میں ایسا ہی ہے، اسی سے لفظ "کبریائی" بھی بنا ہے جس طرح رحمن سے رحمانی اور رحیم و کریم سے رحیمی و کریمی۔ علامہ اقبال کے اس شعر میں بھی یہی صورت ہے:

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اُس کو بتلاتا، مقامِ کبریا کیا ہے بات دراصل یہ ہے کہ ہر زبان کا الگ الگ انداز ہے۔ ایک زبان کا لفظ جب دوسری زبان میں آجائے تو ضروری نہیں کہ معانی و اعراب و قواعد ہو بہو ایک ہی ہوں، مثال کے طور پر عربی میں "رقیب" اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے لیکن فارسی اور اُردو میں یہ لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے اسے سب ہی جانتے ہیں۔ عربی لفظ "صَدَقَ" اُردو میں حرف دال کے سکون کے ساتھ استعمال ہوتا ہے، "کلمہ" عربی میں مونث ہے جبکہ اُردو میں مذکر، علیٰ ہذا القیاس لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ اس میں کھلی چھوٹ ہو۔ صفحہ نمبر ۲۶۶ پر عزیز لدھیانوی کے اس شعر میں لفظ "عرب" کے درمیانی حرف کو مفتوح کی جگہ ساکن باندھنا غلط ہے:

حق کی مدد سے بالیقین حامی شہِ عرب و عجم

"حامی شہِ ارض و سما" والا مصرعہ درست ہے لیکن مذکورہ بالا مصرعہ درست نہیں۔ صفحہ نمبر ۲۸۸ پر ڈاکٹر اشفاق انجم برافروختہ نظر آئے۔ ان کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میری تحریر ان کے مضمون کا رد عمل نہیں ہے بلکہ یہ تبصرہ "جہانِ نعت" کرناٹک کے شمارہ ۶ مطبوعہ ۲۰۱۲ء میں شائع شدہ حلیم حاذق کے مضمون کے جواب میں تھا جس میں موصوف نے حمد و نعت میں لفظ "عشق" لانے والوں کو بھی "جاہل شعراء" کے نام سے یاد کیا تھا۔ مزید یہ کہ میرے اس تبصرے میں جو لہجہ اختیار کیا گیا ہے

وہ جارحانہ نہیں بلکہ نہایت نرم ہے جسے پڑھنے والے محسوس کر سکتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں ہی میرے تبصرے کا یہ حصہ اردو نیٹ جاپان اور اردو بندھن جدہ میں شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے آخر میں جو استفسار فرمایا ہے اس کے جواب میں عرض ہے کہ جنت کی زبان عربی ہوگی وہاں ”تو“ اور ”آپ“ دونوں کے لئے ایک ہی ضمیر (واحد حاضر) استعمال ہوگی اور یہاں بھی نماز میں ”السلام علیک ایھا النبی سلّمیہ وسلم!“ ہی کہتے ہیں۔ مزید یہ کہ اگر خطاب بزبان شعر ہوگا تو ”آپ“ کہنا بہر صورت لازمی نہیں، یہ صرف نثر میں ضروری ہے۔ علامہ اقبال کے اس شعر کے متعلق موصوف کا کیا خیال ہے؟:

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اور حضرت شمس تبریزی کی نعت کا یہ شعر بھی موصوف کے نزدیک قابل اعتراض ہوگا:

شمس تبریزی چہ داند نعت تو پیغمبر! مصطفیٰ و مجتبیٰ و سید اعلیٰ توئی

صفحہ نمبر ۳۰۰ اور صفحہ نمبر ۳۰۱ پر سورۃ الفتح اور سورہ توبہ کی آیات میں پھر کمپوزنگ کی بے احتیاطی ہے، موخر الذکر میں ”مشرکون“ کی جگہ ”مشرقین“ کمپوز ہوا ہے جو افسوس ناک ہے۔ براہ کرم کمپوزر اور پروف ریڈر صاحبان اس طرف خصوصی توجہ دیں۔

صفحہ نمبر ۳۹۸ پر ”چٹائی، غار حرا، جو کے تذکار“ کے بارے میں جو مضمون ہے اسے پڑھ کر احساس ہوا کہ اس میں تنقید برائے تنقیص کی گئی ہے۔ نعت گو شعراء نے بوریا اور چٹائی کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ سلطان مدینہ، سرور دو عالم اور بادشاہ عرب و عجم سلّمیہ وسلم کی سادگی اور قناعت پسندی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے ورنہ کرسی، مسند، چادر، بستر وغیرہ تو دنیوی بادشاہوں نے بھی استعمال کیا ہے۔

یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ آپ نے صرف چٹائی کو ہی پسند فرمایا اور باقی چیزوں سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔ یہ مقالہ نگار کے اپنے ذہن کی اختراع ہے ورنہ شعراء نے نعت نے آپ کی سادگی کو ہی بیان کیا ہے۔

سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی، نہ سوتا تھا سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھوتا تھا
سلام اُس پر جو امت کے لئے راتوں کو روتا تھا سلام اُس پر جو فرش خاک پر جاڑوں میں سوتا تھا
(ماہر القادری)

بوریا، ٹوٹی چٹائی، زیر پا عرش علی عیش کو شو! بادشاہ دوسرا، سرکار ہیں
(تنویر پھول)

کیا فاضل مقالہ نگار کی نظر سے وہ روایت نہیں گزری کہ حضرت عمر فاروقؓ ”جسم اطہر پر

چٹائی یا بوریا کے نشانات دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے تھے اور جب انہوں نے قیصر و کسریٰ کے عیش و آرام کا ذکر کیا تو آپ نے جواب میں کیا ارشاد فرمایا؟ یاد رہے کہ آپ کی یہ سادگی اختیاری تھی ورنہ اگر آپ چاہتے تو پورا کوہ احد سونے کا بنا دیا جاتا جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

صفحہ نمبر ۴۰۲ پر مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ”عموماً“ لوگ ”حفصہ“ کو ”صفہ“ پڑھتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے، جہلاء کی بات اور ہے۔

مقالہ نگار نے غار حرا کی اہمیت کو بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ غار حرا اور اس کے بعد غار ثور دونوں کو جو مقام حاصل ہے وہ دنیا کے کسی اور غار کو نہیں (یاد رہے کہ اصحاب کہف کے غار میں کسی نبیؑ نے قیام نہیں کیا)۔ غار حرا میں پہلی وحی (جو سورۃ العلق کی ابتدائی ۵ آیات پر مشتمل ہے) سے نزول قرآن کا آغاز ایک تابناک حقیقت ہے جس کا انکار کوئی کور چشم ہی کر سکتا ہے اور یہ حق ہے کہ ”ممتاز حرا ہے آج تلک اس دنیا کے سب غاروں میں“۔ علامہ اقبال غار حرا میں آپ کے ذکر الہی، مراقبہ اور نزول وحی کے حوالے سے فرماتے ہیں:

در شبستان حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید

صبحِ رحمانی نے اپنے خوب صورت اشعار میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے:

معمور ہیں حضور کے قدموں کی آہٹیں
حرا کے سوچتے لمحوں کو زندہ ساعتیں لکھ کر
کیسا نصیب آج بھی غارِ حرا کا ہے!
صفا کی گفتگو کو آبشارِ آگہی لکھوں
لوگ عام طور پر آپ کو ”مدینے والے آقا“ کہتے ہیں لیکن ایک مصرعہ ایسا بھی ہے جو خواب میں عطا کیا گیا:

”اے غارِ حرا والے آقا! ہم پر ہو کرم کی ایک نظر“

اس مقالے میں بھائی شبیر احمد انصاری صاحب کی مرتب کردہ کتاب ”شبستانِ حرا“ کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ حُسن اتفاق سے یہ کتاب یہاں میرے پاس موجود ہے اور صفحہ نمبر ۱۲ پر مولف نے کتاب کی تدوین و تکمیل میں مکمل رہنمائی اور خصوصی معاونت کے سلسلے میں جن اصحاب کا شکریہ ادا کیا ہے اُن میں فاضل مقالہ نگار کا نام بھی شامل ہے یعنی اس ”کارِ لا حاصل“ میں وہ بھی شریک ہیں اور اس طرح وہ خود اپنی تنقید کا ہدف بن رہے ہیں!

مزید لطف کی بات یہ ہے کہ ”حرا“ ہی کے موضوع پر صفحہ نمبر ۱۴۳ پر موصوف کے متفرق اشعار، صفحہ نمبر ۱۹۸ پر ”حرا کی روشنی“ کی ردیف میں ان کی نظم، صفحہ نمبر ۱۹۹ تا صفحہ نمبر ۲۰۲ حرا کے بارے میں ان کی معرا نظمیں اور صفحہ نمبر ۲۲۹ پر ثلاثی ”شبستانِ حرا“ میں شامل ہیں یعنی ”حرا“ کو

ایک سے زیادہ بار اپنی شاعری کا موضوع بنانے کا ”جرم“ انھوں نے خود بھی کیا ہے!!
 اسی طرح جو یعنی شعر کے ذکر کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی کھانے
 میں آپ کی سادگی کا ذکر ہے اور مکرر عرض ہے کہ یہ سادگی اختیاری تھی۔ مقالہ نگار صفحہ نمبر ۴۱۸ پر خود
 تحریر فرماتے ہیں کہ ”حضور کا فقر و فاقہ اختیاری تھا اور قیامت تک کے ناداروں، مسکینوں اور فاقہ
 مستوں کے لئے تسلی اور دلا سے کا سبب تھا ورنہ حدیث شریف سے ہی ثابت ہے کہ اگر حضور پسند
 فرماتے تو آپ کے لئے پہاڑ سونے کے ہو جاتے۔“

آپ سرکارِ دو عالم، ہے غذا نانِ شعر بے کس و نادار کے حاجت روا سرکار ہیں
 علامہ اقبال آپ اور آپ کے اصحاب کی اسی سادگی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:
 تری خاک میں ہے اگر شر تو خیال فقر و غنا نہ کر کہ جہاں میں نانِ شعر پر ہے مدارِ قوتِ حیدریؐ
 صفحہ نمبر ۴۲۳ پر حضرت عبداللہ بن علیؓ کی جو روایت مقالہ نگار نے پیش کی ہے اس میں یہ
 بیان کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کی روٹی بڑے شوق سے تناول فرماتے تھے۔ اسی طرح اور بھی
 روایات انھوں نے درج کی ہیں جن میں جو اور غارِ حرا میں خصوصی عبادت بشمول رمضان میں پورے مہینے
 کی عبادت کا ذکر ہے۔ اس طرح ان کا یہ مقالہ تنقید برائے تنقیص اور تضادات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔
 صفحہ نمبر ۷۹۳ پر ”حاصل مطالعہ“ کے زیر عنوان ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی یہ وقع
 تحریر قابل غور ہے:

”بعض ادبی حلقوں میں یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ
 والتسلیم کے لئے ”تو، تیرا، تم، تمھارا“ کے ضما کر استعمال کرنا سوءِ ادب ہے،
 لیکن وہ لوگ شعر کی نزاکتوں اور لفظ کی حرمتوں سے یا تو واقف نہیں ہیں یا
 شعر گوئی کے لئے بھی اپنا کوئی نصاب مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں
 میری رائے اس ادبی حلقے کے ساتھ ہے جو شاعری کے تقاضوں اور لفظوں
 کے برتنے کے سلیقوں کا ادراک رکھتے ہوئے ان ضما کر کے استعمال کو
 معیوب نہیں جانتا۔“

”ایوانِ مدحت“ میں ”اول سے آخر تک“ کی مفرد ردیف میں جناب صبیح رحمانی کی نعت
 بہت دل نشیں ہے۔ شاعر کے لئے داد اور دلی مبارک باد۔

”نعت نامے“ میں احمد صغیر صدیقی صاحب کا مکتوب زیر نظر آیا۔ افسوس ہے کہ ان کو راقم
 الحروف کی حمد کا یہ سادہ مقطع پسند نہیں آیا:

پامال ہے یہ گلشن ہستی میں ہو رہا فریاد لایا پھول ہے تیری جناب میں وہ لکھتے ہیں:

”یہ شعر کوئی بہت کمزور اور اناڑی شاعر لکھتا تو اس سے صرف نظر کیا جاسکتا تھا۔“

اس محبت اور عزت افزائی پر ان کا ممنون ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی شاعر کے تمام اشعار ایک ہی معیار کے نہیں ہو سکتے۔ صغیر بھائی کو حمد و نعت میں الفاظ کے مناسب استعمال پر لکھا ہوا میرا مقالہ نہایت دلچسپ اور فکر انگیز لگا جس پر اُن کا شکریہ۔ ”خیر الامم“ کے استعمال کے بارے میں شاید میں اپنی بات پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔ ”خیر الامم“ کا مطلب ہے ”اُمّتوں میں خیر“ اور یہ اعزاز حضور کی امت کو دیا گیا ہے (بحوالہ قرآن: سورہ آل عمران، آیت نمبر ۱۱۰)۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی نظم ”بلادِ اسلامیہ“ میں اسے ان ہی معنوں میں استعمال کیا ہے:

سوتے ہیں اس خاک میں خیر الامم کے تاجدار نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار ”اُمم“ جمع ہے ”اُمّت“ کی اس لئے اُس میں خیر کوئی امت ہی ہو سکتی ہے، فرد نہیں۔ حضور کو ”خیر البشر“ کہنا درست ہے لیکن آپ کو ”خیر الامم“ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ”شہروں میں اہم“ کی جگہ یہ کہا جائے کہ ”ٹوکیو ملکوں میں اہم ہے۔“ امید ہے کہ اب یہ بات واضح ہو گئی ہوگی۔ صغیر صاحب لکھتے ہیں کہ:

”ڈاکٹر عزیز احسن نے اپنے مقالے میں ایک حدیث نوٹ کی ہے۔ ”اے اللہ! روح القدس کے ساتھ حسان کی مدد فرما۔“ مجھے سمجھانے کے لئے بتائیں یہ ”روح القدس کے ساتھ“ کا اضافہ کیوں کیا گیا ہے؟“ عرض ہے کہ اس حدیث کے الفاظ کو سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۸۷ کی روشنی میں دیکھئے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ”ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روح القدس کے ساتھ مدد دی“: وَ اٰیْدِنَاہُ بِرُوحِ الْقُدُسِ: (واضح ہو کہ ”روح القدس“ حضرت جبریل علیہ السلام کو کہتے ہیں)۔

صفحہ نمبر ۸۹۶ کی سطر نمبر ۱۳ میں غالباً کمپوزر صاحب نے ”واضح“ کو ”واضع“ کر دیا ہے۔ صفحہ نمبر ۹۱۲ پر سعید بدر صاحب نے ”خطائے بزرگاں گرفتن خطا است“ کا حوالہ دیا ہے مگر یہ قول ”نعت رنگ“ کے مزاج کے خلاف ہے۔ یہ بات یاد رہے کہ صحت مند تنقید فن پر کی جاتی ہے، ذاتیات پر نہیں اس لئے اسے ذات سے الگ کر کے دیکھنا چاہئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور

قول ہے کہ یہ مت دیکھو کہ کون کہہ رہا ہے؟ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے؟ عصر حاضر کے ایک دانشور پروفیسر ڈاکٹر خورشید خاور امرہوی کا کہنا ہے کہ لوگ خطائے بزرگاں گرفتِ خطا است کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ بزرگوں کی خطا کو پکڑے رہنا یعنی اس پر کاربند رہنا خطا ہے۔ قرآن پاک بھی باپ دادا کی اندھی تقلید سے منع کرتا ہے (سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۷۰)۔ صفحہ نمبر ۹۱۴ پر انھوں نے راقم الحروف کے مقالے کو قابلِ قدر قرار دیا ہے جس کا شکریہ۔ چالیس برس تک غاروں میں اجالا کرنے والی بات پر تنقید سعید صاحب کو ناگوار گزری اور انھوں نے اسے ”شعری ضرورت“ کہا مگر ایسی جگہ ”ضرورت شعری“ کا حوالہ ہونا چاہئے اور اگر بہتر صورت ہو تو اسے ہی اختیار کرنا چاہئے جیسے ”غاروں میں“ بطور قافیہ وردیف استعمال کرنے کے لئے یہ کہا جاسکتا تھا:

”ممتاز حرا ہے آج تلک اس دنیا کے سب غاروں میں“، ”ارم“، ”عشق“ اور ”خدا“ جیسے الفاظ کے استعمال کے بارے میں اُن کی رائے سے راقم الحروف کو اتفاق ہے۔ صفحہ نمبر ۹۳۴ پر سمیعہ ناز صاحبہ نے راقم الحروف کے مقالے ”حمد و نعت میں الفاظ کا مناسب استعمال“ کو پسند کرنے کی اطلاع دی جس پر اُن کا ممنون ہوں۔ سب کو سلام کہئے۔

اور دعاؤں میں یاد رکھئے۔ ای، میل سے رابطہ رکھئے گا۔

ۛۛۛۛ

سعید سیٹھی۔ برطانیہ

۱۸/ اکتوبر ۲۰۱۶

میں پہلی بار نعت رنگ کی محفل میں شامل ہو رہی ہے۔ میں بھی نعت رنگ جیسے خوبصورت جریدے کی قاری ہوں۔ آج اگر قلم اٹھایا ہے تو میں بہت خوش ہوں کہ مجھے بھی سعادت ملی۔ نعت رنگ کے پچیس شمارے مکمل ہونے پر یہاں برطانیہ میں نعت ریسرچ سینٹر کی وائس چیئر پرسن سمیعہ ناز نے ایک خوبصورت تقریب لیڈز میں منعقد کی جس میں مجھے بطور خاص بلایا گیا اور مجھے بے حد اچھا لگا۔ ۱۹ مارچ ۲۰۱۶ کو ہونے والی تقریب پذیرائی ایک خوبصورت اور کامیاب ترین تقریب قرار پائی ہے۔ اس تقریب کی کمپئرنگ سمیعہ ناز نے کی۔ اور آغاز میں ہی سمیعہ ناز نے اپنی تحریر کردہ نظم بعنوان نعت رنگ سب کو سنائی۔ جسے سن کر سب کو بہت اچھا لگا۔

اس کے بعد سمیعہ ناز نے تقریب پذیرائی کے شرکاء کو نعت رنگ پر اظہار خیال کرنے کی دعوت دی۔ جن میں تنیم حسن، طلعت سلیم، ڈاکٹر عزیز احسن، ڈاکٹر مقصود الہی شیخ اور مجھے بھی اظہار خیال کے لیے سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ”میں خود کو اس قابل تو نہیں سمجھتی کہ میں نعت رنگ کے

حوالے سے کچھ کہہ سکوں لیکن مجھے بہت اچھا لگا کہ سمیعہ ناز نے بڑی فراخ دلی سے مجھے اظہار خیال کے لیے بلایا اور موقع فراہم کیا کہ میں اپنی بات کہہ پاؤں۔ میں نے سب سے پہلے اپنی دوست سمیعہ ناز کا شکریہ ادا کیا اور سب کو مبارکباد پیش کی۔

مجھے آج بھی یاد ہے ۲۰۰۸ء میں جب پہلی بار آپ یو کے آئے تو آپ نے مجھے نعت رنگ کے بارے میں بتایا تھا۔ اور آپ نعت ریسرچ سینٹر کا قیام بھی چاہتے تھے۔ اور اس پر مزید کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن میں خود کو اس ذمہ داری کا اہل نہ سمجھ پائی۔ مجھے پتہ تھا میری طبیعت میں کچھ لاپرواہی سی ہے اور یہ بہت ذمہ دارانہ کام تھا جس کو کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ اور اس وقت مجھے اپنی پیاری سی دوست سمیعہ جی یاد آئیں جو بخوبی یہ ذمہ داری نبھاسکتیں تھیں۔ سمیعہ ناز اُس وقت میرے ساتھ نور ٹی وی پر بطور مہمان نعت خوان، اور نعت گو شاعرہ کی حیثیت سے شریک ہوا کرتی تھیں۔ ایک نعتیہ مجموعہ کلام کی خالق بھی ہیں۔ اور جہاں تک مجھے یاد ہے سمیعہ جی کی نعتیہ کتاب ”خزینہ نور“ کی رسم اجراء آپ ہی کے نیک ہاتھوں سے سرانجام پائی تھی۔ اور اس تقریب میں میری بھی شرکت تھی۔

یوں برطانیہ میں نعت ریسرچ سینٹر کی ایک شاخ کھولنے کا ذمہ سمیعہ جی کے سپرد کیا گیا جسے انہوں نے خوب نبھایا اور جنوری ۲۰۰۹ء میں سمیعہ جی نے نعت رنگ اور نعت ریسرچ سینٹر یو کے کو پہلی بار برطانیہ کے شہر لیڈز میں متعارف کروایا۔ اور مجھے بطور خاص اس تقریب میں مہمان خصوصی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ مجھے یہ باتیں سب کے ساتھ کرتے ہوئے بہت خوشی ہے کہ گذرتے رواں سالوں نے بتا دیا کہ سمیعہ ناز کو جو ذمہ سونپا گیا اسکو بہت اچھی طرح سے انہوں نے سرانجام دیا۔ برطانیہ میں وہ نعت ریسرچ سینٹر یو کے کی روح رواں ہیں اور فروغ نعت کے کاموں میں ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں۔ اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔ نیکی کے کاموں میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے اب افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں نہیں سمیعہ جی کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔

لیکن میں خوش ہوں کہ جو کام بھی سمیعہ جی کر رہی ہیں۔ نعت رنگ کے حوالے سے نعت ریسرچ سینٹر یو کے کے حوالے سے وہ بہت احسن ہے اور پاکستان میں آپ اور ڈاکٹر عزیز احسن صاحب اور دیگر جو احباب آپ کا ساتھ دے رہے ہیں نعت رنگ کے کاموں میں اللہ تعالیٰ سب کو اجر عظیم سے نوازے اور مزید کامیابیاں نصیب ہوں۔ آمین

اس تقریب کے آخر میں ڈاکٹر عزیز احسن صاحب نے نعت رنگ اور نعت ریسرچ سینٹر کے حوالے سے بہت ساری باتیں سب شرکائے محفل کے گوش گزار کیں۔ اور نعت رنگ کے ان پچیس

شماروں میں بیس سالوں کی طویل محنت پر بھی روشنی ڈالی کہ کس طرح سے آپ نے اپنی لگن اور محنت سے نعت رنگ کا کام سرانجام دیا۔

اس تقریب کے ختم ہوتے ہی سمیعہ ناز نے ”نعت ریسرچ سینٹر یو کے“ کی جانب سے دو ایوارڈ خصوصاً دینے کا اعلان کیا۔ جس پر سب کو بہت مسرت ہوئی۔ ایک ایوارڈ ”بہترین نعتیہ تنقید نگار“ جو ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کو ملا۔ اور دوسرا ایوارڈ ”بہترین نعت ایڈیٹر“ کا جو آپ (سید صبیح رحمانی) کو آپ کی بہترین کارکردگی پر دیا گیا آپ کی غیر موجودگی کی بنا پر اس ایوارڈ کو ڈاکٹر عزیز احسن صاحب نے لیا۔ آپ کو اور ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کو بہت مبارک ہو۔

یہ شام میری یادگار شاموں میں سے ایک ہے اس ایک شام میں میں نے کتنے ہی حسین بل ایک ساتھ کتنے ہی دکتے لوگوں کے ساتھ جی لیے۔ نعت رنگ ۲۵ کی سلور جوبلی کی خوشی میں سمیعہ جی نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا کہ دل خوش ہو گیا۔ ایک بہت بڑے کیک پر نعت رنگ ۲۵ کے سرورق کی خوبصورت تصویر چھپوائی گئی تھی جو نہایت دیدہ زیب لگ رہی تھی۔ کیک کو مہمان خصوصی ڈاکٹر عزیز احسن اور دیگر لوگوں نے مل کر کاٹا اور خوشی منائی۔ آخر میں ایک خوبصورت نعتیہ مشاعرہ ہوا جس میں تمام شعراء نے اپنا اپنا نعتیہ کلام سنا کر بہت داد پائی۔



طلعت سلیم - برطانیہ

۱۸/ اکتوبر ۲۰۱۶ء

مقام مسرت ہے کہ نعت رنگ (کتابی سلسلہ) ۱۹۹۵ء میں قافلہ نعت نگاراں آپ (صبیح رحمانی) کے ہاتھوں چمنستان علم و ادب میں نیک تمناؤں، خوبصورت خوابوں اور روشن امیدوں کے ساتھ لگایا ہوا پودا ماشاء اللہ ۲۵ برسوں کی سردی گرمی سہتا آج ایک حسین و جمیل سرسبز و شاداب پیڑ کی صورت ہمارے سامنے قلب و نظر کی شادابی و شادمانی کا ساماں لیے شان سے ایستادہ ہے۔

روح پرور نعتوں کے خوش رنگ پھولوں، بلند پایہ مضامین، تحقیقی مقالوں، بحثوں، تبصروں اور تذکروں کی دنیا پہلو میں لیے ایک ٹھنڈی پھوار کی صورت دل و جاں کو ٹھنڈک بخش رہا ہے۔ تاجدار انبیاء آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رنگ رنگ نعتوں کے گلدستے پیش کر کے قارئین کے مشام جاں کو مہکاتے اور دین و دنیا کو سنوارنے میں اپنی توانائیاں صرف کر کے ہر کتابی شمارے میں کیا کیا کچھ آپ پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

آپ کے مبارک ہاتھوں سے نعت رنگ (کتابی سلسلہ) کا لگایا ہوا اور خونِ جگر سے سینچا

ہوا پودا اب ماشاء اللہ عمر کے بیس برس پورے کر کے بلند قامت پیڑ کا روپ دھارے شان سے کھڑا ہے۔ نعت ریسرچ سینٹر سے شائع ہونے والی دلاویز کتابیں اپنی جگہ دامن دل کو کھینچتی ہیں۔ صنفِ نعت کو متبرک صنف سمجھتے ہوئے اس پر تنقید نہ کرنے کے انداز فکر کو نعت رنگ نے تبدیل کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔

نعت کا ناقدانہ جائزہ لے کر محترم ادباء، شعراء و قیام مضامین لکھ کر اسکی نوک پلک سنوارتے اور اس کا ظاہری و باطنی اور فنی حسن نکھارتے ہیں۔ نعت رنگ کے نگراں اور اپنی ذات میں ایک ادارے کی حیثیت رکھنے والے ہمارے محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب یہی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ!

اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ سمیعہ ناز صاحبہ نے نعت رنگ (کتابی سلسلہ) کی سلور جوبلی کی خوبصورت تقریب محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کے ساتھ لیڈز میں منعقد کی جس میں ہم سب کی بھرپور شرکت رہی۔ نعت رنگ کے کتابی سلسلے کی سلور جوبلی پر سب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ایک شعر جو محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی نذر کیا تھا دورانِ تقریب جب وہ ہم سب کے درمیان تشریف فرما تھے۔

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج

دیکھئے یہ کون آخر زیب کا شانہ ہے آج

یہاں برطانیہ کے شہر لیڈز میں محترمہ سمیعہ ناز صاحبہ بڑی دلجمعی شوق و محبت سے بطور معاون چیئر پرسن قابلِ قدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ مجھے نعت رنگ سے انہوں نے متعارف کروایا اور بہت سارے لوگوں کو کئی سالوں سے کرواتی چلی آرہی ہیں۔

کتابی صورت میں سینکڑوں صفحات پر مشتمل نہایت اعلیٰ نعتوں اور مضامین سے مزین تحفہ پیش کرنا آپ اور آپ کے تمام رفقاء کار کا بیش قیمت کارنامہ ہے جس کے لیے ہم نہایت شوق سے دیدہ و دل فرس راہ کیے منتظر بیٹھے ہوتے ہیں کہ سمندر پار سے کب یہ گراں بہا تحفہ یہاں پہنچ کر دل و جاں کی شادمانی کا سماں مہیا کرتا ہے۔ نعت رنگ کے اس خوبصورت کارواں کے لیے ڈھیروں مبارکباد اور دعائیں۔

ترا آفتاب قسمت رہے تا ابد فروزاں

تری صبح روزِ کامل کبھی شام تک نہ پہنچے

صحیح

سمیعہ ناز اقبال - برطانیہ

۲۰/ اکتوبر ۲۰۱۶ء

جب بھی قلم اٹھاتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ میں ایک کم فہم اور کم علم کیا لکھوں گی اور کہاں تک لکھ پاؤں گی۔ جس جریدے میں اعلیٰ فکر و نظر کے لوگ لکھتے ہوں۔ اللہ کریم کا بے پایاں کرم ہے کہ ”نعت رنگ“ بتدریج درخشاں زینے طے کرتے ہوئے اپنے جلو میں نقد و نعت کے دینوں کو لیے رواں دواں ہے اور اللہ تعالیٰ یوں ہی مزید برکتوں اور رحمتوں سے مالا مال رکھے۔ آمین

محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی برطانیہ آمد سے تمام نعت سے محبت کرنے والوں کو از حد خوشی ہوئی اور وہ اپنے ساتھ نعت رنگ شمارہ نمبر ۲۵ سلور جوہلی نمبر لے کر آئے۔ ماشاء اللہ دیدہ زیب سرورق خوبصورت آیہ نور کے ساتھ نہایت عمدہ کاوش ہے اور بیس برس کی محنتوں کا ثمر!

”نعت رنگ“ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے میں اپنی جانب سے اور نعت ریسرچ سینٹر یو کے کے تمام بورڈ ممبران کی جانب سے آپ اور تمام ارباب نقد و نظر جنہوں نے دامے، درے، قدے، سخنے جیسے بھی جتنا بھی کسی نے حصہ ڈالا ان سب کو اور ”نعت رنگ“ کے تمام قارئین کو بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اللہ کریم ”نعت رنگ“ جیسے وقیع اور خوبصورت جریدے کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے اور مزید توفیقات عطا ہوں۔ آمین ثم آمین

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی خوبصورت دھنک بکھری ہے ”نعت رنگ“ کے ابتدائیہ سے لے کر آخر تک۔ دلی مسرت ہوئی کہ آپ نے اس خوبصورت شمارے سلور جوہلی نمبر ”نعت رنگ“ ۲۵ کو محترم جناب ”پروفیسر انوار احمد زکی“ صاحب کے نام کیا۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے بہت محبت اور وارفتگی سے ”نعت رنگ“ کے لیے جو قصیدہء دعائیہ قلمبند کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب کو جنہوں نے اس قدر خوبصورت اور تحسین آمیز قصیدہ پیش کیا ہے۔ ماشاء اللہ!

تمام مقالات بہت جامع اور پراثر ہیں اور بہت پسند آئے لیکن ہر ایک پر بات کرنا محال ہے۔ ان میں چند ایک پر ضرور بات کرنا چاہتی ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے ”برسبیل نعت۔۔ الفاظ و تراکیب“ پر ایک عمدہ تحریر پیش کی ہے۔ ایسے مضامین کی اشد ضرورت ہے جن سے نواآموز شعرا کو بہتر سے بہترین لکھنے کی ترغیب و تحریک ملے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر عزیز احسن صاحب نے ”نعتیہ ادب کی تخلیق، تنقید اور تحقیق کے تلازمے“ ہمیشہ کی طرح ایک جامع اور اصلاحی تحریر پیش کی ہے۔ ماشاء اللہ! محترم ڈاکٹر شبیر احمد قادری

اور محترم ڈاکٹر اصغر علی بلوچ کا تحریر کردہ مقالہ بعنوان ”مذاہب عالم کا فلسفہ اخلاق اور اردو نعت نگار“ ایک نہایت تحقیقی، معلوماتی اور عمدہ کاوش ہے۔ جسے پڑھ کر بہت اچھا لگا اور جس میں دیگر مذاہب کے بارے میں آگاہی دی گئی ہے۔

کاشف عرفان نے ”اردو نعت نگاری پر مابعد جدیدیت کے اثرات“ کے عنوان سے ایک لاجواب کاوش ”نعت رنگ“ کے تمام قارئین کی نذر کی ہے۔ ان کی تحریر بہت شستہ اور اجلی ہے۔ نعت رسول کے لیے فکر کو جو بلندی اور رسائی عطا ہونی چاہیے وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ہے جس کے عوامل بے شمار ہو سکتے ہیں لیکن مجھے کاشف عرفان کی یہ بات بہت واضح محسوس ہوئی۔ وہ اس ضمن میں یوں لکھتے ہیں کہ:

”نعتیہ میدان میں مابعد جدیدیت کے حوالے سے اقبال کی شاعری اس آفاقی سطح کو چھوتی نظر آتی ہے جس کی جانب مابعد جدیدیت کا نظریہ اشارہ کرتا ہے۔ اردو میں نعتیہ تنقید کو سب سے بڑا مسئلہ یہی درپیش رہا کہ اس نے اقبال کو معیار اور مرکز مان کر بات کو آگے بڑھانے کے بجائے ایسے کلام پر گفتگو کی جو خود اس درجے کو نہیں چھوتا جہاں شعر آفاقیت حاصل کر لیتا ہے مابعد جدیدیت کا ایک اہم نکتہ کائنات کی حدود میں پھیلاؤ اور کائنات کی لامحدودیت کو سمجھنے کے عمل سے متعلق ہے۔“

کاشف عرفان کی اس خوبصورت تحریر کو پڑھ کر از حد خوشی ہوئی۔ انہوں نے بہت جامع اور واضح دلیلوں کے ساتھ ایک وسیع موضوع کو بیان کیا ہے۔ اس پر سیر حاصل بات کی جاسکتی ہے، لیکن میں اسی پر اکتفا کروں گی کیونکہ خط بہت طویل ہو چکا ہے۔

ایک مقالہ جو ڈاکٹر شہزاد احمد نے ”نعتیہ کلیات کی روایت (ایک مطالعاتی جائزہ)“ پیش کیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک بہت ہی معلوماتی اور مطالعاتی جائزہ ہے۔ اور جس کی افادیت مسلم ہے، جیسا کہ اس کے آغاز میں ہی نعت کی صدی کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ آپ اور ڈاکٹر شہزاد احمد بہت مبارکباد کے مستحق ہیں اتنی عمدہ کاوش پر۔ اس جائزے کو پڑھ کر اچھا تو لگا لیکن اختصار کی وجہ سے بڑے سے بڑے شعرائے کرام کی نعتوں کے ایک یا دو عدد اشعار پیش کیے گئے ان کے تعارف کے ساتھ جبکہ قارئین کی تشنگی کو بڑھا دیا گیا۔

محترم منظر عارفی صاحب نے ”اردو کے نعتیہ اشعار میں چٹائی، غارِ حراء، جو، کے تذکار اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق“ پر جو عمدہ کاوش کی ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری ادنیٰ سی

عرض ہے کہ ایسے مزید مقالے منظر عام پر آئیں تاکہ ہمارے جیسے نوآموز شعرا کے لیے مزید آگاہی اور سیکھنے کا سبب ہوں۔ اور اصل حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے قدرے بہتر سے بہترین سیکھنے کی سعی کی جا سکے۔ ڈاکٹر داؤد عثمانی صاحب نے ”نعت نامے“ اور نقد نعت کے حوالے سے ایک خوبصورت اور عمدہ مقالہ پیش کیا ہے۔ جہاں انہوں نے خوب سے خوب تر نعت ناموں کا حوالہ شامل کیا وہاں پر مجھے اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جزاک اللہ خیر!

”نعت رنگ“ کی ایک خصوصیت ہے کہ اس میں نعت کے بہت اُجلے رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس بار بھی ”سرائیکی شاعری میں نعت“ کے عنوان سے خوبصورت تحقیقی مقالہ محترم خورشید ربانی نے پیش کیا ہے۔ جہاں بہت سے نام اور کلام پڑھ کر دل خوش ہوا وہاں سلطان باہو اور خواجہ فرید کے کلام دیکھ کر خود کو لکھنے سے روک نہ پائی۔

ب ب بسم اللہ دا ایہہ گہنا وی بھارا ہو
نال شفاعت سرور عالم چھٹی سارا ہو
جدوں ودھ درود نبی تے جئیں دا ایڈا پیارا ہو
میں قربان انہاں توں باہو جہاں ملیا نبی دلارا ہو

”بسم اللہ خداوند تعالیٰ کا نام ہے اور یہ گہنا انمول ہے، سرکارِ دو عالم کی شفاعت سے ساری دنیا نجات حاصل کرے گی، ایسے باکمال نبی پر بے شمار درود و سلام، باہو! میں ان لوگوں پر قربان جاؤں جنہیں ایسا دلارا نبی ملا ہے۔“

سرائیکی شاعری کے اولین دور سے متعلق پروفیسر عامر فہیم رقم طراز ہیں:
”سرائیکی شاعری کا ارتقا تو ہوتا ہی حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ کریم سے ہے، جتنی پرانی کہانیاں ہیں، مثنویاں ہیں، لوک قصے ہیں، سب کے آغاز میں دعا ہے کہ بارگاہِ رسالت میں اسے قبولیت کا درجہ ملے۔“

خورشید صاحب خواجہ فرید کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں، کہ خواجہ فرید ۱۹ویں صدی کے وہ واحد اہم ترین شاعر ہیں جنہیں عالمی شہرت نصیب ہوئی۔ ان کے کلام کا سوز و گداز، مٹھاس اور نفگی اپنی مثال آپ ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر طاہر تونسوی لکھتے ہیں:

”خواجہ فرید نے لحنِ داؤدی میں سچے حسن اور سچے عشق کی تلاش کا جو نغمہ تخلیق کیا اور عقیدت و محبتِ رسول کا جو مست کر دینے والا سر چھیڑا ہے اس

کے باعث وہ سب کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ علامتوں اور اسرار کے حوالے سے انہوں نے تصوف کے جو مسائل بیان کئے اور جس طرح علاقہ کی علامت کو اظہار کا ذریعہ بنایا اس میں ان کا ثانی کوئی نہیں۔“

خورشید صاحب مزید لکھتے ہیں کہ، خواجہ فریدؒ ایک صوفی شاعر تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں وحدت الوجود کے نظریے کے اثرات بھی نظر آتے ہیں اور ایک عاشقِ کامل کی صدائے درد مند بھی سنائی دیتی ہے۔ صوفیانہ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے کلام میں حمد اور نعت کے مضامین بھی اپنے منفرد انداز میں موجود ہیں۔

حریم عقیدت میں، گوشہء انور شعور پڑھ کر بہت اچھا لگا اور ساتھ میں ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی خوبصورت تحریر ”انور شعور کا شعر عقیدت“ ایک جامع تحریر ہے۔ اس کے علاوہ گوشہء جمیل عالی نہایت عمدہ کاوش ہے۔ خصوصاً جگمگ نور نہایا رستہ، امین راحت چغتائی نے جو مطالعہ پیش کیا ہے۔ گوشہء سید ضیا الدین نعیم دیکھ اور پڑھ کر بہت لطف آیا۔ ان کی نعتیں سوشل میڈیا پہ جب بھی دیکھیں پڑھ کر ہمیشہ اک روشنی کا احساس ملا۔ ان کی نعت میں سادگی سے کہے گئے اشعار میں ہمیشہ ایک خوبصورت پیغام جو آقا کی عظمت کو اجاگر کرتا ہوا قلب و روح میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ خدا کا حکم ہے، ہر آدمی کے واسطے
ان کی جانب دیکھنا ہے پیروی کے واسطے
ان کی آمد سے مٹا رنگ و نسب کا امتیاز
صرف تقویٰ، شرط ٹھہرا، برتری کے واسطے

رواں سال میں میرے پاس نعت ریسرچ سینٹر کی بہت ساری نادر اور اہم کتب پہنچی ہیں جس کے لیے میں خصوصی طور پر ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی بہت مشکور ہوں جنہوں نے اپنی تمام کتابوں کے نایاب نسخے مجھے ناچیز کو دیے اور ”نعت نامے“ جیسی کتاب بھی موصول ہوئی۔ جو ایک مکمل دستاویز بن چکی ہے۔ اور اس ضمن میں محترم اقبال جاوید صاحب اپنے خط میں کیا خوب فرماتے ہیں کہ:

”خط شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔ اور شخصیت مسرت کے قہقہوں، غم کے آنسوؤں،

بے نیازی کی داستانوں اور نیاز مندی کی تمناؤں سے عبارت ہے۔“

اور جو ایسے کئی خوبصورت خطوط سے بھری پڑی ہے۔ آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے ”نعت نامے“ جیسی تاریخی شاہکار کتاب ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کے توسط سے ارسال کی۔ ڈاکٹر سہیل شفیق صاحب کو بہت مبارکباد پیش کرتی ہوں جنہوں نے یہ تحسین آمیز کام سرانجام دیا اور مشکور

ہوں کہ میرے تین خط اس تاریخی دستاویز میں شامل کیے۔ دعا ہے اللہ کریم آپ تمام احباب کی توفیقات میں مزید برکتیں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

آپ کی ممنون ہوں کہ میرے بعد اصرار پر اپنی مرتب شدہ کتب بھی ارسال کیں جن میں ”اردو نعت میں تجلیات سیرت، ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت، اردو نعت کی شعری روایت“۔ ان کے ساتھ ساتھ کاشف عرفان کی خوبصورت کتاب ”نعت اوجدید رتنقیدی رجانات“ بھی بھیجی۔

اس کے علاوہ ”نعت ریسرچ سینٹر یو کے“ کو فروغ نعت اکیڈمی کی جانب سے ”فروغ نعت“ کے تمام شمارے موصول ہوئے جس کے لیے ہم سب ”فروغ نعت اکیڈمی“ کے چیئرمین محترم سید شاکر القادری صاحب اور جملہ اراکین کے بے حد مشکور ہیں جنہوں نے فروغ نعت کے مجلے ارسال کیے۔

ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی برطانیہ آمد سے ہم سب نے خوب استفادہ کیا۔ نعت ریسرچ سینٹر یو کے کے زیر اہتمام ایک تقریب تو منعقد کی لیکن یو کے کے ایک مقامی چینل نورٹی وی جس پر میں اپنے پروگراموں کی کمپیئرنگ کرتی رہتی ہوں۔ ایک براہ راست نعتیہ مشاعرے کا اہتمام کیا جس کے مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب تھے اور جس میں یو کے کے تمام مقامی شہروں سے شعرائے کرام نے شرکت کی۔ اور جس کی صدارت محترم جناب قبلہ پیر محمد علاؤ الدین صدیقی صاحب (چیئرمین آف نورٹی وی) نے فرمائی۔

سب سے اہم بات یہ بتانی مقصود ہے کہ نعتیہ مشاعرہ تو روایتی انداز سے کیا گیا۔ جس میں تمام شعرائے کرام نے اپنے اپنے نعتیہ کلام تمام سامعین و ناظرین کی سماعتوں کی نذر کیے۔ آخر میں مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کو (راقمہ) نے نعت اور تنقید نعت پر گفتگو کی دعوت دی تاکہ تمام عالم اسلام میں جہاں جہاں نورٹی وی دیکھا جا رہا ہو یہ بات بھی سب تک پہنچ جائے۔ کہ صحیح معنوں میں نعت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح سے کرنی چاہیے اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔

اور آخر میں جناب قبلہ پیر محمد علاؤ الدین صدیقی صاحب (چیئرمین آف نورٹی وی) نے صدارتی فرائض انجام دیتے ہوئے اس نعتیہ مشاعرے کو اور خصوصاً ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کی نعت اور تنقید نعت پر گفتگو کو بہت پسند فرمایا اور اس بات کی تائید و تاکید بھی فرمائی کہ ہمیں نعت رسول کریم کس طرح سے کرنی چاہیے اور بحیثیت نعت گو، نعت خوان اور نقاد کے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم نبی کریم کی شان اور ان کے ادب کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کام کو احسن طریقے

سے لے کر چلیں۔ الحمد للہ! اس پروگرام کو بہت پذیرائی ملی بہت سراہا گیا اور نور ثی وی پر اس کو بارگاہ دکھایا بھی گیا۔

انٹرنیشنل نعت ریسرچ سینٹر، یو کے، کی تقریب پذیرائی۔۔۔۔۔ اور نعتیہ مشاعرہ:
لیڈز میں ”انٹرنیشنل نعت ریسرچ سینٹر، یو کے“ کی وائس چیر پرسن سمیعہ ناز (راقمہ) نے خصوصی طور پر نعتیہ ادب کے مقبول ترین کتابی سلسلے، نعت رنگ کے پچیس شمارے مکمل ہونے پر سلور جوبلی کی تقریب پذیرائی منعقد کی۔ یہ تقریب، بروز ہفتہ، ۱۹ مارچ ۲۰۱۶ء کو لیڈز میں منعقد ہوئی۔ جس میں انٹرنیشنل نعت ریسرچ سینٹر، کراچی، پاکستان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عزیز احسن کی برطانیہ آمد پر ان کے اعزاز میں ایک نعتیہ مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔

تقریب پذیرائی کی نظامت کے تمام فرائض (راقمہ) نے سرانجام دیے۔ تقریب کا باقاعدہ آغاز اشتیاق میر صاحب کی تلاوت قرآن حکیم سے ہوا۔ اس کے بعد ثوبیہ ملک کی خوبصورت آواز میں سمیعہ ناز (راقمہ) کا لکھا ہوا نعتیہ کلام سب کی سماعتوں تک پہنچا۔ جس کو سن کر سب بہت لطف اندوز ہوئے۔

جھوم کر آئی صبا تیری ثنا سے پہلے

خوب بری بھی گھٹا تیری ثنا سے پہلے

(راقمہ) نے نعت رنگ کے پچیس شمارے مکمل ہونے پر سلور جوبلی کی تقریب کے لیے ایک بہت بڑا خوبصورت ایک نعت رنگ کے پچیسویں شمارے کے سرورق کی مکمل تصویر کے ساتھ تیار کروا رکھا تھا۔ (راقمہ) نے، مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب، ڈاکٹر مختار الدین صاحب، ڈاکٹر مقصود الہی شیخ صاحب، محترمہ طلعت سلیم صاحبہ اور فراز یونس صاحب کو سٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ اور یوں ایک کو مہمان خصوصی نے دیگر مہمانوں کی شمولیت کے ساتھ کاٹا۔ اس کے بعد نعتیہ ادب کے بہترین نقاد کا ایوارڈ، طلعت سلیم صاحبہ کے ہاتھوں سے، ڈاکٹر عزیز احسن کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ نعتیہ ادب کے بہترین مدیر کا ایوارڈ صبح رحمانی کو دیا گیا جو صبح رحمانی کی غیر موجودگی میں، سمیعہ ناز (راقمہ) کے شوہر پرویز اقبال کے ہاتھوں سے، ڈاکٹر عزیز احسن نے وصول کیا۔

(راقمہ) نے تقریب پذیرائی کے لیے مہمانان اعزاز ڈاکٹر مقصود الہی شیخ، طلعت سلیم صاحبہ اور مہمان خصوصی محترم ڈاکٹر عزیز احسن صاحب کو سٹیج پر متمکن ہونے کی دعوت دی۔ سب سے پہلے (راقمہ) نے ”نعت رنگ“ کے پچیس شمارے مکمل ہونے پر شکریے کے طور پر ”نعت رنگ“ کے

عنوان سے اپنی ایک نظم سب شرکائے محفل کی نذر کی۔

مہمان خصوصی ڈاکٹر عزیز احسن نے نعت رنگ کے اجراء کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اپریل ۱۹۹۵ء میں نعت رنگ، کتابی سلسلے کا پہلا شمارہ تنقید نمبر کی صورت میں منظر عام پر آیا تھا۔ اب تک نعت رنگ کے پچیس شمارے شائع ہو چکے ہیں جن کی پذیرائی کا دائرہ بین الاقوامی سطح تک پھیل چکا ہے۔ انہوں نے صبحِ رحمانی کی مدیرانہ صلاحیتوں کی تعریف کی اور نعتیہ ادب سے ان کی دلچسپی کے باعث نعت ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتب کا تذکرہ کیا۔

نعتیہ ادب میں تنقیدی سرگرمیوں کے آغاز کا سہرہ نعت رنگ کے سر ہے۔ نعتیہ ادب میں تنقیدی عمل کے بہت تاخیر سے شروع ہونے کے اسباب پر بھی ڈاکٹر صاحب نے روشنی ڈالی۔ وقت کی قلت کے باعث ڈاکٹر مقصود الہی شیخ صاحب، محترمہ طلعت سلیم، تسنیم حسن اور سمیعہ ناز (راقمہ) نے بھی نعت رنگ کی ادبی انفرادیت کے حوالے سے بات کی۔ سب مقررین نے صبحِ رحمانی کی مدیرانہ صلاحیتوں کی تعریف کی اور مہمان خصوصی کی ناقدانہ کاوشوں کو سراہا۔

تقریب پذیرائی کے بعد نعتیہ مشاعرہ ہوا جس کی نظامت کے فرائض اشتیاق میر صاحب نے انجام دیے اور اس کی صدارت معروف شاعر ڈاکٹر مختار الدین احمد نے کی۔ ڈاکٹر عزیز احسن مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس مشاعرے میں برطانیہ کے مختلف شہروں سے آئے ہوئے شعراء نے اپنا نعتیہ کلام سنایا۔ جس میں سرفہرست ڈاکٹر مختار الدین احمد، اشتیاق میر، سمیعہ ناز (راقمہ)، تسنیم حسن، طلعت سلیم، سعدیہ سیٹھی، جاوید اقبال ستار، ڈاکٹر قیصر زیدی، خواجہ محمد عارف، مختار آذر کر بلائی تھے۔



(عطیاتِ کتب برائے نعت ریسرچ سینٹر)

محترم جناب ڈاکٹر صادق صاحب نے جو معروف نعت گو شاعر لالہ صحرائی کے صاحبزادے ہیں نعت ریسرچ سینٹر کے لیے درج ذیل کتب کے عطیات سے نوازا ہے۔ رب کریم ان کے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور حضرت لالہ صحرائی کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ ص ر

۱	چراغ عالمیں	اسماعیل انیس	۱۴۰۵ھ	مکتبہ شہزاد اقبال، لائڈھی کراچی
۲	اشک لرزاں	حمید اللہ خاں ساجد	۱۹۹۴	بیکسن بیکس، ملتان
۳	منتخب نعتیں	تابش صدیقی	۱۹۸۳	مطبوعات حرمت، روالپنڈی
۴	صفت ثنا (پنجابی)	اکرام مجید	۱۴۱۹ھ	نعت اکادمی، فیصل آباد
۵	تجلی	حسین سحر	۱۹۹۸	کتاب نگر، ملتان
۶	ثنائے خوبہ	حافظ لدھیانوی	۱۹۸۵	بیت الادب، فیصل آباد
۷	جمال	احمد ندیم قاسمی	۱۹۹۲	بیاض، لاہور
۸	دو جگ دادالی (پنجابی)	حسین سحر	۱۹۹۲	کتاب نگر، ملتان
۹	کاسۂ ہلال (نعتیہ قطعات)	ہلال جعفری	۱۹۹۸	بزم شعروادب، اسلام آباد
۱۰	نور ازل	منظف وارثی	۱۹۸۸	مادر اپبلشرز، لاہور
۱۱	حسنِ رحمت	محمد منظور علی شیخ	۱۹۸۹	علمی کتاب خانہ، لاہور
۱۲	جلوہ گاہ	حافظ مظہر الدین	۱۹۷۵	حریم ادب، روالپنڈی
۱۳	ذکر جمیل	ماہر القادری	۱۹۸۹	طالب الہاشمی، لاہور
۱۴	ذکر جمیل	ماہر القادری	ندارد	نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن
۱۵	صحیفہ انوار (انتخاب)	علامہ کشفی	۱۹۶۰	مکتبہ شباب اردو، سیالکوٹ
۱۶	بکخور سرور کائنات	اثر صہبائی	۱۹۵۸	کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور
۱۷	ذکر حبیب	خالد مینائی	ندارد	مکتبہ الحبیب، لاہور
۱۸	سید و نضر ملتان (نعت نمبر)	عارف دہلوی	۱۹۶۳	مقام اشاعت حسین آگاہی، ملتان
۱۹	لوح بھی تو قلم بھی تو	راز کا شمیری	۱۹۸۸	عثمان اکیڈمی، گوجرانوالہ

۲۰	صل اللہ علیہ وسلم (انتخاب)	راز کا شمیری	۱۴۰۰ھ	سیرت مشن، لاہور
۲۱	مہکتے حرف (انتخاب)	ملتان پریس کلب	۱۹۹۵	ملتان پریس کلب
۲۲	حوائے طیبہ	قاضی عبدالرحمن	۱۹۸۱	آئینہ ادب، لاہور
۲۳	مدح رسول	راجا رشید محمود	۱۹۷۳	پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور
۲۴	حمد و مناجات (انتخاب)	ضیا محمد ضیا / طاہر شادانی	۱۹۸۶	علمی کتاب خانہ، لاہور
۲۵	وسیلہ	عاصم گیلانی	۱۹۸۵	مصنف، لاہور
۲۶	سک متران دی (پنجابی)	حفیظ تائب	ندارد	عزیز پبلیشرز، لاہور
۲۷	صلو علیہ والہ	حفیظ تائب	۱۹۹۱	ادب نما، لاہور
۲۸	وہی یسین وہی طہ	حفیظ تائب	۱۹۹۸	القمرا نشیر پرائز، لاہور
۲۹	وسلمو تسلیم	حفیظ تائب	۱۹۹۰	مقبول اکیڈمی، لاہور
۳۰	نعتیہ رباعیات	حافظ لدھیانوی	۱۹۹۲	بیت الادب، فیصل آباد
۳۱	قاب قوسین	اقبال عظیم	۱۹۸۴	پنجاب بک ہاؤس
۳۲	اوج قمر	قمر جلالوی	ندارد	شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی
۳۳	جان جہاں	حافظ محمد افضل معیز	۱۴۰۳ھ	مکتبہ کارواں، لاہور
۳۴	جان جہاں	حافظ محمد افضل معیز	۱۹۹۴	نعت اکادمی، فیصل آباد
۳۵	اللہم صل علی محمد	ریاض مجید	۱۹۹۴	نعت اکادمی، فیصل آباد
۳۶	شعرائے امرتسر کی نعتیہ شاعری	محمد سلیم چودھری	۱۹۹۶	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور
۳۷	مدحت کے گلاب	عاصی کرناٹی	۱۹۸۶	کاروان ادب، ملتان
۳۸	فیوض الحرمین	عبدالعزیز شرعی	۱۹۸۰	مکتبہ پیام اسلام، ملتان
۳۹	خمسائے حجاز	مولانا ظفر علی خان	۱۹۶۵	کتب خانہ مقبول عام، لاہور
۴۰	تجلیات	حافظ مظہر الدین	۱۹۶۹	حریم ادب، راولپنڈی
۴۱	خوابوں میں سنہری جالی ہے	صبح رحمانی	۱۹۹۷	فضلی سنز، کراچی
۴۲	موج نور (انتخاب)	محمد دین ادیب	ندارد	نظامی پریس، لاہور
۴۳	حرف شیریں	عاصی کرناٹی	۱۹۹۳	قمر زیدی، کراچی
۴۴	محفل حضور (انتخاب)	میاں خدا بخش	ندارد	راجا رشید احمد تاج کتب، لاہور

۳۵	نعت رنگ شماره ۵/۴	صبح رحمانی	۱۹۹۸/۱۹۹۷	اقلیم نعت، کراچی
۳۶	کشکول مجذوب	خواجہ عزیز الحسن مجذوب	۱۹۸۹	ادارہ تالیفات اشرقیہ، ملتان

دیگر موصول ہونے والی کتابیں:

۴۷	صہائے حرم	سہیل احمد	۱۹۷۴	دارالعلوم امجدیہ، کراچی
۴۸	شق القمر	ڈاکٹر فریدی صدیقی	۲۰۰۸	مصنف انگوری باغ، رام پور
۴۹	ان کا در چاہیے	شارق جاوید	۲۰۰۵	مصنف، ملتان
۵۰	خزینہ نوازش	ڈاکٹر عاصی کرنالی	۲۰۰۹	الکتاب گرافکس، ملتان
۵۱	وجدان	یاور وراثی	۲۰۱۱	نجم السعید، کانپوری یو پی
۵۲	رحمت تمام	حبیب سرحد	۲۰۱۱	مصنف، فتح پور (سہون)
۵۳	ناعت و معنوت (کلیات نعت)	ڈاکٹر راہی فدائی	۲۰۱۴	الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد بھارت
۵۴	نقش پائے محمد	سحر علی	۲۰۱۶	حارث پرنٹرز، کراچی
۵۵	آئینہ عقیدت	رشید ساقی	۲۰۱۴	پیر کمونیکیشن سسٹم، اسلام آباد
۵۶	زم زم عشق	ریاض حسین چودھری	۲۰۱۵	القمر انٹر پرائزز، لاہور
۵۷	ڈاکٹر عزیز الحسن اور مطالعت حمد و نعت	صبح رحمانی	۲۰۱۵	نعت ریسرچ سینٹر، کراچی

نعت ریسرچ سینٹر کی مطبوعات

- | | | |
|-------|--------------------------|--|
| 600/- | ڈاکٹر عاصی کرنالی | 1- اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر |
| 350/- | رشید وارثی | 2- اردو نعت کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ |
| 200/- | پروفیسر محمد اقبال جاوید | 3- نعت میں کیسے کہوں (تنقید) |
| 200/- | صبح رحمانی | 4- غالب اور نثائے خواجہ (تنقید) |
| 150/- | ڈاکٹر عزیز احسن | 5- نعت کی تخلیقی سچائیاں (تنقید) |
| 150/- | ڈاکٹر عزیز احسن | 6- ہنر نازک ہے (تنقید) |
| 120/- | ڈاکٹر عزیز احسن | 7- اردو نعت اور جدید اسالیب (تنقید) |
| 150/- | صبح رحمانی | 8- نعت نگر کاہاسی (تنقید) |
| 80/- | ڈاکٹر حسرت کاسکھوی | 9- جادۂ رحمت کا مسافر (تنقید) |
| 250/- | حافظ عبدالغفار حافظ | 10- بہشت تضامین (شعری مجموعہ) |
| 200/- | نور بانو محبوب | 11- خیر البشر (میلاد نامہ) |
| 300/- | ڈاکٹر ابوالخیر کشفی | 12- نعت اور تنقید نعت (تنقید) |
| 200/- | ڈاکٹر افضال احمد انور | 13- فنِ ادارہ نویسی اور "نعت رنگ" |
| 300/- | ڈاکٹر شبیر احمد قادری | 14- "نعت رنگ" اہل علم کی نظر میں (مضامین) |
| 300/- | محمد طاہر قریشی | 15- فہرست کتب خانہ نعت ریسرچ سینٹر (کتابیات) |
| 450/- | اقبال عظیم | 16- زیور حرم (کلیات و نعت) |
| 150/- | امان خان دل | 17- شہہ لولاک (شعری مجموعہ) |
| 200/- | جشن منیر مغل | 18- جادۂ رحمت (انگریزی مجموعہ) |
| 300/- | ڈاکٹر سہیل شفیق | 19- اشاریہ "نعت رنگ" (بیس شمارے) |
| 500/- | سارہ کالپی | 20- سرکار کے قدموں میں (انگریزی ترجمہ) |
| 200/- | ڈاکٹر عزیز احسن | 21- شہرِ توفیق (شعری مجموعہ) |
| 200/- | آفتاب کری | 22- توسین (شعری مجموعہ) |
| 100/- | شفیق الدین شارق | 23- نزول (شعری مجموعہ) |
| 100/- | آفتاب کری | 24- آنکھ بنی سکھول (شعری مجموعہ) |
| 150/- | ضیف اسعدی | 25- آپ (شعری مجموعہ) |

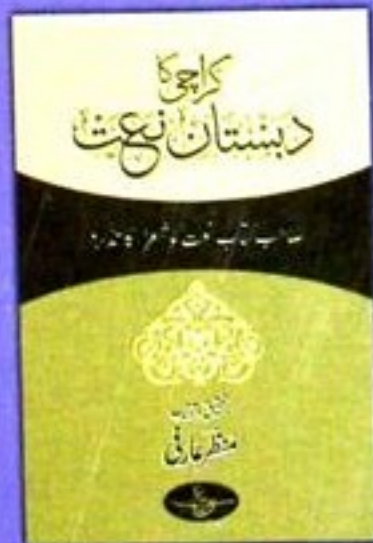
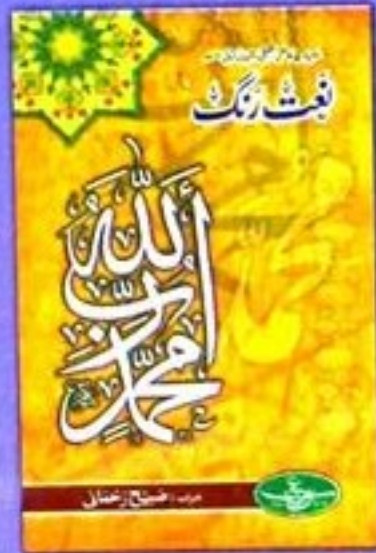
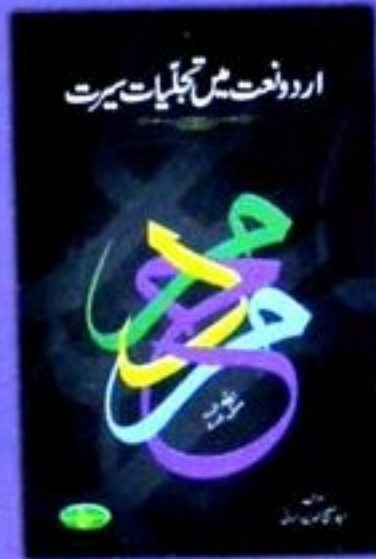
150/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(شعری مجموعہ)	26- کرم و نجات کا سلسلہ
20/-	وحیدہ نسیم	(شعری مجموعہ)	27- نعت اور سلام
200/-	آفتاب کریمی	(شعری مجموعہ)	28- ممدوح خلّاق
300/-	پروفیسر محمد اقبال جاوید	(مجموعہ احادیث)	29- مربع چہل حدیث
250/-	پروفیسر محمد اکرم رضا	(تنقید)	30- نعتیہ ادب کے تنقیدی نقوش
150/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(تنقید)	31- نعت کے تنقیدی آفاق
200/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(اقبالیات)	32- مثنوی رموز بیخودی کافی و فکری جائزہ
150/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(شعری مجموعہ)	33- اُمید طیبہ رسی
300/-	ڈاکٹر ابوالخیر کشفی	(تنقید)	34- نعت شناسی
700/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(تحقیقی مقالہ)	35- اردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیق مطالعہ
300/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(تنقید)	36- پاکستان میں اردو نعت
1000/-	ڈاکٹر محمد سہیل شفق	(مجموعہ مکاتیب)	37- نعت نامے بنا؟ م صبحِ رحمانی
350/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(تنقید)	38- نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویے
52/-	ڈاکٹر عزیز احسن	(سیرت)	39- تعلق بالرسول ﷺ کے تقاضے اور ہم
100/-	ڈاکٹر محمد اقبال جاوید	(ظفر علی خان کی نعتیہ تب و تاب)	40- دل جس سے زندہ ہے
50/-	ڈاکٹر شہزاد احمد	(ایک اجمالی تعارف)	41- نعت رنگ کے پچیس شمارے
200/-	ڈاکٹر محمد منیر احمد سلج		42- وفیات نعت گویان پاکستان
400/-	صبحِ رحمانی		43- ڈاکٹر عزیز احسن اور مطالعاتِ حمد و نعت
200/-	حلیم حاذق		44- اصول نعت گوئی
400/-	کاشف عرفان		45- نعت اور جدید تنقیدی رجحانات
ہدیہ دعا	سیما منیر		46- زمزمہ سلام
1000	منظر عارفی		47- کراچی کا دبستان نعت
600/-	صبحِ رحمانی	(انتخاب نعت)	48- مدحت نامہ

زیر طبع کتب

صبحِ رحمانی
صبحِ رحمانی

49- کلام رضا کے فکری و فنی زاویے
50- پاکستانی زبانوں میں نعت

دستِ نبوت



نعت ریسرچ سینٹر کی مطبوعات
پڑھنے کے لیے ملاحظہ کیجیے۔

www.sabih-rehmani.com